اس چہرے کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ جو انسانیت کے مستقبل پر تاریکیوں اور نحوست کا سایہ کئے ہوئے ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں راجہ انور اپنی زندگی کی اس لہولہان عبارت کے وسیلہ سے گلستان ادب میں داخل ہوتا ہے اور یوں وہ خطوط کے اس دائرے میں اس آخری خط پر پہنچتا ہے۔ جو کنول کے نام اس کا آخری خط ہے۔ جو شائد پوسٹ نہ کیا جا سکا۔ یہ ایک کھلا خط ہے۔ ایک ترقی پسند کا رجعت پسندوں کے نام کھلا چیلنج۔ جس میں راجہ کا ذہن اور دل پھر ایک بار ایک نقطہ پر جمع ہو گئے ہیں۔ راجہ گلستانِ ادب میں کسی پامال راستے اور چور دروازے سے داخل نہیں ہوا۔ نہ ہی اس نے کوئی ایسی شاہراہ اختیار کی ہے۔ جو گردِ کارواں سے اٹی ہوئی ہے بلکہ وہ تو اپنی ذات کا قفس توڑ کے آزاد ہوا ہے اس نے ایک بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ منٹو معاشرے کو ننگا کرتا تھا لیکن راجہ نے اپنے آپ کو ننگا کیا ہے۔ رسوا نے طوائف کی داستان سنائی جو اپنا جسم بیچنے پر مجبور تھی بعدح نہیں بیچتی تھی۔ لیکن راجہ نے اس شریف زادی کی کہانی لکھی ہے جو اپنے جسم کے ساتھ مدح بھی بیچ دیتی ہے۔ راجہ اس حمام میں ننگا ہونے کے باوجود ابھی عریاں نہیں جہاں سب ننگے اپنے وجود کی غلاظتوں کو ڈھانپنے کی فکر میں نئی نئی کثافتوں کا سہارا لیتے رہتے ہیں۔ راجہ کا عریاں جسم فن کی دنیا میں مرمر کا ایک ایسا بت ہے جو سنگتراش سے زیادہ پاکیزہ ہے۔ راجہ نے کئی جگہ اپنے جذبات کی عکاسی فلمی گانوں سے کی ہے میں بھی آخر میں ایک فلمی گیت کے مصرعہ پر ختم کرتا ہوں ؎

"محبت جرم ہے تو جرم کا انکار کرتے ہیں"

••

عقدِ ثانی ــــ سید علی شبنم کارواری

عقدِ ثانی کا ارادہ ہے کروں یا نہ کروں   عمر آدھی سے زیادہ ہے کروں یا نہ کروں
خون کا جوش بھی آدھا ہے کروں یا نہ کروں   ایک بیوہ سے بھی وعدہ ہے کروں یا نہ کروں
دوستو میری یہ خواہش ہے صلاح کے قابل
دیکھیے ہوں کہ نہیں میں بھی نکاح کے قابل

یہ میری آس ابھی غور طلب ہے یارو   پہلی بیوی کی اجازت بھی غضب ہے یارو
مرحلہ اتنا بھی آسان یہ کب ہے یارو   اس کی خاموشی قاتل کا سبب ہے یارو
خواب شرمندۂ تعبیر نہ جانے کب ہو
مہرباں مجھ پہ یہ تقدیر نہ جانے کب ہو

اکتفا ایک ہی سہرے پہ کیا ہے اب تک   ایک ہی قاضی کا احسان لیا ہے اب تک
ایک ہی ساقی سے پیمانہ پیا ہے اب تک   ایک ہی آس پہ یہ بندہ جیا ہے اب تک
ایک دلہن ہو نئی ایک نئی ہو دنیا
تا کہ شریانوں میں گردش کرے پھر خون نیا

عقدِ اوّل تو ضرورت بھی تقاضا تھا ہوا   وہ تو ماں باپ کی کوشش کا نتیجہ تھا ہوا
دولھا بننے کا ہمیں شوق بھی تازہ تھا ہوا   وہ تو اک عہدِ جوانی کا تماشا تھا ہوا
دوسری شادی بھی البتہ تماشا ہوگی
میری خواہش کی میری عمر کی چرچا ہوگی

عقدِ ثانی میں مگر پہلی سی وہ بات کہاں   رقصِ شہنائی وہ ہنگامۂ بارات کہاں
ملنے او بٹنے کی وہ مہندی کی رسومات کہاں   جو ہوا کرتی ہیں جتنی بھی خرافات کہاں
نہ تو گھوڑا ہی یہاں ہوگا نہ ڈولی ہوگی
دو میرے یار اک ان کی سہیلی ہوگی

سرد جذبات ہیں کچھ ان کو حرارت تو ملے   چاہے بے رنگ ہو بے نور ہو چاہت تو ملے
ناتواں جسم کو کھوئی ہوئی طاقت تو ملے   یہ تو مل جائے گی بیوی کی اجازت تو ملے
ایسے موقع پہ ہوا کرتی ہے بیوی گونگی
وارننگ دیتی ہے کہ جان بھی میں دے دوں گی

آگ پہ تیل ہے زخموں پہ نمک ہے یہ عمل   ایک طوفان ہے بجلی کی کڑک ہے یہ عمل
تیغ و خنجر جس میں بہت ہیں وہ سرکشیِ یہ عمل   سر پہ سوتن کے مگر جورِ فلک ہے یہ عمل
طنز کا طعنوں کا بھی ہے نشانہ سوتن



دور کے خط

(مراسلے)

مصطفیٰ کمال صاحب!

السلام علیکم۔

"شگوفہ" کا تازہ شمارہ (ستمبر ۹۱ء) بہت ساری خوشخبریاں لے کر آیا ہے۔ مجلس مشاورت میں دلیپ سنگھ صاحب کی شمولیت، ڈاکٹر عابد معز اور غوری صاحب کی سعی و کاوش سے سعودی عرب کے مختلف شہروں میں سالانہ خریداروں اور معاونین کی تعداد میں اضافہ اور جناب عزیز ابرار کو شگوفہ کی ادبی خدمات پر سنٹرل یونی ورسٹی حیدرآباد کے شعبۂ اردو میں یم فل کی ڈگری (اس مقالے کو زیور طباعت سے آراستہ ہونا چاہیے) ویسے بھی اس شمارے میں پڑھنے کو بہت کچھ ہے۔ گوشۂ فیاض احمد فیضی میں لکھے گئے تمام مضامین دل سے لکھے گئے ہیں بلا نہیں ٹالی گئی ہے۔ موصوف اتنی ساری خوبیوں کے حامل ہیں اس کا اس سے پہلے مجھے پتہ نہیں تھا۔ بینک کی آفیسری سے لے کر ان کی موٹر کار تک سب چیزیں ان کے تمول کی نشان دہی کر رہی ہیں۔ ان کی تحریریں تو پہلے ہی سے مالا مال ہیں۔ شگوفہ صوری اور معنوی اعتبار سے روز بروز نکھرتا جا رہا ہے جس کے لیے میری طرف سے مبارک باد۔ مشتاق احمد یوسفی کی قسط حسب معمول اچھی ہے۔

رشید الدین
(حیدرآباد)

السلام علیکم۔ شگوفہ کا شمارۂ اگست ۹۱ء موصول ہوا جس سے آپ کی اور شگوفہ کی صحت کی جانب سے لاحق پریشانیاں ختم ہو گئیں۔ اللہ دونوں کی عمر دراز کرے۔ آمین

رؤف پاریکھ، کراچی

مجھے اپنے دوست اور کلاس فیلو رضا شاہ کے ذریعہ شگوفہ سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ آپ یقین جانیے کہ پہلے تو یہ یقین ہی نہیں ہوا کہ یہ رسالہ ہندوستان ہی سے شائع ہوا ہے۔ بہرحال! دل کو سمجھانا پڑا۔ سالنامہ، مارچ کا شمارہ اور اس کے بعد کا شمارہ خوب سے خوب تر ہے۔

آج کے اس زمانے میں جب کہ اردو برائے اردو ہی رہ گئی ہے۔ جہاں ریسرچ اور مباحثوں کا موضوع کسی کی تاریخ پیدائش کا تعین ہے تو کسی کی جائے پیدائش کا تعین۔ کوئی اردو ادب کے اصل مقصد کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ ادب کا اوّلین مقصد معاشرہ کی تعمیر ہوتا ہے، سماج کو صحیح رخ دکھانا ہوتا ہے۔ خواہ یہ سماج میں رائج برائیوں کی نشان دہی کر کے ہو یا پھر یہ کہ ایک صحت مند معاشرہ کے لوازم سے واقف کرانے کی صورت میں ہو۔ طنز و مزاح ان مقاصد کے حصول کے لیے اہم اور کارآمد ذریعہ ہے۔ یہ وہ ذریعہ ہے جو بیک وقت تلخ بھی ہے اور شیریں بھی۔ ہنستے ہنساتے وار کر جانا اصلاح کا بہترین ذریعہ ہو سکتے ہیں اور پھر یہ انسان کی creativity اور Imagination power کا غماز بھی ہوتا ہے کہ کس خوب صورتی سے آدمی کتنی پتے کی بات کر جاتا ہے اور کسی کا دل بھی نہیں دکھتا

آپ نے طنز و مزاح کے ممتاز ماہرین کو ایک پلیٹ فارم پر یک جا کر کے صحت مند معاشرے کی تعمیر کے لیے اچھا قدم اٹھایا ہے ہمارا اردو ادب کے ماتھے سے بے مقصدیت کے کلنگ کا ٹیکا اٹھانے کی اچھی کوشش کی ہے۔

اس سے کم از کم مجھ جیسے نوجوان جو اردو ادب کے براہ راست طالب علم نہیں ہیں لیکن اردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں استفادہ حاصل ضرور کر سکتے ہیں۔

میں مشکور ہوں اپنے کلاس فیلو رضا شاہ کا جو آپ کے ہم وطن ہیں کہ جن کی عنایتوں سے "شگوفہ" کے چند شمارے



سالنامہ

موصول ہوئے - میرے دوسرے دوستوں اور جاننے والوں نے بھی شگوفہ کو بہت پسند کیا ہے۔

امجد حسین
محسن الملک ہال علی گڑھ

ادھر آپ کھٹے میٹھے واقعات سے دوچار رہے، جہاں آپ کی تصنیف کے اجرا پر جی خوش ہوا وہاں بوگس حیدرآبادی کی اچانک موت نے وہ دکھ دیا کہ ...... بس۔

بوگس کی آدھی غزل کی برجستگی اور ادائیگی کی بازگشت گونجتی رہے گی۔ خدا موصوف کو جنت المقام کرے آمین ○

قمرالزماں کی کتاب 'بے ساختہ' کی رسم اجرا کے موقع پر میں نے بوگس حیدرآبادی کے حوالے سے ان ہی کے طور طریقے پہ اپنی آدھی غزل پڑھی ہے جسے سامعین نے وہ نوازا کہ موصوف کی یاد تازہ ہوگئی۔ اس طرفہ شگوفہ خوب شگوفے چھوڑ رہا ہے۔ خاص کر محترم حفیظ بنارسی کی موجودگی مزاحیہ ادب کے لیے صحت بخش ہے۔ نثری مضامین تو پہلے سے ہی خوب ہیں شعری کلام کا انتخاب آج کل مرغوب ہے۔

صابر بہاری، رانچی

شگوفہ کا تازہ شمارہ فیاض فیضی کے گوشے کے ساتھ خوب ہے۔ یہ سلسلہ جاری رکھیے اور یوسف ناظم پر کوئی گوشہ شائع کیجیے۔

تقی الدین، لکھنو

طنز و مزاح پر سمینار اور مشاعرہ - مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کی مساعی

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کی بورڈ میٹنگ مورخہ ۱۱ر نومبر ۹۱ء میں اس مرتبہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ ۲۵ر اور ۲۶ر جنوری ۹۲ء کو بمبئی میں دو روزہ کل ہند طنز و مزاح سمینار اور مزاحیہ مشاعرہ منعقد کیا جائے۔

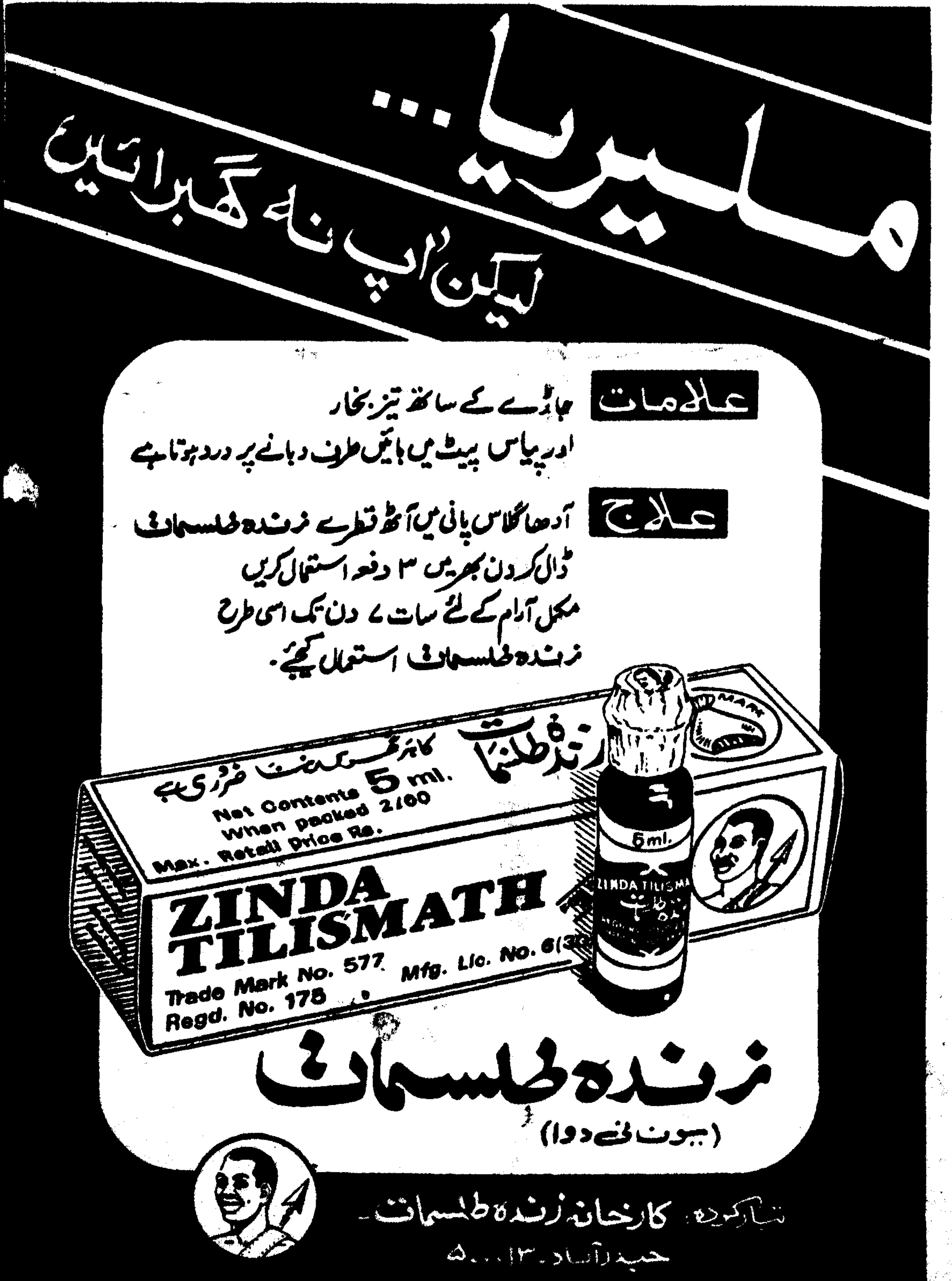
طنز و مزاح سمینار جو دو نشستوں پر مشتمل ہوگا، جس میں ہندوستان میں آزادی کے بعد طنزیہ و مزاحیہ ادب پر سیر حاصل مقالے پڑھے جائیں گے۔

اس سمینار میں شمیم حنفی دہلی، ڈاکٹر لطف الرحمن بھاگلپور، ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، علی گڑھ، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال حیدرآباد کو شرکت کی دعوت دی جارہی ہے۔

سمینار کی ان دو نشستوں میں تنقیدی مقالات کے علاوہ طنزیہ مزاحیہ مضامین اور انشائیے بھی پڑھے جائیں گے۔ اس سلسلے میں ملک کے مشہور و معروف مزاح نگاروں کو دعوت دی جارہی ہے، جن میں یوسف ناظم بمبئی، مجتبیٰ حسین دہلی، سلمیٰ صدیقی بمبئی، شفیقہ فرحت بھوپال، مسیح انجم حیدرآباد، پرویز یداللہ مہدی بمبئی، شکیل اعجاز اکولہ اور علیمہ فردوس بنگلور شامل ہیں۔

کل ہند مزاحیہ مشاعرہ کا انعقاد یوم جمہوریہ کی شب متوقع ہے، اس میں شرکت کے لیے ہلال سیوہاروی، ساغر خیامی، آفتاب لکھنوی، عنایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ، طالب خوندمیری، اسمٰعیل ظریف، پاپلر میرٹھی، مقرب حسین مقرب، پاگل عادل آبادی، اشرف خوندمیری، مفلس قاروقی، سنیل کمار تنگ، مختار یوسفی، ظہیر قدسی، سارس لکھنوی، خوامخواہ حیدرآبادی، انہیر دھ بھونگیری، فیاض افسوس بھاٹے حیدرآبادی وغیرہ کو دعوت نامے بھیجے جارہے ہیں۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اکیڈیمی کی جانب سے بمبئی میں پہلی بار ایک اتنے بڑے پیمانے پر طنز و مزاح کے موضوع پر سمینار اور مشاعرہ کا انعقاد کیا جارہا ہے۔ اردو داں حضرات کے لیے یقیناً ایک خوش آئند قدم ہے۔

R. No. 15822/68 **SHUGOOFA** Postal Regd. No. H/HD.6
Vol. 24 Copy 11 HYDERABAD-1 November '91 Phone : 557716



زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

سالنامہ

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمالؔ

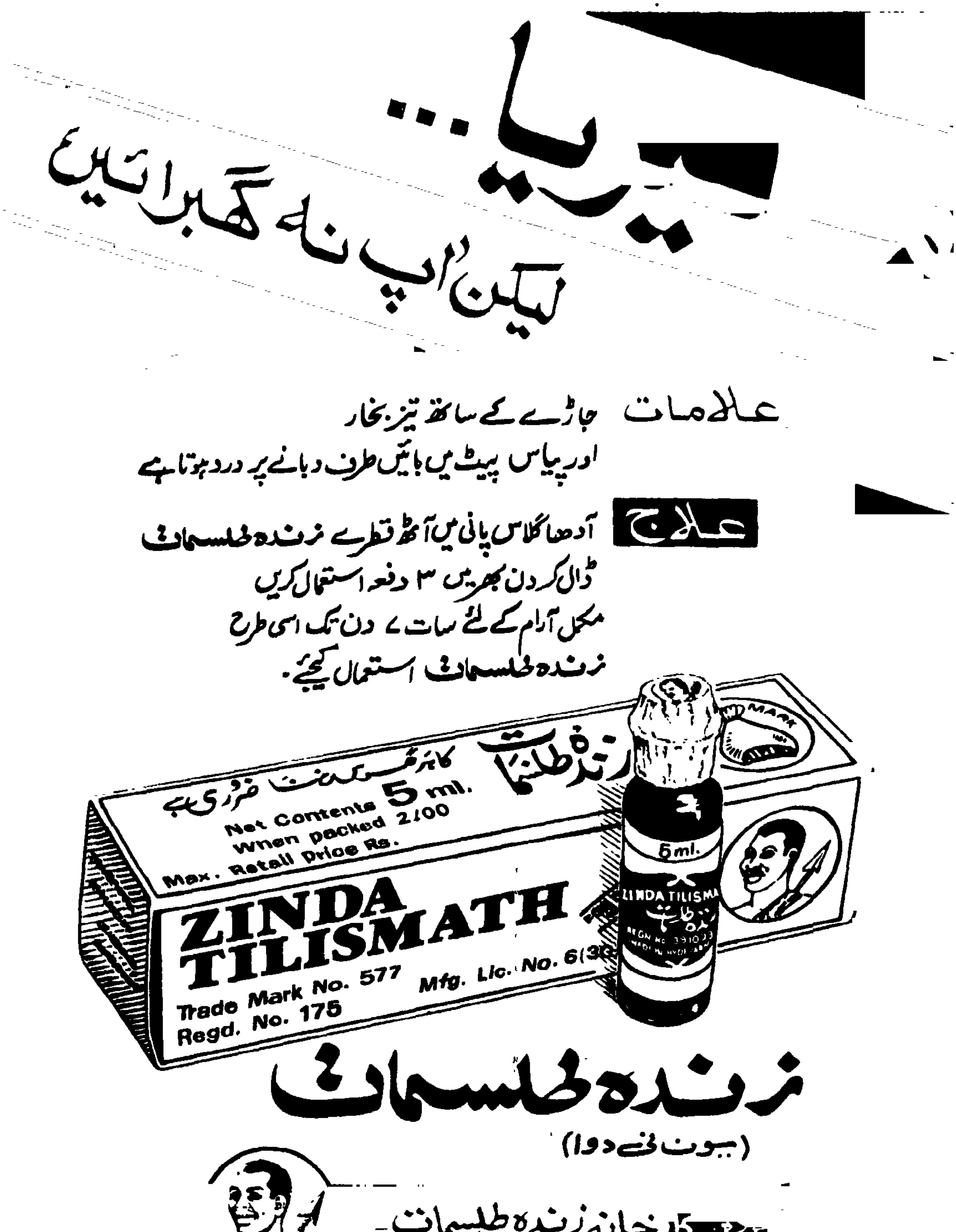
جلد ۲۴
شمارہ ۱، ۲

جنوری
فبروری
۱۹۹۱ء

کتابت: محمد غالب۔ محمود سلیم۔ محمد مجاہد
طباعت: دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد

فی پرچہ: ۹ روپے
زرسالانہ انفرادی ۵۵ روپے
لائبریریوں سے ۶۰ روپے
عرب ممالک سے ۲۵۰ روپے

شگوفہ ۳۱- بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
فون آفس 557716
فون مکان 521064


...یا
لیکن آپ نہ گھبرائیں
علامات
جاڑے کے ساتھ تیز بخار
اور پیاس پیٹ میں بائیں طرف دبانے پر درد ہوتا ہے
علاج
آدھا گلاس پانی میں آٹھ قطرے زندہ طلسمات
ڈال کر دن بھر میں ۳ دفعہ استعمال کریں
مکمل آرام کے لئے سات ۷ دن تک اسی طرح
زندہ طلسمات استعمال کیجئے۔
زندہ طلسمات
5 ml.
Net Contents
When packed 2/00
Max. Retail Price Rs.
ZINDA TILISMATH
Trade Mark No. 577
Regd. No. 175
Mfg. Lic. No. 6(3
5ml.
MARK
زندہ طلسمات
ارخانہ زندہ طلسمات۔
حید

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

دخل در نا معقولات (ڈرامے)

(افسانہ)

اڑیں گے پرزے (خاکہ)

چُورن (منظومات)

مجتبیٰ حسین

انسان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ سوچنے والا جانور ہے۔ جانور اور وہ بھی سوچنے والا۔ گویا کریلا اور وہ بھی نیم چڑھا۔ لہٰذا اس قول کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ہر انسان ہر دم کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا ہے۔ حالاں کہ ہمارا خیال ہے کہ دنیا کے ننانوے فی صدی آدمی سوچنے کے بالکل اہل نہیں ہوتے لیکن قدرت نے چوں کہ انھیں دو ٹانگیں عطا کی ہیں اسی لیے سوچنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض انسانوں کی سوچ اور ان کی عقل گھٹنوں سے نیچے ہوتی ہے۔ مغرب کے کسی فلسفی نے کہا تھا "میں سوچتا ہوں اسی لیے ہوں" اُس کے جواب میں مغرب کے ہی کسی فلسفی نے اس فقرے کی الٹی استری کر کے کہہ دیا تھا "میں ہوں اسی لیے سوچتا ہوں"۔ ہم چوں کہ مغرب کے فلسفیوں کی باتوں میں ذرا آسانی سے بہک جاتے ہیں اسی لیے عنفوانِ شباب میں جب ہم نے یہ دو فقرے پڑھے تھے تو ان فقروں کی گہرائی میں اتنی دور تک چلے گئے اور اتنے طویل عرصے تک سوچ میں غرق رہے کہ جب سوچ کے اس سمندر سے باہر نکلے

سوچا کیا — ہوا کیا

تو پتہ چلا کہ شباب تو کب کا ختم ہو چکا ہے اور بڑھاپا دستک دینے لگا ہے۔ اس وقت ہمیں احساس ہوا کہ ہم خواہ مخواہ "سوچنا" اور "ہونا" کے چکر میں پڑے رہے:

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

"میں ہوں اسی لیے سوچتا ہوں" اور "میں سوچتا ہوں اسی لیے ہوں" کے چکر میں جوانی کی راتیں مرادوں کے دن گزار دیئے۔ بعد میں پھر سوچا تو پتہ چلا کہ اس پیچیدہ فلسفے کو مشرق کے دانش وروں نے ایک عام فہم اور آسان سوال کے روپ میں پیش کیا تھا کہ "مرغی پہلے پیدا ہوئی یا انڈا پہلے پیدا ہوا۔" مرغی اور انڈے کی منطق ہمارے ذہن سے بڑی مطابقت رکھتی ہے۔ مرغی اور انڈے کی تقدیم و تاخیر والی بحث جب کسی نتیجہ پر نہیں پہنچی تو فریقین حسب استطاعت انڈے یا مرغی کو کھا لیتے ہیں۔ یوں بھی سوچ اور بحث کے آخری سرے پر مرغی یا انڈا ہو تو بحث میں بڑی جان اور لذت پیدا ہوتی ہے۔

بہرحال سوچنا اور غیر ضروری باتیں سوچنا انسان کا پیدائشی حق ہے۔ اور یہ ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انسان جب سوچنے پر آتا ہے تو کیسی بے تکی باتیں سوچنے لگتا ہے۔ ہمارے ایک دوست ہیں جو یوں سوچ بچار کرتے ہیں جیسے آدمی لنچ یا ڈنر کھاتا ہے۔ انھوں نے سوچ بچار کا باضابطہ ٹائم ٹیبل بنا رکھا ہے۔ ان کا ٹائم ٹیبل کچھ اس طرح کا ہوتا ہے۔ صبح ناشتہ سے پہلے آدھا گھنٹہ سوچا۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے ایک گھنٹہ کی سوچ۔ پھر رات کے کھانے سے پہلے ایک گھنٹہ سوچا۔ میں نے ایک دن ان کا نظام الاوقات دیکھ کر پوچھا "آپ ہمیشہ کھانے سے پہلے کیوں سوچتے ہیں؟" بولے "بھئی! سچ بات تو یہ ہے کہ ہم اہلِ مشرق صرف کھانے سے پہلے ہی سوچ سکتے ہیں۔ کھانے کے بعد تو جماہیوں کا وہ جلوس نکلتا ہے کہ سوچ کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اور پھر یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ ہم اہلِ مشرق پیٹ سے سوچتے ہیں اور اپنے دماغ کو کم سے کم زحمت دیتے ہیں۔"

ہم نے پوچھا "مگر آپ سوچتے کیوں ہیں؟"

بولے "آپ نے بہت اچھا سوال پوچھا ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ آخر میں کیوں سوچتا ہوں۔ آپ بھی شاید ایسا ہی سوچتے ہوں گے۔ مگر سوچ سوچ میں فرق ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ میری سوچ آپ کی سوچ سے متفق ہو۔ اگر ساری سوچیں ایک جیسی ہوں تو پھر سوچنے کا کیا فائدہ۔ سوچ کی خوبی یہ ہے کہ ایک سوچ کے بعد دوسری سوچ خود بخود چلی آتی ہے۔ سوچ ہی انسان کی اصل زندگی ہے۔ سوچ کے بنا زندگی بے فیض ہے یہ بتائیے میری اس سوچ کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں؟" ہم نے کہا "معاف کیجیے۔ میں سوچتا ہوں کہ اب سوچ کے بارے میں مزید کوئی بات نہیں ہونی چاہیے کیونکہ ایک سوچ کے بعد دوسری سوچ خود بخود چلی آتی ہے۔ اگر سوچتے سوچتے کہیں میری بس مس نہ ہو جائے۔ ہم لوگ پھر کبھی اس مسئلہ پر سوچیں گے۔" یہ کہہ کر ہم وہاں سے چلے آئے کیونکہ ہمارے ساتھ مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاس سوچنے کا وقت بالکل نہیں ہوتا۔

ایک زمانہ تھا جب ہم بھی بڑی محنت سے سوچا کرتے تھے مگر عمر کی ایک منزل کو پہنچنے کے بعد احساس ہوا کہ ہم کسی معاملے پر جب بھی کچھ سوچتے ہیں تو معاملہ الٹ ہو جاتا ہے۔ دور کیوں جائیے۔ ابھی چند برس پہلے کی بات ہے۔ ہم ایک دفتر میں کام کیا کرتے تھے۔ پانچ چھ برس سے ہمیں کوئی پرموشن نہیں ملی تھی لیکن اس کے باوجود ہم پوری دیانت داری کے ساتھ اپنے فرائضِ منصبی کو پورا کیا کرتے تھے۔ بڑی منت سماجت کر کے ہم نے دفتر کے ایک کلرک کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ ہماری ترقی کے بارے میں تجویز ہمارے عہدیدار کے پاس روانہ کر دے۔ سوئے اتفاق کہ جوں ہی ہماری ترقی سے متعلق فائل عہدہ دار کے پاس پہنچی اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا بظاہر ہماری ترقی اور عہدہ دار کی بیوی کے انتقال میں کوئی ایسی تعلق نہیں تھا مگر غرض مند آدمی کی سوچ تو ہر معاملے میں تعلق پیدا کر لیتی ہے۔ ہم نے سوچا کہ عہدہ دار کی بیوی کے انتقال سے فائدہ اٹھا کر پروموشن حاصل کی جاسکتی ہے۔ ذہن میں اس تعلق کے واضح ہوتے ہی ہم عہدہ دار کے گھر پُرسہ دینے کے لیے گئے۔ جانے سے پہلے اپنے قریبی رشتہ داروں کی بھولی بسری اموات کو اپنی ذات میں از سرِ نو اتنا کھنگالا کہ آنکھوں میں سیلاب امڈ آیا۔ اس طغیانی کو آنکھوں میں سمیٹے اور اپنے مرحوم قریبی رشتہ داروں کی نعشوں کو ذہن میں حاضر و ناظر جان کر ہم عہدہ دار کے پاس پہنچے۔ عہدہ دار کو پرسہ دے کر ہم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ پھر جوں جوں ترقی کا خیال آتا تھا خود بہ خود آنسوؤں کا سیلاب ہماری آنکھوں میں امڈ آتا تھا۔ ہم نے سوچا کہ ہمارے اس جذباتی پرسہ کے ذریعے ہم اپنے عہدہ دار کی خوشنودی حاصل کر لیں گے [illegible] جیسے ترقی ہمارے قدم چومنے لگی ہے۔ ترقی [illegible]

کے خیال نے ہم پر وہ رقت طاری کر دی کہ ہم قدم لڑکھڑانے لگے اور آن کی آن میں ہم جذبات سے مغلوب ہو کر زمین پر گر پڑے۔ عہدیدار نے ہمیں سنبھالا دیا۔ ہمیں صبر کرنے کی تلقین کی۔ پھر زندگی کا فلسفہ سمجھایا کہ یہ دنیا فانی ہے۔ یہاں جو بھی آتا ہے وہ چلا جاتا ہے۔ سب کو ایک نہ ایک دن اپنے خالق حقیقی سے جا ملنا ہے۔ ایسے موقعوں پر دھیرج سے کام لینا چاہیے۔ مگر پروموشن کے خیال نے ہمیں کچھ ایسا بے بس کر دیا تھا کہ اس وقت زندگی کا یہ آسان فلسفہ ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ ہم نے اپنے رونے کی رفتار کچھ اور تیز کر دی۔ عہدہ دار بھی آخر کب تک ہمیں سنبھالتا۔ پھر وہ بے چارہ خود اپنی بیوی کی جدائی کے غم سے نڈھال تھا۔ آخری رسومات کے بعد جب ہم گھر واپس ہوئے تو ہم نے سوچا کہ تیر بالکل نشانے پر بیٹھا ہے اور یہ کہ اگلے ہفتے تک پروموشن ہو جائے گی۔ مگر چوتھے دن جب ہمارا عہدہ دار دفتر آیا تو اس نے سب سے پہلے ہمیں بلایا پھر گرج کر بولا "سچ سچ بتاؤ۔ میری بیوی کے انتقال پر تم اتنا کیوں رو رہے تھے۔ آخر معاملہ کیا ہے" سچ سچ جواب دینا ہوگا"۔

ہم منہ لٹکا کر مجرموں کی طرح کھڑے رہے۔ پروموشن تو ہمیں کیا ملتی اللہ اللہ رخصت لے کر گھر بیٹھے رہے اور جب ہمارے عہدہ دار نے دوسری شادی کی تو تب کہیں دفتر میں کام پر جا سکے۔

مگر اس نے تب بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ایک دن پوچھ لیا "سچ سچ بتاؤ تم میری بیوی کے انتقال پر کیوں روئے تھے؟" ہم بھی اس سے بہت تنگ آ چکے تھے۔ سوچا کہ کیوں نہ معافی مانگ کر معاملہ کو ختم کر دیا جائے لہٰذا بولے "حضور غلطی ہو گئی جس کے لیے معذرت خواہ ہوں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ مستقبل میں جب آپ کی دوسری بیوی کا انتقال ہوگا تو میری آنکھ میں ایک آنسو بھی نہیں آئے گا۔"

ذرا سوچیے ہم نے سوچا کیا اور ہوا کیا؟ ہماری سوچ کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ ہمیشہ اس کا الٹا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ کوئی ایک واقعہ ہو تو گنائیں بھی۔ ہمارے محلے میں ایک پہلوان ہوا کرتے تھے۔ سارا دن شریف لوگوں کی شرافت کا امتحان لیا کرتے تھے۔ دو ایک بار ہماری شرافت کا نہ صرف امتحان لیا تھا بلکہ ازراہِ نوازش اس امتحان میں فیل بھی کیا تھا۔ ہم ہر دم ان سے گھبرائے گھبرائے رہتے تھے۔ ایک دن پہلوان صاحب میں نہ جانے کہاں سے ہمارے لیے خلوص سمٹ آیا کہ ہمارا راستہ روک کر شریفوں کی طرح مسکرانے لگے۔ اگرچہ ان کے ہونٹوں پر شرافت والی ہنسی سج نہیں رہی تھی مگر ہم نے سوچا کہ کبھی کبھار یہ اس طرح ہنس لیں تو کیا برا ہے۔ ہم سے بڑی نرمی اور حلاوت کے ساتھ بولے "بھئی! ہمیں کل کسی نے بتایا کہ آپ مزاح نگار ہیں۔ بھئی آپ سے تو ہمیں اچھے مراسم رکھنے چاہئیں۔ کبھی لطیفے ہی سننے کو مل جائیں گے اور ہمارا وقت کٹ جائے گا۔"

ہم نے کہا۔ ذرہ نوازی کا شکریہ۔"

بولے "یہ ذرہ نوازی کیا ہوتی ہے؟"

ہم نے اپنے آپ کو حقیر فقیر ثابت کرنے کے لیے ذرہ نوازی کا مطلب سمجھانا شروع کیا تو بولے "سنجیدہ باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے ہمیں کوئی لطیفہ سنائیے۔" اب ہماری سوچ نے خود کام کرنا شروع کر دیا۔ ہم نے سوچا اگر پہلوان کو اگر ہم نے کوئی لطیفہ سنا کر خوش کر دیا تو سمجھیے کہ محلے میں ہماری دھاک بیٹھ جائے گی اور کوئی ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ اس خیال کے ساتھ ہی ہم نے پہلوان کو وہ مشہور لطیفہ سنانا شروع کر دیا کہ ایک

صاحب سڑک پر ایک کتے کو زنجیر سے باندھے لے جا رہے تھے کہ ایک راہ گیر نے ان صاحب سے پوچھا۔
"کیوں صاحب! اس گدھے کو کہاں لے جا رہے ہیں؟"

ان صاحب نے کتے کی طرف اشارہ کرکے راہ گیر سے پوچھا "کیا تمھیں یہ گدھا نظر آتا ہے؟

اس پر راہ گیر نے کہا "معاف کیجیے۔ میں یہ سوال آپ سے نہیں کتے سے پوچھ رہا ہوں۔"

ہماری سوچ کے مطابق پہلوان صاحب کو اس لطیفے کے بعد قہقہہ لگانا چاہیے تھا مگر اچانک ان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ غصے سے سارا بدن کانپنے لگا۔ ہمارے گریبان کو پکڑ کر انھوں نے ہمیں اپنی طرف کھینچا اور ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے "تمھیں یہ لطیفہ کس نے سنایا۔ مجھے اس کا پتہ بتاؤ۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا اور خبردار۔ آئندہ تم نے کسی کو یہ لطیفہ سنایا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ یہ لطیفہ نہیں یہ ایک واقعہ ہے جو خود میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ اپنی مزاح نگاری کے ذریعے مجھے بدنام کرتے پھرتے ہو" یہ کہہ کر پہلوان صاحب نے ہمارے گریبان کو چھوڑتے ہوئے کہا "جاؤ بھاگو یہاں سے۔ آئندہ پھر کبھی مجھے اپنی صورت نہ دکھانا۔ ہم وہاں سے سرپٹ بھاگے۔ راستہ بھر اس نکتہ پر غور کرتے رہے کہ آخر ان دونوں لطیفوں اور حقیقت میں اتنا کم فرق کیوں رہ گیا ہے۔

ہماری سوچ کے دیوالیہ پن کو ظاہر کرنے کے لیے ہم نے صرف دو ادنٰی سی مثالیں پیش کی ہیں۔ ہماری ساری زندگی ایسی زرّیں مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ کبھی سفر پر جانے کا موقع ملا تو ہم نے سوچا کہ اسٹیشن وقت پر پہنچ جانا چاہیے۔ کیا پتہ کہ ٹرین ٹھیک وقت پر ہی پلیٹ فارم پر آ جائے مگر جب اپنی سوچ کے مطابق ٹھیک وقت پر اسٹیشن پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہماری سوچ ٹرین سے پورے دو گھنٹے پیچھے رہ گئی ہے۔ بعض اوقات ٹرینیں لیٹ چلتی ہیں کیوں نہ تاخیر سے اسٹیشن پہنچا جائے۔ جب ہم اپنی سوچ کے مطابق دو چار منٹ دیر سے اسٹیشن پہنچے تو معلوم ہوا کہ ٹرین ہماری سوچ سے آگے نکل گئی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہماری سوچ اور ٹرینوں میں خدا واسطے کا بیر ہے۔

جب ہم نوجوان تھے تو زندگی کے بڑے حسین خواب دیکھا کرتے تھے۔ سوچا کرتے تھے کہ ہمارا ایک خوب صورت گھر ہوگا۔ ایک خوب صورت بیوی ہوگی، خوب صورت بچے ہوں گے۔ گھر میں خوب صورت بلّے کتّے پالے جائیں گے۔ یہاں تک کہ ہماری خادمہ بھی خوب صورت ہوگی۔ نوجوانی میں آدمی ہر طرف خوب صورتی ہی خوب صورتی دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر ہماری خوب صورت سوچ کا جو حشر ہوا ہے اس کا حال ہم ہی جانتے ہیں۔ اگرچہ ہماری سوچ اس معاملے میں بالکل غلط ثابت نہیں ہوئی کیوں کہ ہماری خادمہ خاصی خوب صورت ہے۔ لیکن خادمہ کی خوب صورتی تو ہماری سوچ کا جزوی حصہ تھی وہ تو ہماری خوب صورت سوچ کے وسیع کینوس کا صرف ایک نقطہ تھی۔ پھر بھی ہم خادمہ کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ہماری سوچ کی لاج رکھ لی۔

ہماری بیوی شادی کے بعد دو ڈھائی مہینوں تک تو خوب صورت دکھائی دیتی رہی مگر جب اس نے ہماری آمدنی پر جو ان دنوں صفر کے برابر تھی، کڑی نظر رکھنی شروع کر دی تو اس کی خوب صورتی رفتہ رفتہ زائل ہونے لگی۔ مگر ہم اس کے باوجود مایوس نہیں ہوئے۔ ہم نے سوچا کم از کم ہمارے بچے ہی ہماری سوچ کی لاج رکھ لیں گے۔ پھر بچے

بھی آسکے۔ مگر جب انھوں نے اسکول کی فیس مانگنی شروع کی اور طرح طرح کی فرمائشیں کرنے لگے تو ان کی خوبصورتی کے نقوش بھی دھندلے ہونے لگے ہم مایوس نہیں ہوئے۔ ہم نے سوچا چلو ایک خوب صورت کتا ہی پال لیں گے۔ آدمی اپنے آئیڈیل کے لیے کیا نہیں کرتا سو ایک کتا بھی لے آئے مگر اس نے آتے ہی سب سے پہلے ہماری سوچ پر بھونکنا شروع کر دیا پھر ایک دن جب اس نے ہماری سوچ میں اپنے دانت پیوست کر دیئے تو بالآخر اس سے بھی نجات حاصل کر لی۔

اب ہماری سوچ خادمہ کی خوب صورتی پر اٹکی ہوئی ہے۔ پتہ نہیں کس دن یہ اپنی تنخواہ میں اضافہ کا مطالبہ کرے اور یہ خوب صورتی بھی ہماری زندگی سے نکل جائے۔

مگر ذرا سوچیے ہماری معصوم سی سوچ کا کیا حشر ہوا ہے۔ اب تو زندگی بہت آگے نکل گئی ہے۔ سوچتے ہیں کہ اپنی پچھلی سوچ کو پورا کرنے کے لیے پھر اس دنیا میں نیا جنم لیں گے کیوں کہ ہم خاصے بے شرم واقع ہوئے ہیں۔ فلک ناہنجار کے آگے ہم یوں آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔ ایک نہ ایک دن تو ہم قدرت کو اپنی سوچ کے مطابق بنا لیں گے۔

سیّد ضمیر جعفری (لاہور)

ضمیریات

رابطہ ہے تازہ ہر اک چہرے سے ہر اک منظر کے ساتھ ——— میں بڑھاپے کو نہ آنے دوں گا کیلنڈر کے ساتھ
بہت زیردستوں نے دی ہے دہائی ——— مساوات اوپر سے نیچے نہ آئی

تبدیلی

نئے خوش رنگ پھولوں سے زمینوں کو سجاتا ہے ——— بہاروں کو لٹاتا ہے، ستاروں پر بھی جاتا ہے

°

نظر آئی تو "اسٹائل" کی تبدیلی نظر آئی ——— کہ انساں اب چھری کانٹے سے انسانوں کو کھاتا ہے

چمکتی قبریں

[آسٹریلیا کے اکثر قدیم سیاہ فام باشندے گھاس پھوس کے جھونپڑوں میں رہتے ہیں مگر اپنی قبروں کو وہ شفاف آئینوں اور رنگین ظروف سے جگمگائے رکھتے ہیں]

اے سیہ روزانِ "بحرالکاہل و جاہل" ——— کتنی صدیوں تک یہ گل دامن زمیں خالی رہی
دل میں بجھتی حسرتیں آخر فروزاں ہو گئیں ——— قبر پہ چمکائی ہے لیکن زندگی کالی رہی

حاکمانِ سفید

کنبرا کے یہ حاکمانِ سفید
دو رُخی خو شعار کرتے ہیں
کالے لوگوں سے ان کو نفرت ہے
کالے تیتر سے پیار کرتے ہیں

گھوڑا

اپنے سائے سے خائف رہتا ہے جب تک جاگتا ہے
بھاگتا ہے سایا، تو گھوڑا اور زیادہ بھاگتا ہے

●

یوسف ناظم
(بمبئی)

بے زبانی ہے زباں میری

غالبؔ نے جب کہا تھا، دیکھنا تقریر کی لذّت تو اُن کا صاف مطلب یہ تھا کہ یہ تقریر دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے سُننے کی چیز نہیں ہے اور جس شخص کی لب کشائی کا ذکر اُنھوں نے اپنے شعر میں کیا تھا وہ شخص تھا ہی قابلِ دید۔ لائقِ شنید بھی ہوگا، لیکن بس ایک حد تک۔ ایسا شخص جس کے دونوں لب شیریں ہوں۔ ظاہر ہے اُس کی عطا کی ہوئی گالیوں میں گاجر کے حلوے کا مزا ہوگا۔ ایسے مقرر ہر کسی کے مقدّر میں نہیں ہوتے۔ بہت سے گھروں میں دسترخوان پر میٹھا تو صرف اس لیے درکار ہوتا ہے کہ جو بھی تقریر سُننی پڑی ہے اور تقریباً ہر دن سُننی پڑتی ہے اس کی تلخی کا کچھ ازالہ ہوجائے۔ وہ بھی وقتی طور پر۔

تقریر اور تحریر میں فرق یہ ہے کہ مقرّر اور سامعین دونوں میں سے کسی کے لیے بھی خواندگی کی شرط نہیں ہے۔ دونوں جتنے ناخواندہ ہوں گے ایک دوسرے کو اتنا ہی پسند کریں گے۔ جب کہ تحریر لکھنے اور پڑھنے کی شرائط کی پابند ہے اسی لیے تقریر کے مقابلے میں تحریر کم لوگوں کی دل آزاری کا باعث ہوتی ہے۔ تقریر سے دلچسپی اور شغف رکھنے والوں کا فائدہ بس یہی ہے کہ تقریر سُننے کے لیے "قوتِ خرید" درکار نہیں ہوتی۔ تقریر سُننے کی وجہ سے البتہ کوئی عارضہ لاحق ہوجائے تو بات الگ ہے۔ تقریر سُنتے وقت آدمی سو بھی سکتا ہے جب کہ تحریر پڑھتے وقت جاگنا پڑتا ہے۔ بہت سے لوگ تقریر سننے جاتے ہی اس لیے ہیں کہ گھر میں بیوی اور بچوں کی وجہ سے جو نیند پوری نہیں ہوتی اُس کا مابقی حصہ پورا کرلیں۔ ہال میں سمجھ دار سامعین بالعموم پیچھے کی نشستوں پر بیٹھتے ہیں۔ دروازے سے قریب بیٹھنے والوں کا بھی تجربہ کار سامعین میں شمار ہوتا ہے۔ یہ لوگ ان تقریروں کو زیادہ شوق سے سُنتے ہیں جو راست مقرر کے دہنِ مبارک کی فرمودہ اور فرستادہ

ہوتی ہیں یعنی ایسی تقریریں جو مائیکروفون کی مدد سے دور دور تک نہیں پھیلائی جائیں۔ مائیکروفون نہ ہو تو نیند میں خلل واقع نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے ایک چھوٹے سے ہال میں کسی مقرر کی تقریر کے دوران ایک شوقین سامع نے جب کھڑے رہ کر یہ شکایت کی کہ فاضل مقرر کی آواز ان تک نہیں پہنچ رہی ہے تو فی الفور ایک کونے سے آواز آئی۔ اگر مقرر کی آواز واقعی وہاں نہیں پہنچ رہی ہے تو آپ کی جگہ مجھے دے دیجئے ـــــ گو کہ آواز صرف ایک تھی لیکن اُس شخص کی نشست کی طرف لپکے کئی لوگ ـــــ

تقریر اور تحریر میں ایک نمایاں فرق یہ بھی ہے کہ تقریر کے کئی انداز ہوتے ہیں اور ہر مقرر اپنے اطوار کی بنا پر دوسرے مقرر سے مختلف ہوتا ہے۔ تحریر میں جولانی کے موقع تو ہوتے ہیں لیکن پہلوانی کے مواقع تقریباً ناپید ہوتے ہیں۔ کچھ مقرر تو اس وضع کے ہوتے ہیں کہ انھیں ٹائم بم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ دھیمے انداز میں تقریر شروع کرتے ہیں اُس پوشیدہ وائر کی طرح جو دھیرے دھیرے سلگتا ہے اور جب تہلکے کی گھڑی آتی ہے تو مقرر کے آگے رکھی ہوئی میز، مقرر کے گھونسوں سے لرز اُٹھتی ہے۔ مقرر جب اپنی تقریر دل پذیر کے دوران اپنی آواز کو فلک شگاف بنانے کے لیے اپنی گردن کی رگوں کو شمشیر کے دم کی طرح سینۂ شمشیر سے باہر نکالنے کی کوشش کرے اور اس کے ساتھ ہی اپنا نیم فولادی مُکّا تان لے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اب میز کی خیر نہیں۔ جلسہ گاہ کی آرائش کے ذمہ دار لوگ اب ایک فاضل میز ساتھ لانے لگے ہیں۔ سامعین تو نچلے بیٹھتے ہیں اور کرسیوں کی مرمت کی اتنی ضرورت پیش نہیں آتی جتنی شہ نشین پر رکھی ہوئی میز کی مرمت کروانی پڑتی ہے۔ مقرر کے گھونسوں کے ڈر سے اب میز پر گلدان اور پانی کے گلاس نہیں رکھے جاتے۔ یہ شعلہ بیان اور آتش زیرِ پا مقرر سامعین کی کمزوریوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سامعین بات کے نہیں جذبات کے قائل ہوتے ہیں اور اُسے اِس بات کا بھی پورا علم ہوتا ہے کہ سامعین اس کے سامنے کس موقع پر بغلیں اور تالیاں بجائیں گے۔ ان ہی تالیوں کے دوران وہ اپنی سانس بھی درست کر لیتا ہے ـــــ (تلفظ کی پرواہ نہیں کرتا) ایسے مقرر جو اپنی تندرستی اور قوتِ بازو کے بل پر تقریر کرتے ہیں ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ فی سانس کم سے (۱۴۰) الفاظ ضرور بولتے ہیں۔ اُن کی رفتارِ گویائی اور ایک ٹائپسٹ لڑکی کے رقصِ انگشتِ حنائی میں تھوڑا ہی سا فرق ہوتا ہے اور یہ فرق بھی صرف اس لیے ہوتا ہے کہ ٹائپسٹ لڑکی کے پاس ایک مشین ہوتی ہے۔ ان دونوں کے عمل زور آزمائی سے الفاظ ہی پیدا ہوتے ہیں لیکن ٹائپ رائٹر سے برآمد شدہ تحریر بامعنی ہوتی ہے۔ مقرر اور ٹائپسٹ میں ہم آہنگی یہ ہوتی ہے کہ دونوں کے ذہن پر کوئی بار نہیں پڑتا اور ان دونوں میں تضاد یہ ہوتا ہے کہ مقرر کی مسکراہٹ دل شکن ہوتی ہے اور ٹائپسٹ کی دل نشیں۔ ٹائپسٹ لڑکی کا مستقبل قدرے روشن ہوتا ہے۔

کچھ مقررین کی تقریریں تقریر تو ہوتی ہی ہے لیکن ڈراما ذرا زیادہ ہوتا ہے۔ مقرر یوگا اور کراٹے کا مظاہرہ تو نہیں کرتا لیکن کہیں کہیں ان کی جھلکیاں ضرور دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ یہ مقرر اپنی آواز کے زیر و بم سے جلسہ گاہ میں ارتعاش پیدا کرتا ہے اور اپنا دایاں ہاتھ (کبھی کبھی بایاں ہاتھ بھی) ہوا میں لہرا کر پہلے

ہی سے رواں دواں پولیوشن کو تقویت پہنچاتا ہے۔ وہ اپنے جوشِ خطابت میں مائیکروفون سے ہٹ بھی جاتا ہے اور
اسے سمجھا بجھا کر ازسرِنو مائیکروفون کے روبرو لایا جاتا ہے (بعض وقت اسے دو مائیکروفون پیش کئے جاتے ہیں
تاکہ اگر وہ ایک مائیکروفون سے ہٹے تو دوسرے مائیکروفون سے اس کا رشتہ برقرار رہے) یہ مقرر مائیکروفون
ہی سے نہیں ہٹتا اپنے موضوع سے بھی ہٹ جاتا ہے۔ اس کام میں وہ مطلق دیر نہیں کرتا۔ اپنے موضوع سے
ہٹ کر تقریر کرنے کی اسے بڑی مشق ہوتی ہے۔ موضوع پر نہ بولنے والے مقرروں کی مردم شماری ممکن نہیں ہے
(پتہ نہیں ان مقررین کے لیے مردم شماری کا لفظ صحیح ہے بھی یا نہیں) یہ مقرر اور ان کی تقریریں دن بہ دن مقبول ہوتی
جارہی ہیں بلکہ بعض تقریروں کے تو کیسٹ بھی تیار ہو کر فروخت ہونے لگے ہیں۔ مصائب اسی طرح پھیلتے ہیں۔ ان مقررو ں
کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ ان کے گھروں میں دو تین قدِ آدم آئینے لگے ہوتے ہیں۔ ان ہی آئینوں کے روبرو کھڑے رہ کر
یہ مقرر اپنی تقریر کے ریہرسل منعقد کرتے ہیں اور جس دن اُن کی تقریر ہونے والی ہوتی ہے اس دن تقریر کا ڈریس ریہرسل ضرور
ہوتا ہے۔ جب یہ مقرر، مقررہ وقت پر مکمل تیاری کے ساتھ لیس ہو کر سوئے جلسہ گاہ روانہ ہوتے ہیں تو گھر کے در و دیوار
وہ دو تین قدِ آدم آئینے اور اہلِ خانہ انھیں بڑی خوشی کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ اُن کے گھر سے رخصت ہونے پر
گھر کا ماحول پُرسکون ہو جاتا ہے۔ سامعین بھی جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں لیکن اُن میں سے بہت کم لوگوں
کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ سوئے مقتل جارہے ہیں۔ ان میں سے اکثر سامعین وہ بھی ہوتے ہیں جو گھر کا
سودا سلف خریدنے گھر کے باہر نکلے تھے۔ تفریحاً جلسہ گاہ چلے گئے اور وہاں واقعات نے کچھ ایسا موڑ لیا کہ ان کے
خریدے ہوئے آدھے سے زیادہ آلو اور ٹماٹر مقرر کو داد دینے میں صرف ہو گئے۔ گو کہ اس داد و تحسین کا آغاز خود
اُنھوں نے نہیں کیا تھا وفورِ جذبات میں ان کے قریب بیٹھنے والوں نے کیا تھا۔ ہال میں ان کا جو نقصان مایہ ہوا سو ہوا
گھر پہنچ کر شماتتِ ہمسایہ کا احسان الگ لینا پڑا۔

آلوؤں اور ٹماٹروں سے داد پانے والے ایک زندہ دل مقرر نے بارش کے پہلے آلو پر مائیکروفون پر یہ
اعلان کیا کہ حضرات شہ نشیں پر مزید آلو نہ پھینکئے۔ جناب صدر نیند سے بیدار ہو چکے ہیں۔ اس اعلان کے بعد مقرر نے
تین منٹ تک اور سامعین کو محظوظ کیا اور شہ نشین سے نیچے اُتر آیا۔ صدرِ جلسہ نے اس مقرر کو بعد میں بہت تلاش کیا
لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ آیا۔

کچھ مقررین اپنے سامعین سے بہت ہی قریبی تعلقات پیدا کر لیتے ہیں اور بعض وقت اپنے شناساؤں کو نام بہ نام مخاطب
کر کے چند جملے انھیں اس طرح نذر کرتے ہیں جس طرح مشاعرے میں کچھ شاعر اپنا کوئی کمزور شعر میونسپل کونسلر یا کسی
اور سخن نافہم شخص کے حوالے کر کے بعد میں کوئی مادی فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ مقرر اگر فنِ تقریر کے تمام حربوں سے
آگاہ ہے تو حاضرینِ جلسہ اس کے کسی سوال کے پوچھنے پر بآوازِ بلند ہاں یا نہیں کہہ کر اس کا دل بڑھاتے ہیں۔ ایسے
مقررین گھر سے چلتے وقت اپنی دستی گھڑی گھر ہی پر بھول آتے ہیں۔ یہ عمل دانستہ ہوتا ہے۔ ان کی تقریر کا شروع ہونا
طے ہوتا ہے ختم ہونا طے نہیں ہوتا۔ پروگرام میں اُن کی تقریر کے بعد جن مقرروں کو بولنا ہوتا ہے اُن کی دل کی دل ہی
میں رہ جاتی ہے۔ صدرِ جلسہ کو بھوک ستانے لگتی ہے۔ جب وہ تقریر کرتے ہیں تو کئی الفاظ کھا جاتے ہیں۔

سامعین ان مقرروں کو بھی بہت پسند کرتے ہیں جو ہر لفظ چبا چبا کر بولتے ہیں۔ یہ مقرر اس خیال کے حامی ہوتے ہیں کہ ان کا ہر لفظ گنجینۂ معانی ہوتا ہے اور اس لفظ کا سامعین تک بمعہ اعراب و مخرج پہنچنا ضروری ہے۔ سامعین تقریر نہیں سنتے لب و لہجہ سنتے ہیں۔ بعض مزاحیہ فنکار ان مقررین کی نقل پیش کرکے اپنے پروگرام کو منصۂ شہود پر لاتے اور اسے تالیوں کی گونج میں اختتام تک پہنچاتے ہیں۔ دیئے سے دیا جلنا اسے ہی کہا جاتا ہے۔ ہر لفظ کو علحدہ علحدہ (وقت کے ساتھ) ادا کرنے والے مقرر اگر چاہیں تو اپنی پوری تقریر ۲۰ منٹ کی بجائے ۷ منٹ میں ختم کرسکتے ہیں۔ ۱۳ منٹ کا وقت تو الفاظ چبانے میں صرف ہوتا ہے۔ تقریر صرف ایک تہائی ہوتی ہے۔

کالج کے کسی پروفیسر کو تقریر کرنے کا موقع دیا جائے تو خواہ موضوع کچھ ہو اور بولنے کے لیے مواد کچھ نہ ہو تب بھی وہ کم سے کم ۴۵ منٹ ضرور بولیں گے کیونکہ کالج میں جو بھی پیریڈ ہوتے ہیں وہ ۴۵ منٹ ہی کے ہوتے ہیں۔ یہ پروفیسر صاحب کی تقریر نہیں عادت ہوتی ہے۔ پروفیسر مقررین اپنے سامعین کو طالب علم ہی سمجھتے ہیں اور اپنی ہر بات کی تفہیم کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ تکرار ان کی تقریر کی خوبی ہوتی ہے۔ سامعین کو اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آجاتا ہے۔ کچھ گوشوں سے طرح طرح کی آوازیں بھی آتی ہیں لیکن مقرر ان آوازوں کا بھی عادی ہوتا ہے۔

کسی ادبی سمینار میں پروفیسر صاحبان اپنا مقالہ لکھ کر لاتے ضرور ہیں۔ کاغذات پوڈیم پر رکھتے بھی ہیں۔ ایک عینک اُتار کے اور دوسری عینک لگا کر اِن کاغذات پر نظر بھی ڈالتے ہیں لیکن مقالہ پڑھتے نہیں۔ تقریر کرتے ہیں۔ پڑھنا تو وہ کب کا ترک کرچکے ہیں۔

خواتین کی تقریریں کافی دلچسپی بلکہ دل جمعی سے دیکھی جاتی ہیں۔ صدرِ جلسہ کا بھی زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔ ان کی تقریر کے دوران سامعین جماہی یا انگڑائی استعمال نہیں کرتے۔

ملک اور قوم کی ضروریات کی فہرست بڑی طویل ہوتی ہے اور اس فہرست میں ایک اچھے مقرر کا نام اہم ضرورتوں میں شامل ہوتا ہے۔ یہ مقرر وقفے وقفے سے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ قحط الرجال ہوتا ضرور ہے۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ کوئی معقول آدمی دکھائی ہی نہ دے۔ شاعر نے جب کہا تھا کہ ایسے لوگوں کے لیے پھرتا ہے فلک برسوں تو شاعر سے بنیادی غلطی یہ ہوئی تھی کہ اس نے فلک کو محوِ گردش بتایا تھا جب کہ ایسے لوگوں کی تلاش میں زمین گھومتی ہے۔ وہی زمین جو اِن دنوں بے گناہوں کے خون سے لالہ زار بنی ہوئی ہے۔ خون آلودہ خاک کے پردے سے کسی اچھے مقرر کے پیدا ہونے کی توقع نہیں کرنی چاہیئے۔ اِس خاک کے پردے سے جو بھی نکلے گا یا تو خار ہوگا یا خونخوار۔

ہم نے کیا کیا نہ کیا — بیوی سے جھگڑا نہ کرنے کے لیے

نریندر لوتھر
(حیدرآباد)

ہم نے ریڈیو والوں سے پوچھا کہ اس عنوان پر کچھ کہنے کے لیے ہمیں ہی کیوں چنا گیا۔ کیا ہمارے گھر کی نشریات ان تک پہنچ چکی ہیں — انھوں نے جواب دیا کہ آپ بے فکر ہو کے کچھ بھی کہہ دیجیے۔ مذاق مذاق میں کہی بات کا کوئی برا نہیں مناتا —— یہ آپ ہمیں بتا رہے ہیں — زندگی بھر ہماری مذاق مذاق میں کہی گئی باتوں کا ہی برا منایا گیا۔ کیوں کہ ہم میں سنجیدگی سے بات کرنے کی نہ تو اہلیت ہے اور نہ ہی اس کی قدر و قیمت —— جب ہم نے بیگم کو بتایا کہ ریڈیو والے ہمیں اس موضوع پر کچھ لکھنے کے لیے کہہ رہے ہیں تو انھوں نے فوراً منع کر دیا۔ دراصل انھوں نے ہمیشہ ہماری ہر تجویز پر "نہیں" کہا ہے۔ سوائے ایک بار کے۔ وہ جب پہلے پہل ہم نے شادی کی تجویز کی تھی تو انھوں نے "ہاں" کہا تھا اس کے بعد کا رلائل کا "دائمی انکار" ہی ملا —

بیگم نے پوچھا —— " یہ ریڈیو والوں کو کیا دل چسپی ہے۔ کسی کی نجی زندگی کی تفصیلات سے ۔" پھر ذرا سوچ کر بولیں "پہلے یہ بتائیے کہ ان کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ ہم میں جھگڑا ہوتا ہے؟ آپ نے ضرور گھر کا بھید کھولا ہوگا۔ میں نے آپ سے لاکھوں بار کہا ہے کہ گھر میں سو باتیں ہوتی ہیں۔ ہر بات کا باہر ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

یہ لاکھ بار والی بات مبالغہ آمیزی ہے۔ پچیس سال میں اگر لاکھ بار کہا جائے تو دن میں سو بار سے بھی زیادہ ہوا۔ ہماری بیگم کے لیے بھی یہ ذرا زیادہ تعداد ہے۔ ہمارا خیال ہے اسے آسانی سے دس سے تقسیم کیا جا سکتا ہے کیوں کہ لاکھ بار کہنے کے لیے بیگم کے ہاں اور لاکھوں باتیں ہیں۔ پھر یہ دن میں اتنا وقت کہاں؟

"آپ نے ان سے یہ کیوں نہ کہا کہ ہمارا آپس میں جھگڑا ہوتا ہی نہیں۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتی تو یہی جواب دیتی۔"

دراصل میں نے بھی پہلے یہی جواب دیا تھا کہ یہ عنوان ہم پر لاگو نہیں ہوتا۔ ہم کبھی جھگڑا نہیں کرتے بلکہ میں تو ہر آتے جاتے شخص سے بھی یہی کہتا رہتا ہوں کہ ہم کبھی جھگڑا نہیں کرتے۔ لیکن ریڈیو والوں میں سب شادی شدہ ہیں۔ انھوں نے میرے اس جواب پر صرف اتنا ہی پوچھا "تو کیا آپ کی شادی

نہیں ہوئی ؟"
ہم نے احتجاجاً کہا ـــــ "دیکھیے بار بار آپ یہ سوال کیوں دہراتے ہیں ؟
انھوں نے جواب دیا۔ "اس میں کوئی ذاتی بات نہیں۔ آپ کو صرف علامت کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ تمام خاوندوں کی نیابت کریں۔"
ہم نے ذرا غور کیا ـــــ اپنی پچیس سالہ ازدواجی زندگی پر طائرانہ نظر ڈالی۔ وہ وقت یاد آیا۔ جب بیگم کو ابھی کھانا پکانا نہیں آتا تھا۔ پہلی بار اپنے ہاتھ سے کھانا بنایا تھا ـــــ ہم نے کھایا تو ہیضہ کا زبردست حملہ ہوا۔ ٹھیک ہوئے تو پھر دیبا ہی کھانا بنایا۔ وہ کھانا کتا کھا گیا۔ بیگم روتی ہوئی آئیں اور شکایت کی کہ آپ کے لیے بنایا ہوا خاص کھانا کتا کھا گیا۔"
ہم نے تسلی دی۔ "کوئی بات نہیں۔ ہم آپ کے لیے ایک اور کتا لے آئیں گے۔" اور واقعی لے آئے ـــــ اور وہ بھی ایک بار نہیں کئی بار۔
پھر ایک بار ہم نے کسی ہوٹل میں بہت ہی لذیذ کھانا کھایا ـــــ بیگم نے کہا،
"اگر میں آپ کے لیے ایسا ہی کھانا بنا دوں تو مجھے آپ سے کیا ملے گا۔"
ہم نے کہا ـــــ "ہماری لائف انشورنس کی پالیسی۔"
جھگڑا نہیں ہوا۔
پھر ایک بار شروع شروع میں رات سونے سے پہلے بیگم نے پوچھا ـــــ "سب کچھ بند کر دیا آپ نے۔"
"ہاں ـــــ جو کچھ بھی بند ہو سکتا تھا ـــــ"
"مطلب۔"
"سوائے تمھاری زبان کے سب کچھ بند کر دیا۔"
جھگڑا ہوا ـــــ
پھر ہم ڈاکٹر کے پاس گئے بلکہ لے جائے گئے۔ بیگم نے ہماری بیماری کی تمام تفصیلات ڈاکٹر کو بتلائیں۔ ڈاکٹر نے ہمارے لیے آرام تجویز کیا اور ساتھ ہی جلدی نیند آنے کی دوائی دی۔ جو بیگم کے لیے تھی ـــــ اس پر جھگڑا ہوا ـــــ ڈاکٹر کے ساتھ۔
پھر ایک دن ہم اونچی آواز میں "مارک ٹوین" (MARK TWAIN) پڑھ رہے تھے۔ مارک ٹوین کو اونچی آواز میں ہی پڑھنے کا مزا آتا ہے۔ دبی زبان میں پڑھا جائے تو دوسروں کو تعجب ہوتا ہے کہ یہ شخص خواہ مخواہ کیوں مسکرا رہا ہے ؟ بیگم عین اس وقت کمرے میں داخل ہوئیں جب ہم اس فقرہ پر پہنچے۔
"زیادہ محبت سے نفرت ـــــ اور بچے پیدا ہوتے ہیں۔"
"کوئی اچھی رائے بھی قائم کی آپ نے کبھی ؟"
"یہ میری رائے نہیں۔ مارک ٹوین کی رائے ہے۔"
"جی ہاں ـــــ" میں خوب جانتی ہوں۔ میں آپ کی زندگی کو ایک کھلی کتاب کی طرح پڑھ سکتی ہوں۔"
"ضرور پڑھیے۔ لیکن اونچی آواز میں نہیں۔"

جھگڑا ہوتے ہوتے بچ گیا۔ یہ کم بخت مارک ٹوین۔ ہم نے اسی لیے مولانا حالی کو اونچی آواز میں کبھی نہیں پڑھا۔ ایسے بزرگوں کے لیے آج کل کی نسوانی آزادی پسند عورتوں کے پاس ایک تین لفظی لقب ہے۔ خواہ مخواہ کیوں مولانا کی روح کو تکلیف دی جائے۔

ایسے اور کئی واقعات کے بارے میں ہم سوچ رہے تھے۔ ان جھگڑوں کے بارے میں جو ہوتے ہوتے رہ گئے جو رہتے رہتے ہو گئے۔

اب بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے کہ ہم ایسی ہی باتوں کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ کھانے کی میز پر بیٹھے ہیں ـــــ سوچ میں غرق بیگم پوچھتی ہیں "دماغ کہاں ہے۔ کیا سوچ رہے ہو"

"کچھ نہیں"۔ ہمیشہ ایک ہی جواب۔

"اتنا مت سوچا کرو۔ خاص کر کھانے کی میز پر"

"جی ہاں ـــ ہمارے والدین کے گھر کھانے کی میز پر بولنا منع تھا۔ اب ہمارے گھر سوچنے پر بھی پابندی لگ گئی ہے۔ کون کہتا ہے ہم نے ترقی نہیں کی"

ہم نے خیال کی چڑیا کو غلیل ماری۔ بچاری تڑپ کر نیچے گر پڑی۔ ہم بھی دھڑام سے زمین پر آن پڑے۔ ہم نے ہڑبڑا کر کہا "یہی سوچ رہا تھا کہ ریڈیو والوں کو کیا جواب دوں"

بیگم نے تسلی دلائی "اگر آپ کو کچھ کہنا لازمی ہے تو کہہ دیجیے کہ آپ نے جھگڑا نہ کرنے کے لیے کبھی کچھ نہیں کیا۔ سب کچھ ہمیشہ میں ہی کرتی ہوں"

سنا آپ نے ـــ ریڈیو والو ـــ سامعین۔ نوٹ کر لیجیے۔ ہمیشہ اور سب کچھ بیگم ہی کرتی ہیں۔

مرزا مصطفیٰ علی بیگ
حیدرآباد

کرفیو میں ہے

درد دل کی ہر دوا کرفیو میں ہے
آج کل دارالشفاء کرفیو میں ہے
احتجاجاً پھول اب کھلتے نہیں
کیونکہ اب بادِ صبا کرفیو میں ہے
اِک ہیلی کاپٹر مجھے دیدے خدا
ان کے گھر کا راستہ کرفیو میں ہے
ہنس رہا ہوں میں سیاست کی ہنسی
میرے دل کا قہقہہ کرفیو میں ہے
اب رقیبوں سے مجھے خدشہ نہیں
کیونکہ میری دِلرُبا کرفیو میں ہے
شور ہے چمگادڑوں کا رات بھر
صبح کوئل کی صدا کرفیو میں ہے
مل رہی ہے سب کو اک جیسی سزا
جیل سے جو بچ گیا کرفیو میں ہے
ہیڈ پہ اُن ۔۔ ٹائیٹ جوڑا یوں لگے
جیسے اک کالی گھٹا کرفیو میں ہے
وار پہ خنجر کے پابندی نہیں
ہاں مگر دستِ دُعا کرفیو میں ہے
اُس صنم کا ساتھ اور یادِ خُدا
دونوں عالم کا مزا کرفیو میں ہے
اس لیے ٹینشن میں ہے میری غزل
شعر کا ہر قافیہ کرفیو میں ہے

پاپولر میرٹھی

بہت ضروری ہے

جوان بازو میں طاقت بہت ضروری ہے
ہمارے بچوں کو کسرت بہت ضروری ہے
تیری نگاہِ عنایت بہت ضروری ہے
لگی ہو پیاس تو شربت بہت ضروری ہے
اُنھیں کوئی بھی نہیں پوچھتا جو بزدل ہیں
یقین جانئے ہمت بہت ضروری ہے
پولیس والوں کو میرا یہ مشورہ دے دو
ستم گروں کی مرمت بہت ضروری ہے
اگر ہو خرچ زیادہ قلیل ہو تنخواہ
تو یہ سمجھ لو کہ رشوت بہت ضروری ہے
جوان شخص اگر ہو تو کوئی بات نہیں
مگر بڑھاپے میں عورت بہت ضروری ہے
کہیں نہ شانِ ترنم پہ حرف آجائے
میاں گلے کی حفاظت بہت ضروری ہے
تم اپنا عیب چھپانا ہی چاہتے ہو تو پھر
جنابِ شیخ کی دعوت بہت ضروری ہے
سُنا یہ ہے کہ زمانے کا غم بھلانے کو
شراب پینے کی عادت بہت ضروری ہے
اے پاپولر کرو ہموار ٹی وی والوں کو
ہمارے دور میں شہرت بہت ضروری ہے

دلیپ سنگھ
(نئی دہلی)

ابھی تو لوگ اکثر رستے میں آمائے روشنی کرکے

کچھ دن پہلے کی بات ہے میں
دلی کی اجمل خاں روڈ پر ٹہل رہا تھا کہ میں نے ایک جگہ لوگوں کی ایک
بھاری بھیڑ دیکھی میں فوراً ادھر کو ہولیا۔

آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ بھیڑ ہمارے ہاں دو مقامات پر اکٹھی ہوتی ہے۔ یا تو وہاں جہاں کوئی چیز سستی بک رہی ہوتی ہے یا پھر وہاں جہاں کوئی تماشہ ہو رہا ہوتا ہے۔ ایسی جگہوں پر جانا بہت ضروری ہے۔ اگر کوئی چیز سستی مل رہی ہے تو وہاں جا کر آپ کچھ پیسے بچا سکتے ہیں۔ اور اگر تماشہ ہو رہا ہے تو بغیر کچھ خرچ کیے آپ کی تفریح ہو جائے گی۔

اس سلسلے میں مجھے ونسٹن چرچل کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ چرچل کہیں تقریر کرنے گیا تو دیکھا کہ ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ چرچل کے ایک دوست نے بھیڑ کو دیکھ کر کہا:

"یار ونسٹن، قسمت والے ہو کہ تمھیں اتنے لوگ سننے آئے ہیں۔" چرچل نے جواب دیا "ہاں یہ تو ہے، لیکن اگر مجھے اس ہال میں آج پھانسی دی جا رہی ہوتی تو مجمع اس سے دگنا ہوتا کیوں کہ پھانسی زیادہ تفریح کا سامان بنتی۔"

چرچل اچھی طرح جانتے تھے کہ لوگ بنیادی طور پر تماشہ دیکھنے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔ تماشہ چاہے سیاسی لیڈروں کی وجہ ہو یا بندروں کی اچھل کود سے۔ چناں چہ میرے قدم خود بہ خود اس بھیڑ کی طرف اٹھ گئے۔

قریب جا کر میں نے دیکھا دو شخص آپس میں لڑ رہے تھے اور کوئی دو سو کے قریب لوگ انہماک سے ان کی لڑائی دیکھ رہے تھے۔ تماشبینوں کی تعداد سے آپ کو حیرانی نہیں ہونی چاہیے۔ سو ڈیڑھ سو لوگ تو ہمارے ہاں مرغوں اور مینڈھوں کی لڑائی دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور یہاں تو ماشاء اللہ انسان لڑ رہے تھے۔

تماشہ کتنا ہی دل چسپ کیوں نہ ہو کوئی نہ کوئی شخص اسے بگاڑنے کی کوشش سے باز نہیں آتا۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ ابھی دونوں لڑنے والوں کے معمولی خراشیں ہی آئی تھیں کہ ایک بے وقوف بزرگ لڑائی کے میدان میں کود پڑا۔ اور دونوں کے درمیان کھڑا ہو کر کہنے لگا: "آپ دونوں میں جو بھی جھگڑا ہے، اسے حل کرنے کے لیے لڑائی کا راستہ مت اپنائیے۔ آپ اپنے جھگڑے کا حل بات چیت سے بھی ڈھونڈ سکتے ہیں۔" دونوں نے حیرانی سے اس کا منہ تکتے ہوئے کہا: بزرگوار

آپ کیا کہہ رہے ہیں، بات چیت سے ہی تو جھگڑا شروع ہوا۔ ہم دونوں اس فٹ پاتھ پر اپنا اپنا سامان بیچتے ہیں۔ جھگڑا اس بات پر ہے کہ فٹ پاتھ کا یہ کونہ میرا ہے یا اس کا۔ پہلے اس مسئلے پر بات چیت ہوئی۔ پھر تو تو میں میں ہوئی۔ پھر گالی گلوج ہوئی۔ پھر ہم نے تشدد کا سہارا لیا۔ اب آپ فرما رہے ہیں کہ مسئلہ حل کرنے کے لیے ہم بات چیت کا سہارا لیں۔ بزرگوار ایک لمبی بحث کے بعد تو اس مقام پر پہنچے ہیں۔ آپ ہمیں پھر سے پیچھے ڈھکیل رہے ہیں۔

میں نے جب دیکھا کہ لڑائی شاید آگے نہ بڑھ سکے، میں وہاں سے کھسک آیا۔ جب تماشہ ہی نہیں تو وہاں تماش بین کا کیا کام۔ لیکن بزرگوار کی بات میرے ذہن میں ہچکولے کھاتی رہی کہ کیا جھگڑوں کا حل بات چیت یا مباحثے میں ڈھونڈا جا سکتا ہے؟

مجھ میں جو تھوڑی بہت سیاسی سمجھ بوجھ ہے وہ کافی ہاؤس کی دین ہے۔ کالج کے زمانے میں کسی نے مشورہ دیا تھا کہ صحیح تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہو تو کافی ہاؤس میں بیٹھا کرو۔ پہلے ہی دن جس گروپ میں جا کر بیٹھا۔ وہاں کمیونزم اور مذہب پر بحث چل رہی تھی۔ اپنی طرف سے مناسب موقعہ دیکھ کر میں نے بھی چونچ کھولی اور کہا: کمیونزم میں لاکھ برائیاں ہوں لیکن انسان دوستی کا جو درس آپ کو اس سے ملتا ہے وہ مذہب میں نہیں ملتا۔ مذہب تو انسانوں کو بانٹنے میں مصروف رہتا ہے۔" اس پر ایک صاحب نے جن کی شکل و صورت سے عیاں تھا کہ ان کا ایک خاص مذہب سے تعلق ہے مجھ سے مخاطب ہوئے اور کہا ذرا باہر آؤ۔

" باہر کیوں؟ میں نے پوچھا " آپ کے پاس اگر میری بات کا جواب ہے تو یہیں دیجیے۔ کہنے لگے: " یہاں کراکری اور کرسیوں کے ٹوٹنے کا ڈر ہے۔ باہر چلو گے تو صرف تمھاری ہڈیاں ٹوٹیں گی اور کچھ نہیں"۔

اس واقعے کے بعد یہ بات میرے ذہن میں اچھی طرح بیٹھ گئی کہ کافی ہاؤس میں بیٹھ کر بحث کرتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنے ساتھیوں کے سیاسی رنگ روپ کو پہلے پہچان لیں۔ یہاں لوگ اپنے نقطہ نظر بدلتے نہیں صرف اس کی تشریح کرنے آتے ہیں۔

یہی حال مذہبی بحث کا ہے۔ ہمارے سیاسی رہنما کہتے ہیں کہ مذاہب تو مختلف راستے ہیں منزل تو ہم سب کی ایک ہے۔ یہ تمام راستے اسی منزل پر پہنچانے کے لیے وجود میں آئے ہیں۔

خیر یہ تو منزل پر پہنچ کر ہی پتہ چلے گا کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ فی الحال تو اوپر والے کا شکر بجا لانا چاہیے کہ راستے الگ الگ ہیں۔ راستہ اگر ایک ہی ہوتا تو منزل پر کوئی قسمت والا ہی صحیح سلامت پہنچ پاتا۔

گھر گرہستی کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ میاں بیوی کی زندگی میں بحث کا مقام وہی ہے جو کھانے کے ساتھ چٹنی کا ہوتا ہے۔ میاں بیوی کی زندگی میں اگر بحث نہ ہو تو ازدواجی زندگی کا لطف جاتا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بات صحیح ہو لیکن میں نے دیکھا کہ بحث گھروں میں معمولی بات سے شروع ہوتی ہے کہ سالن میں نمک زیادہ ہے یا کم اکثر ایسے مقام پر پہنچ جاتی ہے جہاں خاوند لاٹھی اور بیوی بیلن اٹھا لیتی ہے اور اکثر بحث انہی ہتھیاروں کی وجہ سے اختتام کو پہنچتی ہے۔ جب ایک فریق ہسپتال ہی چلا جائے گا تو پھر کیسی بحث اور کون سی بحث

ادبی بحث عام طور پر ایسے ماحول میں ہونی چاہیے جہاں نوبت ہاتھا پائی تک نہ آئے۔ لیکن ہم نے وہاں بھی پگڑیاں اترتے اور جوتے چلتے دیکھے ہیں۔ اس سلسلے میں خود ہمارے ساتھ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس پر مرنا

غالب کا یہ مصرعہ آسانی سے فٹ کیا جا سکتا ہے۔

بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ہمسایہ کہ ہمارے ایک شاعر دوست تھے جن کی صحیح پہچان یہ تھی کہ وہ ایک بڑے سرکاری افسر تھے انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی رشوت نہیں لی۔ اگر کوئی سائل ان کے رحم و کرم کا بدلہ چکانا چاہتا تو وہ اُسے کہتے کہ بھائی گھر میں شاعری کی ایک محفل کیوں نہیں منعقد کرتے۔ شاعر کلام سنا کر اور سامعین سن کر خوش ہوں گے اور تمھیں دعائیں دیں گے۔ سائل محفل کا انتظام کرتا جس میں شراب اور سامانِ خورد و نوش اس کا ہوتا اور شعرا و سامعین افسر مذکور کے ہوتے۔ ایسی ہی ایک محفل میں ہم بھی مدعو تھے۔ نشے کی فراوانی ہی ہو گی کہ ہم سچ بولنے کے موڈ میں آ گئے۔ ہمارے دوست نے شعر پڑھا اور ہم نے کہا کہ وزن سے خارج ہے۔ اس نے ایک اور پڑھا اور ہم نے کہا کہ شعر مہمل ہے افسر مذکور نے میزبان کی طرف دیکھا اور میزبان نے اپنے نوکروں کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہوئے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اپنے آپ کو سڑک پر اس حالت میں پایا کہ تخنہ اس جگہ پر نہیں تھا جہاں معمول کے مطابق اُسے ہونا چاہیے تھا۔ مرزا غالب تو صرف بے آبرو ہو کر نکلے تھے ہم بے آبروئی کے ساتھ زخمی حالت میں نکلے تھے۔

زندگی کے سفر میں چلتے چلتے ہم تو اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مسائل کا حل بات چیت کے ذریعے تبھی نکلتا ہے۔ جب فریقین ایک دوسرے کی بات سننے اور اسے برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ اپنے بیان کے ثبوت میں میں ایک واقعے کا ذکر کرنا چاہوں گا جو میرے بچپن میں ظہور پذیر ہوا تھا۔

میں موجودہ پاکستان کے ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ ہمارے گاؤں سے چار میل دور جنگل بیابان میں ایک مسجد تھی۔ اس مسجد کے نزدیک کوئی آبادی نہیں تھی۔ قیاس غالب ہے کہ کسی اہلِ ثروت نے اسے اس لیے تعمیر کروایا ہوگا کہ کوئی مسافر اگر وقتِ نماز اس کے پاس سے گزرے تو نہ صرف نماز پڑھ سکے بلکہ کچھ دیر تک سستا بھی لے۔ لیکن پتہ نہیں کس طرح یہ بات ہمارے علاقے میں پھیل گئی کہ یہ مسجد مکہ مدینہ سے چل کر آئی ہے اور وہاں آ کر قیام کیا ہے۔

میرے والد کا بھی میری طرح مسخروں میں شمار ہوتا تھا۔ ایک دن کہیں اس مسجد کا ذکر آیا تو اپنے پڑوسی عنایت اللہ سے کہنے لگے "یار عنایت تم میں ذرا بھی عقل ہو تو بتاؤ کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک مسجد مکہ مدینہ سے چلے۔ چلتے چلتے وہ اس جنگل بیابان میں پہنچے اور پھر یہاں ڈیرا جمالے۔ ایسا ممکن ہے کیا؟"——— عنایت اللہ نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا: "سردار جی، میں مانتا ہوں کہ یہ کہانی شاید سچی نہیں ہے لیکن آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ آپ جب کہتے ہیں کہ ہنومان پورا پہاڑ اپنی پیٹھ پر اٹھا لایا اور راستے میں ایک کنکر بھی گرا نہیں تو ہم نہیں کہتے کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ ہماری مسجد کے سفر پر یقین کیوں نہیں کرتے۔"

میرے والد نے ہنستے ہوئے کہا: "یار عنایت تم نے سمجھایا ہے تو اب مجھے بھی یقین ہو گیا ہے کہ یہ مسجد مکے سے چل کر آئی ہے۔"

بات چیت سے مسئلوں کا حل تلاش کرنا ہو تو پہلے دلوں میں محبت کی شمع جلا لینی چاہیے۔ راستہ صاف سجھائی دے جاتا ہے۔ لوگ بات چیت میں مسائل کا حل تو تلاش کرنا چاہتے ہیں لیکن شمعیں نہیں جلانا چاہتے۔ شاید اس لیے کہ شمعیں اتنی سستی نہیں رہیں جتنی کبھی تھیں۔ ●●

ابو جی مرے ابو جی

ابو جی مرے ابو جی !
امی جی سے دبو جی !

سب پر رعب جماتے ہیں
امی سے گھبراتے ہیں
سب کو آنکھ دکھاتے ہیں
ان سے آنکھ چراتے ہیں
کپڑے بھی سلواتے ہیں
شاپنگ بھی کرواتے ہیں
زیور تک بنواتے ہیں
اپنی شرٹس اور پتلونیں
سنڈے سے لے آتے ہیں

ابو جی مرے ابو جی !
امی جی سے دبو جی !

عنایت علی خاں
نائب پروفیسر مسلم کالج حیدرآباد (سندھ)

ڈاکٹر راہی قریشی
گلبرگہ یونیورسٹی۔ گلبرگہ

غزل

لوگوں نے جہاں انڈے پراٹھے کھائے
اس بزم میں ہم پہنچے تو بھیجے کھائے
دعوت میں پکوڑے، نہ سموسے کھائے
سب چھوڑ کے بیگن ہی بگھارے کھائے
پھل کھائے وہاں جاکے، نہ میٹھے کھائے
جو نیم چڑھے تھے، وہ کریلے کھائے
بیگم کو جو دیکھا، برا چہرہ بگڑا
انگور کوئی جیسے کہ کھٹے کھائے
اس کثرتِ اولاد سے گھر میں ہر سو
شب میں ہی نہیں دن میں بھی دھکے کھائے
رمضان میں دن رات ملے جو چندے
نیتاؤں نے دن رات وہ چندے کھائے
عہدہ تھا تو کیا کیا نہیں کھایا، لیکن
پنشن جو ہوئی، گلگلے گڑ کے کھائے
تقریر کے دوران جو برسے کچھ دیر
گھر جاکے وہی انڈے ٹماٹے کھائے
بریانی پہ راہی کی نظر تھی، لیکن
جتنے بھی وہاں بیٹھے تھے، پہلے کھائے

دُوردرشن کے بور بچن

پرویز یداللہ مہدی
(بمبئی)

کوئی تیس سال بھر پہلے کی بات ہے ـــــ

" غریب خانے کا دس بائی دس کا ڈرائنگ روم جو صبح تک کسی سہاگن کی سیندور بھری مانگ کی طرح بھرا بھرا اور بارونق تھا، شام میں گھر لوٹنے پر کسی بیوہ کی خالی کلائی کی طرح سونا سونا نظر آیا ہم نے ہڑبڑا کر بیگم کو آواز دی اور پھر محترمہ کے نمودار ہوتے ہی تذبذب آمیز لہجے میں پوچھا۔ بیگم یہ اپنا ہی ڈرائنگ روم ہے نا۔ ؟" جواب میں محترمہ نے پہلے تو مشکوک نظروں سے ہمارا جائزہ لیا پھر تشویش ناک لہجے میں بولیں۔ "سنا تھا گرمیوں میں لوگوں کا دماغ پٹڑی سے اتر جاتا ہے، آپ تو سردیوں میں بہکی بہکی باتیں کرنے لگے، آج آپ کو اپنا ہی ڈرائنگ روم پہچاننے میں تکلف ہو رہا ہے۔ خدانخواستہ کل کلاں کو مجھے پہچاننے سے انکار کروگے تو اس عمر میں کہاں جاؤں گی کیا کروں گی۔ ؟"

ہم نے حسرت آمیز لہجے میں کہا "میرے ایسے نصیب کہاں بیگم کہ اتنی آسانی سے بیس سال پہلے سرزد ہونے والی غلطی کو بھول جاؤں! ہماری اس کراری چوٹ پر محترمہ نے جوابی چوٹ کی۔ اب بھی وقت ہے سرکار اپنی غلطی سدھاریے۔"

ہم نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا "یہ وقت غلطی سدھارنے کا نہیں، ہمارے سدھارنے کا ہے اور پھر بات صرف اس ایک غلطی تک ہوتی تو شاید سدھار بھی لیتا۔ یہاں تو آپ کے تعاون سے اس دوران میں مزید تین غلطیاں سرزد ہو چکی ہیں بلکہ ماشاءاللہ ہماری خسترکہ غلطیاں خود ہماری طرح غلطی کرنے کے موقف میں بھی آچکی ہیں۔ خیر یہ باتیں چھوڑیئے اور بتایئے کہ اپنا ڈرائنگ روم اتنا خالی خالی کیوں لگ رہا ہے یہاں کا سینٹر ٹیبل، گلدان، ایش ٹرے، شوکیس، اس میں کی کراکری دیواروں پر ٹنگی ہماری شادی کی تصویریں جن میں آپ کے چہرے پر فتح و نصرت اور ہماری صورت پر شرمندگی و ندامت کے پکے رنگ نمایاں تھے، کہاں گئیں؟ کون لے گیا یہ سب چیزیں۔؟

محترمہ نے مسکرا کر مطلع فرمایا۔

یہ ساری چیزیں

میں نے اسٹور روم میں منتقل کر دی ہیں ـــ !

ہم نے حیرت سے پوچھا "وہ کس لیے ـــ ؟"

بولیں ـــ "اس لیے کہ اس اتوار سے مہابھارت، شروع ہو رہا ہے!" اس عجیب و غریب انکشاف پر ہمیں مزید حیرت ہوئی، ہم نے کہا ـــ بیگم مہابھارت تو اب سے پانچ ہزار سال بلکہ اس سے بھی بہت پہلے لڑی اور بھگتائی جا چکی ہے، یہ تم کس نئی مہابھارت کا ذکر کر رہی ہو؟" بولیں ـــ "میں نئے ٹی وی سیریل مہابھارت کی بات کر رہی ہوں! ہم نے کہا ـــ "ٹھیک ہے لیکن آپ کے اس نئے ٹی وی سیریل مہابھارت کا اپنے ڈرائنگ روم کے فرنیچر، کراکری وغیرہ سے کیا تعلق ہے بیگم؟"

بولیں ـــ "فی الحال تو کوئی تعلق نہیں لیکن اس کے ٹیلی کاسٹ، ہوتے ہی آپ کی اولاد خود ان ساری چیزوں سے اس کا تعلق جوڑنے گی اور اس تعلق کے جڑتے ہی گھر میں ایسی توڑ پھوڑ مچے گی کہ کوئی چیز صحیح سلامت نہیں بچے گی! جس زمانے میں رامائن ٹیلی کاسٹ ہوتی تھی آپ کی اولاد اپنے دوستوں کی فوج کو اکٹھا کر کے رام چندر جی کی فاتح سینا اور راون کی راکھشس سینا کے مابین لڑی جانے والی لڑائیوں کا کس طرح آموختہ کیا کرتی تھی، میں تو کبھی بھول ایسا گھمسان کا رن اصلی رامائن میں بھی نہیں پڑا ہوگا۔ رامائن میں چلنے والے تیروں کی بوچھار نے بھی شاید اتنی کراکری نہیں توڑی ہوگی جتنی کراکری آپ کی اولاد کی تیر اندازی نے دیکھتے ہی دیکھتے شہید کر ڈالی۔ آپ کی اولاد تو سدھرنے والی ہے نہیں ـــ جب آپ آج تک نہیں سدھرے تو آپ کی اولاد کیا خاک سدھرے گی، اسی لیے میں نے گھر کی بچی کچھی کراکری اور فرنیچر کو مہابھارت کی زد سے محفوظ رکھنے کا پہلے ہی بندوبست کر لیا ہے!"

اس خالص ازدواجی منظر سے مضمون شروع کرنے کے پیچھے ہمارا مقصد دور درشن کے سیریلس کی برائی کرنا نہیں بلکہ اس بہانے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دور درشن نے نئی نسل کو خود اس قدر قریب کر لیا ہے کہ وہ ماں باپ سے بہت دور ہو گئی ہے۔ اگر آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں تو ٹی۔ وی کے کسی بدترین پروگرام کے دوران میں اپنے فرزند ارجمند، یا دختر نیک اختر سے پانی کا ایک گلاس مانگ کر دیکھیے کیسا ردِ عمل ہوتا ہے؛ پہلے تو آپ کی سعادت مند اولاد کے کانوں پر جوں نہیں رینگے گی، اس طرح ان جان بن جائیں گے جیسے آپ کی بات سنی ہی نہ ہو، آپ دوبارہ اپنا سوال دہرا کر دیکھیے، اس بار با دلِ ناخواستہ پل بھر کو پلٹیں گے ضرور لیکن آپ کو صرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھیں گے اور پھر واپس ٹی وی پروگرام کی طرف متوجہ ہو جائیں گے، یہ اصل میں عقل مند ماں باپ کے لیے ایک خاموش وارننگ ہوگی کہ خبردار آئندہ پانی مانگ کر ہمارے اور دور درشن کے بیچ دیوار بننے کی کوشش کی تو ہم تمھیں گھاٹ گھاٹ کا پانی پلا دیں گے ـــ اس وارننگ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کی تمام ہمت جواب دے جائے گی اور آپ بیٹھی جگہ شرم سے پانی پانی ہو جائیں گے یہی سوچ کر کہ صرف پانی ہی تو مانگا تھا غذا تو نہیں مانگی تھی ـــ !

نونہالانِ قوم کی روز افزوں نافرمانیوں میں خود ان کا اتنا قصور نہیں جتنا ہمارا ہے۔ ظاہر ہے جو پیڑھی دور درشن کی سیڑھی پر چڑھ کر اپنا قد بلند کر رہی ہے اس سے فرماں برداری کی توقع رکھنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

ویسے بھی وہ زمانے لد چکے جب بچوں کے تعلق سے بڑوں کو یہ خوش فہمی ہوا کرتی تھی کہ آج کا بچہ کل کا نیتا ہوگا، دورِ حاضر کے ہونہار بروا نیتا نہیں "ابھنیتا" بننے کے خواب دیکھتے ہیں۔ اگلے وقتوں میں بچوں کو قوم کی امانت سمجھ کر گھر کے بڑے بزرگ اور اساتذہ کرام ان کی کردار سازی پر اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیتے تھے، اب یہ ذمہ داری دوردرشن نے اپنے سر لے لی ہے گویا اب دوردرشن قوم کی امانت کی کردار سازی کی ضمانت بن گیا ہے چنانچہ جو کچھ بتاتا ہے، سکھاتا ہے، دکھاتا ہے، قوم کی امانت ..... وہی سیکھتی ہے، دیکھتی ہے بلکہ فرصت کے اوقات میں اس کی نقل بھی کرتی ہے۔ اس کا عملی اندازہ ہمیں کچھ عرصہ پہلے اپنے فرزند کے ایک ننھے دوست کے توسط سے ہوا۔ اس روز اتفاق سے ہمارے فرزند اپنی ننھیال گئے ہوئے تھے اس لیے ان کے ننھے دوست نے غریب خانے کے کئی چکر لگائے۔ ہر چکر میں برخوردار کے ہاتھ میں ہمیں ایک عدد گاجر ضرور نظر آئی جسے وہ بات بے بات کچر کچر چبا بھی رہے تھے بلکہ بات کم کر رہے تھے گاجر زیادہ چبا رہے تھے۔ یہی نہیں گاجر کے تازہ ایڈیشن سے پہلے جو پرانا ایڈیشن چبا چکے تھے اس کے باقیات الصالحات کی جگالی بھی فرما رہے تھے۔ اس روز اتفاق سے ہمارے فرزند کافی دیر گئے گھر لوٹے، اس سے پہلے کہ ہم ان کے ننھے گاجر خور، دوست کے بارے میں بتلاتے، برخوردار نے پوچھا "پپا میرے جانے کے بعد میرا دوست رفیق آکر کوئی کتاب دے گیا کیا۔ ہم نے کہا "نہیں بیٹے رفیق نام کا کوئی لڑکا تو نہیں آیا البتہ کرم چند نام کا ایک لڑکا کئی بار آکر تمھیں پوچھ گیا" برخوردار نے ہنستے ہوئے فرمایا "پپا 'کرم چند' ہی تو رفیق ہے ۔۔۔!"

ہم نے سٹپٹا کر کہا ۔۔ "کیا ۔۔؟ کرم چند ۔۔! رفیق ۔۔! یہ کیا چکر ہے بیٹے ۔۔؟"

برخوردار نے انکشاف کیا "چکر کچھ نہیں ہے پپا ۔ اصل میں رفیق کو ٹی ۔ وی سیریل کرم چند جاسوس بہت پسند ہے اسی لیے وہ خود کو کرم چند کہنے لگا ہے ۔۔! ہم نے پوچھا ۔۔ ایک بات بتاؤ بیٹے، یہ تمھارا کرم چند، میرا مطلب ہے رفیق گاجر بہت کھاتا ہے کیا ۔۔ ؟

برخوردار نے مسکرا کر کہا ۔۔۔ "پہلے نہیں کھاتا تھا لیکن اب سیریل والے کرم چند کو کھاتا دیکھ کر کھانے لگا ہے ۔۔۔ !"

ہم نے گمبھیر لہجے میں کہا ۔۔ تبھی سیزن کے باوجود ان دنوں گاجر اتنے مہنگے ہو گئے ہیں۔ لگتا ہے تمھارے دوست کی طرح اور بہت سارے کرم چند پیدا ہو گئے ہیں محلے میں ۔۔!

دوردرشن کا ایک کارنامۂ نمایاں یہ بھی ہے کہ اس کی ایجاد سے پہلے جو نونہال صحیح وقت آنے پر ہی "نونہال" ہوا کرتے تھے یعنی سنِ بلوغ کو پہنچا کرتے تھے وہ اب بفضل ٹی ۔ وی ترسیل و ابلاغ کے تمام مراحل وقت سے پہلے ہی طے کر لیتے ہیں۔ یہاں ہم اپنا ایک چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں۔ ذکر ایک شادی کی تقریب کا ہے جو کچھ روز قبل پڑوس میں ہوئی تھی جس میں اتفاق سے ہم نے بھی شرکت کی تھی اور اتفاق سے یکے از گواہانِ نکاح چنے گئے تھے محض اس اتفاق کی بنا پر کہ قاضی صاحب قبلہ صرف نکاح کی کارروائی کے سلسلے میں سنت کی اتباع کی سختی سے پابند تھے چنانچہ صرف باریش حضرات ہی کو بطور گواہ کے قبول فرماتے تھے اور ہم میں اتفاق سے یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود بلکہ چہرے پر صرف یہی ایک خصوصیت سب سے نمایاں ہے اور یوں ہمیں دلہن کا عندیہ لینے کی غرض سے دوسرے گواہ اور وکیلِ شادی کے ہمراہ اند[illegible] جانے کا اتفاق ہوا اور اس کے ساتھ ہی وہ عجیب وغریب تماشہ

بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا ۔ جیسے ہی دلہن نے کسمسا کر اپنی حنا مندی کا ہنکارا بھرا ' ایک چھ سالہ برخوردار ہاتھوں میں پھولوں کی مالا لیے بھیڑ کو چیر کر آگے بڑھے دلہن کے گلے میں مالا پہنائی اور پھر با آوازِ بلند بولے " بھابی اس مالا کے ساتھ ایک اور مالا کو نہیں بھولنا ' پہننے والی نہیں کھانے والی ــــ ! نابالغ برخوردار کے اس بالغانہ مشورے پر ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا اور ہمیں فوراً دوردرشن سے روزانہ دکھائی جانے والی تیس سکنڈ کی بہروپگنڈہ فلم یاد آگئی ' آپ سمجھ گئے ہوں گے ہمارا اشارہ کس فلم کی طرف ہے ــــــ لگے ہاتھوں ایک اور نونہال کی دوردرشن فہمی کا واقعہ سن لیجیے ۔ ہمارے ایک پڑوسی ہیں قاسم بھائی رسّی والا ' خاصے کثیر العیال آدمی ہیں ' بلکہ ان کے دبلے پتلے بل دار جسم کو دیکھتے ہوئے انھیں آدمی کے بجائے رسّی کہنا زیادہ مناسب ہوگا وہ بھی ایک ایسی رسّی جو جل چکی ہے ۔ صرف بل رہ گئے ہیں گھر میں چوں کہ کثرتِ اولاد کے جلوے انھیں اپنے تلوے زیادہ دیر ٹکانے کی اجازت نہیں دیتے اس لیے ہمیشہ سرِ راہے ملاقات کا شرف بخشتے ہیں اور جب بھی ملتے ہیں بغل میں جہازی سائز کا جھولا لٹکائے مارکٹ جارہے ہوتے ہیں یا مارکٹ سے آرہے ہوتے ہیں لیکن ایک روز ایسی حالت میں ملے کہ بغل میں جھولا تو خیر لٹکا ہوا ہی تھا منہ بھی لٹکا ہوا تھا بلکہ غور کرنے پر آخر الذکر اوّل الذکر سے زیادہ لٹکا ہوا نظر آیا ۔ اس سے پہلے کہ ہم حال چال دریافت کرتے موصوف نے اداس لہجے میں استفسار کیا ۔ آپ کی جان پہچان میں کوئی ٹی وی والا ہے ۔" ہم نے پوچھا ۔

" کیوں کیا ٹی ۔ وی بگڑ گیا ہے ۔ ؟ "

ٹی وی ٹھیک ہے ، گھر کا ماحول بگڑ گیا ہے ! اس سے پہلے کہ لونڈے پوری طرح ہاتھ سے نکل جائیں ٹی وی نکال دینا چاہتا ہوں ــــ ! " ہم نے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا تو آگے بولے ۔ " ابھی آج ہی کی بات لیجیے وہ جو ہمارا سب سے چھوٹا فتنہ ہے کہنے لگا ڈیڈی مجھے پورا یقین ہے جب آپ کی شادی ہوئی تھی تب ٹی وی نہیں تھا ' اگر ہوتا تو آپ اور ممی دونوں پر اس ایڈ (اشتہار) کا تھوڑا تو اثر ہوتا ــــ ؟ میں نے گڑبڑا کر پوچھا کون سا ایڈ بیٹا ؟ وہ بدتمیز پھاٹک سے بولا وہی جس میں پودوں کی طرح بچوں میں فاصلہ رکھنے کو کہا جاتا ہے اور ساتھ ہی بیک گراؤنڈ میں یہ گانا بھی بجایا جاتا ہے ۔

" ذرا سی سادھانی ۔ زندگی بھر آسانی "

مسٹر رسّی والا کے اس انکشاف پر ہم بمشکل تمام اپنی ہنسی روک سکے ' انھوں نے آگے فرمایا ۔ کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ اولاد میری نہیں دوردرشن کی ہے ، خدا کی قسم اب اس گھر میں یا تو میں رہوں گا یا ٹی وی ــــ " اتنا کہہ کر مسٹر رسّی والا رسّیاں تڑا کر چلے گئے ۔ ہم انھیں یہ دوستانہ مشورہ بھی نہیں دے سکے کہ قاسم بھائی آدمی اور مشین میں جب بھی مقابلہ ہوا ہے آدمی کی جھولی میں ناکامی و نامرادی اور مشین کے حصے میں کامیابی و سرفرازی آئی ہے اور ٹی وی تو ہیں دورِ جدید کی ایک ایسی معرکۃ الآرا ایجاد ہے جس کی اہمیت ہمارے گھروں میں " گنگا جل " جیسی اور بندگوں کی حیثیت عضوئے معطل کی سی ہوگئی ہے ۔ چناں چہ پہلے پہل جو ٹی وی محض ایک ایڈیٹ باکس (IDIOT BOX) کہلاتا تھا ترقی کی منزلیں طے کر کے آج فردِ خاندان بلکہ صدرِ خاندان کے درجے پر فائز ہو چکا ہے اور جو اصلی صدرِ خاندان ہیں ان بے چاروں کا یہ حال ہے کہ گھر کے کسی کونے پر سکتے کے عالم میں پڑے ایک ایک کو ،

تکتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

کی مرے قتل کے بعد اس نے دوا سے توبہ

رؤف پاریکھ
(کراچی)

انگریزی کا ایک مقولہ ہے کہ ایک سیب روزانہ کھائیے، ڈاکٹر کو بھگائیے۔ سیب کی قیمت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے تو ڈاکٹر کو دور رکھنے کا یہ نسخہ بظاہر مہنگا نظر آتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحبان کی فیسوں کو دیکھتے ہوئے بسا غنیمت ہے کیوں کہ بعض ڈاکٹر حضرات ایک دفعہ طبی معائنہ کرنے کی جتنی فیس لیتے ہیں اتنے پیسوں میں سیب کی کئی پیٹیاں آجاتی ہیں۔

سیٹھ فیاض بھائی مکھی چوس کی ماہانہ آمدنی ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے ہوگی لیکن جب انھوں نے اس ڈاکٹر کا حال سُنا جو آپریشن (یعنی مشقِ ستم بذریعہ اوزار) کے دس ہزار اور محض نبض ٹٹول کر اور دل کی دھڑکنیں شمار کر کے نسخہ لکھنے کے دو سو روپے لیتا ہے تو کفِ افسوس مل کر کہنے لگے "کاش میں ڈاکٹر بنتا مجھے ڈاکٹر بننے اور امیر ہونے کا بچپن سے ہی شوق تھا۔ ڈاکٹر بن جاتا تو دوسرا شوق بھی پورا ہوجاتا۔"

"تو پھر آپ ڈاکٹر کیوں نہ بن سکے ؟" ہم نے دریافت کیا۔

مجھے میڈیکل کالج میں داخلے کے وقت نا اہل قرار دے دیا گیا تھا۔ کیوں کہ میری لکھائی بہت خوب صورت تھی۔" وہ حسرت بھرے لہجے میں بولے۔

"بھلا اس میں نا اہلی کی کیا بات ہے؟" ہمیں حیرت ہوئی۔

"ان کا خیال تھا کہ دوا ساز اور دوا فروش میرے لکھے ہوئے نسخہ جات صحیح صحیح پڑھ لیا کریں گے۔ اور اس طرح مریض کے انتقال پُر ملال کی ذمہ داری غلط دوا کے استعمال پر نہیں ڈالی جاسکے گی۔"

سیٹھ صاحب نے یہ بھی انکشاف فرمایا کہ آج کل ڈاکٹر بننے سے زیادہ آسان کام کوئی نہیں۔" بلا شبہ آج کے دور میں دو چار کام بے حد آسان ہیں۔ مثلاً اقبالیات کا ماہر ہونا۔ یونیورسٹی سے ڈگری لینا، وزیر ہونا، کسی فلمی رسالہ کا مدیر ہونا وغیرہ۔ ان کاموں میں نہ محنت کی ہلدی لگتی ہے اور نہ عقل کی پھٹکری اور شہرت کا رنگ بھی چوکھا

آتا ہے لیکن ڈاکٹر بننا اس سے بھی سہل ہے۔ اگر آپ کو چند درد رُبا، دافع الرجی اور مُسکن ادویات کے نام یاد ہیں تو آپ ایک کامیاب اور دولت مند ڈاکٹر بن سکتے ہیں۔

ڈاکٹر بننے میں ایک اور چیز جو معاون ہوتی ہے وہ سادہ اور عام بیماریوں کو پیچیدہ اور ڈراؤنے نام دینے کی صلاحیت ہے۔ اگر کسی بیماری کو ایسا نام دیا جاسکے کہ وہ کسی یونانی فلسفی کا نام یا اس کی تصنیف یا کوئی قدیم کتاب نظر آنے لگے تو کیا کہنے۔ ہم بھی بوطیقا، لٹریریا، بایوگرافیا اور پرنسپیا، میتھمیٹیکا کو پہلے پہل کتابوں کی بجائے بیماریوں کے نام سمجھتے تھے۔ حقیقت کھلی تو ایسے جھینپے کہ ڈپتھیریا، بلھارزیا اور انسومینا کو بھی یونانی فلسفیوں کی کتابیں سمجھ کر ان کا نام سنتے ہی داد دینے کے انداز میں سر ہلانے لگتے —— "واہ صاحب! کیا تصنیف ہے"، مبادا کوئی جاہل گردانے۔

سیٹھ صاحب جنھوں نے اپنی جوانی یعنی کھیلنے کھانے کی عمر بازار حصص میں سٹہ کھیلنے اور ایلوپیتھی کی دوائیں کھانے کی نذر کردی ہے۔ اکثر فرماتے ہیں —— کہ کراچی کے موسم معشوق کے مزاج، بازار حصص میں تیزی مندی، ایشیائی ملکوں کی سیاست اور انگریزی دواؤں کا کوئی اعتبار نہیں جو بظاہر نظر آئے گا وہ ہرگز صحیح نہیں ہوگا

سیٹھ صاحب کے ارشادات عالیہ تو برسبیلِ تذکرہ آگئے تھے۔ بات ہو رہی تھی ڈاکٹروں کی فیس کی۔ ڈاکٹر صاحبان کی فیس اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ خود کبھی بیمار نہیں پڑتے۔ خود اپنے علاج پر انہیں بھروسہ نہیں ہوتا اور دوسرے ڈاکٹروں کی فیس اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ کوئی معقول آدمی محض دو منٹ کے معاوضے کے عوض ادا نہیں کرسکتا۔ جانے اپنی فیس اور نسخے کا ڈر ہے یا کیا ہے کہ ڈاکٹر حضرات کبھی بیمار نہیں پڑتے اور اگر بھول چوک سے کبھی بیمار ہو بھی جائیں تو یوں ہی لوٹیں لگا کر اچھے ہوجاتے ہیں کیسی ہی جان لیوا وبا کیوں نہ پھیلی ہو، ڈاکٹروں کے تعاون اور حسنِ تدبر سے ہزارہا مریض عدم کو سدھار جائیں گے لیکن یہ خود اسی طرح ایک "ہاتھ" میں انجکشن، دوسرے میں تھرمامیٹر لیے گلے میں استھٹسکوپ ڈالے یونہی مسکراتے رہیں گے (غالباً مریضوں پر) اور اس پر بھی مریضوں کی بھیڑ بھاڑ کا یہ عالم ہوگا کہ ایک کا بلڈ پریشر ناپ رہے ہیں تو دوسرے کی نبضیں ٹٹول رہے ہیں۔ تیسرے کا نسخہ لکھ رہے ہیں اور چوتھے کو پرہیز بتا رہے ہیں۔ پانچویں کا ایکس رے ناک کی پھننگ پر دھرے چشمے کے آگے لہرا رہے ہیں اور چھٹے کو انجکشن بھی لگاتے ہیں تو دوا ساز کو منہ پھیر کر ہدایات دیتے جاتے ہیں کہ مکسچر میں پانی ذرا زیادہ ڈالنا۔ گویا ع "منہ پھیر کر اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ" کا منظر ہوتا ہے۔

ایک دفعہ ہم نے ایک ڈاکٹر صاحب کے بازو پر ایک مچھر کو براجمان پایا۔ ہے تو کمینگی مگر اس کمینگی کا اعتراف نہ کرنا بھی کمینگی ہوگی کہ ان کے بازو پر مچھر کو بیٹھا دیکھ کر ہم دل ہی دل میں بے حد خوش ہوئے۔ سوچا کہ اب اگر انھیں ملیریا نہ بھی ہوا تو کم از کم ایک آدھ قطرۂ خون اُن کا بھی چوسا جائے گا۔ لیکن صاحب توبہ کیجیے۔ وہ مچھر ڈاکٹر صاحب کا خون چکھتے ہی لڑکھڑایا اور کھٹ سے دم توڑ دیا۔ ہو سکتا ہے کہ موصوف کے خون میں کونین یا کسی اور دافع ملیریا دوا کی آمیزش ہو۔ اسی طرح ایک ڈاکٹر صاحب کو کتے نے کاٹ کھایا۔ ڈاکٹر صاحب نے تو بغیر خود ہی اپنا زخم دھو دھا کر پٹی باندھ لی لیکن وہ کتا مرتے مرتے بچا۔ چودہ ٹیکے لگے تب جانبر ہوا۔ وہ تو خیریت گزری کہ ڈاکٹر صاحب صحیح الدماغ تھے ورنہ خطرہ تھا کہ کہیں باؤلا نہ ہوجائے لیکن ان مثالوں سے مچھروں اور کتوں کا بودا پن دکھانا مقصود نہیں بلکہ ڈاکٹر صاحبان کی سخت جانی کا بیان مطلوب ہے۔

ابن انشاء مرحوم نے ایک جگہ معالجوں کا ذکر کرتے ہوئے ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی اور فٹ پیتھی بھی اس فہرست

میں شامل کئے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی اور نٹ پیتھی سے بھی اچھا ایک طریقۂ علاج ہے اور وہ ہے سِم پیتھی (-SYM PATHY-) بمعنی ہمدردی لیکن اس کا کیا علاج کہ ڈاکٹر حضرات اس نافع ترین طریقۂ علاج کے قائل نہیں۔ ہماری رائے میں تو ڈاکٹر اگر مریض سے ہنس کر دو باتیں کر لے تو آدھا مرض وہیں جاتا رہتا ہے لیکن ڈاکٹر حضرات کے ساتھ بھی تو آخر پیٹ لگا ہوا ہے۔ اگر وہ صرف مسکراہٹوں کے انجکشن اور ہمدردی کے کیپسولوں سے ہی علاج جاری رکھیں تو پیٹ کا کیا کریں۔

ہم نے مانا کہ دِلّی میں رہیں، کھائیں گے کیا ؟

یہی وجہ ہے کہ سِم پیتھی طریقۂ علاج ڈاکٹروں میں سخت غیر مقبول ہے اور ڈاکٹر حضرات مریض کو مختلف قسم کی گولیوں کا برسٹ مارنے کے بعد سمجھتے ہیں کہ اب مریض کو انسانیت، ہمدردی یا اخلاق جیسی لغویات میں سے کسی کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ ہاں بِل البتہ مستثنیات میں سے ہے۔ نصیب اعدا ہم ایک دفعہ عجیب و غریب بیماری میں مبتلا ہوگئے۔ ہمارے سر میں آئے دن درد رہنے لگا۔ راتوں کو خواب میں بجٹ آکر ڈراتا۔ دن میں دفتری اوقات میں نیند آ رہتی۔ چونکہ انگریزی دواؤں کے اثرات سے سیٹھ صاحب خبردار کر چکے تھے لہٰذا ایلوپیتھک کو چھوڑ کر ہومیوپیتھک ڈاکٹر کے پاس گئے۔ ہمارا حال سن کر بہت ہنسے کہ بھلا یہ کوئی بیماری ہے ؟ یہ تو معمولی کیس ہے، پھر فرمایا۔ کہ کلکریا فاس اور نیٹرم میور بحصہ مساوی ہر چار گھنٹے کے بعد پھانک لیا کرو۔ ہم نے اس مشورے پر عمل شروع کر دیا لیکن افاقے کی رفتار اتنی سست تھی جتنی محکمۂ ڈاک کے ارجنٹ ٹیلی گرام کی ہوتی ہے یعنی اگر کسی بچے کی پیدائش کی خبر بذریعہ تار کہیں بھیجی جائے تو انشاءاللہ العزیز اس بچے کی پہلی سالگرہ کے موقع پر مکتوب الیہ فرد اس سانحے سے باخبر ہو جائے گا۔ سیٹھ فیاض بھائی مکھی چوس نے اس مسئلہ کا حل یہ نکالا ہے کہ جیسے ہی کسی رشتہ دار خاتون کا جغرافیہ تبدیل ہونے لگتا ہے۔ موصوف ولادت باسعادت کی خبر ارجنٹ ٹیلی گرام سے مختلف شہروں تک پہنچا دیتے ہیں اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مکتوب الیہ بچے کے عقیقے میں شریک ہونے سے رہ گیا ہو۔ افاقے کی اس رفتار سے جب ہم نے اپنے معالج کو آگاہ کیا تو متبسم ہو کر فرمانے لگے۔ دراصل ہومیوپیتھی یا بایو کیمسٹری طریقۂ علاج میں صحیح علاج کے لیے تاریخِ پیدائش کے حساب سے زائچہ بنانا ضروری ہے تاکہ قسمت میں لکھی ہوئی بیماریوں کا اندازہ ہو جائے اور اس مناسبت سے علاج ہو سکے۔



"کیا آپ اپنا پین (PEN) چند منٹ کے لیے بطورِ قرض دیں گے ؟"

پہلے تو ہم اسے مذاق سمجھے لیکن تحقیق پر معلوم ہوا کہ واقعی علمِ نجوم اور ہومیوپیتھی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ یہ بھی منکشف ہوا کہ ہومیوپیتھی پہلے آپ کے تمام ، فراموش کردہ اور خوابیدہ عوارض کو ازسرِنو بیدار کرے گی اور پھر موجودہ شکایات کا علاج کرے گی تاکہ ہر بیماری کا جڑ سے خاتمہ کیا جا سکے۔ ہم اپنی پرانی اور موروثی بیماریوں کی طویل فہرست کے پیشِ نظر اُن کے کڑوے مُردے اکھڑ جانے کی بجائے جوتے بغل میں داب کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

اگلے دن ہم ایک حکیم صاحب کے مطب میں پہنچے جو یونانی، آیوروید ک اور چینی طریقہ ہائے علاج کے باہمی تعاون سے

"بقول خود ان کے "امراضِ خبیثہ و لطیفہ کا شافی و کامل و عاجل علاج" کیا کرتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اس طریقے کے بانی مبانی بھی تھے اور خاتم بھی، خاتم ہونے کا سن کر ہمیں بنی نوعِ انسان کے مستقبل کے بارے میں اک گونہ اطمینان ہوا۔ انھوں نے جو نسخہ ہمیں لکھ کر دیا وہ یوں تھا۔

نسخہ:۔ لعوقِ سپستان، خمیرہ گاؤزبان عنبریں، ڈھائی ڈھائی ماشے، خمیرہ ابریشم زبان عنبریں، خمیرہ مروارید، اطریفل دیدان پونے تین تین رتی۔ شربت آبنوس، شربت شیشم، شربت ساگوان، شربت روح افزا، شربت دینار بقدر اشکِ بلبل، جوارش جالینوس، جوارش فیثاغورث، جوارش افلاطون، جوارش برٹینڈ رسل سوا سوا دانے، معجون فلک سیر چٹکی بھر، معجون ہوشربا سوا تین چٹکی۔

ترکیب استعمال:۔ ان تمام چیزوں کو کھرل کر کے کسی جاپانی کپڑے میں چھان لیں۔ پھر مگر مچھ کے آنسوؤں کے ساتھ گوندھ کر گولیاں بنالیں اور حسبِ خواہش دودھ پانی یا عقل کے ساتھ استعمال کریں۔

بڑی مشکل سے وہاں سے جان بچا کر نکلے اور علاج کا خیال چھوڑ صبر کا دامن پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ایک روز اچانک سر راہے ایک حضرت طلسمی چورن بیچتے ہوئے مل گئے۔ وہ سنیاسی ہونے کے دعویدار تھے حالانکہ شکل سے ستیاناسی لگتے تھے۔ یہ چہل سالہ برخوردار فرماتے تھے کہ عمرِ عزیز کا نصف حصہ (جو بقول خود ان کے ایک سو ساڑھے چھیاسٹھ سال پونے تین ہفتے بنتا تھا) ہمالیہ کی چوٹیوں گھاٹیوں، گپھاؤں اور برفانی وحشتوں میں ایک نایاب بوٹی کی تلاش میں محض اس لیے گزار دیا تھا کہ خلقِ خدا کو کچھ فائدہ پہنچے۔ وہ بوٹی اس طلسمی چورن کا جزوِ اعظم تھی۔ انھوں نے اس چورن کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ "یہ طلسمی چورن جگر، ہاضمے اور حافظے کو تقویت دیتا ہے۔ دردِ سر اور مرضِ نزلے میں مفید اور خونی پیچش کا تیر بہدف علاج ہے۔ مثانے کی کمزوری میں اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ بھوک لگاتا ہے۔ گنج مٹاتا ہے، بال اگاتا ہے، دافعِ ضعفِ قوتِ باہ اور باعثِ تقویتِ نگاہ ہے۔ دشمنِ ضعفِ بصارت اور عدوئے ثقلِ سماعت ہے۔ بعض لوگوں نے تپِ دق میں بھی مفید پایا ہے۔ قدرت نے سو سال میں ایک پودا اگایا ہے۔ کچھ لوگ اسے منجن اور بوٹ پالش کے طور پر بھی برتتے ہیں۔ اس کا ثانوی فائدہ یہ ہے کہ اسے چوہے مار دوا کے طور پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔"

اپنی عمر اور تجربے کے اس حاصل کو اب عوام کی خدمت اور اپنی عاقبت کے خیال سے بالکل مفت تقسیم کر رہے تھے۔ بس اس پر اٹھنے والے اخراجات طلب کرتے تھے جو فی چٹکی اسّی روپے تھے۔ مکمل کورس تین چٹکیوں پر مشتمل تھا۔ ذاتی منافع اور حصولِ زر کو حرام جانتے تھے۔ یہ "مفت بکنے" والا نسخہ وہ ہمیں دینے پر بضد تھے لیکن ہم نے اپنی بے بضاعتی کی جانب اشارہ کیا تو ازراہِ تلطف نسخے کی قیمت بلکہ اخراجات گھٹا کر نصف کر دیے۔ ہم نے خود کو مفلس ظاہر کیا تو حقارت سے "یہ منہ اور مسور کی دال" کہہ کر چل دیے۔

جب یہ ساری داستان ایک بزرگوار کے کان میں پڑی تو بڑے جز بز ہوئے کہ سر کے درد کے علاج کے لیے ٹکّوں مارے مارے پھرتے ہو۔ بادام اس کا آزمودہ علاج ہے۔ بس سات دانے بادام نہار منہ کھا لیا کرو۔ گویا سات بادام روزانہ کھائیے۔ ڈاکٹر کو پھانسیے یہ سن کر ہم ہنس دیے۔ ہم چپ رہے اور یہ سوچ کر رہ گئے کہ بادام ہی کھانے ہوں تو سیب کیا برے ہیں۔

ع مرا علاج مرے چارہ گر کے پاس نہیں

* دردربا: PAIN KILLER

چڑھتی دھوپ۔ اُترتی دھوپ

(ڈرامہ)

رفیعہ منظور الامین (سکندرآباد)

کردار :۔

سلیمہ خاتون ــــــ نوجوان ادیب کالج پاس دوشیزہ

آماں بی ــــــ سلیمہ خاتون کی بیوہ والدہ ۔

تحسین احمد نزع ــــــ عمر رسیدہ شاعر ۔ چشمہ لگاتے ہیں۔

نصیبن ــــــ تحسین کی ادھیڑ خادمہ ۔ لنگڑی ۔

مراد ــــــ نوجوان پہلوان، نزع صاحب کا نیا شاگرد

ابّو ــــــ سلیمہ خاتون کے باپ ۔

خالد میاں ــــــ جوتوں کی دکان کے مالک ۔

دکان دار ــــــ انڈوں کی دکان کے مالک

ایک گاہک ــــــ

نزع کا ایک شاگرد ــــــ !

وقت : دن ــــ مقام ــــ سلیمہ خاتون کا گھر ــــ کیمرہ پہلے پتلی سی گلی سے ہوتا ہوا LOCATION کو ظاہر کرتا ہے۔ (کوٹھے والی چاہ کی گلیاں) پرانے شہر کا محلہ ہے ۔ کیمرہ گھر میں داخل ہوتا ہے۔ چھوٹا گھر ہے ایک کونے میں ٹوٹی کرسی جالے نکالنے والی لکڑی، ٹوٹے ٹرنک ــــ صحن میں ایک طرف مرغی کا ڈربہ ــــ کیمرہ کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔ گھر کو صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کی گئی ہے مگر پرانی ٹوٹی پھوٹی چیزوں کو بھی عزیز از جان رکھا گیا ہے ایک طاقچے میں نئی پرانی کتابیں ہیں ۔ آماں تخت پر بیٹھی پاؤں کے انگوٹھوں میں دبائے سلیمہ خاتون کا دوپٹہ چن رہی ہیں، سلیمہ خاتون طاقچے میں رکھی ہوئی کتابوں کی اُلٹ پھیر کر رہی ہیں۔ وہ فیشن کی دلدادہ ہیں لیکن دس سال پرانا فیشن تاکہ کسی کی گرفت میں نہ آئیں ۔)

سلیمہ : (ایک پرانی کتاب جزدان سے نکال کر گرد جھاڑتے ہوئے)۔ آماں بی ــــ یہ ابو مرحوم کا دیوان ہے؟!

آماں ۔ : (ہاتھ روک کر اداسی سے خلا میں دیکھتے ہوئے ٹھنڈی سانس) بس اب یہی تو رہ گیا ہے ــــ کیا کیا ہیرے موتی بٹورتے تھے وہ ــــ ہر شعر قاتل ہوتا تھا۔

سلیمہ : (آنکھیں پھاڑ کر آتی ہے اور اماں کے پاس گھٹنے ٹیک کر) آماں بی ..... ابو نکسلائٹ تھے !

آماں بی : مجھے نہیں معلوم وہ کیا ہوتا ہے ۔ میں تو تمہارے ابو کی شاعری کی بات کر رہی ہوں ــــ کتنے چاؤ سے یہ دیوان چھپایا تھا ــــ میرے بُندے تک بک گئے تھے ۔

سلیمہ ۔ (دوبارہ دوپٹہ سنبھال کر) اور کیا کرتے کوئی پاجی چھاپنے کو تیار نہیں ہوتا تھا ۔ خود چھپانا پڑا ــــ

سلیمہ : (ارمان سے) پھر تو ابّو کے دیوان کو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہوگا ۔

آماں : (دوپٹے کو جھٹکا دے کر) خاک لیا ہوگا

سلیمہ : پھر ساری کتابیں بکیں کیسے ؟

آماں : (دوپٹے کی چنائی ختم کر کے) وہ تو تمہارے ابو کی ہشیاری تھی جو ساری کتابیں بیچ دیں ۔ میرے نئے بُندے بھی بنوا دیے

سلیمہ: وہ کیسے اماں بی؟

اماں: اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ——— وہ کرتے یہ تھے کہ کرانے والے منشی صاحب کے پاس سے کرانہ لے آتے تھے۔ جب انھوں نے پیسوں کا تقاضا کیا تو اتنی قیمت کی کتابیں ان کے ہاں جھونک آئے۔

سلیمہ: اچھا! ...... تو منشی جی کرانے کے بدلے میں ابو کی کتابیں لے لیتے تھے؟

اماں: اے لیتے کیسے نہیں۔ تمھارے ابو کی ساکھ ہی ایسی تھی۔ وہ کوئی میر، غالب کے دیوان تھوڑے ہی تھے جو منشی جی پھاڑ دیتے۔ انھوں نے فائدہ دیکھا ہوگا تبھی چپ چاپ کتابیں اٹھوالیں۔

سلیمہ: (فخریہ) یاد آیا۔ میں نے بھی ایک بار زیرے کی پڑیا کھولی تو وہ ابو کی کتاب کے پتے میں بندھی تھی۔

اماں: اس کے بعد ان کی دکان ہی بند ہوگئی ——— وہ ہاتھ ملا کر ابو سے خبر لیتے کہ قبلہ، ساری کتابیں ختم ہوگئیں یا اور باقی ہیں ——— جب تمھارے ابو نے بتایا کہ کتابیں ختم ہوگئیں تو انھوں نے بڑی بے دلی سے دکان کھولی۔ دھندا تو چلانا ہی تھا۔

(سلیمہ اٹھ کر ماں کے پہلو سے جا لگ بیٹھتی ہے)

سلیمہ: (کندھے پر ٹھوڑی ٹکائے) اور کس کس نے ابو کے دیوان کی قدر کی اماں؟

اماں: خالد میاں ان کے بڑے قدرداں تھے۔

سلیمہ: وہی جن کی جوتوں کی دکان ہے۔

اماں: ہاں وہی ...... ذرا پان اٹھانا (سلیمہ اٹھ کر پاس رکھے ٹیبل سے پان اٹھا لاتی ہے) پہلے بڑا سعادت مند لڑکا تھا مگر اسے بڑی بدخصلت بیوی ملی ——— اچھا ہوا (پان بنانے لگتی ہیں)

سلیمہ: اونہہ! دیوان کی بات کرو نا اماں ——— اگر خالد میاں نے مجھ سے شادی کرنے کے لیے ابو کا کہا مانا تو کیا ہوا۔

اماں: (تخت پر سے جھک کر جوتی اٹھا کر پھینکتی ہیں) اے مٹی ہم کیوں جوتے والوں کو اپنی لڑکی دینے لگے۔ اس نے اسی بات پر ہم سے یاد اللہ بند کردی۔

سلیمہ: (جیا ہوا دوپٹہ لے کر مروڑنے لگتی ہے) ہوا کیا تھا؟

اماں: ہوا یہ کہ تمھارے ابو نے خالد میاں کو اپنا دیوان لے جا کر دیا۔ خالد میاں کو اتنی عزت کون دیتا بھلا ان کا تو شین قاف بھی درست نہیں (قاف کو خاف کہتی ہیں)

سلیمہ: خاف نہیں اماں۔ قاف ——— پھر کیا ہوا؟

اماں: اے وہی خالد میاں نے سر آنکھوں سے لگا کر دیوان رکھ لیا اور تمھارے ابو جوتا لے کر آگئے۔

سلیمہ: چلو قصہ ختم ہوا۔ (اٹھتی ہے) میں ذرا اپنی مرغی کو دانہ دے آؤں۔

اماں: ٹھہرو قصہ ختم کہاں ہوا ——— خالد میاں بڑے نامعقول نکلے!

سلیمہ: کیا کیا انھوں نے؟

اماں: (پان منہ میں رکھتی ہیں) اوئی کیا پان دیئے ہیں آج تنبولی نے (اگالدان میں تھوکتی ہیں) ہوا یہ کہ ایک دن تمھارے ابو سودا سلف لینے کے لیے گئے۔

(FLASH BACK)

وقت: دن ——— مقام: بازار

(بازار کا سین۔ جہاں خالد میاں کی جوتوں کی دکان بھی ہے۔ سبزی ترکاری اور انڈوں وغیرہ کی دکانیں بھی ہیں۔ ابو دبلے پتلے مختصر۔ مونچھیں تتلی کی طرح آنکھوں پر موٹا چشمہ ——— وہ دکان پر انڈے ہلا کر دیکھتے اور واپس رکھتے جاتے ہیں۔ آخر دکان دار بیزار ہو جاتا ہے ——— وہاں دوسرے گاہک بھی ہیں)

دکان دار: کیا انڈے میں سے بانگ سنائی دے گی مولانا؟

ابو: میاں دو پیسے کی ہانڈی بھی ٹھونک بجا کر خریدی جاتی ہے۔

دکان دار: مجھے تو معاف ہی کیجیے گا —— اگر آپ نے میری دکان کے ہر انڈے کی ٹھونک بجا دی تو یہاں کشتوں کے پشتے لگ جائیں گے۔

ابو: اماں، تم سمجھتے کیا ہو —— ہم خود ہی یہ . . . انڈے نہیں لیں گے۔ یہ کوئی خاندانی انڈے ہیں؟

گاہک: بس لے لیجیے مولانا لے لیجیے —— ان انڈوں کے ماں باپ کی شادی میں میں خود شریک تھا۔

(ایک قہقہہ پڑتا ہے۔ ابو وہاں سے کھسک کر خالد میاں کی دکان پر چلے جاتے ہیں اور SHOW CASE میں جوتے دیکھنے لگتے ہیں۔ اندر جاتے ہیں۔ خالد میاں دوسرے گاہکوں سے نپٹ رہے ہیں۔ ابو انھیں اپنے بیگ سے کتاب نکال کر دیتے ہیں)

ابو: خالد میاں، یہ ہمارا دیوان ہے آپ کے لیے۔

خالد: (اخلاقاً جلدی) یہ تو تبرک ہے میرے لیے —— آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں (دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ ابو کاونٹر سے ایک جوتا اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں)

ابو: خالد میاں —— یہ جوتا کتنے کا ہوگا؟

خالد: (پلٹ کر) جی بہت سستا ہے۔ دس روپے۔

ابو: یہ ہم لیے جاتے ہیں۔

خالد: (مصروف) جیسی آپ کی مرضی۔

(ابو جوتا لے کر دکان سے نکل جاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد پلٹتے ہیں اور دوبارہ دکان میں داخل ہوتے ہیں۔ تب گاہک وہاں کم ہو گئے ہیں)

ابو: خالد میاں —— برخوردار۔ ایک پانچ روپے ہوں گے آپ کے پاس؟

خالد: (Reluctantly) جی، وہ . . . .

ابو: تمھاری چچی نے انڈے منگوائے تھے اور پیسے ہمارے ہمارے پاس کچھ کم پڑ گئے ہیں۔

خالد: (SAFE سے پانچ روپے نکال کر دیتے ہیں) مولانا۔ وہ . . . . . جوتے کے پیسے؟

ابو: (بپھر کر) کون سے پیسے . . . . . . پانچ روپے تو تم پر ہی ہمارے، ادھار تھے جو میں وصول کر رہا ہوں

خالد: (ہکلا کر) وہ کیسے؟

ابو: ہاں تم کند ذہن ہو —— انگریزی اسکول میں پڑھے ہو نا۔ خیر میں ہی بردا شت سے کام لے کر سمجھاتا ہوں . . . . کتاب نہیں لی تھی تم نے ہماری؟ اس کے دام پندرہ روپے جوتا ہم نے دس کا خریدا۔

خالد: (جھلا کر) اور یہ رہے پانچ روپے کیوں! آپ کی بزرگی کا خیال ہے ورنہ . . . . .

ابو: (جاتے ہوئے) آئندہ حساب میں ہیرا پھیری مت کرو۔

خالد: (ایک جوتا الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے پھر ابو کو ——) دس نمبری۔

(DISSOLVE)

سلیمہ: ابو کتنے حساب کتاب کے سیدھے تھے اماں۔ ان کی مغفرت تو ہو گئی ہو گی۔

اماں: (آنسو پونچھ کر) خود تو چلے گئے جنت کے مشاعروں میں —— اپنی نشانی یہ دیوان چھوڑ گئے (جزدان میں دیوان رکھتی ہے) آج کو زندہ رہتے تو ایسے ایسے کئی دیوان چھپتے۔ تمھاری اماں بھی مشہور شاعر کی بیگم کہلاتیں۔

(سلیمہ اچھل کر اماں سے لپٹ جاتی ہیں)

سلیمہ: اماں . . . . . . میری اچھی اماں . . . . . مت رو . . . . . میں جو ہوں —— میں ابو کا نام روشن کروں گی۔ میں خود شاعری کی ٹریننگ لے کر موٹے موٹے دیوان چھپواؤں گی —— تمھیں مشہور شاعر کی بیگم نہ سہی مشہور شاعرہ سلیمہ خاتون کی اماں تو لوگ

کہیں گئے ہیں۔

اماں: (آنسو پونچھ کر) تمھیں جب ادیب کامل کروایا ان کی بھی یہی خواہش تھی ـــــ مگر اب تو مجھے تمھاری شادی کی فکر ہے۔

سلیمہ: (شکایتاً) لڑکا کہاں ہے اماں ـــ اور اب تو میں تمھاری خواہش پوری کرکے ہی دم لوں گی۔ تمھارے دل سے یہ غم دھودوں گی کہ ابو کے باقی دیوان نامراد کباڑیا لے گیا۔

اماں: (ناامید) مگر تو کس سے صلاح لے گی کون سکھائے گا تجھے ـــ شاعری تو لوہے کے چنے ہیں بیٹی ـ

سلیمہ: تم بھول رہی ہو اماں کہ میں (فخریہ) کس شاعر کی بیٹی ہوں۔ (شرماکر) تھوڑا بہت تو میں یوں بھی لکھ لیتی ہوں۔

بلبل نا شاد نے کچھ اس طرح فریاد کی
روتے روتے آنکھ پھوٹی کم بخت صیاد کی

اماں: (سر پہ ہاتھ پھیر کر) سبحان اللہ، کم بخت کہہ کر تو تو نے اس پاجی صیاد کا جنازہ ہی نکال دیا ہے۔ واہ واہ عمر دراز

سلیمہ: (اٹھ کر بندگی کرتی ہے) میں کس قابل ہوں ــــ ہاں، تو میں کہہ رہی تھی۔ نزع صاحب کی شاگردی کرلوں گی۔

اماں: مزہ صاحب!

سلیمہ: مزہ نہیں۔ نزع صاحب .... نزع ..... نزع موت کا عالم ـ

اماں: اوئی، جو موا خود قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ وہ کیا تجھے شاعری سکھائے گا۔؟

سلیمہ: یہ ان کا تخلص ہے اماں ــــ ان کے گھر میں چنبیلی کی کلیاں توڑنے جایا کرتی تھی ۔!

اماں: اچھا اچھا۔ تمھارے ابو ذکر کرتے تھے ۔ اب میں کیا جانوں ـ

سلیمہ: وہ بڑے مشہور شاعر ہیں اماں۔ کبھی جب ان کے گھر کے سامنے سے گزرتی ہوں ــــ واہ وا ــــ واہ وا کا شور سنائی دیتا ہے اور (سونگھ کر) اچھے اچھے پکوانوں کی خوشبو آتی ہے۔

اماں: اے جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناطہ۔ بزرگوں کا پیسہ ہے۔ اٹھاتے ہوں گے ۔

سلیمہ: تو میں ان کے پاس جایا کروں اماں؟

اماں: ہاں ہاں جا ــــ بزرگ آدمی ہیں (تیور بدل کر) لیکن خبردار سلیمہ خاتون سر سے دوپٹہ نہ کھسکنے نہ پائے۔ (سلیمہ خاتون ادا سے سر پہ دوپٹہ لیتی ہیں) ہم نے تمھیں برقعہ نہیں پہنایا ــــ آزادی دی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ نامحرموں سے ٹھٹھی ٹھٹھی، ٹھاٹھا کرو۔ وہاں اور بھی لوگ آتے ہوں گے ۔

سلیمہ: توبہ کرو اماں بی۔ ایسا ہو سکتا ہے! ابھی تو میں نے جانا بھی شروع نہیں کیا اور تم ڈرنے لگیں۔

(SCENE CHANGE)

وقت: دن، مقام: نزع صاحب کا گھر

(تحسین احمد نزع ساٹھے پاٹھے ہیں۔ چندیا پہ سفید بال، سفید مونچھیں جھکی ہوئی، کرتہ پاجامہ پہنے اپنے ایک شاگرد کو شاعری کا درس دے رہے ہیں ــــ حقہ بھی پیتے جاتے ہیں۔ شاگرد دبلا پتلا ۲۷، ۲۸ سال عمر ــ سر پر کالی ٹوپی، گلے میں رومال ــــ شکل سے فلموں کا رسیا دکھنے والا لگتا ہے ۔)

نزع: (جھلاکر) لاحول ولا قوۃ ـــ میاں یہ شاعری، یہ ردیف قافیہ تمھارے بس کی بات نہیں ہے۔ خواہ مخواہ کیوں میرا اور اپنا وقت برباد کر رہے ہو ــ جاؤ اور دھڑلے سے آزاد شاعری شروع کردو ــ کس کی مجال کہ تمھیں روک لے۔ جاؤ ـ جاؤ (پکار کر) نصیبن ان صاحبزادے کو باہر چھوڑ آؤ۔

(شاگرد سر جھکائے، اداس، روٹھا ہوا سا جانے لگتا ہے۔ نصیبن کی آواز آتی ہے)

نصیبن : رو کے رکھنا، آرہی ہوں۔

نزع : (اپنی غزل میں کھوئے بغیر شاگرد کی طرف دیکھے اس کا کرتا تھام لیتے ہیں) تم ٹھہرو میاں ابھی نصیبن کو آنے دو۔ فاعلاتن، فاعلاتن فاعلن'۔ اب آبھی چکو نصیبن۔

(نصیبن لنگڑاتی آتی ہیں ——— کانوں میں تنکے ——— آنکھوں میں بے تحاشہ کاجل بھرا)

نصیبن : (شاگرد کو پلٹاتے ہوئے ٹٹولتی ہیں) بلٹو میاں ——— جیبیں دکھاؤ ——— ہوں . . . سر سے ٹوپی کھسکاؤ ——— ٹھیک ہے ——— جاؤ۔ (شاگرد اپنا رومال اٹھاکر چلا جاتا ہے)

نصیبن : میں تو کہتی ہوں، یہ استادی شاگردی کا سلسلہ اب ختم کیجیے ——— یہ نگوڑے لونڈے کچھ سیکھتے دیکھتے نہیں سب کے سب کار بھیجا چاٹ جاتے ہیں۔ ایک تو کھا پی کر پانی کا کٹورہ ہی لے اڑا تھا موا۔

نزع : تو تم سمجھتی ہو، یہ ہماری شاعری کے دیوانے نہیں تمھارے کبابوں کے متوالے ہیں۔

نصیبن : اور نہیں تو کیا ——— اس روز وہ تنکی نما مونچھوں والے جن کی کسی کسی سی اچکن رہتی ہے، کیسے بے چین ہو گئے تھے۔ (نزع چشمے کے اوپر سے دیکھتے ہیں) آپ کی شاعری تو چل رہی تھی ایک طرف وہ بار بار، باورچی خانے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ کب کباب آئیں اور وہ کھا کر چھٹی کریں۔

نزع : بڑا بھرم ہے تمھیں ——— تم سمجھتی ہو حکیم تراب علی کی گردن ہمارے شعروں کی واہ واہ کرتے نہیں، یونہی کھسک گئی تھی ——— ؟

نصیبن : ارے چھوڑیے سرکار ——— وہ جاتے جاتے مجھ سے کہہ گئے تھے کہ اگر میں خاتون نہ ہوتی تو وہ میرے ہاتھ چوم لیتے جو ایسے آسمانی کباب بناتے ہیں۔ وہ تو کچھ کر دینے کے لیے تیار تھے کہ انھیں تو یہاں میرے کباب کا

نزع : (پینترہ بدل کر) کم نظر ——— کباب یے کی اولاد۔ اب کی بار جب وہ آئے تو صرف مونگ پھلی کے دانے کھلاؤ۔

نصیبن : اے ایسے تو سب غٹرغوں کرنے والے کبوتر اڑ جائیں گے۔ داد کس سے لیجیے گا؟

نزع : نصیبن یہ ہماری مرضی ہے۔ تم اپنی اوقات سے مت بڑھو ——— پرانی خادمہ ہو اس گھر کی۔

نصیبن : تبھی تو اس گھر کو بھاڑ میں جاتے نہیں دیکھ سکتی ——— بی بی ماں جب اللہ کو پیاری ہوئیں تو چھوٹے بھیا، بڑے بھیا اِتنے اتنے سے تھے ——— میرے انہی ہاتھوں میں جوان ہوئے۔

نزع : (جوش میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں) ان ناخلفوں کا نام بھی مت لو ——— میں نے انھیں پڑھایا، لکھایا، شادیاں کیں اور وہ نامعقول اپنی دلہنوں کو لے کر انگلینڈ امریکہ چمپت ہو گئے (حسرت سے) میرے آنگن کو پوتا پوتی کی چہلوں سے آشنا بھی نہ ہونے دیا۔

(کیمرہ Pan ہو کر صحن پر جاتا ہے جس کی ایک طرف پرانے اسٹائل کا کھلا کچن ہے۔ جہاں کا کافی حصہ کمرے کی کھڑکی سے نظر آتا ہے)

نصیبن : ایک میں ہی ہوں جو اس چوکھٹ سے چمٹی پڑی ہوں ——— آپ کو تو خبر بھی نہیں ہوتی۔ آمدنی کم خرچہ زیادہ۔ میرا دل ہی جانتا ہے میں گھر کیسے چلاتی ہوں۔

نزع : (سر پکڑ کر) کم بخت نے دماغ چاٹ لیا۔

نصیبن : (Hurt) کون، میں؟

نزع : نہیں، اس مردود نے جو ابھی ابھی گیا ہے۔ میں نے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا کہ مرد خدا مزاج کو مزاح کہہ مجاز نہیں لیکن اس ظالم کو مجھ پر رحم نہیں آیا۔ کرسی پر دھم سے بیٹھ جاتے ہیں)

نصیبن : (طاقچے سے تیل کی بوتل نکال لاتی ہے) اے جاند چھوڑے ان پر۔ لائیے میں سر پہ روغن بادام کی مالش

کردوں؟

(سر پر پالش کرنے لگتی ہے۔ نزع صاحب سکون سے
کرسی پہ دراز ہو کر آنکھیں بند کرلیتے ہیں۔ کیمرہ مسکراتی
نصیبن پر رک جاتا ہے)

(FREEZE SHOT)

سلیمہ کی آواز: میں اندر آسکتی ہوں؟

نزع: ایں یہ کس کی آواز ہے۔

نصیبن: (نزع صاحب کی زلفیں جھاڑ کر) سلیمہ خاتون ہیں۔
کل بھی آئی تھیں۔

نزع: (سر جھٹک کر) کک ..... کون .... سلیمہ خاتون؟

نصیبن: اے سرکار آپ بھی بھول جاتے ہیں سلیمہ
چھوٹی سی تھیں ــــ چنبیلی کی کلیاں توڑنے آتی تھیں۔

سلیمہ: (اندر داخل ہو کر) بندگی ....

نزع: (آنکھیں پھاڑ کر) معاذاللہ ... تم تو کبھی تھیں چھوٹی
سی مگر ..... یہ یہ .... سبحان اللہ۔

نصیبن: میں تو دس بارہ سال پہلے کی بات کر رہی تھی۔ آپ
کیا ابھی تک ان سے انگوٹھا چسوائیں گے؟

نزع: بس نصیبن تمھاری یہی بات بری ہے۔ ذرا ذرا سی
بات پر الجھنے لگتی ہو (جھٹکے سے سر چھڑا کر)
اب چھوڑ دو بھی، کیا کھوپڑی کی قلعی کرتی ہے (اٹھ کھڑے
ہوتے ہیں)

نصیبن: (تیل کی شیشی سنبھال کر) لو .... میرا کیا۔!
روز روغن بادام کی چمپی کرتے کرتے میری ہتھیلیاں
بھی گھس کر یان ہو جاتی ہیں۔

نزع: اب کیا یہیں کھڑی ہوئی باتیں بناؤ گی ــــ جاؤ
شربت لے آؤ۔ ارے آپ کھڑی کیوں ہیں بیٹھیے نا
(سلیمہ سر ڈھلکائے، ترچھی نظروں سے نیچے دیکھتی رہتی
ہیں)

نصیبن: (اسے سلیمہ کا آنا پسند نہیں آیا) لاتی ہوں ــــ

آپ آپ کیے جا رہے ہیں۔

نزع: (ریشہ خطمی) اب فرمایئے کیسے آنا ہوا!

سلیمہ: (شرماتے ہوئے) جی مجھے بچپن سے شاعری کا شوق ہے۔
آپ اگر مجھے شاگردی میں قبول کریں تو اپنی خوش قسمتی سمجھوں گی۔

نزع: (خوش ہو کر) آپ شاعری سیکھیں گی اور مجھے استاد بنانا
چاہتی ہیں؟

سلیمہ: (سر کے اشارے سے ہاں کہتی ہیں)

نزع: (جھک کر) بسر و چشم حاضر ہوں۔

سلیمہ: جی

نزع: میرا بس چلے تو ساری دنیا میں شاعری کی شمعیں جلا دوں۔
ــــ دل و جان سے حاضر ہوں ــ تو کب سے سیکھیے گا؟

سلیمہ: آپ کو اعتراض نہ ہو تو .... آج ہی سے۔

نزع: بہت نیک خیال ہے (سلیمہ تخت کے کونے پر بیٹھ جاتی
ہیں اور ان سے کچھ دور نزع) اچھا اب یہ بتایئے کہ
آپ کو میری کوئی غزل یاد ہے؟

سلیمہ: جی بیسیوں۔

نزع: واللہ اب فی الحال ایک ہی سنایئے گا۔

سلیمہ: یا الٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل!

نزع: واہ واہ ایسے نہیں، ترنم سے پڑھیے۔

سلیمہ: (گا کر) یا الٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل۔

نزع: (تقطیع کر کے) فاعلاتن، فاعلاتن فاعلن۔ واہ کیا
گلا پایا ہے۔

(نصیبن غصے میں بھری آتی ہیں)

نصیبن: لیجیے شربت ــ بی بی تم پیو گی تو گلا خراب ہو جائے گا۔

نزع: کوئی گلا وَلا خراب نہیں ہوگا اور نصیبن، جب ہم سلیمہ
خاتون کو سبق دیتے رہیں تو بیچ میں نہ آیا کرو۔

سلیمہ: (کھڑی ہو جاتی ہے) نہیں نصیبن بوا۔ اب میں چلوں گی
اماں سے کہنا ہے کہ نزع صاحب نے مجھے شاگردی میں
قبول کر لیا ہے۔

نزع : (خود بھی کھڑے ہو جاتے ہیں) ارے اتنی جلدی چلی جائیں گی آپ۔ ابھی تو ایک شعر بھی پورا نہیں ہوا۔

نصیبن : (الگ سے) ابھی تو مردار ساری غزل پوری ہونی ہے —

سلیمہ : آج اماں کی دوائی لانے جا رہی ہوں۔ کل سے پابندی کروں گی —

(بندگی کرکے چلی جاتی ہے)

(DISSOLVE)

(وقت : دن ، مقام : نزع صاحب کا گھر۔

نزع صاحب خود کو سنوارتے جاتے ہیں۔ نزع صاحب کی مونچھیں اب کالی ہیں۔ یہ ہونٹوں پر ڈھلی رہتی تھیں اب نوک دار اوپر کو کھڑی ہیں۔ وہ گنگناتے ہیں۔ یا الٰہی، یا الٰہی۔ اس بیچ کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور نزع صاحب مسرت سے دوہرے ہو جاتے ہیں۔ نصیبن آتی ہے)

نصیبن : میاں — میر امانت علی اور خاں صاحب آئے ہیں۔

نزع : (disappointed) بس چلے آتے ہیں — کہو بہت مصروف ہوں۔

نصیبن : ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ (آواز دبا کر) یہی دونوں تو سب سے زیادہ آپ کی واہ واہ کرتے ہیں۔

نزع : تو ایسا کرو — فی الحال انھیں ٹال دو — کہنا میں گھر میں نہیں ہوں۔ شام میں آئیں۔

نصیبن : (طنزیہ) آپ تو بہت زیادہ اس وقت گھر میں ہیں۔ فرش بدلوایا ہے — (سونگھ کر) اگربتیوں کی مہک یہ سب انہی کے لیے تو ہوگا۔

نزع : بکومت — جو تم سے کہا ہے وہی کرو۔

(اٹھ ... کر آواز آتی ہے ... نزع ...)

نصیبن : (دروازے کے پاس جاکر) میاں گھر میں نہیں ہیں شام میں آئیے گا۔

(میر صاحب کی آواز : نصیبن بوا۔ شام میں خیال رہے میں مرچ کچھ کم کھاتا ہوں۔

نصیبن : ہاں، جائیے جائیے مجھے یاد رہے گا۔ (آواز دبا کر) موئے ہمیشہ منہ پھاڑے ہی آتے ہیں۔

(کھونٹی پر سے اچکن اور ٹوپی اتار کر نزع کو دیتی ہے)

نزع : کیا کروں میں اس کا؟

نصیبن : بازار جائیے اور چینی لائیے۔

نزع : اور بابا جو سلیمہ خاتون آئیں گی تو درس تم دو گی؟

نصیبن : نہیں آئیں گی آج وہ۔

نزع : لیکن ... کیوں نہیں آئیں گی بھلا؟

نصیبن : آج ان کے گھر مہمان آنے والے ہیں۔ انھیں اپنی ماں کی مدد کرنی ہے۔

نزع : (غصے سے ٹوپی اور اچکن کھینچ لیتے ہیں اور دروازہ کھول کر نکل جاتے ہیں (کیمرہ نصیبن کے پاس بھرے چہرے پر جاتا ہے۔ سلیمہ آتی ہے۔)

(SCENE CHANGE)

کچن

سلیمہ : سلام نصیبن بوا (ان کے ہاتھ میں ایک کٹوری ہے)۔

نصیبن : (دانت پیس کر) آ گئی فتنہ، فساد کی جڑ (بآواز) تم تو آج نہیں آنے والی تھیں۔

سلیمہ : مہمانوں نے کہلوا دیا آج نہیں آئیں گے۔ میں نے سوچا چلی چلوں۔

نصیبن : (بیزار) وہ تمہارے استاد تو ہیں نہیں بازار گئے ہیں۔

سلیمہ : میں آج شاعری سیکھنے کب آئی ہوں بوا۔

نصیبن : تو کیا میری فاتحہ پڑھنے آئی ہو — کیا کام ہے؟

سلیمہ : تم نے کہا تھا گھٹنے میں درد ہے۔ سوچا لہسن اور تیل سے تمہاری مالش کر دوں۔

نصیبن : (...M-11 ... ... کر) ... صدقے

جاؤں، تم میرے لیے آئی ہو۔ مجھ نصیبوں جلی کے لیے۔

سلیمہ: بوا تم خود کو نصیبوں جلی کیوں کہہ رہی ہو ـــــ یہ گھر تمہارے ہی دم سے تو چل رہا ہے۔

نصیبن: (ٹھنڈی سانس) بی بی یہ تو دنیا کا چلن ہے۔ جوتی نہ ہو تو پاؤں چھلنی ہو جائیں، پھر بھی جوتی جوتی ہی رہے گی اور پھر اب تو وہ اپنا سارا کام تم سے لینے لگے ہیں۔ روغن بادام کی چمپی بھی تم کرتی ہو۔

سلیمہ: بوا، بزرگ ہیں میرے استاد ہیں۔ اماں نے بچپن ہی سے گھٹی میں ادب لحاظ بھر دیا ہے۔ اس لیے نا نہیں کر سکتی (رک کر) مگر ایک بات ہے بوا۔

بوا: کیا بات ہے؟

سلیمہ: اب رہنے دو۔

بوا: کہونا، مجھ سے کیا پردہ۔

سلیمہ: نہیں، تمھیں برا لگے گا۔

بوا: تمھیں سات پیروں کا واسطہ ـــ کہو۔

سلیمہ: بوا مجھے ان کی چمپی کرتے ہوئے ہیک آتی ہے۔ لاکھ دل کو سمجھاتی ہوں ہاتھوں کے نیچے ابو کا سر ہے لیکن دل نہیں مانتا (ابکائی)

بوا: یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔

سلیمہ: باتیں تو ہوتی رہیں گی بوا لاؤ تمھاری مالش کر دوں۔

نصیبن: بی بی اللہ تم کو دو جہاں میں سرخرو کرے سہرے کے پھول کھلیں۔ دودھوں نہاؤ۔

(سلیمہ گھٹنے کی مالش کرتی ہے۔)

(SCENE CHANGE)

وقت: دن، مقام: دہی ' نزرع کا کمرہ

(دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ نصیبن دروازہ کھولتی ہے۔ نزرع داخل ہوتے ہیں)

نصیبن: آگئے آپ ـــ لائیے چینی دیجیے۔

نزرع: (عطر کی شیشی دیتے ہوئے) چینی نہیں لائے ہم۔ یہ طاقچے میں رکھ دو۔

نصیبن: (سونگھ کر) عطر ہے ـــ شاید سلیمہ خاتون کے لیے۔

نزرع: تم اپنے کام سے کام رکھو جی۔

نصیبن: میں بھی کہے دیتی ہوں میاں۔ گھر کا خرچ اب مجھ سے نہیں چلتا ـــ میرا کیا ہے۔ میں تو گھر جن پرپلی ہوں۔ آپ اپنی فکر کیجیے گا۔

نزرع: ہونہہ ـــ بیر کی کانٹی کی طرح لپٹ پڑتی ہے۔

نصیبن: لو ـــ اب میں بیر کی کانٹی ہو گئی۔

نزرع: میں اندر جا رہا ہوں۔ کچھ دیر قیلولہ کروں گا۔

(نصیبن ہاتھ کے اشارے سے کہتی ہے، جو چاہو کرو)

(نزرع چلے جاتے ہیں۔ دروازہ دھڑ سے کھلتا ہے۔ مراد آتا ہے)

نصیبن: (چونک کر) اوئی، ... مر دودے۔

مراد: میرا نام مراد ہے۔

نصیبن: مراد ہو تو کیا مراد لے کر آئے ہو؟

مراد: واہ بوا ـــ تم بھی شاعر ہو..... اور ہونا بھی چاہیے۔ اتنے بڑے شاعر کے گھر کے تو برتن بھانڈے بھی شاعری کرتے ہوں گے۔

نصیبن: (دھیمے سے) آگ لگے شاعری کو..... یہ بھی اٹھائی دیوانہ نکلا (با آواز) تو یوں دروازہ توڑ کر تم شاعری سیکھنے آئے ہو ـــ؟

مراد: بوا، تم روشن ضمیر بھی ہو ـــ ہاں، میں نے سنا نزرع صاحب بے چوں و چرا شاگرد بناتے ہیں اس لیے ادھر کا رخ کیا۔

نصیبن: (کمر پہ دونوں ہاتھ) جانتے ہو ـــ موا گیدڑ شہر کا رخ کب کرتا ہے؟

مراد: میں گیدڑ نہیں ہوں بوا ـــ شاعری کا سچا عاشق ہوں۔ دنیا میں نام کمانا چاہتا ہوں۔ شاعری سیکھوں گا اور ہو گا کرستیا پہلوان کو چت کر دوں گا۔

نصیبن: ہائے اللہ ـــ دو دو بار ـــ بہت موئے۔
ـــ باہر نکل مسٹنڈے، تو پہلوان ہے؟

مراد: (ٹھنڈی سانس) پہلوان ہوں نہیں بوا ـــ پہلوان تھا ـــ ذلت قسمت میں لکھی تھی مستیا سے ہار گیا۔ اس کمینے نے کسی سے میری ہجو لکھوائی اور لونڈوں لپاڑیوں کو سکھا کر میرے پیچھے لگا دیا ـــ اب میں منہ چھپاتا پھرتا ہوں۔

نصیبن: ہمارے زمانے میں تو ہارنے والے کا منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھایا جاتا تھا ـــ تم سستے چھوٹے بچو ـــ

مراد: شکر ہے زمانہ بدل گیا بوا ـــ ورنہ میں کہیں کا نہیں رہتا۔

نصیبن: تمہارے حال پر مجھے ترس آتا ہے۔ مگر کیا کروں پہلوان، میاں نے شاگردی بند کر دی ہے۔

مراد: ایسا غضب نہ کرو بوا ـــ ان سے میری سفارش تو کرو۔

نصیبن: (کچھ سوچ کر) جب جاؤ گے تو پانی پینے کا کٹورہ تو نہیں چراؤ گے؟

مراد: نہیں ـــ لیکن لوٹے کی نہیں کہہ سکتا۔

نصیبن: میاں کی ٹوپی تو نہیں مارے جاؤ گے؟

مراد: نہیں ـــ لیکن بنیان کی نہیں کہہ سکتا۔

نصیبن: جب تمہاری اوقات اتنی ہے تو ہارو گے نہیں تو اور کیا ہوگا ـــ ایک بات اور ہے۔

مراد: دس باتیں پوچھو۔

نصیبن: دس نہیں بس ایک ہے ـــ اسے سن کر ٹھہرو تو تمہاری شاگردی پکی ورنہ اپنا راستہ پکڑو۔

مراد: بتاؤ کیا حکم ہے۔

نصیبن: اب میاں شاگردی کے پورے سو روپے مہینہ لیتے ہیں۔

مراد: سو روپے! ـــ یہ تو بہت زیادہ ہیں۔ اس سے اچھا تو یہ ہے کہ کسی شاعر کو پانچ روپے دے کر میں ہجو لکھوا لوں۔

نصیبن: اب تمہاری مرضی۔

مراد: ہونہہ ـــ پھر شرط یہ بھی کہ لوٹا اور بنیان تک کی چوری کی اجازت نہیں۔ نا بابا میں چلا ـــ

(سلیمہ خاتون اندر آتی ہیں)

سلیمہ: بوا، مولانا کی نسوار کی ڈبیا کہاں رکھی ہے؟

(مراد انھیں دیکھ کر بھونچکا رہ جاتا ہے)

مراد: اف بجلی سی گری ـــ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس معجونِ مرکب کی اتنی مفرح بیٹی بھی ہے۔

نصیبن: ہوش کی دوا کرو ـــ یہ ان کی بیٹی نہیں ـــ سلیمہ خاتون ہیں۔

مراد: اچھا اچھا ـــ سلیمہ خاتونیں ایسی ہوتی ہیں! بوا بوا ـــ میں سو روپے دوں گا۔ ضرور دوں گا اور کٹورا اور بنیان بھی نہیں چراؤں گا۔

(SCENE CHANGE)

مقام: کچن اور نزرع کے کمرے کی کھڑکی جہاں سے کچن نظر آتا ہے۔

وقت: دن۔

(کچن میں مراد، سلیمہ خاتون کو کچھ کھلا رہا ہے اور وہ بھی شرما کر اس کے منہ میں کباب ٹھونس رہی ہیں) ـــ نزرع اپنی کھڑکی سے یہ سین دیکھ کر پیچ و تاب کھاتے ہیں۔ نصیبن Dusting کر رہی ہیں)

نزرع: میرا ماتھا پہلے ہی ٹھنکا تھا اس بھگوڑے پہلوان کو دیکھ کر۔

نصیبن: (آ کر خود بھی کھڑکی سے جھانکتی ہے)

نزرع: دیکھ رہی ہو چہلیں۔

نصیبن: بچے ہیں میاں ـــــ ان کے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں۔

نزع: ہونہہ ـــــ بچے ہیں! نظروں کے داؤ پیچ چل رہے ہیں۔ اور تم کہتی ہو بچے ہیں اور وہ سلیمہ سیکھ چکیں شاعری۔ یہ منحوس ایسے گھر میں گھسا ہے کہ وہ بھی سب کچھ سیکھا ہوا بھول رہی ہیں۔ میرے سامنے تو سر سے پلو نہیں کھسکتا اور۔ ۔ ۔ ۔ یہ (کھڑکی سے سلیمہ اور مراد کا رومانس کیمرہ Catch کرتا ہے)

نصیبن: حلوہ بنایا تھا میں نے ہی بچوں سے کہا تھا چکھ لیں۔

نزع: ہر وقت باورچی خانے میں گھسا رہتا ہے ـــــ باورچی خانہ کیا اس کے باوا کا ہے۔ یہ آفت تم نے ہی میرے پیچھے لگائی ہے ـــــ یہ پہلوان تو میری شاعری کا کس بل نکالے دے رہا ہے۔

نصیبن: وہ سیکھے نہ سیکھے میاں ـــــ اس سے آپ کو کیا ـــــ ہر مہینے سو روپے تو دیتا ہے۔

نزع: (کیمرہ ہنستے ہوئے مراد پر جاتا ہے) مگر یہ اتنا ہنستا کیوں ہے۔ میں رقت میں ڈوبا شعر سناتا ہوں اور یہ کھیسیں نکال دیتا ہے۔ خدا کی قسم اس پہلوان کو چت نہ کیا تو نزع نام نہیں۔

نصیبن: (اکساتے ہوئے) مگر ہے بڑا گبرو۔

نزع: ابھی اس گبرو کو جھبرو بنا کر باہر نکالتا ہوں (کھڑکی سے سر نکال کر پکارتے ہیں) مراد۔ ۔ ۔ ابے او نامراد۔

مراد: (منہ میں کچھ بھرا ہوا) جی استاد (سلیمہ آڑ میں ہو کر جھانکتی ہے)

نزع: یہ نہ کوئی دنگل ہے نہ میں تیرا استاد ـــــ اسی وقت دفعان ہو جا تو یہاں سے۔

مراد: حضور اتنے بڑے شاعر ـــــ آپ کے منہ سے یہ ردیف قافیہ بھلا نہیں لگتا

نزع: (حقے کا پیچواں کھینچ کر) جاتا ہے کہ پیچواں سے ٹھکاؤں دو چار۔

مراد: ٹھہرو استاد۔ میں آ رہا ہوں ـــــ (کمرے میں آتا ہے) مجھے غصہ نہ دلاؤ استاد۔ ورنہ تم سے سیکھی ہوئی ہجو تم پر ہی لکھ دوں گا۔

نزع: اسے تو کیا، جو لکھے گا ہارے ہوئے پہلوان، میں خود تیرا مرثیہ لکھ رہا ہوں۔

مراد: استاد ہارے ہوئے تو تم لگ رہے ہو۔

نزع: نکلتا ہے کہ۔ ۔ ۔ ۔ کدھر ہے میرا پیچواں؟

مراد: (پیچواں کھینچ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے) پیچواں! ۔ ۔ ۔ ۔ لو یہ رہا۔ ۔ ۔ ۔ یہ رہا۔ ۔ ۔ ۔ یہ رہا میں جا رہا ہوں۔

نصیبن: بے کار تم نے للکارا میاں۔ ۔ ۔ ۔ اب تو حقے سے بھی گئے۔

نزع: چپ رہو تم۔ ۔ ۔ ۔ (کرسی پر بیٹھ کر) کہاں ہیں سلیمہ خاتون۔ کیا آج میرے سر میں چمپی نہیں ہوگی۔

نصیبن: کہاں ہیں سلیمہ خاتون۔ وہ روتی روتی کبھی کی چلی گئیں۔

(دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)

نزع: کون۔ ۔ ۔ ۔ کون ہے۔ ۔ ۔ ۔ اب کوئی شاگرد اس گھر میں نہیں گھسے گا۔

نصیبن: (دروازے سے جھانک کر) برقعے میں کوئی بی بی کھڑی ہیں۔

نزع: (کچھ سوچتے ہیں)

(برقعے میں سلیمہ خاتون کی اماں آتی ہیں)

اماں: مجھے شاعر اعظم مولوی تحسین احمد نزع سے ملنا ہے۔

نزع: مر گئے وہ۔

اماں: ہائے، کب۔ ۔ ۔ ۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ـــــ میں تو زندگی بھر ان کے لیے دعائے خیر کروں گی۔ انھوں نے میری لڑکی کو اعلیٰ پائے کا شاعرہ ہی نہیں بنایا بلکہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نزع : آپ ...... آپ سلیمہ خاتون کی ......

اماں : میں اماں ہوں سلیمہ خاتون کی ۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ میرے محسن آن کی آن میں چل بسیں گے ۔ انھوں نے سلیمہ خاتون کو شاعری ہی نہیں سکھائی بلکہ اس کے لیے مراد احمد جیسا خوب رو صالح نوجوان منگیتر ڈھونڈ دیا ۔ میں غریب چراغ لے کر بھی ڈھونڈتی تو ایسا داماد کہاں ملتا ۔

(نزع حقے کی ٹوٹی نے کو مروڑتے رہتے ہیں)

نصیبن : یہ تو سب ٹھیک ہے بی بی مگر سلیمہ خاتون کی اِس مہینے کی فیس کہاں ہے ۔

اماں : (برقعے میں سے ایک کتاب نکالتی ہے) اسی لیے تو میں آئی ہوں ۔ میرے شوہر مرحوم سلیمہ کے ابو ۔ ــــــ زندوں کو نہیں بخشتے تھے تو میں نزع ۔ .... نہیں مرحوم کا پیسہ ڈبو کر کیا کروں گی ــــ یہ .... سلیمہ کے ابو کا دیوان ــــ تم رکھ لو یوا اور پچاس روپے واپس کردو ۔

نصیبن : (حیرت سے) پچاس روپے واپس ۔

اماں : ہاں ــــ دیوان ڈیڑھ سو کا ہے ۔

نزع : (غصے سے بپھر کر) نصیبن ، نصیبن ان سے کہو چلی جائیں ۔ ورنہ میں خودکشی کرلوں گا ۔ سچ مچ مرحوم بن جاؤں گا ۔ اور یہ دیوان بھی لے جائیں ساتھ ۔

نصیبن : جاؤ بی بی جاؤ ــــ ہوا بدل رہی ہے ۔ چلی جاؤ اور یہ دیوان بھی لیتی جاؤ ۔

(اماں دھیرے دھیرے چلی جاتی ہیں ۔ نصیبن چھوڑنے جاتی ہے)

نزع : (ہانپتے ہوئے کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں) نصیبن ــــ .... کہاں مرگئیں ــــ روغن بادام کی مالش کرو ۔ سر میں ۔ دماغ پھٹ رہا ہے میرا ۔

نصیبن : (خوشی سے نکھر کر) لائی سرکار ابھی لائی ۔ (لپک کر بوتل لاتی اور بچاؤ سے سر میں مالش کرتی ہیں ۔ نزع آنکھیں بند کرلیتے ہیں ۔)

(FREEZE SHOT)

اسمٰعیل ظریفؔ
(حیدرآباد)

کیا کیا جائے

شہر میں شور شرابا ہے کیا کیا جائے
ہر ایک موڑ پہ خطرہ ہے کیا کیا جائے

جو گھر میں گیا رکھ دیں تحتِ جگر کی ہے آمد
نئے برس کا یہ تحفہ ہے کیا کیا جائے

یہ ٹی وی آیا ہے جس روز سے مرے گھر میں
عجیب گھر میں تماشا ہے کیا کیا جائے

گلی میں پھرتے ہیں بے خوف و بے جھجک لیکن
بس اپنے لوگوں سے پردا ہے کیا کیا جائے

ہے کالا چشمہ اُدھر اُن کی نیلی آنکھوں پر
ادھر بھی نمبری چشمہ ہے کیا کیا جائے

گلی میں اُن کی کوئی اب تو جا نہیں سکتا
اب اُن کے گیٹ پہ کتا ہے کیا کیا جائے

نئی کی بات پرانی میں آ نہیں سکتی
پرانی کار کھٹارا ہے کیا کیا جائے

بہو سے ساس کی بنتی نہیں کسی عنواں
کئی گھروں کا یہ نقشا ہے کیا کیا جائے

جو آ کے بہن کو پٹی پڑھا کے جاتی ہے
ہمارے بیٹے کی خالا ہے کیا کیا جائے

ہے تاک جھانک کی عادت جناب کو لیکن
اب ان کی کھڑکی پہ پردا ہے کیا کیا جائے

بگڑ کے باپ نے بیٹے کو کہہ دیا رو میں
تو ایک آلو کا پٹھا ہے کیا کیا جائے

یہ لین دین کی خواہش نہیں ہے بیٹے کی
بڑے حضرت کی تمنا ہے کیا کیا جائے

پتنگ کے واسطے آتا ہے جو مری چھت پر
وہ بازو والی کا لڑکا ہے کیا کیا جائے

ہیں چار بکریاں کتے ہیں مرغیاں بھی ہیں
ہمارے گھر کا یہ نقشا ہے کیا کیا جائے

اُڑان بھر کے جو چھت سے صحن میں آیا ہے
کسی پڑوسی کا مرغا ہے کیا کیا جائے

یہ بلدیہ بھی عجب بلدیہ ہے بلدیے کی
جدھر بھی دیکھیے کچرا ہے کیا کیا جائے

بغیر اس کے کوئی بات بن نہیں سکتی
ہر ایک شعبے میں چمچا ہے کیا کیا جائے

میں اُن کی شان میں گستاخی کر نہیں سکتا
جناب شیخ سے رشتا ہے کیا کیا جائے

اساتذہ کے بھی چربے غزل میں ڈھلتے ہیں
یہ شاعری کا تقاضا ہے کیا کیا جائے

جہاں بھی جاؤ گے محفل میں پاؤ گے اس کو
ظریفؔ داد کا بھوکا ہے کیا کیا جائے

اگر شادی ہوجاتی — لیلیٰ مجنوں کی!

غلام جیلانی
(حیدرآباد)

(ڈرامہ)

افراد: لیلیٰ - مجنوں
رابعہ - نعمان
بچہ - ملازم

پہلا سین: قیمتی اور جدید طرز کے فرنیچر سے سجا ہوا بیڈروم۔ ہر چیز سے قرینے اور اعلیٰ ذوق کا احساس ہوتا ہے۔ پچھلی طرف درمیان میں ایک خوب صورت سی فرنچ کھڑکی ہے جس پر مہین پردہ پڑا ہے۔ ہوا سے پردہ ہل اٹھتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ بیڈروم عمارت کی تیسری یا چوتھی منزل پر ہے اور باہر دور تک ریگستان کی ریت پر کھجور کے درخت اور نجر ٹیلے نظر آجاتے ہیں۔ ٹی وی کے آگے ایک تپائی پر چائے کا سامان رکھا ہے۔ لیلیٰ چائے بنا رہی ہے، مجنوں آرام کرسی پر نیم دراز سا اخبار پڑھنے میں مصروف ہے ـــــ دونوں عربی وضع کے گھریلو مگر قیمتی لباس میں ہیں۔

مجنوں (چونک کر، اخبار سے نظریں ہٹاتا ہے): جانتی ہو لیلیٰ کل ۲۸ر فروری ہے۔ . . .

لیلیٰ: جانتی ہوں۔

مجنوں: (مسکراکر): تو یہ بھی جانتی ہوگی کل ہماری شادی کو پورے دس سال ہوجائیں گے!

لیلیٰ: (مسکراتی ہے): ہاں ـــ جانتی ہوں۔ حالاں کہ اس بات کا یقین نہیں آتا!

مجنوں: یقین نہیں آتا؟ . . . . یہ کیوں؟

لیلیٰ: پتہ ہی نہیں چلا، کب اور کیسے گزر گئے یہ دن، . . . اتنے برس!

مجنوں: ہاں لیلیٰ، زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

لیلیٰ: لگتا ہے، جیسے کل تک ہم فراق کے گیت گاتے پھرتے تھے . . . . . اور آج بچوں کی طرح محبت کے ترانے گاتے پھر رہے ہیں . . . .

قیس! . . . اب ہمیں لحاظ رکھنا چاہیے، ہم اب بچے

والے [smudge] گئے ہیں:

مجنوں: قاسم کہاں ہے؟

لیلیٰ: اسکول کے بچوں کے ساتھ آئیل ریفائنری دیکھنے گیا ہے۔ تم سے کل کہہ تو رہا تھا!.....

مجنوں: ہاں، ہاں۔ کہا تھا۔ بھول گیا تھا..... بات اصل میں یہ ہے لیلیٰ کہ مجنوں کو لیلیٰ کے سوا کچھ یاد ہی نہیں رہتا!

[لیلیٰ خوشی سے مجنوں کو دیکھتی ہے لیکن ایک خادم کمرے میں آتا ہے]

خادم: آقا نعمان صاحب کا غلام آیا ہے۔ آپ کو فوراً اپنے بنگلے میں بلایا ہے۔

[لیلیٰ اور مجنوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں خادم واپس چلا جاتا ہے۔]

لیلیٰ (چہرے پر قدرے تشویش کے آثار): ایسی کیا بات ہوئی کہ نعمان بھائی نے....

مجنوں: (اخبار رکھ کر اٹھتے ہوئے): ارے کچھ نہیں لیلیٰ، وہی پرانی بات........ لڑائی، جھگڑا..... بات بے بات!..... کہ بھائی آؤ، صلح صفائی کرادو۔

لیلیٰ: یہ نعمان بھائی رابعہ کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟

مجنوں: خوب!..... گویا رابعہ کبھی پیچھے نہیں پڑتی؟....

لیلیٰ: پڑتی ہوگی۔..... سوال یہ نہیں ہے کون کس کے پیچھے پڑتا ہے۔...... تعجب تو یہ ہے کہ ان دونوں نے بھی محبت کی شادی کی تھی!.... ہے نا قیس؟

مجنوں: اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

لیلیٰ: کیوں نہیں ہے؟..... کیا تمھیں حیرت نہیں ہوتی؟........ اس طرح روز، روز، بچوں کی طرح لڑتے رہنا، محبت کی شادی کی توہین نہیں ہے؟.... (رک کر) کیا ہماری مثال سامنے نہیں ہے؟

مجنوں: (مسکرا کر) کون سی مثال؟.....

لیلیٰ: محبت کی!..... جو شادی سے پہلے تھی، وہی آج بھی ہے۔

مجنوں: محبت کو لڑائی سے کیا تعلق؟

لیلیٰ: یہ کیسی بات کہہ رہے ہو قیس!...... ہم کبھی لڑے ہیں جو.....؟

[باہر سے نعمان اور رابعہ کی لڑائی کی چیخ پکار سنائی دیتی ہے۔ دونوں جھگڑتے ہوئے اندر آجاتے ہیں۔ ـــ رابعہ کے ہاتھ میں برقعہ ہے]

رابعہ: (برقعہ ایک طرف کرسی پر پھینکتے ہوئے): قیس بھائی..... آج تصفیہ کر دیجیے۔

مجنوں: پہلے بیٹھ تو جاؤ رابعہ۔ کہاں سے آرہی ہو، گھر سے؟

رابعہ: وہ اب میرا گھر نہیں رہا۔

مجنوں: میں تو بھی خود آرہا تھا تمھارے گھر...... نعمان نے نہیں بتایا تمھیں؟

رابعہ: رابعہ: بتایا تھا،... مگر اب میں اس گھر میں ٹھہرنا نہیں چاہتی تھی۔

نعمان: اور میں یہ سمجھا، رابعہ اپنے میکے جارہی ہے؛ اس لیے موٹر لے کر لپکا!.... کہ غصے میں اکیلی جارہی ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا وہ تمھارے یہاں آرہی ہے!

رابعہ: دیکھا قیس بھائی؟..... مجھے میکے پھینک آنے، نعمان کیسا موٹر لے کر لپکا؟ خوشی خوشی؟

مجنوں: نعمان۔ کیا بات ہے؟.... بولتا کیوں نہیں؟... کیا ہوا؟

رابعہ: یہ نہیں بولے گا۔ میں بتاتی ہوں۔ یہ دوسری شادی کے چکر میں ہے.............

لیلیٰ : کیا؟

رابعہ : (اپنی رو میں) قبیلے کے سردار کی بیٹی ہے۔ بہت سا روپیہ ملے گا۔ LATEST A.C. JAPANESE کار؟....

..... اور.....

نعمان : بس، بس۔ اب چپ رہو رابعہ...... یہ سب بکواس ہے مجنوں.... اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

رابعہ : ہاں، ہاں۔ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے، کھری کھری سنا دیتی ہوں نا؟

دراصل اس کا جی بھر گیا ہے مجھ سے، بیزار رہنے لگا ہے..... قیس بھائی ابھی چند دن پہلے یہ نعمان، کیمی کے ساتھ ڈیپ اینٹی ڈیزرٹ میں ویک اینڈ منانے گیا تھا.... اونٹ پر بیٹھ کر.... تیسرے دن واپس آئے دونوں!

نعمان : یہ جھوٹ ہے، بہتان ہے۔ دوسرے ہی دن آ گئے تھے۔

رابعہ : سن لیا لیلیٰ آپا؟ اب میں کیوں رہوں یہاں؟... مجھے طلاق کیوں نہیں دے دیتا؟ اسی سے کیوں نہیں کر لیتا؟ .....کیمی ڈارلنگ سے.......

ماڈلنگ بھی کرتی ہے۔ خوب کما کر بھی لائے گی....

موا منہ (نقل کرکے) ..... انگلینڈ سے آئی ہے، ڈیزرٹ دیکھنے!۔

[برقعہ اٹھا کر باہر جانے لگتی ہے۔ دروازے پر رک کر زور سے کہتی ہے]

..... اور جب وہ اونٹنی مجھے اپنی پیٹھ پر سے پٹک دے گی، تو چیختا، چلاتا، روتا ہوا آئیو نہ، پاس مت آئیو..... سمجھا؟ (چلی جاتی ہے)

نعمان : (لیلیٰ اور مجنوں کی طرف دیکھ کر) اس کی باتوں پر یقین مت کرنا....

[نعمان بھی اسی دروازے سے باہر چلا جاتا ہے۔

لیلیٰ اور مجنوں چپ چاپ اسی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔

پردہ گرتا ہے]

دوسرا سین :

لیلیٰ اور مجنوں کسی بڑھیا سوپر مارکٹ میں شاپنگ کر کے باہر نکل رہے ہیں۔ عقب میں سوپر مارکٹ کا "خروج" (EXIT) کا دروازہ نظر آ رہا ہے اور کئی دوسرے لوگ بھی ٹرالیز یا ہاتھوں میں سامان لیے باہر نکل رہے ہیں۔ لیلیٰ کے ایک ہاتھ میں پرس لٹک رہا ہے۔ دوسرے ہاتھ سے ٹرالی ڈھکیل رہی ہے جس میں تھوڑا سا سامان رکھا ہے۔ سامان کے کئی پیکٹ مجنوں ہاتھوں میں اس طرح اٹھائے ہوئے ہے کہ ان کے پیچھے اس کا چہرہ چھپ گیا ہے۔

ایک شخص صاف ستھرے یونیفارم میں ملبوس قریب آ کر لیلیٰ اور مجنوں سے ادب کے ساتھ کہتا ہے "آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں جا کر آپ کے ڈرائیور کو گاڑی کے ساتھ بھیجتا ہوں" اور جلدی سے چلا جاتا ہے۔

ساتھ ہی ایک چھوٹا سا بچہ بھاگتا ہوا آتا ہے ــــ اور لیلیٰ سے کہتا ہے۔

بچہ : میڈم..... میڈم..... آپ لیلیٰ ہیں نا؟

لیلیٰ : ہاں۔

بچہ : مجنوں والی لیلیٰ.....؟

لیلیٰ : ہاں، ہاں وہی لیلیٰ.....

بچہ : (اشارا کرتے ہوئے) اور یہ قیس ہیں؟

مجنوں (خوش ہو کر پیکٹوں کے پیچھے سے چہرہ نکالتے ہوئے) ہاں... ــ ہاں۔ میں ہی قیس ہوں۔

بچہ : (آٹو گراف بک اور قلم بڑھاتے ہوئے) : مہربانی سے آٹو گراف.....

لیلیٰ : (جلدی سے) : وہ کہاں دے سکتے ہیں!.....

دیکھتے نہیں؟ ..... لاؤ میں دے دیتی ہوں۔

[بچہ مجبوراً لیلیٰ کے آٹوگراف لے کر چپ چاپ چلا جاتا ہے۔ فوراً ہی یونیفارم والا شخص آکر کہتا ہے ——

کار آگئی ہے جناب ..... اور بڑھ کر مجنوں کے ہاتھوں سے سارے پیکٹ اٹھا کے لے جاتا ہے۔

. . . .

. . . . . مجنوں لمبا سانس لیتے ہوئے ہاتھ جھاڑتا ہے]

مجنوں: (دکھ بھری) فاختہ .... اور کوا انڈے کھائے!

لیلیٰ: کیا مطلب؟

مجنوں: مطلب یہ کہ شہرت ہو ہماری .... اور آٹوگراف دیں آپ ....!

لیلیٰ: تو کیا ہوا!! ... میری شہرت کیا کم ہے؟ ..... اور پھر اس وقت تم ....

مجنوں: ہاں، ..... نوکر کی طرح سامان ڈھو کر لا رہا تھا۔

لیلیٰ: تو کیا میں نے آٹوگراف دے دیا تو تمھیں ..... بُرا لگا؟

مجنوں: .... خیر۔ چھوڑو ان باتوں کو ..... (اس دوران میں ڈرائیور آکر لیلیٰ کے آگے سے ٹرالی دھکیل کر لے جاتا ہے) ..... یوں بھی لیڈیز فرسٹ (Ladies first) تو ہوتا ہی ہے ..... دیکھو نا۔ دنیا بھی لیلیٰ مجنوں کہتی ہے؟ ... مجنوں لیلیٰ کوئی نہیں کہتا .... آؤ چلیں۔

[مجنوں کے پیچھے لیلیٰ بھی ایک دو سکنڈ کے توقف سے چلی جاتی ہے ..... پردہ گر جاتا ہے]

تیسرا سین

[لیلیٰ اور مجنوں کے گھر کا بیڈ روم ....
ٹی وی میں کسی مصری مغنیہ کا پروگرام ہو رہا ہے اسے بند کر کے مجنوں بستر پر آبیٹھتا ہے اور ایک سگریٹ سلگاتا ہے۔
لیلیٰ سنگھار میز سے اٹھ کر آتی ہے، اور سگریٹ لے کر ایش ٹرے میں بجھا دیتی ہے۔]

لیلیٰ: اتنے سگریٹ پینے سے منع کیا ہے ڈاکٹر نے۔

مجنوں (محبت بھرے انداز میں) ڈاکٹر کا نہیں، ہم تو تمہارا کہنا مانتے ہیں۔

[لیلیٰ مسکرا کر مجنوں کو دیکھتی ہے اور واپس سنگھار میز کے سامنے جا کر بیٹھ جاتی ہے]

لیلیٰ: ... اچھا بتاؤ مجنوں —— یہ نعمان اور رابعہ کو کیا ہو گیا ہے؟ ..... ان میں تو اتنی محبت تھی!

مجنوں: شادی کے بعد یہی ہوتا ہے لیلیٰ ..... اصل چیز برداشت ہے ..... برداشت کی قوت چاہیے۔

لیلیٰ: ..... کسے چاہیے؟

مجنوں: نعمان کو ..... میرا مطلب ہے شوہر کو۔

[لیلیٰ پلٹ کر ایک دو سکنڈ مجنوں کی طرف دیکھتی ہے۔ پھر اپنے ناخنوں کی پالش میں لگ جاتی ہے]

لیلیٰ: بیوی کو بھی تو چاہیے! ... کتنے ایسے موقعے آتے ہیں جب برداشت سے کام لینا پڑتا ہے۔

مجنوں: (بستر پر لیٹتے ہوئے): ہاں۔ وہ تو ہے ... لیکن ایسے موقع شوہر کے لیے زیادہ آتے ہیں۔

لیلیٰ: (پلٹ کر): جی؟

مجنوں: ہاں لیلیٰ تم نہیں جانتیں ..... کتنی بار ایسے موقعے آئے اور ٹل گئے ..... میں نے تمھیں پتہ بھی نہیں چلنے دیا۔

لیلیٰ: تم برداشت کر گئے؟ .....

مجنوں: ہاں۔ اور کیا۔

لیلیٰ: اور مجھے ایسے موقعے کبھی نہیں آئے؟

مجنوں: آئے ہوں گے ..... مگر بہت کم۔

[لیلیٰ اٹھ کر قریب آجاتی ہے۔ آواز اور چہرے سے
غصہ اور رنج دونوں جھلک رہے ہیں]
لیلیٰ: تم آج یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟ ..... مجنوں ....
تم اتنے سخت دل ہو جاؤ گے، میں نے سوچا بھی نہیں
تھا ... کیا تمھاری وہ محبت ختم ہوگئی؟
مجنوں: (اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے) میں تو صرف حقیقت
بتا رہا ہوں .... ورنہ محبت تو اب بھی ....
لیلیٰ: (بات کاٹ کر) نہیں۔ اگر ہوتی تو صرف اسی کی خاطر
تم اس وقت میری بات مان لیتے۔
مجنوں: میری محبت تو ساری دنیا جانتی ہے لیلیٰ .....
تمھاری خاطر، عقل رکھتے ہوئے، مجنوں کہلایا؟ ...
.... میرے عشق کو دماغ کا خلل بتایا گیا .....
سب کے طعنے سنے، بچوں کے پتھر سہے .....
در بدر مارا مارا پھرا۔ تم میری محبت کا مقابلہ کیا کر
سکتی ہو؟
لیلیٰ: کیا میں نے کہیں کوئی کمی کی؟ .... کوئی کسر
اٹھا رکھی؟ .... میں ضد نہ کرتی کہ قیس جنگل میں
اکیلا ہے مجھے جانے دو، تو کیا ابا کو تم پر رحم آتا؟۔
تم سے میری شادی کے لیے تیار ہو جاتے؟
مجنوں: ارے وہ تو اس لیے ہو گئے کہ ..... میں کوئی
جہیز یا روپیہ نہیں مانگ رہا تھا ــــ
لیلیٰ: کیا کہا؟ .... اس لیے تیار ہو گئے؟ .....
اور تم روپیہ مانگتے بھی تو کس منہ سے؟ تم میں قابلیت
ہی کیا تھی؟
مجنوں: قابلیت؟ .... لیلیٰ تم جانتی ہو۔ میں تو شروع ہی
سے تمھارے عشق میں تباہ رہا .... اسکول میں
ہی کیا تھی؟

...... اسکول میں سلیٹ پر بھی تمھارا نام لکھ لکھ کر
مٹاتا رہا۔ اور استاد سے پٹتا رہا۔ اب پڑھتا کہاں
سے؟
لیلیٰ: بہانے مت بناؤ۔ تم ہمیشہ سے نکمے رہے۔ جاہل اور
بے وقوف ...... محنت سے اسٹڈی کرتے تو آج
سول سروس پاس نہیں ہوتے! عزت داروں میں نام
نہیں ہوتا؟
مجنوں: اور پھر تمھارا نام دنیا میں مشہور کون کرتا؟
لیلیٰ: بھاڑ میں جائے نام — دنیا مجھے ایک پاگل کی بجائے
بڑے افسر کی بیوی تو کہتی، پوزیشن تو ہوتا۔!
مجنوں: تو اب پوزیشن نہیں ہے؟
لیلیٰ: ہے۔ مگر یہ سب تو میرے ابا کا دیا ہوا ہے۔ ان کی
دی ہوئی دولت پر اتراتے۔ تمھیں شرم آنی چاہیے۔
مجنوں: سنو لیلیٰ۔ تم نے یہ باتیں کر کے میرا دل توڑ دیا ہے...
تمھارے پاس میری یہ قدر ہے! جانتی ہو تم سے کہیں زیادہ
خوب صورت لڑکیاں مجھ پر مرنے لگی تھیں، مگر میں نے
کسی کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اپنی بے مثال محبت
سے تمھیں انٹرنیشنل فیگر بنا دیا!۔ تمھارا نام گنیس بک
میں بھی شاید آجائے گا اور تم ہو کہ .... لقمان سچ
کہتا تھا۔
لیلیٰ: ... کیا کہتا تھا؟ ــ
مجنوں: یہی کہ بیوی محبوب نہیں بن سکتی .....
افسوس! میں نے کیسی بے وقوفی کی!
لیلیٰ: تو اب کون سی دیر ہوئی ہے؟ ..... کوئی محبوب
ڈھونڈھ کیوں نہیں لیتے؟ ــ
[لیلیٰ تیزی سے الماری کھول کر برقعہ نکالتی ہے۔
اور جلدی جلدی پہننے لگتی ہے۔ مجنوں پریشان سا
دیکھ رہا ہے .... پردہ گرتا ہے]
●

پاگل عادل آبادی

خلیج میں

کیا ہو رہا ہے یارو تماشہ خلیج میں کھنچنے لگا ہے جنگ کا نقشہ خلیج میں
لنگوٹ کس کے سارے پہلوان ڈٹ گئے کشتی کا کھل گیا ہے اکھاڑہ خلیج میں
ہر کوئی کھینچنے لگا اک دوسرے کی ٹانگ اندھے سے جاکے بھڑ گیا لنگڑا خلیج میں
مونچھوں پہ تاؤ دیتا ہے صدام تو مگر بش بھی دکھائے جاتا ہے نخرہ خلیج میں
اک ہاتھ میں ہے فاختہ، اک ہاتھ میں ہے بم ہے دھمکیوں کا دھوم دھڑکا خلیج میں
نغمے بھی گائے جاتے ہیں امن و امان کے اور بج رہا ہے جنگ کا تاشہ خلیج میں
بم گر رہے ہیں روز سوال و جواب کے طے ہو رہا ہے موت کا سودا خلیج میں
چنگاری کی بس ایک ضرورت ہے دوستو بارود کا ہے جمع ذخیرہ خلیج میں

پاگل ہے بات کہتا ہے پھر بھی یہ ہوش کی
پیٹرول کا ہے سارا یہ جھگڑا خلیج میں

وہ میک اپ سے جھریاں چھپانے لگے ہیں پرانے کھنڈر کو سجانے لگے ہیں
ہنی مون ہی سے وہ شوہر کو اپنے کچن کی ٹریننگ دلانے لگے ہیں
نشے میں سمجھ کر آتے غسل خانہ گٹر کے وہ اندر نہانے لگے ہیں
منسٹر بنائیں تو بولے وہ ہنس کر گدھے گلگلے کب سے کھانے لگے ہیں
میرے ہوش گم ہیں حجامت کے ڈر سے وہ سگنل پہ سگنل گرانے لگے ہیں
عجب دور ہے اب تو شرفا بھی یارو کمینوں کو سر پر بٹھانے لگے ہیں

کبھی جلدی جلدی، کبھی ہلّو ہلّو
وہ پاگل کو پاگل بنانے لگے ہیں

عاتق شاہ (حیدرآباد)



قینچی بڑے کام کی چیز ہے کوئی چاہے تو اسے چاقو کی طرح بھی استعمال کرسکتا ہے۔ لیکن چاقو، چاقو ہے اور قینچی قینچی۔ اچھی قینچی سو دو سو روپیوں سے لے کر دو ہزار روپیوں تک آتی ہے جاپان یا جرمنی کی قینچی نہ صرف معیاری ہوتی ہے بلکہ برسوں چلتی ہے آنکھیں بند کرکے اسے خریدا جاسکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہمارے دیس میں ڈپلیکیٹ قینچیاں بھی بننے لگی ہیں جن پر میڈ ان جاپان یا جرمنی کندہ ہوتا ہے۔ ان کی شناخت مشکل ہے۔ مشکل کیا بلکہ ناممکن ہے۔ کوئی اصلی اور نقلی دواؤں کو نہ پہچان سکے تو انھیں کیا پہچانے گا۔ یہ تو مریض کی موت کے بعد یا قینچی کے ناکارہ ہونے کے بعد ہی پتہ چلتا ہے کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔ لیکن چاقو کے معاملے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔ یہاں چاقو اصلی اور اوریجنل ملتے ہیں چھوٹے بڑے اور قسم قسم کے۔ شہر کی کسی بھی سڑک اور شاہ راہ پر نکل جائیے آپ کو فٹ پاتھوں پر بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے چاقو نظر آئیں گے۔

کوئی بھی کسی ہچکچاہٹ کے بغیر چاقو خرید سکتا ہے۔ لیکن یہ احتیاط ضروری ہے کہ آپ اپنے لباس کے اندرونی جیبوں میں اسے اس طرح چھپالیں کہ پولیس کے ہاتھ وہاں تک نہ پہنچ سکیں! کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ بھئی یہ کیا تک ہے! جب کھلے بازار میں چاقو فروخت ہورہا ہے تو اسے خرید کر جیب میں رکھنا یا گھر میں رکھنا کون سا جرم ہے؟ اس معقول سوال کا کوئی نامعقول ہی جواب دے سکتا ہے۔ ویسے اپنی تسلی کی خاطر کسی بھی زبان کے ایڈیٹر کو خط لکھا جاسکتا ہے کہ مفادِ عامہ کی خاطر اسے مراسلوں کے کالم میں چھاپے اور بتائے کہ جب چاقو بیچنے والا مجرم نہیں تو خریدنے والا کیوں کر مجرم کہلایا جاسکتا ہے؟ یقین ہے کہ اس پر ہر پڑھا لکھا دانشور اظہارِ خیال کرے گا اور عوام کی معلومات میں اضافہ کرے گا۔ اگر اس موضوع پر آل انڈیا بنیادوں پر شہر کے کسی ایرکنڈیشنڈ ہال میں سمینار ہی منعقد ہوجائے تو کیا ہرج ہے۔ قومی مفاد میں یہ بے حد ضروری ہے۔ چند گھنٹوں کی گفتگو کے بعد کچھ تو بات بنے گی۔ اگر نہیں تو ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ دور دراز کے مقامات پر رہنے والے بچھڑے دوست ایک جگہ جمع ہوجائیں گے اور کچھ کھائی کر، ہنس بول کر پھر کسی دوسرے سمینار میں ملنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوجائیں گے!

قینچی ایک ایسا آلہ ہے جو لوہے کی آڑی ترچھی اور ٹیڑھی میڑھی سلاخوں کو جوڑ کر بنایا جاتا ہے۔ قینچی چلانا ایک مشہور محاورہ ہے جس میں ایک پہلوان دوسرے حریف پہلوان کی ٹانگوں میں اپنی ٹانگیں ڈال کر اسے چت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جیت اسی کی ہوتی جس کی ٹانگوں میں دم ہے اور بازوؤں میں قوت۔ مغلیہ دور میں اس فن کو بہت بڑھاوا ملا اور جیتنے والے پہلوانوں کو انعامات سے نوازا گیا۔ ہندوستان پر قبضے کے بعد انگریز سامراج نے نہ صرف اس خوب صورت فن کو باقی رکھا بلکہ اسے آرٹ کا درجہ دے کر دیسی ریاستوں کے حکمرانوں، رجواڑوں اور کم و بیش تمام عوام کو کشتیوں کے مقابلوں، مرغوں کی لڑائیوں اور پتنگ بازی کے دلچسپ تماشوں میں مصروف رکھا۔

قینچی چلانے سے بات چلی اور بیچ میں انگریز آگیا اور انگریز کو آنا ہی چاہیے تھا۔ انگریز کے بغیر کوئی بات آگے بڑھتی ہے اور نہ ختم ہوتی ہے۔ اب دیکھیے نا انگریز کو یہاں سے رخصت ہوئے قریب قریب نصف صدی ہو رہی ہے۔ لیکن ہم انگریزی زبان بول کر اور اس کے چھوڑے ہوئے لباس کو پہن کر اس حد تک اکڑتے ہیں کہ انگریز بھی شرما جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم سب اس نازک مسئلہ پر غور کرنا نہیں چاہتے۔ اور ہمیں غور کرنا بھی نہیں چاہیے۔ ایسی لاحاصل اور فضول باتوں پر توجہ دینے سے دماغ متاثر ہوتا ہے اور اس کا اثر معدہ پر پڑتا ہے۔ نتیجتاً کبھی ڈکاریں آتی ہیں اور دن میں آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگتے ہیں۔ لہٰذا اچھا کھائیے۔ اچھا پہنیے اور بڑھیا سوٹ پہنیے اور مرجائیے۔ کلچر و لچر کی بات تو ان فالتو قسم کے لوگوں کا پروپگنڈہ ہے جو دنیا میں کسی کام کے قابل نہیں ہوتے۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جن کی جیب میں چھوٹی کوڑی بھی نہیں ہوتی۔ البتہ آپ کو کچھ شوق ہے تو کلچرل پروگراموں کی سرپرستی میں کوئی ہرج نہیں۔ کبھی کبھار آرٹ اور کلچر پر ایک آدھ پمفلٹ پڑھ کر اظہار خیال بھی کر لیجیے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ ایسے جلسوں میں بڑھیا اور معیاری سوٹ زیب تن کر کے جائیں۔ ایسے کہ کوٹ اور پتلون کی کریز میں رتی برابر بھی جھول نہ آنے پائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ٹیلر بھی موڈرن ہو اور بدلتے ہوئے جدید فیشن کے لباس کی وضع قطع سے اچھی طرح واقف ہو۔ اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے کہ ٹیلر، فل سوٹ کی اسٹیچنگ کے لیے دو ہزار روپیے لے رہا ہے یا تین ہزار۔ یاد رہے کہ قیمتی کپڑا "درزی" جیسے اناڑی کے ہاتھوں میں جا کر اپنا سارا حسن کھو دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہی "درزی" اگر راتوں رات ٹیلر بن جائے اور اپنی دکان پر ٹیلرنگ سنٹر کا بورڈ لگا کر کاروبار شروع کر دے تو اس کے یہاں اسٹیچنگ کروانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کم از کم کسی معترض کو کوٹ یا شرٹ کا کالر الٹ کر بتایا تو جا سکتا کہ دیکھو ـــــ لیبل دیکھو ـــــ دیکھو اس کی اسٹیچنگ کہاں ہوئی ہے۔ بی بی ٹیلرنگ سنٹر، ڈپلوما ہولڈر لندن انسٹی ٹیوٹ ـــــ

کٹنگ ٹیبل پر شرٹ پتلون میں ملبوس ٹیلر منہ میں سگریٹ دبائے اور گلے میں ٹیپ ڈالے جب قینچی چلاتا ہے تو ٹیلرنگ شاپ کے صوفوں میں دھنسے ہوئے وائٹ کالر اسکالر ٹیلر بڑی پُرشوق نگاہوں سے اسے دیکھتے ہیں اور شاید یہ بھی سوچتے ہیں کہ کاش وہ بھی ٹیلر ہوتے۔ خواہ مخواہ انھوں نے عمر عزیز کو داؤ پر لگا کر اتنی بڑی بڑی ڈگریاں لیں اور ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔ اگر کوئی ٹیلر کی فیٹ کار سے متاثر ہو کر اپنا پیشہ بدلنے کی کوشش کرے تو یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہوگا۔ کیوں کہ اسکالر یا پروفیسر یا لکچرر آخر عمر میں ٹیلر بننے کے بعد سارے شہر کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ وہ ایسا لباس تیار کرے گا کہ پہننے والے کا حلیہ ہی بگڑ جائے۔ لیکن ٹیلر اگر لکچرر یا پروفیسر بن جائے تو فائدہ

ہی فائدہ ہے . . . .

سنا کہ ٹیلر حضرات کبھی اپنے بچّوں کے لیے کپڑا نہیں خریدتے۔ گاہکوں کے کپڑوں میں سے اتنا بچا لیتے ہیں کہ ان کی گھریلو ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ محض افواہ ہو اور کسی دل جلے نے یہ خبر اُڑا دی ہو۔ لیکن قینچی کی کرامات سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے!

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ قینچی بڑے کام کی چیز ہے۔ چاقو سے لے کر ٹیلرنگ ٹیبل تک وہ یوں کُر کُر چلتی ہے جیسے کسی خاتون کے منہ میں زبان۔ یہ بھی ایک محاورہ ہے جو مرد حضرات نے خواتین کے تعلق سے وضع کیا۔ (حالاں کہ محاورے وضع نہیں ہوتے) قینچی کی طرح عورتوں کی نہیں بلکہ مردوں اور صرف مردوں کی زبان چلتی رہتی ہے (استثنائی صورتوں کو چھوڑتے ہوئے) دن بھر اور رات کے بڑے حصّے تک وہ مسلسل بولتے جاتے ہیں۔ دراصل اس محاورے کے ذریعے عورتوں کو بدنام کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ایک ہی سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ مردوں کے ہاتھوں میں چوں کہ قلم تھا، اس لیے انھوں نے اپنے قلم کا ناجائز استعمال کیا۔ اگر اس قلم کو چھین کر عورتوں کے ہاتھوں میں دے دیا جائے تو پتہ چلے گا کہ عورتوں کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے یا مردوں کی!

میڈیکل سائنس میں قینچی کا بہت ہی اہم اور مثبت رول ہے۔ معمولی سرجری سے لے کر آپریشن تک اور ہارٹ کے آپریشن سے لے کر "سیزیرین بے بی" تک قینچی نے تخلیقی کام انجام دیا ہے۔ سائنس کی دنیا میں یہ وہ کارنامہ ہے جسے انسانیت کبھی نہیں بھلا سکتی۔ لیکن کیا یہ الجھن کی بات نہیں ہے کہ اردو میں اس "بے بی" کو آخر کس نام سے پکارا جائے؟ قینچی کا بیٹا یا بیٹی کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی پتھر کو اٹھا کر کسی کے منہ پر مار دے۔ یورپ کے سائنس داں بڑی آسانی کے ساتھ آلتو فالتو قسم کے لفظ استعمال کر لیتے ہیں۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ ایسے الفاظ سے کتنی مضحکہ خیز سچویشن پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اب ہم اردو والوں کا کام ہے کہ لفظی ترجمے کی بجائے کوئی موزوں اور مناسب نام تجویز کریں۔ اصل میں اس کا تعلق بڑی حد تک عصری حسّیت سے ہے۔ دیسے صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے۔

اگر قینچی نہ ہوتی تو اس سماج کا ہر فرد بالوں سے ڈھکا ہوا وہ ریچھ ہوتا جو جنگل سے بھاگ آیا ہو۔ یہ قینچی کا فیض ہے جس نے آدمی کو آدمی باقی رکھا۔ حجام یا ہیر ڈریسر کے ہاتھوں میں جب قینچی تیز تیز چلنے لگتی ہے تو کُر کُر اور چق چق کی ہلکی سی موسیقی چاروں طرف پھیلنے لگتی ہے اور ترشے ہوئے بال جب کندھوں سے ہوتے ہوئے فرش پر گرنے لگتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے سر پر سے منوں بوجھ ہٹ گیا ہے اور طویل بیماری کے بعد مریض شفایاب ہو کر زندگی کی طرف پھر قدم اٹھا رہا ہے۔ لیکن ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں کو دیکھ کر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنے سروں پر بالوں کا منوں بوجھ لیے کیسے گھومتے ہیں۔ بہرحال ہمت کی داد دینی پڑتی ہے!

لیکن قینچی کے چند منفی پہلو بھی ہیں۔ جہاں تک ادبی حلقوں کا تعلق ہے اردو کے کم و بیش تمام نقّادوں کے ہاتھوں میں ایک قینچی ہے۔ بڑی قینچی بڑے نقّاد کی نشان دہی کرتی ہے اور چھوٹی قینچی چھوٹے نقّاد کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ چھوٹا نقّاد بڑا نقّاد کہلانے کے شوق میں چھوٹی قینچی پھینک کر بڑے سائز کی قینچی بازار سے خرید لاتا ہے۔ لیکن اس بات کا وہ ضرور خیال رکھتا ہے کہ وہ یہاں انگلینڈ یا امریکہ ہو۔ کبھی کا خیال ہے کہ آج اردو ادب کو ایک صدام حسین کی ضرورت

ہے جو نقادوں کی "شیخوں" جیسی حرکات ختم کرکے عوامی اور سائنٹیفک نکتہ نگاہ سے ادب کا جائزہ لینے کی پابندی لگادے۔ یہ ایک انتہائی تشویش ناک خیال ہے۔ فکر اس بات کی ہے کہ یہ بے چارے یتیم نقاد آخر کہاں جائیں گے؟ ویسے مذہب ہمیں سکھاتا ہے کہ یتیموں کے سر پر شفقت سے اپنا ہاتھ رکھو!

ان کے علاوہ قینچیاں اور بہت سے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں سنسر بورڈ کے ممبر، انکم ٹیکس کے عہدہ دار، سیلز ٹیکس کے افسروں، ٹیکدار، سرجنوں اور نامور فزیشنوں سے لے کر بڑے بڑے سرمایہ دار تک اس کاروبار میں ملوث ہیں۔ یہاں میں نے جان بوجھ کر وکلا کا ذکر نہیں کیا۔ کیوں کہ سیّد عبدالقدوس ایڈوکیٹ میرے عزیز دوست ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس پیشے سے تعلق رکھنے والے حضرات کے خلاف کچھ کہہ کر اپنی دوستی پر حرف لاؤں۔ ویسے میری رائے محفوظ ہے!

اور تو اور اس وقت میرے ہاتھ میں بھی قینچی ہے!

اب میں آپ سے کیا چھپاؤں، اس خوش صورت آلے کی مدد سے میں اپنے ماہواری بجٹ کی مسلسل تخفیف کرتا رہا ہوں۔ ضروریاتِ زندگی کی ایک ایک چیز چھوڑنے کے بعد نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ دال پر گزارا ہو رہا ہے۔ میں سوچتا ہوں آخر اس کی بھی کیا ضرورت ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ آدمی صاف اور کھلی ہوا پر گزارا کرے!

اس سے پہلے کہ مدیر کا قلم قینچی کا فرض انجام دے میں قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان کی ترجمانی سے مستعفی ہوتا ہوں!

وجاہت علی سندیلوی

ملاقات ایک نقّاد سے

رستم بیگ آج اپنے پورے فارم میں تھے۔ کسی شامت کے مارے نقّاد نے ایک شاعر کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہیں لکھ دیا تھا۔ "نازل صاحب پرانی روایتوں میں نئے رجحانات کو بڑی خوب صورتی اور چابک دستی سے سمودیتے ہیں۔ ان کا کلام ماضی کے خوابوں کو عصری تقاضوں کی روشنی میں نئی تعبیر بخشتا ہے اور وہ ادب کی پرانی روشوں میں تازہ دم حسیّت کے نئے گل اور بوٹے کھلا رہے ہیں۔ نازل صاحب کو پرانی علامتوں کو نئی علامتوں میں مدغم کرنے کا ملکہ حاصل ہے۔ وہ پرانے اقدار کی شناخت ہی پر اپنے نئے اقدار کی قلمیں باندھتے ہیں اور اگرچہ اس عمل سے ترسیل اور ابلاغ کا ایک پیچیدہ مسئلہ کسی فتنۂ خوابیدہ کی طرح بیدار ہوجاتا ہے لیکن ایسے شعر کی معنویت اور قاری کی حیرت میں اضافہ ہو جانے کا بھی امکان بڑھ جاتا ہے ....."

"لعنت! لعنت! استغفراللہ" رستم بیگ بھڑکے "یہ کوئی ادبی تبصرہ ہے یا کسی شیخ چلّی کا الکشن مینی فسٹو۔ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے اور کیا کہنا چاہتا ہے۔ دراصل یہ کم بخت نقّاد جانتا ہی نہیں کہ وہ کیا کہے۔ الفاظ کے توتا مینا بنا کر وہ قاری کو مخبوط الحواس کرنا چاہتا ہے تاکہ اس پر وہ اپنی علمیت اور ہمہ دانی کا رعب آسانی سے جما سکے"۔

رستم بیگ کسی خود کار مشین کی طرح چالو ہوئے تو بس چلتے ہی چلے گئے۔ کسی ایک نقّاد کی کیا وہ نقّادوں کی پوری قوم اور نسل کے بخیے ادھیڑنے لگے اور ان کی شہرت اور عظمت پر کسی بل ڈوزر کی طرح پل پڑے اور ہر گوشے اور ہر زاویے سے اسے بے تحاشا ڈھانے لگے

ہم اپنی جہالت کے مارے کوئی ایسا فیتہ تو رکھتے نہیں جس سے رستم بیگ جیسے ابوالہول قسم کے محقّق اور نقّاد کا علمی اور ادبی قد ناپ سکتے۔ لیکن اتنا ہم بھی جانتے ہیں کہ وہ ہیں کوئی پہنچے ہوئے جغادری قسم کے دانشور۔ اور اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ہم نے جتنے بھی نقّادوں کے نام سن رکھے ہیں وہ ان میں سے ہر ایک سے تن تنہا نہ صرف لڑبھڑ چکے بلکہ بقول ان کے پرزے اُڑا چکے ہیں۔

رستم بیگ، جب کسی سے ناراض ہوتے تو اس ناہنجار پر اپنا غصّہ اتارنے کے ریہرسل کے لیے ناک کی سیدھ پر سیدھے ہمارے غریب خانے پر تشریف لاتے اور از راہ خلوص و محبت اپنے معتوب کا بدل ہم کو سمجھ کر اپنے جلے پھپھولے پھوڑنا شروع کر دیتے اور "دھوبی سے زور نہ چلے گدھے کے کان اُمیٹھے" کی مثل ہم پر صادق کر دیتے۔ ہم سعادت مندی سے منھ بند کیے اور کان ہلاتے۔ یہ آزمائش کی گھڑی جھیل لے جاتے تو ہم کو یہ خوش خبری سنا دیتے"

مجھے ادیب و شاعر تو خیر کیا؟ — اس کے لیے صلاحیتیں چاہئیں —— ایک بڑا نقّاد ضرور بنا دوں گا۔"

اپنی خطابت کے طوفان میں بہتے ہوئے رستم بیگ یہ نکتہ سمجھانے لگے کہ آج کل کے نقّاد اور ادبا کرایسی مغلق، مبہم اور دو غلی زبان لکھتے ہیں کہ یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کسی کی تعریف کر رہے ہیں یا تنقیص۔" وہ چیخے — رہی بات شعرا کی —— وہ سب واہیات ہیں! وہ شعر نہیں کہتے گھاس کھود دیتے ہیں۔ شاعر تو بس ایک میں ہوں اور ہاں ہاں! کچھ تم بھی —— لیکن میاں خدا لگتی پوچھتے ہو تو تم بھی کیا؟

"اس کو کہتے ہیں صاف، کھری، دو ٹوک تنقید۔ کڑی کمان کے تیر کی مانند:

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

جو دل میں آیا اسے کسی لگی لپٹی کے بغیر اور تمام مصلحت اندیشیوں کو بالائے طاق رکھ کر تڑاق سے کہہ دیا نتیجہ کچھ بھی ہو:

یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک!"

رستم بیگ ایک لمحہ کے لیے رکے تو شرماجی نے اپنے کالے مخمل کی ٹوپی سر سے اتار کر میز پر رکھ دی۔ یہ سگنل تھا اس بات کا کہ "ہم بھی منھ میں زبان رکھتے ہیں" اور کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ بولنے سے پہلے ٹوپی اتار دیتے؛ شاید اس سے الہامات کے ان کے سر تک پہنچنے میں کچھ آسانی ہو جاتی ہو۔

شرماجی نے بڑے جوش سے کہا" اجی جو شاعر اتنا خود سر، برخود غلط اور ساتا پرور ہیں کہ اپنے علاوہ اُسے گنتی کے لیے بھی کوئی دوسرا شاعر نظر نہ آئے اسے تو ایک ہی ذہنی مریض کہوں گا۔ اُسے آپ ایک صاف، کھرا، دو ٹوک تنقید کرنے والا نقّاد کیسے تصوّر کر سکتے ہیں؟"

رستم بیگ اس غیر متوقع حملے سے گھبرائے نہیں اور غیر معمولی سنجیدگی سے بولے" برخوردار آپ اپنی ٹوپی سر پہ رکھ لیں۔ آپ میرا مفہوم سمجھے نہیں۔ میں شاعر کے دعوے کی نہ تعریف کرتا ہوں نہ تائید۔ آپ اس کو اگر کسی نفسیاتی اسپتال میں داخل کرانے کی کوشش کریں گے تو میں آپ کا ہاتھ نہیں پکڑوں گا۔ میری گزارش کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس نے اگر کوئی بے بنیاد بات بھی کہی تو اس انداز سے کہی کہ آپ سمجھ تو گئے کہ وہ کہہ کیا رہا ہے۔ آج کل بیشتر نقّاد تو کچھ ایسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں جیسے جان بوجھ کر یہ کوشش کر رہے ہوں کہ:

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

شرماجی نے اپنی ٹوپی اپنے سر کو واپس نہیں کی اور کہنے لگے" تو اس کا مطلب میں یہ سمجھوں کہ آپ کی نظر میں سب سے بڑا نقّاد وہی ہے جس کی بات آپ کی سمجھ میں آجائے خواہ وہ بالکل ہی بکواس کیوں نہ کر رہا ہو؟"

رستم بیگ نے کرسی کے تکیہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں اور اپنے چہرے کو کچھ ایسا بنا لیا جیسے منہ ہی منہ میں یہ شعر پڑھ رہے ہوں:

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

چند لمحہ بعد آنکھیں کھول کر بولے" یہ بڑا کا لفظ آپ کس جنگل سے اور کہاں پکڑ لائے اور پھر اسے سب ... سے

برطا کیوں بنا دیا؟ ۔ میں نے بڑا نہیں کھرا کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ کھرا نقاد وہی ہے جو صاف اور دوٹوک بات کرے اور ایسی زبان میں کرے کہ ہم یہ نہ سمجھیں کہ ہم کسی چڑیا گھر میں کھڑے محض کچھ ناقابلِ فہم آوازیں سن رہے ہیں۔"

شرما جی نے طنزیہ لہجے میں کہا "کیا منطق ہے آپ کی؟ بات آپ نہ سمجھیں اور گوشمالی کی جائے بے چارے نقاد کی۔ شیکسپیر اور غالب کی اگر آپ بہت سی باتیں نہیں سمجھ پائے ۔ تو آپ کی رائے میں انھیں بھی بساطِ ادب سے باہر کر دیا جانا چاہیے۔"

رستم بیگ خفا ہونے کے بجائے ہنسنے لگے "بندہ پرور یہ نہ بھولیے کہ تخلیق کا کام ہے اُلجھانا اور تنقید کا کام ہے سلجھانا۔ اچھا اب ٹوپی سر پر رکھ لیجیے اور چلیے تازل صاحب کے دیوان بازیچۂ اطفال کے جشنِ اجرا میں" شرما جی نے ٹوپی سر پر رکھتے ہوئے کہا "جی نہیں! تخلیق جس کو بول میں الجھائی ہے اب تنقید اسی کو تار تک پہنچاتی ہے: ●●

سید عبدالولی قادری، انجینئر
(حیدرآباد)

نذرِ شجیع

سونے دیئے نہ آج بھی مچھر تمام رات　"جاگے تمام رات جگائے تمام رات"
تارے دکھائی دینے لگے مجھ کو دن تمام　"کیا جانے کس کو خواب میں دیکھا تمام رات"
دل اپنا پھینکتے رہے ہر جلوہ گاہ میں　"جلوہ تمام رات تماشا تمام رات"
کیا رہ گیا تھا اور لٹانے کو اپنے پاس　"لٹتی رہی خیال کی دنیا تمام رات"
چیخ و پکار سن کے جب انجان ہو گئے　"خاموشیوں نے تم کو پکارا تمام رات"
ننھو کے چار بلب لگے تھے چہار سمت　"تھا میری انجمن میں اجالا تمام رات"
تھی رات کے ڈنر میں ہر اک شئے بڑی لذیذ　"آتا رہا خیال تمہارا تمام رات"
ڈائرکٹ لے لیا تھا کنکشن، اسی لیے　"روشن رہی ہے شمع تمنا تمام رات"
جاکر سناؤ اور کہیں راگ مچھرو!　"سنتا ہے کون ایک فسانہ تمام رات"

تازہ غزل شگوفہ کو دینی تھی صبحدم*
مالِ شجیع ہم نے اڑایا تمام رات

* ایڈیٹر "شگوفہ" کی فرمائش پر

غزل

اقبال ہاشمی
(حیدرآباد)

سقراط چاہیئے نہ فلاطون چاہیئے　گھر گھر محافظوں کا پلاٹون چاہیئے
مردوں سے باگ ڈور سنبھالی نہ جائے گی　دلی کے تخت پر کوئی خاتون چاہیئے
دستور کی غلام رہے آدمی کی ذات　جنگل کے راج میں کسے قانون چاہیئے
ندیوں کے پانیوں سے بجھے گی نہ اس کی پیاس　اس سرزمیں کو بہتا ہوا خون چاہیئے
نیتا ہمارے غم میں بہت ہی نڈھال ہیں　لگتا ہے ان کو چندوں کی معجون چاہیئے
پونم کی رات ہو کہ اماوس کی رات ہو　میری ہنی کو روز نیا مون چاہیئے
درسی کتب چھپایئے دیمک کے واسطے　کالج کے نوجوان کو افیون چاہیئے

شلوار چاہیئے مرے بیٹے کو ہاشمی
پردہ نشین بیٹی کو پتلون چاہیئے

عابد معز
(ریاض)

ہمارا موٹاپا

ہماری زندگی میں وہ وقت بھی آیا جب ہم موٹے ہونے لگے۔ شادی کے بعد چند ہفتے گزرے تھے کہ ہمارا وزن بڑھنے لگا۔ لوگ کہتے ہیں شادی کی خوشی میں ہم موٹے ہو رہے ہیں۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ شادی کی ہمیں ایسی کوئی خوشی نہیں تھی۔ بچپن سے ہمیں امید تھی کہ ایک دن ہم بڑے ہوں گے۔ چڈی چھوڑ کر پتلون پہنیں گے۔ ہماری داڑھی اور مونچھ نکل آئے گی تب ہماری شادی ہوگی۔ ہم نے بچپن میں دوستوں کے ساتھ "ابا کا کھیل" بھی کھیلا تھا۔ دادی ماں ہمیں کھلاتے ہوئے کہتی تھیں "میرا راجہ بیٹا دولھا بنے گا۔ اس کے لیے میں چاند سی دلہن لاؤں گی۔ چل بیٹے دودھ پی لے"۔ قصہ مختصر شادی کی وہ خوشی نہ تھی جو توقع کے خلاف کسی چیز کے ملنے سے ہوتی ہے ہم شادی کی خوشی میں موٹے ہونے کے الزام کو ایسے ہی مسترد کرتے ہیں جیسے کوئی فلمی اداکارہ اپنے رومانس کی خبروں کی تردید کرتی ہے۔

اس تردید کے باوجود ہم خود اعتراف کرتے ہیں کہ کچھ تو ہے اور کچھ تو ہوا ہے کہ ہم شادی کے بعد موٹے ہونے لگے ہیں۔

موٹے ہونے کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش میں ہمیں ایک نمایاں بات نظر آتی ہے وہ ہے۔ شادی سے پہلے کی آزادی جو شادی کے ساتھ ختم ہوئی۔ صبح جب جی چاہا اٹھا، دیر ہوئی تو بغیر ناشتہ گھر چھوڑا۔ دوپہر ٹفن کبھی لے نہیں گئے، فٹ پاتھ سے الم غلم کچھ کھا لیا۔ ملٹر گشتی کر کے رات کو دو بجے گھر آئے۔ کسی دن کھانا پروس دیا تو کھایا ورنہ فریج سے نکال کر کھا لیا۔ ہمارے بس میں نہ تھا دعوتوں میں گئے نہ گئے۔ دعوت میں جاتے بھی تو غذا کے علاوہ ہماری دلچسپی کے دوسرے سامان ہوتے۔ شادی کے بعد ذمہ داری کا احساس دلایا جانے لگا۔ "آج بیوی ہے۔ خیر سے کل بچے ہوں گے۔ انسان بنو۔ وقت پر ہر کام کیا کرو اور ڈھنگ کی زندگی گزارو" صبح جلد اٹھا دیا جانے لگا۔ بیوی سامنے بیٹھ کر ناشتہ کروانے لگیں۔ گھر چھوڑتے وقت ہاتھ میں ٹفن تھما دیا جاتا۔ رات کسی وقت بھوکے یا کھا کر گھر آتے تو بیوی انتظار میں بیٹھی ہوتی۔ بارہا سمجھایا کہ آفس میں دیر ہو جاتی ہے، انتظار نہ کرو۔ لیکن بیوی نے انتظار کرنا نہ چھوڑا، ہم ہی وقت پر گھر پہنچنے لگے۔ رات کا کھانا بیوی کے ساتھ کھایا اور وقت پر سو گئے۔ ہماری کیفیت اس شریر لڑکے جیسی تھی جسے ٹھیک کرنے کے لیے بورڈنگ اسکول میں داخل کیا جاتا ہے۔ ہم بورڈنگ اسکول نہیں گئے۔ خود وارڈن کو ہمارے ماحول بلکہ ہماری زندگی میں لایا گیا۔ وقت پر کھانے، گھر پر زیادہ رہنے اور ضرورت سے زیادہ سونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم موٹے ہونے لگے۔

ہمارا موٹاپا یکلخت طاری نہیں ہوا۔ آہستہ آہستہ ہر قدم پر اپنی آمد کا پتہ دیتا ہوا موٹاپا ہمارے جسم میں سرایت کرنے

لگا۔ ابتدا میں ہمارے کپڑے تنگ ہوئے۔ بٹن ٹوٹنے لگے۔ ہم نے بٹن اور کاجوں کو مضبوط کیا تو کپڑوں کا سیون کھلنے لگا۔ اور کپڑے پھٹنے لگے۔ نئے کپڑے سلوانے پڑے لیکن چند دن میں نئے کپڑے ۔ ۔ ۔ ۔ بھی تنگ ہوگئے اور نئے کپڑے سلوانے کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ ہمارے موٹاپے سے کپڑوں کی دوکان والے اور درزی خوش رہنے لگے۔ ہماری آؤ بھگت کرتے، اطراف گھوم پھر کر ناپ لیتے اور کپڑے جلد تیار کرکے دیتے۔ چند مہینوں میں ہمارے پاس ہمارے اپنے کپڑوں کا خاصہ اسٹاک جمع ہوگیا۔ بڑے بچوں کے کپڑوں کے علاوہ ہمیں جوتے اور چپل کے لیے بھی پریشان ہونا پڑا۔ پیر کا سائز وہی تھا لیکن پیر موٹا ہوچکا تھا۔ دکان دکان ڈھونڈ کر جوتے اور چپل تلاش کرتے جن میں ہمارے پیر سما سکتے تھے۔ گھڑی کا تسمہ اور کمر کا بلٹ بھی بدلنا پڑا۔ انگوٹھیاں انگلیوں میں پھنسنے لگیں اور پھر ہماری انگلیوں کے سائز کی انگوٹھیاں نہ ملنے پر انگوٹھی پہننا ہی ترک کردیا۔

موٹاپے سے ہماری جسمانی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ چہرے پر بڑی حد تک گالوں نے قبضہ کرلیا۔ پھیلتے ہوئے گالوں نے تھوڑی کو بے دخل کیا، آنکھوں کو اندر ڈھکیلا اور ناک پر چڑھائی کی۔ گردن غائب ہوئی اور یوں لگا جیسے چہرہ سیدھے دھڑ پر لٹکا ہوا ہے۔ پیٹ غبارہ کی طرح ابھر آیا۔ پھول کر اتنا گول گیا ہوا کہ پتلون کمر پر ٹھیرتا ہی نہ تھا۔ پتلون کو اپنی جگہ قائم رکھنے کے لیے پتلون کا رشتہ شانوں سے جوڑنا پڑا۔ گنبد نما پیٹ کا توازن برقرار رکھنے کے لیے قدرت نے پیچھے بھی ابھار پیدا کیے۔ فربہ ہوتے تو پیروں کے درمیان پائی جانے والی جگہ غائب ہوئی اور دونوں ہاتھ جسم سے قریب تر ہوگئے۔ ہماری لمبائی اور چوڑائی میں زیادہ فرق نہ تھا۔ ہم اب گول دکھائی دینے لگے۔ غرض ہماری شکل ایسی ہوگئی کہ کوئی لڑکی ہمیں نظر بھر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی۔ ہماری بیوی خوش ہوئی کہ ان سے سر سے سوت کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ٹل گیا۔ ہماری ہیئت کو دیکھ کر کوئی زیر لب مسکراتا اور کوئی کچھ نہ کچھ کہتا ضرور تھا۔ ہمدرد ہمیں وزن کم کرنے کا مشورہ دیتے تو اغیار ہمیں مختلف القاب سے نوازتے۔ ہماری شخصیت بچوں کو ڈرانے کے کام بھی آنے لگی۔

کرسی پر بیٹھنا ہمارے لیے مشکل ہونے لگا اول تو کرسی میں سماتے نہیں اور اگر کسی طرح سما جاتے تو کرسی ہمیں جکڑ لیتی ہمارے ساتھ ہی چپکی چلی آتی۔ ہم نے کرسی پر بیٹھنا ترک کیا۔ بنچ استعمال کرنے لگے۔ تین آدمیوں کی بنچ پر یکا و تنہا قابض ہوتے۔ پلنگ پر لیٹتے تو پلنگ کے جوڑ سے دل خراش آوازیں آنے لگتیں۔ کروٹ بدلتے تو پلنگ جھولنے لگتا۔ مضبوط سے مضبوط پلنگ کی گود بھی جب برداشت نہ کرسکی تو ہم سمنٹ کے چبوترے پر آرام کرنے لگے۔ پبلک سواریوں میں ہمارا داخلہ قدرت نے ممنوع کردیا۔ یک مشت ہم ان سواریوں میں داخل ہو نہیں سکتے تھے اور اقساط میں جانا ہمارے لیے جیتے جی ممکن نہ تھا۔ سواری کے لیے ٹرک استعمال کرنے لگے۔ چھوٹے دروازوں کی بات چھوڑیئے۔ بڑے دروازوں میں سیدھے جا نہیں سکتے تھے۔ آڑھے ہوکر سانس روکے، پیٹ اندر کیے اور ہاتھوں اور پیروں کو سمیٹ کر اپنے آپ کو دروازے میں گذارنا پڑتا۔ بھاگنا تو عرصہ ہوا چھوٹ چکا تھا۔ سڑک پر کبھی تیز چلتے تو لوگوں کا مجمع لگ جاتا۔ چلنا پھرنا بھی دوبھر ہونے لگا۔ چلتے تو دھم دھم کی آواز کے ساتھ زمین میں ارتعاش پیدا ہوتا۔ لگتا فوج پریڈ کر رہی ہے۔ ہماری چال کے بارے میں لوگ کہتے کہ ہم چلتے نہیں لڑھکتے ہیں۔ سانس لینے کا انداز بھی بدلا گویا جاگتے میں خراٹے لے رہے ہیں۔ جب سوتے تو خراٹوں کی جگہ ایسی آوازیں آتیں جیسے جنگل میں طوفان آیا ہوا ہے۔ ہوا کی سائیں سائیں اور جھاڑوں کے گرنے اور چٹانوں کے لڑھکنے کی آوازوں سے وہ ماحول بنتا کہ نیند سے ڈر کر بھاگ جاتے۔ یکا و تنہا سونے لگے۔ ہمارے دشمن کچھ عرصہ کے لیے خوف زدہ رہے لیکن جلد ہی انھوں نے ہمیں زیر کرنے کے لیے گوریلا لڑائی اختیار کرلی۔ ہمیں گدگدیاں کرتے اور جب ہم ان کے پیچھے دوڑتے تو وہ چکمہ دے کر ہمیں تھکا دیتے۔ ہم

تھک کر اپنے دشمنوں کو گالیاں دیتے اور کوسنے لگتے۔ ہمارے موٹاپے کو دیکھ کر لوگ ہمیں مشورہ دینے لگے کہ ہم اپنے نام کو معز سے معزے کرلیں۔ سرکس میں کام اور فلموں میں رول کے آفر بھی ہوتے۔ ہم نے پوچھا "میں اپنے ہی کام کا نہیں رہا، آپ کے کیا کام آسکتا ہوں"۔ جواب ملا "آپ کو کچھ کرنا نہیں ہے ہم آپ کو نمائش کے لیے عوام کے سامنے پیش کریں گے۔ خود بخود قہقہے بلند ہوں گے"۔ دوسروں کو چھوڑیے اب ہمارا وجود ہمیں بھی بھاری لگنے لگا۔

ہمارا جسم جہاں غلّے کا گودام تھا وہیں مختلف امراض کا مسکن بھی بننے لگا۔ کمزور پیروں کی بنیاد پر مضبوط جسمانی عمارت غضب ڈھانے لگی۔ پیروں کا جوڑ جوڑ متاثر ہوا۔ جوڑوں میں دائمی درد رہنے لگا۔ جلد تھکنے بلکہ کہنا چاہیے ہمیشہ تھکے ہوئے پسینے میں نہال رہنے لگے۔ غیر ضروری سانس پھولنے لگی۔ شکر کا مرض دستک دینے لگا۔ گردوں اور پتّے میں پتھر پڑنے لگے۔ ڈاکٹر دل کی بیماریوں کا ذکر کر کے دھمکانے لگے۔ مختلف شکایات لے کر ڈاکٹر سے رجوع ہوئے تو ارشاد ہوا۔ "آپ کی بیماری موٹاپا ہے۔ اپنا وزن کم کیجیے"۔ ہم نے وزن کم کرنے کے لیے دوا مانگی تو کہا "موٹاپے کا علاج کم کھانا اور ورزش کرنا ہے"۔ ہم نے استفسار کیا "کیا کھاؤں"۔ جواب ملا "انسانوں کی غذا اور انسان کی خوراک"۔

اب ان کوششوں کے تعلق سے بھی سن لیجیے جو ہم نے وزن کم کرنے کے لیے کیں۔ دوڑ لگائی۔ اٹھک بیٹھک کیے۔ ڈنڈ لگائے، انگریزی اکسرسائز کی، ترکاری کے نام پر گھاس پوس کھائی، فاقے کیے۔ کبھی کبھار آدھا یا ایک کیلو وزن کم ہوا لیکن جلد ہی معہ سود اس کی بازیابی ہو گئی۔ یہ عام بات ہر کوئی جانتا ہے کہ جب وزن بڑھنے لگے تو بھاگنا چاہیے۔ غذا قریب آتے ہی دوڑ لگانی چاہیے۔ اگر دوڑ نہ لگا سکیں تو چہل قدمی کرنی چاہیے۔ صبح کا وقت بہتر ہوتا ہے۔ اعتراض کرنے والے اور ہنسنے والے سوتے رہتے ہیں۔ صبح نیند سے جلد بیدار ہونا خود ایک قسم کی ورزش ہے۔ ہم نے دوڑ لگانے کے لیے مخصوص لباس اور جوتے خریدے۔ انھیں بستر پر سرہانے رکھا۔ صبح اٹھ کر بھاگنے کی نیت کی۔ چار بجے صبح کا الارم سیٹ کیا اور سو گئے۔ ہم سے نہیں اٹھا گیا۔ ہم نے گھڑی کو ذمہ دار ٹھیرایا کہ وقت پر ہمیں نہیں جگاتی۔ دوسری اور تیسری گھڑی بھی الارم بجا کر ہمیں اٹھانے میں ناکام رہی تو ہم نے شام میں بھاگنے کا قصد کیا۔ پارک میں بھاگنے کے لیے جگہ نہ ملی۔ مختلف لوگ بسیرا کیے ہوئے تھے۔ سڑک پر ٹریفک کی دھوم تھی گلیوں میں بھاگنا چاہا تو بچے پتھر اٹھائے ہمارے پیچھے دوڑنے لگے۔ شام میں ناکام ہونے پر ہم نے پھر صبح دوڑ لگانے کا فیصلہ کیا گھر والوں کی متفقہ کوشش [illegible] ہم صبح اٹھے، مخصوص جوتے اور کپڑے پہن کر سڑک پر بھاگنے لگے۔ سڑک کے کتوں کو ہمارا یوں بھاگنا پسند نہ آیا۔ ان کی نیند میں خلل پڑتا تھا۔ ایک خرانٹ کتے سے رہا نہ گیا۔ ہمارے پیچھے دوڑنے لگا۔ مقابلہ کی نیت سے ہم نے اپنی رفتار بڑھائی۔ کتے کو ناگوار گزرا۔ جھنجھلا کر کتے نے ہمیں کاٹا۔ ہم نے پیٹ میں چودہ انجکشن لینے اور بھاگنے سے توبہ کی۔ اور گھر پر ورزش کرنے کے لیے ساز و سامان اٹھا لائے۔ ورزش کے دوران دل لگا رکھنے کے لیے ساتھ ہی ٹیپ ریکارڈر پر گانا بجایا۔ کتاب کی ہدایت پر ورزش شروع کی۔ گانا سنتے ہوئے ورزش کرتے پر خیال آیا، کیوں نہ موسیقی کی لے پر ناچیں۔ بریک ڈانس اور ڈسکو خوب رہے گا۔ ورزش کے ساتھ تفریح ہو جائے گی اور یوں ایک فن میں مہارت بھی حاصل کر لیں گے۔ جدید ناچ بھی ایک قسم کی ورزش ہی ہے۔ ناچ کے لیے دو پارٹنرز ہونے چاہییں۔ ہم نے اپنی بیوی کو دعوت دی۔ انھوں نے ہماری دعوت کو ٹھکرا دیا۔ ہمیں طیش آیا۔ ایک ڈسکو گانا بجا کر خود ہی تھرکنے لگے۔ پتہ نہیں جوش میں ہمارے قدم سیدھے پڑے یا الٹے، پیر کا ایک پٹھا دوسرے پر چڑھ گیا۔ دایاں پاؤں بائیں سے دو انچ چھوٹا ہو گیا۔ تکلیف سے کراہتے ہوئے ہم ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ ڈاکٹر نے ہمیں فاسٹ باولر جان کر کہا "آپ باولنگ نہیں کر سکتے"، ہم نے ڈاکٹر کو بتایا کہ ہم فاسٹ باولر ہیں اور نہ ڈسکو ڈانسر۔ ایکسس بیگیج Excess Baggage

سے پریشان ہیں۔ دواؤں اور شعاعوں کی مدد سے چڑھا ہوا پیٹھا اپنی جگہ واپس آیا۔ انگریزی ورزش سے مایوس ہو کر ہم نے دیسی ریاضت کے لیے دنگل کا رخ کیا۔ ہم نے ایک پہلوان استاد کی شاگردی قبول کی۔ بیوی سے اجازت چاہی اور لنگوٹ باندھا۔ ابتدائی پندرہ دن دنگل بنانے میں گزر گئے۔ مٹی چھان کر مٹی میں گڑ اور تیل ملاتے اور پھر اس پہلوانی مرکب کو دنگل کے فرش پر بچھاتے۔ دنگل تیار ہوا تو استاد پہلوان کے شاگرد آپس میں ایک دوسرے کو تیل پلا کر تیار کرنے لگے۔ ہمارے جسم نے بھی تیل پیا۔ موٹے تو تھے ہی اب اور چکنے بھی لگے۔ دنگل اور خود کو تیار کر لینے کے بعد باضابطہ ورزش کے ساتھ داؤ پیچ شروع ہوئے۔ داؤ پیچ کے دوران استاد نے ہاتھ بڑھایا۔ ہم نے خوشی خوشی اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا۔ پہلوان استاد نے دوسروں پر بھروسہ نہ کرنے کا سبق دینے کے لیے ہمارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دھوبی پچھاڑ ماری۔ ہم فرش پر چاروں خانے چت گرے۔ نتیجے میں پیر کی ایک ہڈی ٹوٹی اور اترا ہوا پیٹھا پھر چڑھ بیٹھا۔ کئی دن فریش رہے۔ ٹانگ فضا میں لٹکی رہی۔ ہم نے ہسپتال کے بستر پر بارہا قسم کھائی کہ اب کبھی دنگل کا رخ نہیں کریں گے۔

ہماری بیوی، ہمارے موٹاپے سے کچھ حد تک خوش اور مطمئن رہیں۔ لوگ ان کی تعریف کرتے کہ ان کا کھا کر اور ان کے ساتھ رہ کر ہم موٹے ہو رہے ہیں۔ دبلے، نحیف و ناتواں شوہروں کی بیویاں ہماری بیوی سے مشورے کے لیے رجوع ہوئیں۔ ہماری بیوی انھیں پکوان کے طریقے بتلانے لگیں اور پکوان پر ایک کتاب شائع کرنے کا ارادہ کرنے لگیں جس کے سرورق پر ہماری تصویر دینا چاہتی تھیں لیکن جب ہمارا موٹاپا حد سے بڑھنے لگا تو انھیں بھی تشویش ہونے لگی۔ لوگ ہمیں پہاڑ اور انھیں گلہری خانم کہہ کر ابن صفی کی ناولوں کی یاد تازہ کرنے لگے۔ لوگ ہمیں پہاڑ کہیں یہ ہماری بیوی کو گوارا تھا۔ لیکن جب انھیں گلہری خانم کہا جانے لگا تو انھوں نے سنجیدگی سے ہمیں دبلا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ان کی سہیلی نے مشورہ دیا کہ ہمیں بھوکا رکھ کر ورزش کرائیں اور ورزش کے بعد پانی کے ساتھ وٹامن کی گولی دیں۔ دو دن ہم بھوکے رہے اور ورزش کے تمام پیاٹھ بیٹھ کی۔ تیسرے دن ورزش کے دوران ہمیں چکر آنے لگی۔ ہم نے ورزش موقوف کرنا چاہا۔ لیکن ہماری بیوی ہمارے اطراف "کیپ اپ" کا نعرہ لگاتے ہوئے گھومنے لگیں۔ ناگاہ ہماری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے اور ہم دھڑام سے کھڑے قد گر پڑے۔ نیم بے ہوشی سے حواس بجا ہوئے تو دیکھا ہماری بیوی ہمارے پیچھے بے ہوش پڑی ہوئی تھیں۔

ورزش کے ساتھ موٹاپے کے علاج کا دوسرا پہلو غذا میں احتیاط ہے۔ ماہرین کم سے کم کھانے کے لیے کہتے ہیں۔ ہم نے کم سے کم کھایا۔ اکثر اوقات صرف ہوا کھائی۔ کبھی گرم تو کبھی ٹھنڈی پھر بھی۔ وزن بڑھتا رہا۔ ماہرین ہماری بات کا یقین نہیں کرتے۔ سوال کرتے کیا یہ شخص غبارہ ہے جو صرف ہوا کھا کر موٹا ہو رہا ہے۔ ہماری بیوی کو ہدایت دی گئی کہ وہ ہم پر کڑی نظر رکھیں۔ ہر وہ چیز لکھ کر بتلائیں جو منہ اور ناک کے ذریعہ ہمارے جسم میں داخل ہوتی ہے۔ بیوی کی خفیہ رپورٹ دیکھ کر ماہرین نے ہمارے جبڑوں کو فولادی تاروں سے بند کیا۔ بات کرنے اور پانی کے لیے منہ کھلتا تھا۔ اس عمل سے بھی فائدہ نہ ہوا تو ماہرین نے ہمارے جسم سے معدہ نکال دینا چاہا۔ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ موٹاپا کم کرنے کی آس میں ہم نے جو کیا، وہ کیا کم تھا جو اب معدہ کی قربانی دیں۔ معدے کے بعد بھی آنتیں باقی رہتی ہیں اور آنتیں قل ہو اللہ پڑھنا جانتی ہیں۔ اگر وہ معدے کا زائد کام سنبھال لیں تو پھر ماہرین کیا کریں گے۔ ہم نے موٹاپا کم کرنے کی تمام کوششوں کو خیرباد کیا اور اپنے آپ کو موٹاپے کے حوالے کر دیا۔

غزل کہتا ہوں

مفلس فاروقی
(بارہ ٹکی)

بھوک جب آنتوں کو کھائے تو غزل کہتا ہوں
دیر تک نیند نہ آئے تو غزل کہتا ہوں

پان کلّے میں ہو اور ہاتھ میں بیڑی ماچس
سامنے رکھی ہو چائے تو غزل کہتا ہوں

جاگ اٹھتا ہوں بھری نیند سے اور بستر میں
کوئی کھٹمل نظر آئے تو غزل کہتا ہوں

خشک ہو جائیں جو اشکوں کے ابلتے جھرنے
آنکھ جب خون بہائے تو غزل کہتا ہوں

میں کہوں مرغ پکانے کے لیے اور بیوی
مونگ کی دال پکائے تو غزل کہتا ہوں

ذہن ہو جاتا ہے چوپٹ تری یاد آتے ہی
جب تری یاد نہ آئے تو غزل کہتا ہوں

میکے جانے کے لیے گھر سے نکل کر بیوی
بیچ ہی سے پلٹ آئے تو غزل کہتا ہوں

گھر بلائے کوئی بریانی کی دعوت دے کر
اور کڑھی بھات کھلائے تو غزل کہتا ہوں

ہو وہ قوال، طوائف کہ غزل گائیک ہو
میری غزلیں کوئی گائے تو غزل کہتا ہوں

روکھی سوکھی کو ترستا ہوں میں اور ادھر
ہر گدھا گلگلے کھائے تو غزل کہتا ہوں

ڈگریوں پر مری اک صاحبِ دولت جاہل
منہ اگر میرا چڑائے تو غزل کہتا ہوں

بات بیوی کی الگ ہے مگر اس کا بھائی
مجھ کو صلواتیں سنائے تو غزل کہتا ہوں

یوں ستاتا نہیں بے وجہ کسی کو لیکن
کوئی بے وجہ ستائے تو غزل کہتا ہوں

میرا ہر دوست، مرا اپنا برے وقتوں میں
مجھ سے جب آنکھ چرائے تو غزل کہتا ہوں

کیا مرے بس میں ہے، کر سکتا ہوں کیا اس کے سوا
ظلم مجھ پر کوئی ڈھائے تو غزل کہتا ہوں

اپنی البیلی اداؤں سے لبِ بام آ کر !
کوئی جو مجھ کو رجھائے تو غزل کہتا ہوں

جب ستارے لبِ جو آنکھ مچولی کھیلیں
چاند دریا میں نہائے تو غزل کہتا ہوں

خوشنما پھول، بہاروں کے سہانے منظر
کوئی شئے من کو نہ بھائے تو غزل کہتا ہوں

سوئے آرام سے صاحب کی چہیتی بیگم
اور ماں پیر دبائے تو غزل کہتا ہوں

جب طبیعت نہ قطعہ اور رباعی پہ جمے
نظم جب راس نہ آئے تو غزل کہتا ہوں

ٹوک دے ساس کسی بات پہ اور اس پہ بہو
سارا گھر سر پہ اٹھائے تو غزل کہتا ہوں

پے بہ پے دل میں خیالات کے طوفان اٹھیں
ذہن پہ ابر سا چھائے تو غزل کہتا ہوں

میری ہیئت مرے افلاس پہ کوئی مفلس
مضحکہ میرا اڑائے تو غزل کہتا ہوں

منڈل کمیشن

اسمٰعیل آذر
(کٹک)

ریزرویشن پہ تھا جن کا عقیدہ
بنایا بیٹھ کر اس کا ملیدہ
کہ حل ہو جائے بے کاری کی مشکل
کہ مل کر کھائیں سب سروس گزیدہ
'کچن' سے بھینی بھینی بو اُڑ ائی!
پڑھا منڈل کمیشن کا قصیدہ
سنی ہڑتال نے جب یہ حقیقت
تو جاگے اُس کے اوصافِ حمیدہ
چڑھا لرزہ معاً بلوؤں کے تن پر
فسادوں کا ہوا بھیجا تپیدہ
سڑک پہ آئی خود سوزی نکل کر
بنی فتنوں کی شاگردِ رشیدہ
(جلائی بھی گئی، سُنتے ہیں۔ لیکن
شنیدہ کے بود مانند دیدہ!
ادھر گھبرائے کچھ اخبار والے
کہ منڈل ہو نہ جائے سر بُریدہ!
ملایا رابطہ سیدھے "کچن" سے
تو فرمانے لگے اہلِ ملیدہ!
کہ لوگوں نے ابھی سمجھا نہیں ہے
ابھی منڈل ہے اک بنڈل رسیدہ
سمجھ لیں گے رپٹ اس کی وہ جس دن!
رہیں گے پھر نہ یوں ہم سے کشیدہ

وہیں حاضر تھے اک آذر خلیفہ
وضاحت کی سُنا کر اِک لطیفہ

مریض اک ڈاکٹر کے پاس آیا!
اسے ٹیبل پہ جھٹ اس نے لٹایا
پھر اس پہ جھک کے دائیں آنکھ دیکھی
نظر یکساں رکھے سر کو گھمایا
کہا" حالت نہایت سیریس ہے"
سنا بیمار نے جب بڑبڑایا
دکھا کر ایک فوٹو ڈاکٹر نے
اسے اک نرس "ہنٹش" والی بتایا
"تمہیں کہنا نہیں کچھ بھی" وہ بولا
سمجھتا ہوں میں آنکھوں کا کنایہ
یہ دائیں آنکھ خود ہی کہہ رہی ہے
کہ کس کس روگ نے کب کب ستایا
اُتر آئی ہے سوجن پھیپھڑے میں
تمہیں گھیرے ہے فیور کا بھی سایہ
تمہیں تو ریومیٹزم بھی ہے بھائی
ارا را را، ارا را را، خدایا
اب آئی ڈاکٹر کی یاد تم کو
جو ہونے کو ہے دنیا سے صفایا
ادھر روگی کو بے چینی لگی تھی!
اسے یہ دیکھنا بالکل نہ بھایا
کہا — "صاحب اُدھر کی آنکھ دیکھو
اِدھر والی تو شیشے کی ہے بھایا

بچہ، باپ، دادا

منظور الامین
(سکندرآباد)

انگریزی کی ایک کہاوت میں کہا گیا ہے :

"بچہ آدمی کا باپ ہوتا ہے !"

بچپن میں جب ہم نے یہ کہاوت سنی تھی تب ہمارے چھوٹے سے دماغ میں یہ بڑی سی بات سما نہیں سکتی تھی کہ بچہ آدمی کا باپ کیسے ہو سکتا ہے، بڑے ہونے پر یہ بات آسانی سے ہماری سمجھ میں آگئی کہ بچہ آدمی کا باپ ہی نہیں بلکہ دادا بھی ہوتا ہے اور صاحب ––– دادا یعنی صرف باپ کا باپ ہی نہیں بلکہ بمبئی والا دادا بھی !

آپ کہیں گے اللہ اللہ! ایسے ننھے منے شگوفوں کے لیے یہ کینہ، یہ بغض، یہ دشمنی، یہ عداوت !! ابھی تو یہ پھول بھی نہیں بنے۔ لیکن BUDDY آپ کو اس کا علم نہیں کہ یہ ہستیاں جنھیں آپ شگوفے یا غنچے یا کلیاں کہتے ہیں کیا کیا گل کھلانے والے ہوا کرتے ہیں۔ شکلاً تو یہ شریف، معصوم اور بھولے ہوتے ہیں لیکن اصلاً ہوتے کچھ اور ہیں۔

نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ بچّوں کے جسم کی ساخت میں گوشت پوست کے علاوہ ایک اور عنصر بھی ہوتا ہے اور وہ ہے شیطانی۔ اس بات سے ہم سب واقف ہیں کہ بچے کبھی چین سے نہیں بیٹھتے ان کی آنکھوں میں ایک جستجو، ان کے جگر میں ایک چمک اور ان کے دل میں ایک پیاس پائی جاتی ہے۔ . . . . ہر بار یہ ایک نیا گل کھلانے پر آمادہ دکھائی دیتے ہیں۔ یہ چلتے پھرتے DYNAMO ہوتے ہیں۔ ان کی توانائی ELECTRO-MOTIVE FORCE (EMF) کی کوئی حد نہیں ہوتی خاص کر اتوار یا اور چھٹیوں کے زمانے میں جب اسکول بند ہوتے ہیں تو بچوں کی یہ بارود، یہ توانائی، یہ پیا خت گھر اور آنگن، کھیل کے میدان اور شہراہ رگاؤں کے گلی کوچوں میں نہر طرف کہرے کی طرح پھیل جاتی ہے۔

ہم شہر کے جس محلّے میں رہتے ہیں اس محلّے کا جغرافیہ اور محلِ وقوع کچھ اس قسم کا ہے:

شمال میں: بچے
جنوب میں: بچے
مشرق میں: بے شمار بچے
مغرب میں: بچے ہی بچے، ہر طرف بچے

غرض ہمارے محلے کا طول البلد اور عرض البلد بچوں سے پٹا پڑا ہے۔ اب ذرا آپ غور فرمائیں کہ فیملی پلاننگ کے باوجود اگر بچوں کی PER CAPITA کاشت کا یہ عالم ہو تو ہم جیسے پُرامن شہری اپنے ہم وطنوں سے بس یہی کہہ سکتے ہیں:

شوق سے نورِ نظر، لختِ جگر پیدا کرو
ظالمو تھوڑا سا گندم بھی مگر پیدا کرو

بچے ہر نوع اور ہر رنگ میں پائے جاتے ہیں۔ یہ دنیا کے ہر ملک اور ہر خطے میں ملتے ہیں، خطِ استوا سے خطِ جدی تک اور خطِ جدی سے خطِ سرطان تک، آرکٹک سے انٹارکٹک تک ہر علاقے میں یہ آسانی دستیاب ہوتے ہیں۔ ان کی بے شمار قسمیں ہوتی ہیں، ہم نے آپ کی سہولت کے لیے چند ایک کی فہرست بنانے کی کوشش کی ہے، وہ یہ ہیں:

ارسطو بچہ: سیریس وسنجیدہ
ہلاکو بچہ: جنگ وجدل کا قائل
ہلاکو بچہ: بات بات پر اس کی تلوار میان سے باہر،
اقلیدسی بچہ: حساب کتاب میں رواں،
بیربل بچہ: ذہین اور طباع
قلندر بچہ: راضی بہ رضا، قناعت پسند
سکندر بچہ: اپنے دائرۂ عمل کو لگاتار بڑھانے کی کوشش میں جُٹا رہنے والا۔
گدگد بچہ: ہشاش بشاش
دُکھیا چار بچہ: اُداس ورنجیدہ،
بور بچہ: بکواسی
پکاسو بچہ: دیواریں رنگتا ہے۔
ژوژو بچہ: سدا ماں کی گود میں گھسا رہتا ہے۔
شائیلاک بچہ: کنجوس،
ڈائیلاگ بچہ: فلموں کے مکالمے فرفر سناتا ہے۔
پیش از وقت پختہ بچہ: جو بڑوں کی بھی ناک کاٹے۔
سٹہ بچہ: سٹے باز
داداچہ بچہ: دھونس جماتا ہے۔
نانا بچہ: خود کو بزرگ سمجھتا ہے۔

گاما بچہ : دن رات ڈنڈ بیٹھک پیلنے والا۔
سارے گاما بچہ : بے سُری آواز میں رونے والا بچہ
عقل بند بچہ : بے وقوف، غبی،
ڈائنامائٹ یا بارودی بچہ : زیرک، عقل مند
ایک ایسے ہی بارودی بچے کے بارے میں ایک لوک کتھا کچھ اس طرح کی ہے :

ایک بار ایک راجہ نے ایک دوسرے راجہ کو دوستی میں ایک ہاتھی تحفہ میں بھیجا، راجہ نے اپنے افسروں کو حکم دیا کہ [ا]س کا وزن معلوم کیا جائے۔ ادھیکاری پریشان ہوگئے کیوں کہ اتنا بڑا ترازو وہ کہاں سے لاتے جو اتنے لمبے چوڑے بھاری [جس]م، جس کا چلنا کم کر تھم تھم کے وزن کا پتہ لگا سکتے، سوچتے رہے اور پریشان ہوتے رہے کہ راجہ کا آدیش کس طرح پورا [ہو]، ان کی قسمت اچھی تھی اتفاق سے ایک عقل مند بچہ ادھر سے کھیلتا ہوا گزرا، ادھیکاریوں کو الجھا ہوا دیکھ کر اس نے وجہ [پوچھ]ی، انھوں نے ماجرا کہہ سنایا، بچے نے کہا :

"یہ تو کوئی مشکل بات نہیں، میرے پاس پیتل کا ایک چھوٹا سا ہاتھی ہے میں نے ایک دن اس کا وزن معلوم کرنا چاہا [اس]سے کاغذ کی ناؤ میں بٹھا کر پانی میں ڈالا، ناؤ پانی میں جتنی اندر ڈوبی میں نے اس پر نشان لگا دیا پھر ہاتھی کو نکال کر کشتی میں [پتھر] بھرے کر کشتی اسی نشان تک دوبارہ پانی میں ڈوب گئی، ناؤ کو نکال کر میں نے کنکر گن لیے پس میرے ہاتھی کا وزن معلوم ہوگیا۔"

یہ تو ایک پرانی کتھا ہے ویسے آج کے بچے کا آئی کیو 10 بھی کم نہیں۔

پیشے سے ہم ملازم ہیں، ہر ملازم کو اتوار کے آنے کا گزرے ہوئے اتوار ہی سے انتظار شروع ہو جاتا ہے! ہم بھی اس کلیے سے بری نہیں، اپنے گھر کے چو بچے پر بیٹھے بیٹھے ہم ہر ہفتے یعنی سنیچر کی شام ہی میں آنے والے اتوار کی تعطیل گزارنے کے لیے [کئ]ی پانچ سالہ پلان بناتے رہتے ہیں لیکن وہ جو کہا ہے نا کہ انسان تدبیریں کرتا ہے لیکن تقدیر اس کا مذاق اڑاتی رہتی ہے، یہ [با]ت اکثر سچ ثابت ہوتی ہے۔ ابھی ابھی ایک لفظ استعمال کیا گیا تقدیر! کیا آپ جانتے ہیں تقدیر کا متبادل لفظ کیا ہے؟ [نہ]یں! تو آئیے ہم آپ کو بتائیں یہ لفظ ہے 'بچے'۔

دوسرے لفظوں میں آدمی بناتا ہے منصوبے اور بچے اڑاتے ہیں اس کے پرخچے۔

اس میں شک نہیں کہ اس بات میں ہے سچائی اور صاحب جہاں تک سچائی کا سوال ہے ہم خود اس کے گواہ [ہیں]۔

ایک اتوار کی شام ہم رفقا کے ساتھ گزارنا چاہتے تھے جس کے لیے ہم نے اپنے چند دوستوں کو اپنے گھر دعوت [د]ے کر بلایا۔ مہمانوں میں ایک صاحبہ ایسی تھیں [ج]ن کی ناک بہت لمبی تھی۔ دوسرے لفظوں [میں] ناک وہ ناک خطرناک جسے کہتے ہیں۔ بیوی نے ہمارے صاحب زادے کو جن کی عمر پانچ سال ہوگی شام [کو آ]نے والے مہمانوں کے بارے میں ایک وعظ دے دیا خاص کر ان مہمان خاتون کے بارے میں جن کی ناک بہت طویل تھی

ایٹم بم کا موجد :

ساس نے اپنے داماد سے کہا بیٹا سنا ہے آج کل روس اور امریکہ نے بہت سی نئی نئی چیزیں ایجاد کی ہیں۔
داماد نے جواب دیا "جی ہاں! ایک ایٹم بم کا موجد آپ بھی ہیں۔"

اور یہ تاکید کردی کہ ان کی ناک کے بارے میں ہرگز کسی قسم کی کوئی بات نہ کی جائے۔ یہ قدم اس لیے اٹھایا گیا کہ ہمارے صاحبزادے اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس کے بارے میں کہا گیا ہے:

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی

شام آئی، مہمان خاتون اپنی ناک کے ساتھ تشریف لے آئیں۔ ہمارے سعادت مند بیٹے نے انھیں دیکھا، والدہ ماجدہ کی تاکید کو ذہن میں رکھ کر خاموشی تو اختیار کرلی لیکن اس الم ناک ناک کو لگاتار گھورتا رہا، بیوی کے لیے یہ لمحے صبر آزما ہوتے جارہے تھے، ان کا ذہنی تناؤ بڑھتا گیا۔ کیوں کہ تاکید کے باوجود انھیں اپنے صاحب زادے پر بھروسہ نہیں تھا۔ ادھر ہمارے بیٹے کی ٹکٹکی بندھی ہوئی تھی ادھر ہماری بیوی کی سٹی گم تھی، انھوں نے چاہا بیٹا وہاں سے ٹل جائے مگر یہ نہ ہوا، آخرکار انھوں نے بیٹے سے نادانستہ کہا۔

جاؤ بچے باہر جاکر ناک کے ساتھ کھیلو

ظاہر ہے وہ کہنا چاہتی تھیں "کتے کے ساتھ کھیلو" وغیرہ، ویسے اس واقعے میں ہمارے بچے کے ساتھ ہماری بیوی کا بھی خاص رول رہا، بہرکیف!

اور یہ حکایت ہے ایسے صاحب کی جو بچپن سے بالپن، بالپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی تک کنجوس بلکہ بے حد کنجوس تھے۔ بیوی کے برا بھلا کہنے پر وہ ایک اتوار کو بیوی اور ایک عدد بچے کو پارک کی سیر کرانے پر راضی ہوگئے پکنک تھا اس لیے انھوں نے ساتھ میں قدرے بڑا سوٹ کیس بھی رکھ لیا جس میں کھانے پینے کی چیزیں بھی تھیں، ایک بس پر سوار ہوئے، جب کنڈکٹر نے پارک کا کرایہ بتایا تو وہ اس پر بہت خفا ہوئے۔ اس سے لڑنے لگے کہ وہ ان سے زیادہ پیسے مانگ رہا ہے، لفظی بحث نے تکرار کی صورت اختیار کرلی، پھر ہوا یہ کہ کنڈکٹر نے جھلا کر ان صاحب کا سوٹ کیس ان کے ہاتھ سے چھین کر باہر پھینک دیا۔ اس پر صاحبِ موصوف اور زیادہ چیخنے چلانے لگے اور بولے "میاں تم کنڈکٹر ہو یا ہٹلر، کیا اتنا کافی نہیں کہ تم ہم سے زیادہ کرایہ لینا چاہتے ہو اور اب نوبت یہاں تک آگئی کہ تم ہمارے بچے کو جو سوٹ کیس میں بند ہے مار ڈالنے کی کوشش کی ہے، بس روکو۔" ●●

کیا کیا جائے

فساد ہر جگہ برپا ہے کیا کیا جائے
مزاج قوم ہی ایسا ہے کیا کیا جائے؟

اُدھار پیتے تھے غالب تو یہ چُراتا ہے
چچا سے آگے بھتیجا ہے کیا کیا جائے؟

ہم اپنی ناک کٹوانے سے ہو گئے قاصر
ہمارے سامنے نکٹا ہے کیا کیا جائے؟

جو مذہبی تھے مسائل وہ اب سیاسی ہیں
یہیں تو دال میں کالا ہے کیا کیا جائے؟

خلوص لب پہ ہے اور دل میں زہر نفرت کا
منافقوں کی یہ دُنیا ہے کیا کیا جائے؟

ہیں ایک تھالی کے بینگن سیاسی سب لیڈر
تمام کرسی کا کنبھا ہے کیا کیا جائے؟

ہے خود کشی ہی اب انجام عشق بازی کا
ہمارے خواب میں دیکھا ہے کیا کیا جائے؟

ہر ایک شعر ہمارا ہے طنز کا نشتر!
ہمارا لہجہ ہی تیکھا ہے کیا کیا جائے؟

ڈھکا چھپا نہیں فرہاد و قیس کا انجام!
رحیم عقل کا اندھا ہے کیا کیا جائے؟

رؤف رحیم
حیدرآباد

شہر میں

کون ہٹلر آگیا ہے شہر میں
خونِ ناحق بہہ رہا ہے شہر میں

ساری جنتا کے محافظ سو رہے
دن دہاڑے گھر لٹا ہے شہر میں

منہ ہی تکتی رہ گئی موسیٰ ندی
خوں کا وہ دریا بہا ہے شہر میں

کس لیے منڈلا رہے ہیں گدھ یہاں
کیا کوئی بھوکا مرا ہے شہر میں

آیئے جشنِ چراغاں کیجئے!
ایک میرا گھر بچا ہے شہر میں

معجزاتِ زندگی کیسے کہوں؛
زندگی خود معجزہ ہے شہر میں

ہر کوئی سہما ہوا ہے اے رحیم
منظر کرب و بلا ہے شہر میں

غالب ثانی (حیدرآباد)

گئے موسم میں

اُڑی صرصر کی عجب دُھول گئے موسم میں
غنچہ کوئی نہ کھلا پھول گئے موسم میں
حسرتیں ہم بھی بہت دل میں لیے بیٹھے تھے
کوئی لیڈر ملے معقول گئے موسم میں
پک گئے کان بھی وہ کیسٹوں کا شور اُٹھا
ہاتھ پاؤں بھی گئے پھول گئے موسم میں
ایسی اُفتادِ فسادوں کی پڑی اب کی بار
بے کفن ہی اُٹھے مقتول گئے موسم میں
لمبے کرفیو کے سبب ہو گئی حالت ابتر
اچھے اچھے ہوئے مجہول گئے موسم میں
دُھول تک جھاڑ کے سب لے گئے پولس والے
اُن کا ٹھہرا یہی معمول گئے موسم میں

نئے موسم میں

شاخ در شاخ ہوں پھل پھول نئے موسم میں
اے خدا اب نہ ہمیں بھول نئے موسم میں
جنگ کی بادِ سموم آہ کسی طرح رکے
کھلیں زخموں کے نہ اب پھول نئے موسم میں
بارشیں کالی ہی برسیں، نہ بم ایسڈ کے گریں
رن سے بارودی اُٹھی دھول نئے موسم میں
جنگ چھڑتے ہی بن آئی ہے نفع خوروں کی
زر جمع کرنے میں مشغول نئے موسم میں
جو بھی بنتی ہے حکومت بڑے اخلاص کے ساتھ
کیوں بڑھا دیتی ہے محصول نئے موسم میں؟
تم بھی اک تہنیتی کارڈ اُسے بھیجو غالب
خواہش خریدی کا ہے معمول نئے موسم میں

○

یہ میرے ہی گھر کی کہانی نہیں ہے
نصیب ہم کو پینے کا پانی نہیں ہے
بتاؤں گا گن کر کہ ہیں کتنے بچے
مجھے یاد مسئلہ منہ زبانی نہیں ہے
پکڑوں تو پکڑوں میں چوہوں کو کیسے
جہیز میں مرے چوہے دانی نہیں ہے

غافل عادل آبادی

بشارت اس زمانے میں نئے نئے اسکول ماسٹر مقرر ہوئے تھے اور سیاہ فش ان کی تمناؤں کی معراج تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس یونی فارم یعنی سفید اچکن، سفید جوتے، . . . . سفید کرتے پاجامے اور سفید ازار بند وغیرہ کی کھکھیڑ فقط خود کو سفید گھوڑے سے میچ کرنے کے لیے تھی، ورنہ اس بیلطا بھیس پر کوئی بطخ ہی فریفتہ ہو سکتی تھی۔ انھیں چوڑی دار سے بھی سخت چڑ تھی۔ صرف خوب رو دوشیزہ کے ہاتھ کے بنے ہوئے ازار بند کو استعمال کرنے کی خاطر یہ ستار کا غلاف ٹانگوں پر چڑھانا پڑتا۔ اس ہوائی قلعے کی ہر اینٹ خیوڈل گارے سے بنی تھی جو پوتر خوابوں سے گندھا تھا۔
اتنا ہی نہیں کہ ہر اینٹ کا سائز اور رنگ مختلف تھا، ہر ایک پر ان کی ابھرواں شبیہ بھی بنی تھی۔ کچھ اینٹیں گول بھی تھیں! باریک جزئیات، یہاں تک کہ اس حدِ ادب کا بھی تعین کر دیا تھا کہ ان کے حضور سفید گھوڑے کی دم کتنی ڈگری کے زاویے تک اٹھ سکتی ہے اور ان کی سواری بادِ بہاری گزرنے پر کس کس جھروکے کی چق کے پیچھے کس کس کلائی میں کس کی چوڑیاں چھنک رہی ہیں۔ کس کی ہتھیلی پر ان کا نام (مع بی اے کی ڈگری) مہندی سے لکھا ہے۔ اور کس کس کی سرمگیں آنکھیں چلمن

مشتاق احمد یوسفی

اسکول ماسٹر کا خواب

(۱) پہلی قسط

سے لگی راہ تک رہی ہیں۔ اور تیلیوں کو بار بار انگلیوں سے چوڑا کر کے دیکھ رہی ہیں کہ کب انقلابی شہزادہ یہ دعوت دیتا ہوا آتا ہے کہ:

تم پرچم لہرانا ساتھی میں بربط پہ گاؤں گا

یہاں اتنا عرض کرتا چلوں کہ اس سے زیادہ محفوظ تقسیمِ کار اور کیا ہو گی کہ گھمسان کے رن میں پرچم تو محبوب اٹھائے اٹھائے کٹتا مرتا پھرے اور خود شاعر دور کسی مرمریں مینار میں بیٹھا ایک متروک اور دقیانوسی ساز پر ویسا ہی کلام یعنی خود اپنا کلام گا رہا ہو۔ نثر میں اسی سچویشن کو دوسرے کو سولی پر چڑھا جانے کی تلقین اور رام بھلی کرنے والی کہاوت میں ذرا زیادہ بھرپور ایمان داری سے بیان کیا گیا ہے۔ لیجیے، مطلع میں ہی سخن گسترانہ بات ... آپڑی۔ ورنہ کہنا صرف اتنا تھا کہ مزے کی بات یہ تھی کہ اس سوتے جاگتے خواب کے دوران، بشارت نے خود کو اسکول ماسٹر ہی کے "رول" میں دیکھا۔ منصب بدلنے کی خواب میں بھی جرأت نہ ہوئی۔ شاید اس لیے بھی کہ فلٹ اور ریشمی ازار بند سے صرف اسکول ماسٹروں

پر بھی رعب پڑ سکتا تھا۔ زمین داروں اور جاگیرداروں کے لیے یہ چیزیں کیا حیثیت رکھتی تھیں۔ انھیں اپنی پیٹھ پر بتیس برس بعد بھی اس آتشیں لکیر کی جلن محسوس ہوتی تھی جب محلے کے لونڈوں کے ساتھ شور مچاتے، چابک کھاتے وہ ایک رئیس کی سفید گھوڑے والی فٹن کا پیچھا کر رہے تھے۔

پچھوڑا ہے بلکہ کشش و پیچ را ہے پر

شعر و شاعری کو چھوڑ کر اسکول ماسٹری اختیار کی۔ اسکول ماسٹری کو دھتا بتا کر دکان داری کی۔ اور آخر کار دکان بیچ کھوچ کر کراچی آ گئے، جہاں ہر چند رائے روڈ پر دوبارہ عمارتی لکڑی کا کاروبار شروع کیا۔ نیا ملک بدلا بدلا رہن سہن۔ ایک نئی اور مصروف دنیا میں قدم رکھا۔ مگر اس گھوڑے اور فٹن والی فینٹسی نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ خواب نیم روز (day-dreaming) اور فینٹسی سے دو ہی صورتوں میں چھٹکارا مل سکتا ہے۔ اوّل، جب وہ فینٹسی نہ رہے، حقیقت بن جائے۔ دوم، انسان کسی چوراہے بلکہ کشش و پیچ راہے پر اپنے سوتے جاگتے ہمزاد سے سارے خواب بخشوا کر رخصت چاہے۔

Heart-breaker, dream-maker, thank you for the dream!

اور اس کھونٹ نکل جائے جہاں سے کوئی نہیں لوٹتا۔ یعنی گھر گرہستی کی طرف۔ لیکن بشارت کو اس سے بھی افاقہ نہیں ہوا۔ وہ بھرا پُرا گھر اونے پونے بیچ کر اپنے حسابوں لٹے پٹے آئے تھے۔ پاکستان میں ایک دو سال میں ہی اللہ نے ایسا فضل کیا کہ کانپور ہیچ معلوم ہونے لگا۔ سارے ارمان پورے ہو گئے مطلب یہ کہ گھر اشیائے غیر ضروری سے اٹا اٹ بھر گیا۔ بس ایک کمی تھی۔

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے گھوڑے کے سوا!

اب وہ چاہتے تو نئی نہ سہی، سیکنڈ ہینڈ کار بآسانی خرید سکتے تھے۔ جتنی رقم میں آج کل چار ٹائر آتے ہیں۔ اس سے کم میں کار مل جاتی تھی۔ لیکن کار میں انھیں وہ رئیسانہ ٹھاٹ اور زمین دارانہ ٹھسّا نظر نہیں آتا تھا جو فٹن اور بگھی میں ہوتا ہے۔ گھوڑے کی بات ہی کچھ اور ہے۔

گھوڑے کے ساتھ شجاعت بھی گئی۔

مرزا عبدالودود بیگ کہتے ہیں کہ آدمی جب بالکل جذباتی ہو جائے تو اس سے کوئی عقل کی بات کہنا ایسا ہی ہے جیسے بگولے میں بیج بونا۔ چناں چہ بشارت کو اس شوقِ فضول سے باز رکھنے کے بجائے انھوں نے الٹا خوب چڑھایا۔ ایک دن آگ کو پٹرول سے بجھاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جب سے گھوڑا رخصت ہوا، دنیا سے شجاعت و سرفروشی، جاں بازی اور بہادری کی ریت بھی اٹھ گئی۔ جانوروں میں کتا اور گھوڑا انسان کے سب سے پہلے اور سچے رفیق ہیں جنھوں نے اس کی خاطر ہمیشہ کے لیے جنگل چھوڑا۔ کتا تو خیر اپنے کتے پن کی وجہ سے چپٹا رہا، لیکن انسان نے گھوڑے کے ساتھ بے وفائی کی۔ گھوڑے کے جانے سے انسانی تہذیب کا ایک ایسا رومانی باب ختم ہوتا ہے۔ وہ باب جب سورما اپنے دشمن کو للکار کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے لڑتے تھے۔ موت ایک نیزے کی دوری پر ہوتی تھی اور یہ نیزہ دونوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ موت کا ذائقہ اجنبی سہی، لیکن مرنے والا مارنے والا دونوں ایک دوسرے کا چہرہ پہچان سکتے تھے۔ غافل سوتے ہوئے بے چہرہ شہروں پر مشروم بادل کی اوٹ سے آگ اور

ایسی موت نہیں برستی تھی۔ گھوڑا صرف اس وقت بزدل ہو جاتا ہے جب اس کا سوار بزدل ہو۔ بہادر گھوڑے کی ٹاپ کے ساتھ دل دھک دھک کرتے اور زمین تھرتھراتی تھی۔ پیچھے دوڑتے ہوئے بگولے، سموں سے اڑتی چنگاریاں، نیزوں کی انی پر کرن کرن بکھرتے سورج اور سانسوں کی ہانپتی آندھیاں کوسوں دور سے شہ سواروں کی یلغار کا اعلان کر دیتی تھیں۔ گھوڑوں کے ایک ساتھ دوڑنے کی آواز سے آج بھی لہو میں ہزاروں سال پرانی وحشتوں کے الاؤ بھڑک اٹھتے ہیں۔

" لیکن مرزا! ذرا ٹھہرو۔ اپنے توسنِ خطابت کو لگام دو۔ یہ کس گھوڑے کا ذکر کر رہے ہو؟ تانگے کے گھوڑے کا؟

گل جی کے گھوڑے :

لیکن یہ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ گھوڑے کے بغیر طالع آزمائی، ملک گیری، شجاعت اور "شولری" کے عہد کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ گھوڑے کی کاٹھی ہی ہمارا راج سنگھاسن ہے۔" گائیکواڑوں کو اپنے قدیم شاہی "ماٹو" پر بڑا ناز تھا۔ یورپ کو تاخت و تاراج کرنے والے ہن شہ سواروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کبھی گھوڑے سے نہیں اترتے تھے اس کی پیٹھ پر ہی سوتے، سستاتے، کھاتے، شراب نوشی اور خرید و فروخت کرتے — یہاں تک کہ حوائج ضروری سے فارغ ہوتے۔ انگلینڈ میں اسٹب نامی ایک آرٹسٹ گزرا ہے جو صرف اعلیٰ نسل کے گھوڑے پینٹ کرتا تھا۔ یورپ میں گھوڑوں، کتوں اور رائلٹی کی حد تک ولدیت اور شجرۂ نسب اب بھی تھوڑے بہت معنی رکھتے ہیں۔ گھوڑے کو برہنہ ماڈلوں پر ترجیح دینے کی وجہ ہمیں تو بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ عورت کے دم نہیں ہوتی۔ اس میں یہ عافیت بھی تھی کہ گھوڑا کبھی یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ تصویر اصل کے مطابق نہ ہو۔ بہتر ہو۔ ہم پاکستان کے ممتاز نامور آرٹسٹ گل جی کے گیارہ سال دیوار بیچ پڑوسی رہ چکے ہیں۔ انھیں بہت قریب سے پینٹ کرتے دیکھا ہے۔ وہ صرف رات کو اور وہ بھی بارہ بجے کے بعد پینٹ کرتے ہیں۔ کافی عرصے تک ہم یہی سمجھتے رہے کہ شاید انھیں رات میں بہتر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جب سے خود ہم نے السر کی تکلیف کے سبب رات کو لکھنا پڑھنا شروع کیا، ہمسائے کے بارے میں بدگمانی سے کام لینا چھوڑ دیا۔

کیا تجھ کو خبر کون کہاں جھوم رہا ہے

انھیں بھی گھوڑوں سے بے انتہا شغف ہے۔ ان کی تصویریں بنا کے لاکھوں کماتے ہیں۔ سنا ہے ایک دفعہ کسی نے (ہم نے نہیں) مذاق میں کہہ دیا کہ جتنے کی آپ ایک گھوڑے کی تصویر بیچتے ہیں، اس میں تو تین زندہ گھوڑے بآسانی آسکتے ہیں۔ . . . . اتنا تو ہم نے بھی دیکھا کہ اس کے بعد وہ کینوس پر کم از کم تین گھوڑے بنانے لگے۔ یہ بھی دیکھا جتنے پیار، تفصیل وار ہوشیاری اور انسپریشن سے گھوڑے کی دُم بناتے ہیں، اس کا دسواں حصہ بھی گھوڑے اور سوار پر صرف نہیں کرتے۔ صرف گھوڑے ہی کی نہیں، سوار کی بھی ساری پرسنلٹی کھنچ کر دُم میں آجاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے ایک ایک بال پر مالکانہ شفقت سے ہاتھ پھیر پھیر کر دُم بنائی ہے۔ چناں چہ ہر دُم منفرد، البیلی اور انمول ہوتی ہے۔ دل کی بات پوچھیے تو وہ فقط دُم ہی بنانا چاہتے ہیں۔ باقی ماندہ گھوڑا انھیں فقط دم کو لٹکانے کے لیے طوعاً و کرہاً بنانا پڑتا ہے۔ کبھی کسی وی آئی پی خاتون کی پورٹریٹ خاص توجہ سے بہت ہی خوب صورت بنانی مقصود ہوتی تو ان کے بالوں کی پونی ٹیل بطور خاص ایسی بناتے تھے کہ کوئی گھوڑا دیکھ لے تو بے قرار ہو جائے۔

بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط دُم

یوں بنانے کو تو انھوں نے ایسے اونٹ بھی بکثرت بنائے ہیں اور لنڈے بانس بریلی بھیجے ہیں۔ یعنی درجنوں کے حساب سے عرب ممالک کو روغنی اونٹ ایکسپورٹ کیے ہیں۔ ان کے بعض اونٹ تو اتنے مہنگے ہیں کہ صرف بینک، شیوخ، غیر ملکی سفارت کار اور مقامی اسمگلر ہی خرید سکتے ہیں۔ یونائیٹڈ بینک نے ان سے جو نایاب اونٹ خریدے وہ اتنے بڑے نکلے کہ ان کے ٹانگنے کے لیے ہال کے بیچوں بیچ ایک دیوار علاحدہ سے بنوانی پڑی لیکن انھیں دیکھ کر شیوخ اتنے خوش ہوئے کہ بعض نے اصل یعنی بالکل انھی جیسے اونٹوں کی فرمائش کر دی۔ اب بینک اس مخمصے میں پڑ گیا کہ:

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

پٹرو ڈالر ڈپازٹ کے لالچ میں بینک کو ان سے تھوڑی بہت مشابہت رکھنے والے اونٹ کی تلاش کر کے چارے سمیت ایکسپورٹ کرنے پڑے۔ جب ہم یونائیٹڈ بینک سے متعلق و منسلک ہوئے تو ایک دن ہمت کر کے گل جی سے کہا کہ حضور! اگر آپ آئندہ ایسے اونٹ بنائیں جو اس عالم آب و گل میں بآسانی دستیاب ہو جایا کریں تو بینک کو شیوخ کی فرمائش پوری کرنے میں آسانی رہے گی۔ نوکری کا سوال ہے۔ اور ہاں! ان پر کبھی کسی بے پردہ عورت کو سوار نہ دکھائیں۔ گل جی بلا کے ذہین، زود رنج اور حاضر جواب آرٹسٹ ٹھہرے۔ بہت منغض ہوئے۔ پھر کچھ خیال آیا تو سنبھل کر انگریزی میں بولے "بابا! ہم سیدھے سادے اسمٰعیلی آغا خانی مزدور! تابعدار! مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب میں آئل پینٹ کو بدچلن اونٹنی کے دودھ میں مکس کر کے کنواری گھوڑی کی دم کے بالوں کے برش سے اونٹ بناؤں۔ لاگت اور قیمت دگنی ہو جائے گی۔ سوچ لیجیے (اردو میں) صاحب! آپ فقیروں سے مسخری کرتے ہیں! پکاسو کہتا ہے کہ پینٹنگ اندھوں کا پیشہ ہے۔ آرٹسٹ وہ پینٹ نہیں کرتا جو وہ دیکھتا ہے بلکہ جو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے۔" ہم نے ان کے طنز کا برا نہیں مانا۔ اوّل تو:

مرد دانا پر کلام گرم و نیلک بے اثر

دوسرے ہم نے کہیں پڑھا تھا کہ تین چار سو سال پرانی راجپوت پینٹنگز میں جو شوخ اور نایاب ہلدی سے بھی پیلا رنگ نظر آتا ہے، وہ اس طرح بنایا جاتا تھا کہ پہلے گائے کو مسلسل کئی دن آم کے پتے کھلاتے پھر ان کے پیشاب سے یہ پیلا رنگ بناتے تھے۔ یہی رنگ پکے ہوئے رس بھرے آموں اور بسنتی چولیوں اور راجاؤں کے پرغرور پگڑیوں میں بھرتے تھے۔

بہرکیف، گل جی کے اونٹ میں وہ گھوڑے والی بات پیدا نہ ہو سکی۔ اور ہوتی بھی کیسے۔ کہاں گھوڑے کی تا بہ زانو گھنیری چنور شاہی دُم، کہاں اونٹ کی پونچھڑی! دم نہیں دم کا ٹوٹا کہیے۔ مرزا کہتے ہیں کہ اس سے تو ڈھنگ سے ستر پوشی بھی نہیں ہو سکتی۔ ہر جانور کی دم کا کچھ نہ کچھ مصرف ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً لنگور کی دم درختوں سے لٹکنے اور گدرائے ہوئے پھل اور مادہ پر کمند ڈالنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ آقا کے سامنے بے تحاشا ہلنے والی کتے کی دم پچھلے جنم میں کسی مصاحب کی زبان تھی۔ کتا اس کام کے لیے اپنی زبان استعمال نہیں کرتا۔ شتر مرغ کی دم مغربی خواتین کے سر کی زینت کے لیے بنی ہے۔ بعضے جانور کو دم محض اس لیے دی گئی ہے کہ دکھیا کے پاس دبا کر بھاگنے کے لیے کچھ تو ہو۔ دانا اس کو جانتے ہیں کہ بعض اوقات غریب کو مونچھ صرف اس لیے رکھنی پڑتی ہے کہ بوقت ضرورت

نیچی کر کے جان کی امان پائیے۔ مور کی دم شہریوں کو ناچ دکھانے کے لیے نہیں بلکہ جنگل میں مورنی کو رجھانے اور پیروں کے مزاروں پہ جاروب کشی کے لیے بنائی گئی ہے یہ لالچ نہ ہوتا تو ذرا سے جثے پہ اتنا بھاری جھنکاڑ کاہے کو اٹھائے پھرتا۔ ذرا ایک لحظہ کے لیے آنکھ بند کر کے غور فرمائیے، مور کو اگر شیو کر دیا جائے تو بالکل الو معلوم ہوگا۔

افضل ترین دُم

لیکن اونٹ کی دُم سے مادہ کو رجھانا تو درکنار، کسی بھی معقول یا نامعقول جذبے کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو تو ٹھیک سے لٹکنا بھی نہیں آتا۔ سچ پوچھیے تو دُم تو بس مور، برڈ آف پیراڈائز اور کسینو کی Bunnies کی ہوتی ہے۔ آخر الذکر ہمیں اس لیے بھی اچھی لگتی ہے کہ وہ ان کی اپنی نہیں ہوتی اور اس کا مقصد آدمی کے اندر سوئے ہوئے اور ہارنے والے خرگوش کو گدگدا کر جگانا ہے۔ برڈ آف پیراڈائز چکور کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن نر کی دُم، خدا جھوٹ نہ بلوائے، پندرہ پندرہ فٹ لمبی ہوتی ہے۔ اگر بہت سے نر اونچے اونچے درختوں پر اپنی متعلقہ دُمیں لٹکائے امیدوارِ کرم بیٹھے ہوں تو مادہ ان کی شوہرانہ اہلیت جانچنے کے لیے وہی پیمانہ استعمال کرتی ہے جس سے اگلے زمانے میں علما و فضلا کا علم ناپا جاتا تھا۔ مطلب یہ کہ فقط متعلقات یعنی داڑھی، شملہ اور دم کی لمبائی پر فیصلے کا انحصار۔ جس کی دُم سب سے لمبی ہو، مادہ اسی کے پہلے سرے پر لگی ہوئی منّا چونچ میں اپنی چونچ ڈال دیتی ہے
حقیقت یہ ہے کہ سب سے بامقصد دم بچھو کی ہوتی ہے۔ سانپ کا زہر کچلی میں اور بچھو کا دُم میں ہوتا ہے۔ بھڑ کا زہر ڈنک میں رہتا ہے اور پاگل کتے کا زبان میں۔ انسان واحد حیوان ہے جو اپنا زہر دل میں رکھتا ہے ــــ لکھتے لکھتے یوں ہی خیال آیا کہ ہم بچھو ہوتے تو کس کس کو کاٹتے۔ اپنے ناپسندیدہ اشخاص کی فہرست کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ ایک زندگی تو اس مشن کے لیے بالکل ناکافی ہوتی۔ لیکن یہاں تو نوبت ہی نہ آتی، اس لیے کہ ہمارے معتوبین کی فہرست میں سب سے پہلا نام تو ہمارا اپنا ہی ہے۔ نہ ہی سانپ کی دُم تو وہ ہمیں 'پسند نہیں' Fasci- nate (لبھاتی) ضرور کرتی ہے۔ اس میں وہی خوبی پائی جاتی ہے جو ہماری پیشانی میں ہے۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ پھن کو چھوڑ کر ہمیں تو سارا سانپ دم ہی دم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سب سے اعلیٰ و افضل وہ دُم قرار پائے گی جو جھڑ چکی ہے۔ اس لیے کہ اس حادثے کے بعد ہی اشرف المخلوقات اور خلیفۃ الارض کا درجہ ملا ہے۔

ہماری سواری، کیلے کا چھلکا:

فش اور گھوڑے سے بشارت کی شیفتگی کا ذکر کرتے کرتے ہم کہاں آ نکلے۔ مرشدی و آقائی مرزا عبدالودود بیگ نے ایک دفعہ بڑے تجربے کی بات کہی۔ فرمایا "جب آدمی کیلے کے چھلکے پر پھسل جائے تو پھر کبھی بریک لگانے کی کوشش ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ کیوں کہ اس سے اور زیادہ چوٹ آئے گی۔ بس آرام سے پھسلتے رہنا چاہیے اور پھسلنے کو انجوائے کرنا چاہیے۔ بقول تمہارے استاد ذوق کے، تم بھی چلے چلو یونہی جہاں تک چلی چلے۔ کیلے کا چھلکا جب تھک جائے گا تو خود بخود رک جائے گا۔" "Just relax." لہذا قدم ہی نہیں، قلم یا نگاہ و تصور بھی پھسل جائے تو ہم اسی اصول پر عمل کرتے ہیں بلکہ صاف صاف کیوں نہ اقرار کر لیں کہ زندگی کے طویل سفر میں کیلے کا چھلکا ہی ہماری واحد سواری رہا ہے جو کبھی کبھی ہماری چال میں جوانوں کی سی تیزی، صحت مند طبیعت بھی آجاتی

ہے تو یہ اسی کے طفیل ہے۔

ریس کورس سے تانگے تک :

جیسے جیسے بزنس میں منافع بڑھتا گیا، فنٹن کی خواہش بھی شدید تر ہوتی گئی۔ بشارت جنون گھوڑے کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے گھوڑے کے بغیر ان کے سارے کام بند ہیں اور بادشاہ رچرڈ سوم کی طرح وہ ہر چیز گھوڑے کی خاطر تج دینے کے لیے تیار ہیں:

"A horse! a horse! my kingdom for a horse."

ان کے پڑوسی چودھری کرم الٰہی نے مشورہ دیا کہ ضلع سرگودھا کے پولس اسٹڈ فارم سے رجوع کیجیے۔ وہاں پولیس کی نگرانی میں "تھارو بریڈ" اور اعلیٰ ذات کے گھوڑوں سے انزایشن نسل کروائی جاتی ہے۔ گھوڑے کا باپ خالص اور اصیل ہو تو بیٹا لامحالہ اسی پر پڑے گا۔ مثل ہے باپ پر پوت، پتا پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ مگر بشارت کہنے لگے کہ "میرا دل نہیں ٹھکتا۔ بات یہ ہے کہ جس گھوڑے کی پیدائش میں پولیس کا عمل دخل ہو، وہ خالص ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ گھوڑا پولیس پر پڑے گا۔"

گھوڑے کے بارے میں یہ گفتگو سن کر پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے۔ بی ٹی نے وہ مشہور شعر پڑھا اور حسب معمول بے محل پڑھا اور جس میں دیدہ ور کی ولادت سے رونما ہونے والی پیچیدگیوں کے ڈر سے نرگس ہزاروں سال روتی ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ پروفیسر قاضی عبدالقدوس اپنی دانست میں کوئی بہت ہی ماناکی بات کہنے کے لیے اگر بیچ میں بولیں تو بے وقوف معلوم ہوتے ہیں۔ اگر نہ بولیں تو اپنے چہرے کے نارمل ایکسپریشن کے سبب اور زیادہ بے وقوف لگتے ہیں۔ گویا۔

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

پروفیسر مذکور کے نارمل ایکسپریشن سے مراد چہرے پر وہ رنگ ہیں جو اس وقت آتے اور جاتے ہیں جب کسی کی زپ ادھ بیچ میں اٹک جاتی ہے۔

خدا خدا کرکے ایک گھوڑا پسند آیا جو ایک اسٹیل ری رولنگ مل کے سیٹھ کا تھا۔ تین چار دفعہ اسے دیکھنے گئے اور ہر دفعہ پہلے سے زیادہ مطمئن لوٹے۔ اس کا سفید رنگ ایسا بھایا کہ اٹھتے بیٹھتے اسی کے چرچے، اسی کے قصیدے۔ ہم نے ایک دفعہ پوچھا "پنج کلیان ہے؟" حقارت آمیز انداز سے ہنسے۔ فرمایا "پنج کلیاں تو بھینس بھی ہو سکتی ہے۔ فقط چہرہ اور ہاتھ پیر سفید ہونے سے گھوڑے کی دُم میں سرخاب کا پر نہیں لگ جاتا۔ گھوڑا وہ جو آٹھوں گانٹھ کمیت ہو۔ چاروں ٹخنوں اور چاروں گھٹنوں کے جوڑ مضبوط ہونے چاہئیں۔ یہ بھاڑے کا ٹٹو نہیں، ریس کا خاندانی گھوڑا ہے۔" یہ گھوڑا اُن کے اعصاب پر اس بُری طرح سوار تھا کہ اب اُسے ان پر سے کوئی گھوڑی ہی اتار سکتی تھی۔ سیٹھ نے انہیں ایسوسی ایٹڈ پرنٹرز میں طبع شدہ کراچی ریس کلب کا وہ کتابچہ بھی دکھایا جو اس ریس سے متعلق تھا جس میں اس گھوڑے نے حصہ لیا اور اوّل آیا تھا، جس میں اس کی تصویر اور تمام کوائف مع شجرہ نسب درج تھے۔ نام WHITE ROSE ولد WILD OATS ولد OLD DEVIL۔ جب سے یہ اعلیٰ نسل کا گھوڑا دیکھا انہوں نے اپنے ذاتی بزرگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیا۔ اُن کے بیان کے مطابق اس کے دادا نے بمبئی میں تین ریسیں جیتیں۔ چوتھی میں دوڑتے ہوئے ہارٹ فیل ہو گیا۔ اس کی دادی بڑی نرچگ تھی۔ اپنے زمانے کے نامی گرامی ولایتی گھوڑوں سے اس کا تعلق رہ چکا تھا۔ اس کے دامنِ عصمت سے ترک دتیّج کی بدولت چھ نرینہ اولادیں ہوئیں۔ ہر ایک اپنے متعلقہ باپ پر پڑی۔ سیٹھ سے پہلے وائٹ روز ایک بگڑے رئیس کی ملکیت تھا جو [illegible] "گڈ اینڈ برائٹ" نام کی اینگلو انڈین بیوی ایلس کے لیے غلطی [illegible] ری رولنگ مل سے جو سرمایہ خرید کرکے گیا تھا ۔۔۔ رقم کی جیتنے سے اس کے نام کھڑی تھی۔ ریس اور سٹے میں دوالا نکلنے کے

سبب ونڈرلینڈ کی تعمیر رک گئی اور ملیس اسے حیرت زدہ چھوڑ کر ملتان کے ایک زمیندار کے ساتھ یورپ کی سیر کو چلی گئی۔ سیٹھ کو ایک دن جیسے ہی یہ خبر ملی کہ ایک قرض خواہ اپنے واجبات کے عوض پلاٹ پر پڑی ہوئی سمنٹ کی بوریاں اور سریا اٹھوا کے لے گیا اس نے اپنے منیجر کو پانچ لٹھ بند چوکیداروں کی نفری ساتھ لے کر ہاتھی لینڈ بھیجا کہ بھاگتے بھوت کی جو چیز بھی ہاتھ لگے کھسوٹ لائیں۔ لہٰذا وہ یہ گھوڑا اصطبل سے کھول لائے۔ وہیں ایک سیامی بلی نظر آگئی۔ سو اسے بھی بوری میں بھر کے لے آئے۔ گھوڑے کی ٹریجڈی کو پوری طرح ذہن نشین کرانے کے لیے بشارت نے ضمناً ہم سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ فرمایا "یہ گھوڑا تانگے میں جتنے کے لیے تھوڑا ہی پیدا ہوا تھا۔ سیٹھ نے بڑی زیادتی کی مگر قسمت کی بات ہے۔ صاحب تین سال پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ آپ یوں بینک میں جوت دیئے جائیں گے۔ کہاں ڈپٹی کمشنر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی کرسی اور کہاں بینک کا چار فٹ اونچا اسٹول!"

شاہی سواری:۔

انہیں اس گھوڑے سے پہلی نظر میں محبت ہو گئی۔ اور محبت اندھی ہوتی ہے، خواہ گھوڑے سے ہی کیوں نہ ہو۔ انہیں یہ تک سجھائی نہ دیا کہ گھوڑے کی مدح میں اساتذہ کو جو اشعار وہ اوٹ پٹانگ پڑھتے پھرتے تھے، ان کا تعلق تانگے کے گھوڑے سے نہیں تھا۔ یہ مان لینے میں چنداں مضائقہ نہیں کہ گھوڑا شاہی سواری ہے۔ رعبِ شاہی اور شوکتِ شاہانہ کا تصور گھوڑے کے بغیر ادھورا بلکہ آدھا رہ جاتا ہے۔ بادشاہ کے قد میں گھوڑے کے قد کا اضافہ کیا جائے تب کہیں وہ قدِ آدم نظر آتا ہے۔ لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو شاہی سواریوں میں گھوڑا دوسرے نمبر پہ آتا ہے۔ اس لیے کہ بادشاہوں اور مطلق العنان حکمرانوں کی مستقل اور دل پسند سواری درحقیقت رعایا ہوتی ہے۔ یہ ایک دفعہ اس پہ سواری گانٹھ لیں تو پھر انہیں سامنے کوئی کنواں، کھائی، باڑھ اور رکاوٹ دکھائی نہیں دیتی۔ جوشِ شہ زوری و شہ سواری میں نوشتہ دیوار والی دیوار بھی پھلانگ جاتے ہیں۔

اکثر یہ بد رکاب بنی اور بگڑ گئی

غربا کشتن روزِ اول:۔

لیکن جو حکمراں ہوشیار، مردم شناس اور رموزِ مصلحتِ مملکت سے آشنا ہوتے ہیں، وہ پہلے ہی دن غریبوں کی سرکوبی کر کے خواص کو عبرت دلاتے ہیں۔

غربا کشتن روزِ اول

ویسے خواص اور عمائد کو کسی تنبیہ اور آنکس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جو بھی ان پر سونے کی عماری، چاندی کی گھنٹیاں، زربفت کی جھول اور تمغوں کی مالا ڈال دے، اسی کا نشان کا ہاتھی بننے کے لیے کمربستہ رہتے ہیں۔ پہلے کمربستہ و دست و پابستہ۔ پھر لب بستہ۔ اور آخر میں فقط بستہ بردار۔

چار دن کی زندگی ملی تھی۔ سو دو آرزوئے حضوری میں کٹ گئے، دو جی حضوری میں۔

ہمارا کجاوہ۔

ہم نے ایک دن گھوڑوں کی جناب میں کچھ گستاخی کر دی تو بشارت بھنا گئے۔ ہم نے برسبیل تضحیک ایک تاریخی حوالہ دیا تھا کہ جب منگول ہزاروں کے غول بنا کر گھوڑوں پر نکلتے تو بدبو۔ گرد سے بھبکے اٹھتے تھے کہ بیس میل دور سے پتہ چل جاتا تھا۔ ارشاد فرمایا، معاف کیجیے۔ آپ نے راجستھان میں، جہاں آپ نے جوانی گنوائی، اونٹ ہی اونٹ دیکھے، جن کی پیٹھ پہ کلف دار راجپوتی صافے، چڑھواں داڑھیاں اور دس فٹ لمبی نال والی توڑے دار بندوقیں سجی ہوتی تھیں۔ اور پیچھے...... کندھے پہ رکھی لاٹھی کے سرے پر تیل پلائے ہوئے کچے چمڑے کے جوتے لٹکائے، اردلی میں ننگے پیر جاٹ۔ گھوڑا تو آپ نے پاکستان میں آن کر دیکھا ہے۔ میاں احسان الٰہی گواہ ہیں، انہی کے سامنے آپ نے ان ٹھاکر صاحب کا قصہ سنایا تھا جو مہاراجہ کی شتر نال پلٹن میں رسالدار تھے۔ جب

ریٹائر ہو کر اپنے آبائی قصبے ..... کیا نام تھا اس کا ...... ادے پور تو راوائی پہنچے تو اپنی گڑھی میں ملاقاتیوں کے لیے دس بارہ مونڈھے ڈلوا دیے اور اپنے لیے اپنے سرکاری اونٹ جنگ بہادر کا پرانا کجاوہ۔ اسی پر اپنی بلیش کا شنگرفی رنگ کا صافہ باندھے سینے پر تمغے سجائے صبح سے شام تک بیٹھے ہلتے رہتے۔ ایک دن ہل ہل کر جنگ بہادر کے کارنامے بیان کر رہے تھے اور میڈل جھن جھن کر رہے تھے کہ دل کا دورہ پڑا۔ کجاوے پر ہی طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر کے اپنے ممدوح کا ہمسفر پرواز ہو گیا۔ دم واپسیں لبوں پر مسکراہٹ اور جنگ بہادر کا نام۔ معاف کیجیے یہ سب آپ ہی کے لیے ہیں سے اسنیپ شاٹس ہیں۔ بندہ پرور ذرا آپ بھی تو اپنے کجاوے سے نیچے نہیں اترتے۔ نہ اتریں۔ مگر یہ کجاوہ خاکسار کی پیٹھ پر رکھا ہوا ہے۔ صاحب آپ گھوڑے کی قدر کیا جانیں۔ آپ تو یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ سمند، سیاہ زانو کس چڑیا کا نام ہے، خچر کا کاواں کیسے ہوتا ہے! کھر یا کس شکل کا ہوتا ہے! کنوتیاں کہاں ہوتی ہیں! بیل کے آر کہاں چبھوئی جاتی ہے! چلغوزہ کس زبان کا لفظ ہے!

آخری دو سوال کلیدی اور فیصلہ کن تھے۔ اس لیے کہ ان سے پتہ چلتا تھا کہ بحث کس نازک مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ یہ کج بحثی ہمیں اس لیے اور بھی ناگوار گزری کہ ہمیں ایک بھی سوال کا جواب نہیں آتا تھا۔ وہ "اوکھے" نہیں بطابت دھیمے اور میٹھے آدمی ہیں۔ لیکن جب وہ اس طرح پٹڑی سے اتر جائیں تو ہمیں دور تک کچے میں کھدیڑتے گھسیٹتے لے جاتے ہیں۔ کہنے لگے "جو شخص گھوڑے پر نہیں بیٹھا وہ کبھی سیر چشم، غیور اور شیر دلیر نہیں ہو سکتا۔" ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ خود بھی کبھی گھوڑے پر نہیں بیٹھے تھے۔

جنازے سے دور رکھنا:

انہیں ایک عرصے سے زندگی میں جو روحانی خلا محسوس ہو رہا تھا وہ اس گھوڑے نے پر کر دیا۔ انہیں بڑی حیرت ہوتی تھی کہ اس کے بغیر اب تک کیسے بلکہ کاہے کو جی رہے تھے!

I WONDER BY MY TROTH THOU AND I DID TILL WE LOVED— DONNE

اس گھوڑے سے ان کی شیفتگی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ فٹن کا خیال چھوڑ کر سیٹھ کا تانگہ بھی ساڑھے چار سو روپے میں خرید لیا، حالانکہ انہیں بالکل پسند نہیں تھا۔ بہت بڑا اور گنوارو تھا۔ لیکن کیا کیا جائے، سارے کراچی میں ایک بھی فٹن نہیں تھی، سیٹھ گھوڑا اور تانگہ ساتھ بیچنا چاہتا تھا۔ یہی نہیں، اس نے دانے کی دو بوریوں، گھاس کے پانچ پولوں، گھوڑے کے فریم کیے ہوئے فوٹو، ہاضمے کے نمک، دوا اور تیل پلانے کی نال، کھریرے اور توبڑے کی قیمت ساڑھے اٹھتیس روپے علیحدہ سے دھروالی۔ وہ اس دھاندلی کو "پیکج ڈیل" کہتا تھا۔ گھوڑے کے بھی منہ مانگے دام دینے پڑے۔ گھوڑا اگر اپنے منہ سے دام مانگ سکتا تو یقیناً سیٹھ کے مانگے ہوئے داموں یعنی نو سو روپے سے کم ہی ہوتے۔ گھوڑے کی خاطر بشارت کو سیٹھ کا تکیہ کلام "کیا!" اور "سالا" بھی برداشت کرنا پڑا۔ چلتا حساب کر کے جب انہوں نے لگام اپنے ہاتھ میں تھام لی اور یہ یقین ہو گیا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت ان سے ان کے خواب کی تعبیر نہیں چھین سکتی تو انہوں نے سیٹھ سے پوچھا کہ آپ نے اتنا اچھا گھوڑا کیوں بیچ دیا؟ کوئی عیب ہے؟ اس نے جواب دیا کہ "دو مہینے پہلے کی بات ہے، میں تانگے میں لارنس روڈ سے لی مارکیٹ جا رہا تھا۔ میونسپل ورکشاپ کے پاس پہنچا ہوں گا کہ سامنے سے ایک سالا جنازہ آتا دکھائی پڑا۔ کیا کسی پولیس افسر کا تھا۔ گھوڑا آل آف اے سڈن بدک گیا۔ پر کندھا دینے والے اس سے بھی زیادہ بدکے۔ بے فضول دھڑک کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ کیا! بیچ سڑک پر جنازے کی مٹی خراب ہوئی۔ ہم سالا الو کے موافق بیٹھا دیکھتا پڑا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن بیکار بندھا کھڑا رہا ہے۔ دل سے اتر گیا۔ کیا! ویسے عیب کوئی نہیں۔ بس جنازے سے دور رکھنا اچھا۔ سلام الیکم!"

"آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"تم نے پہلے کیوں نہیں پوچھا؟ سلام الیکم!"



پچور میر الحسن

نعیم زبیری (حیدرآباد)

میری بدنصیبی یہ ہے کہ وہ مجھے اپنا ہم خیال سمجھنے لگے ہیں۔ میاں عبدالغفور اگر مجھے زد میں ملے ہوتے اور پنجرے کے محفوظ حصار میں ہوتے تو شاید میں خوش ہو لیتا۔ بلکہ اپنی آل اولاد سے بھی انھیں ملواتا اور اگر اس سلام میں ایک آدھ کیلا بھی خرچ ہو جاتا تو پیشانی پر بل نہ لاتا لیکن کیا کیا جائے کہ وہ اپنی رنگ برنگی شخصیت کی ساری رعنائیوں برنائیوں کے ساتھ میرے سر پر سوار ہیں اور اکثر مجھے اس بات کا احساس دلواتے رہے ہیں کہ ان کے مخاطبین میں صرف میں اکیلا ہی اس قابل ہوں جسے وہ برداشت کر لیتے ہیں۔ ڈپی جی وڈہاؤس کے صفحات سے نکلا ہوا یہ عجیب و غریب کردار مجھ بے چارے کے اعصاب پر سواری کسنے کے لیے کیوں چلا آیا ہے۔ اور میں اسے برداشت کرنے پر کیوں مجبور ہوں۔ یہ ایک لمبی اور دردناک کہانی ہے جسے سنا کے میں آپ حضرات و خواتین کو بور نہیں کرنا چاہتا۔ بس یوں سمجھیے کہ جو چند گناہ میں نے کیے ہوں گے ان کی پاداش میں یہ آسیب مجھ پر مسلط کیا گیا ہے HORROR کہانیوں میں جب کوئی کردار اندھیری رات میں ساحل سمندر کے قریب کسی ویران اندھیرے۔ کائی کی بدبو سے بھرے ہوئے گودام میں کسی بھوت سے دوچار ہوتا ہے اور وہ بھوت اپنے بغیر نرخرے والی آواز میں ایک وحشت ناک قہقہہ مار کے مخاطب ہوتا ہے تو رونگٹے کھڑے کر دینے والی جو آواز پیدا ہوتی ہے اس میں اور ہمارے عبدالغفور صاحب کی آواز میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔

جس گھر میں موصوف فروکش ہیں اس کے عین سامنے ڈریننج کا مین ہول ابلتا رہتا ہے۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ چپل پہن کے ہرگز گھر نہ جائیں۔ کیوں کہ دھلنے کے بعد بدبو بیٹھے ہی چلی جائے، آپ کی پتلون اور شرٹ کے پچھواڑے سے چپکے ہوئے دھبے زندگی بھر آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔

جو گھنٹہ پیچھے سے رینگ کر دیمک کال بیل تک پہنچ گئی ہے لیکن آپ کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کو مطلب ہے کال بیل سے۔ اسے بجائیے اور انتظار کیجیے۔ گھر کے تحت الشعور میں گھنٹی ضرور بجے گی کیوں کہ میاں عبدالغفور اپنے الیکٹریکل انسٹالیشنز ELECTRICAL INSTALLATIONS کا بہت خیال رکھتے ہیں اور اگر غلطی سے آپ یہ سمجھ بیٹھیں کہ اکثر گھروں کی کال بیل کی طرح یہ گھنٹی بھی ناکارہ ہے۔ اور دستک دینے کی بھول کر بیٹھیں تو یاد رہے وہ آپ جیسے ناسمجھوں کے لیے جان بوجھ کر دروازہ نہیں کھولیں گے یا اگر کھولیں گے بھی تو اپنے غصے کو ضبط کرنے کی

کوشش کرتے ہوئے سلام علیک سے پہلے کال بیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ کی حماقت پر نگاہوں ہی نگاہوں میں طنز کریں گے "اوہو۔ بھئی بڑے زمانے بعد تشریف لائے۔ آئیے۔ آئیے۔" اور اپنا دلبرانہ طوعاً و کرہاً کھولیں گے۔ ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا ڈائیلاگ اتنا اہم نہیں ہے کہ اُسے دہرایا جاتا لیکن اس کی اہمیت کو آپ اسی وقت سمجھ سکتے جب کہ آپ اُن سے کبھی ملے ہوتے اور ان کی معنی خیز مسکراہٹ کو پڑھ سکتے جو ہر آنے والے کو یہ احساس دلاتی ہے کہ انھیں خوب پتہ ہے کہ کوئی کام پڑ گیا ہے آپ کو ان سے کیوں کہ اس شبہ میں ہمیشہ مبتلا رہتے ہیں کہ وہ شہر کی نہایت بارسوخ اور با اثر شخصیت ہیں۔

دہلیز کا ایک پتھر اکھڑا ہوا ہے لہٰذا آپ کو بہ احتیاط ڈرائینگ روم میں داخل ہونا ہے۔ کمرہ کے بیچوں بیچ قالین کا ایک ٹکڑا بچھا ہوا ہے۔ میں اسے ٹکڑا کہنے پر مصر رہوں گا کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ یہ وظیفہ یاب قالین دو تین حصوں ہی میں خریدا گیا ہوگا۔ کیوں کہ اس کا ایک حصہ میں اپنی آنکھوں سے ایک پچھلی ملاقات کے موقعے پر بیڈ روم میں بچھا ہوا دیکھ چکا ہوں۔ واقعی عبدالغفور صاحب کی نظرِ انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے۔ کیوں کہ جہاں جہاں بھی اس قالین کا ڈیزائن وقت کے بے رحم ہاتھوں کی زد میں آنے سے رہ گیا ہے۔ وہاں اس بچے کھچے ڈیزائن کا حسن آپ کے تصور کو شاہی محلات کی تفریح کروا دیتا ہے۔ اس قالین نے کبھی بڑے عیش کے دن رات گزارے ہوں گے۔ آرٹ اور کرافٹ کے دلدادہ اس مہربان شخص سے کسی بدبخت کباڑی کی ناقدری نہ دیکھی گئی ہوگی۔ چناں چہ انھوں نے اسے اپنی شرن میں لے لیا امتدادِ زمانہ کی پتہ نہیں کون کون سی داستانیں اپنے تار تار دامن میں چھپانے آج یہ قالین کا حصہ اوّل عبدالغفور صاحب کے دیوان خانے کی زینت بنا ہوا ہے۔ دیوان خانے کا فرش اگر اُوبڑ کھابڑ ہے تو اس میں عبدالغفور صاحب کا کوئی قصور نہیں ہے۔ آپ اس سلسلے میں ان کے مالکِ مکان سے گفتگو کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ قالین کے اوپر شیشم کی بنی ہوئی ایک نہایت خوب صورت۔ وزنی۔ گول میز ہے جس پر بنے ہوئے نقش و نگار بے اختیار تاج محل کے سنگ تراشوں کی انگلیوں کی یاد دلا دیتے ہیں۔ اور میز کے اوپر ایک نہایت ہی حسین۔ نہایت ہی وسیع و عریض چینی کا گلدان رکھا ہوا ہے۔ جس کی حفاظت یقیناً نواب سالار جنگ مرحوم کی روح کر رہی ہوگی۔ کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کب کی یہ خوب صورت میز اپنے حسین بار کے ساتھ زمیں دوز ہو چکی ہوتی کیوں کہ یہ میز شروع تو اچھی خاصی ہوئی تھی لیکن اگر درمیان میں عبدالغفور صاحب کے چابک دست ہاتھوں نے آگے بڑھ کے چیڑ کی کھپچیوں کے ذریعہ نہایت ماہرانہ انداز میں سہارا نہ دے دیا ہوتا تو اسے بھی دو حصوں میں استعمال کرنا ضروری ہو جاتا ـــــ دیوان خانے میں چاروں دیواروں کے ساتھ ساتھ سینکڑوں کرسیاں رکھی ہوئی ہیں اور اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ ایک کرسی کی شکل و ہیئت دوسری سے نہ ملے اور اسی کو اصل میں تنوع کہتے ہیں اور یہاں بھی کئی فن کاروں کی سرپرستی کا جذبہ کارفرما ہے۔ کرسیوں کے ہلنے جلنے کی شکایت فضول ہے۔ آپ سے کس نے کہا ہے کہ آپ فرنیچر کو ادھر ادھر ہٹانے کی زحمت کریں۔ دیوار سے ٹکی ہوئی کرسیوں پر آرام سے بیٹھیے اور صاحبِ خانہ سے گفتگو کیجیے۔

میں معافی چاہتا ہوں کہ میں نے صاحب خانہ سے تعارف کرائے بغیر ہی قالین اور فرنیچر وغیرہ کی باتیں شروع کر دیں۔ موصوف کی شخصیت کچھ اتنی رنگین اور اتنی پہلو دار ہے کہ مجھ ایسے کوتاہ قلم کے لیے ان کا مکمل احاطہ

کرنا بے حد مشکل ہے ۔ یوں لگتا ہے کہ موصوف تاریخ کے ان صفحات کے بیچ میں دب کے رہ گئے تھے جہاں مغل اور برطانوی تہذیبیں ایک دوسرے میں مدغم ہونے کی جدوجہد میں دست و گریباں تھیں۔ چناں چہ ان کی شخصیت نے روشنائی کو جذب کرنے کے لیے استعمال کیے ہوئے چاک پیس کی طرح دونوں تہذیبوں کو چوس لیا ہے۔ اور اس کا گڈمڈ نتیجہ ہمارے آپ کے سامنے ہے ۔ وہ انگریزی اردو میں اور اردو انگریزی میں بولتے ہیں۔ لنگی کے اوپر ڈریسنگ گاؤن پہنتے ہیں۔ پائپ بھی پیتے ہیں اور شاید اس میں بیڑی تمباکو استعمال کرتے ہیں ۔ ہر چیز کی اوریجنالٹی کے قائل ہیں ۔ چناں چہ اصول پرستی کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے اپنا چوکڑا کسی اینگلو انڈین دندان ساز سے بنوایا تھا جس کا ہوائی حادثہ میں انتقال ہو گیا ۔ ہوائی حادثہ کا ذکر بھی اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس سے ان کے چوکڑے کی حیثیت کا کچھ اندازہ سننے والے کو ہو جاتا ہے ۔ کچھ دن بعد ان کا چوکڑا بھی ہوائی حادثہ کا شکار ہو کے جاں بحق ہوتے ہوتے رہ گیا۔ لیکن ایک خطرناک قسم کا فریکچر اس میں آگیا اور وہ اس وقت ٹھیک ہوگا جب وہ بھی انگلینڈ جائیں گے ۔ اس وقت تک یہ چوکڑا ان کے منہ میں اٹھکیلیاں کرتا رہے گا اور ان کی اکثر باتیں ہم تک دو حصوں میں تقسیم ہو کے پہنچیں گی۔

سلام علیک کے بعد وہ آپ کو اپنی منتخبہ کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دیں گے کہ ان کرسیوں پر بھی ہاتھی کے دانتوں والی کہاوت صادق آتی ہے ۔ پھر آپ کے ہاتھ میں نیویارک ٹائمز کا ایک دو سال پرانا شمارہ تھما کے نہایت ہی اینگلو امریکی انداز لہجے میں "Excuse me for a moment pl." کہتے ہوئے اندر چلے جائیں گے۔ لیکن یہ سلوک ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جن کے ساتھ وہ تکلف برتتے ہیں ۔ لیکن جیسا کہ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں ۔ پتہ نہیں اپنی بدقسمتی کے کس موڑ پر میں موصوف سے ملا تھا کہ ۔ ان کی "good books" میں آگیا ہوں ۔ چناں چہ وہ مجھے اپنے مخصوص کمرے میں لے جاتے ہیں جہاں قالین کا حصہ دوم بچھا ہوا ہے ۔ راستے میں آپ کی مڈبھیڑ لیڈی عبدالغفور سے ہوتی ہے ۔ جو ایک میلی نائٹی میں ملبوس برتن مانجھنے میں مصروف ہیں ۔ ان کے کمرے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں چاروں طرف گلدان پھیلے ہوئے ہیں ۔ لمبے ۔ گڈے ۔ موٹے ۔ آڑے ۔ ٹیڑھے ۔ ترچھے ۔ جن میں سے ہر ایک میں مصنوعی جاپانی پھول لگے ہوئے ہیں ۔ جنھیں اگر میرا بس چلتا تو کسی نالے میں پھینک دیتا ۔ انھیں دیکھ کے یاد آتا ہے کہ تاریک دیوان خانے میں بھی ایسے ہی گلدان ادھر ادھر رکھے ہیں اور بعض تو چھت سے لٹکے ہوئے بھی ہیں ۔ لگتا ہے چمگادڑیں لٹکی ہوئی ہوں ۔ کمرہ کو نہایت رومانوی انداز میں نیم تاریک رکھا گیا ہے ۔ کونے میں رکھے ہوئے لیمپ کی روشنی کا حلقہ صوفے پر پڑی پلاٹ کے ڈائیلاگ والی کتاب پر پڑ رہا ہے ۔ میں نے ہر مرتبہ ایک نئی کتاب اس جگہ رکھی ہوئی دیکھی ہے ۔ وہ اصل میں صوفے کے پھٹے ہوئے کپڑے سے جھانکنے والے ایک اسپرنگ کو چھپانے کے لیے رکھی جاتی ہے ۔ لیمپ کے اوپری حصے سے چھن چھن کے آنے کی روشنی چھت میں لٹکے ہوئے جالوں میں کھو جاتی ہے اور کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ کہیں آپ اہرام مصر کے تہہ خانے میں تو نہیں پہنچ گئے ہیں۔

اسی دوسرے دن یعنی "the other day" جب میں ڈرینیج کا دریا پار کرکے ان کی چوکھٹ تک بہ حفاظت پہنچ گیا تو بڑی دیر تک گھنٹی کا بٹن دباتا رہا لیکن سارا گھر رومانوی سناٹے میں ڈوبا رہا ۔ گاہے ماہے برتن مانجھنے کی ہمواری Rythm اس سناٹے کو چیرتی ہوئی سنائی دے جاتی اور پھر وہی خاموشی ۔ جب گھنٹی بجاتے بجاتے تھک گیا تو خیال آیا کہ گھنٹی بے چاری تو پاور کٹ کا شکار ہے ۔ چناں چہ میں نے دروازے پر ہلکے سے دستک دی ۔ کچھ بدحواسی سے دوڑنے .

اور ایک کرسی کے گرنے کی آواز آئی اور پھر دروازہ بھڑ سے کھلا — آج پہلی مرتبہ وہ بغیر ڈریسنگ گاؤن اور پائپ کے نمودار ہوئے تھے۔ انھوں نے ابھی تک شیو بھی نہیں کیا تھا۔

"پولیس — پولیس نہیں آئی؟" انھوں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

پولیس؟ میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔

"ہاں ہاں — پولیس — پتہ نہیں ہے آپ کو؟ —

میرے سارے گلدان چوری ہو گئے ہیں۔ انھوں نے ایسے کہا جیسے پوچھ رہے ہوں" آپ نے اخبار نہیں دیکھا آج کا؟"

"گلدان — یعنی — صرف گلدان؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"جی ہاں — صرف گلدان!" انھوں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور میرے سینے سے جیسے ایک بوجھ سا ہٹ گیا — اور میں نے تصوّر ہی تصوّر میں محسوس کیا جیسے کوئی نیک آدمی اپنے کاندھوں پر عبدالغفور کے گلدان اٹھائے قریبی نالے کی طرف دوڑتا چلا جا رہا ہو۔

●●

محمد علی رفعت
(حیدرآباد)

غزل

اِدھر سے نکل کو اُدھر ہلو ہلو
اُدھر سے نکل کو اِدھر ہلو ہلو
ڈبل بس میں بیٹھیں ڈبل عشق کریں
محبت کا چل رہا ہے سفر ہلو ہلو
سلام اُن کو بھیجے تھے ہم بیگی بیگی
جواب اُن کا آیا مگر ہلو ہلو
محض ان کے وعدے پہ جیتے رہے ہم
گزرتی رہی یہ عمر ہلو ہلو
اندھیرے میں پہلے وہ دکھتے نہیں تھے
دوبئی جا کو چھپائیں کلر ہلو ہلو
ذرا اپنی عینک کا نمبر بھی دیکھو
نظر سے لڑائیں نظر ہلو ہلو
سمجھ کر کلیجے کو میٹھا شہد کا
چلائیں وہ تیر نظر ہلو ہلو

جھاپڑ ناگپوری

نیا سال

یہ نیا سال اب جو آیا ہے
کتنے ہنگامے ساتھ لایا ہے
سال پچھلا تو تھا بڑا خونی
کر دی ہیں جس نے بستیاں سونی
کتنی جانوں کو تو بھی کھائے گا
کتنی مہنگائیاں بڑھائے گا
ایک ننھی دیا سلائی سے
کتنی تو لڑکیاں جلائے گا
تیرے رہتے ہوئے جو جنگ ہوئی
یہ سمجھ لے زمین تنگ ہوئی
تجھ کو جھاپڑ سلام کرتا ہے
اور پھر یہ کلام کرتا ہے
سال رفتہ سا پاپی مت بننا
ظلم کی بھونڈی کاپی مت بننا

سراج نرملی

غزل

ہے غرض ہم کو تو گھوڑے، جوڑے، کوٹھی کار سے
واسطہ ہم کو نہیں بیوٹی سے یا کردار سے

قرض لے کر وہ گیا تھا شام کو مختار سے
رات کے بارہ بجے ہیں، آ رہا ہے بار سے

لال مرچی ہے وہ غصے کی اسے تو چھیڑ مت
وہ مجسم آگ ہے تو کھیل مت انگار سے

ناخلف نے شادی کر لی گھوڑے جوڑے کے بنا
اب کوئی رشتہ نہیں باقی ہے "ناہنجار" سے

عقد اوّل، ثانی، ثالث کر کے چپ بیٹھے ہیں کیوں
ہے اجازت آپ کر سکتے ہیں شادی چار سے

اَن پڑھ بھونگیری
(حیدرآباد)

قطعہ

کم بولتا ہوں کہتا ہوں ہر بات ناپ کو
اک تلخ بات آج سناتا ہوں آپ کو
دس بیٹے پال سکتا ہے اَن پڑھ اکیلا باپ
دس بیٹے مل کے پال نہیں سکتے باپ کو

غزل

کیسی ہے اپنے ملک کی تصویر دیکھنا
مذہب کے نام نکلی ہے شمشیر دیکھنا
اربابِ اقتدار کی تدبیر دیکھنا
کیوں خون میں نہا گیا کشمیر دیکھنا
ایسی بھی شوہروں کی ہے تقدیر دیکھنا
بیلن کو صبح، شام کو کفگیر دیکھنا
ہر سال صرف عید کی پڑھتے ہیں جو نماز
ان کی نمازِ عید میں تکبیر دیکھنا
مجھ کو یقین ہے وہ مجھے چاہنے لگے
سب سے چھپا کے وہ مری تصویر دیکھنا
تیئیس ۲۳ شادیوں کی ہو تقلید ہر جگہ
آگے بھی ہو نصیب یہ تعمیر دیکھنا
بھاگئے بشریٰ کو دیکھ کے سلمان خاں کے ساتھ
کچھ منچلوں کے پیار کی تسخیر دیکھنا
ان پڑھ ہے بھونگیر کا طنز و مزاح میں
آگے کبھی، کبھی تو پسِ تیر دیکھنا

۲۳ حیدرآباد میں پنکھا جلوس کے لیے جمع کی گئی رقم سے نادار لڑکیوں کی شادیاں کی گئیں۔

صابر بہاری
(رانچی)

جھوٹی شہرت دے شان دے یارب
مجھ کو تلیا مسان دے یارب
ان کے منہ میں لگام دے اللہ
منہ میں میرے زبان دے یارب
جسم ننگا عیاں ہے کپڑے میں
چادرِ شرم تان دے یارب
صحنِ غربت میں لڑکی بیٹھی ہے
نیک سیرت جوان دے یارب
طنز صابر بہاری کرتے ہیں
ان کو تھوڑا سا گیان دے یارب

ڈاکٹر سید حامد حسین (بھوپال)

امتحانوں کا میلہ

ہم شہر کے ایک کالج کے باہر کھڑے ہیں۔ یہاں امتحان دینے والے طالب علموں اور طالبات کی بڑی بھیڑ ہے۔ آیئے۔ ان سے امتحانات کے بارے میں ان کی رائے معلوم کریں۔ چلیے پہلے ان طالب علم رہنما کے پاس چلیں جو اپنے حمایتیوں میں گھرے ہوئے کھڑے ہیں۔

"کیوں جناب کیا حال چال ہیں؟"

"جی، ایک دم بڑھیا تیاری ہے۔"

"آپ بتائیں گے کہ آپ نے اپنی تیاری میں کن کن کتابوں سے مدد لی۔"

"جی ہم کتابیں نہیں پڑھتے۔"

"تو آپ نے اپنے نوٹس خود بنائے ہوں گے۔"

"جی نہیں ہم نوٹس نہیں پڑھتے۔"

"اچھا تو آپ نے ایک دن میں ختم کر لینے والی کوئی سیریز لی ہوگی۔" "جی نہیں ہم سیریز بھی نہیں پڑھتے۔"

"تو پھر آپ کیا پڑھتے ہیں؟"

"ٹائم ٹیبل...... امتحان کا ٹائم ٹیبل۔"

"وہ کیوں؟"

"امتحان کی تاریخ بڑھوانے کے لیے۔"

"لیکن اس سے تو طالب علموں کا بڑا نقصان ہوتا ہے۔"

"جی نہیں۔ یہ پالیسی کا معاملہ ہے۔"

"جی نہیں۔ یہ پالیسی کا معاملہ ہے۔"

"کس کی پالیسی؟"

"قومی پالیسی۔"

"کیسے؟"

"امتحان کے ایک پرچے اور دوسرے پرچے کے درمیان خاصا وقفہ چاہیے۔"

"لیکن کیوں؟"

"قوم کا فائدہ اسی میں ہے۔ جیسے ہماری پالیسی ہے کہ ایک بچے اور دوسرے بچے کے درمیان وقفہ ہو۔"

(۲)

دیکھیے سامنے ایک طالبہ آ رہی ہے۔ کندھے پر بھاری جھولا ہے۔ پسینہ پسینہ ہو رہی ہے۔

"کیا میں آپ کو رومال پیش کر سکتا ہوں؟"

"شکریہ۔ میرے پاس ہے۔ جھولے میں..... دیکھیے یہ رہا پیکٹ۔ پورے چھ ہیں۔"

"آپ امتحان دینے آئی ہیں؟"

"جی ہاں۔ لیکن آپ کو شک کیوں ہوا؟"

"آپ کے جھولے میں اتنی ساری شیشیاں بوتلیں اور سارا سامان دیکھ کر۔"

"ارے یہ تو دوائیں ہیں۔ یہ لال گولی سر کے درد کی ہے۔ یہ کیپسول دل گھبرانے پر لینا ہے۔ یہ ٹیبلٹ

تب لینا ہے جب کانوں میں سنسناہٹ ہونے لگے۔ اور یہ
......"

"اچھا تاثیاں بھی رکھتی ہیں آپ؟"۔

"جی یہ تو پڑوسی طالب علموں کے لیے ہیں۔"

"جی؟"

"جب وہ جواب پوچھ پوچھ کر تنگ کرتے ہیں تو یہ ان کا منہ بند کرنے کے لیے ہیں۔"

"اچھا یہ کیا ہے؟"

"یہ سنترہ ہے۔"

"لیکن یہ تو ٹھوس ہے۔ مٹی کا لگتا ہے۔"

"جی ہاں۔ ڈرائنگ روم میں رکھے کھلونوں میں سے اٹھالائی ہوں۔"

"مگر کیوں؟"

"امتحان دیتے وقت سامنے میز پر رہتا ہے تو دل میں ٹھنڈک رہتی ہے۔"

(۳)

آئیے ان سے ملیں جو امتحان سے پہلے جلدی جلدی سگریٹ کے آخری کش لے رہے ہیں۔

"کیوں بھئی آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

"جی۔ سب کو پچھاڑ کر رکھ دیں گے۔"

"آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟"۔

"اسے یہی ٹیوشن لینے والوں کی۔"

"آپ ٹیوشن نہیں لیتے؟"

"جی نہیں ہم اپنے خالو سے مشورہ لیتے ہیں۔"

"آپ کے خالو کس کالج میں پروفیسر ہیں؟"

"جی نہیں وہ کتے باز ہیں۔ کتے بازی کے قومی چمپین۔"

"تو آپ کتہ بازی کی بھی ٹریننگ لیتے ہیں؟"

"ٹریننگ نہیں۔ صرف گر۔"

"گر کیسے؟"

"کامیابی کے گر۔ خالو جان کہتے ہیں کہ دشمن کو اکھاڑے میں آنے سے پہلے ہی پچھاڑ دو۔"

"لیکن کیسے؟"

"دھاک جما کر"

"لیکن ہم تو امتحان کی بات کر رہے تھے۔"

"جی ہاں ہم بھی امتحان کے کمرے میں سب کے چھکے چھڑا دیتے ہیں۔"

"اس کے لیے آپ کیا کرتے ہیں؟"

"جب ہم ایک کے بعد ایک کاپیاں لینا شروع کرتے ہیں تو پڑھاکوؤں کے ہاتھ سے قلم چھوٹنے لگتے ہیں۔"

"اچھا آپ کا کاپیاں لینے کا کیا ریکارڈ ہے۔"

"پچھلے سال ایک بار ہم نے سولہ کاپیاں لی تھیں۔"

"اچھا اتنی ساری کاپیوں میں لکھنے کے لیے آپ کے پاس مسالا کہاں سے آتا ہے؟"۔

"اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"اچھا تو پچھلے سال آپ نے اپنی سولھویں کاپی میں کیا لکھا تھا؟"

"سات صفحوں پر لکھا۔ اگلا صفحہ دیکھیے۔"

"اور آخری صفحہ پر۔"

"شکریہ۔ بڑے بڑے حرفوں میں شکریہ لکھا تھا۔ دور سے دیکھنے پر بھی سمجھ میں آتا تھا۔"

——(۴)——

چلیے ان طالب علم سے ملیں جو منھ ہی منھ میں کوئی فارمولا وغیرہ یاد کر رہے ہیں۔

"کیوں بھئی۔ ابھی فارمولے پکے نہیں ہوئے؟"

"جی میں تو منتر کا جاپ کر رہا ہوں۔"

"تیاری تو اچھی کرلی ہوگی؟"

"ہاں، پنڈت جی نے جو بتایا تھا، اس کے حساب سے سب پڑھ لیا ہے۔"

"پنڈت جی آپ کے پروفیسر ہیں؟"

"جی نہیں۔ جیوتشی مہاراج۔ انھوں نے ہمارا ہاتھ

دیکھ کر بتایا تھا کہ اس بار میم سے شروع ہونے والی چیزوں پر سوال آئیں گے۔"

"تو پھر؟"

"ہم نے کوئی ۲۸۲ چیزیں یاد کی ہیں مچھر سے لے کر مچھیرے تک"

"تو زوالوجی کے پرچے میں مچھیرے پر بھی سوال آسکتا ہے!"

"کیوں نہیں آسکتا۔ یہ تو ستاروں کا چکر ہے۔ کچھ بھی پوچھا جا سکتا ہے۔ آخر مچھیرا بھی تو میم سے شروع ہوتا ہے۔"

"اچھا آپ نے مچھیرے پر کیا یاد کیا ہے؟"

"مچھیرا ایک دو پیروں والا جاندار ہے جو عام طور پر ساحلی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ مچھلی کا انتظار کرنا اور جال بُننا یہ اس کی دو اہم خصوصیات ہیں۔ ہندوستانی مچھیرے خالی وقت میں جگہ جگہ سے سوراخ اکٹھا کرتے ہیں اور پھر انھیں رسّی سے باندھ کر جال بناتے ہیں۔"

(۵)

دیکھیں یہ طالب علم اس قدر پریشانی سے کیا تلاش کر رہے ہیں۔

"کیوں بھئی۔ آپ کی کچھ مدد کریں؟۔ کیا گُم ہو گیا ہے؟"

"جی کنجی"

"کیسی کنجی؟"

"ارے آپ کو کیا بتائیں؟۔ بس تھی ہمارے قلعہ کی چابی۔ آپ جائیں اپنا کام کریں۔"

"ذرا آپ دیکھیں آپ کے جوتے کے نیچے کیا ہے؟"

"ارے۔ شکریہ آپ کا۔ یہی تو ہے۔"

"لیکن یہ تو کاغذ کی ایک لپٹی ہوئی نلی جیسی ہے۔ مجھے دکھائیں گے؟"

"آپ کیا سمجھیں گے۔ دراصل یہ علم کے خزانے کی کنجی ہے۔ کس سوال کا جواب کالر کے نیچے ہے، کس کا دائیں موزے میں کون سا جواب گھڑی کے پٹّے کے نیچے ہے اور کون سا کمر کی بیلٹ میں۔"

"لیکن آپ یہ بتائیں کہ ان دو دو میٹر لمبی پٹیوں پر اتنا باریک لکھنے میں آپ کو محنت تو بہت لگی ہوگی۔"

"ہاں کوئی پندرہ دن لگ گئے۔"

"اتنے وقت میں تو یہ سب زبانی یاد ہو جاتا۔"

"لیکن اتنی محنت کون کرتے؟"

"شاباش! اچھا آپ ہماری طرف سے یہ کپڑے کی پٹّی اپنی پیشانی پر باندھ لیں۔ فائدہ ہوگا۔"

"اس پر کیا لکھا ہے؟"

"آگ پکڑ لینے کا شدید خطرہ۔ دس گز کے دائرہ میں ماچس نہ جلائیں۔"

محمد قلی کے شہر حیدرآباد کے نام (۴۰۰ سالہ جشن کے موقع پر)

حفیظ خاں مذاق (حیدرآباد)

یہ ہے چار سو سال پہلے کی بات
نہ فرقے نہ جھگڑے نہ مذہب نہ ذات
تھے خوش حال سب جھومتی تھی حیات
مگر آج دل کو رہا جائے نا
پیا باج پیالہ پیا جائے نا

نہ وہ عشق باقی نہ وہ چاہ اب
نہ دل میں تڑپ ہے نہ وہ آہ اب
نہ حیدر محل نا قطب شاہ اب
پرانا پھر اک پل بنا جائے نا
پیا باج پیالہ پیا جائے نا

شہر میں درندے بھٹکنے لگے
سہاگ عورتوں کے اُجڑنے لگے
کہ معصوم بچے بھی کٹنے لگے
یوں اب خونِ ناحق سہا جائے نا
پیا باج پیالہ پیا جائے نا

روپیے پہ پولس کے رونے لگے
گرفتار شرفا جو ہونے لگے
تو غنڈے سبھی مست ہونے لگے
پولس ظلم اب تو سہا جائے نا
پیا باج پیالہ پیا جائے نا

سکوں آج اس دیش کا کھو گیا
دلوں میں وہ سب نفرتیں بو گیا
جہاں سے بھی گزری فساد ہو گیا
کہیں پھر سے رتھ یاترا جائے نا
پیا باج پیالہ پیا جائے نا

دلوں سے کدورت مٹائیں گے اب
یہ نفرت کے شعلے بجھائیں گے اب
جو اب تک ہوا بھول جائیں گے اب
یوں آپس میں لڑ کر جیا جائے نا
پیا باج پیالہ پیا جائے نا

کہ شہر کا جشن اب منائیں گے سب
کہ پھر سے نوا پل بنائیں گے سب
قطب شہ کی روح کو سنائیں گے سب
تمھیں کوئی دکھ اب دیا جائے نا
پیا باج پیالہ پیا جائے نا

دلاسوں پہ وعدوں پہ ہے میری جاں
مجھے بھول بیٹھے میرے مہرباں
یہ حسرت سے کہتی ہے اردو زباں
میرا چاک دامن سیا جائے نا
پیا باج پیالہ پیا جائے نا

ں ہاں! م نے سکوٹر خریدا

رشید الدین
(حیدرآباد)

شہر میں پیدا ہونے کی وجہ سے ہم نے ٹریفک کی گڑگڑاہٹ ہی میں آنکھ کھولی۔ ہماری والدۂ محترمہ کہتی تھیں کہ جس دواخانے میں ہم پیدا ہوئے اس سے متصل سڑک پر دن رات ٹریفک کی ریل پیل رہتی تھی اور رات دیر گئے تک بھی سونا مشکل تھا۔ پھر صبح ہوئی نہیں کہ وہی ہنگامہ۔ اس طرح ٹریفک سے ہمارا ناطہ اس وقت سے ہی قائم ہے۔ جب ہم اس دنیائے آب و گل میں آئے۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو دو منزلہ بس کے اوپر کے حصے میں بیٹھ کر سڑک کی چہل پہل دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ ابھی چار سال کے تھے کہ ہمیں اسکول میں شریک کرادیا گیا۔ اب ٹریفک سے ہمارا روز ہی کا سابقہ تھا۔

لیکن ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ایک دن ہم بھی اس ٹریفک کا ایک جز بن جائیں گے۔ لوگ اکثر سڑک پر چلتے ہوئے ڈرتے ہیں لیکن خدا گواہ ہے کہ ایسا خوف ہمیں کبھی نہیں ہوا۔ سڑک پر چلنے والی سواریاں ہمیں ہمیشہ ہی اچھی لگیں خصوصاً وہ چھوٹے چھوٹے پہیوں والی سواری جسے عرفِ عام میں اسکوٹر کہا جاتا ہے کہتے ہیں کہ اٹلی کے ایک انجینئر نے اسے خاص طور سے عورتوں کی سواری کے لیے بنایا تھا لیکن ہمارے ملک اور ہمارے شہر میں تو اسے سب مرد ہی استعمال کرتے ہیں۔ اور بڑے ٹھاٹھ سے کرتے ہیں۔

جب ہم اسکول جاتے تو ان اسکوٹر چلانے والوں کو بڑی حسرت سے دیکھا کرتے۔ مانو آپ ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ چل رہی ہے۔ زمین آپ کے نیچے سے بھاگی جارہی ہے اور آپ جہاں ہیں وہیں بیٹھے ہیں۔ اسکوٹر ہمیں بڑی شان کی سواری لگتی تھی۔ لیکن ہم پر بعد میں یہ بھید کھلا کہ یہ کتنی پریشانی کی سواری ہے۔

ٹریفک سے روزانہ لطف اندوز ہوتے ہوتے جب ہم نے تعلیم مکمل کرلی اور ملازمت کا طوق گلے میں آیا تو ایک عدد سیکل ہماری سواری تھی۔ جو برسوں ہمارا ساتھ نبھاتی رہی لیکن جب ہمیں گزیٹڈ عہدہ داری کا رتبہ ملا تو سیکل کو بھی خیرباد کہنا پڑا۔ لوگ کیا

کہیں گے کہ گزیٹیڈ عہدہ دار ہوکر بھی سیکل پر دفتر جاتا ہے! اس لیے ہم نے اسی بس کا سہارا لیا جو طالب علمی کے زمانے سے ہمارا ساتھ نبھاتی رہی۔ لیکن صاحب! لوگوں کو چین کہاں۔ چناں چہ اب یہ کہا جانے لگا کہ یہ کیسا شخص ہے جو معزز عہدہ پر فائز ہوکر بھی بس سے آتا ہے۔ ایک عدد موٹر سیکل کیوں نہیں خرید لیتا۔ سکنڈ ہینڈ ہی کیوں نہ ہو۔

اور تو اور ہماری نصف بہتر اور بچے بھی یہی کہنے لگے کہ اس طرح دفتر جانا ٹھیک نہیں لگتا اسکوٹر ہونی چاہیے — چناں چہ ہم نے بھی ٹھان لی کہ ایک عدد اسکوٹر خرید لینا چاہیے ویسے بھی یہ بچپن سے ہماری پسندیدہ سواری رہی ہے لیکن مجبوری کی وجہ سے ہم اسے خرید نہیں سکے تھے۔

جب اسکوٹر لینے کی ٹھان ہی لی تو ہمیں نتھو میکانک کا خیال آیا جو اسکوٹریں درست بھی کرتا تھا اور سکینڈ ہینڈ اسکوٹروں کا کاروبار بھی کرتا تھا۔

ہم اس سے رجوع ہوئے تو اس نے کہا یہ کون سی بڑی بات ہے۔ جب بھی میرے پاس کوئی اچھی سکینڈ ہینڈ گاڑی آئے گی تو میں آپ کو اطلاع دیتا ہوں۔ ادھر ادھر مت بھٹکیے ورنہ لوگ آپ کو ٹھگ لیں گے۔ ابھی اس بات چیت کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک صبح گھر پر دستک ہوئی۔ ہم نے خمار آلود آنکھوں سے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ نتھو میکانک سامنے کھڑا ہے۔

"صاحب آپ کو ایک سکنڈ ہینڈ اسکوٹر چاہیے تھی نا۔ میرے پاس ایک گاڑی آئی ہے"۔

ہم نے دل ہی دل میں خوش ہوکر کہا "ٹھیک ہے دفتر جاتے وقت دیکھ لیں گے"۔

ہم نے اس موقع پر ایک دوست سے مشورہ کیا جن کے پاس برسوں سے اسکوٹر تھی۔ دوست احباب ایسے موقع پر بہت کام آتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ دوست احباب وقت اور پیسہ دونوں برباد کرتے ہیں۔

انھیں لے کر ہم سیدھے نتھو میکانک کے پاس پہنچ گئے جس نے اس سکینڈ ہینڈ اسکوٹر کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ ہمارے دوست نے بھی کہا کہ گاڑی ٹھیک ہی ہے خریدی جاسکتی ہے۔ چناں چہ بڑی ردوقد کے بعد پانچ ہزار میں سودا طے ہوگیا۔ ہم نے نتھو سے کہا کہ "یہ ستائے گی تو نہیں"۔ اس پر اس نے جواب دیا کہ "پھر یہ خاکسار کس لیے ہے"۔

اسکوٹر کا سودا طے ہوگیا اور نتھو میکانک کو شام تک



پے منٹ بھی کر دیا گیا۔ لیکن اس کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ یہ مرحلہ اتنا آسان نہیں جتنا ہم سمجھ رہے تھے۔ سب سے پہلے تو ہمیں اسکوٹر کے لیے حدود زنی ہونے کا احساس ہوا۔ کیوں کہ ہمیں تو صرف سیکل کا تجربہ تھا۔ جہاں اور جیسے چاہا بیٹھ گئے۔ جہاں چاہا اتر گئے جہاں چاہا ہاتھ میں لے لی اور بکری کے کان کی طرح ہینڈل پکڑ کر لے چلے۔ اسکوٹر جب اسٹارٹ ہو جائے تو بے حد ہلکی محسوس ہوتی ہے۔ بلکہ ابھی ہم اس موقف میں نہیں تھے کہ اسکوٹر چلائیں۔

ابھی بغیر اسٹارٹ کیے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا ہوتا تھا۔ پھر ہمارے وہی دوست یہاں بھی کام آئے۔ انھوں نے اس کے مختلف کل پرزوں سے ہمیں واقف کروایا۔ کلچ، پلگ، گیر، بریک، اور جانے کیا کیا۔ اسٹارٹ کرنے کے لیے کک ماریں۔ آہستہ آہستہ کلچ کو چھوڑیں۔ روکنے کے لیے بریک لگایا جاتا ہے۔ تیز کرنے کے لیے گیر بدلنے پڑتے ہیں۔ اسٹارٹ کے بعد گاڑی کو فرسٹ گیر میں رکھنا پڑتا ہے۔ پھر رفتار بڑھانی ہو تو سکنڈ اور پھر تھرڈ گیر استعمال کرنا پڑتا

بیوی : اگر میں مر جاؤں تو ؟

شوہر : میں پاگل ہو جاؤں گا

بیوی : تم دوسری شادی تو نہیں کروگے ؟

شوہر : میں اتنا پاگل تھوڑی ہو جاؤں گا۔

ہے۔ اور بہت زیادہ تیز چلانا ہو تو فورتھ گیر لگائیں۔ رفتار دھیمی کرنی ہو تو پھر اسی عمل کو الٹا دہرانا پڑتا ہے۔" یہ سب سن کر تو ہمارے پسینے چھوٹنے لگے۔ ان تمام کے علاوہ بیلنس تو اپنی جگہ ہے ہی۔ کیوں کہ ذرا بیلنس متاثر ہوا اور آپ دھڑام سے نیچے آ رہے۔"

پہلا سبق سن کر ہی ہم نروس ہونے لگے۔ پھر اسکول کے سبق کی طرح اسے زبانی یاد رکھنا ہی کافی نہیں تھا بلکہ عملی طور پر کر دکھانا تھا۔ سیکھنے کے دوران گرنے اور اٹھنے کا سبق تو ہم سیکل چلانا سیکھنے کے دوران سیکھ چکے تھے۔

لیکن معلوم ہوا کہ سیکل سے گرنے اور اسکوٹر سے گرنے میں بہت فرق ہے۔ سیکل سے گرنے میں نہ سیکل کا کچھ نقصان ہوتا ہے اور نہ سوار کا کچھ بگڑتا ہے۔ اسکوٹر سے گرنے میں نہ صرف سواری بلکہ سوار بھی سخت متاثر ہوتا ہے۔ چناں چہ ابتدا ہی میں ہم نے کلچ اس زور سے دبایا کہ کٹ سے اس کا وائر لوٹ گیا۔ اسے گھسیٹتے ہوئے ہم پھر نتھو میکانک کے پاس گئے۔ اس نے کلچ وائر بدلا۔ کافی دیر ہو گئی تھی۔ اس لیے واپس اسے گھسیٹتے ہوئے گھر لے آئے۔ حالت یہ کہ پسینے میں شرابور ہو رہے ہیں۔ صورت پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ آتے ہی سیدھے پلنگ پر دراز ہو گئے۔ ایسی حالت تو ہماری کبھی نہیں ہوئی تھی۔ مگر ہم بھلا کہاں ہارنے والے تھے۔ دوسرے دن صبح ہی صبح پھر دوست کے پاس پہنچ گئے اور پھر میدان میں کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ہم دھڑام سے نیچے اور اسکوٹر ہمارے اوپر۔ ہمارے دوست نے بڑی مشکل سے ہمیں اسکوٹر کے نیچے سے نکالا۔ معلوم ہوا کہ ہمارے سیدھے پیر میں سخت چوٹ آئی ہے اور ہم سیدھی طرح سے نہیں چل سکتے۔ اسکوٹر الگ اسٹارٹ ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ شاید اس کا بھی کوئی کل پرزہ ٹوٹ گیا تھا۔ چناں چہ پھر لنگڑاتے اور اسے گھسیٹتے ہوئے نتھو میکانک کی دوکان پر پہنچے۔ اس نے کہا "صاحب! اسے چھوڑ جاؤ، تفصیل سے دیکھنا پڑے گا۔"

چناں چہ اسکوٹر کو وہیں چھوڑ کر ہم آٹو رکشا کر کے گھر آئے۔ چوٹ دیکھ کر ہماری شریک حیات کے بھی ہوش اڑ گئے۔ فوراً ڈاکٹر کے پاس لے گئیں جس نے انجکشن لگا کر پٹی باندھ دی۔ دو دن تک پھر ہم نے اسکوٹر کا نام نہیں لیا۔ تیسرے دن خیال آیا کہ چلو چل کر نتھو میکانک کے پاس چل کر اسکوٹر کا حال پوچھیں۔ وہاں جا کر دیکھا تو اسکوٹر وہیں اور اسی حالت میں کھڑی ہے جس حالت میں ہم اسے چھوڑ کر آئے تھے۔ اسے توجہ دلا

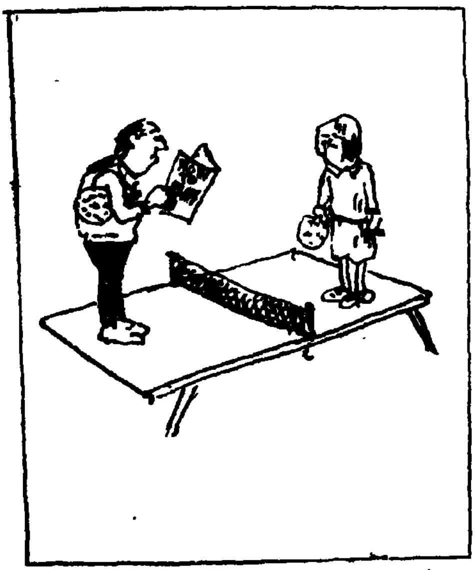
تو اس نے بڑی لاپرواہی اور عدم توجہ کا مظاہرہ کیا۔ ہم کو بہت افسوس ہوا کہ اسکوٹر کی بدولت یہ حال ہو گیا کہ معمولی میکانک سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ خیر ہمارے بکنے سننے پر وہ اسکوٹر کے پاس آیا اور ادھر ادھر دیکھ کر کہا "آج نہیں ہو سکتا۔ کل آئیے"۔ ناچار ہم گھر واپس آ گئے۔

دوسرے دن پھر اسکوٹر بن گیا تھا۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر کے دوست کے پاس بھاگے۔ وہ گھر پر نہیں تھے۔ معلوم ہوا کہ ترکاری لانے بازار گئے ہیں۔ ہم انتظار میں وہیں بیٹھ گئے۔ جب وہ ساز و سامان سے لدے پھندے آئے تو انھیں یہ خوش خبری سنائی کہ اسکوٹر بن گیا۔ لیکن یہ ان کے لیے خوش خبری قطعی نہیں تھی۔ برا سا منہ بنا کر بولے، یار آج تو مجھے ضروری کام ہے۔ کل دیکھیں گے۔ ہماری ساری خوشی کافور ہو گئی۔ منہ لٹکائے پھر میکانک کی دوکان پر آئے۔ وہاں سے اسکوٹر لیا اور اسے گھسیٹتے گھسیٹتے گھر لے آئے۔ راستے میں ایک شناسا مل گئے۔ کہنے لگے۔ "میں پچھلے کئی دن سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ اس اسکوٹر کو ادھر سے ادھر گھسیٹتے پھر رہے ہیں۔ اسے چلاتے کیوں نہیں۔ ہم نے جواب دیا۔ چلانا نہیں آتا" انھوں نے کہا "پھر سیکھ لیجیے"۔ ہم نے دل پر جبر کر کے جواب دیا "وہی تو کر رہے ہیں"۔

خدا خدا کر کے ہم میدان سے اسکوٹر پر بیٹھ کر گھر آنے کے قابل ہوئے۔ ہم کچھ اس طرح اسکوٹر چلاتے تھے کہ ہارن بجانے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ لوگ ہمیں دور سے آتا دیکھ کر ہی جلدی سے بازو ہٹ جاتے تھے۔

ایک دن ہم نے ہمت کی کہ بڑی سڑک پر جانا چاہیے۔ ہمارے دوست نے کہا کہ ہلمٹ پہنو اور تمام کاغذات بھی ساتھ رکھ لو۔ شاید پولس والے مل جائیں۔ وہ آج کل اسکوٹر والوں کی اس طرح تلاش میں رہتے ہیں جیسے شیر شکار کی۔ چناں چہ ہم نے کیل کانٹے سے لیس ہو کر بڑی سڑک کا رخ کیا۔ اب کسی کا ڈر نہیں تھا ہیلمٹ سر پر تھی اور بیگ میں کاغذات جس میں عارضی ڈرائیونگ لائسنس بھی تھا۔ پیچھے ہمت بندھانے کے لیے ہمارے دوست بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

سڑک چوڑی تھی اس لیے ہم بڑی آسانی سے اور تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ذرا ہمت آئی تو رفتار اور تیز کر دی۔ آگے ایک چوراہا تھا جہاں پولس والا کھڑا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی سیٹی بجائی۔ شاید سمجھ گیا تھا کہ کوئی



نوسیکھ ہے۔ ہم نے بڑے اعتماد کے ساتھ اسکوٹر سڑک کے بازو ٹھیرائی۔ پولس والے نے سارے کاغذات دیکھے۔ ہم نے کہا حولدار صاحب! سر پر ہیلمٹ بھی ہے" وہ بولا وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن "ایل" کی تختی کہاں ہے؟ ہم نے حیران ہو کر پوچھا "وہ کیا ہوتی ہے؟" اس نے جواب دیا کہ جو نئے اسکوٹر چلاتے ہیں انھیں ایل یعنی لرنر کی تختی لگانی پڑتی ہے"۔

ہم نے کہا "اب لگا لیں گے"۔ وہ بولا "لیکن اب جو نہیں ہے" اس کا کیا ہوگا۔ یہ خلاف قانون ہے۔ آپ

اس چہرے کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ جو انسانیت کے مستقبل پر تاریکیوں اور نحوست کا سایہ کئے ہوئے ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں راجہ انور اپنی زندگی کی اس لہولہان عبارت کے وسیلہ سے گلستانِ ادب میں داخل ہوتا ہے اور یوں وہ خطوط کے اس دائرے میں اس آخری خط پر پہنچتا ہے۔ جو کنول کے نام اس کا آخری خط ہے۔ جو شائد پوسٹ نہ کیا جاسکا۔ یہ ایک کھلا خط ہے۔ ایک ترقی پسند کا رجعت پسندوں کے نام کھلا چیلنج۔ جس میں راجہ کا ذہن اور دل پھر ایک بار ایک نقطہ پر جمع ہو گئے ہیں۔ راجہ گلستانِ ادب میں کسی پامال راستے اور چور دروازے سے داخل نہیں ہوا۔ نہ ہی اس نے کوئی ایسی شاہراہ اختیار کی ہے۔ جو گردِ کارواں سے اٹی ہوئی ہے بلکہ وہ تو اپنی ذات کا قفس توڑ کے آزاد ہوا ہے اس نے ایک بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ منٹو معاشرے کو ننگا کرتا تھا لیکن راجہ نے اپنے آپ کو ننگا کیا ہے۔ رسوا نے طوائف کی داستان سنائی جو اپنا جسم بیچنے پر مجبور تھی روح نہیں بیچی تھی۔ لیکن راجہ نے اس شریف زادی کی کہانی لکھی ہے جو اپنے جسم کے ساتھ روح بھی بیچ دیتی ہے۔ راجہ اس حمام میں ننگا ہونے کے باوجود ابھی عریاں نہیں جہاں سب ننگے اپنے وجود کی غلاظتوں کو ڈھانپنے کی فکر میں نئی نئی کثافتوں کا سہارا لیتے رہتے ہیں۔ راجہ کا عریاں جسم فن کی دنیا میں مرمر کا ایک ایسا بت ہے۔ جو سنگتراش سے زیادہ پاکیزہ ہے۔ راجہ نے کئی جگہ اپنے جذبات کی عکاسی فلمی گانوں سے کی ہے میں بھی آخر میں ایک فلمی گیت کے مصرعہ پر ختم کرتا ہوں سے

"محبت جرم ہے تو جرم کا انکار کرتے ہیں"

●●

یہ بازو بیٹھی ہے۔ ہم دل ہی دل میں ان سے مہر معاف کرنے کی درخواست کرنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ سامنے سے دو کانسٹیبل چلے آئے۔

ہم نے سمجھا شاید ٹریفک پولیس ہوگی جو ہمارا بیان لینے کے لیے آئی ہے اور حادثے کے بارے میں پوچھ گچھ کرنا چاہتی ہے۔ لیکن - لیکن جو الفاظ ہمارے کانوں سے ٹکرائے وہ سن کر ہم دوبارہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچے — کانسٹبل بتا رہا تھا کہ وہ زخمی شخص کا بیان لینے آیا ہے۔ کیونکہ وہ چوری کی اسکوٹر تیز چلانے کی کوشش میں زخمی ہوا ہے۔

ہم نے بتایا کہ اسکوٹر تو نخوّ میکا نک سے خرید اگیا ہے وہ بولا آپ اپنا بیان لکھائیے۔ ہم مزید تحقیق کرلیں گے۔

ہماری نصف بہتر جو ہاتھ اٹھا کر خدا سے ہماری دوبارہ زندگی پر شکر ادا کر رہی تھی۔ یہ گفتگو سن کر دونوں ہاتھ چھوڑ کر ایک دم اچھل پڑی اور بولی " ہاں ہاں! حولدار صاحب اس نامراد نتھو سے خریدی ہوئی اسکوٹر ہمارے گھر کے آنگن میں کھڑی ہے۔ فوراً اسے ہمارے گھر سے دفع کیجیے۔"

زا کھونج

یا (بہار)

۱۹۹۱ء کے نام

ال نو مبارک ہو
یٹ اور نفرت کو
نما سیاست کو
ہبی قیادت کو
نے والی آفت کو
سال نو مبارک ہو

ال نو مبارک ہو
بے ٹکٹ مسافر کو
شوقی دفاتر کو
بے حیا مناظر کو
م کے اکابر کو
سال نو مبارک ہو

سال نو مبارک ہو
اغ دار موسم کو
انسی اور بلغم کو
ل میں دردِ پیہم کو
اکرڈ کی انکم کو
سالِ نو مبارک ہو

سالِ نو مبارک ہو
بن بلائے مہمان کو
یعنی ان کی اماں کو
میرے گھائل ارماں کو
حالتِ پریشاں کو
سالِ نو مبارک ہو

سال نو مبارک ہو
نامراد شاعر کو
پیچ خوردہ طائر کو
اندھا دھند فائر کو
سست اور کائر کو
سال نو مبارک ہو

سالِ نو مبارک ہو
بھولی بھالی صورت کو
عاشقوں کی چاہت کو
لعنت و ملامت کو
کھونج کی حجامت کو
سالِ نو مبارک ہو


ایکتا پریڈ
ہمارے مرد، عورتیں اور بچے،
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی،
بودھ، جین، پارسی......
مشرق سے، مغرب سے، شمال سے جنوب سے
ملک کے چاروں کونوں سے ہزاروں کی تعداد
میں یوم جمہوریہ کی تقریبات میں حصہ لینے کیلئے
آتے ہیں۔
اس طرح وہ ایک بار پھر ایکتا اور ساتھ کا مظاہرہ
کرتے ہیں اور ذات پات، نسل و مذہب،
خطے اور زبان کی رکاوٹوں کو توڑنے کیلئے خود کو
وقف کر دیتے اور ہمارے کروڑوں عوام کی
فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے ہوئے قوم کو
لوہے کی طرح مضبوط بنانے کا عہد کرتے ہیں۔
آئیے پریڈ کے جذبے کو برقرار
رکھیں اور مل کر آگے بڑھیں۔
vp 90/760

طالب خوندمیری

لکیروں کا سوداگر

سیّد عباس متقی
(حیدرآباد)

سید محمود آرکیٹکٹ المعروف بہ طالب خوندمیری سے پہلی ملاقات کسی غیر سنجیدہ مشاعرے میں ہوئی تھی اور انھوں نے غالباً "غالب بہ حیثیت آرکیٹکٹ" نظم سنائی تھی کیوں کہ طالب بہ حیثیت آرکیٹکٹ سنانے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا کیوں کہ یہ چیز دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نظم کے بعد انھوں نے ایک طویل نظم "زندگی" بھی پیش کی تھی جس میں زندگی کے بارے میں مختلف لوگوں کے احساسات، خیالات اور جذبات مرقوم تھے۔ ہم حیران رہ گئے کہ فردِ واحد نے افرادِ جمع کے جذبات کی عکاسی کس خوب صورتی سے کی ہے اور پیرایہ بھی اس قدر غیر سنجیدہ کہ نہایت سنجیدگی سے غور کیا جانے کا متقاضی ہو۔ کلام سننے کے بعد قطرۂ ایک سلیم الطبع سامع کو شاعر سے ملنے کا ایک بے معنی شوق پیدا ہوجاتا ہے جس کا خمیازہ ہم آئے دن بھگتتے رہتے ہیں اور خود ہماری زندگی کا ایک معتدبہ وقت محض اپنا مختصر تعارف کروانے اور دوسروں کا مفصل تعارف حاصل کرنے میں گزر رہا ہے۔ اگرچہ ہم کسی کو محض شغلِ معرفت سے بور کرنا ہرگز نہیں چاہتے لیکن طالب خوندمیری سے ملنے کی ایک خواہش بہرصورت پیدا ہوچکی تھی اور دیگر بے شمار خواہشوں کی طرح تہہِ دل ہی موجزن رہی۔ ان سے دوسری ملاقات کی سبیل یوں برآمد ہوئی کہ اردو مجلس نے ہمارا انشائیہ اور طالب کا کلام ساتھ ساتھ رکھ دیا تھا کہ طالب گمان غالب سے کچھ دیر ادھر ادھر کی گفتگو ضرور ہوگی، خواہ مکانوں کے نہ سمجھ میں آنے والے نقشوں پر ہی کیوں نہ ہو۔ اگرچہ اردو ہال، اردو گھر کی طرح بغل میں نہیں لیکن سامعین کی کافی تعداد جنھیں داد دینے کے علاوہ خاموش رہنا بھی خوب آتا تھا حاضرِ مجلس تھی۔ اب یہ خدا ہی جانتا ہے کہ وہ ہمارا انشائیہ سننے تشریف لائے تھے یا کلام طالب۔ ہمارا انشائیہ شاید کلام غالب کی طرح دوراز کار و متقاضی شرحِ افکار تھا ہلکا پھلکا گزر گیا۔ کسی نے اونگھتے ہوئے سبحان اللہ کہا تو کسی نے جماہی لیتے ہوئے استغفراللہ۔ بعض لوگوں کے سر گریباں میں تھے ایسا لگ رہا تھا گویا ہم ندامتِ عصیاں اور عفوِ بیکراں کوئی نالہ بیان بنائے وعظ فرما رہے ہوں۔ وعظ فرمانا اگرچہ ہمارا شغل اصلی صحیح لیکن اردو مجلس میں مجلس کے جلسے چہ معنی۔ ہمارے بعد طالب خوندمیری کو زحمتِ کلام دی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو ہال زعفران زار سے تبدیل ہونے لگا۔ طالب جب بہت ساری نظمیں سنانے کے بعد آپ ہی آؤٹ ہونے لگے تو صدرِ محفل جناب نریندر لوتھر نے کہا "حضرات! یہ شام طالب کے نام ہے"۔ ایک سمجھ دار آدمی کے اس جملے کے بعد ایک دوسرا سمجھ دار آدمی کیسے گراؤنڈ چھوڑ سکتا تھا؟ طالب پچ پر جمے رہے اور کافی دیر تک قہقہات کے

محفل نہایت کامیاب رہی۔ ہم نے جب اپنی پرانی سیکل سنبھالی تو دیکھا طالب
چٹکے اور قہقہوں کے پھلکے اڑاتے رہے . . . .
اپنی خوب صورت فیٹ میں بیٹھے رہے ہیں۔ جی میں آیا کہ مزاحیہ نثر لکھنے کی بجائے مزاحیہ شاعری کرنے لگیں۔

ایک زمانے کے بعد جب ہم نے اپنی کتاب "دکھتی رگیں" کو چھیڑنا چاہا تو عالم خیال میں کسی نے ہماری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا اور ہم طالب خوندمیری کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اب یہ بات کیا مخفی رکھی جائے کہ صاحب فن ہمارے لیے دکھتی رگ سے کم نہیں ہوتا۔ اتنا معلوم تھا کہ وہ مسجدوں کے محلے میں مسجد کے زیر سایہ رہتے ہیں۔ جب ہم چنچل گوڑہ پہنچے تو ان کے مکان تک پہنچنا کوئی دشوار کام نہیں تھا۔ طالب ایک زمانے کے مطلوب ہیں۔ اور مطلوب، معلوم ہوتا ہے، ہمیں دیکھ کر وہ کافی مسرور ہوئے اور ہم انھیں دیکھ کر ان سے زیادہ مسرور ہوئے کہ چنچل گوڑہ کے راستوں میں چڑھاؤ بھی کافی تعداد میں ہیں اور ہم سیکل سوار، رکشہ رانوں کی طرح چنچل گوڑہ سے بہت گھبراتے ہیں۔ ہم نے اپنی ڈیڑھ کتابیں نذر کیں۔ "تسلیماً کثیرا" کا ایک نسخہ اور "دکھتی رگیں" کا آدھا اور مدعائے آمد بیان کیا کہ آپ کو سرورق کی زحمت دینی ہے۔ ہم نے خیال کیا تھا کہ طالب خوندمیری ایک نہایت مصروف آرکیٹکٹ ہیں یقیناً وہ عدم فرصت کا عذر رکھ کر ہماری دکھتی رگوں کو چھیڑنے سے گریز کریں گے۔ کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر ہمیں حیرت ہوئی کہ انھوں نے معنی خیز تبسم کے ساتھ سرورق کی ترقیم و تزئین کے لیے آمادگی ظاہر کی۔ اور چار دن بعد آنے کو کہا۔ قدرے خیال ہوا کہیں وہ چار دن محاورۃً نہ کہہ رہے ہوں، مزاح نگاروں کا معاملہ بھی عجیب ہوتا ہے اگر وہ کچھ سنجیدہ بھی ہوتے ہیں تو مزاح کا ہی گمان ہوتا ہے۔ اب یہی دیکھیے کہ طالب نے ایک روشن چہرہ عمر رسیدہ صاحب ریش شخص، کا تعارف کروایا کہ یہ میرے چھوٹے بھائی ہیں، اب کون نادان ہے جو اس تعارف کو مزاح پر مبنی نہ خیال کرے۔ ہم تو مزاح کے خوگر ہیں، بہت محظوظ ہوئے، بعد میں پتہ چلا کہ وہ "بزرگ" واقعی موصوف کے برادر خورد واقع ہوئے ہیں۔ غوطہ زن بحرِ حیرت ہوگئے۔ طالب خوندمیری کو خدا نظر بد سے محفوظ رکھے کہ وہ ہر پہلو اور ہر زاویے سے شاب شکیل لگتے ہیں۔ گٹھا ہوا جسم، تنومند قامت، پرکشش چہرہ۔ برق سی تیز چمکتی ہوئی آنکھیں، گونجتی آواز، مزید برآں بال بھی کالے کالے، ہم رہے بھولے بھالے۔ عمر کا کیا اندازہ لگا سکتے جب کہ وہ ہمیں "عباس بھائی" بلاتے ہوں۔ ہم عورتوں ہی کی عمر کا اندازہ کافی مشکل سے لگا پاتے ہیں۔ مردوں کی عمر کا اندازہ کیا لگا سکیں گے۔

طالب خوندمیری کا دیوان خانہ ان کے مزاج کا غماز ہے داخلے کے ساتھ ہی نفیس غالیچہ، موزونیت پیدا کرتے ہوئے در و دیوار اور ان کے دل کش رنگ۔ دور کہنہ کی یاد دلاتا ہوا بڑا سا تخت، اگر اس پر ایک جانب بڑا سا پان دان اور قریب میں منقش اگال دان رکھ دیا جائے تو یہ ہمارے ہی مزاج کی عین غمازی ہو جاتی۔ اطراف اسٹول نما جالی دار کرسیاں اور ان پر آرام دہ گدّے۔ اوپر نظر کی تو ایک نئے ماڈل کی غلط وقت بتاتی ہوئی خوب صورت گھڑی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہماری گھڑی غلط رہی ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ ایک طنز نگار کے گھر کی گھڑی ہندوستانی وقت کی عکاسی نہ کر رہی ہو۔

ہم وعدے کے بہت پابند آدمی ہیں جب کہ دوسرے ہم سے وعدہ کریں۔ چناں چہ حسب وعدہ روز موعود مکان طالب پہنچ گئے۔ اس دن طالب نے ہمیں "برقعہ پوش" چائے پلوائی اور معذرت چاہی کہ وہ بہت زیادہ مصروف تھے۔ کل انشاء اللہ ضرور تزئین انجام دیں گے۔ ایسی عمدہ چائے جس میں ایک انچ بالائی پڑی ہو اور شیرینی بھی ہو اس عذر کے

نیچے میں زیادہ مہنگی نہ تھی۔ اگر وہ اسی طرح چائے پلا پلا کر چالیس دن بھی کر دیتے تو ہم اس چلہ کشی کو چھٹی کا دودھ یاد آنے تک برداشت کر لیتے۔ طالب نے دلکش رنگوں کی جو تصویر بنائی وہ ہم حیرت اور مسرت سے دیکھتے رہے۔ ایک معقول شخص کا کہنا ہے کہ ہر آدمی مسرت سے بصیرت تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ استثنائی صورتوں میں اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ امید ہے کہ ہماری کتاب پڑھنے والے سرورق کے ذریعہ پہلے مسرت پھر بصیرت ضرور حاصل کریں گے۔

دیکھنا تصویر کی صورت کہ جو کھینچے ہے وہ
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کام ابھی ادھورا تھا۔ کہنے لگے آفس آجائیے مکمل کر لیں گے۔ آفس کا پتہ بتایا تو پتہ پانی ہو گیا۔ دونوں طرف سے چڑھاؤ یعنی شیر گیٹ کنگ کوٹھی۔ ایک نہایت نحیف و نزار آدمی اور طالب مطلوب محبوب ہوتا ہے بلکہ مرغوب و محجوب بھی۔ مرتا کیا نہ کرتا سیکل سنبھالے اترتے چڑھتے، پوچھتے پاچھتے۔ ہانپتے کانپتے آفس پہنچ ہی گئے۔ سلیقہ مند آدمی کا آفس ہو یا گھر، سواری ہو یا لباس سلیقہ مندی کا نمونہ ہوتا ہے۔ آفس میں داخل ہوتے ہی ایسا لگا گویا ہم نگار خانے میں آگئے ہیں۔ اگرچہ ہمارا وجود واقعی طوطی کی آواز لگ رہا تھا۔ مختلف مساجد کے خوب صورت نقشے، مکانات اور بنگلوں کی دیدہ زیب تصاویر، آیاتِ قرآنی کے مرقعجات۔ دل کچھ ایسا لگا کہ ہم حضرتِ داغ کی طرح بیٹھے رہے۔ پتہ چلا کہ طالب نے کم و بیش ایک سو چالیس مساجد کے نقشے بنائے ہیں۔ ہمارا خیال ہے جو خدا کے گھر کے لیے نقشے تیار کرتا ہو خدا اس کے گھر کا نقشہ بھی بنانا خوب جانتا ہے۔ ہل جزا والاحسان الاحسان۔ اسی دوران طالب نہایت دیدہ ریزی سے ہماری دلکش رنگوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے۔ کرسیاں نہایت آرام دہ تھیں تین گھنٹے شامِ یاراں کی طرح گزر گئے۔ اور مختلف موضوعات پر سیر حاصل گفتگو بھی ہوتی رہی۔ طالب خوندمیری کے خیالات نہایت مذہبی اور از حد متصوفانہ ہیں اگرچہ دیکھنے میں یہ نہیں کھلتا وضع قطع اور لباس کے اعتبار سے طالب اور تصوف میں کوئی ہم آہنگی نہیں معلوم ہوتی لیکن ہے۔ موصوف کو ہم نے عاشقِ رسولؐ پایا۔ یہ وہ سند ہے جس کے آگے استادگو تاگوں ہیچ لگتی ہیں۔ اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہب الست۔ ان کے دل میں صاحب لولاکؐ کی بے پناہ عظمت اور بحر ال محبت موجزن ہے۔ بے شمار نعتیہ اشعار از بر ہیں جو کانوں کے راستے دل کی گہرائیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ خوب گذرنے لگی دو دیوانے جو مل بیٹھے تھے۔ طالب کو دیکھنے کے بعد ہمیں سعدی شیرازی کی یہ رباعی یاد آگئی۔

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد
ہر بیشہ گماں مبر کہ خالیست شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

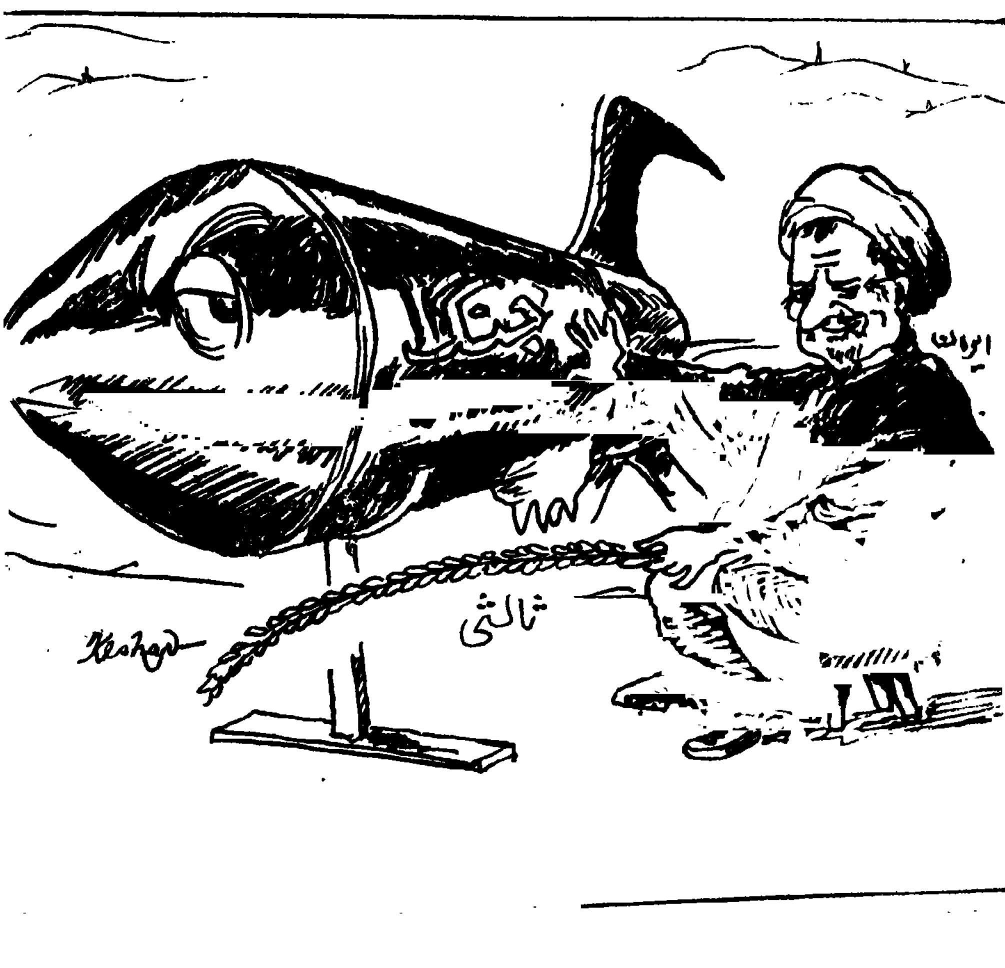
طالب جہاں ایک بلند پایہ مہندس اور مقبول طنز نگار شاعر ہیں وہیں ایک مشاق کارٹونسٹ بھی ہیں۔ جب انھیں یہ پتہ چلا کہ کارٹون ہماری کمزوری ہیں تو انھوں نے ایک سادہ کاغذ لیا اور کچھ لکیریں کھینچ دیں۔ وہ اندرا گاندھی تھیں۔ پھر چند لکیروں کو جمع کیا وہ علامہ اقبال تھے۔ پھر کچھ قوس و خم کو یکجا کیا۔ سیدھی مانگ نکالی میر تقی میرؔ مخمور آنکھوں کے ساتھ غزل سرا تھے۔

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

پھر ایک مستطیل نما دائرہ بنا کر اس کے نیچے آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ دیں۔ ہم حیرت زدہ دست و خامہ کی سحر کاریوں کو تکتے جا رہے تھے۔ یک بیک مرزا غالب بیٹھے بیٹھے اٹھ گئے۔ فن واقعی فن ہوتا ہے۔ مشق اسے بالائے بام تک پہنچا دیتی ہے۔ ہم نے اس "قرطاس کارٹون" کو بڑی حفاظت سے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ بہت ساری چیزیں صاحبانِ فن کے نزدیک کوئی اہمیت کی حامل نہیں ہوتیں لیکن شائقین

فن کے لیے بڑی اہم ہوتی ہیں۔ طالب نے بہت خوب صورت اور پرکشش آواز پائی ہے۔ ہمارا خیال ہے اگر وہ مقرر ہوتے تو سلطان صلاح الدین اویسی سے آگے ہوتے۔ دکھتی رگوں میں کچھ آخری حدیں باقی تھیں مغرب کا وقت ہوگیا تو ہم نے اجازت لے لی۔ کہنے لگے کل صبح غریب خانے پر آجائیے۔ ہر درتی مکمل مل جائیگا۔ دوسرے دن ساتویں جگہ تھی۔ خانہ مطلوب کے سات جگہ تو سمجھ میں آسکے تھے لیکن خانہ طالب کے سات جگہ معنی دارد۔ شاید انھوں نے نجومیوں' آسمانوں کا خیال رکھا ہو۔ بالآخر ساتویں جگہ بہت کام کی نکلی اور یہیں وہ موقع مل گیا جس پر ہمارے خوابوں کی تعبیر مزین تھی۔ ہم سوچ رہے تھے کہ اس موقع کا معاوضہ کیا ہوسکتا ہے۔ حسب گنجائش جیب سے سو کا نوٹ نکالا۔ بڑا اتنا اچھا۔ لیکن طالب نے سختی سے انکار کر دیا۔ کہنے لگے دوستوں کے لیے اتنا بھی نہ کیا جائے تو دوستی ہی کیا ہم نے عرض کیا کہ طالب نے اتنے دنوں اتنی زحمت اٹھائی۔ تصویر اتاری ہمیں پھرایا اور معاوضہ بھی نہ لیا۔ ہم نے کہا طالب صاحب اسے معاوضہ نہیں نذرانہ سمجھیے۔ اس پر بھی وہ راضی نہ ہوئے شاید اُن کا خیال رہا ہو کہ نذرانہ تو بزرگ لوگ قبول کرتے ہیں۔ مجبوراً ہم نے اپنا نوٹ اپنے جیب میں رکھ لی۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا!"

جیب میں نوٹ کیا گئی کہ دل سے دعائیں اُبلنے لگیں اور دعائیں وہ چیز ہوتی ہیں جنکی طالب و مطلوب دونوں کو ضرورت ہے۔



خوش دل خانپوری
خان پور (بلند شہر)

شکستِ فاش

میں ووٹ لینے کو گھر گھر پہ بار بار گیا
مرا نصیب کہ پھر بھی چناؤ ہار گیا

کچھ ایسے لوگ جو بیٹھے کبھی نہ رکشا میں
میں ان کے گھر پہ کرائے کی لے کے کار گیا

یہ دوسروں کی سیاست ارے معاذ اللہ
ہر اک سے وعدہ کیا جو امیدوار گیا

کھڑے نہیں تھے تو سب کچھ تھا اور اس کے بعد
ہماری آبرو عزت گئی وقار گیا

بڑا ہی ناز تھا خوش دل کو اپنی شہرت پر
کسی کا کچھ نہ گیا اپنا اعتبار گیا

غزل

فیض الرحمن فیض

اشعار سنانے کا بھی انداز نیا ہے!
اور جھوم کے گانے کا بھی انداز نیا ہے!
الزام لگانے کا بھی انداز نیا ہے!
بے پَر کی اُڑانے کا بھی انداز نیا ہے!
کچھ چرب زبانی ہی سے منواتے ہیں ہر بات
باتوں میں گھمانے کا بھی انداز نیا ہے!
جوکر سے وہ لگتے ہیں اگر گفتگو کرلیں؟
روتے کو ہنسانے کا بھی انداز نیا ہے!
وہ دیکھ کے رستہ میں مخاطب ہوئے ایسے!
اَے، آے سے بلانے کا بھی انداز نیا ہے!
انگڑائی لیے چھوڑ دیئے ہاتھ جھٹک کر!!
یہ بغلیں بجانے کا بھی انداز نیا ہے!
ہر چیز نئی آپ کی اور آپ پُرانے
شرما کے رِجھانے کا بھی انداز نیا ہے!
دھوکا ہی سہی قرض ہر ایک دوست سے مانگو
یوں پیسے کمانے کا بھی انداز نیا ہے
رو رو کے تو منوانا پُرانا ہے طریقہ
ہنس ہنس کے کھپانے کا بھی انداز نیا ہے
ہر وقت مجھے ہاتھ وہ دیتے ہی رہے ہیں
پھر ہاتھ مِلانے کا بھی انداز نیا ہے
ہے دال الگ اور الگ پانی کا پانی!
اب دال گلانے کا بھی انداز نیا ہے
آنا ہے نئے پن سے، نئے ڈھنگ سے آؤ
اے فیض زمانے کا بھی انداز نیا ہے

جنوب وسطی ریلوے

اعلانِ ہراج عام

منجانب صدر جمہوریہ ہند، لاوارث، غیر متعلقہ اور غیر تقسیم شدہ مال واسباب کو جو اسٹیشن میں موجود ہے ہراج کے ذریعہ بتاریخ ۱۶ اور ۱۷ فروری ۱۹۹۱ء کو حیدرآباد پارسل آفس پر فروخت کیا جائے گا۔ اگر ضرورت محسوس کی جائے تو ہراج کی میں ایک دن کی توسیع کی جاسکتی ہے۔ ہراج شدنی اشیاکی ایک فہرست نوٹس بورڈ پر لگائی جائے گی۔

۱۔ تمام مقداریں خواہ وہ وزن، پیمائش یا تعداد کے اعتبار سے ہوں جن کی صراحت ہراج کی تفصیلات میں درج ہے تخمینی ہیں ہراج میں اس مقدار یا تعداد کو جس پر لاٹ مشتمل ہے۔ بولی کی رقم ادا کرتے ہوئے اس کی ڈلیوری حاصل کرنا ہوگا۔

۲۔ ریلوے انتظامیہ ہراج شدنی مال واسباب سے متعلق صراحت، ان کی تقسیم یا مقدار کی وضاحت کے بارے میں کوئی داری قبول نہیں کرے گا اور اسے یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ بلا اظہار وجوہ ہراج سے کسی بھی چیز کو واپس حاصل کرے اشیاء کو ہراج میں شامل ہونے سے روک لے۔ ریلوے کو یہ حق بھی حاصل ہوگا کہ بلا اظہار وجوہ کسی یا تمام لاٹس کو ہراج سے حاصل کرے۔

۳۔ بولی کی قبولیت کا انحصار ہراج منعقد کرانے والے افسر انچارج پر رہے گا جن کا فیصلہ قطعی اور قانونی اعتبار سے بولی کے لیے مستوجب پابندی ہوگا۔

۴۔ کامیاب بولی دہندہ کو بولی کی کامل رقم بر سر موقع ادا کرتے ہوئے مال واسباب کو فی الفور لے جانا ہوگا۔

۵۔ ایسے مال واسباب جن پر آندھرا پردیش سیلس ٹیکس ایکٹ اور اس کے تحت وضع کردہ قواعد کی رو سے سیلس ٹیکس عائد ہے۔ اسے عائد کیا جائے گا اور ہراج شدہ اشیاء پر آندھرا پردیش میں مروجہ شرح ٹیکس کی شرح پر رقم کی فوری طور وصولی کی جائے گی۔

۶۔ ایسی صورت میں جبکہ ہراج شدہ اشیا کو ہراج کے فوری بعد منتقل نہ کیا جائے ان پر داخلہ چارجس عائد کیے جائیں گے از روئے قواعد منظورہ مدت کے ختم ہونے کے بعد بھی ایسی اشیا کو احاطہ ریلوے سے منتقل نہ کرنے کی بابت ہوں گے۔

۷۔ ہراج شدنی اشیا حیدرآباد پارسل آفس پر معائنہ کے لیے موجود ہیں۔

بحکم

ڈویژنل ریلوے منیجر / براڈگیج سکندرآباد

PUB 706/90-91

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید (تردیتی)

ماچس لکھنوی کی شاعرانہ مرتبت

عام زندگی میں بھی طنز و مزاح سے سب ہی کام لیتے ہیں لیکن طنز و مزاح میں شستگی و شائستگی اور اونچے مذاق و معیار کو برقرار رکھنا ہر کہہ و مہ کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہی حال شعر و ادب کا ہے۔ فی زمانہ شعر و ادب اور بالخصوص شاعری میں طنز و مزاح کا چرچا کچھ زیادہ ہی ہے لیکن بس چرچا ہی کہ جہاں تک مذاق اور معیار کا تعلق ہے مذاق نہایت نچلے درجہ کا اور معیار غایت پست! نام ظرافت کا لیکن پھکڑپن کے سوائے اور کچھ نہیں ——— ہاں اس مایوس کن فضا میں چند ایک شاعر ایسے ضرور ہیں جن کے کلام کو پڑھتے ہوئے داد دینے کو جی چاہتا ہے ——— ہمارے دور کے ایسے شاعروں میں ماچس، لکھنوی کا شمار بھی ہوتا ہے جنھوں نے اپنے کلام کے ذریعہ جہاں اونچے درجہ کے طنز و مزاح سے کام لیا، شاعری کی ادبی، فنی، لسانی اور تہذیبی قدروں کو بھی عالی مقام کیا۔ ماچس کا انتقال ہوئے لگ بھگ (۲۰) سال کا عرصہ ہوتا ہے (تاریخِ وفات: ۲۶-اگست ۱۹۷۰ء) انھوں نے (۵۲) سال کی عمر پائی (سالِ پیدائش: ۱۹۱۸ء) ——— ماچس نے جن کا اصلی نام ام۔ اے اقبال تھا، ابتداً اگرچہ سنجیدہ شاعری کی لیکن یہ طور انھیں بھایا نہیں۔ طنز و مزاح سے لگتا ہے انھیں طبعی مناسبت تھی چنانچہ جلد ہی وہ اس طرف راغب ہوئے لیکن مزاج کی سنجیدگی کسی زیریں لہر کی طرح کلام میں ہمیشہ موجود رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں پھکڑپن کا شائبہ بھی نہیں ہوتا ——— اس کے کچھ اور وجوہ بھی ہیں۔ ابتدائی عمر میں ماچس نے اپنے نانا سے تربیت پائی خاص طور پر فارسی اور اردو انہی سے سیکھی۔ نانا حکیم مرزا محمد ابراہیم جو عیش، تخلص کرتے تھے اچھے شاعر تھے اور اپنے دور کے اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ من بعد، ماچس نے حضرت آرزو لکھنوی سے اصلاح لی و نیز وہ میر کے کلام سے بھی بہت زیادہ متاثر تھے۔ کسی زمانے میں انھوں نے سلام بھی لکھے اور سلام میں سوختہ تخلص کیا ——— اس پس منظر میں ممکن ہی کب تھا کہ ان کا مذاقِ شعری پست ہوتا۔ ماچس نے آرزو لکھنوی سے علمِ عروض باقاعدہ پڑھا بھی تھا اس لیے ان کے ہاں فنی اسقام اور بے ربطیاں نہیں ملتیں۔ زبان و بیان کی صفائی و سادگی اور روزمرہ کی صحت کے ساتھ ان کی شاعری فنی اصولوں پر بھی پوری اترتی ہے۔

ماچس نے مزاحیہ شاعری کا آغاز "اودھ پنچ" اور "سرپنچ" کے مزاحیہ کالموں اور ان کے ہم عصروں میں احمق پھپھوندوی، بوم میرٹھی، حاجی لق لق، شوکت تھانوی، مجید لاہوری، شاد عارفی، سید محمد جعفری اور فرقت کاکوروی جیسے شعرا تھے۔ جن میں سے کم ہی نے طنز و مزاح میں اپنا مقام پیدا کیا۔ صحافت سے وابستگی اس امر کا اظہار ہے کہ ماچس نے

معاشرے سے خود کو قریب رکھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ماچس کا معاشرتی شعور گہرا تھا۔ یوں بھی اور فن کاروں کے مقابلہ میں طنز و مزاح نگاروں کو معاشرہ اور ماحول پر گہری نظر رکھنی ہوتی ہے کہ اسی صورت میں ان کے فن پر نکھار آتا ہے، رنگ پیدا ہوتا ہے۔ ماچس نے بھی اطراف واکناف کا بہ نظر عمیق جائزہ لیا۔ ماحول کو دیکھا، پرکھا، زندگی کی نبض پر اپنی انگلیاں رکھیں اور قلب کی دھڑکنوں کو محسوس کیا۔ کون سا موضوع ہے جس پر ماچس کی نگاہ نہیں پڑی، کون سا مسئلہ ہے جس کو ماچس نے اپنی شاعری کا عنوان نہیں بنایا: احساس کی قلت، گرانی اور ماتب بندی، مذہب کے نام پر بے راہ روی اور مذہبی رہنماؤں کا دوہرا کردار، سیاست دانوں کی بوالعجبیاں گفتار کے غازی، فرقہ وارانہ فسادات، تعلیم یافتہ افراد کی بے روزگاری، خاندانی منصوبہ بندی، سرکاری اور نیم سرکاری ادارں میں بدعنوانیاں اور اقربا نوازی اور کیا کیا کچھ ــــــ ماچس نے ان سارے عنوانات پر طبع آزمائی کی ہے اور نہایت خوش سلیقگی، اہتمام اور ادبی و فنی حسن کو برقرار رکھتے ہوئے کہ طنز و مزاح کے تقاضے بھی پورے ہوں۔

اچھا اور کامیاب طنز وہی سمجھا گیا ہے جو واضح اور دو ٹوک نہ ہو، بات اشارۃً کنایۃً ہی کہی جائے تو تھوڑا تھوڑا ابہام بھی رہے، بین السطور والی کیفیت ــــــ ماچس کے ہاں یہی انداز ہے۔ وہ اخباری اطلاع کی طرح بات سے ہما یا نہیں کہہ دیتے بلکہ شعر و ادب اور طنز و مزاح کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے قدرے ڈھکے چھپے انداز میں، گویا بات کہتے ہوئے بھی نہیں کہتے اور نہیں کہتے ہوئے بھی کہہ جاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے وہ شیخ و برہمن کی کس مہذب انداز میں خبر لیتے ہیں۔

اس شعر میں تو شیخ صاحب ہی کی مزاج پرسی کی گئی ہے اور کیسے معرکہ آرا انداز میں:

شیخ آئے جو محشر میں تو اعمال ندارد
جس مال کے تاجر تھے وہی مال ندارد

صرف یہی شعر ماچس کو زندۂ جاوید بنا دینے کے لیے کافی ہے۔

اور یہاں شیخ و برہمن دونوں نشانہ میں ہیں:

یوں جبیں گھستے ہیں شیخ و برہمن بعد گناہ
جیسے کُتّے چونچ رگڑیں گندگی کھانے کے بعد

—

بس یونہی اے دوست شیخ و برہمن کو بھی سمجھ
جیسے حج بلّی کا چوہے نوش فرمانے کے بعد

مذہبی رہنماؤں کے بعد، سیاسی رہنما ــــ لیکن نہیں، اس سے قبل کچھ 'مقررین' کے بارے میں ان کے تاثرات سے محظوظ ہوں، 'مقررین' بھی کیسے؟ ــــ قطعہ ہے:

اگر ایسے حسیں موجود ہیں اے دوست دنیا میں
کہ جس بستی میں جا نکلیں ہر اک دیوانہ ہو جائے

تو میری جان مقرر بھی ہیں ایسے کچھ زمانے میں
جہاں دو چار تقریریں کریں، ویرانہ ہو جاتے

سیاست دانوں پر ماچس کا طنز بے مدلل جواب ہے۔ اول تو یہ دیکھیے کہ انھوں نے سیاست دانوں کا رشتہ ملایا کس سے ہے ؟ دوم یہ کہ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی کیا کچھ نہیں کہہ دیا۔ یہ بھی قطعہ کی صورت میں ہے :

انسان کے بہکانے کی کھائے تھا قسم　　اس واسطے ظالم نے نیا وار کیا
جب شیخ و برہمن سے ہوا دل مایوس　　شیطان نے نیتاؤں کو تیار کیا

سیاست دانوں پر ماچس کے طنز کے سلسلے میں وہ منظوم خطوط اہمیت رکھتے ہیں جو انھوں نے پنڈت نہرو، سروجنی نائیڈو، حافظ محمد ابراہیم اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے موسومہ لکھے۔ ان خطوط میں جہاں ان شخصیات سے ماچس لکھنوی کی عقیدت کا اظہار ہوتا ہے، مفاد پرست سیاست دانوں کے کردار بھی روشن ہوتے ہیں۔ یہ خطوط ماچس کے صرف سیاسی اور معاشرتی شعور کے غماز ہی نہیں اپنے دور کے سیاست دانوں کا کچا چٹھا بھی پیش کرتے ہیں ـــــ اور دیکھیے اس شعر میں گرانی اور فرقہ وارانہ فسادات، دونوں پر کیسا کاری طنز ہے :

واہ ری قسمت، واہ رے دور
مہنگا آٹا، سستا خون

اور یہاں تعلیم یافتہ افراد کی بے روزگاری پر جھلا اٹھتا ہے۔ کسی رو رعایت کے بغیر، دو ٹوک انداز میں بھرپور وار ہوتا ہے :

بی اے پاس کیا ہے تو جب
بیٹھ سڑک پر بیچے بھون

اجناس کی قلت، گرانی اور راتب بندی پر ماچس کی توجہ خاص رہی ہے۔ یہ مسئلہ ہے بھی عوام کے لیے بنیادی اہمیت کا حامل ـــــ اُن کی ایک نظم ہے "میرے لختِ دل، میرے نورِ نظر جلدی سے آ" ـــــ اس میں وہ اپنے پیدا ہونے والے لڑکے سے خواہش کرتے ہیں کہ وہ جلد تولد ہو تاکہ اس کا نام راشننگ کے دفتر میں درج کرایا جا سکے، کارڈ ملے اور گھر میں آنے والے اناج کی مقدار میں اضافہ ہو۔ میں اس بے مثال نظم کے دو، ایک بند ضرور درج کروں گا :

ترے تو حاضر جو ہو ماں باپ کی سرکار میں　　جھٹ سے تیرا نام بھیجوں راشنی دربار میں
ہو اضافہ کچھ تو راشن کارڈ کی مقدار میں　　گندمی بچے مرے راشن پسر جلدی سے آ
میرے لختِ دل، مرے نورِ نظر جلدی سے آ

شوہر : میری بیوی کے حلق سے آواز نہیں نکلتی، کوئی علاج بتائیے۔
ڈاکٹر : آج رات بہت دیر سے گھر جائیے اور پھر دیکھیے۔

شوہر : میں غسل خانے جا رہا ہوں۔
بیوی : ضرور جائیے مگر آج لمبے لمبے گانے مت گائیے صابن تھوڑا سا ہے۔

دو مہینے پہلے ہی آجا کہ یہ مشکل نہیں   نو مہینے پیٹ میں رہنے سے کچھ حاصل نہیں
میرے پیارے ٹھیک اب غلہ کا مستقبل نہیں   اپنی ماں سے گھر کی حالت پوچھ کر جلدی سے آ
میرے لختِ دل مرے نورِ نظر جلدی سے آ

اور دیکھیے، تان اٹھائی جاتی ہے کہ اگر جڑواں بچے پیدا ہوں تو راشن دوگنا ملے گا:

ہوں اگر جڑواں تو میں ماتھے کو بوسے چار دوں   اس خوشی میں یعنی اک یونٹ کا یونٹ مار دوں
چور بازاری کے منہ پر تھوک دوں، للکار دوں   لے کے اک یونٹ جو گیہوں اور شکر جلدی سے آ

اس نظم سے قطعِ نظر جس میں اجناس کی عام قلت اور راشن بندی کو موضوع بنایا گیا ہے، ماجس نے اقبال کی شہرۂ آفاق نظم "شکوہ" کی پیروڈی کرتے ہوئے شکر کی قلت پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ قطعِ نظر اس کے کہ اس میں اپنے موضوع کے ساتھ بھی انصاف کیا گیا ہے پیروڈی کی حیثیت سے بھی یہ نظم ماجس کی ایک امتیازی کاوش ہے۔ انھوں نے انتہائی نزاکت اور نفاست کے ساتھ ہنرمندی کا اظہار کیا ہے اور تھوڑی بہت تحریف کرتے ہوئے اس نظم کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے کہ ادبی اور فنی دونوں زاویوں سے یہ نظم اردو پیروڈیوں میں منفرد حیثیت رکھے گی۔ اس نظم کی اٹھان ہی ایسی غضب کی ہے کہ منہ سے بے ساختہ واہ نکل جاتی ہے۔ ماجس نے اقبال کی نظم "شکوہ" کی ادبی اور فنی خوبیوں کو کما حقہٗ ملحوظ رکھا ہے۔ وہ اقبال کے لہجے کو بھی برقرار رکھتے ہیں اور شکر کے بارے میں اپنے شکوہ کو بانکپن کا حامل بنا دیتے ہیں۔ کہیں تو ایک دو الفاظ کی الٹ پھیر ہی سے دنیا بدل جاتی ہے۔ سچ پوچھیے تو پوری نظم پورے طور پر نقل کی جانی چاہیے لیکن میں یہاں صرف ابتدائی دو بند درج کرتا ہوں۔ اقبال کے "شکوہ" کے ابتدائی دو بندوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے پڑھیے:

کیوں نمک خوار بنوں، زود فراموش رہوں   فکرِ زردہ نہ کروں، محوِ غمِ دوش رہوں
گڑ کے طعنے بھی سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں   ہمنشیں میں کوئی مردہ ہوں کہ خاموش رہوں
نفع اندوزوں سے الفت کی جلن ہے مجھ کو
شکوۂ شکر سے یہ، خاکم بدہن ہے مجھ کو

خاص درجوں کی مٹھاسوں میں تو مشہور ہیں ہم   اب کہ چٹنی سے مربّے سے بھی مجبور ہیں ہم
مرتباں کہتے ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم   نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم
اے شکر! شکوۂ اربابِ غذا بھی سن لے
تلخ کاموں سے ذرا اپنا گلہ بھی سن لے

• جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس نظم کا ہر بند ادبی اور فنی دونوں زاویوں سے بے پناہ اور پیروڈی کے اصولوں پر بھی کامل اترتا ہے اور یہ کہ لطف اٹھانا ہو تو پوری نظم پڑھنی چاہیے۔ اقتباسات کہاں تک درج کر سکتا ہوں۔ بس یہ بند ملاحظہ ہو کہ اس پیروڈی کی کامیابی کا اندازہ لگایا جاسکے:

اب بھی ہے دل میں ہمارے وہی سوز اور وہی ساز   جھولے ہاتھوں میں لیے صبح پہر، بہرِ نماز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز   نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
آ کے دوکان پہ راشن کے سبھی ایک ہوئے

اور ایسے کئی بند، بلکہ نظم مکمل طور پر عمدہ پیروڈی ہے، شکر کی قلت اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل پر بھی انھوں نے طنز کے تیکھے وار کیے ہیں۔

"چاند کا ریڈیو اسٹیشن" بھی ماچس کی ایک بے مثال نظم ہے۔ اس میں انھوں نے نہایت لطیف انداز میں ریڈیو اسٹیشنوں اور ایسے ہی اداروں میں ہونے والی بدعنوانیوں اور بے ضابطگیوں کی سمت اشارے کیے ہیں۔ مکالمے کی صورت میں یہ ایک طویل نظم ہے، اور کچھ ایسی مربوط کہ اس سے اقتباسات ایسے پُرلطف ثابت نہ ہوں، ساری نظم کے مطالعہ ہی سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ ابتدائی دو بند درج کرتا ہوں کہ کچھ اندازہ ہو:

ہنسیں گے آپ بھی جو عرضِ حال کرتا ہوں
میں خود بھی ہنستا ہوں جس دم خیال کرتا ہوں
یہاں کے شعر و ادب کی بدل گئی جو فضا
مرا تخیلِ پرواز چاند پر پہنچا
مکاں کرایے کا لے کر وہیں قیام کیا
شروع اپنا بھی شاعری کا کام کیا

وہاں کے شعر و ادب کی فضا بھی گندی تھی
وہاں بھی حد سے زیادہ گروپ بندی تھی
جو اہلِ فن تھے وہ بیٹھے تھے دم دبائے ہوئے
خوشامدی تھے وہاں بھی فضا پہ چھائے ہوئے

اور پھر یہ نظم آگے بڑھتی ہے، خوشامدیوں کے اندازِ خوشامد، اربابِ متعلقہ کے ذہنی دیوالیہ، سفارشوں کے چکر، شاعری کے گرتے ہوئے معیار وغیرہ وغیرہ ـــــ اس نظم میں طنز اگرچہ مزاح پر حاوی ہے لیکن اسلوبِ بیان شگفتہ اور حلاوت لیے ہوئے ـــــ

ماچس لکھنوی نے حسن و عشق کے موضوعات پر بھی نہایت شگفتہ انداز میں طنز و مزاح سے کام لیا ہے۔ اس میں ان کا محبوب بھی زد میں آتا ہے اور وہ بھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ بات کہیں کی کرتے ہوں اور کیسی ہی کرتے ہوں تہذیبی قدروں کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ رکاکت در نہیں آتی۔ شائستگی کا معیار برقرار رہتا ہے۔ پہلے ایک قطعہ

جب دل میں کوئی آرزوئے دل نہیں رہی   جب شوقِ دید کی کوئی منزل نہیں رہی
اس وقت اس نے خط کا بھیجا ہے جواب   عینک بھی جب نگاہ کے قابل نہیں رہی

اور اب یہ چند اشعار:

کہاں تک اپنے سینے میں جگہ دوں ان کے تیروں کو   ذرا سا دل ہے اور چمگادڑوں کی میہمانی ہے

ہنس چکے جب وہ تو اُن کے باپ نے ڈانٹا مجھے
لیجیے بادل بھی گرجا برق لہرانے کے بعد

ہمارا ذکر ہی کیا، اچھے اچھے غوطہ خور
ترے مزاج کی گہرائیوں کو پا نہ سکے

اللہ اللہ رے عشق کی ٹھوکریں ۔ چار دن میں طبیعت ہری ہوگئی

اوران اشعار میں ملاحظہ ہو طنز کہیں کہیں دوٹوک بھی ہے اس لیے بظاہر کاری بھی:

ڈومنی تو چل ہی دے گی گا بجا کر کے تیگ
عمر بھر دلہا میاں ناچیں گے اس گانے کے بعد

تحقیق کیا ان کا جو شجرہ تو یہ پایا ۔ کچھ یوں ہی سہی ننہال ہے، ددھیال ندارد
اللہ رے ستم وصل کا جس سال تھا وعدہ ۔ وہ ہوگئے دنیا سے اسی سال ندارد

ماچس کا شعری سرمایہ کچھ ایسا زیادہ نہیں اور جو بھی ہے وہ عرصہ تک بکھرا رہا۔ یہ شعری سرمایہ کمیت میں کم ہونے کے باوجود کیفیت کے اعتبار سے گراں قدر ہے۔ ماچس نے نہایت دردمندی کے ساتھ معاشرے کی دکھتی رگوں کو چھیڑا ہے۔ وہ کبھی کبھی تلخ نوائی بھی کرنے لگے ہیں لیکن شیرینی اور حلاوت کے ساتھ تلخ نوائی، تلخ نوائی محسوس نہیں ہوتی۔ وہ اس کو اپنے مزاح کے حصار میں کچھ اس انداز سے لے لیتے ہیں۔ وہ اپنے کلام کے ذریعہ زندگی کی ناہمواریوں، کمیوں اور خامیوں کی سمت توجہ دلاتے ہیں لیکن خاطر خواہ سنبھلے ہوئے اور دھیمے انداز میں کہ باشعور قاری، ہنستے ہوئے سوچنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ عام طنزیہ و مزاحیہ شاعروں کی طرح ہنسانے کے لیے شعر نہیں کہتے بلکہ اپنے اشعار اپنے طنز و مزاح کو ایک وسیلہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ایک وسیلہ کہ جس سے معاشرے کو صحت مند طاقت ور، توانا، صالح اور فعال بنانے میں اعانت کی جا سکے ـــــ اور پھر ان کے موضوعات شعری، موضوعات کے تعلق سے اُن کا رویّہ، زبان و بیان اور فن پر قدرت، اُن کا اسلوب اور ان کا لہجہ کہ اردو شاعری اور بالخصوص طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں ماچس لکھنوی کا مقام ممتاز رہے گا۔ ☐☐

تبصرہ : قدیر انصاری
(حیدرآباد)

"جامِ انا" (غزلوں کا مجموعہ)

از : رحمٰن جامی

صفحات : ۱۷۶

رحمٰن جامی صاحب کے شعری مجموعے "جامِ انا" میں جذبے کی گرمی، شعر کی نغمگی اور احساس کی صداقت ملتی ہے جو قاری کے ذہن پر ایک خوش گوار تاثر چھوڑتی ہے۔ جب شاعر کسی ذاتی جذبے کی پوری شدت کے ساتھ اظہار میں کامیاب ہوتا ہے تو یہ جذبہ تمام لوگوں کا مشترک جذبہ بن جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں ذاتی مشاہدات، احساسات اور کیفیات بہت شدت کے ساتھ ملتے ہیں اور قاری اپنے ہی احساسات کو شعری پیکر میں دیکھتا ہے۔ جناب جامی باشعور اور حساس شاعر ہیں۔ کلاسکیت سے ناتا توڑے بغیر وہ جدید لب ولہجے کے شعر کہتے ہیں۔ ان کی شاعری سے ان کا اپنا انفرادی اسلوب از خود پھوٹتا نظر آتا ہے۔ ان کی اپنی پہچان ہے۔ لفظیات، تشبیہات و تراکیب ان کے اپنے ہیں۔

انسان کی "انا" اس کے باہوش، پر بلند ہمت اور بے نیاز ہونے کی علامت ہے۔ رحمٰن جامی کی شاعری میں "انا" کہیں سینہ تانے تو کہیں عجز وانکساری لیے نظر آتی ہے۔ جب سینہ تانے ہوتی ہے تو یہ شعر ہوتا ہے:

ہر سمت میں ہی میں ہوں جدھر سے بھی دیکھیے
قد میرا ہی بلند ہے بونوں کی بھیڑ میں

اور جب "انا" عجز وانکساری لیے ہوئے ہوتی ہے تو دوسروں کی انا کو مجروح کیے بغیر شاعر کہتا ہے:

قد آوروں کی بھیڑ میں کھونے کے باوجود
اب اس کو کیا کروں کہ نظر آ گیا ہوں میں

رحمٰن جامی میں جب محبت کی چنگاری سر اٹھاتی ہے تو کہتے ہیں:

یہ تڑپ یہ کسک تمھاری ہے
دل کی آواز تک تمھاری ہے

اہلِ وفا نے پیار کے دو بول کے لیے
صدمے جہاں جہاں ملے دل کھول کے لیے

رحمٰن جامی ایک حساس دل رکھتے ہیں اور دوسروں کے درد کو محسوس کرتے ہیں:

جامی نہیں ہے چین فقط اس لیے مجھے
رکھتا ہوں اپنے دل میں سدا آدمی کا درد

جامی صاحب کا تعلق ادب کے کسی گروپ سے نہیں اور نہ وہ اپنے نام کے ساتھ کوئی لیبل لگانا پسند کرتے ہیں:

جامی تمام اپنی قدامت کے ساتھ ساتھ
کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ ہم بھی جدید ہیں

جناب جامی اپنا احتساب خود کرتے ہیں:

مجھے لگا کہ کوئی اور ہے مرے اندر
خود اپنے آپ سے جب میں نے گفتگو کی تھی

حق بات کہنے والے اس شاعر میں مصلحت اندیشی کہیں

نظر نہیں آئے گی؛

منہ پہ کہہ دی جو بات کہنی تھی
مجھ میں کب احتیاط ذہنی تھی

جامی صاحب جدید لہجہ میں شعر کہیں گے تو پھر ترسیل کے المیہ کا شکار ہوتے ہوئے نظر نہیں آئیں گے:

ٹوٹنے لگتا ہے لمحوں کا بدن ہر چوٹ پر
رفتہ رفتہ برف کی صورت پگھل جاتا ہے تن

آنکھ میں جب مری پڑا سورج
خوب ناچا ہے بھانگڑا سورج
روز رہتا ہے رات بھر غائب
کیسی صحبت میں پڑ گیا سورج

جامی صاحب اپنے عصر کے مسائل اور حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں؛

اب فسادوں میں لوگ مرتے ہیں
پہلے مرتے رہے وباؤں میں

جام انا کی غزلوں میں اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر غزل میں دو چار شعر ذہن و دل کو متاثر کرنے والے ملیں گے۔ یہ شاعری کی بہت بڑی کامیابی کی دلیل ہے۔

غزلوں کا انتخاب ممتاز شاعر حامد مجاز نے کیا اور ملک کے مشہور مصور سعادت علی خاں نے 'جام انا' کے ٹائیٹل کی صورت گری کی ہے۔ بین الاقوامی شہرت کے حامل سلام خوش نویس نے کتابت کی ہے۔ ۱۷۶ صفحات پر مشتمل غزلوں کے اس مجموعے کی قیمت شائقین کے لیے ۳۰ روپے رکھی گئی ہے۔ عمدہ کاغذ اور بہترین طباعت کے ساتھ اس دہے کی بہترین متاثر کرنے والی غزلیں مہنگی نہیں ہیں۔ ذہن کی سرشاری اور روح کی تازگی کے لیے "جام انا" کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

قلمی معاونین اپنی تخلیقات صاف اور خوش خط روشنائی سے صفحہ کی ایک جانب لکھ کر ارسال فرمائیں۔ مسودات پر پتہ ضرور لکھیں۔

پھر ملیں گے اگر خدا لایا (اداریہ)

اس بار شگوفہ کا سالنامہ مشترکہ شمارہ (جنوری، فروری) کے طور پر شائع ہو رہا ہے۔ نومبر ۱۹۹۰ء کے مہینے میں چند دن شہر حیدرآباد کے اکثر حصّوں میں کرفیو نافذ رہا جس کے بعد کسی قدر سکون ہوا تھا کہ دسمبر کا مہینہ مکمل طور پر فساد اور کرفیو کی نذر ہو گیا۔ نومبر اور دسمبر کے شماروں کی کسی طرح اشاعت عمل میں آگئی۔ لیکن سالنامہ کی تیاریوں کے لیے وقت ہی نہ مل سکا۔ نتیجتہً سالنامہ کو مشترکہ شمارہ بنانا پڑا جس کا ہمیں بہت دکھ اور افسوس ہے۔ ہماری ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ شگوفہ ہر مہینہ پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ تاہم اس بار حالات کے آگے ہمارا بس نہ چل سکا۔ ہمیں خوشی ہے کہ نامساعد حالات کے باوجود ہمیشہ کی طرح برصغیر کے تمام مزاح نگاروں کی تخلیقات کو سالنامہ میں پیش کرنے میں ہم کامیاب ہو سکے۔

● ملک اور خاص طور سے حیدرآباد کی فرقہ وارانہ صورت حال اور خلیج کی جنگ کی وجہ سے فروری ۱۹۹۱ء میں منعقد ہونے والی عالمی مزاح کانفرنس ملتوی کر دی گئی۔ اس کانفرنس کی نئی تاریخوں کا بہت جلد اعلان کیا جائے گا۔

● سالنامہ ۱۹۹۱ء سے شگوفہ کی مجلسِ ادارت میں کسی قدر تبدیلی عمل میں آرہی ہے۔ جناب محمد منظور احمد نے چار ماہ قبل اپنی ذاتی مصروفیات کی وجہ سے مجلسِ ادارت میں نام شامل نہ رکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ حالاں کہ ادارتی امور میں ان کا عملی تعاون ہمیں اب بھی حاصل ہے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے مشوروں کے بعد یہ طے پایا کہ حیدرآباد کے نمائندہ اور نامور شعرائے کرام جناب مضطر مجاز اور جناب صلاح الدین نیّر کو مجلسِ ادارت میں شریک کیا جائے۔ ان دو حضرات نے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے تعاون کا یقین دلایا ہے۔ امید ہے کہ ان کی شمولیت سے شگوفہ کی ترو تازگی میں اضافہ ہوگا۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

جلد: ۲۴ — مارچ ۱۹۹۱ء — شمارہ: ۳

مجلسِ مشاورت:

بھارت چند کھنّہ

نریندر لوتھر

یوسف ناظم

مجتبیٰ حسین

مجلسِ ادارت: مصطفیٰ مجاز، محمد عنایت اللہ

صلاح الدین نیّر، طالب خوندمیری

خصوصی نمائندے: بمبئی: فیاض احمد فیضی — ریاض: ماجد سحر — دوبئی: غلام نجم الدین

آسٹریلیا: ایس ایم حسینی

کتابت: محمد غالب - محمد مجاہد - محمد ماہر الزماں ٭ طباعت: دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد

فی پرچہ: ۵ روپے

انفرادی: ۵۵ روپے

اداروں سے: ۶۰ روپے

بیرونی ممالک سے: ۲۵۰ روپے

شگوفہ

۲۱-۲ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ

حیدرآباد 500001

فون دفتر: 557716

فون مکان: 521064

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

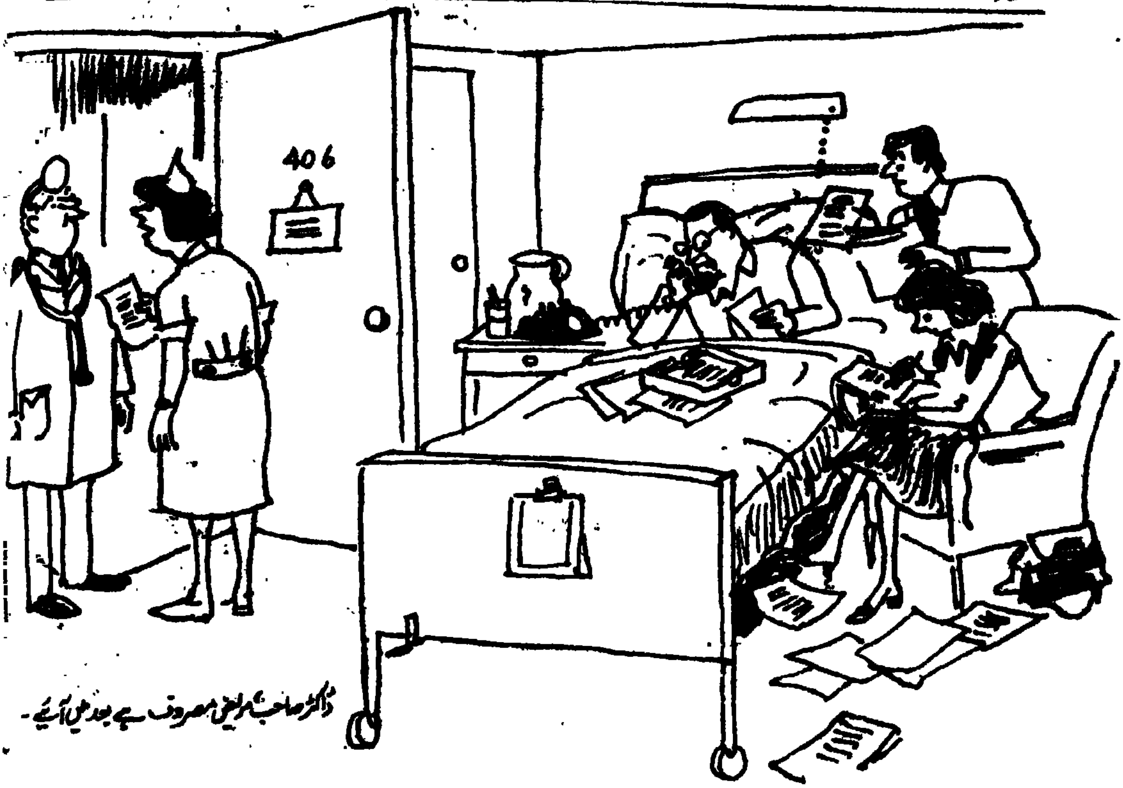
.... تو مرا حاجی بگو (خاکے)

مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

مال مفت (انشائیے)

ایسی کی تیسی (تنقید)

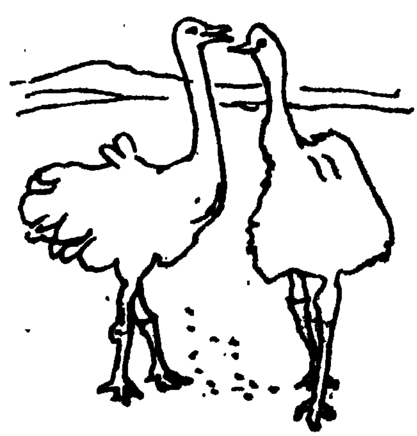
چوسر (منظومات)



ڈاکٹر صاحب! مریض مصروف ہے بعد میں آئیے۔



[illegible]



خدا نہ کرے برا! میرے کان میں ریت بھر گئی ہے

طالبؔ خوندمیری

نذرِ مصطفیٰ کمال

جس مختصر بدن میں چھپا ہے بڑا کمال
طالبؔ اسی کا نام پڑا مصطفیٰ کمال

اندر سے کون جانتے یہ ٹوٹے ہیں کس قدر
باہر تو اوڑھتے ہیں بڑا دبدبہ کمال

تالیفِ نسخہ ہائے شگوفہ کے ساتھ ساتھ
تصنیف کر رہے ہیں کتابِ وفا کمال

اس دورِ بے حسی میں بھی پورے وجود سے
اردو زباں کے درد میں ہیں مبتلا کمال

ہلکی سی اک ہنسی میں مسائل کو ٹالنا
ہے مصطفیٰ کمال کا سب سے بڑا کمال

ملتی نہیں انھیں بھی کئی کرسیاں مگر
ان سے بھی کچھ اٹھا نہ سکے فائدہ کمال

رکھتے ہیں مہ وشوں سے برابر معاملے
لیکن ہیں دیکھنے میں بڑے پارسا کمال

غیروں پہ جانے دھونس جماتے ہیں کس طرح
یاروں کے درمیاں تو ہیں قرباں ہوا کمال

اوروں پہ ڈالتے ہیں کمندِ نظر مگر
رکھتے ہیں دور خود سے سدا آئینہ کمال

یاروں کو پہلے دامِ مباحث میں پھانس کر
پھر مانگتے ہیں اپنا کوئی فیصلہ کمال

ایسا گناہ ان سے جو سرزد نہ ہو سکا
دیتے رہے ہیں خود کو اسی کی سزا کمال

اپنا لہو دہن میں شگوفوں کے ڈال کر
کرتے رہے مزاح کی نشو و نما کمال

مسیح انجم

کیا باکمال شخص ہے یہ مصطفیٰ کمال!

آج جب کہ ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال کی کتاب کی رسم اجراء انجام دی جارہی ہے تو میں دوہری خوشی سے سرشار ہوں۔ پہلی خوشی تو یہ ہے کہ کمال صاحب "صاحبِ کتاب" ہوگئے ہیں۔ مقالے کی پیش کشی کے بعد وہ ڈاکٹر تو تسلیم کرلیے گئے تھے۔ لیکن کتاب کی رسم اجرائے بعد وہ یہ کہنے کے موقف میں آجائیں گے کہ "مستند ہے میرا فرمایا ہوا!" حتیٰ کہ اُن کی اُوٹ پٹانگ باتوں اور خواب والی بڑبڑاہٹ کو بھی مستند مان لیا جائے گا۔ مجھے دوسری خوشی اس بات کی ہے کہ اس سال اُن کی اور میری دوستی کے پچیس سال مکمل ہوگئے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں تو شاید "صاحبِ کتاب" کو کوئی اعتراض نہ ہو کہ آج کی یہ رسم اجراء کی تقریب ہماری دوستی کی "سلور جوبلی" کی تقریب بھی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جلسے کے اختتام کے بعد کمال صاحب یہ طعنہ دیں کہ "مفت کے مال پہ پھر یا کے فاتحہ!"

کمال صاحب کے ساتھ پچیس سال تک دوستی نبھانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ جسے دوست سمجھتے ہیں اُس سے کچھ ایسی توقعات رکھتے ہیں جو ایک بیوی اپنے شوہر سے رکھتی ہے۔ مجھے آج بھی وہ پہلی ملاقات ـــــــــ معاف کرنا "ملاقات" نہیں پہلا حادثہ اچھی طرح یاد ہے جو اُن کے گھر پر پیش آیا تھا۔ میں نے ایک رومانی قسم کا گھٹیا افسانہ لکھ رکھا تھا۔ اور خواہش یہ تھی کہ وہ افسانہ "حیدر" کے صفحہ پر زیورِ طبع سے آراستہ ہو۔ یہ اُن دِنوں کی بات ہے جبکہ کمال صاحب روزنامہ "رہنمائے دکن" کا "شعر و ادب" والا صفحہ ایڈیٹ (EDIT) کیا کرتے تھے۔ اور ہر ہفتہ نت نئے انکشافات کے ذریعہ ادب میں ہلچل پیدا کرکے ادیبوں اور شاعروں کو لڑایا کرتے تھے۔ گویا ادب میں جمود کو توڑنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔ البتہ اتنی احتیاط ضرور ملحوظ رکھتے کہ فوجداری کی نوبت نہ آنے پائے۔ یہ شعر اُن پر پوری طرح صادق آتا تھا:

ـــــــ بڑے مزے سے گزرتی ہے چھیڑ چھاڑ میں عمر　　خدا کرے کہ حریفوں کا انتقال نہ ہو

ہاں تو مجھے اس بات کی فکر تھی کہ میرا افسانہ چھپے۔ افسانہ نہ سہی تو کم از کم تصویر ہی چھپ جائے۔ میں نے بڑے اہتمام کے ساتھ کوٹ اور ٹائی پہن کر مختلف زاویوں سے دو تین تصویریں کھنچوائی تھیں۔ اب آپ سے چھپایا کیا ہے۔ کوٹ اور ٹائی تو فوٹو اسٹوڈیو کے تھے۔ حتیٰ کہ ڈائرکشن اور پوز بھی فوٹو گرافر کے مرہونِ منت تھے۔ البتہ داڑھی بالکل اوریجنل تھی۔ میری اپنی۔ میں نے افسانے سے زیادہ تصویر کو چھپنے میں دلچسپی دکھائی تھی تاکہ افسانے کی اشاعت کے بعد چند حسینوں کے خطوط ملیں۔ وہ دَور ہی کچھ ایسا تھا۔ (اور شاید اب بھی ہے۔) ہمارے بیشتر افسانہ نگار افسانے کو مانجنے اور چمکانے کے بجائے تصویروں کو مانجنے اور چمکانے میں خصوصی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ ...... مختصر یہ کہ میرے ایک دوست مُلّا عنایت اللہ نے یہ عنایت فرمائی کہ کمال صاحب کے گھر پر اُن سے میرا تعارف کروادیا۔ اب میں اُس وقت کمال صاحب کا کیا ذکر کروں؟ اس وقت کے کمال صاحب کا حلیہ بیان کرنے کے لیے آج کے ڈاکٹر

سید مصطفیٰ کمال کے تن و توش میں سے ایک بٹا تین (۱/۳) حصہ منہا کرلینا پڑے گا۔ آپ چاہیں تو ایک بٹا دو (۱/۲) حصہ بھی منہا کرسکتے ہیں حساب اور ناپ تول میں بھول چوک کا امکان رہتا ہے۔ لیکن احتیاطاً یہ ملحوظ رہے کہ قد منہا نہ ہونے پائے۔ تو اُس وقت کے کمال صاحب کا خاکہ احباب میں پیش ہے: ۔ قد بالکل وہی جو فوج میں بھرتی کے لیے ناموزوں قرار دیا گیا ہے۔ دُبلے پتلے اتنے کہ اگر کوئی زور سے چھینک دے تو لڑکھڑانے لگ جائیں۔ اس پر طرفہ تماشہ یہ کہ وہ ململ کا کُرتا پہنے ہوتے تھے جس کے دو ایک بٹن کھلے تھے۔ جس کی وجہ سے اُن کے دُبلے پن کو چار چاند نہیں آٹھ چاند لگ گئے تھے۔ پاجامے کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ وہ گھر پر کرتے اور پاجامے میں ہی ملبوس رہتے ہیں۔ ناک پر موٹے موٹے عدسوں والی عینک جیسے جھگڑے کے موقع پر اگر کوئی انتقاماً چھین لے تو موصوف "اندھا بھینسا" کھیلنے لگ جائیں۔ پیشانی کے اوپر کے بال اُس وقت سے ہی "الوداع یا سید!" کہنے لگے تھے۔ میں نے سوچا کہ جو نوجوان دنیا میں ڈیڑھ پسلی کا شہکار ہو وہ بھلا "شعر و ادب" کا منفرد کیا خاک ایڈیٹ کرتا ہوگا۔ لیکن تعارف کے بعد جب سوالات کی بوچھار شروع ہوئی تو میں سٹپٹا سا گیا۔

پوچھا "کیا لکھتے ہیں؟"

عرض کیا "افسانہ!"

پوچھا "کیوں لکھتے ہیں؟"

چاہا کہہ دوں کہ "لکھنا آتا ہے!" لیکن بوکھلاہٹ میں کچھ کا کچھ کہہ گیا۔ میری بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پھر پوچھا "افسانے میں ہوتا کیا ہے؟"

میں نے منمناتے ہوئے جواب دیا "یہی ایک تکون ہوتا ہے۔ ہیرو، ہیروئین اور ویلن!"

طنزیہ مسکراہٹ سے فرمایا "میں اس قسم کے افسانے نہیں چھاپتا!" اور پھر مفت میں مشورہ بھی عنایت فرمایا کہ "مزاح لکھیے۔ طنز لکھیے۔ اس کی ہمارے سماج کو سخت ضرورت ہے۔ میں طنز و مزاح کو دیگر اصناف پر ترجیح دیتا ہوں!"

اب وہ اس قسم کے مشورے کچھ کھلائے پلائے بغیر نہیں دیتے۔ (اشارہ بریانی، چائے اور سگریٹ کی طرف ہے۔)

اس حادثے کے بعد میں بہت کچھ سنبھل گیا تھا۔ لیکن کمال صاحب سے جب ملاقاتیں بڑھیں تو پتہ چلا کہ وہ انتہائی مخلص انسان ہیں۔ اور طنزیہ جملے چھوڑنا اور مزاح سے لطف اندوز ہونا اُن کی عادت ہے۔ ان سے گھر پر ملیے تو وہی لطف آئے گا جو ایک خالص انشائیہ پڑھنے سے آتا ہے۔ یوں کمال صاحب نے مجھے افسانے کے جنگل سے نکال کر طنز و مزاح کی خاردار پگڈنڈی پر ڈال دیا۔ یہی نہیں کچھ عرصہ بعد یہ عنایت بھی فرمائی کہ اس خاکسار کو "شگوفہ" کی مجلس ادارت میں شامل کر کے اراکین مجلس میں ایک کا اضافہ کرلیا۔ "الجھن" سالنامہ ۱۹۹۱ء کی اشاعت سے قبل انھوں نے بڑے اصرار کے ساتھ چائے پلائی اور "یوم حیات" منایا۔ کمال صاحب کے ظاہر کو مت دیکھیے۔ وہ جتنا باہر ہیں اس سے دگنا اندر بھی ہیں۔ اُن کا سینہ رازوں کا دفینہ ہے [illegible] انھوں نے پردہ ڈال رکھا ہے۔ ان کا [illegible] جس کیا لینا دینا۔ البتہ رازوں سے بہت [illegible] ہوسکتا ہے۔ یہ اُن کی تجارتی پالیسی ہے یا داخلہ پالیسی، شگوفہ پالیسی ہے یا تجارتی پالیسی کہ وہ اپنا راز کسی کو نہیں بتاتے اور اُن [illegible] کا گلا [illegible] کے لیے [illegible] پڑے گا۔ راز کے سینے میں مجھے تخیلی رام سنگم پائے گئے۔ [illegible] نامی ایک شخص [illegible]

اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ اب وہ بات رام لنگم کے پیٹ میں مچلنے لگی۔ وہ بولنا کس سے۔ بالآخر عادت سے مجبور ہو کر رام لنگم نے جنگل کی راہ لی اور ایک سنسان علاقے میں بڑی احتیاط کے سارا راز ایک چوہے کی بل میں اگل دیا۔ اس حکایت کو سنانے کا مقصد یہ ہے کہ اگر رام لنگم کی جگہ مصطفیٰ کمال ہوتے تو بادشاہ کا ہی سر قلم کر دیتے کہ اس نے راز کو راز ہی کیوں نہ رہنے دیا۔ آشکارا کیوں کیا؟

اگر کسی شاعر یا ادیب کو کتابت، طباعت اور وغیرہ وغیرہ کے سلسلے میں زریں مشورے لینا ہو تو کمال صاحب سے زیادہ موزوں شخصیت اس شہر میں کوئی نہیں ہے۔ چناں چہ ان سے مشورے لینے کے لیے مختلف حضرات دفتر "شگوفہ" پر آتے ہی رہتے ہیں جن میں ان کی کچھ سہیلیاں اور پردہ دار خواتین بھی آتی ہیں۔ حضرات قسم کے لوگوں سے وہ جس طرح پیش آتے ہیں وہ لے دے کی تعریف میں آتا ہے۔ لین دین کی تعریف میں نہیں۔ البتہ خواتین کو مشورے دیتے وقت وہ اچانک مولانا حالی بن جاتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں ——— "اے ماؤ، بہنو، بیٹیو! ملک کی عزت تمھارے ہاتھ میں ہے!" میری خوش خطی کو دیکھ کر کئی بار موصوف نے یہ مشورہ بھی دیا کہ میں کتابت کرنا سیکھ جاؤں اور "شگوفہ" کی کتابت کا کام سنبھال لوں۔ اس زریں مشورے پر وہ خود اس لیے عمل نہیں کرتے کہ ان کی ہینڈ رائٹنگ کیڑے مکوڑوں کی تعریف میں آتی ہے۔ کسی زمانے میں امتحانی پرچوں پر پانچ نمبر خوش خطی کے جو محفوظ کیے جاتے تھے شاید موصوف کی ہینڈ رائٹنگ ہی کا نتیجہ ہو۔ ان کو ایم۔اے میں گولڈ میڈل ملا ہے۔ خراب ہینڈ رائٹنگ کا بھی ان کو ایک گولڈ میڈل دیا جانا چاہیے تھا تاکہ "ڈبل گولڈ میڈلسٹ" کہلائیں۔

کمال صاحب نے ہر کام ٹھیک وقت پر کیا ہے، سوائے شادی کے۔ اس میں ان کی کاہلی کو کوئی دخل نہیں ہے۔ البتہ انھوں نے اس کی تلافی یوں کر دی کہ عقد کے روز ایک سکنڈ بھی ضائع نہیں کیا۔ ٹھیک وقت پر نوشہ بنے اور ٹھیک وقت پر مسند پر آ بیٹھے۔ انھوں نے شادی وقت پر نہیں کی تو کیا ہوا؟ شادی کے بعد کے تمام کام وقت پر انجام دیتے اور انجام دیتے جا رہے ہیں۔

موصوف کو ٹھیلوں اور بنڈیوں پر تلی جانے والی مرچیاں کھانے کا بڑا شوق ہے۔ چناں چہ یہی وجہ ہے کہ جب وہ کسی موضوع پر بحث کرتے کرتے حجت کی منزل پر پہنچ جاتے ہیں تو مخاطب کو مرچیاں سی لگ جاتی ہیں۔ میں یہ بتانا بھول گیا کہ مرچیاں کھانے کا شوق وہ سڑک پر کھڑے کھڑے ..... نہیں فرماتے۔ اردو کے لیکچرار جو ٹھہرے۔ شاید انھیں یہ دھڑکا لگا رہتا ہو کہ کہیں کوئی شاگرد رشید نمودار ہو کر "آداب صاب!" نہ کہہ دے۔ شاگردوں کا اتنا پاس و لحاظ رکھنے والے لیکچرار اب خال خال ہیں۔

کمال صاحب جب کسی سے ناراض ہو جاتے ہیں یا کوئی ان سے تکرار کر لیتا ہے تو وہ اپنا سارا غصہ اپنی اسکوٹر پر نکالتے ہیں۔ کسے کوئی اور بھرے کوئی۔ ویسے، وہ نارمل حالت میں بھی اسکوٹر کی رفتار کو نارمل کب رکھتے ہیں۔ ہلکوٹ پر بیٹھتے ہی ان کو حال سا آنے لگتا ہے۔ وہ اس وقت یہ نہیں دیکھتے کہ ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص کا کیا حال ہے ہے بھی یا گزر گیا۔ تین چار تجربوں کے بعد تو افسانہ نگار عاتق شاہ نے ان کی اسکوٹر پر پیچھے بیٹھنا چھوڑ دیا ہے بلکہ باضابطہ توبہ بھی کر لی ہے۔ اب اگر مصطفیٰ کمال کبھی انھیں لفٹ دینا بھی چاہیں تو وہ یہی فرمائیں گے کہ بھئی مجھے بخشو، ابھی تو مجھے کئی سال زندہ رہنا ہے اور کئی افسانوں کے مجموعے شائع کرانا ہے۔ [illegible]

مسیح انجم کا [illegible] کا آدمی ہے۔
سیکل ہے کہ سیکنڈ ہینڈ اسکوٹر تک اور چیک بک سے کر نئی "ایل ایم ایل" ویسپا تک میں مصطفیٰ کمال کو ساتھی ملا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود مجھے یہ اعتراف ہے کہ میں نے کمال صاحب کو پہچانا ہی نہیں۔ ان کی ذات کے کئی حصار ہیں۔ ان کے دوستوں میں کوئی "ایک حصاری" ہے تو کوئی "دو حصاری" کوئی "تین حصاری" لیکن [illegible] کوئی نہیں ہے۔

"شگوفہ" اور "دفتر شگوفہ" کمال صاحب کی شخصیت کا ایک حصہ ہیں۔ ان دونوں کے بغیر ان کی شخصیت اس مکان کی سی ہو جائے گی جس کا سائبان نہ ہو۔ ابتدا میں "شگوفہ" کا آفس "مجرد گاہ" بند نہ والی حیدرآباد کے کرے میں تھا۔ وہاں سے کمال صاحب نے اس کو مجرد گاہ کی تیسری منزل (جو آخری منزل بھی ہے) کے کمرہ نمبر ۲۱ میں [illegible] کیا۔ ہمارے بزرگ مزاح نگار جناب رشید قریشی پہلی بار کمرہ نمبر ۲۱ پر تشریف لائے تو کمال صاحب نے پوچھا "کہیں رشید بھائی شگوفہ کا آفس کیسا ہے؟" رشید صاحب جو مجرد گاہ کی (۷۵) سیڑھیاں چڑھ کر آئے ہوئے تھے، ہانپتے ہوئے "میاں! آفس تو اچھا ہی ہے۔ لیکن یہ اتنی اونچائی پہ ہے کہ یہاں آنے کے بعد عاقبت یاد آ جاتی ہے۔ یہ دفتر شگوفہ نہیں، دفتر عاقبت ہے!!" شگوفہ اور دفتر شگوفہ کو سنوارنے میں کمال صاحب نے اتنی زیادہ دلچسپی لی کہ [illegible] سنوریں کے بجائے کیا خاک؟ دفتر شگوفہ کسی اردو رسالے کے ایڈیٹر کا آفس ہی نہیں معلوم ہوتا۔ اگر کسی انکم ٹیکس [illegible] اس پر نظر بد پڑ جائے تو شاید انکوائری شروع کر دے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس وقت مصطفیٰ کمال کو منہ [illegible] شرارت سوجھے گی۔ ان کی رگ ظرافت پھڑک اٹھے گی۔ وہ ضرور اس انکم ٹیکس آفیسر کے سامنے بائیس سال سے [illegible] ہوا ناقابل اشاعت کلام اور ناقابل اشاعت مضامین کا ڈھیر بطور [illegible] پیش کر کے یہ فرمائیں گے:

"گر قبول افتد زہے عز و شرف!"

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے اپنے مقالے "حیدرآباد میں اردو کی ترقی" کو اپنی چار بیٹیاں "اسنیٰ"، "افریح"، "سہا" اور "نیساں" کے نام [illegible] کیا ہے۔ اس معاملے میں مجھے ان سے تھوڑا سا اختلاف ہے۔ لڑکیوں کی اس فہرست میں "شگوفہ" کو بھی شامل کر دیتے تو [illegible] جواب طلب نہ کرتا۔ میں تو "شگوفہ" کو کمال صاحب کی اولاد نرینہ سمجھتا ہوں۔ میرے اس خیال پر بعض [illegible] زیند اولاد شاید یہ اعتراض کریں کہ "شگوفہ" تو [illegible] حیدرآباد کی اولاد ہے۔ تو میں ان سے یہ عرض کروں گا کہ کمال صاحب نے اس کو متبنیٰ لیا ہے؟

خدا کا [illegible] کی ہمارے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ آج کل بچے پیدا کرنا تو بہت آسان ہے۔ "[illegible]" [illegible] نے لڑکی [illegible] صاحب [illegible] ہو۔ اصل مسئلہ تو ان کی پرورش ہے۔ ہندوستان میں [illegible]
[illegible] کمال صاحب نے "شگوفہ" کو ایک بیٹے کی طرح [illegible]
[illegible]

ہیں اور اب تو وہ "نمبری" کہلانے لگے ہیں۔ پاکستان میں ماہنامہ "نقوش" کے ایڈیٹر محمد طفیل صاحب کو "خاص نمبر" شائع کرنے کا اعزاز حاصل تھا۔ لیکن ادھر ہندوستان میں یہ اعزاز مصطفیٰ کمال کو حاصل ہے۔ اسی لیے میں کمال صاحب کو محمد طفیل کے نام کی مناسبت سے "مصطفیٰ طفیل" کہتا ہوں۔

پیچ یہ ہے کہ کمال صاحب ہر کام کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ لیکن وہ کسی کام کو اپنے ہاتھ میں لیتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ پہلے ہی سے کچھ فرمائشی، فہمائشی اور سفارشی کام پینڈنگ میں پڑے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ ان تمام "فالتو اور پالتو" کاموں میں گھر کر آزمائش سے گزرتے ہیں تو دفتر شگوفہ میں ایک سماں سا بندھ جاتا ہے۔ اگر بیک وقت کئی کام کرتے ہوئے کسی شخص کو دیکھنا چاہتے ہوں تو آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ شگوفہ کے کسی خاص نمبر یا سوونیر کی تیاری کے دنوں میں آپ سیدھے "شگوفہ" کے دفتر کو سرِ شام چلے جائیے۔ آپ کی تفریح بھی ہو جائے گی اور چائے بھی ملے گی۔ اس وقت آپ کمال صاحب کی اسٹڈی کرنے کے لیے چپ چاپ کہیں بیٹھ جائیے۔ لیکن یہ پتہ نہ چلے کہ آپ ان کا مطالعہ فرما رہے ہیں۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اچانک وہ نیم دراز ہو جائیں گے۔ اپنی آنکھیں بند کر لیں گے۔ لیکن وہ اپنے ذہن میں کام کی اسکیم بنا رہے ہوں گے۔ اچانک وہ اپنی آنکھیں کھول دیں گے۔ جھٹ کرسی سے اٹھ کر سیدھے باتھ روم جائیں گے۔ وہاں ضروریات سے فارغ ہو رہے ہوں گے کہ ادھر فون کی گھنٹی بج اٹھے گی۔ اندر ہی سے "ہیلو!" بولیں گے اور پھر تیز تیز قدموں سے باہر آکر چہرے کا پانی انگلیوں سے صاف کرتے ہوئے فون کا ریسیور [illegible] "ہیلو" اور گفتگو میں اتنی احتیاط برتیں گے کہ وہ نشر نہ ہونے پائے اور وہاں بیٹھے ہوئے احباب معاملے کی تہہ کو نہ پہنچ سکیں۔ بات کرتے جائیں گے اور پیشانی اور آنکھوں کو سہلاتے بھی رہیں گے۔ اتنے میں انھیں عینک یاد آجائے گی۔ عینک کی بجائے پیپر ویٹ اٹھائیں گے۔ غلطی کا احساس ہونے پر پیپر ویٹ رکھ دیں گے اور عینک اٹھائیں گے۔ پھر انھیں الماری یاد آجائے گی۔ جھٹ الماری کی طرف لپکیں گے۔ لیکن ہاتھ میں الماری کی کنجی کے بجائے ٹیلی فون کی [illegible] ہوگا۔ ٹیلی فون [illegible] کر کے الماری کی کنجی لیں گے۔ الماری کھول کر کتابت شدہ کاغذات نکالنا چاہیں گے تو ان کی نظر تولیہ پر پڑے گی۔ انھیں یاد آئے گا کہ "ارے میں نے تو ابھی اپنا چہرہ پونچھا بھی نہیں!" پھر تو وہ ایک ہاتھ سے تولیہ نکالیں گے تو دوسرے ہاتھ سے کتابت شدہ کاغذات۔ ایک ہاتھ سے چہرہ صاف کرتے جائیں گے تو دوسرے ہاتھ سے کاغذات میز پر رکھیں گے۔ چونکہ اب ایک ہاتھ کو فرصت ملی ہے، اس سے کنگھا نکالیں گے اور پھر اسی ہاتھ سے اپنے مختصر اور سفید بالوں میں جھٹ جھٹ دو تین بار کنگھا پھیریں گے۔ کنگھا جیب میں رکھیں گے اور تولیہ کاتب کو دیں گے۔ کاتب سوچے گا کہ "یہ کیا بوالعجبی ہے"۔ اب میں ان حرکتوں کو کہاں تک گناؤں؟ ایک منفرد اور مشاق مائم آرٹسٹ ہی ان تمام حرکتوں کو دلکش انداز میں پیش کر سکتا ہے۔ میری مجبوری یہ ہے کہ میں کوئی مائم آرٹسٹ نہیں ہوں۔ اگر میں ایک مائم آرٹسٹ ہوتا تو کمال صاحب کی خاکہ [illegible] پر وہ بھی پیش کرتا۔ جسے "مائم آرٹ" کہتے ہیں۔ ویسے میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر کمال صاحب "نمائش" کے دنوں میں یہی کام ایک "اسٹال" کھول کر انجام دیں تو اچھی خاصی آمدنی [illegible] کہ گنیز بک میں نام بھی شامل ہو جائے۔

مشتاق احمد یوسفی

دوسری قسط

اسکول ماسٹر کا خواب

۲

جگ میں چلے پون کی چال

انہوں نے ایک کوچوان رحیم بخش نامی ملازم رکھ لیا۔ تنخواہ منہ مانگی۔ یعنی پینتالیس روپے اور کھانا کپڑا۔ گھوڑا انہوں نے صرف رنگ، دانت اور گھنیری دُم دیکھ کر خریدا تھا۔ اور وہ ان حصوں سے اتنے مطمئن تھے کہ باقی ماندہ گھوڑے کی جانچ پڑتال ضروری نہ سمجھی۔ کوچوان بھی کچھ اسی طرح رکھا۔ یعنی صرف زبان پر ریجھ کر۔ باتیں بنانے میں طاق تھا۔ گھوڑے جیسا چہرہ۔ ہنستا تو معلوم ہوتا گھوڑا ہنہنا رہا ہے۔ تیس سال گھوڑوں کی صحبت میں رہتے رہتے اُن کی تمام عادتیں، عیب اور بیماریاں اپنا لی تھیں۔ گھوڑے کے اگر دو ٹانگیں ہوتیں تو یقیناً اسی طرح چلتا۔ بچوں کو اکثر اپنا بایاں کان ہلا کر دکھاتا۔ فٹ بال کو ایڑی سے دولتی مار کر پیچھے کی طرف گول کرتا تو بچے خوشی سے تالیاں بجاتے۔ گھوڑے کے چنے کی چوری کرتا تھا۔ بشارت کہتے تھے "یہ منحوس چوری چھپے گھاس بھی کھاتا ہے، ورنہ ایک گھوڑا اتنی گھاس کھا ہی نہیں سکتا۔ جبھی تو اس کے بال ابھی تک کالے ہیں۔ دیکھیے، حرامزادہ تین عورتیں کر چکا ہے!" موضوع کچھ بھی ہو تمام تر گفتگو سائنسی اصطلاحوں میں کرتا اور رات کو چابک لے کر سوتا۔ دو میل کے دائرے میں کہیں بھی گھوڑا یا گھوڑی نظر آجائے تو وہیں رک جاتا۔ ...... اور آنکھ مار کے تانگے والے سے اس کی عمر پوچھتا۔ پھر اپنے گھوڑے کا چرمی چشم بند اٹھاتے ہوئے کہتا "پیارے! تو بھی جلوہ دیکھ لے۔ کیا یاد کرے گا!" اور ٹخ ٹخ کی آواز نکالے اور گھوڑے کی ٹاپ کی تال پر "جگ میں چلے پون کی چال" گاتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ مرزا کہتے تھے کہ یہ شخص پچھلے جنم میں گھوڑا تھا اور اگلے جنم میں بھی گھوڑا ہوگا۔ یہ سعادت صرف مہاتماؤں اور رشیوں منیوں کو حاصل ہوتی ہے کہ جو وہ پچھلے جنم میں تھے اگلے میں بھی وہی ہوں، ورنہ پاپیوں کی تو ایک ہی دفعہ میں جُون پلٹ جاتی ہے۔

دست بدیوار رواں گیا۔

گھوڑے تانگے کا افتتاح کہیے، مہورت کہیے، BREAKING N... کہیے..... اس کی رسم بشارت کے والد نے انجام دی۔ وہ ستر کے پیٹے بلکہ لپیٹے میں آنے کے بعد مستقل بیمار رہنے لگے تھے۔ کراچی آنے کے بعد انہوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر نہ کوئی مکان اور دکان الاٹ کرا سکے، نہ کوئی ڈھنگ کا بزنس شروع کر پائے۔ بنیادی طور پر وہ بہت سیدھے آدمی تھے۔ بدلے ہوئے حالات میں بھی وہ اپنے بندھے ٹکے اصولوں اور آؤٹ آف ڈیٹ طرز زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے کو سراسر بدمعاشی تصور کرتے تھے۔ چنانچہ ناکامی سے دل گرفتہ یا تلخ ہونے کے بجائے ایک گونہ اطمینان و طمانیت محسوس کرتے [illegible] [illegible] زندگی میں ناکام ہونے کی [illegible] [illegible] سب سے روشن دلیل [illegible]

حساس، تکلم آمیز اور خوددار انسان تھے۔ کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔ پامسٹ کے سامنے بھی نہیں۔ ایسے ہی کیا حرف شکایت سے زبان کو کبھی آلودہ نہیں کیا تھا۔ یہ قسم بھی ٹوٹی مگر کار برآری نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ بقول مرزا عبدالودود بیگ جب غیور اور بااصول آدمی حتی المقدور دھکے کھانے کے بعد "ڈی مورلائز" ہو کر کامیاب لوگوں کے ہتھکنڈے اپنانے کی بھونڈی ...... کوشش کرتا ہے تو رہی سہی بات اور بگڑ جاتی ہے۔ یکایک ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ جسم کا بایاں حصہ مفلوج ہوگیا۔ ذیابیطس، الرجی، پارکنسن کا عارضہ اور اللہ جانے کیا کیا لاحق ہوگیا۔ کچھ نے کہا، ان کی مجروح انا نے بیماریوں میں پناہ تلاش کر لی ہے۔ خود تندرست نہیں ہونا چاہتے کہ پھر کوئی ترس نہیں کھائے گا۔ اب انھیں اپنی ناکامی کا اتنا ملال نہیں تھا جتنا کہ عمر بھر کی وضع داری ہاتھ سے چھوٹنے کا قلق۔ لوگ آ آ کر انھیں حوصلہ دلاتے اور کامیاب ہونے کی ترکیبیں سمجھاتے تو ان کے آنسو رواں ہو جاتے:

تم تو کرو ہو صاحبی[1] بندے میں کچھ رہا نہیں

بشارت بیان کرتے ہیں کہ وہ ساری عمر داغ کی غزلوں پر سر دھنا کیے۔ انھوں نے کبھی کسی طوائف کو فانی یا میر کا غزل گاتے نہیں سنا۔ دراصل ان دنوں محفل رقص و سرود میں کسی شعلہ رو شعلہ گلو سے فانی یا میر کی غزل گوانا ایسا ہی تھا جیسے شراب میں برابر کا رس نچوڑ کر پینا پلانا! گستاخی معاف، ایسی مے مردافگن پینے کے بعد تو آدمی صرف طبلہ بجانے کے لائق رہ جائے گا! تو صاحب، باوا ساری عمر فانی اور میر سے نفور رہے۔ اب جو پناہ ملی تو انھیں کے ابیات میں ملی۔ وہ قوی اور بہادر آدمی تھے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کبھی ان کو روتے ہوئے دیکھوں گا مگر دیکھا۔ ان آنکھوں سے۔ الخ۔

کراچی میں ان کا آدھا وقت تو یارانِ رفتہ کی یاد میں گزرتا تھا۔ بقیہ آدھا یارانِ ازکار رفتہ ضائع کر دیتے تھے۔

الہ دین ہشتم

بزرگوار کے امراض نہ صرف متعدد تھے بلکہ متعدی لگتے تھے۔ ان میں سب سے موذی مرض بڑھاپا تھا۔ ان کا ایک داماد سرجری میں تازہ تازہ ایف آر سی ایس کرکے آیا تھا۔ اس نے اپنی سسرال میں کسی کا اپینڈکس سلامت نہیں چھوڑا۔ کسی کی آنکھ میں بھی تکلیف ہوتی تو اس کا اپینڈکس نکال دیتا تھا۔ حیرت اس پر ہوتی کہ آنکھ کی تکلیف جاتی رہتی تھی۔ بزرگوار حالاں کہ درد شکم میں مبتلا رہتے، لیکن اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر حلفیہ کہتے تھے کہ میں نے آج تک کسی ڈاکٹر کو اپنے اپینڈکس پر ہاتھ نہیں ڈالنے دیا۔ ایک مدت سے صاحبِ فراش تھے لیکن ان کی معذوری ناکمل تھی۔ مطلب یہ کہ سہارے سے چل سکتے تھے۔ انھوں نے رسم افتتاح اس طرح ادا کی کہ اپنے کمرے کے دروازے میں جس سے نکلے انھیں کئی مہینے ہو گئے تھے، ایک سرخ ربن بندھوا کر اپنے ڈانواں ڈول ہاتھ سے قینچی سے کاٹی۔ تالی بجانے والے بچوں میں لڈو تقسیم کرنے کے بعد دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا کی۔ پھر گھوڑے کو اپنے ہاتھ سے گیندے کا ہار پہنایا۔ اس کی پیشانی پر ایک بڑی سی بھونری تھی۔ زعفران میں انگلی ڈبو کر اس پر "اللہ" لکھا اور کچھ پڑھ کر دم کیا۔ چاروں سموں اور دونوں پہیوں پر شگون کے لیے سیندور لگا کر دعا دی کہ جیتے رہو، سدا سرپٹ چلتے رہو۔ رحیم بخش کوچوان کا منہ کھلوا کے اس میں سالم لڈو فٹ کیا۔ خود ورقِ نقرہ میں لپٹی ہوئی گلوری کلّے میں دبائی۔ پرانا کشمیری شال اوڑھ لپیٹ کے تانگے کی

---

[1] صاحبی کی مراد صاحب سے "صاحب" ہونا نہیں بلکہ ناز و نخرہ اور تغافلِ معشوقانہ سے۔

پچھلی سیٹ پر بیٹھے اور اگلی سیٹ پر ایک پچاس سال پرانا ہارمونیم رکھوا کر اس کی مرمت کرانے ماسٹر بلو قوالی کی دوکان روانہ ہو گئے۔

گھوڑے کا نام بدل کر بزرگوار نے علیٰ ہذا رکھا۔ کوچوان سے کہا، ہمیں تمہارا نام رحیم بخش بالکل پسند نہیں۔ ہم تمہیں الہ دین کہہ کر پکاریں گے۔ جب سے ان کا حافظہ خراب ہوا تھا۔ وہ ہر نوکر کو الہ دین کہہ کر بلاتے تھے۔ یہ الہ دین ہشتم تھا۔ اس کا پیش رو الہ دین ہفتم کثیر العیال تھا۔ حقے کے تمباکو اور روٹیوں کی چوری میں نکالا گیا۔ گرم روٹیاں پیٹ پر باندھ کر لے جا رہا تھا۔ چال سے پکڑا گیا۔ بزرگوار موجودہ الہ دین یعنی رحیم بخش کو عام طور سے الہ دین ہی کہتے تھے۔ البتہ کوئی خاص کام مثلاً پیر دبوانے ہوں یا بے وقت چلم بھروانی ہو یا محض پیار اور شفقت جتانی ہو تو الہ دین میاں کہہ کر پکارتے۔ لیکن گالی دینی ہو تو اصل نام لے کر گالی دیتے تھے۔

ہاف ! اسٹ چابک

دوسرے دن سے تانگہ صبح بچوں کو اسکول لے جانے لگا۔ ایک ہفتہ بعد بشارت کو دکان چھوڑنے جا رہا تھا۔ وہ ابھی صحیح راستہ تھا کہ کوچوان بچوں کو اسکول چھوڑ کر واپس آیا تو بے حد پریشان تھا۔ گھوڑا چابک سے باندھ کر سیدھا بشارت کے پاس آیا۔ ہاتھ میں چابک اس طرح اٹھائے ہوئے تھا جیسے زمانہ قدیم میں علم بردار جنگی علم لے کر چلتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے جس طرح نیویارک کے اسٹیچو آف لبرٹی نے اپنے ہاتھ کو آخری سینٹی میٹر تک اونچا کر کے مشعل آزادی بلند کر رکھی ہے۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ کوئی بجوگ پڑ جائے یا منحوس خبر سنانی ہو تو وہ اسی طرح چابک کا علم بلند کیے آتا تھا۔ چابک کو عمودی حالت میں دیکھ کر بشارت ایسے سراسیمہ ہوتے جیسے ہیملٹ ghost دیکھ کر ہوتا تھا۔

Here it cometh my lord

بشارت کے قریب آ کر اس نے چابک کو "ہاف ماسٹ" کیا اور پندرہ روپے طلب کیے۔ کہنے لگا؟ اسکول کی گلی کے نکڑ پر چابک چالان ہو گیا۔ گھوڑے کے بائیں پاؤں میں لنگ ہے! اسکول سے نکلا ہی تھا کہ بے رحمی والوں[1] نے دھر لیا۔ بڑی منتوں سے پندرہ روپے دے کر گھوڑا چھڑایا ہے، ورنہ اس کے ساتھ سرکار بھی بے فضول پیچھے پیچھے پھرتے۔ میری آنکھوں کے سامنے بے رحمی والے ایک گدھے گاڑی کے مالک کو چابک سے مارتے ہوئے ہنکال کے تھانے لے گئے۔ اس کے گدھے کا لنگ تو اپنے گھوڑے کا پاسنگ بھی نہیں۔" کوچوان نے گدھے کے خفیف سے لنگ کا ذکر اتنی حقارت سے کیا اور اپنے گھوڑے کے لنگ کی شدت اور برتری بیان کرنے میں اتنے فخر و غلو سے کام لیا کہ بشارت نے غصے سے کانپتے ہوئے ہاتھ سے پندرہ روپے دے کر اسے خاموش کیا۔

شیر کی نیت اور بکری کی عقل میں فتور

اسی وقت ایک سلوتری کو بلا کر گھوڑے کو دکھایا۔ اس نے بائیں ٹلی ہاتھ سے ... گھوڑا چابک تشخیص بھلی کر دیا۔ لنگ ہے۔ سارا گھپلا اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا۔ غالباً کیا یقیناً اسی وجہ سے گھوڑا ریس میں چابک کو الٹی فالو ہوا ہوگا۔

---

[1] بے رحمی والے، کوچوان انجمن انسداد بے رحمی جانوراں (SPCA) کو اسی مختصر نام سے پکارتا اور کوستا تھا۔

ایسے گھوڑے کو تو اسی وقت گولی ماردی جاتی ہے جو اس کے حق میں تانگے میں ذلیل وخوار ہونے سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے۔ تاہم سلوتری نے امید دلائی کہ لنگ اس صورت میں دور ہو سکتا ہے کہ چھ مہینے تک مواصل کے تیل کی مالش کرائیں۔ مالش کی اجرت پانچ روپے یومیہ یعنی ڈیڑھ سو روپے ماہوار۔ چھ مہینے کے نو سو روپے ہوئے۔ نو سو کا گھوڑا نو سو کی مالش۔ گویا ٹاٹ کی گدڑی میں کمخواب کا پیوند! ابھی کچھ دن ہوئے انھوں نے اپنے والد کی مالش اور پیر دبانے کے لیے ایک شخص کو تین سو روپے ماہوار پر رکھا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کی کمائی کا نصف حصہ تو انکم ٹیکس والے دھر جائیں گے اور ایک تہائی چپی مالش والے کھا جائیں گے۔ حلال کمائی کے بارے میں انھوں نے کبھی نہیں سنا تھا کہ وہ اس تناسب سے غیر مستحقین میں تقسیم ہوتی ہے۔ چار بجے تانگہ جتوا کر سیٹھ سے نمٹنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ تانگے میں بیٹھنے سے پہلے انھوں نے گہرے رنگ کی دھوپ کی عینک لگائی تاکہ سخت بات کہنے میں حجاب محسوس نہ ہو اور چہرے پر ایک پراسرار خونخواری کا ایکسپریشن آجائے۔ آدھا راستہ ہی طے کیا ہوگا کہ ایک شخص نے بم[1] پکڑ کر تانگہ روک لیا۔ کہنے لگا، "آپ کا گھوڑا بری طرح لنگڑا رہا ہے۔ چالان ہوگا۔" بشارت ہک دک رہ گئے۔ معلوم ہوا "بے رحمی والے" آج کل بہت سختی کر رہے ہیں۔ ہر موڑ پر ایک انسپکٹر گھات میں کھڑا ہے۔ قدم قدم پر بات بے بات چالان ہو رہا ہے۔ وہ کسی طرح نہ مانا تو بشارت نے قانونی موشگافی کی، "آج صبح ہی اس کا چالان ہو چکا ہے۔ سات گھنٹے میں ایک ہی جرم میں دو چالان نہیں ہو سکتے۔" انسپکٹر نے یہ بات بھی فرد جرم میں ٹانک لی اور کہا کہ اس سے تو جرم کی نوعیت اور سنگین ہو گئی۔ کوئی جائے فرار نظر نہ آئی تو بشارت نے کہا "اچھا بابا! تمھیں سچے سہی۔ دس روپے پہ معاملہ رفع دفع کرو۔ برانڈ نیو گھوڑا ہے۔ خریدے ہوئے تیسرا دن ہے۔" یہ سنتے ہی وہ شخص تو آگ بگولا ہو گیا۔ کہنے لگا "بڑے صاحب! اگالگز کے باوجود آپ بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ پیسے سے لنگڑا گھوڑا خرید سکتے ہیں۔ آدمی نہیں خرید سکتے۔" چالان ہو گیا۔

اسٹیل ری رولنگ مل پہنچے تو سیٹھ گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ آج اس کے یہاں ایک بزرگ کی نیاز میں ڈیڑھ سو فقیروں کو پلاؤ کھلایا جا رہا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اس سے مہینے بھر کی کمائی پاک ہو جاتی ہے اور یہ money laundering (شست وشو) کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ایک بینک میں پندرہ بیس برس تک یہ دستور رہا کہ ہر برانچ میں روزانہ جتنے نئے اکاؤنٹ کھلتے شام کو اتنے ہی فقیر کھلائے جاتے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کھانا اکاؤنٹ کھلنے کی خوشی میں کھلایا جاتا تھا یا سودی کاروبار میں بڑھوتری کا کفارہ تھا۔ ہمیں ایک مرتبہ ملتان جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں اس دن بینک کے مالکان میں سے ایک بہت سینیئر سیٹھ انسپکشن پر آئے ہوئے تھے۔ شام کو برانچ میں مساوات کا یہ ایمان افروز منظر دیکھ کر خوشی کی انتہا نہ رہی کہ سیٹھ صاحب پندرہ بیس فقیروں کے ساتھ زمین پر اکڑوں بیٹھے پلاؤ کھا رہے ہیں اور فرداً فرداً ہر فقیر اور اس کے اہل وعیال کی عدم خیریت کی تفصیلات دریافت کر رہے ہیں۔ لیکن مرزا عبدالودود بیگ کو ضابطے سے بیکچر کرنے کی بڑی بری عادت ہے۔ انھوں نے یہ کہہ کر ہماری ساری خوشی کرکری کر دی کہ جب شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پانی پینے لگیں تو سمجھ لو کہ شیر کی نیت اور بکری کی عقل میں فتور ہے۔ محمود

---

[1] بم: گھوڑے کے آگے لگنے والی لکڑی جن میں گھوڑا جتتا ہے۔

ایاز کا ایک ہی صف میں بیٹھ کر پلاؤ کھانا بھی "آڈٹ اینڈ انسپکشن" کا حصہ ہے۔ سیٹھ صاحب دراصل یہ تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ کھانے والے اصلی فقیر ہیں یا مجھ نے اپنے یاروں، رشتے داروں کی بینگٹ (فرشی دعوت) بٹھا دی ہے۔

ہم کہاں سے کہاں آ گئے۔ ذکر اسٹیل مل والے سیٹھ کا تھا جو سات آٹھ سال سے کالے دھن کو ماہ بہ ماہ نیاز فاتحہ کے لوبان کی دھونی سے پاک اور "وہائٹ" کرتا رہتا تھا۔ نئی جادوئی چھڑی ایجاد ہونے میں ابھی کافی دیر تھی کیونکہ ہمارے ذہین اور طباع وزیر مالی خزانہ اور ماہرین اقتصادیات تو اس زمانے میں میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہے ہوں گے۔ لہٰذا سیاہ کو سفید کرنے کا شعبدہ ہنوز پیر، فقیر، فسوں ساز، سفلی عمل اور یادیجی خانے پر سفیدی کرنے والے انجام دیتے تھے۔

سیٹھ نے گھوڑے کے لنگ سے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ الٹا سر ہو گیا کہ "تم گھوڑے کو دیکھنے ہاف ڈزن ٹائم تو آئے ہو گے۔ گھوڑا مالک تم کو پہچاننے لگا تھا۔ دس دفعہ گھوڑے کے دانت گنے۔ کیا! تم ایک دفعہ اس کے لیے نال خلائی بھی لائے۔ تم نے ہم کو یہاں مالک بولا کہ گھوڑا الو ہاتھ لیا ہے۔" اس سے تمہیں یہ لنگڑا دکھلائی پڑتا تھا۔ آج چار پانچ دن بعد گھوڑے کے کالکٹر خود دیہن کے بہتان طوفان لگانے آئے ہو۔ کیا تین دن میں تو قبر میں مردے کا بھی حساب کتاب برد برخلاص ہو جاتا ہے۔

اُس ٹیم آپ کو مال میں یہ ڈیفیکٹ دکھلائی نہیں پڑا۔ تانگے میں جوت کے غریب خانے لے گئے تب بھی نظر نہیں آیا۔ بشارت سیٹھ کے سامنے اپنے گھر کو اتنی دفعہ غریب خانہ کہہ چکے تھے کہ وہ یہ سمجھا کہ یہ اُن کے گھر کا نام ہے۔

بشارت نے کچھ کہنا چاہا تو قطع کلام کرتے ہوئے بولا "ارے بابا! گھوڑے کا کوئی پارٹ کوئی پرزہ ایسا نہیں جس پر تم نے دس دس دفعہ ہاتھ نہیں پھیرا ہو۔ کیا! تم ترنس میں ہو کہ ایسی بات منہ سے نکالیں گا تو ہم کدھر جائیں گا! بولو خدا اور کلیا مانس دکھیا آدمی اکے موافق بات نہیں کرو۔ کیا" سیٹھ بری الذمہ ہو گیا۔ اُس کا سگرٹ باہر نکلا

بشارت نے زچ ہو کر کہا "حد تو یہ کہ سودا کرنے سے پہلے یہ بھی دیکھتا یا کہ گھوڑا اپنے ہی بغیر ہے" دوسرے صرف اللہ کھیں مسلمان اور پاکستانی کہتے ہیں!

(سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) تو کیا تمہارے کو بد ذات دکھ

کیا ہے۔ کیا! اپنے پاس برد برس خدھ کا ڈو میسائل ہے۔

ہے۔ تم بھی بچوں کی قسم کھا کے بولو۔ جب تم اردو کے منفرد مزاح نگار

کرنے سے پہلے پوچھتے تو ہم پہلے ہی

مجتبیٰ حسین

کے بتاتے ہو کہ پہلے اُ

کے فن اور شخصیت کا جائزہ

کو پہنچی او

ماہنامہ شگوفہ کا دستاویزی نمبر

مجتبیٰ حسین نمبر

تا عمر ممنون و احسان مند رہیں گا۔

سیٹھ آپے سے باہر ہو گیا۔ "ارے بابا! تمہارے موافق ہم سے اڑی شد مت جانا۔ ہم پہلے سے دلیپ کے موافق تمہارا گلا کاٹ کے ادھر کا ہے کو توڑ ... سے بار سال ہماری نیئیں جو شریمیوں سے ما ماگری"۔

اشپیل ری رولنگ مل۔ ادھر گھوڑوں کا دھندا ... ادھر شیلموٹے سے تانگے کا دھندا ... کسی مجرتی کا سماج رنیدا"

ت ...

رایک دم کرشک اشدد میں ذا کلاک باتھ پر چیلا ہیں ہے۔ کوئی بھی ... یہ ری رولنگ مل ہے۔ رسالا الگ ذ تمام اس ... کستیوں کا گھر ہے۔

نے لیکے کر
... تھیں
... گی

[illegible]

ہے خریت۔
بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں
... حالات ہو گیا۔

اشپیل ری رولنگ مل پہنچے تو سیٹھ نظر ...
... سو فقیروں کو پلاؤ کھلایا جا رہا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا نہ ... دہشت و شور) کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ایک بینک میں ... جتنے اکاؤنٹ کھلتے شام کو اتنے ہی فقیر کھلائے جاتے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا ... کھلایا جاتا تھا یا سودی کاروبار میں برکت تری کا کفارہ تھا۔ ہمیں ایک مرتبہ ملتان ... مل بینک کے مالکان میں سے ایک بہت سینئر سیٹھ انسپکشن پر آئے ہوئے تھے۔ شام کو ... یہ ایمان افروز منظر دیکھ کر خوشی کی انتہا نہ رہی کہ سیٹھ صاحب پندرہ بیس فقیروں کے ساتھ زمین پر آلتی پالتی ... پلاؤ کھا رہے ہیں اور فرداً فرداً ہر فقیر اور اس کے اہل و عیال کی عدم خیریت کی تفصیلات دریافت کر رہے ہیں۔ لیکن مرزا عبدالودود بیگ کو خواہ مخواہ بیکل کرنے کی بڑی بری عادت ہے۔ انھوں نے یہ کہہ کر ہماری ساری خوشی کرکری کر دی کہ جب شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پانی پینے لگیں تو سمجھ لو کہ شیر کی نیت اور بکری کی عقل میں فتور ہے۔ محمود ...

ا ... گاڑی کے آگے جتنے والی لکڑی جس میں گھوڑا جوتتے ہیں۔

سلامتی اور رحیم بخش تینوں بالترتیب ہنستے گھوڑے اور بچھڑے کھاتے رہے۔ رحیم بخش کو گھوڑے کے ساتھ برکیت کی نایاں بھی ہمدردی ہوگیا کہ اس کی خوراک گھوڑے سے کسی طرح کم نہ تھی۔ گھوڑے کو تو خیر سیر سے جو تھے بدہضمی ہوجاتی رہتی تھی لیکن رحیم بخش کا نظام ہضم نہ صرف ہر قسم کے بیکٹیریا سے بلکہ مقدار سے بھی IMMUNE ہوگیا تھا۔ نئے PET نئی نویلی دلہن اور لاڈلے بچے کے ساتھ شفقت کا اظہار کرنے کا ہمارے ہاں لے دے کے ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ ہر شخص انہیں کچھ نہ کچھ کھلا کر اوور فیڈ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ گھوڑے کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ نتیجہ اسے بار بار رکھ بند کا لمرغا اسپیشل (جانوروں کا اسپتال) بھیجنا پڑتا۔ بشارت کا بیان ہے کہ ایک دن شام کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ رحیم بخش گھوڑے کے جلاب کا سارا پاؤڈر پھنکے مار کے کھا گیا۔

ہفتہ ختم ہوتے ہی بچوں کو پھر تانگے میں بھیجنا شروع کر دیا۔ ان کی اپنی دکان زیادہ دور نہیں تھی لہٰذا پیدل چلے جاتے تھے۔ تین ہفتے خیریت سے گزر گئے۔ مطلب یہ کہ گھوڑے کا لنگ بڑھ گیا مگر چالانوں کا سلسلہ بند ہوگیا۔ چوتھا ہفتہ شروع ہی ہوا تھا کہ رحیم بخش چابک کا غم اٹھائے 'آؤ دیکھا نہ تاؤ' بائیں ٹانگ سے لنگڑاتا آیا۔ گھوڑے کی دیکھا دیکھی اب وہ بھی بائیں ٹانگ سے لنگڑانے لگا تھا۔ کہنے لگا "سرکار! آج پھر دھر لیا! آگاہ کیے بغیر ناگاہ دھر لیا! چالان ہے۔ بیس روپے بھر کے آرہا ہوں۔ اگرچہ میں نے بہتیرے ٹھوڑی میں ہاتھ دیئے۔" بشارت نے بادلِ ناخواستہ بیس روپے اس کے منہ پر مارے۔ اب جو تابڑ توڑ چالان ہونے شروع ہوئے تو چوٹ سہلانے تک کی مہلت نہ ملی۔ انہوں نے رحیم بخش کو سختی سے ہدایت کی کہ چھپ چھپا کر راستے بدل بدل کر گلیوں گلیوں جایا کرے۔ اس وضع احتیاط میں اس نے اپنی طرف سے اتنا اضافہ اور کر لیا کہ خود بھی چھپ کر یعنی سر سے پیر تک ایک لال کھیس اوڑھ کے تانگہ چلانے لگا۔ گھونگھٹ میں سے صرف اس کا سگرٹ باہر نکلا رہتا ہے۔ لیکن اس سے واقعی بڑا فرق پڑا۔ وہ اس طرح کہ انسپکٹر اب گھوڑے کو پہچانے بغیر ہی، دور سے صرف لال کھیس دیکھ کر چالان کر دیتا تھا۔

پروفیسر حفیظ بنارسی

ضرورت ہے اک وزیراعظم کی

وطن کے کارواں کو ایک رہبر کی ضرورت ہے
حکومت جو چلائے ایسے لیڈر کی ضرورت ہے

وزیرِ اعظمِ ہندوستاں کا پوسٹ خالی ہے
مگر ہے کچھ دنوں کے واسطے یہ منصب عالی

کبھی یہ پانچ سالہ تھی مگر اب عارضی ہے یہ
بہ الفاظِ دگر اب چار دن کی چاندنی ہے یہ

ہزاروں کے دلوں میں پھر بھی ہوگی آرزو اس کی
بہت سے لوگ ہوں گے جن کو ہوگی جستجو اس کی

نہ کوئی تجربہ لازم نہ ڈگری کی ضرورت ہے
مگر کچھ ڈھول ڈھپے چھینا جھپٹی کی ضرورت ہے

نہیں لازم کہ جو بندہ وفاداری میں کامل ہو
مگر وہ جوڑ توڑ اور اس کی فن کاری میں کامل ہو

مناسب ہے کہ ہو کچھ ناٹکی انداز بھی اس کا
نہ واقف اس سے ہو اچھی طرح ہمراز بھی اس کا

معمر ہو کہ میدانِ سیاست میں ہو نو وارد
کنوارا ہو کہ دس بچّوں کا ہو وہ والدِ ماجد

وہ فلموں کا کوئی ہیرو ہو یا سرکس چلاتا ہو
کوئی رتھ ہانکتا ہو یا ہوائی بس چلاتا ہو

غریبوں اور کسانوں سے وہ ہمدردی جتاتا ہو
مگر دن رات اپنے بینک بیلنس کو بڑھاتا ہو

کسی بھی ذات کا ہو وہ برہمن ہو کہ چھتری ہو
وہ بنیا ہو کہ لالہ ہو وہ یادو ہو کہ کھتری ہو

ہو اس کے چہرے پہ داڑھی کہ داڑھی صاف کرتا ہو
مگر وہ دھن کی دیوی پر بہ جان و قلب مرتا ہو

مزاروں پر کبھی جا کر وہ چادر بھی چڑھاتا ہو
مرادیں ہوں جہاں پوری وہاں سر کو جھکاتا ہو

اُچھالے اوروں کی پگڑی کہ پگڑی کو وہ عزت دے
اڑنگی مار دے یا اپنے یاروں کو وہ نصرت دے

بھگت ہو گاندھی جی کا یا وہ نہرو کا پجاری ہو
عقیدت مند ہو "جے پی" کا یا وہ کرانتکاری ہو

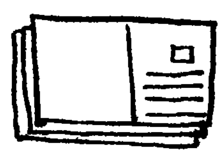
دمِ تقریر کچھ اردو سے بھی وہ کام لیتا ہو
اگر ہندی غلط بولے تو انگریزی میں اچھا ہو

وہ دھوتی باندھتا ہو یا فدائے شیروانی ہو
بس اتنی شرط لازم ہے کہ وہ ہندوستانی ہو

یہ موقع خوب ہے ہر بندۂ جانباز کی خاطر
صلائے عام ہے یارانِ حرص و آز کی خاطر

کارڈ، کیلنڈر اور نیا سال

مجتبیٰ حسین



میں کسی کو نئے سال کی مبارکباد کا کارڈ نہیں بھیجتا۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ گنہگار آدمی ہوں۔ کسی کے حق میں دُعا کروں گا یا کسی کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کروں گا بھی تو کچھ نہیں ہونے والا۔ بلکہ اُلٹا ڈاک کا خرچ میری جیب پر پڑ جائے گا۔ مجھے وہ لوگ بہت معصوم لگتے ہیں جو نیا سال آتے ہی رنگ برنگے کارڈ ڈاک کے خوب صورت ٹکٹ اور لفافے لے کر بھولے بسرے احباب، قرض خواہوں اور رشتہ داروں کو یاد کرنے لگ جاتے ہیں اور یوں جاتے ہوئے سال کی آخری گھڑیاں بھی گنوا دیتے ہیں۔

اِس دُنیا میں زندہ رہتے ہوئے اب پچاس سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے۔ گویا پچاس سے زیادہ نئے سال ہمارے اُوپر سے گزر چکے ہیں۔ ابتدائی دس بارہ برسوں میں نئے سال نے ہمیں بالکل پریشان نہیں کیا۔ کیوں کہ یہ ہماری زندگی کا آغاز تھا اور سماج کی اونچ نیچ اور تعلقات کی نزاکتوں میں ہماری ذات ابھی ملوث نہیں ہوئی تھی۔ کسی کو ہم سے کچھ لینا دینا تھا ہی نہیں کہ ہمارے لیے کسی کے دِل میں نیک خواہشات پیدا ہوتیں۔ ہمیں یاد ہے کہ تیرہ سال کی عمر میں ہمیں نئے سال کا پہلا تہنیتی کارڈ مِلا تھا۔ جس کے ذریعے ہمارے اسکول کے ایک ساتھی نے ہمیں نئے سال کی نیک خواہشات بھیجی تھیں اور اُنہیں پانے کے بعد اگلے سال ہم امتحان میں فیل ہو گئے تھے۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ تیرہ سال کی عمر کے بعد ہمیں جتنے بھی تہنیتی کارڈ ملے۔ اُن میں جو نیک خواہشات تھیں وہ اتنی نیک اور بے لوث نہیں تھیں۔ کیوں کہ اُس وقت تک ہم زندگی کے داؤ پیچ کو سمجھنے لگے تھے اور ہمارے دانت، ناخن بھی نکل آئے تھے ہمیں آج تک اپنی نوجوانی کے دنوں کا وہ تہنیتی کارڈ یاد ہے جو ہماری ایک ہم جماعت لڑکی کی طرف سے مِلا تھا۔ جس میں نئے سال کی خواہشات کچھ اتنی نیک اور تمنّائیں کچھ اتنی والہانہ تھیں کہ اس کارڈ کے ملنے کے بعد اگلے ہی سال ہماری شادی اُسی لڑکی سے ہو گئی۔ اس کارڈ کو ملے ہوئے اب تیس برس بیت چکے ہیں اور وہ لڑکی اب ہماری بیوی بنی ہوئی ہے۔ جو ہمارے گھر پر قابض ہے۔ اور اب ہمارے لیے اُس کی نیک خواہشات . . . . اور ضروریات بھی شامل ہو گئی ہیں۔ ایک تہنیتی کارڈ کے بل بوتے پر ہماری بیوی کو

جو فائدہ اور ہیں جو نقصانِ عظیم پہنچا ہے اُس کی نظیر شاید ہی کہیں ملے۔ قصور ہمارا یہ تھا کہ ہم تہنیتی کارڈ کی نیک خواہشات پر ایمان لے آئے تھے۔ ایک نئے سال کے موقع پر بھیجی ہوئی نیک تمناؤں کی سزا ہم پچھلے تیس برسوں سے بھگت رہے ہیں۔ اسی لیے جب بھی نیا سال آتا ہے اور ہمیں تہنیتی کارڈ ملنے لگتے ہیں تو ہم فطری طور پر سہم سے جاتے ہیں۔ ہر کارڈ کے پیچھے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے لیے ان نیک تمناؤں کا اظہار کس مقصد سے ہے۔

کل ہمیں ایک دوست کا تہنیتی کارڈ ملا ہے بہت خوش رنگ اور خوش شکل ہے۔ انہوں نے ہمیں آج تک کبھی نئے سال کا کارڈ نہیں بھیجا تھا۔ اُن سے پچیس برس پرانی دوستی ہے۔ کبھی انہیں رسمی طور پر نئے سال کا کارڈ بھیجنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ اس نئے سال کے موقع پر اُن کے کارڈ بھیجنے کا کیا مقصد ہے۔ بات دراصل یہ ہوئی تھی کہ ہر سال کی طرح اس سال بھی ہمارے مالی حالات خراب ہو گئے تھے اور ہم نے مجبور ہو کر اُن سے دو سو روپے بطور قرض لیے تھے۔ بھلا بتائیے اگر کسی کے مالی حالات خراب ہوں اور اگر وہ کسی دوست سے قرض لیتا ہے تو کیا بُرا کرتا ہے۔ دوست آخر ہوتے کس دن کے لیے ہیں۔ اب ہم اپنے دوست کو کس طرح سمجھائیں کہ میاں دوستوں میں لینا دینا تو چلتا رہتا ہے۔ یوں بھی دوستوں کا حساب دل میں رہنا چاہیے یہ نہیں ہونا چاہیے کہ آپ قرض کی واپسی کو یاد دلانے کے لیے ہمارے پاس نئے سال کا تہنیتی کارڈ بھیج دیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارا حافظہ کمزور ہے اور ہمیں آپ سے لیے ہوئے قرض کی رقم یاد نہیں ہے۔ بھئی اس معاملے میں ہماری یادداشت خاصی اچھی ہے ہمیں تو دس سال پہلے دوستوں سے لی ہوئی قرض کی رقم یاد رہتی ہے۔ ٹھیک ہے ہم قرض کو واپس کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم بھلکڑ ہیں اور دوستوں سے قرض لے کر بھول جاتے ہیں۔ یہ ہم پر سراسر تہمت ہے۔ آپ ہمیں قرض کی لاکھ یاد دلائیں ہر نئے سال پر تہنیتی کارڈ بھیجیں۔ ہم یہ رقم اُس وقت تک واپس نہیں کر سکتے جب تک کہ ہمارے معاشی حالات ٹھیک نہ ہوں اور ہمارے حالات پچھلے برسوں میں ٹھیک نہ ہوئے تو اب کیا ہوں گے۔ میرے پاس آنے والے تہنیتی کارڈوں میں اکثریت ایسے کارڈوں کی ہوتی ہے جس کے پیچھے دوستوں سے لیا ہوا قرض جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ کسی سال زیادہ تہنیتی کارڈ آ جائیں تو بیوی کہتی ہے "کیا تم نے اس سال اتنے سارے دوستوں سے قرض لیا ہے۔" اس سال ہمارے پاس ایک اور تہنیتی کارڈ آیا ہے جسے ایک شاعر نے بھیجا ہے۔ اس پر ایک بے وزن شعر بھی لکھا ہے۔ جس میں ہمارے جیسے شاعر کی باوزن نیک خواہشات درج ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کارڈ کے پردۂ زنگاری میں کون معشوق چھپا بیٹھا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ان شاعر صاحب کا مجموعۂ کلام تبصرہ کے لیے ہمارے پاس آیا ہوا ہے۔ موصوف پچھلے کئی برسوں سے ادب میں مقام حاصل کرنے کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ نہایت مستقل مزاج آدمی ہیں۔ مشاعروں میں سامعین نے ہوٹنگ کے ذریعے اور ناقدین نے تنقید کے ذریعے انہیں شاعری سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ مگر یہ لگاتار شعر کہے جا رہے ہیں۔ انہیں یہ آس ہے کہ نیا سال اُن کی شاعری کے لیے اچھا ہوگا۔ جب پچھلے کئی برسوں میں اُن کی شاعری پروان نہیں چڑھ سکی تو اب نئے سال میں وہ کیا تیر مار لیں گے۔ پھر بھی ہمارے تبصرے پر آس لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کا نئے سال کا کارڈ پا کر ہم اُن کی شاعری میں وہ خوبیاں تلاش کریں جو پچھلے بیس برسوں میں ہمیں اُن کی شاعری میں نظر نہیں آئیں۔ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن پر ماہ و سال کی گردش کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اُن کی شاعری بھی ایسی ہی شے ہے۔ آغاز میں وہ جتنی نابختہ تھی آج بھی اتنی ہی نابختہ ہے۔ بھلا بتائیے کیا صرف ایک تہنیتی کارڈ کی بنا پر ہم انہیں شاعر تسلیم کر لیں۔

بہرحال نیا سال آتا ہے تو انسان نئی نئی امیدیں وابستہ کرتا ہے۔ دوسروں سے نیک تمنائیں قبول کرتا ہے اور اپنی

نیک تمنائیں دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ جب کہ ہمارا تو یہ تجربہ رہا ہے کہ ہر نیا سال پچھلے سال سے خراب اور آنے والے سال سے اچھا ہوتا ہے۔ زمانے کی رفتار کا یہی عالم ہے۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ جو افراد سال بھر ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں وہ نئے سال کی آمد کے موقع پر خواہ مخواہ مصروف ہو جاتے ہیں۔ دوستوں کو نئے سال کی مبارکباد دینے نکل پڑتے ہیں اپنے سال کے کلینڈر اور ڈائریاں حاصل کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ پرسوں ہمارے ایک دوست اسی میں ملے کہ دونوں ہاتھوں میں دس بارہ کلینڈر تھے اور بغل میں چار پانچ ڈائریاں داب رکھی تھیں۔ بہت خوش تھے۔ کہنے لگے آنے والا سال یقیناً میرے لیے اچھا ہوگا۔ کیوں کہ میرے قبضے میں اس وقت ایک درجن سے زیادہ کلینڈر موجود ہیں۔ پتہ نہیں انہیں کلینڈر جمع کرنے کا اتنا شوق کیوں ہے؟ خاص طور پر کپڑا بنانے والی کمپنیوں کے کیلنڈر وہ ضرور حاصل کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ کپڑا بنانے والی کمپنیوں کے کیلنڈروں پر جو حسیناؤں کی تصویریں چھاپی جاتی ہیں۔ اُن کے بدن پر گھڑی کے سوائے کوئی اور لباس نہیں ہوتا۔ اُن کے گھر جائیے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ اُن کا گھر کیلنڈروں کی نمائش کا مرکز ہے۔ انواع و اقسام کے کیلنڈر دیکھ کر رہ جائیں گے۔ حد تو یہ ہے کہ اُن کے باتھ روم میں تک بھی چار کلینڈر اس خیال سے آویزاں کیے گئے ہیں کہ آپ باتھ روم میں داخل ہونے سے پہلے احتیاطاً دیکھ لیں کہ آپ کس تاریخ کو باتھ روم میں داخل ہو رہے ہیں" یا اور کس تاریخ کو باتھ روم سے باہر آ رہے ہیں۔ اُن کے ڈرائنگ روم کے بارے میں عرض یہ ہے کہ اس میں چاروں طرف کیلنڈر آویزاں ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے کیلنڈروں کی مدد سے اپنے ڈرائنگ روم کی دیواریں کور کی ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ سال کے سال گھر کی سفیدی کرانے سے بہتر تو یہی ہے کہ آدمی گھر کی دیواروں کو کیلنڈروں میں چھپا دے۔

دوسروں کی بات ہم کیا کریں۔ ایک سال خود ہمارے گھر میں کیلنڈروں نے آفت مچا رکھی تھی۔ چند برس پہلے غلطی سے ہم ایک ایسا کیلنڈر لے کر گھر آئے تھے جس پر ہماری پسندیدہ فلمی اداکارہ کی تصویر چھپی تھی۔ یہ بات ہماری نصف بہتر کو اتنی بُری لگی کہ وہ انتقاماً ایک ایسا کیلنڈر لے آئیں جس پر اُن کے پسندیدہ فلمی اداکار کی تصویر تھی۔ ہم بھلا کب خاموش رہنے والے تھے ہم اسی اداکارہ کا ایک خوب صورت پوز والا کیلنڈر لے آئے۔ ہماری بیوی نے بھی جوابی کارروائی کی۔ ہم نے بھی ایک اور جوابی حملہ کیا۔ صورتِ حال اتنی نازک ہو گئی کہ بچوں نے اس کا ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ آپ یقین کریں کہ پورے ایک برس ہمارے گھر میں بدامنی کی کیفیت پھیلی رہی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ نیا سال آیا تو خود ہم نے اپنے طور پر جنگ بندی کا اعلان کیا تب کہیں جا کر ہمارے گھریلو حالات بہتر ہوئے۔ مگر ہمیں اب بھی وہ سال یاد آتا ہے جو کیلنڈروں کی جنگ کی نذر ہو گیا ●●

رشید عبدالسمیع جلیل (حیدرآباد)

کرفیو میں

خون ہے مثلِ آب کرفیو میں — آدمی ہے حباب کرفیو میں

گھر کی دہلیز پار کرتے ہی — جان پر ہے عذاب کرفیو میں

قید معصوم شرپسند آزاد — ظلم ہے بے حساب کرفیو میں

رخ سے چکنائی کچھ ہوئی رخصت — ڈھل گیا کچھ شباب کرفیو میں

موت سے جو بھی کھیل سکتا ہے — ہے وہی کامیاب کرفیو میں

لیڈری کا الٹ گیا تختہ — آگیا انقلاب کرفیو میں

زخم خنجر کے اس طرح مہکے — جیسے تازہ گلاب کرفیو میں

خوف و دہشت کے بیچ ہو ہی گیا — عقدِ عبدالوہاب کرفیو میں

یہ ستمگر یہ آج کے قاتل — کھائیں لقمی کباب کرفیو میں

جو بھی گزری غریب پر گزری — تھا نہتا جناب کرفیو میں

کیجیے کچھ تو بات ہنسنے کی — ہے یہ کارِ ثواب کرفیو میں

شعر موزوں نہیں ہوا ہے جلیل
شاعری ہے خراب کرفیو میں

اسرار جامعی (دہلی)

بھائی چارہ

کیا پتے کی بات کہہ دی جامعی اسرار نے — کیوں ادا کرنا پڑا ہے اس کا کفارہ ہمیں

[illegible]

پرویز یداللہ مہدی

سواری کے ش

صرف اردو زبان ہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کا شعروادب صفحۂ قرطاس کے علاوہ دیگر صفحات و سطحات پر بھی منتقل ہونے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ دیگر سطحات سے ہماری مراد لگے دقتوں کے ریشمی تکیوں، معلّیٰ دسترخوانوں اور دورِ حاضر کی مقبول عام سواریوں جیسے سائیکل رکشاؤں، آٹو رکشاؤں اور لاریوں سے ہے۔ اگر آپ کو ہماری بات کا یقین نہ ہو تو شہر کی کسی بھیڑ بھاڑ والی شاہ راہ کے کنارے کھڑے ہو کر ٹرافک کا تھوڑی دیر جائزہ لیجیے، انشاء اللہ ہر دوسری سواری اپنی پیٹھ پر کوئی نہ کوئی حسبِ حال شعر چسپاں کیے آپ کو دعوتِ مطالعہ دیتی ہوئی گزر جائے گی۔ سڑکوں پہ دندناتی پھرتی سواریوں کی پیٹھ پر پیرِ تسمہ پا کی طرح سوار اشعار کو دیکھ کر ایک زمانے تک ہم یہی سمجھتے رہتے کہ ع یہ سارے شعر ہیں پبلک کی دل لگی کے لیے۔ لیکن ان کی اشاعت کی صحیح غرض و غایت کا علم ہمیں کچھ عرصے پہلے اچانک ہوا کہ اس روز ہم ذرا جلدی میں تھے، اس لیے جو پہلا آٹو رکشا خالی نظر آیا اس میں بنا سوچے سمجھے سوار ہوگئے۔ جیسے ہی ہم نے مقامِ مطلوبہ کا پتہ بتایا آٹو ڈرائیور نے ایک جھٹکے کے ساتھ آٹو اسٹارٹ کیا جھٹکہ اس قدر زوردار تھا کہ ہمارے گھٹنے ڈرائیور کی پشت والی فولادی دیوار سے اور سر چھت والی لوہے کی سلاخ سے جا ٹکرایا ہم درد سے بلبلا کر چیخ اٹھے۔ بھائی جان مجھے جلدی ضرور ہے لیکن آپ مجھ سے زیادہ جلدی میں معلوم ہوتے ہیں، خدا کے لیے ذرا آہستہ چلئے مجھے اپنے ایک دوست کے گھر جانا ہے، کسی ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں نہیں ــــ!" جواب میں ڈرائیور مہاشے نے ایکسیلیریٹر پر مزید دباؤ ڈالتے ہوئے تمسخرانہ لہجے میں فرمایا "جناب آپ کی سٹی پٹی تو ٹیک آف ہی میں گم ہوگئی! لینڈنگ کے وقت آپ کے لیے یقیناً اسٹریچر منگوانا پڑے گا۔!! موصوف کی زبانی ٹیک آف اور لینڈنگ جیسی خطرناک اصطلاحات سن کر، جو صرف ہوائی اڈوں سے منسوب ہوتی ہیں، ہمیں احساس ہوا کہ آں جناب خود کو پائلٹ اور اپنے رکشا کو ہیلی کاپٹر سے کم نہیں سمجھتے، علاوہ ازیں ان کے انداز، اطوار، گفتار اور رفتار سے ہمیں یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ جس طرح بگڑا ہوا شاعر مرثیہ گو بن جاتا ہے اسی طرح ناکام پائلٹ آٹو ڈرائیور بن جاتا ہے۔ ہم نے گڑگڑا کر ان سے گزارش کی "خدا کے لیے آٹو روک دو۔ مجھے کہیں جانا نہیں ہے۔"

"لیجیے ــــ!" موصوف نے ایک جھٹکے کے ساتھ آٹو روک دیا اور ہاتھ ہماری طرف بڑھا کر ہتھیلی پھیلا دی، جس پر کچھ دیر پہلے ہم نے غلطی سے اپنی جان رکھ دی تھی۔ ہم نے ان کی کھلی ہتھیلی پر کرایہ رکھا اور اپنی جان سنبھال کر [illegible] باہر نکلے۔ موصوف نے بڑی حقارت سے ہمارا جائزہ لیتے ہوئے طنز کیا۔ [illegible]

لیا کیجیے ۔!" موصوف کے مشورے پر ہم نے فوراً عمل کیا، ان کے آٹو کی پشت پر یہ شعر چسپاں تھا:

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی!

اور یوں اس روز پہلی بار ہم پر یہ بھید کھلا کہ سواریوں کی پشت پر شاید جو بلکہ پینٹ سے آراستہ اشعار دراصل سواریوں کے اپنے اوصاف حمیدہ و غیر حمیدہ کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ چناں چہ جو گاڑی بان حضرات زندگی سے ...... بیزار اور موت کے طلب گار رہتے ہیں، وہ اپنی سواریوں کے لیے بطور خاص جس قماش کے اشعار کا انتخاب کرتے ہیں، ان کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے:

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ سڑک ہم تو سفر کرتے ہیں

جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے

البتہ جو لوگ زندگی کو بہر حال موت پر ترجیح دیتے ہیں اور جیو اور جینے دو کے اصول پر سختی سے کاربند رہتے ہیں وہ عموماً اس قسم کے حیات آفریں اشعار کا انتخاب کرتے ہیں:

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

اب تو جاتے ہیں بائی وے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

خدا کا شکر کہ ان سخن فہم حضرات کی سخن فہمی کی وجہ سے ہم جیسے غافلوں کو اتنا فائدہ تو ہوا کہ اپنی مرضی کے مطابق سواری منتخب کرنے کی سہولت حاصل ہو گئی، چناں چہ اب ہم سواری کے انتخاب سے پہلے شعر کا انتخاب کرتے ہیں، اور اکثر پیدل ہی اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔

شعر و شاعری کا پیمانہ کب، کس دور اور کن حالات میں صفحۂ قرطاس سے چھلک کر دیگر صفحات پر پھیلا اس کا ٹھیک ٹھیک مہورت دن، تاریخ اور گھڑی بتانا تو خیر مشکل ہے تاہم یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس کی شروعات یقیناً تکیوں اور دستر خوانوں سے ہوئی۔ خود اردو کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ماضی میں تکیوں اور دستر خوانوں نے شعر و ادب کے فروغ میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے، اب یہی دیکھیے [illegible] میں کبھی اخبارات اور رسائل کا داخلہ ممنوع ہوا کرتا تھا وہاں اردو شعر و ادب تکیوں اور دستر خوانوں کے ذریعے [illegible] دیگر

و ہیں تک پہنچ جایا کرتا گویا جہاں شعر وادب، کتابی صورت میں ورق بہ ورق، صفحہ بہ صفحہ نہیں پہنچ پاتا وہاں بڑی آسانی سے تکیہ بہ تکیہ، بستر بہ بستر، دستر بہ دستر پہنچ جاتا ــــ ماضی میں امرا، شرفا، غربا سبھی کے دسترخوان اشعار سے مزیّن ہوا کرتے بلکہ بعض دسترخوانوں پر شاعری کی اس قدر بھرمار ہوتی کہ یہ دسترخوان کم 'دیوان' زیادہ معلوم ہوتے اور کبھی کبھی یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا کہ دسترخوان پر چنی ہوئی اشیائے خورد و نوش زیادہ لذیذ ہیں یا دسترخوان پر چھپے ہوئے اشعار۔ ویسے دسترخوان کے ہر شعر کا معرکۃ الآرا ہونا ضروری بھی نہیں ہوا کرتا۔ ظاہر ہے دسترخوان، شاعری کا انتخاب نہیں کلیات ہوا کرتے جن میں اچھے برے ہر طرح کے شعر مل جاتے ہیں۔ اصل میں دسترخوانی اشعار کے انتخاب میں معیار سے زیادہ موضوع کو فوقیت دی جاتی چنانچہ ایسے تمام اشعار جو دسترخوان کے آداب قواعد اور لوازمات سے راست یا بالواسطہ طور پر ہم آہنگ ہوا کرتے انھیں خوشی خوشی داخل دستر کر لیا جاتا چاہے یہ اشعار خارج از بحر ہی کیوں نہ ہوں اس ڈھیلے ڈھالے انتخاب کے باوجود ہر دسترخوان صاحب خانہ کے صاحب ذوق ہونے کی گواہی دیتا۔ ان دنوں چونکہ آج کی طرح بے مقصد شعر کہنے کا رجحان عام نہیں تھا اس لیے جو شاعری ہوتی مقصدی ہوتی دسترخوانی شاعری تو ہمہ مقصدی ہوا کرتی یہ جہاں مہمانوں کے ذوق شعری کی تسکین کا سامان مہیا کرتی وہیں اگر پکوان میں خدانخواستہ کوئی کسر رہ جاتی تو اپنی شاعرانہ خوبیوں سے کھانے کی بے کیفی پر پردا ڈال دیا کرتی۔ اور اگر کہیں اتفاق سے دونوں ہی ایک سے بڑھ کر ایک ثابت ہوتے تو پھر پوچھنا ہی کیا، واہ واہ سبحان اللہ مکرر ارشاد کے مروجہ نعروں سے دسترخوان کا ماحول گونج اٹھتا دعوت کا مزا دوآتشہ ہو جاتا۔ البتہ کبھی کبھار ان دسترخوانوں پر بڑے عجیب و غریب واقعات بھی رونما ہوا کرتے یہاں ایک ایسا ہی واقعہ پیش ہے جس کے ہم نہ صرف راوی ہیں بلکہ چشم دید گواہ بھی ہیں بیس پچیس برس ادھر کی بات ہے سبھی مہمان مطبوعہ دسترخوان کے آگے اپنے اپنے زانوئے شکم تہہ کیے بیٹھے تھے ہمارے ہی سامنے جو مہمان براجمان تھے وہ اتفاق سے آج کے بیشتر اردو اسکالروں کی آل اولاد کی طرح اردو سے نابلد تھے۔

چنانچہ دسترخوان پر چھپے ہوئے لٹریچر عرف شاعری کو دیکھ کر حیرت اور خوشی سے ان کی باچھیں اس قدر کھل گئیں اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے جوڑی دار سے بے ساختہ بولے۔ دسترخوان پر بھی پرنٹیڈ میٹر (PRINTED MATTER) ونڈرفل ــ! اتنا کہہ کر کھانے پر ٹوٹ پڑے پھر آن کی آن میں ایسا گھمسان کا رن پڑا کہ اچھا خاصا دسترخوان پانی پت کے میدان میں تبدیل ہو گیا، تھوڑی ہی دیر میں دسترخوان پر چنی ہوئی ہر شئے پلیٹوں کے ذریعہ پیٹوں میں منتقل ہو گئی صرف "پرنٹیڈ میٹر" ہی دسترخوان پر باقی رہ گیا اور وہ بھی موصوف سے دیکھا نہ گیا ایک عدد نلی کا گودا جھٹکنے کے لیے اسے چن چن کر دسترخوان پر چھپے ہوئے شعروں پر ٹھپکنے لگے، ان کی یہ حرکت دسترخوان کے آداب کے سراسر منافی تھی لہٰذا ہم نے انھیں ٹوکا ــــ بھائی صاحب، یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ جواب میں بھائی صاحب کے بجائے ان کے پہلو میں بیٹھے ہوئے جوڑی دار نے ارشاد فرمایا "اصل میں بھائی صاحب دسترخوان کے پرنٹیڈ میٹر پر مہر لگا رہے ہیں ــ!"

یہ عجیب و غریب استدلال سن کر ہم نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ کیوں"؟

ارے ــ عادت سے مجبور ہیں، پوسٹ آفس میں سارٹر ہیں، دن بھر خطوط پر مہر لگاتے رہتے ہیں، پرنٹیڈ میٹر دیکھ کر ہی [illegible] خود بخود اٹھ جاتا ہے۔!

ماضی کے دسترخوان اگر شاعری کے گلستان ہوا کرتے تو تکیے شعر و شاعری کے غنچے، وسیع و عریض دسترخوانوں پر شعر و ادب کا سمندر ٹھاٹیں مارتا تو تکیوں کا اختصار اس سمندر کو کوزے میں بند کرکے قارئین و ناظرین سے خراج داد وصول کرتا دسترخوان کے اشتہار اور شعر اگر بھوکے پیاسے کو من و سلویٰ کی لذت سے ہمکنار کرتے تو تکیوں کے خواب آور اشعار تھکے ماندے کو نیند کی لذت سے دوچار کرتے البتہ موضوع کی یکسانیت اور اکہرے پن کی وجہ سے دسترخوان کے شعر جس قدر یک رنگی یک رخے ہوا کرتے تکیوں کے اشعار اسی قدر رنگا رنگ اور چونکے بلکہ ان میں وہی فرق ہوا کرتا جو آورد کے شعر اور آمد کے شعر میں ہوتا ہے۔ چنانچہ ماضی کا ہر تکیہ مختلف النوع اشعار کے ذریعہ تکیہ بردار کے دلی جذبات احساسات اور خیالات کی ترجمانی، اس کی عمر جنس اور حیثیت کے حسب حال کیا کرتا مثلاً کنواروں کے دلی جذبات کی ترجمانی کے لیے جس قسم کے شعر تکیوں پر زیور طبع سے آراستہ کیے جاتے اس کا فی الحال صرف ایک نمونہ ملاحظہ فرمایئے ؎

رہے گا کب تک یونہی لنڈورا بول او تکیے
میرے بستر پہ کیا ہوں گے نہیں ایک ساتھ دو تکیے

جبکہ شادی شدہ افراد کے دلوں کی بھڑاس اس قطعہ کی شکل میں تکیوں پر درج ہوا کرتی ؎

تکیے تیری زندگی پہ دل جلتا ہے
بس ایک تبسم کے لیے کھلتا ہے
تکیے نے کہا کہ اس پلنگ پہ بابا
یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

بعض تکیوں پر ایسے خطرناک شعر بھی تکیہ بردار کی فرمائش پر ٹانکے جاتے ہیں ؎

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تری زلفیں جس کے تکیے پر پریشاں ہو گئیں

بھیڑ جو نہ آکے خواب میں اے منکر و نکیر
سونے دو مجھ کو میں تھکا ماندہ ہوں راہ کا

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا ؎
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

یہ بات نہیں ہے کہ تکیوں پر صرف خطرناک یا المناک شعر ہی درج کیے جاتے دعائیہ شعر بھی تکیوں کی زینت ہوا کرتے سردست اس کا بھی ایک نمونہ ملاحظہ فرمایئے ؎

اپنے بندے پر سدا یارب تیری رحمت رہے
سونے والا سو رہا ہے جاگتی قسمت رہے

لیکن افسوس اب نہ وہ باادب تکیے ہیں نہ باملاحظہ دسترخوان نہ وہ سخن فہم مہمان ہیں نہ سخن پرور میزبان نہ وہ بلی جلی تہذیب ہے نہ وہ گنگا جمنی کلچر نہ وہ اگلی شرافت کے نمونے ہیں نہ وہ بھولے پن کی فضا نہ وہ آپسی یگانگت ہے نہ میل جول سب جیسے خواب کے دھندلکوں میں کھو کر گیا ہے اب تو بس چاروں طرف مار دھاڑ ہے شور ہے اور اس شور میں اضافہ کرتی ہوئی سواریوں کی پیٹھ پر سوار شعر ہیں جنھیں تکیوں کے کاغذی پیرہن کی محفوظ پناہ سے بچھڑتے وقت یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ ؎

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

وجاہت علی سندیلوی

کرشمہ قدرت کا

قدرت اللہ کی جن چند باتوں سے اختلاف کی کوشش کے باوجود ہم اپنے آپ کو متفق پاتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر شخص کے اجزائے ترکیبی میں کہیں نہ کہیں شاعری کے جراثیم ضرور چھپے بیٹھے ہوتے ہیں۔ سیدھے الفاظ میں مطلب یہ کہ بے پرکی اڑانے کی ایک جبلی خواہش بلا استثنا ہر شخص میں پائی جاتی ہے۔ اب یہ اور بات کہ اپنی صلاحیتوں کو جلا دے کر کوئی خدائے سخن، کوئی شہنشاہ غزل، کوئی لسان الغیب، کوئی طوطیِ دوراں وغیرہ کہلانے لگتا ہے اور کوئی بیچارہ قوتِ اظہار کی کمی یا محرومی کے باعث صرف غوں غاں یا تک بندی ہی پر قناعت کر لیتا ہے یا بہت ہوا تو کسی قصبے کے مقامی مشاعرے میں ہوٹ کیے جانے کے بعد دلِ عاشق کی طرح اُٹھنے سے پہلے ہی بیٹھ جاتا ہے۔

چیچک کی طرح شاعری کے مرض کا حملہ ہر ایک شخص پر زندگی میں ایک بار ہوتا ضرور ہے۔ کچھ خوش قسمت بچپن میں ہی اس سے نجات پا لیتے ہیں اور عالم بلوغت تک پہنچتے پہنچتے گنگا نہا چکے یعنی اس سے تائب ہو چکے ہوتے ہیں۔ کچھ شیدائین وفا تخلص کا دُم چھلا لگا کر من تو شدم تو من شدی کے مصداق اسی کے ہو کر رہ جاتے ہیں اور بزم مشاعرہ اُن کا مسکن، [illegible] اوڑھنا اور مکرر ارشاد اُن کا بچھونا بن جاتا ہے۔ خیر اُن کو بھی چھوٹے سے کسی کام سے تو لگ جاتے ہیں، اکثر چندے گانٹھ کر اپنے دیوان چھپواتے اور اُن کی رسم اجراء کرواتے نظر آتے ہیں لیکن دل کٹتا ہے اُن سن رسیدہ بزرگوں کے حال زار پر جو بچپن اور جوانی تو بے داغ کاٹ لے جاتے ہیں لیکن بڑھاپے میں جب دیکھا اعتراف ادب کے محاذ سے پسپا ہو کر بیٹھے ہیں تو شاعری کا متعدی اور موذی مرض نزلہ بر گردن ضعیف کی طرح ان کو آ کر دبوچ لیتا ہے اور جو وقت ان نیک بختوں کا گوشہ عافیت میں آرام کرنے کا ہوتا ہے وہ یہ عروس سخن کی زلف سنوارنے، شوق کے کوچے کی پیمائش کرنے، رقیب روسیاہ کو منہ چڑانے اور واعظ کی پگڑی اچھالنے میں خواہ مخواہ صرف کر دیتے ہیں۔ ہمارے دوست لائق صاحب نے اپنے ایک اسی قسم کے تجربے کو اپنے ایک مقطعے میں بند کر رکھا ہے:

چپاتے اور بیڑی منگاتا ہے ہمیں سے وہ رقیب بعیا
کچھ نہیں کرتا لحاظ احمق ہماری عمر کا لائق ہنوز

ہمیں اس قسم کا پورا شعر یاد بھی نہ ہوتا اگر اس کو سن کر قدرت اللہ جیسے سخن فہم نے لائق صاحب سے یہ سوال نہ کیا ہوتا۔ کیوں استاد! کیا آپ نے .... اپنا تخلص بدل دیا ہے؟ اس طویل تمہید کے بعد ہمیں عرض کرنا ہے کہ ہمارے خالد شہاب الدین صاحب شہیر سابق محرر کا بھی ہے، سابق افسانہ نگار، سابق نقاد، سابق نثر و نظم کے علم بردار۔ پر بھی شاعری جان نے اس وقت حملہ کیا جب وہ ساٹھ سال کے پیٹے میں آ چکے تھے اور کہاں [illegible] کے باعث چلنے سے معذور [illegible] انھوں نے شہر [illegible]

لگے اُڑنا شروع کر دیا اور ہر تقریب اور ہر مشاعرے میں شریک ہونے لگے۔

گرگِ باراں دیدہ تھے لہٰذا جانتے کہ شہرت کا مختصر ترین راستہ اختلافات ہیں لہٰذا انھوں نے بہت جلد اپنے گرد اختلافات کا ایک طومار اکٹھا کر لیا تھا۔ کہیں کسی شاعر کی عروض دانی کے پرخچے اُڑا دیے، کہیں کسی کی ایطائے جلی نہ سہی ایطائے خفی ہی پکڑ لی، اور کسی کی شکست ناروا یا اس کا حقہ پانی بند کر دیا۔ کچھ نہ ملا تو دوسروں کو تڑپانے اور جلانے کے لیے یہی اعلان کر بیٹھے کہ میں اس صدی کا سب سے بڑا غزل گو شاعر ہوں۔ جو شاعر بھی مر جاتا اسے اپنا شاگرد بتلاتے اور اکثر اس بات کا ماتم کرتے کہ فراقؔ اور فیضؔ کے پائے تک کے شعرا نے ان کے کلامِ بلاغت نظام سے دل کھول کر خوشہ چینی کی ہے۔

حشمت نظامی صاحب خالو شہیر صاحب کے سب سے بڑے حریف تھے یوں کہ دونوں نے قریب قریب ایک ہی راستہ اختیار کر کے بامِ شہرت تک رسائی حاصل کی تھی لہٰذا دلی ما ولی می شناسد کے بموجب ایک دوسرے کی دُکھتی رگیں خوب پہچانتے اور کوئی موقع ایک دوسرے کی پگڑی اچھالنے اور رسوا و بدنام کرنے کا ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ باہم نفرتیں یہاں تک بڑھ چکی تھیں کہ ایک کا نام سنتے ہی دوسرے کے منہ سے گالیاں نکلتیں اور ادب کا گہوارہ بے ادبی کا اکھاڑا بن جاتا۔

دسمبر کی ایک یخ بستہ رات کو کسی غیر متوقع طوفان باد و باراں کی طرح شہیر خالو ہمارے غریب خانے پر دس بجے رات کو اچانک نمودار ہوئے اور ہماری بیگم کے سلام کے جواب میں ان کو حکم دیا "اپنے میاں کے سوٹ کیس میں ایک کمبل، تولیہ اور دو جوڑے کپڑے رکھ دو، میرے ساتھ کل سویرے پٹنہ ایک مشاعرے میں جا رہے ہیں"۔

اس اجمال کی تفصیل جو خالو نے رات کو کافی، کھانے اور کافی اور سویرے چائے، حقہ، ناشتہ اور چائے اور چائے کے دوران بیان کی اسے بخوفِ طوالت ان کے نہیں بلکہ اپنے الفاظ میں بیان کرنے پر مجبور ہوں۔

خالو کو ایک مشاعرے کا بندھا ٹکا دعوت نامہ ملا جس میں صرف ریل کے کرائے اور مروجہ نذرانے کا ذکر تھا۔ خالو نے ڈپٹ کر لکھا کہ استادوں کو بلانے سے پہلے ان کے بلانے کے آداب سیکھو۔ جب کسی استاد کو بلایا جاتا ہے تو لازماً اس کی خدمت کے لیے اس کے کسی نامزد کردہ شاگرد کو بھی بلایا جاتا ہے اور اس کو ریل کے کرائے کے علاوہ استاد کے نذرانے کا آدھا نذرانہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ منتظمین مشاعرہ کو نہیں معلوم کسی خاص قسم کے کتے نے کاٹ رکھا تھا کہ انھوں نے نہ صرف خالو کی شرطوں کو من و عن منظور کر لیا بلکہ ان کے ارشاد کے بموجب منظر پیامی کو دعوت نامہ، ریل کا کرایہ اور نذرانے کی پہلی قسط بذریعہ تار بھجوا دی۔

یہاں خالو پر یہ عذابِ الٰہی نازل ہوا کہ جن صاحب کو منظر پیامی بنا کر وہ اپنے ساتھ مشاعرے اور منتظمین مشاعرہ کو لوٹنے کے لیے جانا چاہتے تھے وہ اپنی کم بختی سے ایک بھینس خریدنے ہریانہ چلے گئے۔ اب خالو کو بھینس کے آگے بین بجانے یعنی منتظمینِ مشاعرہ کو راضی رکھنے اور ان کی رقم کو اپنی جیب میں محفوظ کرنے کے لیے ایک عدد منظر پیامی کی ضرورت تھی۔ ان مفروضہ منظر پیامی کے شاعر ہونے کی کوئی قید نہیں تھی کیوں کہ بھلا خالو کے پاس غزلوں کی کیا کمی ہو سکتی! راجہ کا گھر اور موتیوں کا کال! البتہ ایسے ڈیل ڈول اور حلیے کی یقیناً ضرورت تھی جو خالو کا ایک اچھا باڈی گارڈ یعنی محافظِ جسم مع ٹوپی، شیروانی اور چغا ثابت ہو سکے اور جو مخالف ہوٹنگ کی باڑھ پر کچھ دیر کے لیے تو پامردی سے ڈٹا رہ سکے۔ اور اس عہدۂ جلیلہ کے لیے مجھ ناچیز کا انتخاب کیا جا رہا تھا۔

پیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

دوسرے دن نو بجے صبح کو شہپر خالو اپنے مفروضہ منظر پیامی کے ساتھ طوفان میل سے پٹنہ کے لیے روانہ ہوگئے لیکن ؛ منظر پیامی' میں حقیر پر تقصیر نہیں تھا بلکہ میاں قدرت اللہ وزیر با تدبیر تھے۔ بہت شیر چیتا بنانے اور خوشامد کرنے کے بعد وہ میرے بجائے پھانسی کے تختے پر لٹکنے کے لیے آمادہ ہوئے تھے ؛

شہید کوئی بھی ہو حق کی پاسبانی میں
فرازِ دار یہ اپنا ہی سر لگے ہے مجھے

دو بڑے آدمیوں کی سمائی کے لیے جب پورا ملک ناکافی ہوتا ہے تو بے چارے ٹرین کے ایک کمپارٹمنٹ کی کیا بساط چناں چہ دوران سفر شہپر خالو اور میاں قدرت اللہ میں کافی بحث کیا تو تو میں میں رہی۔ دونوں ہی اپنے آپ کو اپنے اپنے اکھاڑوں کا استاد سمجھتے۔ ٹرین سات گھنٹے لیٹ چار بجے سویرے پٹنہ پہنچی تو شہپر خالو اور منظر پیامی کے استقبال کے لیے فقط ایک بوڑھے منشی جی باقی بچے تھے اور وہ بھی صرف اس لیے کہ انھیں اسی ٹرین سے پٹنے سے آگے جانا تھا۔

منشی جی نے اس ہوٹل کا پتہ تو بتا دیا جہاں معزز مہمانوں کو قیام کرنا تھا لیکن اسی کے ساتھ وہ قدرت اللہ کو پہچان بھی گئے کہنے لگے "میاں قدرت اللہ تم کیسے؟ قدرت اللہ بھلا چپ کیسے رہ سکتے۔ بھائی اپنے چشمے کا نمبر تبدیل کراؤ۔ میں منظر پیامی ہوں۔ قدرت اللہ بے چارے تو کئی سال ہوئے اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔"

جاتی ہوئی ٹرین کی کھلی ہوئی کھڑکی سے قہقہے کے ساتھ منشی جی نے کہا "نیا نام لایا پرانا تھکاری۔ اچھا تو اب منظر پیامی محشر خرامی کے ارادے ہیں۔"

یہ مکالمہ سن کر شہپر خالو نے بڑی خشونت سے قدرت اللہ کو دیکھا اور راستہ بھر خاموشی سے ان کو گھورتے رہے۔ ہوٹل کے سامنے ٹیکسی سے اترتے وقت وہ آخر کار پھوٹ ہی پڑے "آپ واپس جانا چاہتے ہوں تو سویرے کی گاڑی سے جا سکتے ہیں"

"واپسی کے ٹکٹ کے لیے کچھ پیسہ بھی چاہیے" قدرت اللہ جماہی لیتے ہوئے بولے۔

"پیسے لیجیے ان منشی جی سے جن کو آپ نے قدرت اللہ کے انتقال کا مژدہ سنایا اور منظر پیامی والے منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔

حشمت نظامی اور شہپر خالو کی باہمی مخالفت اور مخاصمت کی داستانیں نمک مرچ سمیت ان کے بذاتِ خود پہنچنے سے پہلے ہی پٹنہ پہنچ چکی تھیں۔ اخبار نویس اور نامہ نگاران کے بڑی بے چینی سے منتظر تھے۔ حشمت نظامی سے وہ ان کی آمد پر شام کو شیخ کے مسافر خانے ہی میں ایک حد درجہ فتنہ انگیز، دھماکا خیز اور شہپر خالو کے لیے اہانت آمیز انٹرویو لے چکے تھے۔ سویرے کے مرغے ٹھیک سے بانگ بھی نہیں دے چکے تھے کہ دو نامہ نگار شہپر خالو کو تلاش کرتے ان کے ہوٹل پہنچ گئے اور جب کہ خالو دوسرے کمرے میں خواب خرگوش میں پڑے خراٹے لے رہے تھے، وہ قدرت اللہ کو خالو سمجھتے ہوئے ان سے انٹرویو لینے لگے۔

"حشمت نظامی صاحب کہتے ہیں کہ وہ آپ کے استاد ہیں"

"آپ سچ پوچھتے ہیں تو دراصل حقیقت یہی ہے"

"تو آج تک آپ اس بات سے انکار کیوں کرتے رہے؟"

"استاد نے جب اپنے کچھ دیگر شاگردوں کو مجھ پر ترجیح دینا شروع کر دی تو میں نے بھی غصے میں آکر ان کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا تھا لیکن اب چوں کہ میرا ارادہ حج بیت اللہ کا ہے اور میں نے توبہ و استغفار کر کے جھوٹ بولنا ترک کر دیا ہے لہذا میں بہ بانگِ دہل اعلان اور اقرار کرتا ہوں کہ حشمت نظامی صاحب استاد ہیں۔

"آپ نے ان کے خلاف جو بہت کچھ لکھا ہے......؟

"اب اس کا گناہ میری قبر میں نہ بھریے۔ میں اپنے استاد کے سامنے مجرم، نادم اور شرمندہ ہوں اور جب تک وہ مجھے معاف نہیں کریں گے میں جہنم ہی میں جلتا، بھنتا اور ابلتا رہوں گا۔"

"حشمت صاحب کا فرمانا ہے کہ آپ نے ان کے بہت سے اشعار سرقہ اور اغوا کیے ہیں؟"

برادرم اب اور کانٹوں میں نہ گھسیٹیے اور انٹرویو کو طول نہ دیجیے۔ مجھے سرقہ اور اغوا کے جرائم سے اقبال ہے اور اسی لیے میں نے آپ کے سرِ عزیز کی قسم، تہیہ کر لیا ہے کہ اس مشاعرے اور اس میں استاد سے ان کے پیر پکڑ کر معافی مانگ لینے کے بعد شاعری سے ہمیشہ کے لیے تائب اور دست بردار ہو جاؤں گا۔"

روزنامہ "بے دھڑک" نے آج رات کے مشاعرے کے لیے اپنا ایک خصوصی نمبر نکالا۔ اس میں پہلے ہی صفحے پر شاہ سرخیوں کے ساتھ جلی حرفوں میں شہپر خالو کا معروضہ انٹرویو شائع کیا گیا تھا۔ ایک بڑی سرخی تھی "شہپر کی پول کھل گئی۔ ہر محاذ پر شرمناک پسپائی" اس کے نیچے دوسری سرخی یہ تھی "دروغ گوئی اور فریب دہی کا اقبالی مجرم حاضر ہے" ایک علاحدہ سرخی یہ بھی تھی۔ "حشمت صاحب ایسے ادبی بہروپیے اور غدار کو ہرگز معاف نہ کریں" تیز و تند عبارت پہ چیخ چیخ کر بے دھڑک کے پرچے گرم گرم کچوریوں کی طرح فروخت کر رہے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر پر اس کو صلواتیں اور بہت سی بے نقط باتیں سنا کر شہپر خالو ایک موٹا ڈنڈا لیے ایڈیٹر کو تلاش کر رہے تھے۔ ایڈیٹر غریب اپنے گم شدہ نامہ نگاروں کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ نامہ نگار بیچارے قدرت اللہ کو ڈھونڈنے کے لیے گلی گلی کی خاک چھان رہے تھے اور قدرت اللہ پٹنہ لکھنؤ ایکسپریس کی ایک برتھ پر لیٹے کچھ اس قسم کے اشعار گنگنا رہے تھے:

جانا پڑا ہے مجھ کو جو کوچے سے یار کے
واجب ہیں قرض ہم پہ صلیبوں کے دار کے

ذاکر حسین کالج، دہلی کا واقعہ ہے۔ ایک دن آخری پیریڈ کے اختتام پر سیکنڈ ایئر کے دو طالب علم کلاس روم کے باہر ملے، کہنے لگے، "سر، رس گلے پر کوئی شعر لکھا دیجیے۔ میں نے ان سے کہا کہ "رس گلے" پر کوئی شعر میری نظر سے نہیں گزرا۔ آپ لائبریری جائیے اور کسی بنگالی اردو شاعر کا دیوان کھنگالیے۔ ممکن ہے رس گلے پر کوئی شعر مل جائے۔"

"سر، اتنا وقت نہیں ہے۔ ایک گھنٹے بعد ہماری وداعی پارٹی ہو رہی ہے۔ ہمیں وہ شعر وہاں پڑھنا ہے اور سر، آپ تو شاعر ہیں، آپ کوئی شاعرانہ رس گلے پر کہہ دیجیے پلیز!" انھوں نے کہا۔

میں نے ان سے SITUATION پوچھی کہ آخر کس تناظر میں شعر درکار ہے تو ایک لڑکے نے شرماتے ہوئے کہا "سر پچھلے سال الوداعیہ میں ہم نے ایک لڑکی کی پلیٹ سے رس گلا اٹھا کر کھا لیا تھا اس سال ہم اسے لوٹانا چاہتے ہیں مگر شعر کے ساتھ اس تقریب کے لیے ایک شعر چاہیے۔ اور یہ کہہ کر اس نے اپنی نوٹ بک میرے حوالے کر دی۔ میں نوٹ بک لے کر اسٹاف روم چلا گیا۔ مگر وہاں شعر کہنا دشوار تھا۔ بغیر ٹیلی فون کے "ہلو ہلو" تھینک یو، بینڈ اور "بائی بائی" کی فضا میں طبیعت کا یکسو ہونا محال تھا۔ میں اسٹاف روم کے ایک گوشے میں بیٹھ کر فکر کرنے لگا میں نے شاہ نظیر اکبرآبادی کو یاد کیا۔ یاد کرتے ہی وہ اپنی قلندرانہ آن بان کے ساتھ نمودار ہوئے اور کہنے لگے "کیسے یاد فرمایا؟" میں نے انھیں اپنی بپتا سنائی تو بولے "ہم تو اپنے طلبہ کا امتحان لیتے ہی رہتے ہیں، آج انھوں نے میرا امتحان لے ڈالا۔ وہ دیکھیے اسٹاف روم کے باہر منڈلا رہے ہیں۔ رس گلے پر شعر کہنا ہے، کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ سچویشن آپ نے سن ہی لی ہے۔" میاں نظیر بولے اتنی سی میں کیا مشکل ہے۔ لکھیے:



پچھلے برس تو چکھ ڈالا تھا، ہم نے تمھارا رس گلا
اب کے برس تم بھی چکھ ڈالو یار ہمارا رس گلا

دیکھو رس ٹپکا پڑتا ہے میٹھی میٹھی یادوں کا
پیار کے دونے میں حاضر ہے میٹھا پیارا رس گلا

یہ کہہ کر شاہ نظیر چمپت ہوئے کہ مجھے بلدیو چھٹ کے میلے میں جانا ہے۔ خدا حافظ، فی امان اللہ!

میں نظیر کے لکھائے شعروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ لڑکے پھر نازل ہو گئے۔ میں نے ان کی نوٹ بک لوٹا دی۔ دوسرے دن وہ لڑکے اپنے دوستوں کے ہمراہ ہنستے مسکراتے آئے۔ اس لڑکے کی تو باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ وہ اپنے ہاتھوں میں مٹی کا ایک بڑا آبخورہ اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ آبخورے میں رس گلے تھے۔ انھوں نے ہنس ہنس کر الوداعیہ کی روداد سنائی اور کہا کہ سر، آپ کے شعروں نے رس گلوں سے زیادہ مزا دیا۔ لطف یہ ہے کہ وہ لڑکی جو بڑی تنک مزاج تھی، اس قدر مسرور ہوئی کہ ہماری فریفتہ بن گئی۔ یہ کہہ کر لڑکا شرما گیا۔ پھر وہ سب کہنے لگے کہ اس خوشی میں ہم آپ کے لیے رس گلے لائے ہیں، قبول فرمائیے! اب اتنے رس گلے کون کھاتا۔ ان کے جانے کے بعد ہی بی اے آنرز فائنل کا پیریڈ تھا۔ سب کو رس گلے کھلائے۔ وہ پورا پیریڈ رس گلوں کا پیریڈ ہو کر رہ گیا۔ اگلا پیریڈ بھی اسی کمرے میں تھا۔ لڑکوں کے جانے کے بعد ہی وہ لڑکی بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ آئی۔ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک خوب صورت جار تھا۔ جس میں چار پانچ رس گلے تھے۔ کہنے لگی، "سر! یہ رس گلے آپ کے اشعار سے زیادہ شیریں تو نہیں، مگر ہم یہ رس گلے اس لیے لائے ہیں کہ آپ اگلے سال الوداعیہ کی تقریب میں، اسی زمین میں وہ رس گلے پر پوری نظم پیش فرمائیں گے۔

ہمارے دو ساتھیوں کو انگریزی کے پرچے میں زیرو ملا تو ان میں اس بات پر جھگڑا ہوگیا کہ گول صفر کو انڈا کہا جائے یا رس گلا۔ ایک تو کہتا تھا گول انڈا ملا' دوسرا کہتا تھا گول رس گلا ملا۔ انڈے والے نے رس گلے والے سے کہا کہ تیرے رس گلے سے رس ٹپکنے سے رہا تو اس نے جواب دیا کہ تیرے انڈے سے بھی چوزا نکلنے سے رہا۔ ہم نے انھیں سمجھایا کہ اگر آسانی سے تم پڑھائی پر لگاتے تو تم صفر سے صاف بچ جاتے اور ان کا بیچ بچاؤ کرا دیا۔ اصل میں صفر کو انڈا بتانے والا انڈے بیچنے اور رس گلا بیچنے والا دیکھیں ہیں تمام ماجرا۔ انڈے والے کو مشورہ دیا کہ تم انڈے کا آملیٹ بنا کر چٹ کر جاؤ اور اس رس گلے والے کو کہا تم اپنا رس گلا منہ میں رکھو اور اپنے گھر جاؤ۔

۱۹۴۰ء کی بات ہے۔ ہم ہندو کالج دہلی میں پڑھتے تھے۔ ہمارے ایک بنگالی پروفیسر تھے۔ بوٹا سا قد' ذہین بڑی بڑی آنکھیں' سفید براق دھوتی اور کرتا' شیریں سخن' خوب صورت اور صحت مند۔ طلبا اپنے اساتذہ کو برے نیچے تلے نام اور خطاب دینے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ہم نے بھی ان کا نام "مسٹر رس گلا" رکھ دیا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک روز وہ بہت مسرور نظر آرہے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی ہم نے کہا "سر! آج تو آپ بالکل "سوتچ بنگالی رس گلا" معلوم ہوتے ہیں" وہ اس تشبیہ سے بہت محظوظ ہوئے اور اسی دن سے پورے کالج میں وہ "مسٹر رس گلا" کے نام سے مشہور ہوگئے ان کے کلیگ بھی انھیں اسی نام سے پکارنے لگے اور ان کا اصل نام رس گلے کے رس میں ڈوب کر رہ گیا۔

ایک اسکول میں معائنے کے لیے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر کی آمد آمد تھی۔ گویا اسکول کیا اساتذہ' کیا طلبہ سب پریشان تھے کہ اب کیا ہوگا؟ کیوں کہ یہ مشہور تھا کہ وہ آفیسر تھوڑا بہت کریک نہیں' اس کے دماغ کے کئی پیچ ڈھیلے تھے۔ اس لیے وہ بڑے بیہودہ اور لغو قسم کے سوال پوچھتا تھا اور جواب نہ ملنے پر اسکول کی لوگ بک خراب کر دیتا اور اُولی جلول ریمارک درج کر دیتا۔ دوسرے آفیسر تو اسے اس لیے ہی پاگل سمجھتے تھے کہ وہ معائنہ کرتا تھا۔ جبکہ دفتر میں بیٹھ کر ہی ہماری طرح ڈائری بھرنا چاہیے۔ معائنہ کرنا ہی پاگل پن ہے۔ بہر حال اسکول نے اس کے سواگت کی پوری تیاری کی اور طلبا کو عجیب عجیب سوالوں کے جواب رٹائے گئے۔ انسپکٹر آیا۔ معائنہ شروع ہوا۔ اس نے طلبہ کو خبردار کیا کہ اگر میرے پہلے سوال کا صحیح جواب دے دیا تو پھر میں دوسرا سوال نہیں کروں گا اور اگر ٹھیک جواب نہ ہوا تو شام تک سوالوں کی جھڑی لگا دوں گا اور یہ بھی یاد رہے کہ آج تک کسی اسکول کے طلبہ نے میرے کسی سوال کا صحیح جواب نہیں دیا ہے۔ اب تو لڑکے اور بھی گھبرا گئے' اور دل ہی دل میں " جل تو جلال تو' آئی بلا کو ٹال تو" کا ورد کرنے لگے۔ انسپکٹر کا پہلا سوال تھا ـــــ " دو لڑکے الگ الگ رستوراں میں بیٹھے رس گلے کھا رہے تھے' بتاؤ میری عمر کیا ہے ؟" کلاس میں سناٹا چھا گیا۔ بھلا یہ بھی کوئی سوال ہوا۔ لیکن ایک لڑکے نے زور زور سے ہاتھ ہلانا شروع کر دیا۔ کہ میں بتاؤں گا۔ انسپکٹر بہت خوش ہوا اور کہا کہ آج تک کسی اسکول میں کسی لڑکے نے ہاتھ نہیں اٹھایا' میں تمھیں داد دیتا ہوں کہ تم نے کم از کم ہاتھ تو اٹھایا۔ آخر اس سے پوچھا۔ لڑکے نے جواب دیا' " چوالیس سال"۔ انسپکٹر تو حیران رہ گیا وہ واقعی چوالیس برس کا تھا۔ اب اس نے لڑکے سے پوچھا کہ تم نے کس میتھڈ سے یہ سوال حل کیا؟ جواب ٹھیک ہے میتھڈ کی وضاحت کی جائے۔ لڑکے نے جواب دیا' "سر' میرا بڑا بھائی آدھا پاگل یعنی ہاف میڈ ہے اور وہ بائیس برس کا ہے۔ اس لیے بائیس ضرب دو' برابر ہے چوالیس (22 x 2 = 44)۔ سنا ہے اس دن کے بعد انسپکٹر نے ایسے سوال کرنا ترک کر دیا۔



ڈاکٹر جاوید وششٹ
(فرید آباد)

رس گلّا

بنگالے کا جادو، بنگالی نائکہ کی سیاہ لمبی زلفیں، غزالی آنکھیں، اس کے نورانی شیریں لحن اور مدھو کلس سے عبارت ہے۔ لوک گیتوں اور لوک کتھاؤں میں اس کے طلسم کا حیرت انگیز اور پُرلطف بیان ملتا ہے۔ رس گلا بنگالے کا میٹھا جادو ہے جو سر چڑھ کر تو نہیں بولتا مگر کام و دہن میں شیرینی گھول کر مدھر سُروں میں ٹیگور کا گیت گنگناتا اور رلا دیتا ہے۔ تلخیٔ حیات میں پوشیدہ شیرینیٔ حیات کا پتا دیتا ہے۔ رس گلا اپنے وجود کی گولائی کے ساتھ رس میں ڈوبا رہتا ہے، اس لیے رس گلا کہلاتا ہے اور اسی رعایت سے وہ انسان کے نیرس جیون میں رس بھرنے کی خداداد صلاحیت رکھتا ہے۔

ایک دن مرزا غالب اپنے بنگالی محبوب کے ساتھ کلکتے کے ایک ریستوران میں بیٹھے رس گلے کھا رہے تھے۔۔ اچانک رقیبِ روسیاہ بھی کہیں سے ادھر آ پھوٹا اور ان کی ٹیبل کے ایک سرے پر بیٹھ کر محبوب کو گھورنے لگا تو مرزا بہت گھٹے۔ انھوں نے چپکے سے محبوب کے کان میں کوئی منتر پھونکا تو پھر کیا تھا۔ اس نے رقیبِ روسیاہ کو بے نقط گالیاں سنانا شروع کر دیں۔ دشنام طرازی کا پورا ترکش خالی کر دیا مگر رقیبِ روسیاہ بجائے بے مزہ ہونے کے گالیوں کو رس گلّے کی طرح کھانے لگا اور لطف اندوز اور محظوظ ہونے لگا۔ غالب نے فی البدیہہ شعر کہا:

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

اور مرزا رس گلوں کا بل ادا کیے بغیر، محبوب کو لے کر باہر نکل گئے۔ محبوب کے لبوں کی شیرینی مسلّم، مگر مرزا نے رس گلے کی شیرینی کا اعتراف نہ کر کے سراسر اس کے ساتھ انیائے کیا ہے۔ محبوب کی گالیاں محض اس کے لبوں کو چھو کر ہی میٹھی نہیں ہو گئی تھیں۔ چوں کہ اس کے کام و دہن میں رس گلّے نے مٹھاس بھر دی تھی اس لیے گالیاں شوگر کوٹیڈ ہو گئی تھیں۔ رس گلے نے محبوب کے لبِ شیریں کی شیرینی کو دو آتشہ بنا دیا تھا۔ جب مرزا غالب دانستہ طور پر رس گلے کا کریڈٹ بھی محبوب کو دے دیا تو ماہرینِ غالبیات بھلا کیوں گھاس ڈالنے لگے تھے، وہ بھی محبوب کے لبوں کی شیرینی کے ہی قصیدے پڑھتے رہے اور ظاہر ہے کہ یہ تحقیق اندھیر ہے۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ رشید حسن خاں خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہے اور نام نہاد ماہرینِ غالبیات کی خبر نہیں لی۔ اصل ماجرا یہ تھا کہ محبوب کے لبِ شیریں اور رس گلّے کی مٹھاس، دونوں نے مل کر محبوب کی گالیوں کو بھی رس گلا بنا دیا تھا۔

ہم اپنے گاؤں کے مدرسے میں غالباً چھٹی یا ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ ششماہی امتحان کا جب رزلٹ آیا تو

گیا کہ یہ وہی لڑکی ہے جو حسین بھی ہے اور ذہین بھی۔ میں نے وعدہ کر لیا، یہ سوچ کر کہ ایک سال پڑا ہے کہہ لیں گے نظم۔

کالج کے حسین ماحول میں ایک سال ایک لمحے کی طرح گزر جاتا ہے۔ الوداعیہ سے ایک ہفتے قبل وہ لڑکی پھر آئی اور رس گلے پر نظم کی یاد دہانی کرا کر چلی گئی۔ خیر میں نے اس بار میاں نظیر کو زحمت نہیں دی اور نظم کہہ ڈالی۔ لیکن فرمائش کرنے والی لڑکی نے مجھے ایک نئی آزمائش میں ڈال دیا۔ میں جب نظم سنا چکا تو اس نے کہا "سر" کھارا" قافیہ آپ نے چھوڑ دیا۔ اسے بھی نظم کیجیے اور فی البدیہہ شعر کہیے!" اتفاق سے میاں نظیر میرے قریب ہی بیٹھے رس گلے کھا رہے تھے۔ ان کے فی البدیہہ شعر کا مصرع یوں تھا:

اب جو کھا کر ہم نے دیکھا، نکلا کھارا رس گلا

بقول استاد داغ دہلوی:

ذکرِ حبیب کم نہیں، وصلِ حبیب سے

تو رس گلے کا ذکر بہت ہو گیا، آئیے! اب بنگالی مارکٹ چلیں اور کسی رستوران میں بیٹھ کر وصلِ حبیب کے مزے لوٹیں اور رس گلے اڑائیں۔ نظم "رس گلا" کے مقطع پر ہی اس ذکرِ شیریں کو قطع کیا جاتا ہے:

منہ میں پانی بھر آتا ہے رال بھی ٹپکی پڑتی ہے
جا کے دیا ورنظیر کو دے دو یا یار خدارا رس گلا

ڈاکٹر عابد معز
(ریاض)

مرا شہر

چھٹیوں کی تاریخ قریب آنے لگی تو میں خواب بُننے لگا۔ دوست احباب سے ملاقاتوں کے خواب، وہیں جاتے ہی کر ہوٹلوں میں رات دیر گئے تک خوش گپیوں میں مصروف رہنے کا پروگرام، صبح نہاری ہوگی تو رات بریانی اڑے گی۔ سیکل پہ بیٹھ کر چار مینار کے اطراف کی گلیوں کی سیر کروں گا، پان کھا کر لال پیک سے ادھر اُدھر نقشے بناؤں گا۔ گلی کے نکڑ پر کھڑے ہو کر پرانی یادوں میں گم ہو جاؤں گا۔ احباب کے چہرے نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ جب وہ مجھے دیکھیں گے کھلی باہوں اور مسکراتے چہروں سے میرا استقبال کریں گے۔ اور جب مجھے اپنے روبرو پائیں گے تو دوڑ کر لپٹ جائیں گے۔ دائیں، بائیں اور پھر دائیں گلے ملیں گے لیکن میرے خوابوں کی تعبیر الٹی نکلی۔ میرا اپنا شہر اجنبی سا لگا۔ احباب کے اُترے اُترے خاموش چہرے غم کی تصویر بنے میرے سامنے آئے محسوس ہوا میں چھٹیاں گزارنے نہیں آیا بلکہ احباب کو پرسہ دینے آیا ہوں۔ جب میں غور سے چہرے پڑھنے لگا تو مجھے ہر چہرہ سوالی لگا، "ہم پر ایک قیامت گزر گئی میاں۔ تم کہاں چین کی بانسری بجاتے بیٹھے تھے؟" مجھے چند ماہ قبل کی پڑھی اور سُنی خبریں یاد آنے لگیں۔ بلوائیوں کے مظالم پولیس کی زیادتی، سیاست دانوں کی کارستانیاں اور کرفیو کی مصیبتیں۔ میرے چہرے سے خوشی غائب ہوئی۔ میں افسردہ ہو گیا۔ میں اُنھیں کیا بتلاتا کہ شہر کے حالات کی وجہ سے میں اکیلا ہی کیا سبھی ہم وطن پریشان، غم زدہ اور فکرمند تھے۔ دیارِ غیر میں دوسری قوموں کے لوگ سوال کرتے، تمہارے وطن میں کیا ہو رہا ہے کیوں آپس میں لڑ کر تباہ ہو رہے ہیں؟ میرے پاس اس سوال کا جواب نہ تھا۔ میری گردن شرم سے جھک جاتی۔ حالیہ عرصہ میں شرم، غیرت اور افسوس کے باعث میری گردن ہمیشہ جھکی رہی اُٹھنا ہی بھول گئی تھی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ وطن آنے کے بعد شہر کی سڑکوں پر آٹو رکشہ میں سفر کرنے سے گردن کا علاج ہوا۔ جھٹکے کھا کھا کے گردن اٹھتی گئی اور اب ماشاءاللہ آپ سے نظریں ملانے کے قابل ہوئی ہے۔

میں احباب سے شہر کے حالات کے بارے میں پوچھتا ہوں تو وہ اُلٹا مجھ سے سوال کرتے ہیں "وہاں کے حال چال کیسے ہیں؟ سُنا ہے کہ ریاض میں میزائل سے بہت تباہی ہوئی ہے۔ آپ کیسے بچ گئے۔" آپ یقین کریں یا نہ کریں۔ میری بات مانیں یا نہ مانیں مجھے وہاں [illegible] زیادہ یہاں جنگ کے اثرات نظر آئے ہیں۔ ہر شام دکانیں بند اور سڑکیں ویران ہو جاتی ہیں۔ ٹمٹماتی روشنی سے لگتا کہ بلیک آؤٹ ہے۔ چراغ روشن ہونے کے بعد لوگ گھر سے باہر نکلنا محفوظ نہیں سمجھتے۔ شہر کی سڑکوں پر شدید بمباری ہوئی ہے۔ جگہ جگہ گڑھے بنے ہیں [illegible] ہو گیا ہے۔ مین ہول کھلے پڑے ہیں۔ بجلی کے تار ننگے لٹکتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور تو اور یہاں پر جنگ کا سرچارج وصول کیا جا رہا ہے۔ بس کے ٹکٹ پر سرچارج، اناج اور ترکاری پر سرچارج۔ وہاں جہاں جنگ ہوئی ہی، سرکار اور نہ ہی سرچارج وصول کیا جا رہا ہے۔ قیمتیں جوں کی توں برقرار ہیں۔ ہر شئے کی افراط ہے۔ جبکہ یہاں جنگ کی وجہ سے کئی اشیاء بازار سے غائب [illegible] سب سے پہلے غائب ہوئی۔

میرے شہر میں قیمتیں فرائیں کی رفتار سے بڑھ رہی ہیں۔ پیٹرول جو کبھی پیٹرول کے دام سے ملا کرتا تھا' دودھ کے بھاؤ اور پھر عطر کی قیمت سے بکنے لگا۔ اب تو پیٹرول عطر کے دام ملتا ہے۔ مجھے پیٹرول کی خوشبو جنت الفردوس سے بھلی لگتی ہے۔ صابن کریم شیمپو اور ٹوتھ پیسٹ کی قیمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ انھیں استعمال کرنے پر عیاشی کا گمان ہوتا ہے۔ یوں بھی ہمارے ملک کی معیشت بہت حساس ہے۔ افغان کی خانہ جنگی سے چاول کی قیمت دوگنی ہو جاتی ہے۔ جنوبی آفریقہ میں نسلی فسادات سے دودھ میں چکنائی غائب ہوتی ہے۔ مراقش میں حکومت تبدیل ہو تو مکانات کے دام بڑھتے ہیں۔ بنگلہ دیش میں طوفان آتے ہیں ریل کے کرائے میں اضافہ ہوتا ہے اور خلیج کی جنگ سے پیاز میوے کے بھاؤ بکتی ہے۔ میں نے سیب چھ روپے کیلو تو پیاز آٹھ روپے کیلو خریدی ہے۔ میں نے اپنے ایک دوست سے پوچھا "یار وہ جن کی غذا ایک جوار کی روٹی، ایک ہری مرچ اور ایک پیاز ہوا کرتی ہے ان کا گزر کیسے ہوتا ہوگا؟ جواب ملا۔ یہ تو میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارا سارا وقت اپنے ہی بارے میں سوچتے گزر جاتا ہے دوسرے کے بارے میں سوچنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔

میرے شہر کے لوگوں میں سیاست سے دلچسپی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ہوگئی ہے۔ جسے دیکھیے سیاست پر گفتگو اور بحث پر آمادہ ہے۔ دو دن قبل میں ترکاری کی دوکان پر گیا تو دوکان والے نے پوچھا "صاحب آپ باہر سے آئے ہیں۔ ہمیں بتلائیے امریکہ قصور وار ہے یا عراق" جواب دینے سے پہلے مجھے دوکان والے کی توجہ اس بکری کی جانب کرانی پڑی جو گاجر مولی پر ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ پان کے ڈبے، چائے خانوں اور گلی کوچوں کا ذکر کیا کریں۔ گھر کی چار دیواری بھی سیاست سے محفوظ نہیں ہے۔ میری دادی ماں پان کے مہنگے ہونے پر صیہونی سامراجیت کو کوس رہی تھیں۔ گلی کوچوں کے سیاست زدہ لیڈر عالمی مسائل پر بیانات شائع کروا رہے ہیں۔ غم و غصے کا اظہار کر رہے ہیں اور دھارننگ دے رہے ہیں لگتا ہے عالمی سیاست ایک نیا نشہ ہے اور اس کے عادی ہو کر اپنے اہم ترین مسائل سے فرار کی ہم نے صورت ڈھونڈلی ہے۔

میرے شہر میں بلند و بالا عمارتوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ شہر میں جھاڑ لگانے چاہیے تھے لیکن جہاں چھوٹے گھر تھے وہاں اونچی عمارتیں اُگ آئی ہیں۔ کھلے گھروں میں آزاد زندگی کے بجائے لوگ فلیٹ میں بند ہوتے جا رہے ہیں۔ سڑکوں پر وہی بے ہنگم ٹریفک ہے آزادی کے پچاس سال بعد بھی لوگ رکشا میں جتے جاتے ہیں۔ ہمہ اقسام کی سواریاں ایک ہی صف میں چلتی رہتی ہیں۔ شہر پھیلتا جا رہا ہے جبکہ شہریوں کی زندگی سکڑتی جا رہی ہے۔ معمولی بات پر جھگڑا کر کے جان گنوائی جاتی ہے۔ آج جیسی سستی زندگی میرے شہر میں شاید پہلے کبھی نہ تھی۔

احباب علیک سلیک کرنے اور خیر خیریت پوچھنے کے بعد مجھ سے سوال کرتے ہیں۔ کیا واپس جاؤ گے؟ میں جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کرتا ہوں "کیا واپس نہ جاؤں؟" احباب خلا میں گھورنے لگتے ہیں۔ شاید سوچتے ہوں گے کہ کیا اس کو زندگی کی طمانیت دے سکتے ہیں۔ فسادات سے اگر یہ بچ بھی گیا تو کیا گرانی کی تاب لا سکے گا۔ میں احباب کو الجھن میں مبتلا دیکھ کر کہتا ہوں "میں جاؤں گا۔ موت تو ہر جگہ زندگی کا پیچھا کرتی ہے۔ موت سے کیا ڈرنا" تو صاحب پھر ملیں گے اگر خدا نے چاہا۔ یہاں بھی اور وہاں بھی۔ ●●

قلمی معاونین سے درخواست ہے کہ تخلیقات پر اپنا پوسٹل ایڈریس ضرور لکھیں۔

الیاس صدّیقی
مالیگاؤں

گالی

گالی ہماری زبان کا ایک خوب صورت لفظ ہے۔ اس کی فصاحت سلاست اور کیفیات اظہر من الشمس ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ لفظ معنی کی سیدھی ترسیل کرتا ہے۔ اس لیے ترسیل کا کوئی المیہ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ مغلظات کو اس کا مترادف قرار دیتے ہیں لیکن کیا سچ مچ ایسا ہے؟ ذرا لفظ مغلظات کو ایک بار بلند آواز سے ادا کر کے دیکھیے۔ ہونٹ، زبان، گلا، گردن اور رخسار گویا زلزلہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ صرف ایک بار کی ادائیگی سے ہی گردن پر مالش کروانے کی نوبت آجاتی ہے۔ اس کے برخلاف گالی کو لیجیے۔ اس لفظ کی ادائیگی میں ایک ذرا سا منہ کھلتا ہے اور زبان کی نوک آہستگی کے ساتھ دانتوں کے چھت سے جا لگتی ہے اور بس! کیسی نرماہٹ اور مٹھاس ہے اس لفظ میں۔ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ دشنام طرازی کو اس کا مترادف مان لیا جائے۔ حد ہے صاحب! کہاں گالی کا تصور اور کہاں دشنام طرازی سے ٹپکتی ہوئی شرافت، آب و تاب اور تہذیب۔ دشنام طرازی سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انعام دیا جا رہا ہے اس لیے ایسی شریف النفس اور باوقار ترکیب کم از کم گالی کے لیے موزوں نہیں ہو سکتی۔ گالی کا صرف ایک مترادف ہے "گالی"۔

گالی کی تعریف بیان کرنا بھی ایک مشکل امر ہے اس کے لیے نسبتاً آسان ہے جسے گالی کھانے کا شوق ہو۔ گالی دی جاتی ہے لیکن لی نہیں جا سکتی بلکہ کھائی جاتی ہے۔ غالباً یہ واحد فعل یا عمل ہے جس میں آدمی کوئی چیز لیے بغیر کھا لیتا ہے بلکہ کھانے پر مجبور ہوتا ہے آج کی دنیا خود غرضی اور بخیلی کی آماجگاہ ہے اس لیے عام طور پر کسی کو کوئی چیز دینے سے کتراتے ہیں یہاں تک کہ مصیبت کے موقع پر تسلی دینا بھی گراں گزرتا ہے لیکن گالی دینے میں انسان نہ بخل سے کام لیتا ہے نہ کسر نفسی سے۔ گالیاں دینے والا چاہے کتنا ہی معمولی آدمی ہو، گالیاں ہمیشہ معیاری ہوتی ہیں۔ ان تمام صنائع بدائع سے آراستہ و مزین، جن سے کوئی علمی واقفیت گالیاں دینے والے کو نہیں ہوتی۔

کوئی لفظ فی نفسہ گالی نہیں ہوتا یہ گالی دینے والے کی نیت پر منحصر ہوتا ہے مثلاً ہندوستان کی معروف ترین گالیوں میں "سالا" شمار ہوتا ہے جو ملک کے ایک کروڑ سے زیادہ لوگوں کا تکیہ کلام بھی ہے۔ یہ لفظ کبھی گالی ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص کسی کو خلوص دل کے ساتھ اپنی بیوی کا بھائی بنانا چاہے تو گالی کا کیا سوال؟ لیکن کیا اس کے برعکس ہو تب؟ لیکن یہ کلیہ گالی کے لیے استعمال ہونے والے تمام الفاظ پر صادق نہیں آتا۔ متعدد ایسے

چند الفاظ ہی اس اصول پر پورے اترتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر گالی دینے والے کی نیت گالیوں سے صاف ظاہر ہوتی ہے۔ قدیم اردو مثنویوں میں جہاں بارات کا ذکر کیا گیا ہے وہیں سمدھنوں کی گالیوں کا ذکر بھی نہایت صدق دلی سے کیا جاتا۔ سمدھنیں ایک دوسرے کو ایسی ایسی گالیوں سے تفریحاً نوازتی تھیں جن کا کوئی وجود اس سے قبل کی تاریخ میں عنقا ہوتا تھا ہر شادی میں گالیوں کے پچھلے سارے ریکارڈ بریک کیے جاتے تھے اور نئے قائم کیے جاتے تھے بعض مرتبہ شادیاں خاص اسی مقصد کے لیے کی جاتی تھیں۔ اس کے کچھ سماجی فوائد بھی تھے۔ سمدھنیں نئی اور رنگا رنگ گالیوں کے ذریعے گویا زبانِ حال سے کہہ دیتی تھیں کہ دیکھ لو! خوشگوار موڈ میں بھی ہم میں ایسی نادر الوجود گالیاں ایجاد کرنے کی بھرپور صلاحیت ہے۔ اگر ہمارے موڈ کو ناخوشگوار بنانے کی کوشش کی گئی تو ایسی گالیاں ملیں گی کہ نانی مع چھٹی کا دودھ یاد آئے گی .... وغیرہ وغیرہ۔

گالیوں کے انداز اور اقسام سے ہی سمدھنیں اندازہ لگا لیتی تھیں کہ حریف مخالف کتنے پانی میں ہے۔ ان گالیوں کا خوف تا عمر طاری رہتا تھا یہی اس وقت کی خوشگوار اور کامیاب ازدواجی زندگی کا راز تھا جب سے سمدھنوں کی ان گالیوں کا رواج اٹھا ہے، کامیاب ازدواجی زندگی ایک قصہ پارینہ ہو چکی ہے، دولھن کے ساتھ ساتھ بن اور نو بیاہی لڑکیاں بھی یہ گالیاں یاد کر لیتی تھیں اور زندگی کے کسی ناخوشگوار موڑ پر ان کا برمحل استعمال کر کے اسے خوشگوار بنا لیتی تھیں۔

گالی دینے کے لیے الفاظ ضروری نہیں، اس کا ثبوت گالی کی تاریخ سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ گالی کبھی محض آواز ہوتی ہے اور کبھی بے آواز۔ مثلاً پتھر کے زمانے میں جب قدیم عہد کا انسان کسی شکار کے تعاقب میں ہوتا تھا اور شکار کسی صورت قابو میں نہ آتا تھا۔ تب وہ جو بے نام اور بے شکل سی آوازیں اس کے حلق سے نکلتی تھیں انھیں گالی کے علاوہ دوسرا کیا نام دیا جا سکتا ہے۔ تہذیب کی ترقی نے گالی کو الفاظ ہی نہیں انکی الفاظ کو بے مثال معنویت اور تاثیر بھی عطا کی ہے۔ دنیا کے مختلف علاقوں میں گالیوں کی زبان بدلتی جاتی ہے لیکن تاثیر اور معنویت کبھی تبدیل نہیں ہوتی زبان اور ملک کی تبدیلی کا گالی کی مقصدیت اور استعمال پر بھی کوئی خاطر خواہ اثر نہیں پڑتا۔

گالیوں کے اثرات کا تعلق گالی دینے والے کی ذات سے بھی ہوتا ہے۔ شیریں لبوں سے نکلی ہوئی گالیاں کھا کر رقیب تو کیا خود عاشق بھی بے مزہ نہیں ہوتا۔ یہ گالیاں دونوں کے لیے پھول بن کر برستی ہیں۔ اس کے مقابلے میں موٹے اور کرخت ہونٹوں سے نکلی ہوئی پھول جیسی گالیاں بھی ہتھوڑے کی طرح برستی ہیں اور مخاطب کو بے مزہ ہی نہیں بے ننگ و نام بھی کر جاتی ہیں۔

شیریں لبوں سے نکلی ہوئی وہ گالیاں جو میونسپل کے نلوں پر سننے کو ملتی ہیں، معنی آفرینی، شوخی، علامتوں کی کثرت، تراکیب کی جدت، تشبیہات کی ندرت فصاحت و بلاغت اور روانی و سلاست میں بے مثال ہوتی ہیں۔ حسن اتفاق کہ یہی تمام خوبیاں غالب کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔ انھیں تخلیق کرنے کی کوئی بھی شعوری کوشش سی لا حاصل ہوگی۔ شاعری کی زبان میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس میں آمد ہی آمد ہوتی ہے۔ آورد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان گالیوں کو زمانہ کی دھوپ کمھلا نہیں سکتی اور وقت کی گرد دھندلا نہیں سکتی۔ انھیں سن کر ہمیشہ فرحت بخش تازہ کاری کا ایک خوشگوار احساس دل پر طاری ہو جاتا ہے۔

ہندوستانی عورت بلاتفریق مذہب و ملت بے تکان گالیاں دیتی ہے۔ ہندوستانی معاشرہ بھی گالیوں کے لیے کافی مواقع فراہم کرتا ہے۔ حد یہ ہے کہ ادھر ہمارے علاقے میں سال میں ایک مخصوص دن ایک تہوار کے موقع پر شہر کی ہنساؤ پیر معزز خواتین شام کے وقت ندی کے دونوں کناروں پر جمع ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کو ایسی ایسی گالیاں سناتی ہیں جن کو سن کر وہ خود نہیں شرماتیں، شیطان کے شرمانے کا کیا سوال؟ بظاہر یہ گالیاں دوسرے کنارے پر موجود خواتین کے لیے ہوتی ہیں لیکن دراصل ان گالیوں کا مخاطب کوئی اور ہوتا ہے۔ کون؟ اس کا جواب وہ خود دے سکتی ہیں یا سماج۔ غرض دو تین گھنٹوں کے لیے وہ پاسبانِ عقل کو دل کی دربانی سے رخصت دے دیتی ہیں۔ علم نفسیات کے مطابق انسان کی ناآسودہ خواہشات اور دبی کچلی آرزوئیں اپنی نکاسی کے مختلف راستے تلاش کرتی ہیں، ہزاروں سال سے دل میں دبے مظلومیت کے اس جوالا مکھی کو پھوٹ بہنے کے لیے صرف دو تین گھنٹوں کی اجازت؟ بڑی ناانصافی کی بات ہے اس ناانصافی کے ازالہ کے لیے ہندوستانی عورت سال کے بارہ مہینے گالیوں کے بہانے تلاش کرتی ہے۔ اس کی گالیوں کا ہدف کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ پانی، بجلی، کیروسین، غذائی اجناس، پڑوسن، ساس یا شوہر ــــ اس کی گالیوں کا مقام کوئی بھی ہو سکتا ہے، گھر، آنگن، گلی، چوراہا، بازار، پانی کا نل، سسرال یا آفس۔

اصلاحی اور افادی نقطۂ نظر سے بھی گالیوں کی اپنی اہمیت ہے۔ گالیاں انسانوں کے مشتعل جذبات کو سرد کرنے کا کام کرتی ہیں۔ اگر گالیاں نہ ہوتیں تو دنیا کا کوئی مقام مستقل لڑائی، مارپیٹ، قتل و خون اور جنگوں سے خالی نہ ہوتا۔ گالیوں کا یہ بڑا احسان ہے کہ مخالفین کو دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع فراہم کرتی ہیں اور وہ ایک دوسرے کو گالیاں دے کر یوں جدا ہو جاتے ہیں جیسے دو کتے ایک دوسرے پر محض بھونکنے کے بعد دم دبا کر اپنا راستہ لیتے ہیں دنیا کی بڑی طاقتوں کی چوٹی کانفرنسیں اور سربراہانِ مملکت کی تنہائی میں ملاقاتوں کا سبب اب جا کر سمجھ میں آیا۔

شروع میں ہی بیان کر دیا گیا ہے کہ گالیاں بے الفاظ ہی نہیں بے آواز بھی ہوا کرتی ہیں لیکن اس کا ثبوت دینا مشکل امر ہے۔ قرائن ہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کوئی کلرک جب باس کے غصہ کا شکار ہو کر سر جھکائے ہوئے جھڑکیاں سنتا ہے تو اس لمحۂ خاموشی کو آپ کیا نام دیں گے جو اس کے ہونٹوں سے پھوٹ پڑنے کے لیے بے تاب ہوتا ہے۔ غصہ کی شدت کے سبب وہ باس کو صرف گھور کر رہ جاتا ہے۔ اس کا گھورنا بھی خاموش گالی ہے۔ باس بھی گالی کی اس بے آواز قسم سے واقف ہوتا ہے، لیکن وہ اس کو نظر انداز نہ کرے تو خاموشی کے صدا میں تبدیل ہونے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ بے الفاظ اور بے آواز گالیوں کی ایک طویل اور مضبوط زنجیر ہوتی ہے جس نے ہر فرد کو غیر محسوس طریقے سے جوڑ رکھا ہے۔ یہ زنجیر دکھائی نہیں دیتی لیکن اپنا وجود رکھتی ہے۔

دورِ جدید میں معاشیات کے اصول کے مطابق گالیوں کی افراط نے ان کی قدر گھٹا دی ہے۔ اب کوئی بھی گالی بمشکل گالی ہوتی ہے۔ تعلیم عام ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ گالیاں اب اخلاق کے پیمانے سے نہیں ناپی جاتیں۔ انسانی نفسیات اور ملکی حالات کے فن پر تولی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس ملک کی جمہوریت مشکوک ہے جہاں گالیاں دینے کی اجازت نہ ہو۔ حکومتوں کے ایوان نمائندگان میں بھی ایک ہی میٹنگ گالیوں سے خالی ہوتی ہے اور وہ ہے تعزیتی میٹنگ۔

[illegible] میں تیز رفتاری سے [illegible] ہوتی ہوئی دنیا [illegible] کے ساتھ ساتھ گالی کی تعریف و تاثیر بھی بدلتی جائے گی بہت جلد [illegible] جب [illegible] گالیوں میں [illegible] ۔ جلال۔

غالب ثانی

رمضان میں

مرحبا صلِّ علی رمضان میں
ہر بشر قبلہ نما رمضان میں

ٹوپی اب سر سے اُترتی ہی نہیں
ہے غضب کا ولولہ رمضان میں

کہتے ہیں حیّ سلامٌ یا اخی
یک بہ یک بدلی فضا رمضان میں

ہر زباں پر تو یہ تلّا رات دن
ہر شقی ہے پارسا رمضان میں

ہر طرح کی لو تپا ٹوپی رات دن
دم بہ دم یادِ خدا رمضان میں

اب تو داڑھی صاف بھی بار یش ہیں
بڑھ گیا ہے اِتّقا رمضان میں

نیم خوابی سے غشی آنکھوں میں ہے
روز قیلولہ کیا رمضان میں

آٹھ آنے میں چھوارا دستیاب
ہے گراں عربی غذا رمضان میں

صائم قائم ہیں چپ سادھے ہوئے
کم نظر ہیں سیخ پا رمضان میں

ہیں دہی کے بھی بڑے عمدہ غذا
جاں فزا ہے گلگلہ رمضان میں

کرتے ہی افطار اُٹھی ہر گوشے سے
تُو تُو میں میں کی صدا رمضان میں

صحن میں مسجد کے دنگل کا سماں
ہم نے دیکھا بارہا رمضان میں

ریفری کی طرح نکل کر کچھ بزرگ
فیصلہ دیتے ہیں چکا رمضان میں

کرکے شب بھر تو شبینہ یک شبی
صبح کھٹّا کھچڑی کھا رمضان میں

بعد میں باہر سے پھر آئے ہوئے
قُرّا کی محفل سجا رمضان میں

کیا کتابت کی ہے غالب روتے ہیں
غلطیاں اتنی بھی کیا رمضان میں

بابو آپ کے
(اچل پور شہر)

شکنتلا

آئیے ہم آپ کو اپنی شکنتلا کے چہرے بشرے حلیے سراپے کا کچا چٹھا بتا دیں۔ دُبلی پتلی نازک نازک چھوٹی موٹی سی بالا قد چال خراماں اٹھلاتی بل کھاتی یہ وقت بے وقت آتی جاتی اُردو شعراء کے روایتی محبوب کے تمام ناز و انداز ہماری شکنتلا میں بخوبی پائے جاتے ہیں۔ شکنتلا .... یہ کوئی نازنین ہے نہ مہ جبیں۔ یہ وہی شانتا رام کی شکنتلا ہے اور نہ ہی کالیداس کی یہ تو ہمارے تاریخی شہر اچل پور کی تاریخی ریل کا نام ہے۔ اور یہ نام ہمارے حلقے کے ممبر آف پارلیمنٹ سدام دیشمکھ نے اسے دیا ہے۔ یہ وہی سدام دیشمکھ ہیں جن پر گزشتہ دنوں ساجد رشید صاحب نے "پارلیمنٹ میں ایک فقیر" کے عنوان سے مضمون لکھا تھا۔ ہمارے علاقے میں کالیداس کی شکنتلا نے کم اور اس شکنتلا نے زیادہ شہرت پائی ہے۔ شکنتلا کی پیدائش سنہ ۱۹۲۳ء کی نیک ساعتوں میں ہوئی۔۔ اُس دن سے آج تک قسم لے لو جو اس کا کوئی پرزہ یا ایک آدھا اسکرو بھی بدلا گیا ہو۔ عرق النساء کے مریض کی طرح درد سے کراہتے ہوئے چار چھ ڈبّے، سن رسیدہ بزرگ کی طرح ہانپتا کانپتا تھکا تھکا سا انجن، مرگی کے مریض کی طرح بے سدھ پڑی خمی متی پٹریاں جب شکنتلا اسٹیشن سے ڈگ ڈگ کرتی نکلتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے ٹی بی کا کوئی مریض اسپتال سے ڈسچارج ہو کر نکلا ہو اور قدم جما کر چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ یہ سبک سبک کر تھرک تھرک کر یوں چلتی ہے جیسے کوئی منت اُتر رہی ہو۔ انجن کی چھک چھک پٹریوں کی کھٹ کھٹ اور ڈبوں سے نکلتی چرچوں کی آوازوں .... کے بیچ انجن کی سیٹی کو پہچاننا مسافروں کی سماعت کے لیے کڑا امتحان ہوتا ہے۔ ہماری شکنتلا کا میکا اچل پور سسرال مرتضیٰ پور ہے۔ اسے میکے سے سسرال اور سسرال سے میکے کے دن بھر میں دو چکر لگانے ہوتے ہیں۔ شکنتلا کا معدہ الیکٹرک اور ڈیزل کے بجائے کوئلے کو پسند کرتا ہے۔ برسات کے دنوں میں جب کوئلہ بھیگ جاتا ہے تب شکنتلا بھیگی بلی بن کر ٹانگیں اپڑے دو چار دن اسٹیشن پر اَن فٹ پڑی رہتی ہے۔ اُردو شعراء و ادباء کی طرح اس کا مزاج بھی بلغمی واقع ہوا ہے۔ چونکہ یہ خود کوئلہ خور ہے اس لیے اپنے مسافروں کو بھی کوئلہ کھلاتی ہے اپنے مسافروں کے ساتھ اس کا برتاؤ یکساں رہتا ہے سب کو ایک ہی رنگ میں رنگتی ہے خود بھی دھوئیں سے اَٹی سانولی سلونی بنی رہتی ہے اپنے مسافروں کو بھی کالا بناتی ہے اسی لیے شکنتلا کے مسافروں کے سفر کا اندازہ بجائے ٹکٹ کے مسافروں کے جسم اور کپڑوں پر جمی کالک سے بہ آسانی لگایا جاتا ہے۔ مسافر کا حلیہ دیکھ کر ہی ٹکٹ چیکر صاحب تاڑ لیتے ہیں کہ کس نے کتنا سفر کیا ہے۔ جس طرح شکنتلا کو تیز رفتاری سے چڑ ہے اُسی طرح اسکے مسافروں کو ٹکٹ لینے کی چڑ ہے۔

ملک کی دیگر ریلوں میں بلا ٹکٹ مسافر چوری چھپے چھپتے پھرتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ ہماری شکنتلا کے چیکر صاحب، بلا ٹکٹ مسافروں سے بذاتِ خود نظر چراتے ہیں۔ شکنتلا میں عرس میلہ اور شادی بیاہ کے بھیڑ بھڑکے دنوں میں ٹکٹوں کی جگہ چٹھیاں بھی چلا لی جاتی ہیں اور کبھی کبھی تو سرکشی بھی رواج پاتی ہے۔ [illegible] کے دنوں میں اس کی چھت بالکونی کا کام کرنے لگتی ہے

کھڑکیاں دروازوں میں اور دروازے جھولوں میں بدل جایا کرتے ہیں اکثر مسافر تو انجن کیبن میں گھس کر فائر مین کو ASSIST کرتے ہیں اور کچھ ڈرائیونگ میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ شکنتلا کا سارا عملہ اپنا کام اس انداز میں کرتا ہے گویا بیگار کی تابعداری کی جا رہی ہو۔ اگر شکنتلا سے ڈرائیور اور ٹکٹ چیکر کو بڑے روٹ کی ٹرین میں باعزت مسافر کے طور پر سوار کرا دیا جائے تو ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ دونوں بالترتیب کوئلہ چرانے اور بلا ٹکٹ سفر کرنے کے جرم میں دھر لیے جائیں۔ ایک مرتبہ ہماری بھی شامت آئی تو ہم اچل پور سے مرتضیٰ پور تک شکنتلا کے ساتھ سفر کرنے کا ارادہ کر بیٹھے اور ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ اسٹیشن پر شکنتلا محو استراحت تھی۔ ڈرائیور، میکینک، فائرمین، سگنل مین سب کے سب اس کی نوک پلک درست کرنے میں دیوانہ وار بھڑے ہوئے تھے۔ ہر کوئی اسکے اندر باہر دائیں بائیں اوپر نیچے اوزار ہتھوڑے ہاتھ میں لیے گھوم رہا تھا۔ ہم DEPARTURE کے متعلق جاننے کے لیے اسٹیشن ماسٹر کے پاس گئے وہ ٹیبل پر رکھی ریزگاری گننے میں کھوئے ہوئے تھے ہمیں دیکھ کر وہ کچھ سٹپٹائے کہ ہم شکنتلا کے متعلق دریافت تو نہیں کر رہے! وہ ہمیں نظر انداز کر کے چلائے .... ارے او چھوکو کے بچے یوں ہی بیٹھا بیڑیاں پھونکتا رہے گا یا ڈیوٹی بھی کرے گا شام ہونے کو آئی، جا مٹی کا تیل لا۔ قندیلوں کے چھکے صاف کر، ان میں تیل بھر کیا آج بھی اندھیرے میں مسافروں کو ٹھوکریں اور مجھے گالیاں کھلوائے گا۔" اتنی دیر میں چھوکو مٹی کے تیل کا ڈبہ ہاتھوں میں تھامے کھڑا تھا۔ چلّر پیسے چھوکو دیتے ہوئے اسٹیشن ماسٹر بولے جا جلدی اور اندھیرا ہونے سے پہلے لوٹ آ۔ کل بھی اندھیرے میں کیا کیا نہیں ہوا! آفس سمجھ کر میں شوچالیہ میں چلا گیا اور وہاں اپنا ٹیبل کھوجتا رہا ادھر مسافر شوچالیہ سمجھ کر میرے آفس میں گھس آئے۔ اندھیرے میں بیچارے مسافروں کی جیبیں بھی کٹیں کتنا دھول دھپّہ ہوا جیب کتر صاحب کی کتنی دھلائی ہوئی بیچارے نے لاکھ قسمیں کھائیں تب کہیں مسافروں نے چھوڑا آج اندھیرے میں کیا میری بوٹیاں نچوائے گا؟ چھوکو بیڑی کا دم مار کے بولا" جاؤ استاد جاؤ کسی اور کو بنانا مجھے سب پتہ ہے قندیلیں کون بجھاتا ہے، جیبیں کون کاٹتا ہے دھلائی کس کی ہوتی ہے اور اکاؤنٹ کس کا بڑھتا ہے" اسٹیشن ماسٹر اپنا اکاؤنٹ سمیٹ کر ڈیلے نکالتے ہوئے دوڑے ہی تھے کہ بیچارہ چھوکو وہاں سے نکل بھاگا۔

اگر آپ اسٹیشن ماسٹر سے دریافت کریں کہ شکنتلا مرتضیٰ پور میں بمبئی جانے والی ہاوڑہ۔ گیتانجلی یا سویرے سے وقت ملائے گی تو وہ بیچارے بغلیں جھانکنے لگیں گے اور مسافر کی حالت پر رحم کھا کر خاموش رہیں گے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ شکنتلا اپنے مسافر کو بڑی ٹرین سے CONNECT کرنے کی بجائے DISCONNECT کرتی ہے دوسرے شکنتلا مرتضیٰ پور پہنچنے کی پابند بھی نہیں وہ تو کبھی بھی اور کہیں بھی طبیعت خراب ہونے SICK MEMO دے سکتی ہے اسی لیے شکنتلا کے مسافر اس مصرعہ ؏
"چلنے کی تمنا تھی پہنچنے کی نہیں تھی" کو ذہن میں رکھ کر سفر کرتے ہیں اسکی رفتار میں غضب کا رکھ رکھاؤ بلکہ ٹھہراؤ ہوتا ہے اسی لیے کبھی کبھی اچل پور سے مرتضیٰ پور گھنٹوں کا سفر دنوں میں بدل جاتا ہے۔ دوسرے مقام پر اسکے ذریعے بھیجے گئے انگور کشمش میں اور آم کی کیری اچار میں بدل جاتی ہے۔ منگنی میں جانے والے مسافر کو شادی ہاتھ لگتی ہے اور سیریس مریض کو دیکھنے جائیں تو میت اٹھا کر لوگ گھر لوٹتے ہوئے ملتے ہیں۔ یہ اپنی دھیمی رفتار سے مسافروں کو فائدہ اور ریلوے لائن پر بسنے والوں کو نقصان پہنچاتی ہے جیسے شکنتلا سے اگر فصل بھی کاٹی جا سکتی ہے اور بھینس کا دودھ نکال کر آسانی سے شکنتلا میں سوار ہو سکتے ہیں۔ روڈ کراسنگ پر پھاٹک روڈ والوں کی حفاظت کی جگہ خود اس کی حفاظت کے لیے لگے ہیں کیونکہ شکنتلا کے لٹے پٹے وجود کو معمولی ٹھیس بھی کئی دن تک بستر علالت پہ ڈال سکتی ہے۔

سبھی ریلوں کی طرح زنجیر کا نظام تو شکنتلا میں بھی ہے لیکن ریل کو چلانے اور دوڑانے کے لیے عقیدت سے مرادیں مانگی جاتی ہیں اس لیے تو زنجیر کھینچ کر روکنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ ریلوں کی تاریخ میں شاید شکنتلا ہی وہ واحد ریل ہوگی جس میں شاید ہی

کبھی زنجیر کا استعمال ہوا ہو۔ اسی خوبی کے باعث "گینز بک آف ورلڈ ریکارڈز" میں شکنتلا کا نام درج کروایا جا سکتا ہے۔ ناانصافی ہوگی اگر ہم شکنتلا کی ادب نوازی کا ذکر نہ کریں ہم تک اُردو اخبارات اسی کے ذریعے پہنچتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ برسات کے دنوں میں اخبار چار چار چھ چھ دن تاخیر سے ملتے ہیں جس سے اخبار کی تازہ خبریں تاریخ کا حصّہ بن جاتی ہیں۔ اسی لیے "اُردو ٹائمز" اور "انقلاب" کی خبریں ہم تاریخ سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ مرتضیٰ پور سے اچل پور آنے والے سیلانیوں کو ہم دعوت دیتے ہیں کہ جب کبھی وہ ہمارے تاریخی شہر اچل پور آئیں تو وہ اپنے سفر کو تاریخی بنانے کے لیے ہماری تاریخی ٹرین شکنتلا کو نہ بھولیں۔ اور اپنے ساتھ کھانے پینے کی اشیاء ضرور رکھیں۔

ہم اپنے مضمون کے اختتام پر سوچنے لگے ہیں کہ کاش ہماری جگہ یوسف ناظم صاحب شکنتلا سے سفر کرتے اور مضمون لکھتے تو لطف آتا۔ بھلے ہی سفر کا حق غضب ہوتا لیکن مضمون کا حق یقیناً ادا ہو جاتا۔

ظہیر قدسی (بلے گاؤں)

ادبِ حاضر

بنامِ ادب کرکے چندہ اکٹھا — قیامِ ادب کرنا محفل سجانا
ادب میں ترقّی کی ہے شرطِ اوّل — تمھیں میں بلاؤں، مجھے تم بلانا

○

اردو میں کہتے ہیں جنھیں شاعر و شاعرات — ہندی میں ہوتے ہیں وہ کوی اور کویتری
محفل سجے جو شعرا کی ہو گا مشاعرہ — ہوں صرف شاعرات تو ہو گی مشاعری

حالاتِ حاضرہ

جہاں بگڑا ہو نا اورن اس جگہ پر — حکومت کرے جھٹ روانہ کمیشن
یہی طرزِ جمہوریت اب ہے باقی — بٹھانا کمیشن یا کھانا کمیشن

○

گرانی اور تشدّد کی وجہ سے — بچاری جنتا مرتی جا رہی ہے
یہ سارے مسئلوں کا کوئی ساحل — حکومت غور ابھی فرما رہی ہے

○

ریزرویشن کے جھگڑے بابری مسجد کے قضیے — کریں گے کس طرح حل ہم بھی جب دیکھنے نکلے
سیاسی پنڈتوں کی حرکتوں سے یہ ہوا ظاہر — لگا کر آگ خود ہی اپنی روٹی سینکنے نکلے

غزل

یار بولا مجھ سے فوراً ڈال، میں بولا بچشم — جس قدر بھی جیب میں ہو مال، میں بولا بچشم
بولا سارے نوجواں بنتے ہیں مجنوں عشق میں — پر تو بننا نامور قوّال، میں بولا بچشم
بولا سارے شہر میں دن رات یہ کہتے پھرو — سوہنی کا باپ تھا مہیوال، میں بولا بچشم
بولا آنا چاہیے میرے لیے شعباں کے بعد — ماہِ رمضاں کی جگہ شوّال، میں بولا بچشم
بولا شادی پھر تو آنا چاہیے دو چار دن — ریڈیو سے آنکھوں دیکھا حال، میں بولا بچشم

بولا بس ننھیال سے قیسی رہے گا رابطہ
میرے بچّوں کا نہ ہو ددھیال، میں بولا بچشم

قیسی قمر نگری

انیس سلطانہ
(بھوپال)

شجرکاری

کالج کیمپس میں بڑا ہنگامہ تھا۔ خاموش ہنگامہ۔ مہمانِ خصوصی کو خوش آمدید کہنے کے لیے قطار میں دو طرفہ اساتذہ گرامی کھڑے ہوئے تھے۔ این سی سی کی طالبات بڑی مستعدی سے گارڈ آف آنر کے لیے موجود تھیں۔ پندرہ اگست کا دن تھا۔ اگر یہ پروگرام نہ ہوتا تو مزہ سے لال قلعہ کا پروگرام گھر بیٹھے دیکھتے۔ مگر آج این۔ ایس۔ ایس کی جانب سے شجرکاری کا پروگرام رکھا گیا تھا۔

ہمارا کالج سنا ہے کبھی بڑا خوبصورت تھا۔ اب بھی حسنِ خداداد میں کمی نہیں۔ ... جھیل کے جھلمل کرتے پانی میں عکس ڈالتا ہوا، یوں لگتا ہے جیسے کھلی ہوئی چاندنی میں کسی نے زمرد ڈال دیا ہو۔ بھانت بھانت کے درختوں نے یہاں کچھ عجیب ہی کیفیت پیدا کردی ہے۔ آم، امرود، کمرک اور یوکلپٹس (پتہ نہیں یہ بھی اندھے اپنوں میں بانٹتے ہیں کہ نہیں!) بلکہ بے شمار بیر کے درخت جسے قومی پھل ہونے کا فخر حاصل ہے۔ وغیرہ وغیرہ سے مالا مال ہمارا صحنِ گل و لالہ میر حسن کی مثنوی کی یاد دلاتا ہے۔

گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا ؂ اسی اپنے عالم میں منہ چومنا

اور ع قرینے سے اک سمت ہیب دہی

نتیجہ اس افراطِ شجر کا یہ ہے کہ کالج کا منظر بے شک جنت نظیر ہے لیکن کھیلنے کا میدان ناپید۔ بارش گزرتے گزرتے چار ماہ گزر جاتے ہیں۔ دوسرے کالجوں میں جہاں پڑھائی ہو یا نہ ہو کھیل کود کے روشن امکانات نظر آتے ہیں۔ ہمارے یہاں دل کے خوش کرنے کو مرزا غالب کی وہی جنت دکھائی دیتی ہے جسے لے کر بھی انکار کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ایسی جنت کو کیا کرے کوئی ــــ!!

بارش رکنے پر پہلے گھاس کاٹی جاتی ہے پھر زمین سوکھنے کا انتظار رہتا ہے۔ گھاس کاٹنے کی اجرت، اسے بیچ کر چکائی جاتی ہے۔ پھر تماشائیوں کا انتظام کیا جاتا ہے:

دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

عرصہ تک زمین سراپا انتظار بنی رہتی ہے۔ جیسے ہی کھلاڑی میدان میں اترتے ہیں، ان کے قدم پھسلتے ہیں۔ بھاگیں تو کیا اور دوڑیں تو کیونکر۔ گیند ہر حال میں سر کے بل نیچے گرتی ہے۔ اس سے پہلے کہ کھلاڑیوں کو میدان کی تھیوری کا ثبوت دینے کے لیے زمین پر گرنا پڑتا ہے۔ اور اس یقین کے ساتھ گرتے ہیں کہ:

گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں

اس کر نے یہ یاد دلایا کہ شجر کاری کا پروگرام تو عین وقت کی ضرورت ہے (آج کی اصطلاح میں) درختوں کی بازآبادکاری بھی کہہ سکتے ہیں۔

صدیوں پہلے لگائے گئے یہ درخت کسی کی خوش ذوقی اور عہد حاضر کی بد ذوقی کا ماتم کرتے ہوئے ایک کے بعد ایک شہید ہو جاتے ہیں۔

تھے اپنی آبلہ پائی سے بے خبر کتنے
پڑے ہیں دور تک اکھڑے ہوئے شجر کتنے

کسی نے نظر بھر کے دیکھا، آموں سے لدا ہوا شاندار درخت نیچے آ رہا۔ کوئی اس لیے قدموں میں لوٹ گیا کہ عرصے سے کسی نے جی بھر کے نہ دیکھا تھا۔ کوئی یوں گرا کہ اپنی جگہ کسی توانا ترپودے کو پھلتا پھولتا دیکھے۔

بعض حالتوں میں جڑ سے اکھڑنے کے بعد بھی یہ درخت سالوں سرسبز رہتے اور زمین پر پریشان لب بے نیازی سے پڑے پڑے پھلتے پھولتے رہتے ہیں۔

مگر جس تیزی سے آج کل یہ درخت گر رہے تھے۔ ایسے تو کبھی نہ گرے تھے۔ کیا ان کی ناگہانی موت پر بھی کوئی معاوضہ دیا جا سکتا ہے ؟؟

انھوں نے بھی اپنی بقا کے لیے بڑی کوشش کی ہے۔ برسوں تر و تازہ ہوائیں بکھیرتے رہے اور ایک رات فضائی آلودگی کی سمیت کا شکار ہو گئے۔

تب سے آج تک ..... لگاتار اپنی جگہ خالی کرتے جا رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پودے تو کب کے کھڑے کے کھڑے سوکھ گئے۔ لیکن یہ جو صحن چمن کی آبرو تھے، جن کے سایہ میں کتنے ہی قہقہے گونجے تھے، جو رنگین آنچلوں کی رنگا رنگی سے جھوم جھوم اٹھتے تھے، آج اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے۔

اور ہم لوگ خوش تھے۔ کہ سرکاری سطح پر بھی اب ان کی جگہ پھر سے آباد ہو جائے گی۔ یہ وہ شہری ہیں جن کے نام نہ پہلے الاٹ ہوئے نہ قبضہ ناجائز کی پاداش میں انھیں اپنی جگہ چھوڑنی پڑی مگر کمال بردباری سے یہ اپنی جگہ چھوڑتے جا رہے ہیں۔ ہجرت کرنا ان کا مقدر نہیں، یہ فساد ہوا کا شکار ہو گئے ہیں۔ اور ایک کے بعد ایک زمین کی گرفت سے آزاد ہوتے جا رہے ہیں۔

کل شام جھوم جھوم کے برسات ہوئی تھی۔ تیز ہواؤں نے پھر کچھ درخت اکھاڑ دیئے تھے۔ مگر یہ درخت فوراً ہٹا دئے گئے۔ اوّل تو انھوں نے برہم زدہ طلبا، کی طرح چکا جام کر رکھا تھا اور پھر آج تو منسٹر صاحب آنے والے تھے۔ منسٹر صاحب پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ باقی سب خیریت ہے۔ صفائی کا مکار اپنے سے دوگنی تعداد کے ساتھ جٹے ہوئے تھے۔

مگر نیدرہ اگست تو پچھلے سال بھی آئی تھی۔ پچھلے سال بھی اسی طرح شجرکاری کی گئی تھی۔ اسی طرح بزم جم میں ہم لوگوں نے پودے کے لگائے جانے پر تالیاں بجائی تھیں۔

(البتہ اس سال بارش کچھ زیادہ ہوئی ہے) کوئی پچاس نئے پودے پچھلے سال بھی لگائے گئے تھے۔ سارے پودے مرجھا چکے تھے۔ خالی کٹہرے نئے پودوں کا انتظار کر رہے تھے۔ البتہ ایک پودا سرسبز تھا پر انے بری بچھا رہے بھاڑ کرنے سے پہلے ہی کاٹ دیئے گئے تھے اور پچھلے سال کے پودوں میں سے صرف بیر کا ایک پودا پنپ سکا تھا۔ اپنا تو ہی پھل۔ عوام کی پسند ہ ہ

موصول ہوتے۔ میرے دوسرے دوستوں اور جاننے والوں نے بھی شگوفہ کو بہت پسند کیا ہے۔

امجد حسین
محی الملک ہال علی گڈھ

ادھر آپ کے پے بہ پے واقعات سے دو چار رہے، جہاں آپ کی تقسیس کے اجرا پر خوشی ہوا وہاں بوگس حیدرآبادی کی اچانک موت نے وہ دکھ دیا کہ .... بس۔

بوگس کی آدھی غزل کی برجستگی اور ادائیگی کی بازگشت گونجتی رہے گی۔ خدا موصوف کو جنت المقام کرے آمین ؟
قمر الزماں کی کتاب بےساختہ کی رسم اجرا کے موقع پر میں نے بوگس حیدرآبادی کے حوالے سے ان ہی کے طور طریقے پر اپنی غزل پڑھی ہے جسے سامعین نے دہرا کر موصوف کی یاد تازہ ہو گئی۔ اس طرف شگوفہ خوب شگوفے چھوڑ رہا ہے۔ خاص کر محترم حفیظ بنارسی کی موجودگی مزاحیہ ادب کے لیے صحت بخش ہے۔ نثری مضامین تو پہلے سے ہی خوب ہیں شعری کلام کا انتخاب آج کل مرغوب ہے۔

صابر بہاری، رانچی

شگوفہ کا تازہ شمارہ فیاض فیضی کے گوشے کے ساتھ خوب ہے۔ یہ سلسلہ جاری رکھیے اور یوسف ناظم پر کوئی گوشہ شائع کیجیے۔

تقی الدین، لکھنو

طنز و مزاح پر سمینار اور مشاعرہ۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کی مساعی

مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کی بورڈ میٹنگ مورخہ ۱۱ر نومبر ۹۱ء میں اس مرتبہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ ۲۵ر اور ۲۶ر جنوری ۹۲ء کو بمبئی میں دو روزہ کل ہند طنز و مزاح سیمینار اور مزاحیہ مشاعرہ منعقد کیا جائے۔

طنز و مزاح سیمینار جو دو نشستوں پر مشتمل ہوگا، جس میں ہندوستان میں آزادی کے بعد طنزیہ و مزاحیہ ادب پر سیر حاصل مقالے پڑھے جائیں گے۔

اس سیمینار میں شمیم حنفی دہلی، ڈاکٹر لطف الرحمن بھاگلپور، ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، علی گڑھ، ڈاکٹر مصطفی کمال حیدرآباد کو شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے۔

سیمینار کی ان دو نشستوں میں تنقیدی مقالات کے علاوہ طنزیہ مزاحیہ مضامین اور انشائیے بھی پڑھے جائیں گے۔ اس سلسلے میں ملک کے مشہور و معروف مزاح نگاروں کو دعوت دی جارہی ہے، جن میں یوسف ناظم بمبئی، مجتبی حسین دہلی، سلمی صدیقی بمبئی، شفیقہ فرحت بھوپال، مسیح انجم حیدرآباد، پرویز یداللہ مہدی بمبئی، شکیل اعجاز اکولہ اور علیمہ فردوس بنگلور شامل ہیں۔

کل ہند مزاحیہ مشاعرہ کا انعقاد یوم جمہوریہ کی شب متوقع ہے، اس میں شرکت کے لیے ہلال سیوہاروی، ساغر خیامی، آفتاب لکھنوی، عنایت اللہ، مصطفی علی بیگ، طالب خوندمیری، اسمٰعیل ظریف، پاپولر میرٹھی، مقرب حسین مقرب، پاگل عادل آبادی، اشرف خوندمیری، مفلس تاروفی، ستیل کمار ننگ، مختار یوسفی، ظہیر قدسی، سارس لکھنوی، خواہ مخواہ حیدرآبادی، انور مدہ بھونگیری، فیاض افسوس، بساط حیدرآبادی، وغیرہ کو دعوت نامے بھیجے جا رہے ہیں۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اکیڈیمی کی جانب سے بمبئی میں پہلی بار ایک اتنے بڑے پیمانے پر طنز و مزاح کے موضوع پر سیمینار اور مشاعرہ کا انعقاد کیا جارہا ہے۔ اردو زبان و ادب کے لیے یقیناً ایک خوش آئند قدم ہے۔

انصاری رفیع احمد (مالیگاؤں)

ایامِ الکشن

الکشن کے جلد ہی ایام آئے ہر اک لیڈر نے جال اپنے بچھائے
سنا لوگوں نے ہر لیڈر کا بھاشن حسین وعدوں کی بارش میں نہائے
سبھی کو ووٹ دیں گے نوٹ لے کر بلا سے ووٹ گر باطل ہی جائے
مچی جلسے میں بھگدڑ سی اچانک کہیں سے آگئی تھی ایک گائے
الکشن میں اسی کی جیت ہوگی پلائے گا جو ہر ووٹر کو چائے
تھا لیلیٰ کا دِوانہ صرف مجنوں دِوانے کرسی کے کتنے ہیں ہائے
شرافت ہوگئی تھی پانی پانی نئی نسلوں نے وہ نعرے لگائے
فریب و مکر، غیبت اور تہمت یہی سیکھنے لیے جلسوں سے آئے

سیاست ہے رفیع ایسی تجارت
کروڑوں پاتے جو لاکھوں لگائے

غزل

بدلیں گے کب یہ موسمی حالات کیا پتہ اس سال گرمیوں میں ہو برسات کیا پتہ
شعرا گلی گلی ہیں سنتی ہیں جابجا سنتا ہے کون آج کے نغمات کیا پتہ
بھائی کے بیٹے بہن کی بیٹی چچا کی ساس میکے سے کب وہ لائیں یہ آفات کیا پتہ
کرسی جو مل گئی تو وزارت کبھی ملے پلتے ہوں اس کے دل میں یہ جذبات کیا پتہ
باہر سے جو بھی مل گیا پرچے میں لکھ دیا کتنے ملیں گے ہم کو نشانات کیا پتہ
راہِ ادب میں کیجے ٹریفک پہ کنٹرول ٹکرائیں کب کسی سے خیالات کیا پتہ
چھپوا لیے غزل کسی استاد کی جو ہم ہو جاتے ان سے کل ہی ملاقات کیا پتہ

پرواز لکھ رہے ہیں جو خونِ جگر سے ہم
یہ شاعری بھی ہے کہ خرافات کیا پتہ

تمیز پرواز
(عادل آباد)

No. 16622/69 SHUGOOFA Postal Regd. No- H/HD.8
. 24 Copy 11 HYDERABAD-1 November '91 Phone : 567716

اور معاشرے کی خامیوں اور کوتاہیوں پر گہرا طنز کرتے ہیں لیکن ان کا طنز کنھیا لال کپور اور فکر تونسوی کی طرح جھنجھلاہٹ اور احساس بے بسی کا شکار نہیں ہے کیوں کہ انہیں اپنے طنز کے ہتھیار کی نتیجہ خیزی اور اثر انگیزی کا خوب اندازہ ہے۔ اسی لیے اُن کا طنز باوجود تیکھا اور دوٹوک ہونے کے انتہائی سلجھا ہوا اور نوک پلک سے سنوارا ہوا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کے موضوعات وہی ہیں جن سے ایک عام آدمی کو روزمرہ زندگی میں سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ اُن کی توجہ کا مرکز وہی مسائل ہیں جن سے معاشرتی زندگی میں ہم سب دوچار رہتے اور نبرد آزما رہتے ہیں۔ ان کے موضوعات نہ تو آفاقی ہیں اور نہ ہی ماورائے حقیقت بلکہ عوامی ہیں اور منجملہ صداقت بھی یہی سبب ہے کہ ایک عام قاری اُن کی تحریروں کے آئینے میں اپنی ذاتی اور انفرادی خامیوں کے ساتھ عمومی اور اجتماعی خامیوں کا عکس بھی دیکھتا ہے۔ سماج کی قباحتوں اور زمانے کی بے ڈھب چال کے تعلق سے اُن کا رویّہ نہ تو انتہا پسندانہ ہے اور نہ ہی تغافل عارفانہ پر مبنی بلکہ وہ بڑی ہی سبک روی اور چابک دستی کے ساتھ جادۂ اعتدال پر گامزن نظر آتے ہیں۔ اُن کے طنز کی تلخی و جراحت مزاح کی شیرینی و راحت لیے ہوتی ہے اسی لیے قاری گالیاں کھا کے بے مزہ نہیں ہوتا۔

مشتاق احمد یوسفی نے اپنی کتاب "چراغ تلے" کے دیباچہ میں لکھا ہے "سادہ و پرکار طنز ہے بڑی جان جوکھوں کا کام بڑے بڑوں کے جی چھوٹ جاتے ہیں۔ اچھے طنز نگار تنے ہوئے رسّے پر اترا اترا کر کرتب نہیں دکھاتے بلکہ۔

ع رقص یہ لوگ کیا کرتے ہیں تلواروں پر"

فن کی اس کسوٹی پر جب ہم یوسفی صاحب کی تحریروں کو پرکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے معجزہ فن کی خون جگر سے پرورش کی ہے۔ چنانچہ اُن کے یہاں ہمیں بڑی کاوش و جستجو اور دیدہ ریزی و ژرف نگاہی ملتی ہے۔ اُن کی باریک بیں نگاہیں اور حساس طبیعت عام واقعات سے طنز و مزاح کے پہلو کھوج کھوج کر نکالتی ہے۔ اور وہ بڑے ہی مربوط اور مسلسل انداز میں طنز کے نشتر سے ان کا پوسٹ مارٹم کرتے چلے جاتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی کا طنز ان کے گہرے سماجی شعور وسیع مطالعے اور پختہ بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں زمانے کے اتار چڑھاؤ سیرت انسانی اور اس کی جزئیات کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ ماڈرن آرٹ سے لیکر طب و حکمت تک اور کافی سے لیکر کرکٹ تک کوئی موضوع اُن کے نشتر کی جراحت سے نہیں بچ سکا ہے۔ پڑوسی، کرایہ دار، مالک مکان، باورچی، فیشن، سیاست، تاریخ حتیٰ کہ کتابوں کا مقدمہ لکھنے والوں کو تک انہوں نے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اور اس سلسلے میں بعض قد آور شخصیتوں جیسے مولانا ابوالکلام آزاد، حالی، شبلی، مہدی افادی، جوش اور اختر شیرانی وغیرہ کو بھی نہیں بخشا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کے مزاح میں سطحیت یا بازاریت نہیں بلکہ شائستگی اور متانت کے ساتھ ظرافت ہے، وہ واقعات اور اسلوب کی بے ساختگی سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ اُن کا لہجہ بڑا شگفتہ اور تر و تازہ اور الفاظ برجستہ اور بے ساختہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں کہیں بھی تصنع یا آورد محسوس نہیں ہوتی بلکہ ایسا لگتا ہے کہ ایک سوتا ہے جو اپنی فطری رفتار سے ابل رہا ہے۔ ان کی تحریر بھرتی کے فقروں اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے قاری کی توجہ بھٹکنے نہیں پاتی۔

مشتاق احمد یوسفی صرف ہنسنے ہنسانے اور مزید اسامیں بنانے کے قائل نہیں بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ بات ہی بات میں کام کی بات بھی کہی جا سکتی ہے۔ اور ایک غیر محسوس طریقے سے قاری تک کوئی پیام پہنچایا جا سکتا ہے چنانچہ ان کی

تحریر میں پرلطف فقروں اور چٹپٹی باتوں کے بیچ مقصدی اور معنی خیز کلمات بھی جگہ پاتے ہیں جو بسا اوقات انتہائی سنجیدہ اور فلسفیانہ قسم کی بحث و استدلال پر مشتمل ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ انھوں نے ایسے افراد کا جائزہ لیا ہے جو حال کی بجائے ماضی میں جیتے ہیں۔ اور ہر وقت اپنے شاندار ماضی کی مرثیہ خوانی میں ہمہ ذہن مصروف رہتے ہیں۔ اپنی تاریخ کا شعور و آگہی حال میں آگے بڑھنے کے لیے یقیناً ضروری ہے لیکن تاریخ کی شمع علم و تجربہ کی روشنی پھیلانے کے لیے روشن کی جانی چاہیے نہ کہ پروانے کی طرح اس کے گرد طواف کرتے کرتے مٹ جانے کے لیے رکھتے ہیں " قدیم داستانوں میں بار بار ایسے صحرا کا ذکر آتا ہے جہاں آدمی پیچھے مڑ کر دیکھ لے تو پتھر ہو جاتا ہے یہ صحرا ہمارے اپنے من کے اندر ہے باہر نہیں ۔۔۔۔۔۔ اپنے ماضی سے شیفتگی رکھنے والوں کی مثال ایک ایسی مخلوق کی سی ہے جس کی آنکھیں گدی کے پیچھے لگی ہوئی ہوں۔ چھان بین کیجیے تو بات بات پر مایا کا یا لیکہ اور یادش بخیر کی ہانک لگانے والے وہی نکلیں گے جن کا کوئی مستقبل نہیں " (یادش بخیر یا) ۔

ان جملوں میں مشتاق احمد یوسفی نے نہایت سادہ اور آسان پیرائے میں ماضی کی یاد میں گم رہنے اور حال و مستقبل کے تقاضوں سے بیگانگی و اجنبیت برتنے والوں کا تجزیہ کیا ہے صرف یہی نہیں کہ انھوں نے ایک سنجیدہ و گمبھیر مسئلہ کی نشاندہی کی ہے بلکہ اس کا تدارک بھی بتایا ہے۔ جو کہ طنز و مزاح نگاری کے مزاج اور روایت کے برعکس ہے ۔ کیوں کہ طنز و مزاح نگار کا کام صرف سماج کی خامیوں کوتاہیوں پر نشتر چلانا اور اس کے کیڑے نکالنا یا پیرہنسا ہوتا ہے ۔ مسائل کا حل تلاش کرنا اس کے فرائض میں داخل نہیں کیوں کہ وہ کوئی مصلح یا لیڈر نہیں ہوتا ہے ۔ لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے یوسفی صاحب طنز و مزاح برائے لطف و مزہ کے قائل نہیں بلکہ ان کا طنز و مزاح تفنن طبع کے ساتھ ساتھ تعمیر و اصلاح اور مقصدیت اور افادیت کا بھی حامل ہے۔ ان کا اسلوب مسائل کو اتنی شدت سے اجاگر کرتا ہے کہ قاری خود جو نکنے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ بسا اوقات خود ہی مسائل کا حل بھی بیان کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ماضی پرستی جس کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی مرض ہے جو اقوام و ملل کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا جاتا ہے ۔ اس کے استیصال کے لیے انھوں نے علاج بھی تجویز کیا ہے ۔ کہتے ہیں ۔

" مشرق نے کبھی پل کے روپ سروپ سے پیار کرنا نہیں سیکھا ۔ جینا ہے تو پھیلتے سرسراتے لمحے کو دانتوں سے پکڑ لو ۔ گذرتے لمحے کو بے جھجک چھاتی سے لگا لو ۔ اس کی نس نس میں ماضی کا نیم گرم خون دوڑ رہا ہے اسی کی جیتی جاگتی کوکھ سے مستقبل جنم لے گا اور اپنی چھنچھل دکھا کر اسی کی طرف لوٹے گا "

اسی طرح وہ باتوں ہی باتوں میں بڑے معنی خیز اور ذہانت بھرے جملے کہہ جاتے ہیں ۔ مثلاً ۔

" انصاف کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ننانوے فیصدی لوگ ایک دوسرے کو مشورہ کے علاوہ اور دے بھی کیا سکتے ہیں " (پڑھیے گر بیمار) " ہم اپنی اصل رائے کا اظہار صرف نشہ اور غصے کے عالم میں کرتے ہیں " " افیم کھانے کے بعد ہم نے کسی کو افیم کی برائی کرتے نہیں دیکھا ۔ برائی کرنا تو بڑی بات ہے ۔ ہم نے کچھ بھی کرتے نہیں دیکھا "
(کرکٹ)

مشتاق احمد یوسفی کے ہاں طنز و مزاح نگاری کے چند مخصوص حربے اور techniques ملتے ہیں ۔ مثلاً اشعار کا برجستہ و برمحل استعمال ، مشہور و معروف مصرعوں اور اشعار کی پیروڈی جیسے :

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ گھر جائیں گے
گھر میں بھی چین نہ آیا تو کدھر جائیں گے (تم نے پی ہی نہیں)

ع

علالت بے عیادت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی (بیٹھیے گرمیاں)

ہم سر حرفی الفاظ کا استعمال بھی ان کا ایک اہم ہتھیار ہے جیسے:

"میں ماکولات میں معقولات کا دخل جائز نہیں سمجھتا" (تو نے پی ہی نہیں)

"بچپن سے میری صحت خراب اور صحبت اچھی رہی" (تو نے پی ہی نہیں)

مزاح نگاری کے لیے وہ حسن تعلیل سے بھی کام لیتے ہیں۔ مثلاً:

"ہر ایک کافی ہونہار خاندان کا ایک مخصوص نسخہ ہوتا ہے جو سینہ بہ سینہ حلق بہ حلق منتقل ہوتا ہے" (تو نے پی ہی نہیں)

عام محاوروں اور مروجہ تراکیب کی برجستہ تجنیس سے مزاح کی تخلیق مشتاق کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے مثلاً:

"اس کے بعد وہ مجھے تشخیص ناک نظروں سے گھورنے لگتے ہیں"

"اور جہانگیر نے اس کو (نور جہاں کو) پہلی بار خصم گیں نگاہوں سے دیکھا"

"اور اس تنکم بالائے تنکم پر ملاحظہ ہو وہ ایک دہن کہ بظاہر دہانے سے کم نہیں"

"ایک وہ غذا رسیدہ بزرگ جو کھانے سے علاج کرتے ہیں"

مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں میں کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ جدید ادب کا تیکھا پن بھی پایا جاتا ہے پاکستان کی علاقائی زبانوں کی تازگی نے ان کے فکر و فن اور اسلوب نگارش کو توانائی اور نکھار بخشا ہے۔ انھوں نے زندگی کو جس زاویے سے دیکھا اور برتا ہے اس سے ان کے فن اور تفنن میں شائستگی شگفتگی نشاط کا راور آگہی کا جلال پیدا ہوا ہے۔ ان کے اسلوب اور مزاح کی کاٹ میں طنز و تبسم کی موجوں میں زیریں لہروں کی طرح بصیرت۔ بلند حوصلگی اور متانت کار فرما نظر آتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کے فن اور مہارت کی تحسین کرتے ہوئے مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں "یوسفی کا قلم جس چیز کو چھوتا ہے، اس میں نئی روئیدگی اور تازہ بالیدگی پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی کوئی سطر یا لفظی ترکیب ایسی نہیں ہوتی جو پڑھنے والے کی فکر و نظر کو نئی روشنی نہ دے جاتی ہو۔ یوسفی ایک ظرافت نگار کی حیثیت سے ایک نیا دبستان ہیں" ممتاز مزاح نگار ابن انشا جن کے کمال فن کا اعتراف خود مشتاق احمد یوسفی نے کیا ہے لکھتے ہیں۔

"اگر مزاحیہ ادب کے موجودہ دور کو ہم کسی نام سے منسوب کر سکتے ہیں تو وہ یوسفی ہی کا نام ہے" یہی بات ڈاکٹر ظہیر فتح پوری نے بھی کہی ہے "ہم اردو مزاح کے عہد یوسفی میں جی رہے ہیں"

مشتاق احمد یوسفی کے فن کے بارے میں ڈاکٹر اسلم فرخی کی رائے یہ ہے کہ "اردو طنز و مزاح میں ایک ایسی نئی اور بھرپور آواز کا اضافہ ہوا ہے جو الگ سے پہچانی جا سکتی ہے۔ جس کی طنازی اور دل فریبی دونوں قابل ذکر ہیں"

مختصر یہ کہ مشتاق احمد یوسفی کا طنز سماجی اور معاشی ناہمواریوں کے خلاف بقول خود ان کے صرف ایک "مقدس جھوٹ" نہیں بلکہ "زہر غم" ہے جو فن کار کے رگ و پے میں سرایت کر کے .... اس کے لہو کو چھ اور تیز اور

توانا کرتا ہے جس سے اس کی نس نس سے مزاح کے شرارے پھوٹنے لگتے ہیں۔ "عمل مزاح اپنے لہو کی آگ میں تپ کر نکھرنے کا نام ہے۔" مشتاق احمد یوسفی کو اپنے اس قول کا بڑا پاس ہے۔ جس کا ثبوت ان کی ہر تحریر میں ملتا ہے۔ اپنی خداداد ذہانت تیز قوتِ مشاہدہ۔ برجستگی اور بذلہ سنجی، فن کارانہ ضبط اور ٹھہراؤ سے کام لے کر انھوں نے اپنی ہر تحریر کو طرح آفریں اور ہر تصنیف کو عہد آفریں بنا دیا ہے۔ "چراغ تلے" کے "کھٹے میٹھے" مضامین ہوں یا "خاکم بدہن" کے خاکے اور مزاحیے یا "زرگزشت" اور "آبِ گم" میں بیان و بیتھال آپ بیتی مشتاق احمد یوسفی کا قلم ہر میدان اور ہر مرحلے میں اردو زبان کے طنز و مزاح کو ایک وقار اور اعتبار عطا کرتا نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کی تحقیقی کتاب
"حیدرآباد میں اردو کی ترقی"
نواب شاہ عالم خاں صاحب کے ہاتھوں رسم اجرا۔ نقادوں اور دانشوروں کا اظہار خیال

حیدرآباد ۱۶ رمارچ ۔ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صدر شعبۂ اُردو انوار العلوم کالج اور مدیر شگوفہ کی تحقیقی کتاب "حیدرآباد میں اُردو کی ترقی" تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے کی رسم اجرا ۱۵ رمارچ کو شام پریس کلب میں ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، اساتذہ اور دانشوروں پر مشتمل ایک پُراثر تقریب میں نواب شاہ عالم خاں صاحب صدر نشین انوار العلوم کالج نے انجام دی۔ نواب صاحب نے اس موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ حیدرآباد علم و ادب کا گہوارہ ہے۔ اس شہر نے کئی اہم ادیبوں اور شاعروں کو روشناس کروایا۔ انوار العلوم کالج کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کا آفتاب اس کالج سے طلوع ہوا۔ انہوں نے کہا کہ انوار العلوم کے ہر استاد کی طرح وہ مصطفیٰ کمال کو بھی عزیز رکھتے ہیں انھیں وہ اس لیے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں کہ اپنی شخصیت، قابلیت علمیت اور ہنرمندی کے باوجود انہوں نے انوار العلوم سے مستقلاً وابستہ رہنا پسند کیا۔ اگر وہ یونیورسٹی منتقل ہوجاتے تو یقیناً اہم ترین عہدوں پر فائز رہتے۔ بڑی مسرت کی بات ہے کہ ایسے استاد کی خدمات کالج کو حاصل ہیں۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ سابق ڈین، آف آرٹس جامعہ عثمانیہ نے کہا، مقالے عام طور پر علم دیتے ہیں لیکن مصطفیٰ کمال کی کتاب علم نہیں عرفان دیتی ہے اور بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ یہ کتاب مرحوم جامعہ عثمانیہ کی ان یادگاروں کو زندہ کرتی ہے جس نے تحقیق کے میدان میں جامعہ کا نام بلند کیا تھا مصنف نے مقالہ کی ترتیب میں برطانوی جامعات کے نقوش کو اپنایا ہے۔ مستند معلومات اور حوالہ جات کی جو فہرست دی گئی ہے وہ مستقبل کے محقق کے لیے نشانِ راہ ثابت ہوگی۔ اس کتاب کی اہمیت کا راز اس کا عظیم الشان موضوع ہے اور مصنف نے انشاپردازی کی دھن میں علمیت کو مجروح ہونے نہیں دیا۔ کتاب کے سواد اور پیش کش میں دیدہ زاروں کی سی وسعت اور جوہریوں کی سی مینا کاری ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے کہا حیدرآباد میں اُردو کی کہانی بڑی طویل ہے۔ اس سفر میں کئی ایسے مقام آتے ہیں جہاں قدم لڑکھڑا جاتے ہیں لیکن قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال ان مقامات سے کامیاب نکل گئے ان کا جائزہ آنکھیں کھول دیتا ہے۔ بہت ساری خوش فہمیاں اور غلط فہمیاں ختم ہوجاتی ہیں۔ ڈاکٹر رفیعہ نے کہا کہ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال جامعہ عثمانیہ کے ہر دلعزیز طالب علموں میں سے ہیں جن کی قابلیت ذہانت اور شخصیت کا ہر استاد معترف رہا۔ انہوں نے طنز و مزاح کا شعور اُجاگر کیا اور ہند و پاک میں ایک انقلاب پیدا کیا ڈاکٹر سیدہ جعفر صدر شعبۂ اُردو حیدرآباد یونیورسٹی نے کہا کہ مصطفیٰ کمال ایک تعلیمی ادارہ انوار العلوم سے وابستہ رہ کر مختلف حیثیتوں سے گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اُن کی کتاب ان کی بصیرت، ذکاوت اور محنت کا ثمرہ ہے انہوں نے بہمنی، قطب شاہی اور دوسری تاریخی کتابوں کا مطالعہ کیا اسناد اور معتبر ذرائع سے ثابت کیا کہ اُردو ابتداء ہی سے بلیغ ذریعۂ اظہار رہی ہے۔

جناب مضطر مجاز (مدیر ملاپ) نے "ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا ہے" کے زیرِ عنوان اپنے مضمون میں کہا کہ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کی کتاب ایک دردناک روئیداد ہے جو چھ سال پر محیط ہے۔ غلامی کا جوا اُتار نے کے بعد جب دیسی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو کس طرح ایک دیسی زبان کا دیس نکالا ہوا۔ اور ایک بدیسی زبان کو عظیم درس گاہ کا ذریعۂ تعلیم بنایا گیا۔ اس کا تفصیل

ذکر مصنف نے کیا ہے۔

جناب عاتق شاہ (صدر انجمن ترقی پسند مصنفین) نے اپنے مضمون میں کہا کہ مصطفےٰ کمال اپنی ذات سے بلند ہو کر دیوانہ وار اُردو کا کام کرتے ہیں۔ ایسے چند دیوانے مل جائیں تو اردو کا بیڑہ پار ہو جائے گا۔

جناب مسیح انجم نے اپنے خاکہ کے ذریعہ پچیس سالہ رفاقت کا دلچسپ انداز میں ذکر کیا اور کہا کہ اُردو کے کئی رسالے دم توڑ چکے لیکن مصطفیٰ کمال "شگوفہ" کو اپنے بیٹے کی طرح پال پوس کر برصغیر کا نمائندہ پرچہ بنا چکے ہیں خصوصی نمبر محمد طفیل کی یاد دلاتے ہیں۔ ڈاکٹر عابد معز نے اپنے خاکہ میں مصطفیٰ کمال کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا اور کہا کہ "اُن کی کتاب ایک تفصیل موضوع سے انصاف کا بہترین ثبوت ہے۔

ابتدا میں ڈاکٹر یوسف کمال نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ تاریخ کے بدلتے ہوئے تہذیبی، سیاسی، معاشرتی منظر نامہ کے متوازی کس طرح دکنی نے مختلف لسانی ماحول میں اپنا مقام بنایا۔ اُس کا دلچسپ جائزہ ڈاکٹر مصطفےٰ کمال نے آٹھ ابواب پر مشتمل اپنی تصنیف میں کیا ہے۔ اس کتاب نے انھیں ایک معتبر ادبی اور لسانی مورخ کا درجہ دے دیا ہے۔

ممتاز آرکیٹیکٹ اور شاعر طالب خوندمیری نے جو منظوم خاکہ سُنایا اُس کا ایک شعر ہے:

بنا لیجئے ذہن میں شگوفوں کے ڈال کر کرتے رہے مزاح کی نشو و نما کمال

ممتاز شاعر جناب رحمن جامی، اور مسیح جلیس نے بھی منظوم خراج پیش کیا۔ ڈاکٹر یوسف کمال نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ جلسے کی کارروائی چلائی جناب محمد منظور احمد نے شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر مختلف انجمنوں کی جانب سے ڈاکٹر مصطفےٰ کمال کی گلپوشی کی گئی۔

ڈی فارم۔ ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد

۱۔ مقام اشاعت: ۳۱ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

۲۔ وقفہ اشاعت: ماہانہ

۳، ۴۔ پرنٹر و پبلشر کا نام: سید مصطفےٰ کمال، ہندوستانی
۱۷-۶-۴۶۸ ڈبیر پورہ حیدرآباد

۵۔ ایڈیٹر کا نام: سید مصطفیٰ کمال، ہندوستانی
۱۷-۶-۴۶۸ ڈبیر پورہ حیدرآباد

۶۔ ان لوگوں کے نام جو اخبار کے مالک یا حصہ دار ہیں: قیصر کمال ۱۷-۶-۴۶۸ ڈبیر پورہ حیدرآباد

میں سید مصطفیٰ کمال تصدیق کرتا ہوں کہ اوپر دی گئی معلومات میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں۔

مارچ ۱۹۹۱ء دستخط سید مصطفیٰ کمال

دیے کے خط

(مراسلے)

محبی ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صاحب،

شگوفہ کا سالنامہ مل گیا تھا۔ پڑھ کر جی خوش ہوا حسب معمول نظم و نثر، دونوں حصے، بہت خوب ہیں۔

والسلام

رضا نقوی واہی، پٹنہ

کمال صاحب۔

سالنامہ شان دار، جان دار، پروقار، جاذبِ نظر اور دلفریب ہے۔ مصنفین کے ساتھ ساتھ کاتب صاحب نے بھی اپنی دیرینہ روایتیں ترک کر دیں۔ مجتبیٰ حسین، مشتاق احمد یوسفی اور دلیپ سنگھ تک ذرا ثور دار واہ واہ پہنچا دیجیے۔

شفیقہ فرحت

بھوپال

مصطفیٰ کمال صاحب!

"شگوفہ" کا سال نامہ (جو جنوری اور فروری کے مشترکہ شمارہ پر مشتمل ہے) نظر سے گزرا۔ اداریہ میں آپ نے لکھا ہے کہ اسے آپ نے بہت رواروی میں شائع کیا ہے لیکن اسے دیکھنے اور پڑھنے سے کہیں یہ شائبہ نہیں گزرتا کہ یہ رواروی میں مرتب اور شائع ہوا ہے۔ ٹائیٹل سے لے کر صفحۂ آخر تک اور کاغذ سے لے کر کتابت، طباعت تک سب کچھ بہت شان دار ہے مضامین بھی کافی معیاری ہیں اور ہند و پاک کے تمام مزاح نگاروں (نثر و نظم) کو آپ نے یک جا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

آپ اس کی قیمت آسانی سے ۱۰ روپے رکھ سکتے تھے۔ ایک روپیہ کیوں کم کر دیا؛ مشتاق احمد یوسفی کی نئی کتاب بھی قارئینِ شگوفہ کو پڑھنے کو ملے گی جس کی قسط سالنامے میں شامل ہے۔

سال نامے سے قطع نظر آپ کی کتاب بھی بہت شان دار اور معیاری شائع ہوئی ہے۔ کتاب اتنی ضخیم ہے کہ ابھی اسے پوری طرح نہیں پڑھ سکا۔ لیکن مسعود حسین صاحب، گیان چند صاحب کی تحریریں اور آپ کے معروضات ہی پڑھ سکا۔ لیکن یہ فرصت سے لفظ بہ لفظ پڑھنے کی چیز ہے اور میں اپنا یہ ارمان پورا کروں گا۔ یوسف ناظم صاحب کی رائے ہے کہ اگر آپ اپنی کتاب کی ایک ایک سطر پڑھوانا چاہتے ہوں تو اسے مولانا شہاب الدین ماہر کوٹلوی کی نذر کیجیے۔ افسوس کہ مولانا اب اس دنیا میں نہیں رہے ورنہ میں ان کی خدمت میں اس کی جلد روانہ کرنے کی سفارش کرتا۔

رشید الدین۔ حیدرآباد

مکرمی! تسلیم!

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ سال نامہ نظر نواز ہوا۔ مصیبت میں بھی مسکرانے کا گر کوئی زندہ دلانِ حیدرآباد سے سیکھے اور صرف مسکرانے کا ہی نہیں بلکہ ہمیشہ آگے بڑھتے رہنے کا بھی۔

مرزا کھونچ

بیتیا

برادر محترم مصطفیٰ کمال صاحب

تسلیمات! شگوفہ کا ڈسمبر کا شمارہ ملا۔ مختصر سے اداریے میں کرب میں چھپی ہوئی ایک طویل داستان دیکھی۔ خدا کرے حالات اب معمول پر آگئے ہوں۔

اسمٰعیل آفند، کٹک

محترم کمال صاحب۔ سلام مسنون کے۔ دو روز قبل اخبار میں آپ کی تصنیف کی رسم اجرا کی خبر تفصیل سے پڑھی۔ مبارک باد حیدرآباد پہنچ کر ہی دینا چاہ رہا تھا مگر چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر سفر ملتوی کرنا پڑا۔ مسیح انجم صاحب کے آپ پر لکھے ہوئے خاکے کا بے چینی سے انتظار ہے۔ کسی قریبی شمارے میں اسے شامل کریں۔

امجد علی فیض، گلبرگہ

زندہ دلان حیدرآباد
کا ترجمان

شگوفہ

جلد: ۲۴ شمارہ ۴

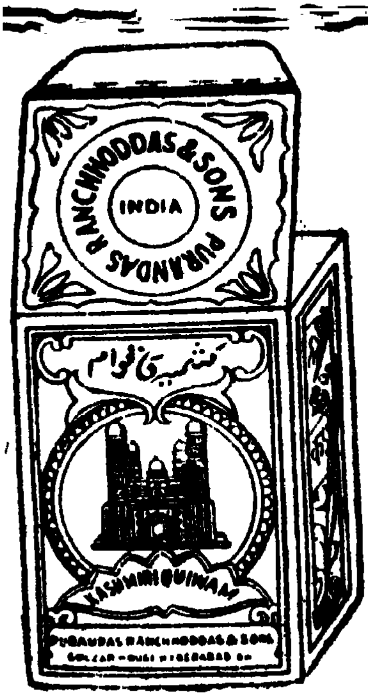
اپریل ۱۹۹۱ء

طباعت: حافظہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد۔

فی پرچہ: ۵ روپے زر انفرادی: ۵۵ روپے
لائبریریوں سے: ۶۰ روپے عرب ممالک ۲۵۰ روپے

شگوفہ: ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ
حیدرآباد 500 001

فون: 557716
مکان: 521064


PURANDAS RANCHHODDAS & SONS
INDIA
کشمیری قوام

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

فہرست

مالِ مُفت (انشائیے)

حق تو یہ ہے کہ.... (ترجمہ)

یہ ہے بابے میری جان

نہیں آتی تو یاد ان کی....

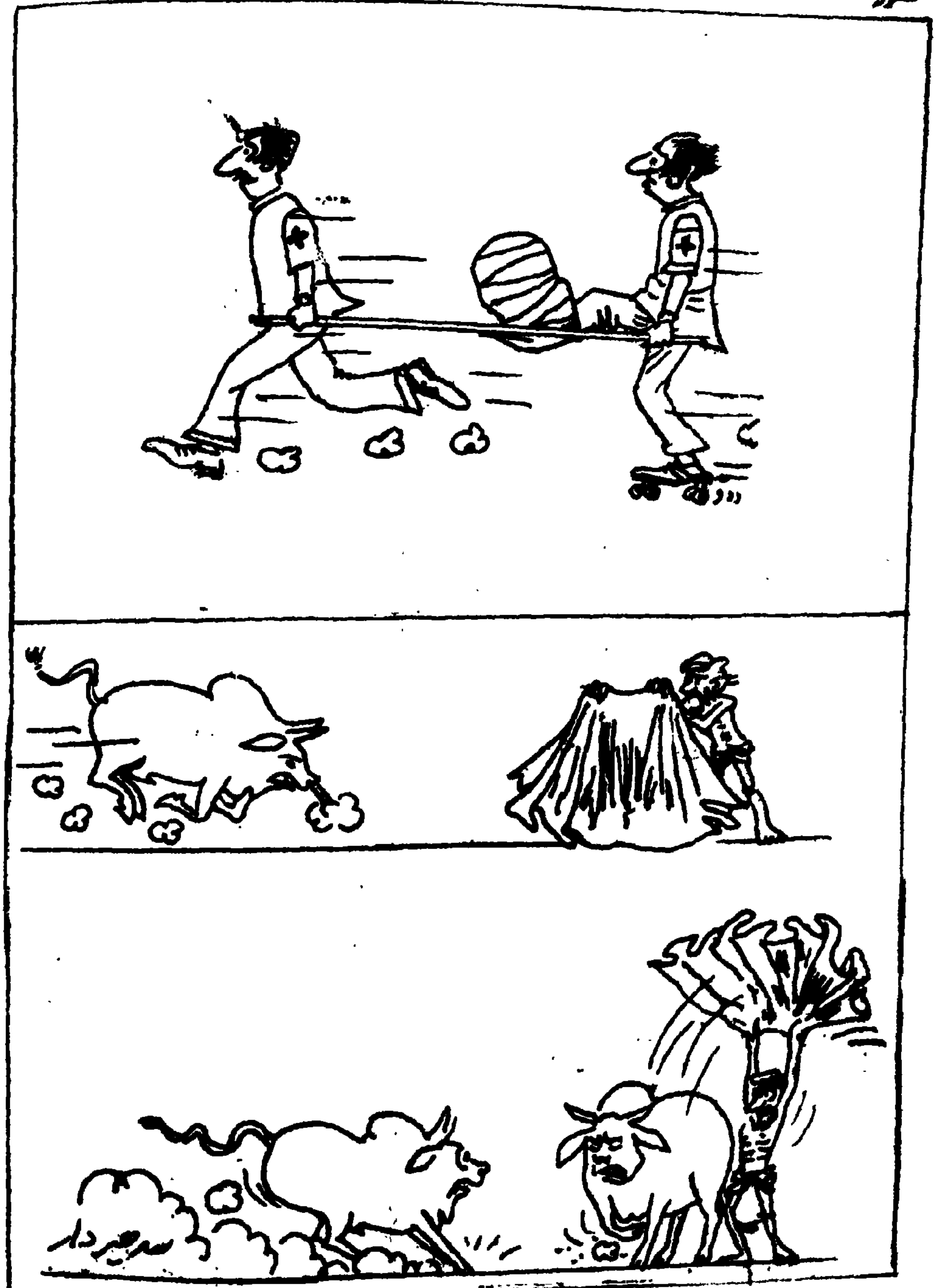
فلمیات

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

اُڑیں گے پُرزے (خاکہ)

بال کی کھال (تبصرہ)

چُورن (منظومات)


سعید دار

یوسف ناظم ⭑

مہندی برائے سیاست

زراعت اور تجارت کے علاوہ سیاست بھی ہمارے لیے بہت ضروری چیز ہے بلکہ کچھ لوگ جو دانا کہلاتے ہیں سیاست کو زراعت اور تجارت سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ سیاست کو ہم نے بھی کافی معقول چیز سمجھا ہے اور اسے ہر گھر میں عام ہونا چاہیئے ۔ [گھر کا ہونا ضروری نہیں ہے]۔ بچوں کے لیے یہ شغل شاید مناسب نہ ہو لیکن خواتین کو سیاست میں ضرور ہاتھ ڈالنا چاہیئے اور اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کو سیاست آشنا بنایا جائے ۔ خواتین جب بھی مہندی استعمال کریں اس بات کو پیشِ نظر رکھیں کہ اس مہندی میں رنگ سیاست کا آئے ۔ مہندی اب تک صرف جمالیاتی معاملات میں استعمال ہوتی رہی۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ آئندہ بھی یہ اسی کام آسکتی ہے لیکن اس میں سیاسی شاخ بھی پیدا ہونی چاہیئے ۔ کیا خالی ہاتھ ووٹ نہیں دیتے۔ ضرور دیتے ہیں۔ جب یہ ووٹ دیتے ہیں تو ان پر جو نقش و نگار بنتے ہیں اُن میں سیاست کیوں نہیں جھلک سکتی۔ جھلکنی چاہیئے ۔ اس عید پر جو ہمارے سالانہ انتخابات سے کچھ ہی دن پہلے منعقد ہوگی، مندرجہ ذیل نقش و نگار ضرور آزمائے جانے چاہئیں ۔ [ہم نے انتخابات کو سالانہ کہا اس لیے کہ یہ بھی ہمارے بچوں کے سالانہ امتحانات کی طرح اب ہر سال منعقد ہوں گے] نشانات یہ ہیں ۔

۱۔ ہتھیلی پر پاؤں کا نشان ۔ پاؤں کا نشان سننے میں شاید ناگوارِ خاطر ہو لیکن اس کی معنویت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ اس کا مطلب ہے بزرگوں کا نقشِ قدم جسے سامنے رکھ کر ہم اپنے قدم اٹھاتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اپنے پیشروؤں کے نقشِ قدم پر چلنے سے خود کے دماغ پر کوئی بار نہیں پڑتا ـــ اگر یہ صحیح ہے تو ہمیں اور کیا چاہیئے ۔ ایک بوجھ سے تو بچیں گے ورنہ اب ہم سوائے باربرداری کے اور کرتے کیا ہیں۔ ہاں قدم اٹھانے سے پہلے اپنے قدموں پر کھڑے رہنے کی مشق کر لینی چاہیئے ۔ اپنے قدموں پر کھڑے رہنے کے لیے سرکار کی اجازت بھی درکار ہوتی ہے لیکن یہ سب مرحلے بعد میں طے ہو سکتے ہیں پہلے ہاتھ میں پاؤں تو آ جانا چاہیئے ۔ جب بھاگتے وقت آدمی سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ سکتا ہے تو ہاتھ میں پاؤں کا نقش بنانے میں ہچکچاہٹ کیوں ؟ پھر وہ محاورہ بھی یاد رکھنا چاہیئے ۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ـــ اس محاورے سے کیا ظاہر ہوتا ہے! اس محاورے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پاؤں کی اہمیت مسلّم ہے بلکہ مقدم ہے ۔ بچے کے پیدا ہونے سے پہلے

پہلے اس کے پاؤں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ بچوں کی مٹھی تو بند ہوتی ہے یہ اس بات کا اعلان ہے کہ آدمی کو زندگی بھر اپنی مٹھی بند رکھنی چاہیئے۔ اس کا بھرم رہتا ہے۔ ہتھیلی میں پاؤں کا نقش بنائیے۔ اسے چھپا کر رکھیئے اور اپنی مٹھی صرف اس وقت کھولیئے جب آپ ووٹ دینے کے لیے خیمے میں داخل ہوں۔ مٹھی کا بھرم یہیں کھلنا چاہیئے اس سے پہلے نہیں۔

۲۔ ہاتھ میں طوطا: یہ کس کام آئے گا؟ بہت کام آئے گا۔ یہ طوطا ہاتھوں سے اُڑ نہیں سکے گا۔ اس نشان کا مطلب یہ ہوگا کہ ووٹ دینے والے اشخاص کو جو بھی رٹا یا جائے اُسے وہ یاد رکھیں دن میں دو تین بار اپنے سبق کو بآوازِ بلند آموختہ کرے۔ (لیکن تنہائی میں کیونکہ معاملہ ووٹ کا ہے کسی سرکاری راز کا نہیں)۔ طوطے طوطا چشم ضرور ہوتے ہیں۔ ہونا بھی چاہیئے کیوں کہ یہ اُن کا پیدائشی حق ہوتا ہے لیکن ان کا حافظہ گو کہ طویل المدت نہیں ہوتا لیکن مضبوط ہوتا ہے۔ جو چیز بھی طوطے کو یاد کرادی جائے وہ اسے بخوبی یاد رہتی ہے۔ اور آپ اُس سے زمانش کریں یا نہ کریں طوطا آپ کی صورت دیکھتے ہی اسے دُہرا دے گا بالکل پرواہ نہیں کرے گا کہ اس وقت آپ اس سے ہم کلام ہونے کے موڈ میں نہیں ہیں — طوطے کے نقش میں ایک فنی دِقت یعنی مصوری کے نقطۂ نظر سے یہ دقت ضرور ہوگی کہ مہندی کے رنگ کی وجہ سے طوطا جو بالعموم سبز باغ کی طرح ہرا ہوتا ہے سُرخ ہو جائے گا۔ کوئی بات نہیں۔ طوطوں کو بھی کبھی کبھی سرخرو ہونے کا حق حاصل ہے اور مہندی بنیادی طور پر لوھری ہوتی ہے پتھر پہ گھِس ملنے کے بعد اپنا رنگ بدلتی ہے۔ جہاں تک رنگ بدلنے کا سوال ہے تو یہ موقعہ ہی رنگ بدلنے کا ہے۔ کون ہے جو اپنا رنگ نہیں بدل رہا ہے۔ جو لوگ علی الاعلان رنگ نہیں بدل رہے ہیں ان کے دل کا حال کس نے دیکھا ہے ورنہ ایک زمانہ تھا جب ہر شخص کہتا تھا۔

"پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے۔"

وہ زمانہ عشق کا تھا سیاست کا نہیں تھا۔

مہندی کے نقش و نگار بنانے کی ماہر لڑکیاں طوطے کی تصویر کسی بھی نصابی کتاب سے حاصل کرسکتی ہیں۔ طوطے کی چونچ صحیح بنی چاہیئے۔ چونچ کا اوپری حصہ چونچ کی نچلی منزل کو پوری طرح ڈھانک دیتا ہے۔ سیاست میں بھی یہی اصول رائج ہے۔ (اصول کو سیاست میں چونچلے کہا جاتا ہے)۔

ہاتھ میں سواری: سواری کا انتخاب خود کرنا چاہیئے۔ ہوائی جہاز، دخانی کشتی، ریل، ڈبل ڈیکر بس، کوئی موٹر کار جس کی قیمت میں ابھی ابھی اضافہ ہوا ہو۔ بیل گاڑی یا سائیکل۔ (پرانی سیکل مناسب نہیں ہے۔ بچے کہاں ووٹ دیتے ہیں وہ اتنے نادان نہیں ہیں) ٹریکٹر اور ٹینک کے نشان بھی ٹھیک نہیں ہیں۔ ان میں جمالیات کے عناصر نہیں ہوتے۔ دستِ حنائی کی ساری خوبصورتی جاتی رہے گی۔ سب سے اچھی سواری ہماری رائے میں بیل گاڑی ہے۔ ہم اسی طرف لوٹ رہے ہیں۔ ایک بیل بھی کافی ہے۔ دو بیل ہاتھ میں سمائیں گے بھی کیسے۔ ویسا بھی ایک بیل بھی اتنا ہی کام کرے گا جتنا دو بیل کریں گے۔ (آخر آدمیوں سے کچھ تو سیکھا ہوگا اِس بیل نے) گاڑی بہرحال ضروری ہے۔ دونوں پہیئے بھی نمایاں ہونے چاہئیں۔ یہ زندگی کی گاڑی ہے۔ ایک پہیئے پہ کیسے چلے گی۔ یاد رہے گاڑی کے دونوں پہیئے ایک دوسرے کے برابر ہوتے ہیں۔ ان میں تذکیر و تانیث یا ذات پات نہیں ہوتی۔ سیکل بھی دو پہیوں کی ہونی چاہیئے۔ ایک پہیئے کی سیکل صرف سرکس میں کام آتی ہے

ہم اس وقت بے حد سنجیدہ ہیں ورنہ جو آپ سوچ رہے ہیں وہ ہم جانتے ہیں۔ سرکس اور سیاست میں فرق یہ ہے کہ سرکس میں محنت کرنی پڑتی ہے۔

سواری کے نقش و نگار بنانے میں ممکن ہے مشکل پیش آئے اس لیے ان سواریوں کی ڈائی بنوالینی چاہیئے۔ ڈائی کو آپ مہر بھی کہہ سکتے ہیں گوکہ یہ ڈائی کا صحیح ترجمہ نہیں ہے۔ مہر کا لفظ ہمارے ذہن میں یوں آیا کہ سیاست میں قسمت پر مہر تو لگتی ہے۔

ڈبل ڈیکر بس کی ڈائی بنواتے وقت کاریگر سے کہہ دیا جائے کہ اوپری منزل پر بیٹھنے والے ایک دو مسافروں کو کھڑکی سے اپنا سر باہر نکال کر سڑک پر تھوکتا ہوا ضرور دکھایا جائے۔ کاریگر کے لیے ایسی ڈائی بنانا مشکل نہ ہوگا کیوں کہ بس میں سفر کرتے وقت وہ خود بھی تو یہ کرچکا ہے۔ اگر اس نے کیا نہیں ہے تو کم سے کم سہا ضرور ہے۔

مکئی کا بھٹا: یہ نقش بہت اچھا رہے گا۔ ہمارا ملک ہے بھی زرعی۔ بھٹے کے دانے بہت خوبصورت دکھائی دیں گے۔ دانے چھوٹے بڑے ہونے چاہئیں۔ چھوٹوں بڑوں کا فرق تو ہر جگہ ہوتا ہی ہے۔ بھٹے کے ایک چوتھائی دانے بڑے ہوں تو وہ قریب قریب صحیح صورتِ حال ہوگی گوکہ چھوٹے اور چھوٹوں سے بھی زیادہ چھوٹے دانے ہمارے یہاں تین چوتھائی سے بھی زیادہ ہیں لیکن یہ تو علامتی نقش ہے کوئی گراف تھوڑا ہی ہے کہ پورے اعداد و شمار ظاہر کئے جائیں اور آج کل جو اعداد و شمار (شوقیہ) دیئے جاتے ہیں وہ بھی سب درست تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ حالیہ مردم شماری میں سنا ہے ایک شہر کی آبادی اچانک دو لاکھ رہ گئی جب کہ صحیح آبادی ساڑھے تین لاکھ ہے۔ خیر ایسی باتوں کا ذکر عید کے موقع پر نہیں کرنا چاہیئے۔ مکئی کے بھٹے کا نقش بنانے کی ہم نے اس لیے سفارش کی کہ بھٹے سبھی کھاتے ہیں جو کھاتے ہیں وہ کھاتے ہی ہیں، جو نہیں کھاتے وہ بھی کھاتے ہیں بیچارے ان کی زندگی کا یہی کھانا ہے۔ کوئلوں پر بھنتے ہوئے بھٹے بہت مزا دیتے ہیں۔ کسی ٹھیلے والے سے بھٹا خرید کر کھانے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ چنگاریاں الگ اڑتی رہتی ہیں۔ یہ نقش اچھی چنگاریوں کی وجہ سے واتفاقی ہوگا۔ سیاست میں چنگاریاں تو ہوتی ہی ہیں ـــ یہی شعلے بھی ہیں لیکن ہٹایئے۔ عید کے موقع پر وہ بھی ہندی کے ذکر کے ساتھ یہ باتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔

چولھا: یہ نشان بہت پسند کیا جائے گا۔ چولھا کتنا ہی ماڈرن اور گیس زدہ کیوں نہ ہو رہے گا چولھا ہی ـــ ہتھیلی پر جو چولھا چڑھایا جائے وہ ٹھنڈا رہے تو بہتر ہوگا۔ کتنے ہی گھر ایسے ہیں جن کے چولھے ٹھنڈے ہی رہتے ہیں گرم سیاست اور ٹھنڈے چولھے لازم و ملزوم چیزیں ہیں کتنے ہی گھروں کے چولھے انتخابات کے بعد سے ٹھنڈے پڑے ہیں۔

مناسب یہ ہوگا کہ دونوں ہتھیلیوں پر دو چولھے بنائے جائیں۔ ایک چولھے پر دیگچی رکھی ہو اور کھانا پکتا ہوا دکھایا جائے اور ایک چولھے پر حسرت برستی دکھائی جائے۔ دونوں چولھوں کے نیچے یہ الفاظ لکھے جائیں "انتخابات سے پہلے۔ انتخابات کے بعد" ـــ تحریر میں کتابت کی غلطی نہیں ہونی چاہیئے اور یوں بھی کتابت کی غلطی کا یہاں کوئی موقع بھی نہیں ہے۔ یہ ہتھیلی ہے اخبار کا مزاحیہ کالم نہیں۔

مہندی لگانا ایک فن ہے۔ باضابطہ مرصع کاری۔ طرح طرح کے [illegible]

اب تربیتی نصاب جاری ہو گئے ہیں۔ ہمیں یہ تعلیم و تربیت بہت پسند ہے لیکن نصاب میں ایک کمی جو ہمیں کھلتی ہے وہ اصلی مہندی کی ہے۔ مہندی کے پتے چننا انھیں کوٹنا، اس کے محلول میں طرح طرح کے لسخے اور ٹھکلے استعمال کرنا۔ اصل لطف تو انہیں مصروفیتوں میں ہوتا ہے۔ اس کی بھی ٹریننگ دی جانی چاہیئے اور ہم نے نقش و نگار کے سلسلے میں جو سیاسی اور معاشی مشورے دیئے ہیں یہ بھی نصاب میں شامل ہونے چاہئیں۔ اس عید پر تو نہیں تو اگلی عید پر کام آئیں گے۔ فی الحال صرف ہلالِ عید کا نقش بنا لیا جائے۔ چاند آسمان پر نظر آئے گا یا نہیں کچھ کہا نہیں جا سکتا حنا کی ہتھیلی میں تو رہے گا — لوگ تو ہتھیلی میں جنت دکھاتے ہیں ایک ننھا منا چاند دستِ حنائی کی رونق بڑھا دے گا۔! ۵۷

طالب خوندمیری

ذائقہ

بڑے ہی پیار سے
اک نوجواں
اپنی حسین، فیشن زدہ بیوی سے بولا
چقندر کا یہ حلوہ
آج جو تم نے بنایا ہے
بہت ہی خوب صورت رنگ ہے اس کا
بڑی بھینی سی خوشبو ہے
چقندر کے علاوہ
اس میں چینی بھی تو تم نے خوب جھونکی ہے
اور اس پر
کریم کا چھڑکاؤ بھی کافی سلیقے سے کیا تم نے
مگر اس میں . . . . . .
مگر اس میں . . . . . .
ذرا سا ذائقہ بھی تم ملا دیتیں تو اچھا تھا

O

بے سبب ہر بات پر ہنستے رہو ۔۔۔ سب سے ہو کے بے خبر ہنستے رہو
جب کسی احمق پہ ہنسنا ہو تمھیں ۔۔۔ آئینہ میں دیکھ کر ہنستے رہو

افطار پارٹی

پروفیسر حفیظ بنارسی

(ارباب نام و نمود سے معذرت کے ساتھ)

افطار پارٹی کا جو یہ اہتمام ہے
یہ بھی بہار تحفۂ ماہ صیام ہے

لیکن برا نہ مانیں جو ارباب ذی وقار
میں ان سے عرض کردوں ہے کیا چیز یہ بہار

تفریح کا بہانہ ہے افطار پارٹی
اب اک حسین فسانہ ہے افطار پارٹی

نام و نمود کا یہ ذریعہ ہے با اثر
ہوتی ہے نشر ٹی وی و اخبار سے خبر

ملتے ہیں لوگ بہر یہ کھانے کے واسطے
ہے کار خیر نام کمانے کے واسطے

دعوت انھیں بھی ملتی ہے جو روزہ خور ہیں
جو دین کے معاملے میں سخت چور ہیں

تقوے سے غرض ہے نہ طہارت سے ہے غرض
اس دور میں سبھی کو سیاست سے ہے غرض

پنڈت کی جو دشا ہے وہ ملّا کا حال ہے
افطار پارٹی بھی سیاست کی چال ہے

بھوجن جو صبح و شام میں دس بار کرتے ہیں
کیسا مذاق ہے کہ وہ افطار کرتے ہیں

مے کش نہیں بچا کوئی ساقی نہیں بچا
ایوان راج پال[1] بھی باقی نہیں بچا

دیتے ہیں زر پرستوں کو زردار پارٹی
ہر انجمن میں ہوتی ہے افطار پارٹی

دربار سے وزیروں کے ملتا ہے جب پیام
مسجد کے راستے سے بھٹک جاتے ہیں امام

پڑھتے ہیں واں نماز جو ہے بزم ناؤ نوش
رہتا نہیں خیال ہے کیا چیز عقل و ہوش

کرتے ہیں لیڈروں سے سیاست پہ گفتگو
چھپ جائے ان کا فوٹو بھی رہتی ہے جستجو

افطار پارٹی سے عداوت نہیں مجھے
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

افطار کیا ہے اس کے معانی بدل گئے
اہل خدا بھی وقت کے سانچے میں ڈھل گئے

[1] گورنر ہاؤس

الکشن نامہ

پاگل عادل آبادی

دنگل میں الکشن کے پہلوان بہت ہیں
ووٹر میرے حلقے کے ہراسان بہت ہیں
کچھ ووٹ دلا دے انھیں تو کر کے سفارش
سنتا ہوں پتا جی ترے بلوان بہت ہیں

بدری رائنا
ترجمہ۔ مضطر مجاز

مہاراجہ بش کا خطابِ فتح و کامرانی

میرے پیارے ہم وطن امریکیو! ۔

آج میں تم سے مخاطب ہوں جب ہم ایک بہت بڑی فتح سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ خدا کے فضل و کرم اور ہماری اعلیٰ تکنیکی مہارت کے ساتھ جس کو ہماری روایت کے مطابق امریکی عزمِ راسخ کی مدد حاصل تھی، ہم نے ایک بڑی خرابی یعنی صدام کا، جو مخالف مسیح بھی تھا، قلع قمع کر دیا۔ آخر کار ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر چالیس ممالک متحد ہو جائیں اور لاکھوں کروڑوں ٹن کے بم بھی دستیاب ہوں تو ہمارے عزمِ محکم کے مقابل تیسری دنیا کا کوئی ملک ہمارے مقابل نہیں ٹھہر سکتا۔ ہم نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ تیسری دنیا کے مرد، عورتیں اور بچے اپنی روایتی خودکشی اور فاقہ کشی کے ہاتھوں چاہے کتنا ہی اپنی جگہ مضبوط کیوں نہ ہوں، اگر مناسب تحدیدات عاید کی جائیں اور بے پناہ ہتھیاروں کو بروئے کار لایا جائے تو ان کو صفحۂ ہستی سے بہ آسانی مٹایا جا سکتا ہے۔ اس سعادت آثار لمحے میں ہمیں اپنی ساری انکساری کے ساتھ یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہمارے "عیسائی خدا" کے حضور جو دعائیں بھیجی جاتی ہیں وہ بہر حال شرفِ قبولیت حاصل کرتی ہیں بہ مقابلہ دوسرے الول جلول خداؤں کے (خصوصاً نسلی طور پر پس ماندہ اللہ کے مقابلے میں!) مسیحی کتب کے متنوں کے مطابق ہم نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ نجات کا بہترین مسیحی طریقہ دوسرے آدمی کے تیل پر قبضہ کرنا اور سیٹ ــــ اس کو ختم کر دینے کا عزمِ محکم رکھنا ہے، چنانچہ ہمارے نوجوان حق آزادی اور انصاف کی خاطر برائی پر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑے۔

اے میرے پیارے ہم وطن امریکیو! ہم نے اپنے B.52 بم باروں اور ٹام ہاک طیاروں کو اپنے ہارورڈ (یونیورسٹی) کے ماہرین آثارِ قدیمہ سے مشاورت کے بعد اس طرح استعمال کیا کہ قدیم میسا پوٹامیا، وہ تہذیب کا گہوارہ اور خاص طور پر اس کا وہ علاقہ جہاں ماضی کے لاثانی اور لافانی خزانے دفن ہیں، پوری طرح محفوظ رہے۔ اس کے برخلاف ہمارے بہادر فوجی اپنی شاندار حمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت درجہ بے پروائی کے ساتھ میسوپوٹامیا کی سطح زمین پر واقع نامعقول نسلوں کے نشانات مٹاتے چلے گئے۔ یہ بات بھی

نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ ہم نے مساوی احساس پذیری کے ساتھ اپنی فخر انگیز سنسر شپ کے ذریعہ اپنے امن پسند امریکی گھروں کے ٹیلی ویژن اسکرینوں کو بہت سے نامناسب نظاروں کو دکھانے سے محفوظ رکھا
میرے پیارے امریکی ہم وطنو! اس تاریخی لمحے میں یاد کرو کہ قابلِ فخر ریگن نے کس طرح سرد جنگ کا خاتمہ کیا، اگرچہ سادہ لوح گوربچوف یہ سمجھتا رہا کہ اس کو اس باب میں کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ ازاں بعد ہمارے اس غریب بش کے کندھوں پر یہ ذمہ داری آن پڑی کہ کس طرح اس کارِ خیر کو آگے بڑھایا جائے۔ ظاہر ہے کہ سرد جنگ کی نرمی اس وقت تک نکالی نہیں جا سکتی تھی جب تک ایک قدیم طرز کی گرما گرم جنگ کو برپا نہ کیا جائے۔ اب تیاری کے چند سالوں کے لیے گوربچوف کو یہ سوچنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے کہ ہمارا پُر جوش معانقہ صرف اسی غرض کے لیے تھا کہ ہم ان کے دور کے بھائی بند بن جائیں۔ سوچو تو اس مریل روس کے طفلِ ناداں کو ہم نے کیسا بیوقوف بنایا پہلے تو ہم نے اس کی اس بات پر حوصلہ افزائی کی کہ وہ اپنی مشرقی (یورپی) ریاستوں سے ہاتھ اٹھا لے، پھر اپنے ہتھیاروں کو تباہ کر دے، اپنی ساری دکانداری برخواست کر دے اور ان موذی جڑواں افراد مارکس اور لینن کو دیس نکال کر دے تاکہ ایک "نیا عالمی نظام" قائم کیا جائے۔ ذرا غور تو کرو کہ کس طرح اس عیسائی جیلہ جوئی کے بعد میں کہ جارج بش اول اور واحد نے بجلی کی کڑک دکھائی اور اس کو اس کی زندگی کا درس پڑھایا کہ ہم جس "نئے نظام" کی بات کر رہے ہیں اس کا مطلب صرف ایک ہی ہے یعنی ــــ عظیم تر امریکہ پس جب تیل پر ضرب لگانے کا وقت آ پہونچا تو گوربچوف نے ہماری اتحادی کھچڑی میں جو کچھ پکایا گیا تھا اس کی حامی بھرنے کے باوجود صلح صفائی کا راستہ اختیار کیا (العجب ثم العجب) ــ تب ہم نے کہا کہ خدا کا فضل ہو صلح کرانے والوں پر! تس پر بھی وہ مجہول العقل شخص اپنی پوری بے باکی کے ساتھ صلح صفائی کا سلسلہ جنبانی میں لگ گیا جب کہ ہم پوری طرح جنگ آزمائی میں لگے ہوئے تھے اور وہ اس راستے پر ذرا دور تک بڑھ نکل گیا تب ہم کو ذرا دو ٹوک بات کرنی ہی پڑی اور "وہ تیسری دنیا" کا حوالدار فوری طور پر اپنی صلح جویانہ زبان کھینچ کر چپ ہو رہا۔

جہاں تک اس اکھڑ صدام کا تعلق ہے اس کو بھی ہمارے فلسطینی قبضے کو اپنے کویت پر قبضے کے مماثل قرار دینے کا بڑا اچھا پھل ملا۔ اس کو اس زہریلے پروپگنڈے کی بھی اچھی سزا ملی کہ وہ وہی کرنا چاہتا تھا جو ہم نے پناما اور گرینیڈا میں کیا ہے حالانکہ جہاں بھی جمہوری حقوق کے تحفظ کا سوال کھڑا ہوتا ہے ہم وہاں پہونچ جاتے ہیں۔ پھر اس کو اس تصوراتی غلط فہمی کی بھی اچھی قیمت چکانی پڑی کہ چھوٹے ممالک اور ان کی اور بھی چھوٹی حکومتیں اس کا ساتھ دینے اٹھ کھڑی ہوں گی ــــ اس کو آخری امید تھی گوربچوف ہو لق سے، پھر رفسنجانی کے اسلامی نعرہ بازی سے اس مہم جو اسد سے جس کی آتشِ انتقام اس کو اوندھے منہ گرانے والی ہے، اردن کی حکومت سے جس کا گلا گھونٹ کر ہم نے ایک کونے میں ڈھکیل دیا ہے، مصر کے اس بھلے آدمی سے جو ہمارا وفادار بیگار رسا سپاہی ہے اور قیمہ ہے کہ وہ مزید حملہ کرے گا کیونکہ ہم نے اس کے اسلحہ خانے کو لبالب بھر رکھا ہے۔ جہاں تک ان سڑک چھاپوں کا تعلق ہے جو نکل پڑے تھے مراقش اور اردن، الجیریا اور پاکستان میں اور اسپین اور یہاں تک کہ فرانس اور بحرین کی سڑکوں پر، انھوں نے اپنی بھڑاس نکالی مگر یاد رکھو کہ وہ امریکی نہیں ہیں۔

تم تو خوب جانتے ہو کہ ہمارے طاقت بخش "برگر" اور "بلو جینس" ان کی پرشور محفلوں کو چپ کرادیں گے — یہی تو وہ اسلحہ تھا جس کی وجہ برلن کے جمہوریت پسندوں نے ہماری پُرجوش للکار پر لبیک کہا — لہٰذا اے ساتھی امریکیو! خصوصاً تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے ایک آدھ غلط فہمی کے دن واشنگٹن میں احتجاج کا مدعیہ اختیار کیا تھا "بلو جینس" اور "برگر" کی طاقت کو چشمِ کم سے نہ دیکھو۔

ساتھی امریکیو! ذرا ہماری اس پینگ کا تو اندازہ کرو۔ آج جب کہ "نئے عالمی نظام" کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری ہمارے منتخب کاندھوں پر آن پڑی ہے تو ہمارے لیے اور کونسی راہ رہ جاتی ہے سوائے اس کے کہ اس دردِ سر کو جس کا نام صیانتی کونسل ہے، اس کے ٹانگ اڑانے والے حصے داروں سے دور ہی رکھیں۔ اس طرح ہم نے بیجنگ اور ماسکو کے برادران کو یہ سمجھا دیا کہ DITTO کو VETO پر کس قدر برتری حاصل ہے۔

کیوباؤں اور یمنوں کی حد تک یہی کہا جا سکتا ہے کہ جھاڑی [BUSH] میں کتنی ہی روشنی ہو، اجنبی اور شیاطین کبھی راہِ راست پر نہیں آسکتے۔ تاہم ہمیں صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے — دیکھو کس طرح وہ قابلِ لحاظ انجمن NAM ایک نقلی انجمن [SAAM] بن کر رہ گئی ہے۔ جیسے جیسے ہماری فوجیں تیسری دنیا کے ڈھانچے کو روندتی آگے بڑھتی جا رہی ہیں تاکہ اس کرۂ ارض پر امن اور آشتی کا دَور دَورہ ہو اور جیسے جیسے ہمارے آزمودہ جوروں کے سردار ہتھیار ساز تعمیری تباہی کی خاطر نئے نئے ہتھیار فروخت کر رہے ہیں (جس نے ہمارے وال اسٹریٹ کو کساد بازاری سے پھر ایکبار باہر نکال لیا ہے) میں واقعی ایک عظیم دھمکی اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ میری مراد اس SAAM کا کیپٹن مارویل ہے یعنی راجیو گاندھی! — لیکن اے میرے ساتھی امریکیو! یہاں بھی ہمیں اس قدر جلد مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ انکل سام کے پاس گاندھی کو رام کرنے کا طریقہ بھی موجود ہے وہ اس طرح کہ جہاں ٹام ہاک بلٹ پروف جاکیٹ کے سامنے ناکام ہو جائے تو ہتھیاروں کا ہتھیار بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے قرض کو کام میں لایا جا سکتا ہے جس کے سامنے کیپٹن مارویل پہلے ہی سے نہتا پڑا ہے

مختصر یہ کہ ساتھی امریکیو! جھاڑی کو روشن رکھو اور یاد رکھو کہ جھاڑی اس وقت تک نہیں جل سکتی جب تک خلیج سے تیل کی رسد جاری نہ ہو۔ یہ اہلِ خلیج کتنے ہی بے عقیدہ جابر و سفاک کیوں نہ ہوں یہ ان کا تیل ہی ہے جو ہمیں چراغ کو روشن کیے ہوئے ہے۔ اسی سے مجھے یاد پڑتا ہے کہ اے ساتھی امریکیو! میرا خطابِ فتح و کامرانی اس قدر موزوں اور قافیہ پیمائی سے آراستہ کس لیے ہے۔ اگر واقعتاً تمہاری صحیح طریقے سے تعلیم و تربیت ہوتی (جس سے ہر شخص جانتا ہے کہ تم سراسر محروم ہو) تو اس کا سبب جاننے کے لیے بہت زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ امریکہ اس قدر شاداں و فرحاں نہیں رہا۔ بلکہ برجز تمہاری بھوک اب خوب چمک اٹھی ہے۔ دنیا جہاں کی چربی تمہارے لیے ہی ہے اٹھو اور اس پر منہ مارنے کے لیے تیار ہو جاؤ!

قلمی معاونین مسودات پہ اپنا پورا پتہ ضرور لکھیں۔ (ادارہ)

ڈاکٹر راہیؔ قریشی
(گلبرگہ)

کیا کیا جائے

جو گھر کا حال ہے، اژدھا ہے کیا کیا جائے
کویت، عراق کا نقشہ ہے کیا کیا جائے

ہمیں نے گھر کو جلانے بلایا غیروں کو
قصور اِس میں ہمارا ہے کیا کیا جائے

عدو، عدو ہے، یہ اِک دن سمجھ میں آئے گا
ابھی تو عقل پہ پردہ ہے کیا کیا جائے

شکست بھائی کو دی دشمنوں کی طاقت سے
مقدروں کا نوشتہ ہے کیا کیا جائے

برادری کی یہ رنجش عدو کو کیوں سونپی
سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے کیا کیا جائے

جو ہے حسینی[1]، وہ دجلہ پہ خون دھوتا ہے
جو بش[2] ہے جشن مناتا ہے کیا کیا جائے

لہو کی جھیل میں تبدیل ہو گیا صحرا
خلیج، آگ کا دریا ہے کیا کیا جائے

کسی کی قبر بھی کھودو گے اب تو دیکھو گے
زمیں سے خون اُبلتا ہے کیا کیا جائے

چلو، "کہ خانہ بہ مہماں گزاشت" پر ہو عمل
یہ میہماں کا تقاضہ ہے کیا کیا جائے

نکال دیں گے تمہیں کو تمہارے آنگن سے
یہی تو اُن کا کرشمہ ہے کیا کیا جائے

خدا، رسولؐ کے سائے میں دشمنانِ خدا
قسم خدا کی، تماشہ ہے کیا کیا جائے

لہو کے رشتوں پہ آخر کو پھر گیا پانی!
یہ اسرائیل کا لفڑا ہے کیا کیا جائے

عراق، تیری تباہی کی داستانِ الم
"شنیدہ" تھی، سو وہ "دیدہ" ہے کیا کیا جائے

خدا کے ماننے والوں پہ کیوں خدا جانے
خدا کا قہر برستا ہے کیا کیا جائے

سوالِ وصل پہ "ہاں" بھی نہیں "نہیں" بھی نہیں
بس ایک آنکھ دباتا ہے کیا کیا جائے

سفید سر ہو، سیہ رُخ ہو، پوپلا منہ ہو
نقاب سب کو چھپاتا ہے کیا کیا جائے

ہمارے حق میں ہی برقعے ہوئے یہاں ایجاد
ہمارے حق میں ہی پردہ ہے کیا کیا جائے

تمام بیویاں موجود گھر میں ہیں، لیکن
ہر ایک بیوی سے جھگڑا ہے کیا کیا جائے

بنایا راہیؔ کو جس نے یہاں مزاح نگار
وہ مصطفےٰ[3] کا شگوفہ ہے کیا کیا جائے

۱۔ صدام حسین ۲۔ جارج بش ۳۔ ڈاکٹر مصطفےٰ کمال۔

اسحٰق ایوبی مرحوم

کا

ایک غیر مطبوعہ مضمون

آم — شہد جام

اسحٰق ایوبی مرحوم صاحبِ طرز مزاح نگار تھے۔ ویسے ان کا وطن مالیگاؤں (مہاراشٹر) تھا لیکن حیدرآباد ہی کو وطن بنا لیا تھا۔ وہ خود حکومت ہند کے پبلسٹی ڈپارٹمنٹ پریس انفارمیشن بیورو میں انفارمیشن آفیسر تھے لیکن اپنی پبلسٹی کے تعلق سے بہت لاپرواہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا نام بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ ہم اس شمارے میں آموں کے بارے میں ان کا ایک غیر مطبوعہ مضمون شائع کر رہے ہیں۔ ویسے بھی یہ آموں کا موسم ہے۔ اسحٰق ایوبی مرحوم اپنا مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "آئینہ خانہ" بھی چھپوانا چاہتے تھے لیکن موت نے مہلت نہیں دی۔ زیرِ نظر مضمون کے لیے مزاح نگار رشید الدین کے ہم مشکور ہیں جن کے مرحوم سے نہایت قریبی دوستانہ مراسم تھے۔ (مدیر)

صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم !
ناز پروردۂ بہار ہے آم !

ہندوستان جہاں مداری، پان کی پٹاری، سادھو، ٹونا جادو، حق پرستی پر لہاد اور صفر کی ایجاد کے لیے شہرت رکھتا تھا، وہیں دنیا بھر کے پہاڑوں کا کمانڈر انچیف ہمالیہ، عمارتوں کا شہنشاہ ہز امپیریل میجسٹی تاج محل اور پھلوں کا پارٹی لیڈر آم بھی اسی سرزمین کی خاص الخاص چیزیں ہیں۔

یوں تو آم میں کئی انوکھی خوبیاں ہیں —

سب سے عجیب بات یہ ہے کہ جب ایک سال کی فصل بھرپور ہوتی ہے تو دوسرے سال نسبتاً کم۔ گویا آم ہر دوسرے برس فیملی پلاننگ کرتے ہیں۔ آم کو صرف برصغیر ہند کی آب و ہوا راس آئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض بعض مقامات پر ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ندی کے ایک کنارے آموں سے لدے پھندے درخت کھڑے جھوم رہے ہیں اور دوسرے کنارے پر دور دور تک اُن کا نام و نشان بھی نہیں۔ آم کی یہ نازک مزاجی ضدی نوابوں، جلالی فقیروں

اور حسین بتوں کی طبیعت سے سو فی صدی لگا کھاتی ہے۔

آم گرمی کا پھل ہے۔ کچا ہو تو اس کی تاثیر سرد ہوتی ہے اور پک کر تیار ہو جائے تو سرد کی بجائے گرم ہو جاتی ہے۔ ویسے ہی جیسے سرپرست چچا، ماموں اور پھوپھا کی نیت یتیم بچوں کا مال و متاع دیکھ کر بدل جاتی ہے۔ کافی مقدار میں آم کھانے سے آدمی پر غنودگی سی طاری ہو جاتی ہے کیوں کہ اس میں ہلکا سا نشہ بھی ہوتا ہے۔ آم گویا قدرت کا ٹانک ہے اور ہر ٹانک میں یقینی طور پر تھوڑا سا الکحل بھی ملایا جاتا ہے۔ آج کل آم کو پکانے کے لیے "چٹ منگنی پٹ بیاہ" کے اصول پر پٹرول ڈالنے کی بجائے بھٹی یا گیس کا بھی استعمال ہونے لگا ہے۔ گویا انسان کو مارنے کے لیے کھانے پینے کی اشیاء میں آمیزش کافی نہیں تھی۔

سبھی آم خوش ذائقہ، خوش رنگ اور خوشبودار نہیں ہوتے جن آموں میں یہ ساری خوبیاں یکجا ہوں، انھیں بڑا سمجھیے۔ آم میٹھے ہوں چاہے کھٹے پھیکے ہوں یا سیٹھے چاہے کھٹ میٹھے۔ ان سبھوں کو انسانی انتڑیاں اسی طرح ہضم کر جاتی ہیں جیسے تیزاب کا حوض گینڈے اور ہاتھی کے بھاری بھرکم لاش کو پوری طرح تحلیل کر دیتا ہے۔

آموں کے سائز بھی الگ الگ ہوتے ہیں قد کے لحاظ سے بعض ناٹے میاں کہلانے کے مستحق ہیں تو بعض مسٹر لمبو۔ کچھ آم پیشہ ور پیروں کا پیٹ رکھتے ہیں تو کچھ معشوقوں کی کمر۔۔۔ چند آموں کے پوست بے حیا لوگوں کی کھال سے بھی سخت ہوتے ہیں تو چند کے چھلکے میخواروں کی توبہ سے بھی کمزور۔۔۔

کہیں کہیں، ایسے آم بھی پائے جاتے ہیں جن میں رس ہی رس ہوتا ہے اور گٹھلی برائے نام ہوتی ہے۔ یہاں رس اور گٹھلی کا تناسب وہی ہے جو جیل کے اخلاقی تبدیلیوں اور آزاد دنیا کے مجرمین کے باب میں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ بے چارے قیدیوں کو جیل میں جرائم کا ارتکاب کرنے کا موقع ہی کہاں ملتا ہے چند اقسام کے آموں میں ریشہ بہت ہوتا ہے اور گٹھلی بھی متقابلتاً بڑی ہوتی ہے یہ گویا ایک ہی گھر میں لڑاکا بہو اور جھگڑالو ساس کا اجتماع مترادفین ہے کبھی کبھار کالے آم بھی دیکھنے کو ملتے ہیں مگر شاذ و نادر اسی طرح جیسے انسانی تواریخ میں مکمل زنانہ خصوصیات کے حامل شہزادے اور مکمل مردانہ خصوصیات رکھنے والی شہزادیاں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور رہے ہیں۔ ہر کچے آم کا رنگ ساون کی ہریالی کی طرح سبز ہوتا ہے مگر ہر پکے آم کا رنگ خزاں رسیدہ پتے کی مانند زرد نہیں۔ ہر کیری باسی کڑی کی مانند کھٹی ہوتی ہے لیکن ہر پختہ آم شب برات کے حلوے کی طرح میٹھا نہیں۔ ہر کچا آم محبوبہ کے دل کے جیسا سخت ہوتا ہے مگر ہر لگا آم ملنے والے سڑک چھاپ فرہاد کی کھوپڑی کی طرح پلپلا نہیں۔۔۔

بعض پھل عموماً "نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز" کی بنیاد پر خواص کے لیے "ریزرو" ہوتے ہیں۔

عوام خصوصاً ان سے اسی طرح محروم رہتے ہیں جیسے بخار کا مریض کھانے کے اصلی ذائقے سے۔ کنگال لوگ اگر قیمتی پھل کھانے کے خواہشمند ہوں تو انھیں پہلے بیمار پڑنا چاہیئے۔ لامحالہ گھر والے تیمار داری اور ناز برداری کرنے کے لیے مہنگے نرخ سے ان کی خاطر تواضع کریں گے چند میوے اور پھل صرف عامۃ الناس کے نصیب میں لکھے ہیں۔ مثلاً جنگلی بیر، جنگلی کھجور، اِملی، مونگ پھلی، گاجر، شریفے، مگر آم تو قبل از تاریخ کے دور ہی سے جمہوری طرز کے سوشلزم کا علمبردار رہا ہے۔ اسے امیر بھی کھاتے ہیں اور غریب بھی۔ سچ پوچھیے تو آموں کی اعلیٰ و ادنیٰ اقسام اتنی زیادہ ہیں کہ انھیں شاہ و گدا دونوں آسانی سے خرید سکتے ہیں۔ ویسے بڑھیا سے بڑھیا آم بھی کم سے کم آمدنی والے افراد کے دست رس سے باہر نہیں ہوتا۔ اسی طرح جیسے بڑے بڑے ہسپتال

نادار سے نادار آدمی کا خطرناک سے خطرناک آپریشن بھی مفت کیا جاتا ہے۔

املی کا تصور کرتے ہی منہ میں پانی بھر آتا ہے مگر آم کا ہزار بار نام جپئے تب بھی رال نہیں ٹپکتی دراصل آم ملک کے حسن کا رتبہ رکھتا ہے۔ جسے دیکھ کر رعایا کی آنکھیں مارے عزت و احترام کے خود بخود جھک جاتی ہیں۔ جب کہ املی آوارہ عورت کی خوبصورتی کا درجہ رکھتی ہے جس کو دیکھنے کے بعد تماش بینوں کا لعاب دہن آپ ہی آپ بہنے لگتا ہے۔

آم کو شعر و ادب میں انتہائی ممتاز مقام حاصل ہے۔ ہندوستان کے شاعروں نے اس کی تعریف و توصیف میں جتنا قدر زبان لکھی ہے۔ اتنی کسی اور پھل کی مدح سرائی میں نہیں۔ آم کی ڈالی اور کوئل کی کوک میں وہی تعلق ہے، جو زبان اور چوک، منہ اور تھوک، پیٹ اور بھوک میں ہوتا ہے اور پھلوں کے مقابلے میں آم سے متعلق محاورے بھی ہماری زبان میں زیادہ ہی مستعمل ہیں مثلاً "آم کے آم گٹھلی کے دام" "آم لوٹو۔ آم کھاؤ" "املی لوٹو، املی کھاؤ" "پیڑ لوئے ببول کے تو آم کہاں سے کھائے۔ آم کھانے سے کام، پیڑ گننے سے" "آم کھائے پال کا، خربوزہ کھائے ڈال کا، پانی پیئے تال کا" "میں کہوں آم وہ کہے املی"۔ مرزا غالب کو شراب و شاہد کی طرح آم بھی بہت مرغوب تھے۔ آم کی خوبیوں کا تذکرہ چھیڑا تو انہوں نے کہا کہ آم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بہت ہوں اور میٹھے ہوں۔ ایک صاحب نے غالب پر طنز کرتے ہوئے کہا "آم گدھے تک نہیں کھاتے" غالب نے برجستہ جواب دیا ہاں گدھے آم نہیں کھاتے"

اکبر الٰہ آبادی نے ہفتہ وار "پیام یار" کے ایڈیٹر کو لکھا تھا ؎

نامہ نہ کوئی یار کا پیغام بھیجئے ✽ اس فصل میں جو بھیجئے بس آم بھیجئے
ایسے ضرور ہوں کہ انھیں رکھ کے کھا سکوں ✽ پختہ ہو اگر بیس تو دس خام بھیجئے

غرض کیا شاعر، کیا بھانڈ، کیا جاہل، کیا عالم، کیا امیر کیا فقیر، کیا واعظ، کیا رند ـــــ سب ہی آم کو بڑے چاؤ سے کھاتے ہیں یہ ہر کسی کا من بھاتا ہے۔ مختصر الفاظ میں آم کو پھلوں کی "اردو غزل" سمجھیے جو مزدور سرمایہ دار صوفی و تعلیم یافتہ و غیر تعلیم یافتہ سب کی منظور نظر ہوتی ہے۔

آم کھانے کا مزہ تو بس املاتیوں میں ہے درجنوں ٹپکے سامنے دھرے ہیں۔ جی بھر کے رس چوسو۔ آدھے چھلکے اور آدھی گٹھلی چاٹو اور آدھے پھینکو۔ تکلف برطرف، آم چوسنے میں جو مزہ ہے وہ قاش بنا بنا کے کھانے میں نہیں۔ ویسے ہی جیسے گلاس کو منہ لگا کر پینے والوں کو چلو بھر بھر کے پانی پینے سے سیری نہیں ہوتی۔

کیری کا اچار برس کے بارہ مہینے چلتا ہے طبی فوائد کے علاوہ اس سے کھانے کے ذائقے میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے اسی طرح جیسے سرکس کی عورتوں کی پوشاک میں ستارے سے چار چاند لگ جاتے ہیں۔ دیہات کے لوگ آم کے رس کا امرٹ بنا کر چھوڑتے ہیں اور سال بھر مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔ کیریوں کو سکھا کر امچور تیار کرتے ہیں جس کا استعمال مختلف پکوانوں میں ہوتا ہے۔ یہ گٹھلیاں بعض پکوانوں میں وہی اہمیت رکھتی ہیں جو رشتہ داری میں سالیوں کو اور لڑائی میں گالیوں کو حاصل ہے۔ اگر ہمارے ملک کے پرندوں میں راجکمار مور سنگھ کو قومی تخت طاؤس پر بٹھایا جاسکتا ہے تو پھولوں میں راج پتر کنول سنگھ اور پھلوں میں راج کنور آم سنگھ کو بھی تاج شاہی مزید پہنائے جاسکتے ہیں۔ ▲▲

نظر برنی (دہلی)

ملتے جلتے آتے جاتے

آپ اگر کوشش فرماتے، ملتے جلتے آتے جاتے
خاموشی سے نوٹ دکھاتے، ملتے جلتے آتے جاتے

گر خواہش ہے "پروموشن" کی چوری چوری "باس" سے ملتے
دفتر کا دستور نبھاتے، ملتے جلتے آتے جاتے

راہ و رسم سے "باس" پگھلتا نتیجہ وڈنر سے آپ کا ہوتا
خود جاتے یا اسے بلاتے، ملتے جلتے آتے جاتے

سامنے اس کے بن کے رہتے "بھیگی بلی" اور "چغد" بھی
لیکن پیچھے رعب دکھاتے، ملتے جلتے آتے جاتے

آپ سے گر مسٹیک ہوئی تھی اس کی ڈانٹ کو سنتے رہتے
اس کے آگے لب نہ ہلاتے، ملتے جلتے آتے جاتے

آپ میں گر ہمت کی کمی تھی پھر تو سہارا غیر کا لیتے
اس کے چمچوں کو ہی پٹاتے، ملتے جلتے آتے جاتے

رشوت سے یارانہ کرتے "صاحب" اس سے خوش ہو جاتے
خود کھاتے اور اسے کھلاتے، ملتے جلتے آتے جاتے

"بیگم" کو کھلوانا ہی تھا کوٹھی جاتے دکھڑا روتے
چپکے سے "ڈالی" پہنچاتے، ملتے جلتے آتے جاتے

افسر کو افسر ہی سمجھو اپنا نظرؔ و شتواس یہی ہے
شان میں اس کی شعر سناتے، ملتے جلتے آتے جاتے

غزل

مجاہد لکھنوی (کراچی)

جو میرا ہے وہی اس کا ہے کیا کیا جائے
معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے کیا کیا جائے

یہ حسن و عشق کا دھندہ ہے کیا کیا جائے
بڑے ہی گھاٹے کا سودا ہے کیا کیا جائے

عجیب دور یہ آیا ہے کیا کیا جائے
جو اپنا ہے وہ پرایا ہے کیا کیا جائے

ہے باپ بیٹے کا محبوب ایک ہی چہرہ ہے
کہ راستے کی یہ ہنڈیا ہے کیا کیا جائے

ہمارے در سے گزر کر وہ اپنے گھر جائیں
یہ ہند و پاک کا نقشہ ہے کیا کیا جائے

خطوط چند حسینوں کے اور تصویریں
یہ میرے عشق کا ملبہ ہے کیا کیا جائے

جوان ہو کے یہ بن جائے گا میری کا بی
جو تیری گود میں بچہ ہے کیا کیا جائے

چڑھا ہے رند کے ہتھے سنا ہے اب واعظ
بدست زندہ وہ مردہ ہے کیا کیا جائے

کہا یہ ان سے کہ راتوں کو جاگتے ہیں ہم
وہ بولے چوروں کا کھٹکا ہے کیا کیا جائے

ہے دھوم عشق سے ان کے ریٹائر ہونے کی
بڑا حسینوں میں چرچا ہے کیا کیا جائے

یقین کس طرح کر لوں تمہارے کہنے کا
خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کیا کیا جائے

مجاہد آج بھی ماچس کی یاد آتی ہے
کہ جیسے اب بھی وہ زندہ ہے کیا کیا جائے

پرویز یداللہ مہدی
(بمبئی)

یہ ہے بامبے
میری جان

عورت کی عمر، مرد کی آمدنی اور گھر کا پتہ

کہاوت مشہور ہے کہ عورت کی عمر اور مرد کی آمدنی کبھی نہیں پوچھنا چاہیے۔ دانائے راز ازاد کی اس [بات] میں یہ راز پوشیدہ ہے کہ دونوں صورتوں میں جو حاصل جواب آتا ہے وہ اکثر غلط ہوتا ہے۔ کیوں کہ [عو]رت ہمیشہ اپنی عمر گھٹا کر اور مرد عموماً اپنی آمدنی بڑھا چڑھا کر بتاتے ہیں۔ اصل میں عورت اپنی عمر کے [مس]ئلے ناقابلِ حل معمے حل کروا کر خوش ہوتی ہے۔ اور مرد اپنی آمدنی کی آڑ میں عجیب و غریب پہیلیاں بوجھا کر [مح]ظوظ ہوتے ہیں یہ با الفاظ دیگر اس غلط بیانی کا مقصد محض اپنی انا کی تسکین ہوتا ہے اسی لیے سمجھدار لوگ [ک]بھی ان بکھیڑوں میں نہیں پڑتے۔ جب کہ عورت کے چال چلن اور مرد کے رہن سہن سے مطلوبہ امور کا [اند]ازہ لگا لیتے ہیں۔

بمبئی کے لوگ چوں کہ ذرا زیادہ ہی اڈوانس اور دور اندیش ہیں۔ اس لیے عورت کی عمر اور مرد کی آمدنی [کے] علاوہ ایک دوسرے کے گھر کا پتہ پوچھنے سے بھی حتی الممکنہ احتراز کرتے ہیں۔ موخر الذکر احتیاط بھی [اس] لیے برتی جاتی ہے کہ یاروں نے یہاں دور بہت دور بلکہ اتنی دور بسائی ہیں بستیاں کہ کسی نا عاقبت اندیش [کی غ]لطی سے گھر کا پتہ پوچھ بیٹھنے پر اہلِ خانہ ذرا سی ترمیم کے ساتھ فوراً غالب کے اس شعر میں ڈھل جاتا ہے

پوچھتے ہیں ہم سے وہ گھر کا پتہ
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

[دراص]ل گھر کا اتا پتا اسی وقت سمجھایا جا سکتا ہے جب خود اہلِ خانہ کی سمجھ میں آیا ہو جب کہ بمبئی کے بیشتر پتے [پہ]یلیوں اور معموں سے کم نہیں۔ انھیں منہ زبانی سمجھانا جوئے شیر لانے کے برابر ہے چناں چہ کاغذ قلم کے ذریعہ [ب]اضابطہ نقشہ اُتار کر زائچہ ڈال کر سمجھانا پڑتا ہے اور یہ نقشہ بھی عموماً کسی سنسنی خیز جاسوسی کہانی کے خزانے کی [تلا]ش والے نقشوں کی طرح ہوتے ہیں جو کسی تعویذ نما راکٹ یا کسی سیکڑوں برس پرانی لاش کی پاکٹ میں سے [بر]آمد ہوتے ہیں۔ یہاں پر اہلِ خانہ کا المیہ یہ ہے کہ جب تک پُر خطر و پُر پیچ و خم فاصلوں کے لامتناہی [سر]اب جھک، ۔۔۔ یہ گنہ تو ٹھیک ۔۔۔ [illegible]

باشندوں کی اکثریت کے چہرے ہمیشہ یہ گذارش کرتے دکھائی دیتے ہیں، ہمارا پتا پوچھ کر شرمندہ مت کیجیے کم سے کم ہم سے جب بھی کوئی غریب خانے کا پتہ پوچھتا ہے ہم جائے واردات سے فوراً لاپتہ ہوجاتے ہیں۔ اصل میں پتے کو صیغۂ راز میں رکھنے کے پیچھے فاصلوں کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کوئی بھی بھی والا یہ نہیں چاہتا کہ اس کی تنگ و تاریک کھولی میں کوئی معزز مہمان عرف خدا کی رحمت تشریف لائے اور اس قدر زحمت اٹھائے کہ بالآخر اس کی زبان پر بھی یہ شکایت آجائے کہ ؎

زندگی تو نے مجھے قبر سے تنگ دی ہے زمیں
پاؤں پھیلاؤں تو دیوار سے سر لگتا ہے

یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں!

جو سکون آدمی کو تنگی کا ناچ نچاتا ہے اس کے مشہور عناصر ترتیب ہیں۔ روٹی کپڑا مکان

بمبئی میں آدمی روٹی بھی کسی طور کھا لیتا ہے اور کپڑا بھی کسی نہ کسی طرح خرید کر پہن لیتا ہے لیکن مکان کا مسئلہ یہاں مسئلۂ فلسطین سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس ضمن میں سرکاری انتظامیہ کی ساری منصوبہ بندی و منصوبہ سازی بھی برسوں سے ناکامی کا نوحہ پڑھ رہی ہے۔ یوں بھی بمبئی چوں کہ کسی منصوبہ بند اسکیم کے تحت وجود میں نہیں آئی بلکہ خود بخود بس گئی ہے اس لیے یہاں باقاعدہ طور پر بسائی ہوئی بستیاں کم اور خودرو جھاڑیوں کی طرح اگی ہوئی بستیاں جگہ جگہ زیادہ نظر آتی ہیں۔ یہ غالباً اسی تضاد کا نتیجہ ہے کہ یہاں مکانوں عرف کھولیوں اور فلیٹوں کی پیمائش مربع فٹ میں اور فاصلوں کی پیمائش کیلو میٹر میں کی جاتی ہے۔ مکانوں کا رقبہ جس طرح مختصر ہوتا ہے ان تک پہونچنے کا فاصلہ اتنا ہی طویل۔ مثلاً دو ڈھائی سو فٹ کی تنگنائی عرف کھولی تک پہونچنے کے لیے کم از کم چالیس پچاس کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنا لازمی ہے۔ فاصلوں کا یہ جال لیواحمر خدا آدمی کو اس بری طرح دھنک کے رکھ دیتا ہے کہ پھر اس میں اور بے جان روٹی میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ اس چرخے کے ہاتھوں روئی کی طرح اس کا بھی رواں رواں، جوڑ جوڑ جیرخ چلا بول دیتا ہے نتیجتاً جب آدمی ادھ مرا حالت میں اپنے ٹھکانے پر پہنچتا ہے تو کسی لائق نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ بیوی کے بھی لائق نہیں رہتا۔ چناں چہ اکثر اہالیان بمبئی بیوی کی چھیڑ چھاڑ کا جواب چھیڑ چھاڑ سے نہیں، اس شعر سے دیتے ہیں ؎

دفتر سے تھک کر آیا ہوں دیکھو مجھے نہ چھیڑو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں بولے تو سنتے نہیں

البتہ فاصلوں سے جہاں ازدواجی، سماجی اور ثقافتی ہر فرنٹ پر صرف گھاٹا ہی گھاٹا ہے وہیں ایک فائدہ ضرور ہے اور وہ یہ کہ جب آدمی تھکا ماندہ اپنی کھولی میں پہونچتا ہے تو ہر احساس سے بے نیاز ہو چکا ہوتا ہے اور یہ بے نیازی ہی اسے یہ احساس نہیں ہونے دیتی کہ کھولی کے نام پر جیتے جی وہ ایک قبر میں اپنی زندگی کے دن کاٹ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کھولی نشینوں کی اکثریت نہ شکر کے موقعے پر شاکر ہوتی ہے نہ شکوے کے۔ نہ خوشی سے خوش ہوتی ہے نہ غم سے بوجھل۔ بقول شاعر ؎

نہ خوشی سے خوش نہ غم سے خوش نہ مکاں سے خوش نہ مکیں سے خوش
وہ خدا نے ہم کو دیا ہے دل! جو نہ آسماں نہ زمیں سے خوش

مفلس فاروقی (پارسی ٹاکی)

الیکشن یا تماشہ

جو الیکشن کے تماشے کا ہوا اعلان پھر   اُٹھنے والا ہے وطن میں ہر طرف طوفان پھر
اپنا اپنا بل بتائے گا ہر اک بلوان پھر   بھیس انسان کا بدل لیگا ہر اک شیطان پھر

لیکے اپنے اپنے وعدوں کی پٹاری آئیں گے
پھر سے سڑکوں پر سیاست کے مداری آئیں گے

پہلے وی۔پی سنگھ ان کے پیچھے ہی شیکھر گئے   یعنی بدھو لوٹ کر پھر اپنے گھر گئے
تہمتیں رکھ کر مگر اک دوسرے کے سر گئے   ہائے بیچاروں کے لیکن جلد ہی دن بھر گئے

چندر شیکھر نے جو وی۔پی سنگھ کو نکما کر دیا
راجیو گاندھی نے شیکھر کو نہتا کر دیا !!

پھر لنگوٹیں اپنی اپنی کس کے سب تیار ہیں   سب الیکشن کے لیے آمادۂ پیکار ہیں
ایک دو کو چھوڑ سب مکار ہیں عیار ہیں   صورتوں سے ان کی یوں تو سب کے سب بیزار ہیں

پھر بھی ان کی جلسہ گاہوں میں رہے گا اژدھام
ہائے رے بیچارے بھارت کے یہ سادہ دل عوام

ووٹ کی خاطر پسارے اپنی اپنی جھولیاں   لیکے وعدوں کی نشیلی کھٹی میٹھی گولیاں
سب کے اپنے اپنے نعرے اپنی اپنی بولیاں   چل پڑیں گی پھر سیاسی مسخروں کی ٹولیاں

پھر سر بازار اک بہروپ لیکر آئیں گے
نت نئے کرتب دکھا کر تالیاں پٹوائیں گے

اپنے اپنے راگ ہوں گے اپنی اپنی ڈفلیاں   پھر اچھالی جائیں گی اک دوسرے کی پگڑیاں
عزت و ناموس کی پھر سے اڑیں گی دھجیاں   تہمتیں، اسکینڈل، الزام، طعنے، پھبتیاں

پھر رچائی جائیں گی اندر ہی اندر سازشیں
پھر ابھر آئیں گی ذہنوں میں پرانی رنجشیں

لوفروں، غنڈوں کے لٹھ والوں کے دن پھر آئینگے　　شعبدہ بازوں کے نقالوں کے دن پھر جائیں گے
سودا بازوں اور دلالوں کے دن پھر جائیں گے　　شاعروں کے اور قوالوں کے دن پھر جائیں گے

پانچوں گھی میں سر کڑھائی میں نظر آئینگے سب
جو نکمے ہیں کمائی میں نظر آئیں گے سب

مسجد و مندر کے قضیے پھر اٹھائے جائیں گے　　بھوت جو بوتلوں کے سوئے ہیں جگائے جائینگے
دھرم اور مذہب کے پھر ڈنکے بجائے جائیں گے　　نفرتوں کے جام بھر بھر کر پلائے جائیں گے

خوف کی چنگاریاں ہر سمت پھینکی جائیں گی
اور ان پر روٹیاں ووٹوں کی سینکی جائیں گی

نت نئی رتھ یاتراؤں کے چلیں گے سلسلے　　پھر سے جلسوں اور سبھاؤں کے چلیں گے سلسلے
پھر فسادوں کی وباؤں کے چلیں گے سلسلے　　بغض و نفرت کی ہواؤں کے چلیں گے سلسلے

کھیلنے کو پھر سے انسانی لہو کی ہولیاں
چل پڑیں گی خون کے پیاسے بھیڑیوں کی ٹولیاں

لوگ کیا جانیں کہ ہتھکنڈے سیاست کے ہیں کیا　　لوگ کیا جانیں کہ منصوبے حکومت کے ہیں کیا
لوگ کیا جانیں کہ معنی اب قیادت کے ہیں کیا　　لوگ کیا جانیں مزے آخر وزارت کے ہیں کیا

چل پڑیں گے اس طرف جو جس طرف لے جائیگا
ان کے ووٹوں سے پھر اپنی لیڈری چمکائے گا

عیش اور آرام سے محروم بے چارے عوام　　بھوکے ننگے، غربت و افلاس کے مارے عوام
عمر بھر دکھ جھیلتے رہتے ہیں دکھیارے عوام　　حرف و وعدوں پہ بہل جاتے ہیں یہ سارے عوام

سادگی کا ان کی استحصال کرتے ہیں سبھی
عظمت جمہوریت پامال کرتے ہیں سبھی!

دو برس پہلے تو پائی تھی الیکشن سے نجات　　ہر گھڑی اک مدعا سی ایک ٹینشن سے نجات
ہر گلی میں نیت نئے نیتا کے درشن سے نجات　　ہر سڑک پر بے تکے اور بد بھاشن سے نجات

پھر وہی ہم ہیں وہی ہنگامہ ہائے شور و شر
درد سر پہلے جو تھا بن جائے گا درد جگر

ہم تو سمجھے تھے کہ اب کچھ بھی نہ ہوگا پانچ سال　　ہائے ارباب سیاست کی مگر بیہودہ چال
دو برس بھی ہونہ پائے کر دیا سب پائمال　　کر دیا ہم پر مسلط پھر الیکشن کا وبال

یہ الیکشن کیا ہوا۔ بس اک تماشا ہو گیا
احمقوں بچے کے گویا اک بتاشا ہو گیا

○

محمد منظور کمال (بنگوسرائے)

آزادی کی برکتیں

جب ہماری پیدائش ہوئی اور ہم عالمِ بے رنگ و بُو سے عالمِ رنگ و بُو میں آئے تو ہمیں اس کی مطلق خبر نہ ہوسکی۔ غالباً بے خبری کی چادر میں لپیٹ کر پوسٹ کیا گیا تھا۔ جب بے خبری کی چادر زمینی ہوا کی تاب نہ لاکر ہمارے سر سے کچھ کچھ سرکنے لگی تب ہمیں اپنے وجود کا مکمل ادراک ہوگیا۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ ہم آزاد وطن کے آزاد باسی ہیں۔ غلام ملک میں غلام باشندوں کو کسی طرح کی آزادی نہیں تھی، سوائے بچّہ پیدا کرنے کے کہ یہ ایک اندرونی معاملہ ہے اور کسی بھی آئین کی رو سے اس معاملہ میں دخل اندازی نہیں کی جاسکتی۔

آج سے کئی صدی قبل ایک بڑے آدمی نے کسی شخص کو مخاطب کرکے کہا تھا کہ ان کی (بچّوں کی) ماؤں نے انھیں آزاد جنا تھا، تم نے انھیں غلام کب سے بنالیا چوں کہ یہ بات کئی صدی قبل کہی گئی تھی اس لیے اب آوٹ آف ڈیٹ قرار پاگئی ہے۔ ہم مہذب اور جدّت پسند لوگ اتنی پرانی بات یاد رکھنے کی کوشش کریں تو ہاضمہ خراب ہونے کا ڈر رہتا ہے لہٰذا اس بات کی نفی کرتے ہوئے انگریزوں نے ہمارے وطنِ عزیز پر غاصبانہ قبضہ کرلیا تھا اور یہاں کی آبادی کو غلام بنالیا تھا۔ اگرچہ یہ واقعہ اب طاقِ نسیاں کی نذر ہوچکا ہے۔ پھر بھی بزرگوں سے گاہے گاہے رونگٹے کھڑے کردینے والے واقعات سننے کو مل جایا کرتے ہیں۔ ویسے سننے میں آیا ہے کہ جن پر یہ ستم ڈھایا جاتا تھا ان کے رونگٹے نہیں کھڑے ہو پاتے تھے کہ وہ پہلے ہی منظم سازش کے تحت گھوڑے کے برش سے رگڑ رگڑ کر صاف کردیے جاتے تھے۔ یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہمیں کم از کم رونگٹے کھڑے کرنے کی آزادی تو ہے۔ ویسے ہماری آزادی کا دائرہ صرف اسی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ اتنا وسیع ہے جتنا کہ ہمارا دیش۔ ہمارے دیش کو جنّت نشان بھی کہا جاتا ہے۔ دراصل اس جنت کی نشانی کو لوگوں نے اس قدر کھرچا کہ اب وہ جگہ جگہ سے زخم کی طرح رسنے لگا ہے۔ غالباً اسی احساس نے فیض احمد فیضؔ کو "داغ داغ اجالا اور شب گزیدہ سحر" کی ترکیب دی تھی۔ ویسے ہمارے لیڈر اس بات کو نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے کہ چوں کہ ہمارا دیش غریب ہے اور آزادی ملے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے اس لیے بہت سی جگہوں پر روشنی نہیں ہو پاتی۔ اسی لیے جب ہم پرواز کے دوران اپنی سرزمین پر نگاہ ڈالتے ہیں تو کہیں کہیں روشنی اور کہیں کہیں اندھیرا نظر آتا ہے جسے فیضؔ نے داغ داغ اجالے سے تشبیہ دی ہے اور جہاں تک شب گزیدہ سحر کا سوال ہے تو دراصل ملک میں اتنی ساری فیکٹریاں کھل گئی ہیں، جن کی چمنیوں سے خارج ہوتے ہوئے دھوئیں اور گیس کی

وجہ سے سحر، شب گزیدہ نظر آتی ہے۔ فیض نے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے یہ ترکیب استعمال کی ہے ورنہ ہمارا ملک مکمل آزاد ہے اور یہاں کے باشی پوری طرح سے آزادی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ جہاں تک میرا سوال ہے تو میں بھی لیڈروں کی اس صائب رائے سے کلی طور پر اتفاق کرتا ہوں۔ یہ بات میں ہوائی نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ٹھوس حقائق کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ اگر آپ یقین نہیں رکھتے تو چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

مثال نمبر ۱: پہلے ہمارے آباؤ اجداد غلام تھے۔ اس لیے انھیں ووٹ دینے کا حق نہیں تھا۔ مگر اب ہم آزاد ہیں لہذا جب چاہیں ووٹ دے سکتے ہیں۔ "جب چاہیں" سے میری مراد یہ ہے کہ مقررہ میعاد سے قبل بھی اگر ہماری (یعنی عوام کی) خواہش ہو تو حکومت اس کے لیے راضی ہو جاتی ہے۔ بعض ذرا سا توڑ جوڑ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنا ووٹ دینا تو خیر کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ خواہش ہو کہ پورے بوتھ (BOOTH) پر صرف ہم ہی ووٹ دیں تو یہ آرزو بھی ہم بزورِ قوت پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں۔ دراصل ہمارے وہ بزرگ جو غلام ملک میں پیدا ہونے کی وجہ سے ووٹ نہ دے سکے، ان کی روح کو خوش کرنے کے لیے ہم درج بالا تکنک بروئے کار لاتے ہیں ورنہ ہم اتنے غاصب بھی نہیں کہ دوسروں کا حق چھینتے پھریں۔

مثال نمبر ۲: پہلے لوگوں کو بولنے تک کی آزادی نہیں تھی۔ اب نہ صرف ہم زور زور سے بھونک سکتے ہیں بلکہ ضرورت کے تحت کاٹ بھی سکتے ہیں۔ جس کا مظاہرہ ہم آئے دن کرتے رہتے ہیں۔ ویسے یہ کاٹنا کتے کے کاٹنے سے مختلف چیز ہے کتے نے اگر کبھی احتجاجاً کاٹا بھی تو زیادہ سے زیادہ وہ دانت جسم میں گڑائے اور چلتا بنا مگر ہم چوں کہ مہذب انسان ہیں اس لیے ہمارے احتجاج کا دائرہ وسیع ہے جس کی زد میں بڑے بڑے ٹرک، بس، ریل گاڑی کے ڈبے، پٹریاں، سرکاری دفاتر، ٹیلی فون کے تار، بجلی کے کھمبے سبھی آجاتے ہیں۔

مثال نمبر ۳: ہماری یہ روایت رہی کہ ہم خوشی و مسرت کا اظہار کرنے کے لیے آتش بازیوں کا سہارا لیتے رہے ہیں۔ مگر برا ہو غلامی کا کہ انگریزوں نے اسے بھی نہیں بخشا اور نتیجے میں ہمیں سال میں صرف دو بار آتش بازی چھوڑنے کی اجازت دی گئی۔ آپ ہی سوچیے ۳۶۵ دن میں صرف دو دن ہمارے بزرگوں پر کیا قیامت گزری ہوگی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ آزادی کے ساتھ ہی اس پابندی کا بھی قلع قمع ہو گیا اور اب ہم آزادانہ بلکہ فراخ دلانہ حتیٰ کہ جارحانہ انداز میں اس آتش بازی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ چوں کہ آتش بازی چھوڑنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس لیے ہم اکثر و بیشتر اس خوشی میں دوسروں کو بھی شامل کرنے کے لیے ان کے گاؤں پر دھاوا بول دیتے ہیں اور آتش بازیوں کے کرتب دکھا دکھا کر ان کی آتشِ ذوق کو اس قدر بھڑکاتے ہیں کہ وہ بھی آتش زیر پا ہو کر اس کھیل میں پورے جوش و خروش کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں چوں کہ جوش خروش میں ہوش و حواس کو قابو میں رکھنا مشکل کام ہے۔ اس لیے یہ "رقصِ شرر" کبھی کبھی "رقصِ اجل" میں تبدیل ہو جایا کرتا ہے جسے خیر پسند (شر پسند بھی کہہ سکتے ہیں) عناصر بلوہ، فساد جیسے مکروہ ناموں سے پکار پکار کر اس شغلِ بے بہا (جو ہمارے ہاں فرض کے طور پر لیا گیا ہے) کو بدنام کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

مثال نمبر ۴: آپ نے بزرگوں کو اکثر کہتے سنا ہوگا کہ ہماری ہڈی شدہ چیزوں خصوصاً شدہ گھی سے پروان چڑھی ہے۔ دراصل یہ "شدہ" لفظ بھی غلام دور کی دین ہے اور چوں کہ ہم آزاد وطن کے آزاد باسی ٹھہرے اس لیے ہمیں ہر شدہ شے سے نفرت ہے۔ ہمارے بزرگ دودھ میں پانی جیسی شدہ چیز بھی ملانے سے گریز کرتے تھے کہ سزا کا خوف ان پر مسلط تھا۔ ذرا تصور کیجیے کہ ہمارے بزرگوں کو کتنی حقیر سی خواہش بھی پورا کرنے کا موقع نہیں مل پاتا تھا۔ جب کہ ہمیں نہ صرف

دودھ میں پانی ملانے کی آزادی حاصل ہے بلکہ پانی میں دودھ بھی ملانے کی آزادی میسّر ہے۔ آہ! وہ بزرگ اپنا من کیسے سوس سوس کر رہ جاتے ہوں گے! ویسے آج تک میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ شدھ چیز میں دوسری شدھ چیز ملانے سے چیزیں اشدھ کیسے ہو جاتی ہیں۔

مثال نمبر ۵: آزادی سے قبل ہمارے بزرگ ایک دوسرے سے گلے ملنے میں بھی احتراز کرتے تھے کہ کہیں حاکمِ وقت یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ لوگ حکومتِ وقت کے خلاف سرگوشی کرنے کے لیے گلے مل رہے ہیں۔ مگر اب یہ حالت ہے کہ ہم جب چاہیں ایک دوسرے سے گلے مل سکتے ہیں بلکہ گلا دبانے کی خواہش کو بھی بروئے کار لا سکتے ہیں۔ صرف اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ حریف ناتواں ہو ورنہ گلا دبایا ضرور جائے گا لیکن کس کا؟ یہ کہنا ذرا مشکل ہے۔ ویسے کچھ لوگ اس جھنجھٹ میں پڑنا مناسب نہیں خیال کرتے۔ ایسے لوگ نہ حریف سے گلے ملتے ہیں نہ حلیف سے۔ صرف جنسِ لطیف سے گلے ملنے کے شائق رہتے ہیں۔

مثال نمبر ۶: سنا کرتے ہیں کہ پہلے لوگ فرسٹ کلاس میں سفر نہیں کر سکتے تھے کہ یہ گورے لوگوں کے لیے مخصوص تھا۔ آزادی کے بعد غلامی کی اس لعنت کو بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکا گیا۔ اب ہم جس کلاس میں سفر کرنا چاہیں ہمیں کوئی روکنے والا نہیں۔ حتیٰ کہ مفت سفر کی سہولت بھی ہمیں میسّر ہے۔

میرا خیال ہے کہ مندرجۂ بالا مثالوں کی روشنی میں آپ بھی میرے ہم خیال بن گئے ہوں گے۔ یقین مانیے ہم اور آپ خوش قسمت ہیں کہ آزاد ملک میں پیدا ہوئے ورنہ غلام ملک میں پیدا ہوئے ہوتے تو ساری زندگی سسک سسک کر مرنا پڑتا۔ جب کہ آزاد ملک میں ایسی موت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اگر اتفاقاً آپ کو ایسا نادر موقع دستیاب بھی ہو جائے تو آپ کے بھائی بند آپ کو اس دگرگوں حالت میں نہیں چھوڑ سکتے۔ مثلاً آپ بس میں سفر کر رہے ہوں اور راستے میں اتفاقاً حادثہ پیش آجائے اور آپ زخمی حالت میں پڑے کراہ رہے ہوں۔ ایسی حالت میں قریبی گاؤں والے اگر آپ کو اس جان کنی کے عذاب سے نجات دلانا اوّلین فریضہ خیال کریں گے۔ وہ کبھی نہ چاہیں گے کہ آپ اپاہج بن کر زندگی گزاریں یا آپ کو ہسپتال روانہ کیا جائے جہاں آپ کا کام تمام ہونا ہی ہے۔ بہر حال جب آپ کو مرنا ہی ہے تو پھر اتنی دیر عذاب میں مبتلا کیوں رکھا جائے۔ ان سب باتوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے وہ لوگ آپ کو جائے حادثہ پر سے ہی دوسرے سفر پر روانہ کر دیں گے کہ اس سفر پر روانہ کرنے کے لیے کوئی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ کو دوسرے سفر پر روانہ کرکے آپ کا سامان اپنے قبضے میں کر لیں گے کہ اسے بے مصرف یونہی چھوڑ دینا ملک کی جائیداد کو بے سبب ضائع کرنا ہے۔ دوسری بات ان کے ذہن میں یہ آتی ہے کہ مرحوم بھی خوش ہوں گے کہ چلو مرنے کے بعد بھی میں کسی کے کام آیا۔ ●

شکیل اعجاز (اکولہ)

فکر تونسوی کی یاد میں

ہمارے دوست رحمٰن صاحب کی عادت ہے کہ جہاں کسی بڑے ادیب نے ان کے ساتھ حسنِ سلوک کیا شکریہ ادا کرنے اس کے شہر پہنچ گئے۔ یوسف ناظم صاحب نے ان کی کتاب پر مقدمہ لکھا تو رحمٰن صاحب شکریہ ادا کرنے کے لیے بے چین ہو گئے۔ اور جب پتہ چلا کہ مالیگاؤں کے کسی مشاعرے میں آ رہے ہیں تو راتوں رات وہاں پہنچ گئے۔ پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ اس لیے ختم ہونے کا انتظار کیا اور رات کے ۲½ بجے شکریہ ادا کیا۔ جب یہ کہا کہ میں صرف آپ کا شکریہ ادا کرنے یہاں آیا ہوں تو ناظم صاحب نے یقیناً دل میں سوچا ہوگا کہ آج کل لوگ خواہ مخواہ جھوٹ بولتے پھرتے ہیں۔ اسی رات کو ایک فوٹوگرافر سے، کہ عجلت میں تھا اور اس ادبی پروگرام سے گھبرا کر گوشۂ عافیت کی تلاش میں تھا۔ فوٹو کے لیے اصرار کیا گیا۔ اس نے اتنی عجلت میں تصویر اتاری کہ نہ ناظم صاحب کو سر میں کنگھا کرنے دیا نہ رحمٰن صاحب کو مسکرانے دیا۔ اس رات اتفاق سے مجرب چوکڑی کی پتلون اور شرٹ پہنے ہوئے تھے اور یہ تو آپ کو بھی معلوم ہے چوکڑی کے کپڑے کہاں پہنائے جاتے ہیں۔ اس تصویر کو دیکھ کر ہر آدمی پوچھتا ہے کہ کس جرم میں پکڑے گئے تھے یا کہاں سے بھاگے ہوئے ہیں۔ اب سے سات برس قبل فکر تونسوی نے رحمٰن صاحب کی کتاب پر اپنے تاثرات روانہ کیے۔ خط لے کر غریب خانہ پر آئے تھے وہیں شک ہو گیا تھا کہ عنقریب دہلی کا سفر وجود میں آنے کو ہے۔ کسی وجہ سے اس میں تاخیر ہو گئی اس دوران فیاض افسوس صاحب کی کتاب "کفِ افسوس" پر رحمٰن صاحب کے صرف ایک خط پر فکر صاحب نے تبصرہ عنایت کر دیا۔ اب تو رحمان صاحب کا جوشِ شکریہ ابل ہی پڑا۔ جب رحمٰن صاحب (ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی) کو اپنے کسی مہربان کا شکریہ ادا کرنا مقصود ہو اور خرابِ صحت کے باعث اکیلے نہ جا سکتے ہوں تو مزید ایک شخص کا بار بھی اٹھا لیتے ہیں۔ ڈاکٹر مظفر حنفی، ظ۔ انصاری صاحب اور مرحوم خواجہ احمد عباس کے معاملہ میں بھی یہی ہوا۔ اور اب تو فکر صاحب نے ایک نہیں دو احسان کر دیئے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے خرچ سے میرا بھی ریزرویشن کیا۔ میں اوپری دل سے کہتا بھی رہا کہ موڈ نہیں ہے۔ مگر وہ کب ماننے والے تھے۔ ان کی عادت سے واقف ہوں۔ گزشتہ برس جب انھوں نے اپنی کتاب تبصرے کے لیے یوسفی صاحب کو لندن بھیجی تو میں نے خفیہ طور پر نہ صرف ایک اچھا سوٹ سلوایا تھا بلکہ چپکے چپکے انگریزی بھی سیکھنے لگا تھا کہ ممکن ہے وہاں

خوبصورت لڑکیوں کو اردو نہ آتی ہو لیکن میری کم نصیبی اور رحمٰن صاحب کے بیوی بچوں کی خوش نصیبی کہ اِدھر سے کوئی احسان ہی نہیں ہوا جس کا شکریہ ادا کیا جاتا۔ بہرحال ہم دونوں دہلی فکر صاحب کے مکان پہنچے یہ فکر صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔ زیادہ تر وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ میں درمیان میں چھوٹے چھوٹے جملے بولتا رہا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے رحمٰن صاحب پتہ نہیں کیا سوچ رہے تھے۔ دو تین دفعہ ایسا ہوا کہ فکر صاحب نے کوئی بات کہی اور رحمان صاحب سن نہ سکے۔ انھیں بعض جملوں کو دوسری تیسری دفعہ بولنا پڑتا تھا۔ میں نے کہا سائنس میں بڑی بڑی مشینیں ایجاد ہو رہی ہیں۔ لیکن پرانے اور خراب کان نکال کر نئے کان لگانے کی مشین ابھی تک نہیں نکلی۔ فکر صاحب بولے سچ پوچھو تو میں بھی اسی انتظار میں ہوں۔ فرق اِتنا ہے کہ تم اُن کے کان بدلوا دو گے میں اپنی بیوی کی زبان بدلواؤں گا۔ غرض کیا ایسا نہیں ہے کہ رحمٰن صاحب کانوں کی طرف سے لاپرواہ ہیں۔ کانوں کے ایک ڈاکٹر سے رجوع کر چکے ہیں۔ اس نے ایک دوا لکھ کر دی تھی۔ پہلے ہی دن اسے کانوں میں ڈالا تو بہت افاقہ ہوا۔ بسلسل استعمال سے یہ نوبت بھی آئی کہ کسی کے بولنے سے پہلے ہی سُن لیا کرتے تھے۔ چنانچہ گھر کے لوگوں نے دوا غائب کروا دی۔ رحمٰن صاحب مسکرائے مصنوعی غصے سے میری طرف دیکھنے لگے تو فکر صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم کو رحمٰن سے ڈر نہیں لگتا۔ اسے غصہ آگیا تو؟ عرض کیا رحمٰن سے اور اس کے غصے سے تو بہت ڈر لگتا ہے۔ لیکن یہ عبدالرحمٰن سے ڈر نہیں لگتا کیوں کہ مجھے معلوم ہے۔ ان کو اسی پر غصہ آتا ہے۔ جس پر اُتار سکتے ہوں۔ فکر صاحب بولے اس حساب سے تو تم پر آنا چاہیے تم بے حد کمزور اور منہ زور ہو۔ میں نے کہا کم از کم اس وقت غصہ نہیں اتار سکتے کیوں کہ ان کی واپسی کا ٹکٹ میری تحویل میں ہے۔ فکر صاحب مسکرائے بولے اریت تیری کی (ارے تیرے کی) بہت چلاک ہو (چالاک ہو) اِس دوران کوئی صاحب اپنے تین چار برس کے بچے کے ساتھ تشریف لائے۔ پتہ نہیں کون تھے فکر صاحب انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ بے اختیار گلے سے لگا لیا۔ بولے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟ میں کسی کو اسٹیشن بھیجتا۔ وہ صاحب بولے ہاں میں آپ کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ یہ سننا تھا کہ بچہ ان کے پیروں سے لپٹ گیا اور اصرار کرنے لگا کہ مجھے بھی سرپرائز دیجئے۔

بیٹے سرپرائز دینے کی چیز نہیں ہوتی

ابھی تو آپ نے انکل کو دی

اچھا کہاں ہے۔ سرپرائز بتاؤ

مجھے نہیں معلوم بس مجھے سرپرائز چاہیے۔

تم بتاؤ تو۔ کہ یہ ہے سرپرائز۔ پھر تمھیں دیتے ہیں۔

بچہ لاجواب ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی والدہ کے کارگر ہتھیار سے کام لیا یعنی رونے لگا۔ ساری بات چیت دھری رہ گئی۔ آخر کار فکر صاحب اندر گئے اور فریج سے ایک رنگین مٹھائی کا ٹکڑا اسے دیتے ہوئے بولے۔

روتے نہیں بیٹے۔ یہ لو سرپرائز؟

اب بچہ خاموش ہو گیا۔ پھر جتنی دیر ہم لوگ وہاں بیٹھے رہے۔ وہ اطمینان سے سرپرائز کھاتا رہا۔ ہم جیسے نئے لکھنے والوں سے بھی وہ اس طرح ملے جیسے دوستوں یا برابری والوں سے ملتے ہیں۔ ہم واپسی کے لیے کھڑے ہوئے تو

فکر صاحب ایسی ہی دل چسپ باتیں کرتے ہوئے باہر آئے۔ وہاں ایک لڑکے کو دیکھ کر بولے۔
تمہاری مرغی اِدھر گھر میں آکر گندگی کر دیتی ہے۔ اب اگر آئی تو میں کاٹ کر کھا لوں گا۔
واہ۔ کیسے کھا جائیں گے۔ اور آپ کی بلی جو ہمارے ہاں کا دودھ پی جاتی ہے۔
تم اسے کھا جاؤ۔ مجھے کوئی آپت تی (اعتراض) نہیں، فکر صاحب نے جواب دیا اور ہنستے ہوئے گیٹ تک
ہمارے ساتھ سڑک تک آئے بلکہ تھوڑی دور سڑک پر بھی ساتھ چلے۔ ہم بار بار روکتے رہے کہ آپ
شرمندہ نہ کیجئے۔ پوچھا شرمندہ ہو رہے ہو؟ ہم نے کہا ہاں تو لو لے تھوڑا اور شرمندہ کرتا ہوں۔ چند قدم
چلنے کے بعد بولے بس پہلی ملاقات میں اتنی شرمندگی کافی ہے۔ اگلی دفعہ آؤ گے تو اور کر دوں گا۔ مظفر حنفی کو
سلام کہنا جامعہ ملیہ میں اب اچھے لوگ کم رہ گئے ہیں۔ اکولہ پہنچ کر میں نے انھیں خیریت کا خط لکھا۔ فوراً یعنی ۲۴
۸۱ء کو جواب دیا۔ لکھتے ہیں ——
تمہارا خط پڑھا تو اس شگفتگی کا ایسا نقصان دہ اثر ہوا کہ میری بیوی سے جو کشیدگی دو دن سے چل رہی تھی۔
نہ صرف کافور ہو گئی بلکہ کم بخت عشق میں بدل گئی جسے ہم دونوں کئی برسوں سے پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ تمہاری اس
شوخی طبع پر مجھے پہلی ہی ملاقات میں شبہ ہو گیا تھا۔ ممکن ہے یہ شوخی اور شگفتگی تمہارے صاف ستھرے ہینڈ رائٹنگ
میں ہو۔ میں خود بھدا لکھتا ہوں لہٰذا خد و خال بھی بھدے ہیں۔ سنا ہے ہینڈ رائٹنگ سے انسان کا باطن
اُبھرتا ہے۔ کیا تمہارا باطن بھی تمہاری تحریر کی طرح شگفتہ ہے سچ سچ بتانا۔ جھوٹ بولنے میں تکلف کا بوجھ ہوتا
ہے۔ بہرکیف شکریہ کہ تم نے مجھے یاد کیا اور اپنے خط سے میرے کچھ ڈل لمحے سرشار کر دیئے۔
کہتے ہیں دیوار سے کیلنڈر بدلتا ہے۔ تو بچوں کی عمر میں ایک سال کا اضافہ اور بزرگوں کی عمر کا ایک سال کم
ہے آج کل سال گزرنے کا پتہ چلانے کے لیے کیلنڈر بدلنے کی ضرورت نہیں۔ دلّی دوردرشن والے ۳۱ دسمبر
کی رات ایک پروگرام کے ذریعہ سب کو خبردار کر دیتے ہیں کہ نئے سرے سے مصیبتیں جھیلنے کے لیے تیار رہو
اور سال کی سب سے پہلی مصیبت خود یہی پروگرام ہوتا ہے۔ جنوری ۸۴ء کی شب فکر صاحب نے بھی
پروگرام دیکھا اور محظوظ ہوئے لیکن اب انھیں بڑھتی عمر کا احساس ہونے لگا تھا۔ لکھتے ہیں ——
"حسبِ معمول تمہارا خط جلدی) مل گیا تھا اور حسبِ معمول میں دیر سے جواب دے رہا ہوں یعنی ۸۳ء
خط کا جواب ۸۴ میں ایک سال تمہاری زندگی کا بڑھ گیا میرا ایک سال کم ہو گیا۔ آپ کی کتاب کے چند صفحے
پڑھ لیے اکولہ میں پہلے اچھے ادیب ہونے شروع ہوئے اب اچھی پرنٹنگ بھی ہونے لگی ہے (ویسے سچ سچ بتا
کہاں سے چھپوائی ہے) کیا سچ بولنے میں کوئی خدشہ ہے۔ جب آج کل جھوٹ بولنے میں بھی کوئی خدشہ نہیں
میں نے پاکستان جانے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن ضیاء الحق نے ایک بار پھر بیان دے دیا کہ ہم انڈو پاک تعلقات
بہتر بنانا چاہتے ہیں چنانچہ بیان پڑھ کر میں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ گھر سے بہت کم نکلتا ہوں۔ بلکہ نکلتا بھی کب
ہوں۔ بس کانگریس کی طرح عوام سے ناتہ ٹوٹ گیا ہے۔ نئے اہلِ قلم آپ ایسے کی نگارشات پڑھتا ہوں تو
خواب تک نہیں آتا۔ نگارشات کیا ہوتی ہیں تعبیریں تعبیر ہوتی ہیں۔ اس زمانے کے خطوط سے یہی پتہ لگتا
کہ مسافر اپنا تمام سامان پیک کر کے پلیٹ فارم پر بیٹھا گاڑی کا منتظر ہے اور اس دوران جس کسی سے ملاقات
ہو جاتی ہے اس سے دعا سلام خدا حافظ کہتا ہے۔ شہر میں گزرے ہوئے اچھے بُرے دِنوں اور لوگ

کے تذکرے کرتا ہے۔ چھوٹوں کے ساتھ خصوصی شفقت سے پیش آتا ہے۔ اور جس کام کے لیے زندگی وقف کردی اسے جاری رکھنے کے لیے نصیحتیں کرتا ہے۔ زندگی کے پلیٹ فارم کے کنارے بیٹھے ہوئے اس شخص نے جو موت کی ٹرین میں سوار ہونے والا تھا اس دوران اپنے خطوط میں لفظ بزرگی کا اکثر استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ۳ ر فروری ۸۴ء کے خط میں لکھتے ہیں :

" عزیزم سے خطاب کرنے سے ہمیشہ گریز کرتا ہوں کیونکہ اس میں اعتراف بزرگی کا خدشہ رہتا ہے اور بزرگی میں نہ کوئی دانائی ہوتی ہے۔ نہ عظمت ___ اور یوں بھی دروغ بیانی سے خاص تسکین ملتی ہے اور جب ملتی ہے تو خواہ مخواہ سچ کا اعتراف کیوں کیا جائے؟"

اگلے خط [۱۳ / مارچ] میں لکھتے ہیں :

" ایک مشورہ کہ ہر بزرگ مشورہ دیئے بغیر بزرگ نہیں مانا جاتا کہ تم اپنے مضامین میں مزاح کے ساتھ طنز کی آمیزش قدرے زیادہ کردو تو چاہے کسی کو ہونہ ہو مجھے ضرور مسرت ہوگی کیونکہ میں خود طنز زدہ ہوں۔ چاہے اسے ٹریجڈی کہہ لو لیکن اس عالمی ٹریجڈی میں تم بھی شرکت کرلو۔" دوسری دفعہ ہم لوگ ۱۲ ر مارچ ۱۹۸۴ کو دہلی گئے۔ دہلی اردو اکیڈمی نے سہ روزہ جشن بہاراں کا اہتمام کیا تھا ___ اور مجتبیٰ حسین صاحب نے دعوت دی تھی۔ عام طور پر اچھے کاموں میں لوگوں کا پاؤں ہوتا ہے۔ اس میں مجتبیٰ حسین صاحب کا ہاتھ تھا [ہمیشہ کی طرح] کانفرنس سے پہلے فکر صاحب سے ملنے گئے اس وقت تک خط و کتابت کے ذریعہ بے تکلفی کی فضا پیدا ہوگئی تھی اس لیے ملاقات بھی خوشگوار رہی۔ اس دفعہ خود کا تعارف بھی کرانا نہ پڑا۔ جاتے ہی پہچان لیا بولے بہت تھکے ہوئے لگتے ہو۔ میں نے کہا سفر کی وجہ سے، کہنے لگے ہاں وہ بھی ٹکٹ دے کر کیا ہوا۔ اس دفعہ ان کے سر پر پلاسٹر بندھا ہوا تھا۔ پھر بھی ہمیشہ کی طرح ہنستے ہنساتے رہے۔ کہنے لگے مشتبہ کا فون آیا تھا [وہ مجتبیٰ کو کچھ اس طرح ادا کرتے تھے کہ مشتبہ سنائی دیتا تھا] وہاں آنے کے لیے بہت اصرار کیا ہے لیکن میں تو مجبور ہوں۔ ویسے بھی کاغذ قلم کا آدمی ہوں کانفرنس کا نہیں۔ وہاں مجھ سے مضمون بھی نہیں پڑھا جائے گا مجتبیٰ دھوم دھام کا آدمی ہے۔ پڑھتا بھی اچھا ہے۔ پروگرام کے بعد میں ان سے دوبارہ ملنے گیا۔ کہا ابھی نریندر لوتھر بھی آئے تھے۔ بہت اداس تھے اپنی کتاب دے گئے کہہ رہے تھے کہ بہت کم سامعین تھے۔ حالاں کہ شریف الحسن نقوی صاحب نے اردو کے اخبار میں بڑے بڑے اشتہار دیئے تھے۔ انھیں انگریزی کے اخبار میں بھی اشتہار دینا چاہیئے تھا۔ آج کل اردو کا سمجھدار قاری بھی اردو نہیں پڑھتا، انگریزی پڑھتا ہے۔

میں نے فکر صاحب سے جب یہ کہا دوپہر میں کھانے کا انتظام بہت اچھا تھا تو مسکراکر بولے اردو اخبارات میں صرف یہی اعلان کردیتے کہ دوپہر میں کھانے کا انتظام ہے تو اتنے لوگ آجاتے کہ خود شریف الحسن نقوی صاحب کو باہر کھڑا رہنا پڑتا۔

آخری دفعہ ہم لوگ ۱۹۸۷ء میں دہلی گئے۔ اس وقت وہاں فساد کا دور دورہ تھا۔ فکر صاحب بھی فسادات کی خبروں سے رنجیدہ تھے اس دن انھوں نے پہلا جملہ یہی کہا کہ اتنے خراب ماحول میں دو مسلمان ایک ہندو کے ہاں کیسے آگئے۔ غرض کیا ایسے ماحول میں اس سے بہتر پناہ گاہ اور کونسی ہوسکتی ہے؟ سن کر خوش

ہوگئے۔ اس دن نہ صرف میرٹھ اور دہلی کا بلکہ فکر صاحب کے گھر کا ماحول بھی اُداس تھا۔ اچھی طرح یاد ہے مجھے۔ کہہ رہے تھے کہ میں برسوں سے فرقہ واریت کے خلاف لکھتا رہا۔ کچھ فائدہ نہ ہوا چالیس سال پہلے جو ماحول تھا وہی آج بھی ہے تحریریں چھپی دیکھ کر خوش ہوتا رہا کہ لوگ پڑھ رہے ہیں۔ لیکن لوگ انھیں پڑھتے نہیں تھے اس دن وہ ہمیشہ کی طرح دروازے تک بھی نہ آسکے صوفے سے اٹھ ہی نہ سکے بیٹھے بیٹھے ہی خدا حافظ کہہ دیا۔ خدا حافظ جیسے وہ جان گئے تھے کہ دنیا نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ اب انسان انسان کی حفاظت کرنے کے لائق نہ رہا اب خدا ہی انسانوں کی حفاظت کرسکتا ہے۔

فکر تونسوی صاحب کو میں نے پہلا خط، ان سے پہلی ملاقات کے بعد لکھا تھا۔ جی چاہتا ہے اب آخری ملاقات کے بعد ایک اور لکھوں کہ فکرجی! پہلی ملاقات میں آپ نے مجھے چالاک کہا تھا لیکن اب سات سال بعد سمجھ میں آیا کہ اصل میں تو آپ بہت چالاک ہیں جو اس کوچہ جارحیت کو چھوڑ کے گوشۂ عافیت میں چلے گئے۔ اور خدا حافظ کہہ کر اپنے ہزاروں چاہنے والوں کو دنیا کے، اور دنیا کو ان کے حوالے کر گئے ہیں۔ واقعی یہ دنیا جو آپ کی چالیس سالہ کوششوں سے سدھر نہ سکی اب اس کا خدا حافظ ہے کہئیے۔ اریت تیرے کی۔ ■■

سید عباس متقی (حیدرآباد)

مرا شہر چوراں٭ ....

جب سارے شہر میں حیدرآباد کے چار صد سالہ جشن کے انعقاد کا اعلان ہوا اور اخبارات کے ذریعے زور و شور سے اطلاع ملی کہ اس ضمن میں اردو زبان کی ایک یادگار قائم کرنا طے پایا ہے تو عوام کا ایک عقل مند طبقہ اس بحث میں الجھ گیا کہ اردو کے نام پر بت نصب ہو یا مینار تعمیر کیا جائے۔ جدہ میں حیدرآبادیوں نے خوشیاں منائیں کہ اردو بولنے والے ابھی زندہ ہیں تو زندگی کا ثبوت دیتے ہوئے ہم نے بھی ایک انگڑائی لی اور شریکِ جشن ہونے کے لیے خود کو چاق و چوبند کر لیا اگرچہ حیدرآباد انتظامیہ کے حسنِ انتظام کا زبانِ حال سے مرثیہ خواں تھا۔ سڑکوں پر وہی گڑھے تھے۔ کچرے کے وہی انبار تھے۔ کہیں موری جوش مار رہی تھی تو کہیں نالہ نالہ زن تھا۔ کہیں زیرِ زمیں راستوں کی تعمیر کے سبب راستے مسدود ہو گئے تھے تو کہیں راستوں ہی کا نام و نشان نہ تھا۔ پانی کے لیے ایک جمِ غفیر خالی گھڑوں کے ساتھ سیاسی شور شرابے سے جلوس نکال رہا تھا۔ بلاک مارکٹنگ بامِ عروج پر تھی۔ رشوت کا بازار پہلے سے زیادہ گرم بلکہ سرگرم تھا۔ اساتذہ طلبا کی دستگیری سے بے نیاز تھے تو طلبا ہوسِ داد خواہی میں گرفتار۔ نل اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہی ہچکیاں لے رہا تھا تو بجلی سلیقے سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ ضعفا ٹھوکریں کھا رہے تھے تو بے روزگار نوجوان اپنے چبوتروں پر بیٹھے اپنے مقدر کو کوس رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود شکر ہے کہ چار سو سالہ جشن کی تیاری بامِ عروج پر تھی۔ مہربان طبیعہ نے مادرِ مہربان اردو کے نام پر ایک خطیر رقم منظور کر کے اپنی کشادہ قلبی اور زندہ دلی کا ثبوت دیا۔

کسی تقریب کے انعقاد سے قبل اہلِ خانہ اپنے گھر کو سنوارتے ہیں، داغ دوزی کرتے ہیں پھر سجاتے ہیں۔ بعد ازاں جشن مناتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ایک مدت تک اس بات کا افسوس کرتے ہیں کہ بلا ضرورت یہ تقریب منعقد کی اور اپنے ہاتھوں بجٹ کا ستیاناس کر ڈالا لیکن سرکاری معاملات میں چل کہ غربت کے اندیشے کا کوئی گزر نہیں ہوتا اور ہر کام سرکاری پیمانے پر کیا جاتا ہے اس لیے بعد کی پشیمانی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ حکومت کے بجٹ اور گھر کے بجٹ میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ شاید جشن منانے کے لیے دلوں کا سرور بہت ضروری ہے اور ہمارا دل اس وقت تک مسرور نہیں ہو سکتا جب تک ہماری لیاقت کا لوہا نہ تسلیم کر لیا جائے اور ہماری لیاقت کا تسلیم کیا جانا بالفاظِ دیگر ہماری چاندی ہوتا ہے اور ہماری چاندی اردو کے بول بالا ہونے سے مشروط ہے۔ یہی ساری تان اردو پر ٹوٹتی ہے۔ جشنِ حیدرآباد اور جشنِ اردو گویا ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ اب کاسے دل کو واقعی سرور حاصل ہوگا۔ جشنِ حیدرآباد کے طفیل اردو کا جشن ہو جائے گا اور اردو کا جشن گویا اردو زبان کے

٭ مرا شہر لوگاں سوں معمور کر (محمد قلی)

عقدِ ثانی —— سیّد علی شبنم کاروارِی

عقدِ ثانی کا ارادہ ہے کروں یا نہ کروں
عمر آدھی سے زیادہ ہے کروں یا نہ کروں
خون کا جوش بھی آدھا ہے کروں یا نہ کروں
ایک بیوہ سے بھی وعدہ ہے کروں یا نہ کروں
دوستو میری یہ خواہش ہے صلاح کے قابل
دیکھیے ہوں کہ نہیں میں بھی نکاح کے قابل

یہ میری آس ابھی غور طلب ہے یارو
پہلی بیوی کی اجازت بھی غضب ہے یارو
مرحلہ اتنا بھی آسان یہ کب ہے یارو
اس کی خاموشی تا تل کا سبب ہے یارو
خواب شرمندۂ تعبیر نہ جانے کب ہو
مہرباں مجھ پہ یہ تقدیر نہ جانے کب ہو

اکتفا ایک ہی سہرے پہ کیا ہے اب تک
ایک ہی قاضی کا احسان لیا ہے اب تک
ایک ہی ساقی سے پیمانہ پیا ہے اب تک
ایک ہی آس پہ یہ بندہ جیا ہے اب تک
ایک دلہن ہو نئی ایک ہنی مون نیا
تاکہ شریانوں میں گردش کرے پھر خون نیا

عقدِ اول تو ضرورت بھی تقاضا تھا ہوا
وہ تو ماں باپ کی کوشش کا نتیجہ تھا ہوا
دولھا بننے کا ہمیں شوق بھی تازہ تھا ہوا
وہ تو اک عہدِ جوانی کا تماشا تھا ہوا
دوسری شادی بھی البتہ تماشا ہوگی
میری خواہش کی میری عمر کی چرچا ہوگی

عقدِ ثانی میں مگر پہلی سی وہ بات کہاں
رقص شہنائی وہ ہنگامۂ بارات کہاں
لیسنے اوبٹن کی وہ مہندی کی رسومات کہاں
جو ہوا کرتی ہیں جتنی بھی خرافات کہاں
نہ تو گھوڑا ہی یہاں ہوگا نہ ڈولی ہوگی
دو میرے یار اک دلہن کی سہیلی ہوگی

سرد جذبات ہیں کچھ ان کو حرارت تو ملے
چاہیے رنگ ہے نور ہو چاہت تو ملے
ناتواں جسم کو کھوئی ہوئی طاقت تو ملے
یہ تو مل جائے گی بیوی کی اجازت تو ملے
ایسے موقع پہ ہوا کرتی ہے بیوی گونگی
وارننگ دیتی ہے کہ جان بھی میں دے دوں گی

آگ پہ تیل ہے زخموں پہ نمک ہے یہ عمل
ایک طوفان ہے بجلی کی کڑک ہے یہ عمل
[illegible] جس میں بہت ہیں وہ سمجھ لیں یہ عمل
سر پہ معشوق کے گر جور فلک ہے یہ عمل
طنز کا طعنہ [illegible]

میں بھی ہوتے ہیں اور رہا کرفیو تو وہ آرام کا موسم ہے اور جبر واستحصال، ظلم وزیادتی! آپ کی پیاری اردو کا ایک محاورہ ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ آخر اس محاورہ کی صداقت ہم پہنچانا بھی تو ضروری ہے سو کچھ شرفا سماج کی اس خدمت میں بھرتی مصروف ہیں۔ ہم نے اپنی پچھلے داریاتوں سے حیدرآباد کا بھرم رکھنے کی کوشش کی لیکن بادشاہ کو مصروف پایا۔ ایسا معلوم ہوا کہ انھیں سب معلوم ہے۔ ہم نے مکرر بہلانا چاہا۔ اعلیٰ حضرت کی تاریخی عمارت چارمینار کی داغ دوزی کی گئی ہے۔ شاید اس کے قریب دو چار میں ایک اور مینار تعمیر کیا جائے گا۔ اس کی تعمیر یہاں کی گنگا جمنی تہذیب کا آئینہ دار ہوگا۔ ہماری یہ ساری گفتگو بے اثر تھی۔ بادشاہ بہنوز مصروف آہ وگریہ تھا۔ اب ہم سے رہا نہ گیا۔ ہم کسی کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکتے خواہ وہ معنے ملا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ ہاتھ جوڑ کر آہ وزاری کا سبب دریافت کیا۔ ارشاد ہوا۔ مایدولت کا منشا یہ نیں تھا کہ حیدرآباد فرخندہ بنیاد منے صرف پتھر کی عمارتاں تعمیر کی جائیں۔ اپنے رب سوں مایدولت نے یو مناجات کی تھی مرا شہر لوگاں سوں معمور کر۔ لوگاں ابھی کیسے ہمارے لوگاں کے نمن تمنا جیسے نئیں۔ تمہارا شمار لوگاں میں کیکو ہوئیگا۔ نئیں نئیں۔ نا تمہارے کنے من کی دولت تاتن کی عزت ہوئے لعل کا پاس نہ اپنوں کا لحاظ۔ میں شہر میں ادمیاں منگا تھا پن کی یاں ادمیاں ہچ نئیں دستیں۔ یہ نکو سمجھو منجے کچھ نیں معلوم منجے سب پتہ ہے۔ کاں کیا ہوا ہے سب منجے معلوم ہے۔" شہزادے کا یہ شکوہ سن کر ہم شرم سے پانی پانی ہو رہے تھے۔ اب تو ہمیں بھی اپنی حالت پر اور اپنے شہر اور اس کے باسیوں کی حالت پر رونا آیا۔ بادشاہ کی آواز میں آواز ملا کر رونے لگے۔ ہچکی بندھ گئی۔ بیگم کی آواز آئی۔ آخر یہ کیا تماشا ہے۔ سینے پر قطب شاہ کا دیوان رکھے کیوں ہنس رہے ہو۔ انھیں کیا پتہ کہ جس آواز کو وہ ہنسی سے تعبیر کر رہی تھیں دراصل وہ ہماری سسکیاں تھیں۔ ہم پر کھل چکا تھا کہ بیاض قدیم کے مصرع میں اصل لفظ "لوگاں" تھا جس کو زمانے کی الٹ پھیر نے "چوراں" بنا دیا ہے۔

■■■

یوسف امتیاز (ٹورنٹو، کنیڈا)

ذراہٹ کے ذرا بچ کے ——
یہ ہے بمبئی میری جان ——

یہ کوئی انسٹھ سال پہلے ۱۹۳۱ء کی بات ہے کہ ہندوستان میں بولتی فلموں کی نمائش شروع ہوئی۔ بس پھر کیا تھا ایکا ایک زندگی میں ایک لہر آگئی۔ ہل چل مچ گئی۔ گونگے کو زبان مل گئی۔ زبان بھی ایسی کہ اب تک بولنے سے تھکی نہیں۔ الف لیلی کی کہانیوں جنوں اور پریوں کے قصوں میں پڑھی گئی یہ زبان سوگز سے زیادہ لمبی ہے۔ سینما بینی تو خاموش فلموں ہی سے ہندوستانی عوام کے لیے ایک نشے کی طرح ہے جواب تک اترنے کا نام نہیں لیتی۔ لوگ کھانا پینا بھول کر سینما کے لیے گھنٹوں لائین میں کھڑے رہتے ہیں۔ سردی ہو یا گرمی بارش ہو یا گرمی، سینما ہال جل گئے، آگ لگی تماشہ بین جل گئے مگر کیا مجال کہ افیون کے اس نشے میں کمی آئی ہو۔ ایک عرصے تک فلم سازوں نے الف لیلیٰ یا مشرق وسطیٰ کی تہذیب پر جی کھول کر تیسرے اور چوتھے درجے کی کامیاب اور ناکام فلمیں بنائیں۔ نسخہ آسان تھا۔ کچھ پگڑیاں جمع کیں اور کچھ SLEEPING PAJAMA ہمہ اقسام کی داڑھیاں اور مونچھیں، کچھ تلواریں۔ بے تحاشہ طائفے ڈھول پیٹے، کمر مٹکا کر ناچ ہوا، کچھ فحش گانے اور ہلکی سی کامیڈی۔ ہیرو ہمیشہ کی طرح سرخرو رہا۔ ولن بے چارا سدا جوتے کھاتا رہا اور ہیرو کے ہاتھوں خوب پٹائی قبول کی۔ جوتے بھی کھلائے اور ہیروئن بھی نہ ملی،

بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہ سلسلہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے حتیٰ کہ بعض اداکار صرف اس رول کی نذر ہوگئے ہیں۔ جنھیں تماشہ بین پٹتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اور خود بھی جی کھول کر سارے زمانے کی گالیاں دیتے ہیں اب صرف تکنیک بدل گئی ہے رنگ آگئے اور سارا ماحول MODERNIZE کر دیا گیا۔

جب بولتی فلموں کا رواج شروع ہوا تو ہندوستان کے مختلف شہروں سے طوائفیں، ناچنے والیاں، بھانڈ اور گویے سب ایک ایک کرکے جمع ہونے لگے اس وقت تک فلم سازوں کو نہ کہانی نویس کی تلاش تھی اور نہ ہندوستان کے بھوکے پیاسے شاعروں کی ضرورت، کلاسیکل شاعروں کا کلام، سورداس، میرا اور کبیرداس کے دوہے، گیت، بھجن سب ہی فلموں میں عام ہوگئے۔ طبلہ، ہارمونیم اور سارنگی سے کام چل گیا۔ لوگ

نہ جانے کدھر آج میری ناؤ چلی رے۔ چلی رے چلی رے میری ناؤ چلی رے"

بڑے ہی پیار اور اہتمام سے سنتے جھومتے ہیرو ہیروئن جھوم جھوم کر گاتے اور پھر محبت کی خاموش لہروں میں بہہ جاتے K.C.DAY

سینما بینوں کو یا تو "بابا من کی آنکھیں کھول" گاکر نصیحت کرتے یا پھر "تیری گٹھڑی میں لاگا چور مسافر" گاکر خبردار کرتے رہے۔ ہیروئن "چل چل رے نوجوان" گاگاکر اپنی محبت کا اظہار کرتی۔ کتنی معصومیت، کتنا پیار، کتنی پاکیزگی، کتنا تقدس تھا ان کے عشق میں کبھی کبھی شادی بیاہ کا منظر ہوتا، گاؤں کے میلے میں ناٹک ہوتا جس میں اکثر گانے والے کچھ اس طرح کے گیت گاتے۔

میں تو دلی سے دلہن لایا رے او بابوجی۔ میرا بمبئی سے بابو آیا رے او بابوجی۔

دھن آسان شاعری آسان لیکن دوکل ذیشن ہم تک بندی اپنے معراج پر بس اور کیا چاہیے۔ دیکھنے والے کا دل بھی بہل گیا تعزیہ گیر اور یہی گانے سڑکوں گلی کوچوں میں گلا پھاڑ پھاڑ کر گائے گئے بھیک مانگنے والے اسی پر اپنی خیرات کماتے۔ شاہ بیاہ اور براتوں میں بینڈ باجے والے بڑے ہی اہتمام سے یہ دھن بجارہے ہیں۔

چھوڑ گئے بالم مجھے ہائے اکیلا چھوڑ گئے

اخلاقیات، مذہبیات کے واعظ لوگوں کو فلموں کے مضر اثرات سے ہر بار ڈراتے دھمکاتے رہے یہاں تک کہ دوزخ کا پاسپورٹ بھی دلوا دیا مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے لوگ خود تو جہنم نہیں گئے مگر واعظوں کو ضرور نرگ پہنچا دیا۔ عوام کے پیٹ بھوکے مگر فلم بینی کی طلب میں اضافہ ہی ہوتا رہا اور جادو سر چڑھ کر بولنے لگا جس کے لیے نہ تو بھانامتی کی ضرورت تھی اور نہ بھوت پیت شیطان کی۔ آہستہ آہستہ مغرب کے ہالی وڈ کی طرح ہندوستان کے فالی وڈ (FOLLY WOOD) یا بیلی وڈ BALLYWOOD نے بھی رنگ بدلنے شروع کیے۔ گرگٹ نے بھی اتنی تیزی سے غالباً اتنے رنگ نہ بدلے ہونگے اور نہ سانپ نے اپنی کینچلی۔ موسیقی کا جادو چڑھنا ضروری تھا اس لیے فالی وڈ نے بھی سر دھن، مار دھاڑ اور موسیقی کے لیے میں تبدیلی لائی اور پھر ایسا بھائی دینے لگا کہ وہ پرانی فلمیں جو لوگ زور وشور سے دیکھتے تھے قصہ پارینہ بن گئے اب ہر ایک زبان پر اس گیت کی طرح ایک نیا انداز تھا پرانی فلمیں اب تاریخ بن گئیں ؎

آئے بھی وہ گئے وہ ختم فسانہ ہوگیا۔ میرے لیے تو موت کا ایک بہانہ ہوگیا۔

ہیرو، ہیروئن کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے ہیں۔ یکایک بادل گھر آتے ہیں سارا ماحول گھن گرج سے گونجنے لگتا ہے۔ کم بخت ہیروئن کو ایسے ہی وقت نیند آجاتی ہے وہ میٹھے سپنوں کی دنیا میں کھو جاتی ہے ایسے منظر کو دیکھ کر ہیرو ایک نیک اور دیانتدار محبوب کی طرح کچھ اور نہ سہی تو گاکر التجا کرتا ہے ؎

"دھیرے دھیرے جا رے بادل دھیرے دھیرے جا۔ میرا بلبل سو رہا ہے شور و غل نہ مچا"

اور محبوب کا بلبل ہیرو کے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے التجا کرتے اور منتوں کے باوجود نیند سے بیدار نہیں ہوتا اور غالباً اس وقت تک سوتا رہتا ہے جب تک کہ ہیرو کا یہ راگ دیپک ختم نہیں ہوتا اور سننے والے کے کان بہرے نہیں ہو جاتے۔ فلم کے ہیرو ہیروئن کا نہ جانے کیا بنا اور آگے کیا ہوا اس کو جاننے کی ضرورت نہیں ہے مگر اس وقت کے منچلے نوجوانوں کے لیے اپنی خوابوں کی ملکہ ہر نوجوان لڑکی وہ دو سے نینوں کے بان چلانے والی لڑکی محبوبہ یا بیوی تو نہ بن سکی مگر بلبل ضرور بن گئی۔ ہر ایک اب عورت کو بلبل پکارنے لگا۔ نیا زمانہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ چھیڑ چھاڑ اور خطاب کے طریقے بدل گئے" دو جسم ایک روح دو دل ایک جان جیسے محاورے تو اکثر سننے میں آتے تھے مگر بھلا ہو ہماری انڈسٹری کی نئی شاعری کا وہی بات کچھ اس طرح ادا ہونے لگی۔

تو میرا چاند میں تیری چاندنی۔ تو میرا راگ میں تیری راگنی۔
نہیں دل کا لگانا کوئی دل لگی کوئی دل لگی . . . . .

یا پھر تو گنگا کی موج میں جمنا کا دھارا ۔ ہو رہے گا ملن یہ ہمارا تمہارا

محبت کے اظہار اور ان تشبیہوں کا کیا کہنا۔ چھیڑ چھاڑ کا ایک اور نیا طریقہ ہاتھ آگیا۔ ہر آتی جاتی لڑکی کے آگے پیچھے بھونڈی آواز میں یہی گیت دہرائے جا رہے ہیں۔ ہیروئن چہک چہک کر اپنے محبوب کو دعوتِ ملاقات دے رہی ہے ؎ ۔

ایک تو ہو ایک میں ہوں ۔ ندی کا کنارہ ہو۔

ملن پیارا پیارا ہو ۔ ہو ہو ہو ہو ہو . . . . .

ایسے گیت تو ان شاعروں کے لکھے ہوئے ہیں جو واقعی شاعر نہیں بلکہ تک بندی، توڑ جوڑ اور قافیہ جوڑنے میں ماہر ہیں مگر ذرا شکیل بدایونی کے ان ارشادات کو سنیے۔

افسانہ لکھ رہی ہوں ۔ دلِ بے قرار کا
آنکھوں میں رنگ بھر کے تیرے انتظار کا

اس بات سے کس کو انکار ہے کہ فلموں کے گانے موقعہ، سین اور ضرورت کے لحاظ سے لکھے جاتے ہیں۔ مزاحیہ گانوں میں آنا میری جان سنڈے، سوا لاکھ کی لوٹری، پھر ہوا اتر گئی اور چیچی چیچی سر چہ تیرا چکرائے دل ڈھونڈا جائے آجا پیارے پاس ہمارے کاہے گھبرائے طرح کے گیت مذاق اور موضوع کی مناسبت اور کردار کے لحاظ سے لکھے گئے۔ مگر مجروح صاحب سی اے ٹی کیٹ CAT اور آر اے ٹی RAT جیسا بے معنی، فضول، واہیات گیت لکھ سکتے ہیں تو پھر عام گیت کاروں کو کیوں مقتل چڑھایا جائے۔

فلموں میں خوب رو پری چہرہ یا گلیمر چہروں کی آمد آمد سے فلم سازوں کے لیے شروع میں کافی دقتوں کا سامنا رہا۔ اداکار خوب صورت، شہزادہ بہار یا بہار سے لعل کی رانی سہی مگر نہ گانے سے واقف اور نہ ناچ سے۔ ہماری انڈسٹری میں ہر مشکل کا آسان حل ہے۔ گانے کے لیے پہلے تو ہمارے فلمی پنڈتوں نے BACK GROUND کا ٹیک جیسی چیز ایجاد کی جس میں گانے والے پردہ پر صرف ہونٹ ہلاتے تھے اور پیچھے کوئی گاتا تھا پھر ترقی کی منزلیں طے ہوئیں اتنی ہی تیزی سے جتنی تیزی سے ہمارے فلم کی ریل REEL چلتی ہے اور کہانی آگے بڑھتی ہے PLAY BACK گانے والوں کی ایک نئی نسل پیدا ہوئی جن کے گانے پہلے ریکارڈ کر لیے جاتے ہیں اور پھر بعد میں اداکار پر فلمائے جاتے ہیں۔ ہالی ووڈ والوں نے ایسی اختراع نہ کبھی دیکھی اور نہ سنی اس لیے ان کی ڈکشنری میں SINGER PLAYBACK جیسا کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔ اب رہا ناچنے کا سوال تو صورت پری چہرہ کی ہے گھنگھرو اور طبلے کی تھاپ پر مٹکنے والے ہاتھ اور پاؤں کسی اور کے۔ یہ ہے کیمرے کا کمال۔ اس سے [illegible] نسخہ کیا۔ فلم دیکھنے والوں نے اپنے محبوب ستارے کو ناچتے گاتے تھرکتے بھی دیکھ لیا۔ طبیعت نہال اور دل باغ باغ۔

بات گیتوں اور شاعروں کی تھی۔ بعض نے جی کھول کر استاد شاعروں کے کلام سے استفادہ کیا بلکہ سرقہ کیا۔ توڑ مروڑ کر اپنا لیا اور اپنی جیب بھر لی۔ چھوٹے موٹے کے شاعروں نے فلمی دنیا میں اپنی دوکان سجائی، مانگ بڑھی اور نام کا لیبل مشہور ہوا تو کھلے بازار میں کوڑیوں کے مول گیت خرید لیے اور نام اپنا چسپاں کر لیا۔ رسٹورانٹ میں پیٹ بھر کھانا بھی کھایا اور گلاس بھی نہیں ٹوٹا۔ کوئی کان بھی نہیں لگا سکتا کہ کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا ایک روپیہ۔ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ جب بازار میں ٹکے کا دودھ مل جاتا ہے تو گھر میں بھینس پالنے سے فائدہ۔

ہندوستان میں اور موسموں کی طرح ایک اور موسم بھی ہوتا ہے اور وہ ہے شادیوں کا موسم۔ لیکن انٹرول سے تھوڑی دیر پہلے یا فوراً بعد ہیرو ہیروئن غلط فہمیاں اور دوریوں کے پھیلائے ہوئے جال کا شکار ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے فلم ختم ہونے سے کچھ دیر پہلے

نہ بچھڑ جاتے ہیں رونا دھونا چلتا ہے۔ کھانا پینا بند ہے نہ ہیرو کو کوئی ہوش ہے اور نہ ہیروئن کو مگر ایسے ہی وقت ہیروئن کو اچانک یاد آیا ہے کہ وہ ہیرو کو ملا رنگ، دنیا بھول گئی تھی:

تم مجھ کو بھول جاؤ اب ہم نہ مل سکیں گے ڈالی پہ پھول ہیں تو اب نہ کھل سکیں گے

خدا بھلا کرے کہ ان پیار کے متوالوں کو جلانے کے لیے یا تو کسی کی برات اس کے گھر کے سامنے سے گزرتی ہے یا پھر قریب میں شادی کی تیاریاں ہوتی ہیں۔

جب دنیا کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں اپنے پرائے بن جاتے ہیں تو یکایک ان عاشقوں کو اللہ میاں یا بھگوان کی یاد جاتی ہے مندر پہنچ کر یا پھر گھر ہی میں مورتی یا تصویر کے آگے گڑگڑا کر التجا کی جاتی ہے:

او روٹھے ہوئے بھگوان تم کو کیسے مناؤں کوئی نہیں سنتا تو میں کیسے سناؤں

طوفان میں ڈالی پہ کلی تھی لوٹ رہی ہے اک آس تھی وہ آس بھی اب ٹوٹ رہی ہے

اس ٹوٹی ہوئی آس کو لے کر کہاں جاؤں او روٹھے ہوئے بھگوان تم کو کیسے مناؤں

اگر مسلم کلچر پر مبنی ہو تو وہ اسلامی کہلائی۔ بھلا کوئی پوچھے کہ بندۂ خدا اس میں اسلام کو کیا لینا دینا۔ کوٹھے کی ڈالی میں ہاتھ کالے۔ ہیروئن ہاتھ پھیلا کر کعبہ کی تصویر کے آگے دعا مانگتی ہے:

بے کس پہ کرم کیجیے سرکارِ مدینہ گردش میں ہے تقدیر بھنور میں ہے سفینہ

دوسری طرف ویلن نے ساز رقص اور سرود کی محفل سجائی ہے۔ شراب مختلف رنگوں میں لٹ رہی ہے صرف ایک گھونٹ پی کر خدا بھی بہکنے لگتے ہیں۔ گانے اور ناچ کی محفل میں جلوہ ریا حسن تھرک تھرک کر ناچتے گانے لگتا ہے:

دیکھو جی چاند نکلا پیچھے کھجور کے بصرے کی حور ناچے آگے حضور کے

جب پہلی ملاقات ہوئی تو کان لگا کر سننے اور چوری چھپے دیکھنے والی گاؤں کی ساری لڑکیاں مٹکے سنبھالے جمع ہو جاتی ہیں اور جب کوئی انھیں بلائے نہ بلائے زبردستی کی مہمان بن کر ناچنے گانے لگتی ہیں:

چپ چپ کھڑے ہو ضرور کوئی بات ہے پہلی ملاقات ہے یہ پہلی ملاقات ہے

مگر کچھ دنوں بعد جب ہیروئن ہیرو سے بچھڑ کر رات کی خاموشی میں آسمان کی طرف دیکھ کر گانے لگتی ہے:

تو کون سی بدلی میں میرے چاند ہے آجا تارے ہیں مرے زخم جگر ان میں سما جا

اب نے دل کی دھڑکنے اور ٹوٹنے کے بارے میں پڑھا ہے۔ مگر کم بخت ایک دل کے ٹکڑے ہزار ہوتے ہوئے فلم میں سنا اور اس کم ظلم یہ کہ دل کے یہ ٹکڑے ایک جگہ نہیں گرتے بلکہ:

ایک دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

نہ صرف دل کے ٹکڑے ہونے اور یہاں وہاں گرنے تک محدود نہیں ہے بلکہ آگے بڑھ کر شاعر صاحب کی مہربانی سے یہاں تک پہنچ گئی:

جیون کے سفر میں ہم جن کو سمجھتے تھے ہمارے ساتھی ہیں
دو قدم چلے اور بچھڑ گئے کوئی یہاں گیا کوئی وہاں گیا

اس سفر کے یہ ساتھی نہ [illegible] ضعیف تھے، نحیف تھے، کمزور تھے، اپاہج تھے یا لنگڑے تھے جو ٹھہر ہی نہیں سکتے تھے جو چل دیے

زیادہ گمانے میں مہارت رکھتے تھے ۔ اس حسن کمال کی داد دی جائے یا اس حسن تخیل پر رو دیا جائے ۔ ماتم ہو ۔ اس کا فیصلہ تو سننے والے کے T.Q پر ہے ۔ سونے پر سہاگہ کہ لوگ بار بار اس کو سنے جا رہے ہیں ۔

یہ تو ہماری خوش قسمتی تھی کہ فالی وڈ کو کچھ عرصے تک راجہ مہدی علی خاں، شکیل، کیفی، پریم دھون، راجندر کرشن، شیلندر، مجروح، ساحر، جاں نثار، اسد بھوپالی جیسے لکھنے والے مل گئے اور کچھ عرصے کے لیے خواہ مخواہ کی تک بندی سے نجات مل گئی، چھما چھما کر فلمی جیون سفر کے یہ ساتھی دو چار قدم چلے پھر بچھڑ گئے ۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا ۔

شراب نئی بوتلوں میں خوب مزا دیتی ہے ۔ پرانے گیت اب REPRODUCE کیے جا رہے ہیں ۔ رواں زمین، سہل ردیف قافیہ والا غزل نما گیت گھنٹوں گنگنایا جا سکتا ہے ۔ اگر مصرعے اور بندیلوں نہ ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں ۔ گنگناتے اور کوئی تھک سکتا ہے ۔

ایک قارون کا خزانہ ہے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا ۔ بقول مجروح ۔ اپنی اپنی ہمت ہے اپنا اپنا دل مجروح

مٹا سکے تو مٹا دے دنیا بنانے والا بنا ہی دے گا

رلا سکے تو رلا دے دنیا ہنسانے والا ہنسا ہی دے گا

مشتاق احمد یوسفی

(تیسری قسط)

اسکول ماسٹر کا خواب

بزرگوار کی حکمت عملیات

رشوت اور مالش کی مجموعی رقم اب گھوڑے کی قیمت اور ان کی قوت برداشت سے تجاوز کر چکی تھی۔ پکڑ دھکڑ کا سلسلہ کسی طرح ختم ہونے کو نہیں آتا تھا۔ عاجز آکر انھوں نے رحیم بخش کی زبانی انسپکٹر کو یہ تک کہلایا کہ تم میرے مکان میں آ گاہی کے کام پر ملازم ہو جاؤ۔ موجودہ تنخواہ سے زیادہ دوں گا۔ اس نے کہلا بھیجا "سیٹھ کو میرا اسلام بولنا اور کہنا کہ ہم مین ہیں"۔

انھوں نے گھوڑا تانگہ بیچنا چاہا تو کسی نے سو روپے بھی نہ لگائے۔ بالآخر اس پریشانی کا ذکر اپنے والد بزرگوار سے کیا۔ انھوں نے سارا احوال سُن کر فرمایا "اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہم دعا کریں گے۔ تانگے میں جوتنے سے پہلے ایک گلاس دم کیا ہوا دودھ پلا دیا کرو۔ اللہ نے چاہا تو لنگ جاتا رہے گا اور چالانوں کا سلسلہ بھی بند ہو جائے گا۔ ایک دفعہ وظیفے کا اثر تو دیکھو"۔

بزرگوار نے اسی وقت رحیم بخش سے بستر پہ ہارمونیم منگوایا۔ وہ دھونکنی سے ہوا بھرتا رہا اور بزرگوار کانپتی کپکپاتی آواز میں حمد گانے لگے۔

ترے ہاتھ میں ہے فنا بقا تری شان جل جلالہٗ
تری شان جل جلالہ

آنکھ جہاں پڑتی وہاں انگلی نہیں پڑ رہی تھی۔ اور جس پردے پہ انگلی پڑتی، اس پہ پڑی ہی رہ جاتی۔ ایک مصرع گانے اور بجانے کے بعد یہ کہہ کر لیٹ گئے کہ اس ہارمونیم کے کالے پردوں کے جوڑ جکڑ گئے ہیں۔ ماسٹر باقر علی نے خاک مرمت کی ہے۔

دوسرے دن بزرگوار کی چارپائی ڈرائینگ روم میں آ گئی۔ اس لیے کہ یہی ایک ایسا کمرہ تھا جہاں گھوڑا علی الصبح اپنے ماتھے پہ "اللہ" لکھوانے اور دم کروانے کے لیے اندر بلایا جا سکتا تھا۔ صبح تڑکے بزرگوار نے دو نفلوں کے بعد عرق گلاب میں انگلی ڈبو کر گھوڑے کی پیشانی پہ اللہ لکھا اور سُموں کو لوبان کی دھونی دی۔ کچھ دیر بعد اس پر ساز کسا جانے لگا تو بشارت دوڑے دوڑے بزرگوار کے پاس آئے اور کہنے لگے گھوڑا دم کا دودھ نہیں پی رہا۔ بزرگوار متعجب ہوئے۔ پھر آنکھیں بند کر کے سوچ میں پڑ گئے۔ چند لمحوں بعد انہیں نیم وا کر کے فرمایا "کوئی مضائقہ نہیں۔ کوچوان کو پلا دو۔ گھوڑا وجع الانسان* میں مبتلا ہے۔ اس کے بعد یہ معمول بن گیا کہ دم کا دودھ رحیم بخش نوش جان کرنے لگا۔ بظاہر ایسی کراہت سے پیتا جیسے اس زمانے میں یونانی دواؤں کے قدحے پیے جاتے تھے۔ یعنی ناک پکڑ کے، منہ بنا بنا کے۔ اللہ شافی، اللہ شافی! (نعوذ باللہ) کہتا جاتا۔ دودھ کے لیے نہ جانے کہاں سے دھات کا بہت لمبا گلاس لے آیا جو اس کی ناف تک پہنچتا تھا۔ بزرگوار کی عملیاتی تدابیر کا اثر پہلے ہی دن ظاہر ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ اس دن چالان والا ایک داڑھی والے نے کیا۔ رحیم بخش اپنا لہراتا ہوا چابک ہاف ماسٹ کر کے کہنے لگا۔ "سرکار! با وجود دودھ لیا"! پھر اس نے قدرے تفصیل سے بتایا کہ ایک داڑھی والا آج ہی جمشید روڈ کے حلقے سے تبدیل ہو کے آیا ہے۔ بڑا ہی رحم دل، اللہ والا آدمی ہے۔ چیاں چہ صرف ساڑھے تین روپے لیے۔ وہ بھی بطور چندہ۔ پڑوس میں ایک بیوہ کے بچے

---

* وجع الانسان: دانتوں کے درد کو کہتے ہیں۔ جس شخص کے دانتوں میں درد ہو، وہ اس کا تلفظ بھی نہیں کر سکتا۔

کے علاج کے لیے۔ آپ چاہیں تو ان سے ملاقات کرلیں۔ بل کے بہت خوش ہوں گے۔ ہر وقت منہ ہی منہ میں وظیفہ پڑھتا رہتا ہے۔ اندھیری رات میں اس کے گٹے سے ایسی روشنی نکلتی ہے کہ سوئی پرو لو۔ (اپنے بازو سے تعویذ کھولتے ہوئے) گھوڑے کے لیے یہ تعویذ دیا ہے۔

کہاں پچیس روپے کہاں ساڑھے تین روپے! بزرگوار نے رشوت میں کمی کو اپنے وظیفے اور کشف و کرامات پر محمول کیا اور فرمایا کہ تم دیکھتے جاؤ۔ انشاء اللہ چالیسویں دن "بے رحمی!" کے انسپکٹر کو گھوڑے کی ٹانگ نظر آنی بند ہو جائے گی۔ بزرگوار کی چارپائی کے گرد ان کا ساز و سامان بھی ڈرائنگ روم میں قرینے سے سجا دیا گیا۔ دوائیں، بیڈ پین، حقہ، سلفچی، ہارمونیم، آغا حشر کے ڈرامے، مولانا آزاد کے "الہلال" کے مجلد فائل، انبیا کے آلات اور کجن ایکٹرس کی تصویر۔ ڈرائنگ روم اب اس قابل نہیں رہا تھا کہ اس میں گھوڑے اور بزرگوار اور ہر دو کا فضلہ اٹھانے والی مہترانی کے علاوہ کوئی اور پانچ منٹ بھی ٹھہر سکے۔ بشارت کے دوستوں نے آنا چھوڑ دیا۔ لیکن وہ گھوڑے کی خاطر بزرگوار کو برداشت کر رہے تھے۔

ایک گھوڑا بھوسے گا کتنے پیٹ ؟

جس دن سے داڑھی والے مولانا تعینات ہوئے، رحیم بخش ہر چوتھے پانچویں دن آ کے سر پہ کھڑا ہو جاتا۔ "چندہ دیجیے!" لیکن ڈھائی تین روپے یا زیادہ سے زیادہ پانچ میں آئی بلا ٹل جاتی۔ اس سے جرح کی تو معلوم ہوا کہ کراچی میں تانگے اب صرف اسی علاقے میں چلتے ہیں۔

تانگے والوں کا حال گھوڑوں سے بھی خستہ ہے۔ انہوں نے پولیس اور "بے رحمی والوں" کا برائے نام ماہانہ باندھ رکھا ہے جو ان کی گزر بسر کے لیے بالکل ناکافی ہے۔ ادھر بھوکے بھوکے گدھا گاڑی والے مکرانی سر پہ چاڑنے پیتیا رہ جاتے ہیں۔ زخمی گدھا پسینے میں شرابور گدھا گاڑی والا اور پھٹے حالوں "بے رحمی" کا انسپکٹر...... یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ان میں کون زیادہ خستہ اور مظلوم ہے۔ یہ تو ایسا ہی تھا جیسے ایک سوکھی بھوکی جونک دوسری سوکھی بھوکی جونک کا خون پینا چاہے۔ نتیجہ یہ کہ "بے رحمی والے" پھر پہلے ہی اکلوتی موٹی اسامی یعنی ان کے تانگے کے انتظار میں گلی کے نکڑ پہ کھڑے ہو جاتے اور اپنے پیسے کھرے کر کے چل دیتے۔ اکیلا گھوڑا سارے محلے کے بال بچوں کا پیٹ پال رہا تھا۔ لیکن کرامت حسین (داڑھی والے مولانا کا یہی نام تھا) کا معاملہ قدرے مختلف تھا۔ وہ اپنے حلیے اور پھٹے حالوں سے اتنے مسکین لگتے تھے کہ محسوس ہوتا تھا گویا انہیں رشوت دینا کارِ ثواب ہے۔ اور وہ رشوت لے کر درحقیقت رشوت دینے والے کو داخلِ حسنات کر رہے ہیں۔ وہ رشوت مانگتے بھی خیرات ہی کی طرح تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا سارا رزق اس گھوڑے کی لنگڑی ٹانگ کے توسل سے نازل ہوتا ہے۔ ایسے پیشہ ور رشوت لینے والے کے لیے ان کے دل میں نہ کوئی ہمدردی تھی نہ خوف۔

کتوں کے چال چلن کی چوکیداری

احباب نے مشورہ دیا کہ گھوڑے کو ویٹرنری ہاسپٹل میں انجکشن سے ٹھکانے لگا دو۔ لیکن ان کا دل نہیں مانتا تھا۔ بزرگوار تو سنتے ہی روہانسے ہو گئے۔ کہنے لگے "آج لنگڑے گھوڑے کی باری ہے۔ کل اپاہج باپ کی ہوگی۔" شریف گھرانوں میں آئی ہوئی دلہن اور جانور تو مر کر ہی نکلتے ہیں۔ وہ خود تین دلہنوں کے جنازے نکال چکے تھے، اس لیے گھوڑے کے بارے میں بھی ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ رحیم بخش بھی گھوڑے کو ہلاک کرانے کے سخت خلاف تھا۔ جیسے ہی ذکر آتا اپنے تیس سالہ تجربات بیان کرنے بیٹھ جاتا۔ یہ تو ہم نے بھی سنا تھا کہ تاریخ درحقیقت بڑے لوگوں کی بایوگرافی ہے۔ لیکن رحیم بخش کی جوانی کی ساری آٹو بایوگرافی دراصل گھوڑوں کی بایوگرافی تھی۔ اس کے تین سابق آقاؤں نے ریٹائرڈ گھوڑوں کو ذبح کے انجکشن لگوائے تھے۔ پہلا آقا تین دن کے

اندر اندر چت پٹ ہو گیا۔ دوسرے کا چہرہ لقوے سے ایسا ٹیڑھا ہوا کہ دائیں باچھ کان کی لو سے جا ملی۔ ایک دن غلطی سے آئینے میں خود پر نظر پڑ گئی تو گھگھی بندھ گئی۔ تیسرے کی بیوی جاکی کے ساتھ بھاگ گئی۔ دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھا جائے تو ان تینوں میں جو فوراً مر گیا، اسی کا انجام نسبتاً باعزت معلوم ہوتا ہے۔

اسی زمانے میں ایک سائیس خبر لایا کہ لاڑکانہ میں ایک گھوڑی تیلیا کمیت بالکل مفت یعنی تین سو روپے میں (!) رہی ہے۔ بس وڈیرے کے دل سے اتر گئی ہے۔ گنّے کی فصل کی آمدنی سے اس نے گنّے ہی سے لمبائی ناپ کر ایک امریکی کار خریدی ہے۔ آپ کی صورت پسند آجائے تو ممکن ہے مفت ہی دے دے۔ اس کی مخالفت پہلے ہم نے اور بعد میں بزرگوار نے کی۔ ہمیں ان دنوں کتّے پالنے کا نیا نیا شوق ہوا تھا۔ ہر بات انہی کے حوالے سے کرتے تھے۔ کتّوں کے لیے من حیث الجنس ہمارے دل میں دفعتاً اتنا احترام پیدا ہو گیا تھا کہ کتیا کو مادہ کتّا کہنے لگے تھے۔ ہم نے بشارت کو سمجھایا کہ خدارا! مادہ گھوڑا نہ خریدو۔ عامل کالونی میں دستگیر صاحب نے ایک مادہ کتّا پال لیا ہے۔ کسی خیر خواہ نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ جس گھر میں کتّے ہوں، وہاں فرشتے، بزرگ اور چور نہیں آتے۔ اس ظالم نے یہ نہ بتایا کہ پھر صرف کتّے آتے ہیں۔ اب سارے شہر کے بالغ کتّے ان کی کوٹھی کا محاصرہ ڈالے پڑے رہتے ہیں۔ عفیفہ خود غنیم سے ملی ہوئی ہے۔ ایسا تن داتا نہیں دیکھی۔ جو بوائے اسکاؤٹ کا "ماٹو" ہے وہی اس کا: ....'BE PREPARED!' مطلب یہ کہ ہر حملہ آور سے تعاون کے لیے ہمہ تن تیار رہتی ہے۔ پھاٹک کھولنا ناممکن ہو گیا ہے۔ خواتین نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ مرد اسٹول رکھ کے پھاٹک اور کتّے پھلانگتے ہیں۔ دستگیر صاحب ان کتّوں کو دونوں وقت باقاعدگی سے راتب ڈلواتے ہیں تاکہ آنے جانے والوں کی پنڈلیوں کے بوٹوں سے اپنا پیٹ نہ بھریں۔ ایک دفعہ راتب میں زہر ڈلوا کر بھی دیکھ لیا۔ گلی میں کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ اپنے خرچ پر ان کی تدفین کروائی۔ ایک صاحب کا پالتو کتّا جو صحبتِ بد میں پڑ گیا تھا، اس رات گھر والوں کی نظر بچا کر تماش بینی کرنے آیا۔ وہ بھی وہیں کھیت رہا۔ ان جید کتّوں کے مرنے سے جو خلا پیدا ہوا وہ اسی طرح پُر ہوا جس طرح ادب اور سیاست میں پُر ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ نئی نسل کے نوجوانوں نے آگے بڑھ کر اس تیزی سے پُر کیا کہ خلا بالکل ناکافی ثابت ہوا۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ خود کو (INDISPENSABLE) یعنی بے مثل و بے بدل سمجھنے والوں کے مرنے سے جو خلا پیدا ہوتا ہے وہ درحقیقت صرف دو گز زمین میں ہوتا ہے جو انہیں کے جسدِ خاکی سے اسی وقت پُر ہو جاتا ہے۔ خیر یہ علیحدہ قصّہ ہے۔ کہنا یہ تھا کہ اب دستگیر صاحب سخت پریشان ہیں۔ "پیڈگ ری" (خاندانی) مادہ ہے۔ نیچ ذات کے کتّوں سے شجرہ بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ میں نے تو دستگیر صاحب سے کہا تھا کہ ان کی توجہات DIVERT کرنے کے لیے کوئی معمولی ذات کی کتیا رکھ لیجیے تاکہ کم از کم یہ دھڑکا تو نہ رہے۔ راتوں کی نیند حرام نہ ہو۔ تاریخ میں آپ پہلے آدمی ہیں جس نے کتّوں کے چال چلن کی چوکیداری کا بیڑا اٹھایا ہے۔

مونسِ تنہائی

اس قصّے سے ہم نے انہیں عبرت دلائی۔ بزرگوار نے دوسرے پیرائے سے گھوڑی خریدنے کی مخالفت کی۔ وہ اس پر بہت برافروختہ ہوئے کہ بشارت کو ان کے کراماتی وظیفے پر یقین نہیں۔ وہ خاصے گلیر تھے۔ بیٹے کو کھل کر تو گالی نہیں دی۔ بس اتنا کہا کہ تمہیں اپنی نسل چلانے کے لیے پیڈگ ری گھوڑی ہی درکار ہے تو شوق سے رکھو۔ مگر میں ایسے گھر میں ایک منٹ نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے یہ دھمکی بھی دی کہ جہاں بلبن گھوڑا جائے گا وہ بھی جائیں گے۔ قصّہ دراصل یہ تھا کہ بزرگوار اور گھوڑا ایک دوسرے سے اس درجہ مانوس ہو چکے تھے کہ اگر گھر والے مانع نہ ہوتے تو وہ اسے ڈرائنگ روم میں اپنی چارپائی کے پائے سے بندھوا کر سوتے۔ وہ بھی ان کے

قریب آکر خود بخود سر نیچا کر لیتا تاکہ وہ اُسے بیٹھے بیٹھے پیار کر سکیں۔ وہ گھنٹوں ہنسے منہ بھرائے اس سے گھر والوں اور بہوؤں کی شکایتیں اور برائیاں کرتے رہتے۔ بچوں کے لیے وہ زندہ کھلونا تھا۔ بزرگوار کہتے تھے جب سے یہ آیا ہے میرے ہاتھ کا رعشہ کم ہو گیا ہے۔ اور بُرے خواب آنے بند ہو گئے۔ وہ اب اُسے بیٹا کہنے لگے تھے۔ سدا روگی سے اپنے پرائے سب اکتا جاتے ہیں۔ ایک دن وہ چار پانچ گھنٹے درد سے کراہتے رہے۔ کسی نے خبر نہ لی۔ شام کو اختلاج اور مایوسی زیادہ بڑھی تو خالہ ماں نے کہا کہ بلبن بیٹے کو بلاؤ۔ بڑھاپے اور بیماری کے بھیانک سناٹے میں یہ دکھی گھوڑا لال کا واحد ساتھی تھا۔

ایک لقمۂ تر کی صورت

گھوڑے کو جوت نہیں سکتے۔ بیچ نہیں سکتے۔ ہلاک نہیں کروا سکتے۔ گھر سے کھلا نہیں سکتے۔ پھر کریں تو کیا کریں۔ جب ایک موقع ملتا تو اندر ہی اندر کھولتے اور اکثر سوچتے کہ سیٹھ، سرمایہ دار، وڈیرے، جاگیردار اور بڑے افسر اپنی شقاوت اور کرپشن کے لیے زمانے بھر میں بدنام ہیں۔ مگر یہ "بے رحمی" والے "دو ٹکے کے آدمی" کس سے کم ہیں۔ انہیں اس سے پہلے ایسے رجعتی اور غیر انقلابی خیال کبھی نہیں آئے تھے۔ ان کی سوچ میں ایک مردم گزیدہ کی کلبیت اور جھنجھلاہٹ در آئی۔ یہ لوگ تو غریب ہیں، مظلوم ہیں۔ مگر یہ کس کو بخشتے ہیں؟ سنتری بادشاہ بھی تو غریب ہے۔ وہ ریڑھی والے کو کب بخشتا ہے؟ اور غریب ریڑھی والے نے کل شام آنکھ بچا کر ایک سیر سیبوں میں دو داغ دار سیب ملا کر تول دیے۔ اس کی ترازو صرف ایک چھٹانک کم تولتی ہے۔ صرف ایک چھٹانک فی سیر کہ ایک من کر تو سنے کی گنجائش نہیں۔ اسکول ماسٹر لائق صد رحم و احترام ہے۔ ماسٹر نجم الدین برسوں سے جیتے جاگتے لڑکا سے ظالم سماج کو کوستے پھرتے ہیں۔ انہیں ساڑھے چار سو روپے کھلا کے جب جا کے بھانجے کے میٹرک کے نمبر بڑھے۔ اور رحیم بخش کوچوان سے یا وہ مسکین کون ہو گا؟ ظلم ظالم اور مظلوم دونوں کو خراب کرتا ہے۔ ظلم کا پہیہ جب اپنا چکر پورا کر لیتا ہے اور مظلوم کی باری آتی ہے تو وہ بھی وہی کچھ کرتا ہے جو اس کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اژدہا سالم نگلتا ہے۔ شارک دانتوں سے خونم خون کر کے کھاتی ہے۔ شیر ڈاکٹروں کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اچھی طرح چبا چبا کے کھاتا ہے۔ بلی، چھپکلی، مکوڑی اور مچھر حسب مقدور و مقدار خون کی تیس لگاتے ہیں۔ بھائی میرے! بخشتا کوئی نہیں۔ وہ یہاں تک پہنچے تھے کہ معاً انہیں اپنے انکم ٹیکس کے ڈبل بہی کھاتے یاد آ گئے اور وہ بے ساختہ مسکرا دیئے۔ بھائی میرے! بخشتا کوئی نہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کا رزق ہیں۔ بڑے جتن سے ایک دوسرے کو چیرتے پھاڑتے ہیں۔

تب نظر آتی ہے اک لقمۂ تر کی صورت

۴

سطحِ سمندر اور خطِ ناداری سے نیچے

آئے دن کے حالات تاوان سے وہ عاجز آ چکے تھے۔ کیسا اندھیر ہے۔ سارے پاکستان میں یہی ایک جرم رہ گیا ہے۔ بہت ہو چکا۔ اب وہ اس کا دو ٹوک فیصلہ کر کے چھوڑیں گے۔ مولانا کرامت حسین سے وہ ایک دفعہ مل چکے تھے۔ اور ساری دہشت نکل چکی تھی۔ پون انچ کم پانچ فٹ کا بودا! اس کی گردن ان کی کلائی کے برابر تھی۔ گول چہرے اور تنگ پیشانی پر چیچک کے داغ ایسے چمکتے تھے جیسے تانبے کے برتن پر ٹھنکے ہوئے کھیرے۔ آج وہ گھر کا پتا معلوم کر کے اس کی خبر لینے جا رہے تھے۔ پورا ڈائلاگ ہاتھ کے اشاروں اور آواز کے زیر و بم سمیت تیار تھا۔ آج اس کا ڈاڑھا پکڑ کے پوچھوں گا کہ ماتھے پہ یہ ادھورے

سدھو رہے گئے کا ٹریڈ مارک لگائے پھرتے ہو۔ ایک دفعہ پیسہ آگ میں دہکا کر اچھی طرح داغوا کیوں نہیں لیتے کہ پانچ وقت ٹکریں مارنے کی جھنجھٹ سے نجات ملے۔ داڑھی پر انہیں کسی دل جلے کی پھبتی بھی یاد آئی۔ "تقریر تقدس کا چھجا!" اُن کے طنز کا سارا زور نماز پڑھنے اور داڑھی رکھنے پر تھا گویا اصل گناہ وہی ہے۔ "سمجھتے کیا ہو؟ تم جیسے چیپڑ قنات تو اپنے نیفے میں رکھتا ہوں۔ حلوہ پلاؤ کھا کھا کے تم ملّاں لوگ ایک دوسرے کی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ اللہ کی رسّی کو پکڑ رہے ہو! تم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو! میں کبھی اپنی پر آ گیا تو پائی پائی آنتوں میں سے نکلوا لوں گا۔" ریہرسل اتنا مکمل تھا کہ ذہن میں یہ تک نوٹ کر لیا تھا کہ اللہ کی رسّی کہنے سے پہلے دل میں نعوذ باللہ ضرور کہیں گے۔

انہیں لیاری میں مولانا کرامت حسین کی جھگی تلاش کرنے میں خاصی دشواری ہوئی حالانکہ بتانے والے نے بالکل صحیح پتہ بتایا تھا کہ جھگی بجلی کے کھمبے نمبر ۲۲ کے عقب میں کیچڑ کی دلدل کے اس پار ہے۔ تین سال سے کھمبے بجلی کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ پتے میں اس کے دائیں جانب ایک گیابھن بھوری بھینس بندھی ہوئی بتائی گئی تھی۔ سڑکیں نہ راستے۔ گلیاں نہ فٹ پاتھ۔ ایسی بستیوں میں گھروں کے نمبر یا نام کا بورڈ نہیں ہوتا۔ ہر گھر کا ایک انسانی چہرہ ہوتا ہے۔ اسی کے پتے سے گھر ملتا ہے۔ کھمبا تلاش کرتے کرتے انہیں اچانک ایک جھگی کے ٹاٹ کے پردے پر مولانا کا نام کرامت حسین سرخ روشنائی سے لکھا نظر آیا۔ بارش کے ریلوں نے بدخط لکھائی کو خطِ غبار بنا دیا تھا۔ کراچی کا یہ سب سے پسماندہ علاقہ سطحِ سمندر اور خطِ ناداری (POVERTY LINE) سے کئی فٹ نیچے تھا۔ سمندر کا حصہ ہوتے ہوتے اس لیے رہ گیا تھا کہ درمیان میں انسانی جسموں کا ایک ڈھیٹ پشتہ کھڑا ہو گیا تھا۔ زمین سے ہر وقت کھاری پانی رستا رہتا تھا جو لکڑی اور لوہے کو چند مہینوں میں گلا دیتا تھا۔ ہوا میں رکے ہوئے سمندری پانی کی سڑاند بسی ہوئی تھی جو سڑی ہوئی مچھلی کی بدبو سے بھی بدتر تھی۔ چاروں طرف ٹخنوں ٹخنوں بجا بجا کیچڑ۔ خشک زمین کہیں نظر نہ آئی۔ چلنے کے لیے لوگوں نے پتھر اور اینٹیں ڈال کر پگڈنڈیاں بنائی تھیں۔ ایک نو دس سال کی بچی سر پر خود سے زیادہ بھاری گھڑا رکھے اپنی گردن اور کمر کی جنبش سے پیروں کو ڈگمگاتے پتھروں پر اور گھڑے کو سر پر بیلنس کرتی آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پسینے کے ریلے بہہ رہے تھے۔ راستے میں جو بھی ملا اس نے بچی کو احتیاط سے چلنے کا مشورہ دیا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پانچ چھ اینٹوں کا ٹریفک آئی لینڈ آتا تھا۔ جہاں جانے والا آدمی کھڑے رہ کر آنے والے کو راستہ دیتا تھا۔ جھگیوں کے اندر بھی کچھ ایسا ہی نقشہ تھا۔ بچے، بزرگ اور بیمار دن بھر اونچی اونچی کھاٹوں اور کھٹولوں کے اندر پر ٹنگے رہتے۔ قرآن شریف، لپٹے ہوئے بستر، برتن بھانڈے، متروکہ جائداد کی دستاویزات، میٹرک کے سرٹیفکیٹ بانس کے مچان پر۔۔۔ ترپال تلے۔ اور ترپال کے اوپر مرغیاں۔ مولانا کرامت حسین نے جھگی کے ایک کونے میں کھانا پکانے کے لیے ایک ٹیکری پر ایک چبوترہ بنا رکھا تھا۔ ایک کھاٹ کے پائے سے بکری بھی بندھی تھی۔ کچھ جھگیوں کے سامنے بھینسیں کیچڑ میں دھنسی تھیں اور ان کی پیٹھ پر کیچڑ کا پلاستر چڑھا ہوا تھا۔ یہ بھینسوں کی جنت تھی۔ ان کا گوبر کوئی نہیں اٹھاتا تھا، اس لیے کہ اُپلے تھاپنے کے لیے کوئی دیوار یا خشک زمین نہیں تھی۔ گوبر بھی انسانی فضلے کے ساتھ اسی کیچڑ میں متھ جاتا تھا۔

ان ہی جھگیوں میں ٹین کی چادر کے سلنڈر نما ڈبے بھی نظر آئے جن میں دودھ بھر کے صدر کی سفید ٹائلوں والی ڈیری کی دکانوں میں پہنچایا جاتا تھا۔ ایک لنگڑا کتا جھگی کے باہر کھڑا تھا۔ اس نے اچانک خود کو جھرجھرایا تو اس کے زخم پر بیٹھی ہوئی مکھیاں اور ادھ سوکھے کیچڑ کے چھینٹے اڑ اڑ کر بشارت کی قمیص اور چہرے پر لگے۔ جن پڑھنے والوں نے اس زمانے کی بہار کالونی، چاکی واڑہ اور لیاری نہیں دیکھی وہ شاید اندازہ نہ کر سکیں کہ انسان ایسی گندی، اگھوری حالت میں نہ صرف زندہ رہ سکتا ہے بلکہ نئی زندگیوں کو جنم بھی دے سکتا ہے۔ ایسا تعفن، ایسی بھیانک غلاظت تو مشرقی پاکستان میں بھی نظر نہ آئی۔ وہاں انسان کیسا ہی کم از کم فقیر تو

مہربان تھی۔ دھوپ، پانی اور ہوا ہر چیز کو پاک اور صاف کرتے رہتے تھے۔ چلچلاتی دھوپ، لال آندھیاں، بچّے کے آنسو والی برسات، کف در کنار سیلاب، سائیکلون۔ ۔ ۔ ۔ ان سے زیادہ تیز و تند ظالم اور بے خطا ڈِش انٹلکچوئل اور کیا ہوگا۔ تاہم بار ایسا وہ منظر نہیں بھولتے۔ لگتا ہے کسی نے ذہن پر تیزابی قلم سے کندہ کر دیئے ہیں۔

سونار بنگلہ

۱۹۶۷ء میں ہمیں کام سے ''فیری'' سے مشرقی پاکستان کا دورہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ چھ سات سو میل کے سفر میں کوئی فرلانگ نہ تھا جس میں اوسطاً پانچ چھ آدمی سڑک پر پیدل چلتے نظر نہ آتے ہوں۔ اوسطاً بیس میں سے صرف ایک کے پیر میں چپل ہوں گے۔ نہ بہ نے پہ سے تن پر کپڑا نظر آیا، سوائے میّت کے راستے میں تین جنازے ایسے دیکھے جن کے کفن کا چادر دو مختلف رنگوں کی لنگیاں کر بنائی گئی تھی۔ ایک ضعیف شخص ایک جنازے پر پھٹی چھتری لگائے چل رہا تھا۔ یہ مرنے والے جوان کا باپ تھا۔ اس کی سفید داڑھی آنکھوں سے بارش کے ریلے بہہ رہے تھے۔ ہم باریسال سے گزر رہے تھے۔ بلا کی اُمس تھی۔ پیاس سے بُرا حال۔ پانی پانی پینے کا سوال ہی نہ تھا۔ ایک بے تکلف دوست نے ٹپ دیا تھا کہ راستے میں خودکشی کرنے کو جی چاہے تو بازار سے کوئی بھی چیز لے کر کھا لینا۔ ناریل کے بارے میں البتہ ایک بنگالی دوست نے کم و بیش وہی بات کہی جو غالب آدم کے بارے میں کہہ گئے ہیں :-

انگبیں کے بحکم ربّ الناس
بھر کے بھیجے ہیں سر بہ مہر گلاس

اس دوست نے کہا تھا ناریل میں جراثیم کا گزر نہیں۔ پانی کے بجائے یہی توڑ توڑ کر پینا۔ السر کو بھی فائدہ کرتا ہے۔ ہم نے چھ آنے کے دو ناریل خریدے۔ ڈرائیور نے ناریل والے ہی سے مانگ کر پانی پیا اور اپنے حصّے کا ناریل کار کے بوٹ میں سنگوا کر رکھ لیا۔ ہم ناریل وہیں توڑا۔ اندر کھوپرے کی بہت پتلی اور نرم تہ نکلی۔ ایسے ادھ کچّے ناریل کی ڈاب بہت مفرّح، ملیّن اور خیریں ہے۔ ڈاب پی کر ناریل ہم نے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا۔ پان والے سے ''تھری کاسل'' سگریٹ کی ڈبیا خریدی۔ سگریٹ نکلا بے حد پرانا اور سوکھا کھڑنک۔ کیڑے نے اس میں مہین مہین سوراخ کر دیئے تھے جن کی وجہ سے کش میں جگہ جگہ پنکچر ہو جاتے تھے۔ ایسے سگریٹوں سے ہمارے یہاں ان گھروں میں تواضع کی جاتی ہے جہاں صاحبِ خانہ خود سگریٹ نہیں پیتا اور عید الفطر پر خریدے ہوئے سگریٹ کے پیکٹ سے دوسری عید الفطر تک بالاصرار اپنے ملاقاتیوں کے حلق اور اخلاق کی آزمائش کرتا رہتا ہے۔ ہم ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ وہ کون سا ظالم کیڑا ہوگا جو تمباکو سے اپنا پیٹ بھر کے زندہ رہتا ہے۔ اس کا مار الحم اور کشتہ بنا کر کینسر کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ اتنے میں ایک بوڑھی عورت کوڑے کے ڈھیر کی طرف بڑھی۔ اس نے کھورے کی گہرائیوں میں سرنگیں لگاتی ہوئی بلّیوں اور ایک آنول سے جڑی آلائش کو بھنبھوڑتے ہوئے کتے کو ڈھیلے مار مار کر بھگا دیا۔ اس کے تن پر بغیر جھولی کی لیر لیر ساری کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ قدم جما جما کر گھورے پر چڑھی۔ جیسے ہی اس نے پیر سے آنول پرے ہٹایا ایک چیل جھپٹا مار کر اسے لے گئی مگر ابھی پوری طرح اٹھی بھی نہ تھی کہ پنجے سے چھوٹ گیا۔ بڑھیا رسان سے ناریل اٹھا لائی کہ اس کا کوئی اور دعوے دار نہ تھا۔ اس کے ساتھ ایک ننھی سی بچی اور دو ننگ دھڑنگ لڑکے تھے جن کی یہ غالباً نانی یا دادی ہوگی۔ وہ ناریل کا گودا کھرچ کھرچ کر ننھے ننھے پوروں سے کھاتی رہی، یہاں تک کہ چھوٹے لڑکے نے اس

کا ہاتھ پکڑ کر اپنے منہ میں رکھ لیا۔ اس نے دونوں لڑکوں کو تھوڑا سا کھوپرا دیا۔ بچی اتنی چھوٹی تھی کہ بڑھیا نے کھوپرے کو پہلے خود اپنے پوپلے منہ سے چبا چبا کر نرم کیا۔ پھر منہ سے منہ ملا کر اُگال بچی کے منہ میں ڈالا۔ جب ناریل اٹھانے کے لیے گھورے پر جھکی تو اس کی ننگی چھاتیاں بھلبھلائے بینگن کی مانند جھریائی ہوئی اور خالی اوجھڑی کی طرح جھول رہی تھیں۔ لگتا تھا کھمبیوں کی طرح یہ بھی اسی زمین سے اُگی ہیں۔ نہ تو دیکھنے والوں کو، نہ خود اس مائی کو اپنے ننگے ہونے کا احساس تھا۔ لیکن اس دن میں نے اپنے آپ کو بالکل ننگا محسوس کیا۔

دوسرا منظر آگے چل کر بازار میں دیکھا۔ بینک . کے دفتر کے سامنے کوئی چار فٹ اونچے تھڑے پر ایک شخص مچھلی بیچ رہا تھا۔ اس کی بنیان میں بے شمار آنکھیں بنی تھیں۔ اس [illegible] لنگی پر مچھلی کے خون اور آلائش کی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ ہاتھ بہت گندے ہو جاتے تو وہ انھیں لنگی پر رگڑ کر تازہ گندگی کو پرانی گندگی سے پونچھ لیتا تھا۔ جب تھوڑے تھوڑے وقفے سے مچھلیوں پر پانی کے چھپکے دینے سے مکھیوں کے چھتے اُڑ جاتے تو نظر آتا کہ مچھلی کتنی چھوٹی اور کس ذات کی ہے۔ غلیظ پانی اور مچھلیوں کا کیچڑ ایک ٹین کی نالی سے ہوتا ہوا نیچے رکھے ہوئے کنستروں میں جمع ہو رہا تھا۔ وہ بغدے سے کسی بڑی مچھلی کے ٹکڑے کر کے بیچتا تو اس کے کھپرے اور پیٹ کی آلائش بھی اسی کنستر میں جاتی۔ وہ جب بھر جاتا تو اسے ہٹا کر دوسرا کنستر رکھ دیا جاتا۔ بلیاں بار بار پچھلی ٹانگوں پہ کھڑی ہو ہو کے منہ مارتیں اور چھیچھڑوں کو کنستروں میں بند کرنے سے پہلے ہی بڑی تیزی سے اچک لیتیں۔ دیکھنے والے کو ہول آتا تھا کہ تیز چلتے ہوئے بغدے سے بلی کا سر کچ سے آٹا کہ اب اڑا۔ کوئی جوان عورت مچھلی لینے آتی تو مچھلی والا ڈھال ڈھال کرتی کو آرزو بھری گالیاں دینے لگتا۔ کوئی دو گھنٹے میں اس نے دو بھرے ہوئے کنستر ایک ایک آنے میں بیچے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ غریب غربا اس پانی میں چاول پکاتے ہیں تاکہ چاولوں میں (مچھلی کی باس) بس جائے۔ مچھلی کی ہڈیوں کے اس ایسنس کے ایک کنستر سے تین گھروں میں ہنڈیا پکتی ہے۔ غریبوں میں جو لوگ نسبتاً آسودہ حال ہیں وہی یہ لگژری افورڈ کر پاتے ہیں!

خاندانِ مغلیہ کا زوال و نزول

بشارت نے جھگی کے باہر کھڑے ہو کر مولانا کو آواز دی، حالاں کہ اس کے "اندر" اور "باہر" میں کچھ فرق نہیں تھا۔ بس چٹائی، ٹاٹ اور بانسوں سے اندر کے کیچڑ اور باہر کے کیچڑ کے درمیان حد بندی کر کے ایک خیالی PRIVACY (تخلیہ) اور ملکیت کا حصار کھینچ لیا تھا۔

یہ میری لحد، وہ تیری لحد

کوئی جواب نہ ملا تو انھوں نے حیدرآبادی انداز سے تالی بجائی، جس کے جواب میں اندر سے چھ بچوں کا تلے اوپر بچیلیوں کا سا سیٹ نکل آیا، جن کی عمروں میں بظاہر نو نو مہینے سے بھی کم کا فرق نظر آ رہا تھا۔ سب سے بڑے لڑکے نے کہا، "مغرب کی پڑھنے گئے ہیں۔ تشریف رکھیے۔" بشارت کی سمجھ میں نہ آیا کہاں تشریف رکھیں۔ ان کے پیر تلے اینٹیں ڈگمگا رہی تھیں۔ تعفن سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ جہنم اگر روئے زمیں پر کہیں ہو سکتا ہے تو:

ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

وہ دل ہی دل میں مولانا کو ڈانٹنے کا ریہرسل کرتے ہوئے آئے تھے۔ "یہ کیا اندھیر ہے مولانا!" جھجکا کر مولانا کہنے کے لیے انھوں

نے بڑے طنز و تلخی سے وہ لہجہ کمپوز کیا تھا جو بہت سڑی گالی دیتے وقت اختیار کیا جاتا ہے۔ لیکن جھگی اور کیچڑ دیکھ کر اچانک خیال آیا کہ میری شکایت پر اس شخص کو بالفرض جیل ہو جائے تو اس کے تو الٹے عیش آجائیں گے۔ مولانا پر پھینکنے طعن و تشنیع کے جتنے پتھر وہ جمع کر کے لائے تھے، ان سب پر داڑھیاں لگا کر جانماز میں لپیٹ دی تھیں تاکہ چوٹ نہ آئے۔ خرم تو آستے۔ وہ سب دھرے رہ گئے۔ ان کا ہاتھ شل ہو گیا تھا۔ اس شخص کو گالی دینے سے فائدہ؟ ا تو خود ایک گالی ہے۔ ان کے گرد بچوں نے شور مچانا شروع کیا تو سلسلۂ ملامت ٹوٹا۔ انھوں نے ان کے نام پوچھے لگے۔ تیمور، بابر، ہمایوں، جہانگیر، شاہ جہاں، اورنگ زیب۔ یا اللہ! پورا دودمانِ مغلیہ اس ٹپکتی جھگی میں تاریخی ترتیب وار اترا ہے۔

ایسا لگتا تھا کہ مغل بادشاہوں کے ناموں کا اسٹاک ختم ہو گیا، مگر اولادوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ چناں چہ چھ اٹھائے تھے۔ مثلاً ایک لختِ جگر کا پیار کا نام (مرزا) کوکا تھا جو اکبر کا دودھ شریک بھائی تھا جسکو اس نے قلعے کی فصیل سے پھنکوا دیا تھا اگر حقیقی بھائی ہوتا تو اس سے سزا دیتا یعنی قزاقوں کے ہاتھوں قتل ہونے کے لیے حج پر بھیج دیتا۔ وہ رحم کی اپیل کرتا تو ازراہِ ترحم مروانہ و شفقتِ برادرانہ جلاد ہی عماری میں سر قلم کروا کے اس کی مشکل آسان کر دیتا۔ جو شیر خوار یا گھٹنوں چلتے بچے اندر رہ گئے تھے ان کے ناموں سے بھی شاہانہ ٹپکتا اور تاج و تخت سے وابستگی کا نشان ملتا تھا۔ حالاں کہ یہ یاد نہیں آرہا تھا کہ ان میں سے کون تخت پر تمکن کے بعد قتل ہوا اور کون پہلے۔ بات یہ ہے کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد انتزاعِ سلطنت اور طوائف الملوکی شروع ہوا۔ بارہ سال میں آٹھ بادشاہ اس طرح سریر آرائے سلطنت ہوئے کہ ایک بادشاہ ٹھیک سے تخت پر بیٹھ نہ پایا تھا کہ اس کا تختہ الٹ دیا جاتا۔ تاج اور سر ہوا میں بازی گر کی گیند کی طرح اچھلنے لگے۔ ہر چند کہ اورنگ زیب کو موسیقی نفرت تھی لیکن اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی تخت و تاج کے دعوے داروں نے شاہی تخت کے گرد میوزیکل چیئرز کھیلنا شروع کر دیا۔ اس ادنیٰ تصرف کے ساتھ کہ میوزک کے بجائے شاعر لہک لہک کر قصیدے پڑھتے پڑھتے اچانک رک، تو ایک نیا شہزادہ تخت پر بیٹھ جاتا۔ نادر شاہ کو یہ مغلئی کھیل ایسا بھایا کہ تخت طاؤس اٹھوا کے وطن لے گیا۔ اس کے، کھیل جاری رہا۔ تخت اٹھوانے کے ضمن میں ہم نے نہ رہے بانس نہ بجے بانسری کا محاورہ جان بوجھ کر استعمال نہیں کیا۔ ا کہ چین کی بانسری بجانے کے لیے بادشاہوں اور آمروں کو بانس کی محتاجی کبھی نہیں رہی۔ شاہوں کا نالہ پابندِ لے ہی نہیں پابندِ نے بھی نہیں ہوتا۔

ہم عرض یہ کر رہے تھے کہ خانوادۂ تیموریہ کے جو باقی ماندہ چشم و چراغ جھگی کے اندر تھے۔ ان کے نام بھی تخت نشینی بلکہ تخت لٹنے کی ترتیب کے اعتبار سے درست ہی ہوں گے، اس لیے کہ مولانا کا حافظہ اور تاریخ کا مطالعہ بہت اچھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ لائحہ عمل بناتے وقت انھوں نے خاندانی منصوبہ شکنی کو تاریخ مغلیہ کے تقاضوں اور تخت نشینی کی ہوئی ضروریات کے تابع رکھا ہے۔ بشارت نے پوچھا 'تم میں سے کسی کا نام اکبر نہیں؟' بڑے لڑکے نے جواب دیا 'نہ وہ تو دادا جان کا تخلص ہے۔'

گفتگو کا سلسلہ کچھ انھوں نے کچھ بچوں نے شروع کیا۔ انھوں نے دریافت کیا، 'تم کتنے بھائی بہن ہو؟' جواباً ایک نے ان سے پوچھا 'آپ کے کتنے بچے ہیں؟' انھوں نے دریافت کیا 'تم میں سے کوئی پڑھا ہوا بھی ہے؟' بڑے لڑکے تیمور نے اترا کر کہا 'جی ہاں میں ہوں۔' معلوم ہوا یہ لڑکا جس کی عمر تیرہ چودہ سال کی ہوگی، مسجد میں بغدادی قاعدہ پڑھ کر کبھی کا فار

اٹھیں ہو چکا تھا۔ تین سال تک پنکھے بنانے کی ایک فیکٹری میں مفت کام سیکھا۔ ایک سال ہوا دائیں ہاتھ کا انگوٹھا مشین میں آگیا۔ کاٹنا پڑا۔ اب ایک مولوی صاحب سے عربی پڑھ رہا ہے۔ ہمایوں اپنے نام کی طرح ہنوز خانہ بدوشی و آوارہ گردی کی منزل سے گزر رہا تھا۔ جہانگیر تک پہنچتے پہنچتے پاجامہ بھی طوائف الملوکی کی نذر ہو گیا۔ البتہ شاہ جہاں کا سر پھوڑوں پھنسیوں پر بندھی پٹیوں سے اچھی طرح ڈھکا ہوا تھا۔ اور نگ زیب کے تن پر صرف اپنے والد کی ترکی ٹوپی تھی۔ بشارت! کو اس کی آنکھیں اور اسے بشارت نظر نہ آئے۔ سات سال کا تھا مگر بے حد باتونی۔ کہنے لگا، ایسی بارش توہم نے ساری زندگی میں نہیں دیکھی۔ ہاتھ پیر ماچس کی تیلیاں، لیکن اس کے غبارے کی طرح پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر ڈر لگتا تھا کہ پھٹ نہ جائے۔ کچھ دیر بعد ننھی نور جہاں آئی۔ اس کی بڑی بڑی ذہین آنکھوں میں کاجل اور کلائی پر نظر گزر کا ڈورا بندھا تھا۔ سارے منہ پر میل، کاجل، ناک اور گرد لپی ہوئی تھی، سوائے ان حصوں کے جو ابھی ابھی آنسوؤں سے دھلے تھے۔ انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے سنہری بالوں میں گیلی لکڑیوں کے کڑوے دھوئیں کی بو بسی ہوئی تھی۔ ایک بھولی سی صورت کا لڑکا اپنا نام شاہ عالم بتا کر چل دیا۔ آدھے راستے سے واپس آکر کہنے لگا کہ میں بھول گیا تھا۔ شاہ عالم تو بڑے بھائی کا نام ہے۔ یہ سب مغل شہزادے کیچڑ میں ایسے مزے سے چھپاک چھپاک چل رہے تھے جیسے ان کا سلسلۂ نسب امیر تیمور صاحبقراں کے بجائے کسی ہنس راج سے ملتا ہو۔

موکھنے کھدرے سب بچے اُبلے پڑ رہے تھے۔ ایک کمانے والا اور یہ ٹبر! دماغ چکرانے لگا۔

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

(سلسلہ اگلے شمارے میں)

محمد طارق
(کھولاپور)

ہم ووٹ کسے دیں...

الکشن کا موسم آیا اور پھر ہم سوچ میں پڑ گئے کہ ہم ووٹ کسے دیں۔ یہ مسئلہ ہمارے لیے اتنا زیادہ زیرِ غور ہوتا ہے کہ ہم اس مسئلہ پر غور کر کے زیر ہو جاتے ہیں۔ اور جب ووٹ دینے کا وقت آتا ہے ہم "ووٹ کی اہمیت نہ جاننے والوں" کی صف میں بلاچوں وچرا ایسے کھڑے ہو جاتے ہیں جیسے بقول علامہ اقبال میدانِ جنگ میں بوقتِ نماز اپنے ہتھیار رکھ کر ایک ہی صف میں محمود و ایاز کھڑے رہتے تھے اور دشمن انھیں نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر "ریلیٹ" لے لیا کرتا تھا۔ یہ جملہ معترضہ ہے کیوں کہ تاریخ میں دشمن کا ریلیٹ لینا نہیں لکھا ہے۔ خیر! آج نہیں لکھا ہے تو جب کبھی ہمارا وقت آئے گا ہم بھی کسی مستند مورخ کا کان پکڑ کر لکھوا لیں گے ـــــ وہ سب جو ہم چاہتے ہیں۔

"لکھو ـــــ! میرے پیارے مورخ!! ہم جو کہتے ہیں۔

اس نے اس کو مسلمان بنایا۔
اس نے اس کو ہندو بنایا۔
اس نے مندر توڑا۔
اس نے مسجد توڑی۔
اس نے ہندوؤں پر ظلم کیا۔
اس نے مسلمانوں کا خون بہایا۔
ہندو ایسے مسلمان ویسے سکھ کیسے

لکھو ـــــ میرے آزاد دیش کے آزاد مورخ وہ سب کچھ جسے پڑھ کر میرے ہم وطن آپس میں ایک دوسرے کا خون بہانا ثواب کا کام سمجھ سکیں۔

"اباجان ـــــ!" ہم نے اپنے اٹھارہ سالہ لختِ جگر کی آواز پر خیالات کے سمندر سے مینڈک کی طرح سر نکالا ـــــ دیکھا، ہمارا نورِ نظر اپنی پر نور آنکھوں پر ہلکے آسمانی کلر کی عینک لگائے، ہاتھ میں کرکٹ کا بال اچھالتے ہوئے عینک کی اوٹ سے ہمیں دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"ابّا جان ۔۔۔!" وہ بالنگ کے انداز میں ہاتھ گھماتے ہوئے مخاطب تھا۔
"آپ کسے ووٹ دیں گے؟"
ہمیں ایسا لگا جیسے وہ ابھی ہمیں بولڈ کر دے گا۔
ہم نے کہا ابھی ہم سوچ رہے ہیں کہ ووٹ دیں تو کس کو ۔۔۔!
جی بھر کے ہنسنے کے بعد وہ بولا "آپ ابھی تک سوچ ہی رہے ہیں، ہمارا ایک دوست کلّو جو ہماری اسکول کا سب سے سینئر اسٹوڈنٹ ہے۔ دو ۔۔۔ دو سال ایک ایک کلاس میں اطمینان سے رہا۔ اب ساتویں جماعت میں پڑھتا ہے، معلوم ہے وہ کیا کہتا ہے؟" ہمارا ہونہار فرزند پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگا۔
"کیا کہتا ہے کلّو؟" ہنستے ہوئے ہم نے پوچھا۔
وہ کہتا ہے، ہم اس کو ووٹ دیں گے جو ہمیں بغیر امتحان دیئے پاس کروا دے گا ۔۔۔ رس گلّے کھلائے اور سینما دکھائے گا۔"
"پھر ۔۔۔؟"
"ہماری اسکول کے ڈبل ایم پی کے لڑکے نے اسے رس گلّے کھلائے اور سینما بھی دکھایا اور بغیر امتحان دیئے پاس کرانے کی گارنٹی بھی لے لی ۔" ہمارا بیٹا پھر ہنسنے لگا۔
"یہ ڈبل ایم پی ہے کون؟"
"ارے وہ سوئٹر پارٹ والا، ممتاز پرویز لیڈر!"
"اچھا ۔۔۔ اچھا ۔۔۔!" ہم ہنسنے لگے۔
"اچھا بیٹا تم کس کو ووٹ دو گے؟"
"میں تو اس کو ووٹ دوں گا ابّا جان! جو میرے کرکٹ کلب کے لیے کرکٹ میدان بنا دے گا۔"
"بیٹا اپنے ووٹ کی قیمت سمجھو، تمہارا ووٹ کرکٹ کے میدان سے کئی گنا قیمتی ہے ۔۔۔ ووٹ کیسے دینا چاہیئے پہلے سنجیدگی سے سوچو سمجھو۔ ووٹ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ کر مت دو۔ ہم ووٹ اسے دیں گے جو دیش سے مفلسی کو دور کر دے، مہنگائی ختم کر دے۔ رشوت اور کالا بازار بند کرا دے۔ نفرت و تعصب کی آگ بجھا دے۔ فسادات نہ ہونے دے!"
ہمارا بیٹا بات سن کر کرکٹ کا بال ہاتھ میں اچھال کر بے اختیار ہنسنے لگا ۔۔۔ پھر بالنگ کے انداز میں ہاتھ گھما کر بولا "پھر ابّا جان! آپ اللہ میاں کو ہی ووٹ دے دیجیئے!"
ہمیں لگا جیسے اس نے ہمیں بولڈ کر دیا۔

غزلیں

چکر نظام آبادی

ٹل گئے ہیں وہ منسٹر معمولی کمہار سے
وہ اترتے ہی نہیں ہیں اپنی موٹر کار سے
پانچویں دل کو بھی ظالم نے کچل کر رکھ دیا
جا کے پھر لانا پڑے گا دل نیا بازار سے
بیوی بچوں ہی نے جب جینا کیا دوبھر مرا
دوستوں سے کیا شکایت کیا گلہ اغیار سے
ایسا بھی فیشن کبھی آئے گا کہ بس کوٹ پہ
کام لیں گے پائینٹ کا سب نوجوان شلوار سے
صرف لفاظی سے حاصل کچھ نہیں ہوتا جناب
لوگ پہچانے گئے ہیں کام سے کردار سے
چال میری دیکھ کر تو سب یہی کہنے لگے
لڑکھڑاتا آرہا ہے پی کے چکر بار سے

سوپر نرملی

نہ LODGING میں نہ کم بخت گھر میں رہتا ہے
ہے عاشق الو کا پٹھا کھنڈر میں رہتا ہے
ہیں باتیں کڑوی کسیلی تو لہجہ تلخ اس کا
اگرچہ رہنے کو شکر نگر میں رہتا ہے
میں گھر جمائی اگر ہوں تو گھر خسر تو ہے
کہ سسرا ہو کے تو [illegible] کے گھر میں رہتا ہے
میں کھیکھڑا کہوں اس کو کہ ٹڈو کلا سمجھوں
"عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے"
نہیں ہوا کہ تمہیں محروم ذاتی گھر سے یہاں
کہ آدھا ملک کرائے کے گھر میں رہتا ہے
خدا خلیج کی رکوا دے جنگ اے سوپر
مرے رقیب کا بیٹا قطر میں رہتا ہے

شاعر اور ماچس

نصیر ناداں کانپوری

ایک شاعر نے یہ بیوی سے کہا اے جانِ من
کر رہا ہوں ان دنوں محسوس میں بے حد تھکن
ایسا لگتا ہے کہ دنیا سے گزر جاؤں گا میں
ایسا لگتا ہے کہ تم سے پہلے مر جاؤں گا میں
اپنے دیوانے کی خاطر اپنے دیوانے کے بعد
کیا کرو گی جانِ من تم میرے مر جانے کے بعد
نازنیں بولی مجھے اپنی جوانی ہے عزیز
چاہے تم مانو نہ مانو میں ہوں اک انمول چیز
تم سے بانکے سجیلے ہیں کئی اس شہر میں
بے وقوف الو کے پٹھے ہیں کئی اس شہر میں
میں کسی سے شادی کر کے غم سے ہو جاؤں گی دور
ہاں تمہارے واسطے اتنا کروں گی میں ضرور
تم کو ہے بیڑی پسند اس واسطے مائی ڈیر
پھول کے بدلے چڑھاؤں گی میں بیڑی قبر پر
پھر وہ بولا "اور ماچس" تو یہ بولی نازنیں
تم جہاں ہو گے وہاں اس کی ضرورت ہی نہیں

حیدر بیابانی
اچل پور

دی سورڈ آف بابو آر۔ کے

اصل نام اُن کا رحمت اللہ خان ہے اور غالباً کرنل محمد خان کے بعد یہ دوسرے خان ہیں جو اکھڑ اور پتھر دل پٹھانوں کے قبیلے سے اردو طنز و مزاح کی نرم و نازک دنیا میں بابو آر۔ کے کی صورت میں وارد ہوئے ہیں۔

" خطا معاف" بابو آر۔ کے صاحب کے ان طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے جو کتابی شکل میں یکجا ہونے سے پہلے اردو کے موقر اخبارات و رسائل میں چھپتے رہے ہیں اور جنھیں پڑھ پڑھ کے زیادہ تر لوگوں نے سر دھنے ہیں اور کم تر لوگوں نے کریلے چبائے ہیں۔ " خطا معاف" کے مضامین کچھ خواب، کچھ اصل اور کچھ طرزِ ادا کا ایسا خوبصورت مجموعہ ہے جس کی کھٹی میٹھی لذت دل و دماغ سے لپٹ کر رہ جاتی ہے۔ لفظوں کی آنکھ مچولی، زبان کی شیرینی اور جملوں کی ہری بھری طرزِ تحریر کا وہ خوبصورت نمونہ پیش کرتی ہے جس کی مثال اُن کے ہمعصروں میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔

جناب یوسف ناظم صاحب لکھتے ہیں کہ " اچل پور ودربھ کا علاقہ ہے اور ودربھ کی سب سے مشہور چیز وہاں کے رس بھرے سنگترے ہیں اور سنا گیا ہے کہ اب سنترے ناگپور سے زیادہ اچل پور میں پائے جاتے ہیں۔ انہی سنتروں کا رس [کبھی کھٹا، کبھی میٹھا اور کبھی کھٹا میٹھا] آپ کو بابو آر۔ کے کی تحریر میں ملے گا لیکن شرط یہ ہے کہ آپ اُن کی تحریر پڑھیں گو، یہ چکھنے کی چیز نہیں ہے لیکن اس میں ذائقہ وہی ہے جو آپ کو عید کے شیر خورمے میں ملتا ہے یا سنترے کے مارملیڈ میں۔"

بابو آر۔ کے پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ اُنھوں نے اردو ادب میں ایم۔ اے کیا ہے۔ اپنے ایک نمبر نام کی مناسبت سے پیشہ آر۔ کے سپہ گری ہونا چاہیے تھا۔ نمبر دو نام کے حساب سے کہیں یا دفتری بابو یا پھر اپنی تعلیم و تربیت کے مطابق کسی اسکول میں ٹیچر لیکن اب اس کا کیا کیا جائے کہ بابو آر۔ کے نے ان تمام ممکنات کو یکسر جھٹلا دیا ہے اور ایک الگ پیشہ اور نرالا مشغلہ اپنایا ہے۔

پیشہ اُن کا بجلی اور بجلی سے متعلق سامان کی خرید و فروخت ہے اور مشغلہ مزاح کے شگوفے کھلانا اور طنز کے تیر و تلوار چلانا ہے۔ اپنی دلچسپ اور دلکش تحریروں سے دل و دماغ میں رنگ برنگے قمقمے جلانے کے ساتھ ساتھ بابو آر۔ کے اپنے قارئین کو گاہے بگاہے شاک بھی لگاتے ہیں۔

انسانی جذبوں اور فطرتوں میں جھانکنا اور اُنھیں اپنے طنز و مزاح کا مرکز و محور بنانا اُن کا دلچسپ مشغلہ ہے جو اُن کے مضامین میں ایک فن کی صورت جلوہ گر ہوا ہے۔

اپنی پہلی کتاب کا نام "خطا معاف" رکھ کر شاید بالو صاحب خوش ہوں کہ اُن کی اگلی پچھلی خطائیں درگزر کر دی جائیں گی اور وہ دودھ سے دُھل جائیں گے۔ لیکن ہمارا سوچنا یہ ہے کہ بالو آر کی خطائیں معاف کرنا کیسا؟ اُنھیں تو کسی عدالت سے سزائیں دِلوانا چاہیئے۔ دوستوں اور رشتہ داروں کی دل آزاری کے سلسلے میں سزائیں، بیوی اور بچوں کی شکایت پر سزائیں، بزرگوں اور ہمسایوں کی ٹوپیاں اُچھالنے کی پاداش میں سزائیں! کیوں کہ یہی وہ معصوم لوگ ہیں جن کی کھلی بالو صاحب نے اپنی تحریروں میں اُڑائی ہے۔ یہی وہ ہستیاں ہیں جن کی دکھتی رگوں کو آر۔ کے نے بار بار پکڑا ہے اور اُنھیں بلبلانے پر مجبور کیا ہے۔ انھوں نے اپنے قلم سے تلوار کا کام لیا ہے اور مسکراہٹوں کی آڑ میں بکھرتے بکھیرتے طنز کے ایسے ایسے نشتر لگائے ہیں کہ اچھے اچھوں کو تڑپا کے رکھ دیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنوں پرایوں کی تخصیص بالکل نہیں کی بلکہ کبھی کبھار اپنے آپ کو بھی اپنے قلم کا ہدف بنا لیا ہے۔

سماج کی بُرائیوں، اِنتظامیہ کی کوتاہیوں اور زندگی کی بے راہ رویوں پر وہ ہنستے ہنستے ایسا بھرپور وار کر جاتے ہیں کہ دِل واہ واہ کرتے ہوئے ایک سرد آہ بھی بھر لیتا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کے قلم کی کاٹ کی دو چار ایسی مثالیں درج ہیں جو اُن کے مضامین سے بطورِ ثبوت اخذ کی گئی ہیں۔

"ہم مسلمان ہر چھوٹے بڑے تہوار کے موقع پر رویتِ ہلال کے مسئلہ میں اُلجھ کر ایک دوسرے کو ملال کرنے کی پوزیشن میں پائے جاتے ہیں۔ ۔ ۔ کہاں تو ایک قوم نے چاند پر پہنچ کر اس کی مٹی کھرچ ڈالی اور اُدھر ہم اس کے دکھائی دینے یا نہ دینے پر لڑ جھگڑ کر ایک دوسرے کی مٹی پلید کر رہے ہیں۔" (عید کا چاند)

"شانے سے شانہ ہم بھی مِلاتے ہیں لیکن صاحب ہم لوگ صرف دو حالتوں میں ایسا کرتے ہیں یعنی ایک تو کھانے کی صف میں یا بحالتِ نماز میں ورنہ بقیہ حالتوں میں تو ہم میں سے ہر کوئی ایک دوسرے کو شانہ لگانے کی سازشوں میں مصروف رہتا ہے۔" (دانت برائے ادب)

"ہمارے ایک دوست ۔ ۔ ۔ ۔ جن کی مونچھ اپنی ایک انفرادیت اور الگ ہی شناخت رکھتی ہے اور جسے ہم "اُمُّ المکروہات" کا درجہ دے کر شرع میں لفظوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ اُن کی لحیم و شحیم مونچھ کے باعث یہ کبھی نہ محسوس ہو پایا کہ انھوں نے لاغر و بوسیدہ چہرے پر مونچھ کا اہتمام کیا ہے بلکہ حقیقتاً یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُن کا چہرہ مونچھ سے جا چھپا ہے۔" (مونچھ)

"ہر زمانے سے قبل بیویوں کی مسکراہٹیں شوہروں کی جیب پر ویسے ہی جھاڑو پھیرتی ہیں جیسا کہ وکیل اور ڈاکٹر کی مسکراہٹ موکل اور مریض کی جیب کا صفایا کرتی ہے۔ اس لیے جب کبھی بیگم مسکراتی ہے تو ہم ہڑبڑا کر اپنا کلیجہ تھام لیتے ہیں۔ کلیجہ اِس لیے تھام لیتے ہیں کہ شرٹ کی جیب کلیجہ کے پاس ہی ہوتی ہے۔" (میاں، جورو اور بچی)

یہ چند مثالیں ہیں جو بالو صاحب کے مضامین سے کشید کی گئی ہیں بقول یوسف ناظم صاحب "ان مثالوں کو ان کی ادھوری شناخت سمجھیے۔ یہ صرف اُن کی انگلیوں کے نشان ہیں پوری دستکاری نہیں۔ آرائش اور مرصع کاری سے وہ شوق نہیں فرماتے لیکن اپنی سادگی ہی کو بڑے سلیقے سے برتتے ہیں پھول بجائے خود کافی ہے ذوقِ نظر کے لیے، پھولوں کو صابن سے دھویا اور عطر میں بھگویا نہیں جاتا"۔

"خطا معاف" کے مصنف کی خطا اس صورت میں معاف کی جاسکتی ہے کہ انھوں نے جس قدر طنز کی تلوار چلائی ہیں اُس سے کہیں زیادہ مزاح کی گلکاریاں بھی کی ہیں۔ یہی وجہ ہے ان زخموں کا کبھی شدت سے احساس نہیں ہو پاتا جو چاہے اَنچاہے قارئین کے دل و دماغ پر لگائے جاتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب "خطا معاف" کی اشاعت میں جہاں مہاراشٹر اُردو اکادمی نے مالی خسارہ برداشت کیا ہے وہیں محترم یوسف ناظم صاحب اور ناچیز نے اپنے خیالات کا اظہار کر کے اپنا وقت ضائع کیا ہے اور اسی طرح کبیر حنفی و شکیل اعجاز نے اپنی فنکاری سے اِسے سجاتے سنوارتے کی بِلا وجہ تکلیف اٹھائی ہے۔ اگر بالو آر۔ کے کی یہ کتاب نہ بھی چھپتی تو اردو ادب کا کوئی نقصان نہیں ہو جاتا کیوں کہ اِس میں شامل تمام کاوشات پہلے ہی اخبارات و رسائل کے ذریعہ نیلی سیاہی میں قارئین کے سامنے آچکی ہیں یا اگر اس کتاب کو اپنی خوبصورتی کے ساتھ زرّیں خیالات اور رنگین فنکاری کی گوٹہ کناری نہ بھی لگائی جاتی تو بالو صاحب کے فن کی صحت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا اُن کے مضامین تب بھی اتنے ہی پسند کئے جاتے جتنے کہ پسند کئے جانے چاہئیے۔ بقول شخصے

"مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید"

تبصرہ

ہندوستانی تناظر

ہندوستان کا سب سے خوب صورت اردو رسالہ

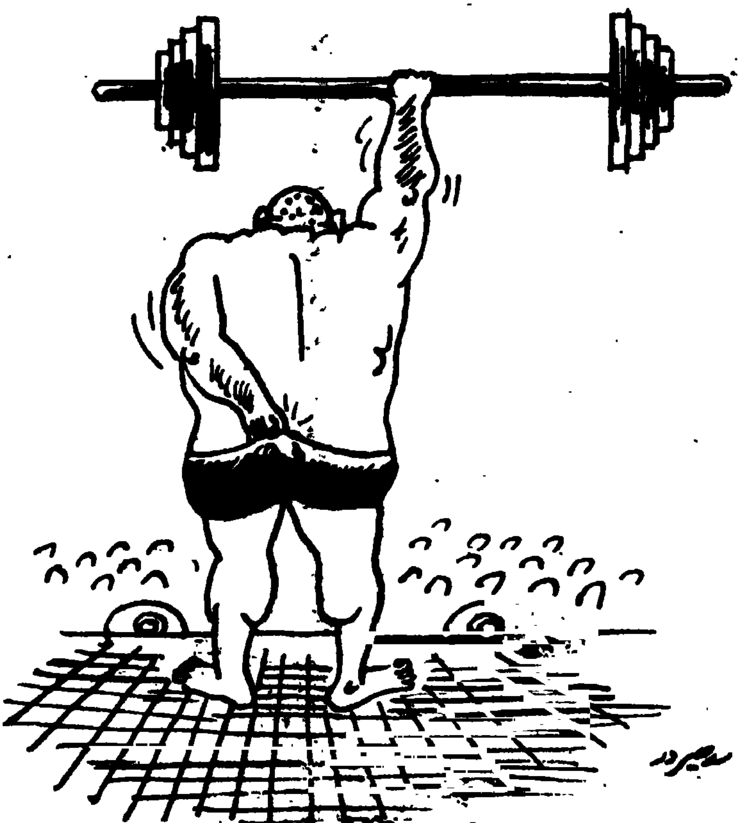
مدیر: دلیپ سنگھ

اواخر جنوری ۱۹۹۱ء میں اچانک اور بلا نوٹس "ہندوستانی تناظر" کا ایک خوب صورت شمارہ ڈاک سے وصول ہوا۔ اوراق الٹے پر پتہ چلا کہ نامور مزاح نگار "دلیپ سنگھ" کی زیر ادارت شائع ہونے والے انگریزی رسالہ INDIA PERSPECTIVE کو اردو کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ انڈیا پرسپکٹیو، پچھلے تین سال سے نہایت پابندی کے ساتھ پبلسٹی ڈپارٹمنٹ وزارت خارجہ حکومت ہند کی جانب سے محکمے کے ڈپٹی سکریٹری جناب دلیپ سنگھ کی ادارت میں آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے دیدہ زیب اور نفیس کاغذ پر رنگین طباعت مزید ستم ڈھاتی ہے۔ جب بھی پرچہ آتا ہے تمام اوراق پر ایک نگاہ ڈالے بغیر چین نہیں آتا۔ دوسرے مرحلے میں تفصیلی مطالعے کی نوبت آتی ہے۔ یہ رسالہ پڑھ کر ہمیشہ یہ خیال ستاتا رہا کہ کاش اردو میں ایسا خوبصورت رسالہ شائع ہو سکتا۔ دلیپ سنگھ جی کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ اردو رسالوں اور کتابوں کا معیار بلند ہو چنانچہ شگوفہ کو صوری اعتبار سے خوب سے خوب تر بنانے کے سلسلے میں نہ صرف مشوروں سے نوازتے رہے ہیں بلکہ ان کا عملی تعاون بھی ہمیں حاصل ہے۔ لیکن "ہندوستانی تناظر" کی اشاعت کے بعد دلیپ سنگھ کو ملک کے خوب صورت ترین اردو رسالہ کے مدیر ہونے کا اعزاز حاصل ہو چکا ہے۔

"انڈیا پرسپکٹیو" ۱۹۹۰ء تک انگریزی کے علاوہ ہسپانوی اور فرانسیسی زبانوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔ اردو پہلی ہندوستانی زبان ہے جس کا فروری ۱۹۹۱ء سے علاحدہ ایڈیشن شائع ہونے لگا ہے۔ "ہندوستانی تناظر" کے اب تک تین شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ دلیپ سنگھ نے بڑی مہارت کے ساتھ انگریزی کے مقررہ صفحات اور "لے آؤٹ" میں ہی اردو تراجم کی گنجائش فراہم کردی ہے۔ انگریزی اور اردو رسالوں میں فرق صرف زبان کا ہے۔ زیر تبصرہ رسالے کے ذریعہ اب اردو والوں کو مختلف النوع موضوعات پر مضامین پڑھنے کا موقع ملے گا۔ اس طرح اس رسالہ کا مزاج عام اردو جرائد کے مزاج سے مختلف ہوگا۔ ہر قسم کے تہذیبی، سماجی اور معاشی معاملات اور قومی و بین قومی اہمیت کے مسائل پر اردو میں اعلیٰ درجہ کی تحریریں شائع کرنے والا اب یہ منفرد رسالہ ہوگا۔ جس میں انگریزی مضامین کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جن کے تراجم "ہندوستانی تناظر" میں شائع ہوں گے اس طریقہ کار سے ترجمہ کے فن کو فروغ ہوگا۔ ویسے ہندوستانی تناظر میں انگریزی ایڈیشن کے ترجمے شائع کرنے کے علاوہ اردو کی دو ایک منتخب تخلیقات میں شائع ہونی چاہئیں جن کا دوسری زبانوں کے رسالہ میں ترجمہ شائع کیا جا سکتا ہے

اس طرح دوسری زبان والوں کو
ی تخلیقات کے مطالعہ کا موقع مل سکتا ہے۔
INDIA PERSPECTIVE اگرچہ حکومت کی جانب سے
ع ہوتا ہے۔ لیکن اس رسالے کو حکومت کے پروپگنڈے
یعہ نہیں بنایا گیا بلکہ ہمیشہ قابل مطالعہ مواد فراہم کرنے کی
گئی۔ انگریزی ایڈیشن کی اس روایت کے پیش نظر
ت وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ "ہندوستانی تناظر" اردو
حلقوں میں مقبول ہوگا۔ وزارت خارجہ حکومت ہند
ناب دلیپ سنگھ اردو والوں کے شکریے کے مستحق ہیں کہ
ستانی زبان میں سب سے پہلے اردو ایڈیشن شائع

کرنے کا فیصلہ کیا گیا امید ہے کہ یہ رسالہ وزارت خارجہ کے
توسط سے عالمی سطح پر اردو والوں کے ذوق کی تسکین کا باعث بنے گا۔
اور پہلا شمارہ طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات کے لیے وقف
کیا گیا۔ اس شمارہ میں آر کے لکشمن کے کارٹون کے ساتھ ان
کا ایک دلچسپ مضمون "مزاح کی گنجائش ہمیشہ رہے گی"
شامل اشاعت ہے۔ ممتاز کارٹونسٹ عبدالصمد صیرد کے علاوہ دوسرے
کے کارٹون بھی اس خصوصی شمارہ کی زینت ہیں۔ ہنس راج لوتھرا،
دلیپ سنگھ، رکشت پوری، پراوڈفٹ اور پی ایل بھنڈاری
کے مضامین کا اس ہنج سے ترجمہ کیا گیا ہے کہ ان سے اردو والے بہتر طور پر
لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ترجمہ کی یہی خوبی دوسرے شماروں کا بھی خصوصیت ہے۔
(م ک)



دوستوں کے خط

(مراسلے)

ڈاکٹر صاحب!

اچھا ہوا کہ آپ کو بھی اسی راستے پر چلنا پڑا جس پر مصنفین چلا کرتے ہیں۔ رسمِ اجرا کی تقریب کامیاب ہوئی ہوگی اور آپ قدرے شرمائے بھی ہوں گے۔ میری طرف سے مبارک باد۔

یوسف ناظم

محترمی جناب ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب۔

صحافت کے دستور نے ایڈیٹر کو یہ پیدائشی حق دے دیا ہے کہ وہ کسی بھی زاویے سے کسی بھی مضمون کو کتر بیونت کر کے شائع کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے میں آپ کے اس حق کو چیلنج نہیں کر سکتا۔ یہ بات تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ میرے انشائیے "رس گلا" کی ریڑھ مار کر رکھ دی ہے صفحات کی بے ترتیبی اتنی گراں نہیں گزرتی جتنی انشائیے کے بعض اہم اقتباس کا حذف کرنا۔ نہیں معلوم آپ کو سربراہان امریکہ، روس اور انگلینڈ والے واقعہ میں ایسی کون سی بات نظر آئی کہ وہ شاملِ اشاعت نہ ہو سکا۔ ہو سکتا ہے وہ آپ کے نزدیک مناسب نہ ہو۔ مگر حضرت! میرے ایک شعر کا مصرعِ اولیٰ حذف کر کے تو آپ نے واقعی کمال ہی کر دیا۔ مجھے اعتراض اس پر بھی نہیں۔ آپ پورا شعر ہی حذف کر دیتے تو بہتر تھا۔ ع

"اب جو کھا کر ہم نے دیکھا، گلتا کھارا رس گلا"

بغیر مصرعِ اولیٰ کے اس کا کیا مفہوم رہ گیا؟

مجھے حیرت ہے کہ آپ زندہ دلانِ حیدرآباد کے ماہنامہ شگوفہ کے ایڈیٹر اور استادِ اردو اور پھر آپ کو بوسہ سے اتنی الرجی؟ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیا 'بوسہ' فحش نگاری میں شامل ہے؟ اکبر الہ آبادی تو کہہ گئے ہیں کہ:

تہذیبِ مغربی میں بوسے تلک معاف

آگے اگر بڑھو تو شرارت کی بات ہے

میں چاہتا ہوں کہ زندہ دلانِ حیدرآباد ہی یہ فیصلہ کریں کہ میرا یہ شعر فحش ہے کہ گوارہ؟:

گڑ سے میٹھا یار کا بوسہ ہونٹ سے چپکے ہونٹ بہت

اب جو کھا کر ہم نے دیکھا، گلتا کھارا رس گلا

ایک بات اور عرض کر دوں میں سنجیدہ لکھاری ہوں مزاح نگار بھی نہیں صرف جب انشائیہ ذرا شوخ ہو جاتا ہے یا دوسرے لفظوں میں کچھ بے لگام ہو جاتا ہے وہ میں "شگوفہ" کے تالِ سمت میں شامل کر دیتا ہوں۔

آپ شگوفہ کے اگلے شمارے میں یہ خط شائع کر کے زندہ دلانِ حیدرآباد سے اس کا فیصلہ ضرور کرائیں، یہ میری گزارش ہے۔

(ڈاکٹر) جاوید وشسٹ

(فرید آباد)

جنابِ مصطفیٰ کمال صاحب!

تسلیمات۔ شگوفہ کے توسط سے نئی تخلیقات پڑھنے کو ملیں۔ آپ کی کتاب کی اشاعت اور اس ضمن میں ترتیب دیئے گئے جلسے کی روداد بھی نظر سے گزری۔ ایک وقیع کتاب کی اشاعت پر مبارک باد قبول فرمایئے۔

تازہ شمارے کی مشمولات سے طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ یہ آپ کی جدوجہد ہی ہے کہ ہر قسم کے زندہ دلوں کو ایک شمارے میں جمع فرما دیتے ہیں اور ہم جیسے ادب دوستوں کو ضیافتِ طبع کا موقع مل جاتا ہے۔ غالب ثانی نے رمضان کے مہینے پر نظم یعنی غزلِ مسلسل لکھ کر بڑی داد حاصل کی چچا غالب نے مقطع میں آبرو کی بات کہہ کر اپنی مجبوری کا اظہار کیا تھا لیکن غالب ثانی نے رمضان کے روزوں میں اپنے پیشے کی وضاحت کے ذریعے دل خوش کر دیا۔ بہر حال اس قدر خوب صورت ترتیب پر مبارک باد قبول فرمایئے اور توقع ہے کہ مستقبل میں بھی آپ کے توسط سے شگوفہ دل و دماغ کو باغ و بہار بنانے کا سامان فراہم کرے گا۔

ڈاکٹر مجید بیدار

مولانا آزاد کالج اورنگ آباد

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد : ۲۴

شمارہ : ۵

مئی

۱۹۹۱ء

ایڈیٹر:

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

طباعت : دائرہ الکٹرک پریس چھتہ بازار حیدرآباد۔

★ فی پرچہ : ۵ روپے زر انفرادی : ۵۵ روپے

لائبریریوں سے : ۶۰ روپے ، غیر ممالک سے : ۲۵۰ روپے

* شگوفہ : ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد 500 001 فون 557716 مکان 521064

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

قاضی جی دبلے (شہر بمبئی)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

ادب کا جغرافیہ

اڑیں گے پرزے (خاکہ)

چوسر (منظومات)

★



میں ملک سے باہر کیوں جا رہا ہوں؟ بلاشبہ اپنے ملک کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لیے

اداریہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کے ایک اہم، سرگرم اور سینئر رکن بوگس حیدرآبادی کا ۱۱رمئی کی صبح ایک بجے حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا ـــــ سید نصیر الدین (بوگس حیدرآبادی) ۱۰راکتوبر ۱۹۴۰ء کو پیدا ہوئے۔ میٹریکولیشن کی تکمیل کے بعد تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور محکمۂ تعلیم میں مدرّس کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرلی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انھیں بڑی جد وجہد کرنی پڑی۔ ایوننگ کالج سے بی اے اور پھر اردو میں ایم اے کیا۔ شعر کہنے کا چسکہ بچپن سے تھا۔ ان کے ماموں میجر محبوب علی خاں محبوبؔ سے تلمذ حاصل تھا۔ مجاہد تخلّص اختیار کیا۔ میلانِ طبع کی مناسبت سے مزاحیہ شاعری کی طرف توجّہ مبذول کی۔ علاّمہ حیرت بدایونی سے بھی مشورۂ سخن رہا۔ تخلّص کی کشش، آدھی غزل کی انفرادیت اور تحت و ترنّم میں ایک ایک مصرعہ پڑھنے کے خاص انداز کی وجہ سے مشاعروں کے کامیاب اور مقبول شعرا میں ان کا شمار ہونے لگا۔ ملک اور بیرونِ ملک کے بے شمار مشاعروں میں انھیں مدعو کیا گیا اور وہ ہر جگہ بے حد پسند کیے گئے ـــــــ بوگس حیدرآبادی روزِ اوّل ہی سے زندہ دلانِ حیدرآباد سے وابستہ تھے۔ کل ہند مشاعروں کے کنوینر، ادارے کے نائب معتمد اور معتمد عمومی کے عہدوں پر فائز رہے، وہ اپنی خوش مزاجی، لطیفہ سنجی اور دوست دار شخصیت کی وجہ سے احباب میں بہت مقبول تھے۔ فکر تونسوی پر ان کی ایک کتاب (ایم۔ اے کے لیے لکھا گیا تنقیدی مقالہ) تو شائع ہوئی لیکن مجموعۂ کلام کی اشاعت کی طرف توجّہ نہ ہوسکی ہے افسوس ہے کہ زندگی نے وفا نہ کی۔ دل کا عارضہ تو عرصے سے تھا لیکن وہم و گمان بھی نہ تھا کہ بوگس یوں اچانک منہ موڑ لیں گے۔ ان کے انتقال سے زندہ دلی کی روایت کو اور زندہ دلوں کے ادارے کو نقصان پہنچا ہی لیکن غم کا جو پہاڑ ان کے پسماندگان کے سر پر ٹوٹ پڑا ہے، اس کا مداوا تعزیت کے چند لفظ ہو نہیں سکتے ـــــ خدا سے دعا ہے کہ انھیں غریقِ رحمت کرے۔ آمین

● مئی کے شمارے کی کاپیاں تیار ہوچکی تھیں کہ ۲۱رمئی کی شب سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی کے قتل کی اندوہ ناک خبر ملی۔ گیارہ سال کے عرصے میں نہرو خاندان کی تین اہم شخصیتوں کا قتل ہمارے ملک کی تاریخ کا بدنما باب ہے۔ راجیو گاندھی کی ہلاکت ملک میں بڑھتے ہوئے تشدد کا بھیانک روپ ہے جس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ جمہوریت اور انصاف پر طاقت کو غلبہ حاصل ہو رہا ہے۔ پرتشدد سیاست کے اس رجحان پر قابو نہ پایا جائے تو ڈر ہے کہ ہمارا ملک لاقانونیت اور دہشت گردی کی آماجگاہ بن جائے گا

[redacted]

یوسف ناظم

سکوت شکن شاعر

(عبدالاحد ساز کے مجموعۂ کلام "خاموشی بول اٹھی ہے" پر چند باتیں)

ساز کی جھنکار ہو گی تو ظاہر ہے خموشی بول اُٹھے گی۔ یہ صوتیات کا پہلا اصول ہے۔ پردۂ ساز سے نکلنے والے سُر اور موسیقار کا سحر انگیز گویہ دونوں ہم زاد بھائی ہیں۔ تنہا بھی رہیں تو اتنے ہی موثر ثابت ہوتے ہیں جتنی کہ دونوں کی جگل بندی۔ جب شعر کہا گیا تھا ؎

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ؛ ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

اُس وقت موسیقار کا لحن پہلے شروع ہوتا تھا اور اُس لحنی آواز سے تحریک پا کر فن کار کا فن اس کے تعاقب میں سرگرم سفر ہوتا تھا۔ قدیم زمانہ اور مراتب کے لحاظ سے غزل پہلے چھیڑی جاتی تھی اور ساز کی لحن طرازی اُس کے بعد شروع ہوتی تھی۔ اب ترتیب بدل گئی ہے۔ ساز کے تار پہلے جھنجھناتے ہیں اور غزل بعد میں طلوع ہوتی ہے جو شعر میں نے ابھی آپ کو سنایا اُس میں ایک سقم یہ ہے کہ شاعر نے یہ نہیں بتایا کہ کس کی عمرِ رفتہ کو آواز دیتی ہے۔ یہ بات شاعر نے غالباً کسی شرح نویس کے لیے چھوڑ دی۔ شاعر اگر ہر بات واضح طور پر کہہ دیا کریں تو پھر ہمارے شرح نویس اور تنقید نگار حضرات و خواتین کیا کریں گے۔ میں نے بہر حال اپنی حد تک یہ سمجھ لیا ہے کہ شاعر مذکور اپنی - - - - - عمر کی واپسی کی تمنا نہیں کر رہا ہے بلکہ جس نے بھی غزل چھیڑی ہے اُس کی عمرِ رفتہ کے عود کر آنے کی خواہش میں مصروفِ سوز و ساز ہے۔

یہ شعر تو یونہی برسبیلِ تذکرہ زیرِ بحث آ گیا ورنہ میں تو اصل میں عبدالاحد ساز کے بارے میں چند باتیں کہنا چاہتا تھا۔۔۔ عبدالاحد ساز اچھے خاصے معقول آدمی ہیں لیکن اس کے باوجود شاعری کرتے ہیں۔ یہ تو قدرت کا کرشمہ ہے کہ ان کے اس عملِ شاعری سے نہ انھیں نقصان پہنچا اور نہ شاعری کو کوئی گزند پہنچی۔ چوں کہ معقول آدمی ہیں اس لیے ان کی شخصی اور ذاتی معقولیت ان کی شاعری میں بھی سرایت کر گئی ہے۔ ورنہ ایسا ہوتا کم ہے۔ عبدالاحد ساز میں نقص یہ ہے کہ ان میں کہیں بھی کوئی ٹیڑھ نہیں ہے۔ یہ بذاتِ خود مستقیم لگتے ہیں۔ صرف اُس وقت ٹیڑھے ہوتے ہیں جب جھک کر بات کرتے ہیں۔ لیکن اسے خمیدہ ہونا کہا جاتا ہے۔ ٹیڑھا ہونا نہیں کہا جاتا۔ اُن پر ان کے اپنے اوصافِ حمیدہ کا اتنا بوجھ ہے کہ یہ خمیدہ ہونے پر مجبور رہیں۔ میں تو انھیں جب بھی دیکھتا ہوں تو وہ مشہور مصرع مجھے یاد آتا ہے " زوالِ مسکین ممکن تھا نہیں "۔ جب انھوں نے منشی عبدالکریم شفیقہ کے مجموعۂ کلام کی اشاعت کا اہتمام کیا تو یوں سمجھیے کہ اُن کے اوصافِ حمیدہ کی رجسٹرار آف ٹریڈ مارکس کے آفس میں کھتاؤنی ہو گئی اور اُن کا یہ اندازِ تبسم و تکلم اُن کے حق میں محفوظ کر دیا گیا۔ انگریزی زبان میں اسے پیٹنٹ کرنا کہا جاتا ہے۔

عبدالاحد ساز بہت دل لگا کر شعر کہتے ہیں۔ جب سے یہ شعر کہہ رہے ہیں، داڑھی نہیں بنا رہے ہیں۔ شیو کرتے ہوتے تو

اتنا سارا کلام کیسے کہہ پاتے ۔ ایک عام اندازے کے مطابق شیو بنانے پر ہر آدمی کے روزانہ کم از کم پندرہ منٹ صرف ہو جاتے ہیں۔ یہ تو ایک نرم و گداز جلد والی داڑھی کا حساب ہوا، ورنہ آدمی گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑا رہ کر ۱۵ منٹ روزانہ کے حساب سے صرف شیو کرنے پر ۷ گھنٹے ہر ماہ خرچ ہو جاتے ہیں۔ عبدالاحد ساز نے شاعری شروع کرتے وقت ہی یہ حساب کر لیا تھا اور عہد کر لیا تھا کہ باریش ہونے کی وجہ سے وہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ سمجھے جائیں سارا وقت شعر گوئی پر صرف کریں گے ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی ۔ رُباعیاں بھی ہیں اور بھی ایک رُباعی تو مجھے بہت پسند آئی ؎

شاعر پہ درِ قبول وا ہو یا رب   کچھ سلسلۂ جود و سخا ہو یا رب
آشائے شرابِ آگہی کی اک بوند   اس ظرفِ شکستہ میں عطا ہو یا رب

یہ شاعر رقیق القلب تو نہیں ہے لیکن ہے ٹھنڈے مزاج کا انسان ۔ بات بھی دھیمے سروں میں کرتا ہے ۔ سننے والے کو یقین ہو جاتا ہے کہ "فریاد کی کوئی لے نہیں ہے"۔ ہر شاعر میں ایک چیز ہوتی ہے جسے انا کا نام دیا گیا ہے۔ شاعر میں کیوں نہیں ہے اور اگر ہے تو کسی دوشیزہ کے نامۂ محبت کی طرح کیوں پردۂ خفا میں ہے ؟ ۔ شاعر نے بہر اپنی رُباعی کے توسط سے مانگی تھی، وہ یوں قبول ہوئی کہ ؎

جانے قلم کی آنکھ میں کس کا ظہور تھا   کل رات میرے گیت کے مکھڑے پہ نور تھا
نغمہ سا چھیڑتی تھیں تجلّی کی اُنگلیاں   توریت کا نزول ، یہ لحنِ زبور تھا

شاعر نے آگہی کی اک بوند مانگی تھی۔ سمندر سے قطرہ نہیں مانگا جاتا لیکن شاعر کو شاید معلوم تھا کہ وہ ایک قطرہ اُسے وہی قطرہ ملے گا جس سے گوہرِ مُراد برآمد ہوگا۔

عبدالاحد ساز نے اپنے پیش لفظ میں، جسے 'خطِ ترسیل' کا عنوان دیا گیا ہے، یہ کہا ہے کہ 'یہ مجموعہ اُن کے ۳۰ سال کی روداد ہے۔ اس 'روداد' میں کچھ خاص قسم کے مرحلے بھی ہیں ۔ ایسے مرحلے جن میں کچھ بہ وہ نشینوں کے نام آتے ہیں "عید اُس پری وش کی" ؎

چھوٹی لبِ نازک سے وہ اک شوخ سی لالی
تھوڑی سی شفق عارضِ تاباں نے چرا لی
پھر بام کی جانب اُٹھے ابرو کے ہلالی۔
اور چاند نے شرما کے کہا عید مُبارک

یہ مرحلہ تو شام کا تھا۔ صبح کا مرحلہ تو اس سے بھی زیادہ ولولہ انگیز در پیش ہوا ؎

جھلکا رُخِ روشن پہ حسین صبح کا پرتو
گُلنار ہتھیلی پہ حنا دینے لگی لَو
زُلفوں سے چلی نکہتِ وارفتہ کی اک رَو
پیغام لیے آئی صبا۔ عید مبارک

صبح خیزی کے فوائد بے شمار ہیں۔ کیسے کیسے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ یہ مذ سارا من وقت کی ہونی چاہیے جب

بارش نہیں ہوا ہوگا۔ جب سبزہ آغاز ہوتا ہے تو ہر جگہ ہریالی ہی ہریالی نظر آنے لگتی ہے شاعر نے اپنی روداد کے بارے میں یہ کہا ہے :

نہ مقامات، نہ ترتیبِ زمانی اپنی
اتفاقات پہ مبنی ہے کہانی اپنی

یہ شاعر اکتوبر ۱۹۹۰ء میں ۴۰ سال کی عمر کو پہنچ گیا اور اتفاقاً اس واردات کے فوراً بعد شہر بمبئی میں اردو ادب کے ۴۰ سال کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد ہوا۔ تاریخِ ادبِ اردو میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا کہ کوئی شاعر ۴۰ سال کی عمر کو پہنچے اور شہر میں ادب کا ۴۰ سالہ جائزہ لیا جائے۔ شاعر نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "اتفاقات پہ مبنی ہے کہانی اپنی"۔ شاعر کا مجموعۂ کلام بھی اسی نوبت پر وجود میں آیا یعنی زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔ یہ زیورِ طباعت کی ترکیب مجھے ہمیشہ عجیب و غریب محسوس ہوئی۔ اردو کتابیں ہمیشہ سے کتابت کی بیسیوں غلطیوں اور طباعت کی سینکڑوں خرابیوں کے ساتھ شائع ہوتی ہیں اور ہم اسے زیورِ طباعت سے آراستہ ہونا کہتے ہیں۔ ایسی ہی غلط بیانیوں کی وجہ سے ہمیں جوکر کو کوتوال کہنا پڑتا ہے لیکن زیورِ طبع سے آراستہ ہونے کا یہ محاورہ عبدالاحد سازؔ کے مجموعۂ کلام کی حد تک بالکل درست ہے۔ عمدہ کھانے کے ساتھ کراکری بھی اچھی ہو تو کھانے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ ویسے صرف ظروف کا قیمتی ہونا کافی نہیں۔ اسی لیے شاید قیصر الجعفری نے کہا تھا :

سونے کے پیالے میں دو گھونٹ شراب آئی

۴۰ سال کی عمر کو زندگی کی مانگ سا یئد بھی کہا جاتا ہے لیکن عبدالاحد سازؔ نے اس عمر کو پہنچ کر اپنا مجموعہ پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ماہرینِ عمریات کا یہ نظریہ غلط ہے۔ زندگی کے سارے سال تو چُہل میں گزر جاتے ہیں۔

عبدالاحد سازؔ جمالیات کے آدمی ہیں اور جمالِ ہم نشیں کے تو حد سے زیادہ قائل ہیں۔ شاعری میں نئی نئی تراکیب وضع کرتے ہیں اور اس طرح انھوں نے اپنی ایک خاص وضع بنالی ہے۔ کپڑے کے تاجر ہیں اس لیے اشعار کی بناوٹ ٹیکسچر، فیڈ اور ڈیزائن کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ پیمائش کا فن بھی جانتے ہیں اس لیے عروض کی تندرستی بھی برقرار رہتی ہے۔ آج کل ادب میں عروض کی بہت دھوم مچی ہوئی ہے۔ تین چار حضرات ہیں جو اس سلسلے میں بے حد پریشان ہیں اور اپنی پریشانی کو وہ اپنی حد تک نہیں رکھنا چاہتے۔ عبدالاحد سازؔ نے شاید انھی لوگوں کے ڈر کے مارے گیان سے کام لیا اور عروض کا کمال دکھایا۔ میں ان کے اس عمل کو کیا عنوان دوں !

عبدالاحد سازؔ کی جمالیت پسندی جہاں ان سے ایسے شعر کہلواتی ہے :

رات رانی سی وہ مہکے خاموشی
مسکرا دے تو چنبیلی سی لگے

فن کی مہکی ہوئی مہندی سے رچی
یہ بیاض اُس کی ہتھیلی سی لگے

وہیں آنکھوں کے سامنے دور تک پھیلی ہوئی دھند اور دھند میں لپٹا ہوا مستقبل کا خوف زدہ چہرہ شاعر سے ایسے شعر بھی کہلواتا ہے :

جذبوں کے دو گھونٹ عقیدوں کے دو لقمے
آگے سوچ کا صحرا ہے، کچھ کھا پی لینا

مچلے سستے دام ہزاروں نام یہ جیون
سوچ سمجھ کر چیز کوئی اچھی سی لینا

عقیدوں کے معاملے والی ترکیب شاید نامانوس معلوم ہو لیکن اب اس قسم کی چیزیں ہماری اشیائے خوردنی میں شامل ہیں۔ شاعر یہ بھی کہتا ہے:

سانس کی ہر آمد لوٹانی پڑتی ہے
جینا بھی محصول چکانا لگتا ہے

یہ محصول، میونسپل کارپوریشن کی آکٹرائے ڈیوٹی نہیں ہے کبھی دی تو کبھی نہیں۔ یہ تو ہمیشہ جاری رہنے والا محصول ہے اور یہی وجہ ہے کہ:

عمر، زمانہ، شہر، سمندر، گھر، آکاش
ذہن کو اک جھٹکا روزانہ لگتا ہے

اس شاعر کی، جس کا نام عبدالاحد اور تخلص ساز ہے۔ مشکل یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہے۔

احساس کے یہ دکھ، یہ عذاب آگہی کے دوست!
کس سے کہیں خطا نگہِ خود نگر کی ہے

کبھی کبھی چشم پوشی سے بھی کام لینا چاہیے۔ حالات سے آگاہ رہ کر بھی تھوڑی سی غفلت برتنے میں کیا مضائقہ ہے۔ گھر کی رونق کے لیے ہنگامہ ہی تو چاہیے۔ خواہ وہ نوحۂ غم ہو یا نغمۂ شادی، دونوں سکوت شکن ہوتے ہیں۔ ★

رفیعہ منظور الامین
148 اگن راک انکلیو، سکندرآباد

وہ روزے یاد آتے ہیں

کچھ لوگوں کو کہاوتیں سنانے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ ایک دوست ہیں جو کہتے ہیں کہ دیکھیے صاحب اسی بات پر ایک کہاوت یاد آئی اور میرا دل بیٹھ جاتا ہے کیوں کہ اس ظالم سے رات دن کا اٹھنا بیٹھنا ہے اور ان کی بات چیت کہاوتوں سے معمور رہتی ہے جو وہ پابندی سے دہرائے جاتے ہیں۔ زندگی میں گفتگو کے موضوع ہوتے ہی کتنے ہیں! نتیجہ یہ کہ ہر موضوع اوپر تلے آزو بازو ان کی کہاوتوں کے تھپیڑے کھاتا رہتا ہے۔ ایسی ہی ایک کہاوت ہے کہ روزے بخشوانے گئے تو نمازیں گلے پڑیں۔ اس کہاوت سے مجھے بہت الجھن ہوتی ہے کیوں کہ میں اس کا نشانہ ہوں۔ روزے کے دراصل چار مراحل ہوتے ہیں۔

ایک، بچپن کا روزہ جس میں رو رو کر سر پٹک پٹک کر کہا جاتا ہے کہ ہم روزے رکھیں گے اور ہر کوئی تشفی دے دے کر ہمیں باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ آخر طے پاتا ہے یا تو ڈبے کا روزہ رکھا جائے جس میں ایک ڈبے میں پھونک کر فوراً بند کر دیا جاتا ہے، یعنی آپ کا روزہ لاکر میں بند ہو گیا جو بوقت افطار ڈھول کر راست نکال لیا جاتا ہے۔ اس بیچ آپ کو کھانے پینے کی کھلی چھوٹ ہوتی ہے۔ بچپن ہی کے روزے کی ایک اور کارآمد صورت ہوتی ہے وہ ہے ایک داڑھ کا روزہ جس میں آپ جبڑے کی ایک ہی سمت سے چبا چبا کر غذا داخل دفتر کر سکتے ہیں۔ پانی تک سر کو ایک طرف جھکا کر پیا جاتا ہے اور روزہ سلامت!

آگے کے تین مراحل میں لڑکپن کا روزہ، جوانی کا روزہ اور بڑھاپے کا روزہ شمار ہوتا ہے — بڑھاپے کا روزہ عاقبت کے لرزا دینے والے احساس سے بھرپور، طہارت و پاکیزگی کا مرقع، یوکلپٹس کے جھنڈ میں سرسراتی ہوئی بھرتی ہوا کی طرح ہوتا ہے جس میں کہیں ایں واں کی گنجائش نہیں ہوتی — ایک خطِ مستقیم جو سیدھے پل صراط سے گزار دیتا ہے۔ البتہ لڑکپن اور جوانی کے روزے بڑے ٹیڑھے ہوتے ہیں، جب روزوں سے باقاعدہ ہاتھا پائی ہوتی ہے — کبھی آپ روزے پر حاوی تو کبھی روزہ آپ کو پچھاڑے ہوئے۔

اسکول کے زمانے میں حضرت رمضان خاں کبھی طے کرتے کہ عین اس وقت تشریف لائیں جب اسپورٹس

کے انٹر اسکول مقابلے منعقد ہوتے۔ ہماری مشق اور روزوں کی مشق ستم میں رسہ کشی جاری رہتی عمر کے اس حصے میں روزوں کے ثواب سے زیادہ فکر اس بات کی رہتی کہ روزوں کی تعداد میں کوئی ہم سے سبقت نہ لے جائے — باسکٹ بال، جمناسٹکس، ہاکی اور بیڈمینٹن کی پریکٹیس میں بڑے آزمائشی دور سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہمارے اسکول میں لڑکیوں کے منہ ہاتھ دھونے کے لیے جو نل لگا تھا اس کے آگے حوض بھی تھا۔ وہ حوض ہمیشہ آدھا بھرا رہتا سڑے ہوئے پانی پر مچھروں کی پریڈ جاری رہتی۔ کائی کے بیل بوٹے بنے ہوتے۔ جب میں اسپورٹس کی پریکٹیس کے بعد منہ دھلانے کے لیے وہاں پہنچتی تو بجائے منہ دھونے وضو کرنے کے مری ہوئی بکری کی آنکھیں لیے بہت دیر تک اس گدلے پانی کو تکتی رہتی کہ کاش اس پانی کا ہی ایک گھونٹ مل جاتا۔ لیکن کاتبِ تقدیر کو شقی، ستم گر، جابر وغیرہ خطابوں سے نوازا جاتا ہے — وہ کہاں ہمارے پیاسے حلق کو تر ہونے دیتا۔

روزوں کا اس سے چند سال پہلے کا زمانہ وہ ہوتا تھا جس میں خود اپنے روزے سے زیادہ دوسرے کی فکر ہوتی۔ الزام لگائے جاتے کہ فلاں، کونے میں کھڑا گلگلہ چبا رہا تھا — یا باتھ روم کی خلوت میں پانی پیا جا رہا تھا۔ اب آپ لاکھ بچارہیں کھا کھا کر یقین دلانے کی کوشش کریں کہ ایسا نہیں ہو رہا تھا، لیکن اگر کبھی آپ کا ریکارڈ داغ دار رہا تو سمجھیے آپ کی تباہی مکمل۔ آخر جب ہائی کمان سے ڈانٹ پھٹکار ہوتی کہ روزے میں جھوٹ بولنا منع ہے تب کینہ پروری کا ایک اور موقع بالائے طاق رکھ کر معاملے کو رفع دفع کر دیا جاتا۔

روزے میں وہ دور بڑا جانکنی کا ہوتا جو دوپہر کے بعد شروع ہوتا اور افطار تک رواں رہتا۔ افطاری بڑے اہتمام سے تیار کی جاتی جسے محض خانساماں کے حوالے نہیں کیا جاتا بلکہ اس میں آپا کی چابک دستی کو بڑا دخل ہوتا۔ مقررہ چیزوں کے علاوہ روز کوئی نہ کوئی نئی چیز اس میں ضرور شامل ہوتی — اس زمانے میں حیدرآباد میں خوان چھبوں کا رواج عام تھا — گول سی دائروی شکل کی ایک گز قطر والی ٹرے ہوتی جس پر رنگ برنگے نصف کروی گنبد نما چھبے ڈھانکے جاتے تاکہ تری والی چیزیں محفوظ رہیں — آپا کٹوروں، پلیٹوں میں سجا کر رکھتیں اور ہم آس پاس کھڑے تکتے رہتے۔ انواع و اقسام کے پکوانوں سے اٹھتی خوشبو کا احساس شدید تر ہو جاتا — ہم نے اسی وقت دریافت کیا تھا کہ ایسے موقعوں پر قوتِ شامہ بڑی اذیت رساں چیز کا نام ہے۔ خاص کر ابالی چنے کی دال بڑی جان لیوا چیز ہوتی — کالی مرچ، ہرا مصالحہ، لیمو، اس کے اجزائے ترکیبی بے چین کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اور ہمارے سامنے یہ سب کچھ مسجد مغرب کے وقت روزے داروں کے لیے بھجوا دیا جاتا۔ لیکن تبھی ہم آئنسٹائن کی تھیوری آف Relativity کے بھی قائل ہوتے۔ کیوں کہ بعینہٖ یہی چیزیں بوقت افطار پیش کی جاتیں تو ایک لقمہ بھی اٹھانے کو جی نہیں چاہتا۔ کیوں کہ روزہ کھول کر پانی پیتے پیتے اتنا پیٹ بھر جاتا کہ نیت بھی نڈھال ہو جاتی۔

سحری کے وقت خوشامدیں کر کر کے اٹھایا جاتا کیوں کہ ہم نے دھمکی دی ہوئی ہوتی کہ خبردار اگر سحری کے لیے نہیں اٹھایا تو ہم بن سحری کا روزہ رکھ لیں گے — لیکن اس وقت کا ہنگام ہی کچھ اور ہوتا۔ ادھر ہم خوابِ غفلت میں نیند کو نہارہے ہوتے ادھر آپا کا ظالم کھردرا ہاتھ ہمارا شانہ جھنجھوڑتا۔ یا دف بجا کر سحری کے لیے اٹھانے

والے فقیر کی آواز گونجتی۔

ہم نہ دنیا پہ نہ دولت پہ نظر رکھتے ہیں
حشر پہ روزِ قیامت پہ نظر رکھتے ہیں

سحری کرو اٹھو!

یہ آواز ہمارے لاشعور میں بس گئی تھی ـــــ ہم چونکتے ، اٹھ بیٹھتے اور پھر دراز ہو جاتے ـــــ مگر تب کی آپائیں جانے کے لیے تھوڑی ہی آتی تھیں ـــــ وہ پلنگ کی دوسری طرف پہنچ جاتی اور اب کے ذرا تیز غصے بھرے لہجے میں کہتی۔

" بیگم صاحب کو بول دیوں گی جاکے ، نئیں اٹھتے بول کے "ـــ

ہم دوسری بار پلنگ پر اٹھ بیٹھتے مگر دل ہی دل میں آیا کو کچھ ایسے کلموں سے نوازتے جن کی رمضان شریف کے مبارک مہینے میں خاص مناہی ہے۔ خواب کی دنیا سے ہوش کی دنیا کا فاصلہ بظاہر تو کچھ نہیں لیکن سحری کے وقت یہ فاصلہ ہفت خواں کے مماثل ہوتا۔

گرمیوں میں صحن میں چھڑکاؤ کے بعد چوکی پر صاف ستھری صراحیوں میں پانی اور وہیں موتیا کے پھول رکھے جاتے جن کی خوشبو سے روزے داروں کے تھکے ہوئے دماغ معطر ہو جاتے۔

بدلتے ہوئے وقت نے گھروں کے صحن چوبارے بھی لوٹ لیے ، ٹھنڈی نیم کی چھاؤں لوٹ لی ـــ کتنے مضبوط خوش گوار سہارے تھے یہ زندگی کے۔ اب تو زندگی بیساکھیوں پر چلتی ہے۔ اسی میں گم ہیں۔ کیوں کہ اور کہیں مفر بھی تو نہیں۔

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

★

تیل

پروفیسر حفیظ بنارسی

شام ہوتے ہی دلِ مفلس کو تڑپاتا ہے تیل
پیسہ پیسہ جوڑ کر بے چارہ منگواتا ہے تیل

گرم خود ہوتا ہے جب اوروں کو گرماتا ہے تیل
مختلف عنوان سے امداد فرماتا ہے تیل

کوئی اپنی کھوپڑی پر روز مَلواتا ہے تیل
اور کوئی سونگھنے کو بھی ترس جاتا ہے تیل

ڈھونڈتے ہیں سب اسے مشکل کشائی کے لیے
جب چلی جاتی ہے بجلی سب کے کام آتا ہے تیل

تیل استعمال کرنے کا سلیقہ چاہیئے
سخت ہو گر مرحلہ آساں بنا جاتا ہے تیل

ہے کراسن اور کہیں ہے نام اس کا گھاسلیٹ
ہو اگر پٹرول تو سونا بھی بن جاتا ہے تیل

کہہ کے "والزّیتون" خود اللہ نے کھائی قسم
دیکھیے قسمت تو اس کی کیا جگہ پاتا ہے تیل

کتنے انساں اس کی خاطر ہوگئے کولہو کے بیل
مفلس و نادار پر کیا کیا ستم ڈھاتا ہے تیل

شعرِ تر کیونکر کہے وہ خشک جس کا ذہن ہو
کام کرتے کرتے دفتر میں نکل جاتا ہے تیل

ہم قطاروں میں کھڑے رہ جاتے ہیں ڈبہ لیے
سیٹھ پوپٹ مل کے گھر از خود چلا جاتا ہے تیل

دوسروں کا گھر جلانے میں یہ کام آتا تھا کل
اب تو خود سوزی کی خاطر کام میں آتا ہے تیل

ڈالڈا تو ڈالڈا ہے ڈالڈے کا ذکر کیا
ہم غریبوں کو تو اصلی گھی نظر آتا ہے تیل

کس قدر مشکل میں پھنس جاتی ہے گاڑی عشق کی
کوچۂ جاناں میں جب ختم ہو جاتا ہے تیل

سائیکل کے ہیں قصیدہ خواں اب اونچے لوگ بھی
چڑھ گئی قیمت بہت مہنگا نظر آتا ہے تیل

اس کی قدرت دیکھیے پانی نہ ملتا تھا جہاں
آبِ حیواں کو وہاں آئینہ دکھلاتا ہے تیل

دشمنِ اخلاق بن جاتی ہے اس کی زیادتی
ہو اگر نو۹ من تو پھر رادھا کو نچواتا ہے تیل

تیل جس دن ختم ہوگا ختم ہو جائے گا کھیل
ہے بھرا جب تک بدن میں ہم کو دوڑاتا ہے تیل

ریگ زاروں کو عطا کرتا ہے جنت کی بہار
اور کبھی دوزخ کے نظارے بھی دکھلاتا ہے تیل

تیل کی خاطر لڑائی ہے عجم سے تا عرب
سچ تو یہ ہے دوست ملکوں کو بھی لڑواتا ہے تیل

جنگ ہے اس کے لیے سب سے بڑا تیلی ہے کون
باعثِ آویزشِ باہم نظر آتا ہے تیل

تیل دیکھو اے حفیظ اور دھار دیکھو تیل کی
کیا تماشہ اور ابھی دنیا کو دکھلاتا ہے تیل

ابراہیم یوسف

معرفت صاحب

معرفت سے یہاں مراد مذہبی یا صوفیائے کرام کی اصطلاح سے نہیں ہے بلکہ اس معرفت سے ہے جسے انگریزی ں کیر آف" کہتے ہیں اور جسے خطوط پر مختصراً C/O لکھا جاتا ہے۔ یہ معرفت ہمارے جی کا جنجال بن گئی ہے یا تو لوگ ہمیں ضروری طور پر بے حد شریف انسان سمجھتے ہیں کہ ہماری معرفت بھیجا ہوا خط ضائع نہیں ہوگا اور شخص متعلقہ کو ضرور پہنچ جائے گا یا۔ پھر ہم سے کسی دشمنی کا بدلہ لیتے ہیں کہ ہم گھنٹے دو گھنٹے ان خطوط کو جو ہماری معرفت آتے ہیں مکتوب یہ تک پہنچانے میں گندی گلیوں میں مارے مارے پھرتے رہیں۔ بعض اوقات ایسے حضرات کے خطوط ہماری معرفت اتے ہیں جن سے ہم قطعی واقف نہیں ہوتے۔ ان کا جغرافیہ معلوم کرنے کے لیے ہمیں محلہ کے آوارہ گرد اور بدمعاشوں کی خوشامد کرنا پڑتی ہے کہ وہ محلہ کے ہر شخص سے خوب واقف ہوتے ہیں ـــــ ہمارے پڑوس میں ایک نوجوان بیوہ ہتی ہیں خوب صورت اور تعلیم یافتہ ہیں ان کے نام ہر روز ایک خط آتا اور ہم ازراہ ہمدردی نہایت خلوص سے خط انھیں دے آتے۔ ایک دن وہ ہم پر برس پڑیں اور بے طرح ہمیں آڑے ہاتھوں لیا کہ شرم نہیں آتی ایسے نامعقول خط مجھے دیتے ہوئے۔ میں تو تمھیں محلہ کا بزرگ اور شریف انسان سمجھتی تھی مگر معلوم ہوا کہ تم ایک نمبر کے لچے اور بدمعاش ہو۔ ہم اپنی شان میں یہ قصیدہ سن کر ہکا بکا رہ گئے۔ کچھ دیر تو ہم سکتے کے عالم میں رہے۔ پھر ہمت کرکے بولے "بی بی ہمیں کیا معلوم کہ ان خطوط میں کیا ہوتا ہے۔ ہماری معرفت آتے ہیں تو ہم اخلاقی فرض سمجھتے ہیں کہ آپ تک پہنچا دیں۔ اس پردہ بگڑ کر بولیں " او ہو بڑا اخلاقیات کا خیال ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں یہ خط تم لکھتے ہو اور مجھ تک پہنچانے کا یہ ناٹک رچا رہے ہو"

"توبہ کرو بی بی توبہ" ہم نے کہا "خیال فرماؤ آپ کے برابر تو ہماری لڑکیاں ہیں۔ بھلا ہم کوئی نازیبا حرکت کیسے کرسکتے ہیں"

"ہوں گی" وہ بولیں "مگر انھیں ڈاڑھی بنا لیا ہے جن کی آڑ میں شکار کھیلنا چاہتے ہو۔ اچھا کیا ایک جیسے خط میں ایک جیسے لفافے میں ہر روز تمھارے پاس بھی خط آتے ہیں"

ان کی بدزبانی پر اب ہمیں بھی غصہ آگیا ۔ اس لیے کہا "اب تو نہیں آتے تھے جوانی میں ضرور آتے تھے خوشبو میں بسے ہوئے۔

"واہ کیا جوانی رہی ہوگی" وہ طنز کرتے ہوئے بولیں "کبھی اپنی شکل بھی آئینہ میں دیکھی ہے۔ دیکھو اب اگر تم نے ایسے خطوط مجھے لاکر دیے تو میں اپنی بیوگی کی دہائی دے کر تمھیں اس قدر بدنام کروں گی کہ کسی کو منھ دکھانے کے قابل نہ رہو گے اور اس محلے میں رہنا دوبھر ہو جائے گا۔" ہم اپنے خلوص اور ذمہ داری کا جنازہ اپنے کاندھے پر لاد کر معرفت پر لعنت بھیجتے ہوئے واپس آگئے۔

یا تو محلے کے آوارہ گرد اور شہدے ہمارے بار بار لوگوں کے پتے پوچھنے سے عاجز آگئے تھے یا پھر ہم سے مذاق کرنا چاہتے تھے اس لیے منشی نوازش علی کا مکان دریافت کرنے پر ایک ایسے گھر کا پتہ بتلا دیا جس میں ایک نہایت بدزبان عورت اپنی لڑکیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ ہم نے گھر پر دستک دی تو اندر سے دہاڑتی ہوئی آواز آئی "کون ہے؟" ہم نے اپنے لہجے میں خلوص پیدا کرتے ہوئے کہا "منشی نوازش علی صاحب تشریف رکھتے ہیں؟" غراتی ہوئی آواز آئی "یہاں کوئی نوازش علی وازش علی نہیں رہتے۔ جانے کہاں کہاں کے لفنگے آجاتے ہیں۔ جانتے ہیں نا کہ اس گھر میں جوان لڑکیاں رہتی ہیں ان بدمعاشوں کو تو کوئی بہانہ چاہیے گھر کے چکر لگانے کا۔" ہم پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

منشی نوازش علی کا مکان نہ ملنا تھا نہ ملا آخر پریشان ہو کر "منشی نوازش علی کا گھر نہیں ملا" لکھ کر پھر ڈاک میں ڈال دیا۔ دوسرے دن ڈاکیہ وہ خط لیکر پھر آگیا اور کسی قدر تلخ لہجے میں بولا۔ "یہ آپ نے کیا لکھ دیا کہ گھر نہیں ملا۔ تلاش کرنے سے کیا نہیں ملتا۔ آخر ہم بھی تو سیکڑوں مکان تلاش کر لیتے ہیں۔ یہ آپ کا اخلاقی فرض ہے کہ یہ خط آپ منشی نوازش علی کو پہنچائیں۔" قبل اس کے کہ ہم کچھ بولیں وہ خط ہمارے ہاتھ میں تھما کر یہ جا وہ جا۔ گویا منشی نوازش علی کمبل بن کر ہم سے لپٹ گئے تھے ان منشی نوازش علی کا کیا کیا جائے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ خط کو اپنے پاس رکھ لینے یا ضائع کر دینے کو ہم اخلاقی بددیانتی سمجھتے تھے اس لیے ایک دوسرے لفافے میں رکھ کر پوسٹ ماسٹر کے نام ڈاک میں ڈال دیا۔ اور مطمئن ہو گئے کہ منشی نوازش علی کی نوازشوں سے چھٹکارا مل گیا۔ لیکن منشی نوازش علی یوں آسانی سے پیچھا چھڑانے والے نہیں تھے۔ خط تو خیر واپس نہیں آیا مگر پوسٹ ماسٹر کا عتاب نامہ ضرور ملا جس میں تحریر تھا کہ اگر منشی نوازش علی کا پتہ نہیں ملا تھا تو خط کو پھاڑ ڈالا ہوتا، جلا دیا ہوتا جیسا کہ ہمارے پوسٹ مین کرتے ہیں اور پریشانی سے بچنے کی خاطر لاوارث خطوط کے ساتھ کچھ اور خطوط بھی ملا دیتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ سرکاری آفیسر کا وقت بہت قیمتی ہوتا ہے اگر آپ نے آئندہ ایسی غیر ضروری خط و کتابت کی تو آپ کے خلاف قانونی کارروائی بھی کی جاسکتی ہے۔" واہ رے نوازش علی تیری نوازشیں۔

ابھی ہم ان نوازشوں ہی سے چھٹکارا نہیں پاسکے تھے کہ معرفت نے ایک اور گل کھلایا۔ ڈاکیہ ایک رجسٹرڈ خط لے کر آیا جو شہر کے ایک مشہور وکیل کی طرف سے نوٹس تھا جو کالا کوا کو ہماری معرفت بھیجا گیا تھا۔ کالا کوا کا نام تو اس کے ماں باپ نے بھلا سا رکھا ہوگا مگر عوام میں کالا کوا کے نام سے مشہور تھا۔ اسے بھی اس نام پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ فخریہ کہا کرتا تھا کہ یہ نام میری شخصیت کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے۔

"یہ شناختی بھی ہے اور توصیفی بھی۔ میرا رنگ کالا ہے تو نام میں کالا شناختی ہے اور میں کوے کی طرح چالاک ہوں۔" کالا کوا کو ہم بہ خوبی جانتے تھے۔ چوری، ڈاکہ، راہ زنی، اغوا اور قتل جیسے جرائم اس کے بائیں ہاتھ کے کھیل تھے۔ اس کے نام ہماری معرفت آئے ہوئے نوٹس سے ہم گھبرا گئے اور نوٹس لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر ڈاکیہ نے کسی قدر تیور بدل کر کہا "آپ نوٹس لینے سے انکار نہیں کر سکتے۔ انکار کا مطلب سمجھتے ہیں ایک ملازم سرکار کے فرائض منصبی

شگوفہ

کی اطلاعی میں مداخلت جو قانوناً جرم ہے۔" "خیر قانون سے تو ہم نمٹ لیں گے۔" ہم نے کہا: "مگر یہ کالا کوا قانون سے بھی اونچی کوئی چیز ہے جو ہمارے بس کا نہیں۔ ہم ایک شریف انسان ہیں۔" ہمارے دعوائے شرافت پر ڈاکیہ نے ہمارے پیر تک دیکھا اور تھوڑا مسکرایا جیسے اسے ہماری شرافت پر شک ہو۔ اس کی اس گستاخی پر ہمارا خون کھول گیا۔ اور کسی قدر غصے سے کہا: "تمھیں ہماری شرافت پر شک کیوں ہے؟ نہ ہمارے گھر کبھی پولس آئی نہ ہم کبھی تھانے بلائے گئے نہ عدالت کچہری سے کبھی کوئی واسطہ پڑا اور شریف کسے کہتے ہیں۔" اس پر ڈاکیہ نے کہا: "وہ تو آپ کے حلقے کے پولس والے ہی کچھ شریف معلوم ہوتے ہیں ورنہ آپ کی شرافت کوئی ہم سے پوچھیے، گرمی، سردی، بارش کوئی موسم ہو ہر روز دو مرتبہ خطوط کا یہ بڑا گٹھا لادے آپ کے گھر کی حاضری دینا پڑتی ہے ایک غریب سرکاری ملازم کو یوں پریشان کرنا کوئی بھلے اور شریف آدمیوں کے لچھن ہیں۔ میں پوسٹ ماسٹر کو لکھ کر دینے والا ہوں کہ آپ کی ڈاک سنسر کرائی جائے کہ آپ کسی سازش میں تو ملوث نہیں ہیں کہ ہر روز ملک اور بیرونِ ملک سے اس قدر ڈھیر سے خطوط آتے رہتے ہیں۔"

ڈاکیہ کی اس دھمکی سے ہم گھبرا گئے کہ اگر اس نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیا تو خفیہ پولس کی نظر میں بلاوجہ مشکوک ہو جائیں گے۔ اس لیے لہجہ میں تھوڑی سی خوشامد پیدا کرتے ہوئے کہا: "برادر! آپ ہر روز ہمارے گھر تشریف لاتے ہیں اس طرح آپ کے ہمارے دیرینہ تعلقات ہیں۔ عید بقرعید پر اپنی اوقات کے مطابق آپ کی خدمت بھی کرتے ہیں۔ عید پر سوئیاں اور بقرعید پر قربانی کا گوشت بھی آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور اب تو آپ محرم میں بھی انعام لینے تشریف لے آتے ہیں۔ ان تعلقات کو دیکھتے ہوئے ——"

وہ بات کاٹ کر بولا: "یہ ہمارا حق ہے جو ہم آپ سے وصول کرتے ہیں۔ آپ ہم پر کوئی احسان نہیں کرتے۔ خیر چھوڑیئے اس بحث کو۔ یہ نوٹس وصول کیجیے ورنہ پولس کے ذریعہ تعمیل کرایا جائے گا۔"

پولس کا نام سن کر ہمارے اوسان خطا ہو گئے کیوں کہ وردی پوش سرکاری ملازم سے ہم بہت ڈرتے ہیں چاہے وہ صفائی کرنے والے مزدوروں کا داروغہ ہی کیوں نہ ہو۔ ہم نے جبراً قہراً نوٹس وصول کر لیا۔ کالا کوا کو تو یہ نوٹس ہم کیا پہنچاتے کہ ہمیں اپنی اور اپنے گھر کی عورتوں کی عزت بہت عزیز ہے۔ کیا یہ کہ وہ لفافہ ایک دوسرے لفافے میں رکھ کر رجسٹری سے وکیل صاحب موصوف کو بھیج دیا اور لکھ دیا کہ اگر اب آپ نے یہ نوٹس ہماری معرفت بھیجا تو اس کا جواب ہم اپنے وکیل کے ذریعے دیں گے۔ وکیل صاحب موصوف شاید بھلے آدمی تھے پھر وہ نوٹس ہماری معرفت نہیں آیا۔ سنا ہے کہ جب کالا کوا کو اس کا علم ہوا تو وہ ہنسا اور بولا: "بس بھلا آدمی ہونے میں یہی تو خرابی ہے۔ ہمارے دروازے پر تو دن میں چار مرتبہ پولس والے حاضری دیتے ہیں ہم ان کا نوٹس نہیں لیتے یہ دکیلوں سکیلوں کے نوٹس کی کیا اوقات ہے۔" بہر حال ڈاکیہ نے بدتمیزی کی اچھا نہیں کیا۔ ہم کالا کوا کی شرافت کے قائل ہو گئے۔

عزیز الدین صاحب محلے کے بزرگ اور ہمارے والد کے ملنے والوں میں سے ہیں۔ عمر نوے سے کچھ اوپر ہے۔ بھنگی دکھائی بھی کم دیتا ہے۔ ایک روز ان کا خط ہماری معرفت آ گیا۔ شام کو جب ہم یہ خط لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ گھر کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ ہمارے سلام کرنے پر تھوڑی تھوڑی آنکھیں کھول کر فرمایا۔ "کیا ہے"

"آپ کا خط ہے۔" ہم نے کہا۔ "کیسا خط؟" انھوں نے پھر سوال داغا۔ "آپ کا خط ہے، ہماری معرفت آیا ہے۔" ہم نے عرض کیا۔ عزیز الدین صاحب یہ سن کر کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر افسردہ ہو کر بولے۔ "اب ہم اس قدر غیر معروف ہوگئے ہیں کہ ہمارے خطوط دوسروں کی معرفت آتے ہیں۔" پھر ہمارے ہاتھ سے خط لے کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ بزرگ کی انا کو سخت ٹھیس پہنچی تھی۔ کچھ دیر اس طرح خاموش رہے جیسے اندر ہی اندر اتھل پتھل مچی ہوئی ہے اس پر قابو پا رہے ہوں کچھ دیر بعد بولے۔ "یہ خط کب آیا تھا؟" ہم نے عرض کیا صبح کی ڈاک سے۔" اس پر وہ بولے۔ "اور تم اب لے کر آرہے ہو کس قدر غیر ذمہ داری ہے۔" پھر اپنی آنکھوں کو عینک سے مسلح کر کے ہمیں سر سے پیر تک دیکھ کر ہمارے والد کا نام لے کر پوچھا۔ "تم ان کے صاحب زادے ہو؟" ہمارے اثبات میں سر ہلانے پر بولے۔ "وہ اس قدر غیر ذمہ دار نہیں تھے۔ دو ٹوک بات کرنے والے کھرے پٹھان تھے۔" اور پندرہ منٹ تک ہمارے والد کی خوبیاں بیان کرتے رہے۔ ہماری بے چینی بڑھنے لگی۔ ہم نے اجازت چاہی تو بولے۔ "میاں جلد جانا ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ تمھارے باپ سے ہمارے گہرے مراسم تھے۔" لفافہ چاک کر کے خط نکالا پہلے لفظ پر نظر پڑی۔ تیوری پر بل آیا منہ بنا کر اس طرح بڑبڑانے لگے جیسے خود ہی مخاطب ہوں۔ "نئی نسل سے تہذیب بالکل رخصت ہو گئی ہے نہ القاب نہ آداب نہ قبلہ و کعبہ بس ابا جان گویا ابا جان نہ ہوئے یتیم خانے کے دربان ہو گئے۔ اتنی بھی تمیز نہیں کہ بزرگوں کو کس طرح مخاطب کیا جاتا ہے۔ یہ بدعت اس شاعر اعظم غالب کی پھیلائی ہوئی ہے۔" شاعر اعظم انھوں نے طنزیہ لہجہ میں کہا تھا جانے غالب کے خلاف کون سا غبار لیے بیٹھے تھے۔ دو چار سطریں پڑھ کر ہماری طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔ "میاں یا تو ہم اپنی مادری زبان بھولتے جا رہے ہیں یا ہماری ہی زبان ہمارے لیے اجنبی ہوتی جا رہی ہے۔ ہم اور ہمارے باپ دادا جن الفاظ کو ملا کر لکھا کرتے تھے اب الگ الگ لکھے جانے لگے ہیں بھلا انھیں پڑھنے میں دقت ہی نہیں ہوتی بلکہ غیر مانوس اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں ذہن انھیں اس حلیہ میں قبول نہیں کرتا۔" اس کے بعد آدھے گھنٹے تک وہ ہمیں املا و انشا پر لیکچر دیتے رہے۔ ہماری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی مگر اس لیے خاموش تھے کہ بے چارے بڑے میاں کے دل میں جانے کب کا غبار بھرا ہوا ہے جسے وہ ہمارے سامنے نکال دینا چاہتے ہیں۔ ہمیں ان سے ہمدردی پیدا ہو گئی وہ جانے کب تک یوں دل کے پھپھولے پھوڑتے رہتے کہ مغرب کی اذان کان میں پڑی۔ ہم نے انھیں اس طرف متوجہ کیا تو وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے "میاں معاف کرنا میں نے تمھارا بہت وقت لیا۔" اور گھر میں چلے گئے۔ ہم یہ سوچتے رہ گئے کہ ہماری معرفت آئے خط کو پہنچانے میں ہم نے اپنا وقت ضائع کیا یا بڑے میاں کی دل بستگی۔

ایک روز ہم بیٹھے ڈاکیے کا انتظار کر رہے تھے کہ کال بیل بھیانک آواز میں چیخ اٹھی۔ اس کال کی آواز پر ہماری بیگم کو سخت اعتراض ہے ان کا کہنا ہے کہ گھنٹی اطلاع دینے کے لیے ہوتی ہے نا کہ مردوں کو قبروں سے اٹھانے کے لیے۔ صور اسرافیل کی آواز بھی اس قدر بھیانک نہ ہوگی۔ ہم انھیں برابر سمجھاتے رہتے ہیں کہ بیگم یہ گھنٹی ہماری شان ہے۔ جب بار بار بجتی ہے تو پاس پڑوس کے لوگوں پر خاصا رعب پڑتا ہے کہ ہمارے احباب کا حلقہ کس قدر وسیع ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ گھنٹی بجانے والوں میں صفائی کرنے والا، دھوبی، سبزی فروش اور اسی قسم کے لوگ زیادہ ہوتے ہیں احباب کم۔ خیر ہم باہر پہنچے تو ڈاکیہ ہی تھا۔ آج بڑے خلوص سے ہمیں سلام کیا اور مسکرا کر بولا۔

"میاں آج میں بلا انعام لیے نہیں جاؤں گا"۔ جب اس کی غرض ہوتی ہے تو وہ ہمیں میاں کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ "آخر بھئی ایسی کیا بات ہے کہ تم انعام طلب کر رہے ہو"۔ ہم نے پوچھا۔ "آپ کے نام منی آرڈر ہے"۔ اس نے کہا۔ "پانچ روپے سے کم نہ لوں گا"۔ ہمارے نام اور منی آرڈر ہم حیرت میں پڑ گئے۔ "اچھا لاؤ پیسے دو۔ تمھیں انعام بھی مل جائے گا"۔ ہم نے کہا۔ "جی نہیں یوں نہیں پہلے انعام"۔ اس نے کہا۔ کافی بحث و مباحثہ کے بعد معاملہ دو روپے میں طے ہوا۔ ہم نے دو روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ اس نے منی آرڈر فارم ہمیں دے کر جگہ بتاتے ہوئے کہا یہاں یہاں اور یہاں دستخط کر دیجیے۔ یہ منی آرڈر تین روپے تیس پیسے کا تھا جو کلثوم بی کے نام ہماری معرفت آیا تھا۔ ڈاکیہ نے تین روپے ہمارے ہاتھ پر رکھ کر کہا میرے پاس تیس پیسے چھٹے نہیں ہیں آپ کے ستر پیسے ہوں تو دے دیجیے۔ میں ایک روپیہ دے دوں گا اور اگر نہ ہوں تو تیس پیسے میں پھر کبھی دے جاؤں گا اور وہ تیس پیسے بھی لے کر چلتا بنا۔ کلثوم بی محلّے کی بڑی بی تھیں جن کی گزر بسر محلّے والوں کے رحم و کرم پر تھی۔ جب ہم نے تین روپے تیس پیسے لے جاکر انھیں دیے تو انھوں نے سینکڑوں دعائیں دیں اور بتلایا کہ ان کے باپ کی کچھ جائیداد ہے جس کی آمدنی میں ان کا حصّہ بھی بنتا ہے ان کے بھائی بڑے خدا ترس اور اللہ والے ہیں منی آرڈر کمیشن کاٹ کر ان کا حصّہ انھیں بھیجتے رہتے ہیں۔ واقعی چار پانچ روپے میں سے بھی کمیشن کاٹ لینا خدا ترسی ہے۔ ہم سوچنے لگے کہ بڑی بی نے جو دعائیں دی ہیں وہ دو روپے تیس پیسے میں مہنگی نہیں ہیں۔

اکثر خطوط بے رنگ آتے ہیں ان کی رقم ہمیں ادا کرنا پڑتی ہے ایک مرتبہ ایک صاحب سے کہا کہ میاں آپ کا خط بے رنگ تھا۔ ہمیں دو روپے ادا کرنے پڑے تو فرمایا آپ نے کیوں وصول کر لیا واپس کر دیا ہوتا اور خط لے کر رکھ لیا۔ گھر کے بجٹ میں بے رنگ خطوط وصول کرنے کی مد کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

اگر ہم کسی خط کے پتے کو غور سے دیکھتے ہیں تو ڈاکیہ وہ پتہ ہم کو سمجھا دیتا ہے اور دو چار خط اور پکڑا دیتا ہے کہ میاں آپ ادھر تو جاؤ گے ہی یہ خط بھی دے دینا میں کہاں ان گلیوں میں مارا مارا پھروں گا گویا اس نے ہمیں اپنا اسسٹنٹ بنا لیا ہے۔

اب حالت یہ ہے کہ جب ڈاکیہ کے آنے کا وقت ہوتا ہے تو ہمارے صاحب زادے ادھر ادھر کھسک لیتے ہیں کہ کہیں ہم انھیں دو چار خط پکڑا دیں کہ یہ فلاں فلاں کو دے آؤ۔ ہماری بیگم ہمیں اے جی، او جی یا گڈی کے ابا کہہ کر مخاطب نہیں کرتیں بلکہ 'معرفت صاحب' کہتی ہیں۔ آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ اس طرح وہ ہمارا مذاق اڑاتی ہیں یا ہم پر طنز کرتی ہیں۔ یا اپنی محبت کا اظہار۔ ○○

قلمی معاونین

اپنی تخلیقات

صاف اور خوش خط لکھیں !

مسودات پر اپنا پورا پتہ ضرور لکھیں ________

الیکشن کا زمانہ

مفلس فاروقی (بارسی ٹاکلی)

سنہرے جال پھیلاؤ الیکشن کا زمانہ ہے
سہانے خواب دکھلاؤ الیکشن کا زمانہ ہے

بہل جائے گی بھارت کی یہ جنتا بھولی بھالی ہے
کھلونے دے کے بہلاؤ الیکشن کا زمانہ ہے

سیاسی مسخرے چہرے بدل کر آئیں گے اپنے
نقاب ان کے اترواؤ الیکشن کا زمانہ ہے

تمھیں جو لوٹ کر کھاتے رہے ہیں مدتوں یارو
انھیں اب لوٹ کر کھاؤ الیکشن کا زمانہ ہے

کھلاؤ کھیر کتوں کو ملائی بلیوں کو دو
گدھوں کو تاج پہناؤ الیکشن کا زمانہ ہے

کیے تھے ہم سے جو پچھلے الیکشن کے زمانے میں
انھیں وعدوں کو دہراؤ الیکشن کا زمانہ ہے

کرو مت بھول کر بھی تذکرہ اب روکھی سوکھی کا
چپاتی، گھی سبھی کھاؤ الیکشن کا زمانہ ہے

لڑاؤ باپ کو بیٹے سے اور بھائی کو بھائی سے
انھیں آپس میں الجھاؤ الیکشن کا زمانہ ہے

مسائل ہی سیاسی کامیابی کی ضمانت ہیں
مسائل کو نہ سلجھاؤ الیکشن کا زمانہ ہے

بلا کر لیڈروں کو اپنی ٹوٹی پھوٹی چوکھٹ پر
اب ان سے ناک گھسواؤ الیکشن کا زمانہ ہے

زباں رکھتے ہیں ہم بھی بولنا ہم کو بھی آتا ہے
ہمارا منہ نہ کھلواؤ الیکشن کا زمانہ ہے

کم از کم اس زمانے میں کوئی بھوکا نہ رہ پائے
سبھی اب پیٹ بھر کھاؤ الیکشن کا زمانہ ہے

تمھارے ووٹ لے کر یہ تمھیں کو بھول جاتے ہیں
غریبوں کو نہ بہلاؤ الیکشن کا زمانہ ہے

تمھارا فائدہ وابستہ ہے جس سے وہ جو بھی ہو
اسی نیتا کے گن گاؤ الیکشن کا زمانہ ہے

منسٹر کے چہیتے ہم ہیں، چمچے ہم ہیں نیتا کے
ہمارے منہ نہ تم آؤ الیکشن کا زمانہ ہے

سہولت سے کسی کو بھی الیکشن جیتنے مت دو
چنے لوہے کے چبواؤ الیکشن کا زمانہ ہے

میاں! یوں بیٹھنے سے ووٹ تو ملتے نہیں والے
ادھر آؤ، ادھر جاؤ الیکشن کا زمانہ ہے

لگا دو سارے مفلس شاعروں کو روزی روٹی سے
قصیدے ان سے لکھواؤ الیکشن کا زمانہ ہے

بے حیا

اقبال ہاشمی (حید

میں سمندر کا تلاطم دیکھنے کے شوق میں
ایک ساحل پر گیا
ہر طرف رعنائیاں بکھری پڑی تھیں
ڈوبتے سورج کو میں تکتا کبھی
اور کبھی بے چین لہروں میں الجھتے تھے قدم
ایک جانب میں نے دیکھی ادھ کھلی رنگیں کتاب
ادھ کھلی رنگیں کتاب
آتے جاتے پڑھ رہے تھے جس کو لوگ
میں بھی جب پڑھنے کو کچھ آگے بڑھا
اس نے کچھ مجھ سے کہا
جس کا مطلب تھا پرے ہٹ بے حیا

پرویز ید اللہ مہدی

یہاں سے یا سے میری جان

فاصلوں کی خلیجِ بنگال

بستی میں فاصلوں کی فصیل صرف مقامات اور جگہوں تک ہی محدود ہوتی تو بخدا ہم کبھی شکوہ برلب نہ ہوتے بلکہ بستی کے پھیلاؤ کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا کر چپ سادھ لیتے لیکن افسوس فاصلوں کی یہ وسیع و عریض خلیج یہاں گھروں اور دلوں کے بیچ بھی پائی جاتی ہے ایک ہی بلڈنگ بلکہ ایک ہی فلور پر اغل بغل کے فلیٹوں اور کھولیوں میں رہنے والے لیکن بھی یہاں نہ تم ہمیں جانو، نہ ہم تمہیں جانیں کا راگ الاپتے ہوئے اجنبیوں کی طرح زندگی گزار دیتے ہیں۔ غالباً ایسی ہی کسی سچویشن کو سامنے رکھ کر ایک فلمی نغمہ نگار نے یہ مکھڑا موزوں فرمایا۔

ہائے رے انسان کی مجبوریاں ؎ پاس رہ کر بھی ہیں کتنی دوریاں

زمینوں کے سلسلے میں پہنچنے والے فاصلوں کا اندازہ ہمیں کچھ عرصے پہلے اس وقت ہوا جب ایک شناسا سے ملنے پہلی بار ہاؤزنگ بورڈ کی ایک کالونی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ہاؤزنگ بورڈ کی بلڈنگوں میں خوبی یہ ہوتی ہے کہ ہر بلڈنگ دوسری بلڈنگ کی زیراکس کاپی معلوم ہوتی ہے - ایک جیسا ڈیزائن ایک جیسی کلر اسکیم جن میں کلر کم اور اسکیم زیادہ ہوتی ہے ایک جیسے دروازے، ایک جیسی کھڑکیاں غرض یہ کہ ہاؤزنگ بورڈ کی ہر کالونی یکسانیت، مماثلت، یک جہتی کا حیرت انگیز نمونہ ہوتی ہے۔ مذکورہ کالونی بھی ان ہی اوصاف حمیدہ و غیر حمیدہ کا مظہر تھی - البتہ رقبے کے اعتبار سے کالونی ہذا کا طول بلد و عرض بلد دیکھ کر ہم پر ہیبت طاری ہو گئی۔ یوں لگا جیسے بستی عظمیٰ میں ایک اور منی بستی نمودار ہو گئی تھی اور ہم ان کے آگے سر جھکائے کھڑے تھے اس پریشان حال جانور کی طرح جسے گھنے جنگل میں اچانک اپنے گھر کا راستہ سجھائی نہ دے رہا ہو۔ اصل میں حماقت ہمیں سے سرزد ہوئی تھی۔ اپنے شناسا کا پتہ کاغذ پر محفوظ کرنے کے بجائے حافظے کے بھروسے پر چھوڑ دیا تھا جس نے ہمیشہ کی طرح بھروسے کا یہ انعام دیا کہ خود تو کسی حیر شکاری کی طرح محفوظ مچان پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور ہمیں قربانی کے جانور کی طرح اللہ کے لیے بلڈنگوں کے جنگل میں تنہا چھوڑ دیا۔ اب کسی تجربہ کار گائیڈ کی رہنمائی کے بغیر منزل مقصود تک رسائی ناممکن تھی لہٰذا اللہ کا نام لے کر کسی معقول رہنما کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگے۔ اچانک نظر ایک معقول شخص پر پڑی جو ایک جھلنگا سی کھٹیا پہ بیٹھا جھول رہا تھا۔ اس نامعقول حرکت کے باوجود موصوف ہمیں معقول اس لیے معلوم ہوئے کہ عمر کی اس منزل میں تھے جہاں آدمی دھوپ چھاؤں کی پرواہ کئے بغیر خود تو تھک کر بیٹھ جاتا ہے لیکن بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھانے کا کار خیر بخوبی انجام دے کر ثواب دارین لوٹنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ہم لپک کر ان کے پاس پہنچے اور اپنے شناسا کا نام بتلا کر رہنمائی کی درخواست کی، جواب میں ان کے چہرے پر جو تاثرات ابھرے ان میں اگرچہ تاثرات کم اور جھریاں زیادہ تھیں پھر بھی ہمیں یہ اندازہ

لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ یہ نام خود موصوف نے زندگی میں پہلی بار سنا ہے آپ کہ ہم نے اپنے شناسا کے حوالے سے اس کا اتا پتا جاننے کی کوشش کی عرض کیا۔ جثے کے اعتبار سے خاصے نعیم شمیم ہیں وہ خالص بمبئیا۔ ادھر میں نعیم بھائی، شمیم بھائی، کوئی بھی نہیں رہتا۔

"نعیم شمیم نہیں۔ نعیم شحیم۔ مطلب موٹا تازہ۔ جاڑا۔" مسکرا کر بولے۔ "پھر ایسا بولنے کا۔ وہ کیا ہے اکھا بمبئی لوگ جاستی کر کے ادھر میں رہتا۔ اور اکھا جاڑا لوگ، سالا ایک سری کا لگتا۔!"

ہم نے اگلی نشانی بتائی "بالوں کی حد تک خاصے فارغ البال ہیں وہ!" چونک کر بولے۔ "فٹبال ہے۔ ادھر کوئی فٹبال ڈھونڈنے کو آیا۔" ہم نے گڑبڑا کر کہا۔ "فٹ بال نہیں۔ فارغ البال۔"

ہماری بات کاٹ کر وہ بولے۔ "نہ بابا یہ ہم کون سا بال بولتا۔ سر کا ادھر کا ادھر کا۔"

ہم نے فوراً وضاحت کی۔ فارغ البال مطلب گنجا۔ مسکرا کر بولے۔ "پھر ایسا بولنے کا۔ وہ کیا ہے اکھا بمبئی کا ٹاٹا جاستی کر کے ادھر میں رہتا اس واسطے جاستی کر کے لوگ یہ کالونی کو ٹاٹا نگر کا جگہ ٹکلا نگر بولا کے بولتا۔"

ہم نے ایک اور نشانی کی طرف اشارہ کیا۔ ان کی آنکھیں خاصی کمزور ہیں۔ موٹے شیشوں کی عینک چوبیس گھنٹے ان کی آنکھوں پر سوار رہتی ہے۔ سوتے میں بھی نہیں اتارتے۔!

مسکرا کر بولے۔ "ارے بابا یہ تو سالا اکھی کالونی کا پرابلم ہے بڈھا لوگ، بچہ لوگ، مرد لوگ عورت لوگ۔ میں سالا سب چشمش ہے" ہم نے آخری نشانی ان کے گوش گزار کی۔ دیکھنے میں وہ ذرا سخت گیر ہیں مگر اندر سے بہت نرم... ہماری بات کاٹ کر بولے، "کپ گیر ہے۔ ارے بابا تم کیا آدمی ہے۔ اسپیر پارٹ SPARE PART آدمی کا بتاتا اور ڈھونڈنے کو چلا کپ گیر کا۔" ہم نے فوراً وضاحت کی۔ کپ گیر نہیں سخت گیر، مطلب ایک دم کڑک لیکن اندر سے نرم بالکل ناریل کی طرح۔

مسکرا کر بولے۔ "ارے بابا ادھر میں جاستی کر کے سب جن ایسا ہی ہے، ہتی کا دانت کا مافک، سالا کھانے کا اور دکھانے کا اور، ایسا فالتو نشانی لے کے تم ادھر میں کسی کو بھی نہیں ڈھونڈ سکتا۔ کیا؟"

ان منہ توڑ جوابات کے آگے سوائے ہتھیار ڈالنے کے ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں تھا اور پھر معدودے چند بھی قابلِ ذکر نشانیاں یاد تھیں وہ سب کی سب صرف وبالِ ہو چکی تھیں لہٰذا وہاں سے چپ چاپ واپسی میں عافیت اور عاقبت دونوں کی خیر تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنی واپسی کے ارادے کو عملی جامہ پہناتے، ہاؤسنگ بورڈ کالونی کے کاتیڈ مہاشے نے ہماری معلومات کے جاسے کو مزید تار تار کرنے کی غرض سے بڑے ہی پرجوش انداز میں آگے فرمایا۔ "بڑا بڑا نیتا لوگ، دور درشن کے اوپر بھاشن دیتے ٹیم بوبابوم کرتا ابھی اکھا ملک اکیسویں صدی کے جانے والا ہے کر کے، پر اپن بولتا ہے۔ سالی بمبئی ٹیم سے پہلے، اکیسویں صدی میں گھس گئی ہے۔ کا تیکو بولے گا ادھر میں سب الٹا سلٹا ہو گیا ہے ابھی بمبئی میں آدمی لوگ کا پہچان نام اور نشان سے نہیں ہوتا ہے۔ ٹیلی فون نمبر بلڈنگ کا نمبر والے کا نمبر، بلاک کا نمبر، فلیٹ کا نمبر......."

انسان کی اس نئی پہچان کے حوالے پر ہم نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا....... "جہاں تک نمبروں کا تعلق ہے مجھے اپنے دوست کی بلڈنگ کا نمبر یاد ہے نہ بلاک کا نہ والے کا۔ صرف فلیٹ کا نمبر یاد ہے۔ فلیٹ نمبر آٹھ

تشویش ناک لہجے میں بولے .... یہ تو سالا اور بھی مشکل ہے۔ کائیکو بولے گا تو ادھر میں دو بلڈنگ کے تیسرے کے اوپر فلیٹ نمبر آٹھ تھی ہوتا۔ ابھی تم کو تمہارا دوست سے ملنے کا ارجنٹ ہوئے تو دو بلڈنگ کا تیسرا مالا چڑھ کے تپاس کرو۔ کدھر نہ کدھر تم کو نکی مل جائیگا . . . موصوف کا مشورہ اگرچہ خاصا تکلیف دہ تھا لیکن ناقابل عمل نہیں تھا۔ اس کی میلی ہی بھی توقع تھی۔ مو بروم ہی سہی۔ چناں چہ ان کا شکریہ ادا کر کے عمل درآمد کے ارادے سے قدم بڑھا لیے ہی تھے کہ موصوف نے زبانی اڑنگا لگایا۔ ارے بابا بھاگتا کدھر ہے؟ ابھی اپن کا بات خلاص نہیں ہوا ہے۔ اتنا کہہ کر ہمارے بڑھتے قدموں میں پھر سے بیڑیاں ڈال دیں اور آگے بولے۔ ابھی جو بات اپن تم کو بتاتا ہے اس کو دھیان سے سننے کا، ادھر میں دو بلڈنگ کے تیسرے مالے کے اوپر پہنچنے کے واسطے کتنا دادر چڑھنا پڑیگا تم کو مالوم؟ سوال معقول تھا لیکن اس کا کوئی نامعقول سا جواب بھی ہمارے پاس نہیں تھا۔

اس لیے فوراً انکار میں سر ہلا دیا۔ مسکرا کر بولے، ارے بابا! پورا تیس کا اوپر پانچ نہ ایک کمتی نہ ایک جاستی۔ پہلے چند کا پھر اس نے کا دونوں ملا کے دو بلڈنگ کے تیسرے مالے کا ٹوٹل ادر کتنا ہوا۔ ہم نے فوراً منہ زبانی حساب کر کے بتایا، تیس کے اوپر پانچ، مطلب پینتیس پورے مسکرا کر بولے ایک دم برابر پورا ستر نہ ایک کمتی نہ ایک جاستی، ابھی ادھر کا بلڈنگ کتنا ہے تم کو مالوم۔؟ ہم کوئی بلڈنگ شماری کے ایکسپرٹ تو تھے نہیں جو ترنت بلڈنگوں کی تعداد، ان کے سنگ بنیاد کے دن تاریخ اور مہورت کی مکمل تفصیلات ان کی خدمت اقدس میں پیش کر دیتے۔ الٹا ہمارا شمار تو ان معصوموں میں ہوتا ہے جو مردم شماری سے اختر شماری تک ہر باب میں کورے ہوتے ہیں۔ چناں چہ موصوف کے سوال کے جواب میں سوالیہ نشان کی صورت شرمندہ و محجوب سے کھڑے رہے۔ ہماری اس حالت زار پر مسکرا کر بولے، ارے بابا ادھر میں ہاؤزنگ بورڈ والا لوگ ایک سائز، ایک ٹائپ کا پورا تیس بلڈنگ کھڑا کیا ہے۔ نہ ایک کمتی نہ ایک جاستی اور تیس بلڈنگ کا تین مالے کا ٹوٹل دادر کتنا ہوا مالوم؟۔

ہم نے ایک بار پھر جواب جوڑ کر بتا دیا۔ ستر ضرب تیس یعنی پورے اکیس سو زینے۔

مسکرا کر بولے۔ ایک دم برابر، پورا اکیس سو نہ ایک کمتی نہ ایک جاستی۔ ابھی تم کو اپنا دوست کا فلیٹ تپاسنے کا ہوئے تو جاؤ اکیس سو دادر چڑھ جاؤ۔ رام تمہارا بھلی کرے گا!!

اکیس سو زینے کے حوالے پہ ہماری رہی سہی ہمت اور بچے کچھے حوصلے کی ہوا نکل گئی۔ ہم کوئی وی۔ آئی۔ پی (V. I. P) تو تھے نہیں جو اکیس سو زینوں اور اکیس سو توپوں کی سلامی میں تمیز نہیں کر پاتے۔ چناں چہ واپسی کے مصمم ارادے سے پلٹے ہی تھے کہ نظر آخر نظر ہے۔ بے ارادہ سامنے والی بلڈنگ کے تیسرے مالے کی طرف اٹھ گئی۔ اسے حسن اتفاق ہی کہیے کہ ٹھیک اس وقت مذکورہ بالکنی میں ہمارے ممدوح کا سراپا طلوع ہوا۔ ہاتھوں میں گیلے کپڑوں کا گٹھر لیے ہوئے۔

ہم نے فوراً گائیڈ مہاشے کو جنھوں نے اب تک صرف مس گائیڈ کیا تھا جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ وہ دیکھیے سامنے والی بلڈنگ کے تیسرے مالے کی طرف، جو بالکنی میں کھڑے ہوئے کپڑے نچوڑ کر الگنی پر ڈال رہے ہیں۔ میں انھیں کے بارے میں پوچھ رہا تھا....!

گائیڈ مہاشے پہلے تو کھسیائے۔ پھر ڈھٹائی سے بولے۔ یہ تو سالا کمال ہو گیا۔ تمہارا بھلا میں، اور ڈھونڈ رہا اکھی کالونی میں، یہ گنجا تو اپن کا پڑوسی ہے!

اس انکشاف پر ہم نے متحیر لہجے میں کہا۔ مطلب آپ بھی اس بلڈنگ میں رہتے ہیں؟ کمال ہے ایک ہی بلڈنگ میں رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو جانتے نہیں؟ ۔ مسکرا کر بولے ۔ ارے بابا تم بلڈنگ کی بات کرتا ہے ۔ ادھر میں لوگ ایک ہی مالے کے ادیبا جو باجو کے فلیٹ میں رہتا ہے پھر بھی ایک دوسرے کو جانتا نئیں ۔ کائیکو بولے گا تو دو فلیٹ کے بیچ میں جو دیوار ہے وہ کوئی آلتو فالتو دیوار نئیں ، دیوار چین ہے ۔۔؟ کیا سمجھا ۔۔؟

گائیڈ جہانشے نے آخری بات بڑے پتے کی بھی کی ۔ دلوں اور گھروں کے بیچ پائی جانے والے فاصلوں کی یہ دیواریں واقعی دیوار چین کی جدید توسیع ہیں ۔ البتہ ان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک حقیقی ہے تو دوسری مجازی ' دیوار چین ' اینٹ ' چونے گارے اور سمنٹ کے گھول سے کھڑی کی گئی ہے جبکہ فاصلوں کی دیوار چین رتبے حیثیت اور پوزیشن کی بنیاد پر کھڑی کی جاتی ہے اس لیے جب آدمی خود کو مجازی دیواروں میں محصور کر لیتا ہے تو پھر اس میں اور دیوار سے ٹنگے کیلنڈر یا موڈرن آرٹ کے کسی بے حس و بے جان نمونے میں کوئی فرق نہیں رہتا ۔۔!!!

مشتاق احمد یوسفی

چوتھی قسط

اسکول ماسٹر کا خواب

کوئی دیوار سی گری ہے ابھی۔

کچھ دیر بعد مولانا آتے ہوئے نظر آئے۔ کیچڑ میں ڈگمگ ڈگمگ کرتی اینٹوں پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہے تھے۔ اس ڈانواں ڈول پگڈنڈی پر اس طرح چلنا پڑتا تھا جیسے سرکس میں کرتب دکھانے والی لڑکی تنے ہوئے تار پر چلتی ہے۔ لیکن اس کی کیا بات ہے۔ وہ تو خود کو کھلی چھتری سے بیلنس کرتی رہتی ہے ذرا ڈگمگا کر گرنے لگتی ہے تو تماشائی پلکوں پر جھیل لیتے ہیں۔ مولانا خدا جانے بشارت کو دیکھ کر لڑکھڑا گئے یا اتفاقاً ان کی کھڑاؤں اینٹ پر پھسل گئی، وہ دائیں ہاتھ کے بل جس میں ذم کے پانی کا گلاس تھا، گرے۔ ان کا تہمد اور داڑھی کیچڑ میں لت پت ہو گئی اور ہاتھ پر کیچڑ کا موزہ سا چڑھ گیا۔ ایک بچے نے بدھنی لوٹے سے پانی ڈال کر ان کا منہ ہاتھ دھلایا۔ بغیر صابن کے۔ انھوں نے انگوچھے سے تسبیح، منہ اور ہاتھ پونچھ کر بشارت سے مصافحہ کیا اور سر جھکا کے کھڑے ہو گئے۔ بشارت ڈھے چکے تھے۔ ریہرسل کیے ہوئے طعن آمیز ابتدائیہ فقرے جو داڑھی، نماز اور گلے سے متعلق تھے، اس کیچڑ میں غرق ہو گئے "قصرِ تقدس کا چھجا" والی پھبتی بھی اسی نگ بھاتی دلدل میں دھنستی چلی گئی۔ ان کا بے اختیار جی چاہا کہ بھاگ جائیں۔ مگر دلدل میں آدمی جتنی تیزی سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے اتنی ہی تیزی سے دھنستا چلا جاتا ہے۔

ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب شکایت و فہمائش کا آغاز کہاں سے کریں۔ اسی شش و پنج میں انھوں نے اپنے دائیں ہاتھ سے، جس سے ذرا دیر پہلے بہ کراہت مصافحہ کیا تھا، ہونٹ کھجایا تو ابکائی آنے لگی۔ اس کے بعد انھوں نے اس ہاتھ کو اپنے جسم اور کپڑوں سے ایک بالشت دور رکھا۔ مولانا غایتِ آمد بھانپ گئے۔ خود پہل کی۔ اس اعتراف کے ساتھ کہ میں آپ کے کوچوان رحیم بخش سے پیسے لیتا رہا ہوں۔ پڑوسن کی بچی کے علاج کے لیے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ میری تعیناتی سے پہلے یہ دستور تھا کہ آدھی رقم آپ کا کوچوان رکھ لیتا تھا۔ اب جتنے پیسے آپ سے وصول کرتا ہے وہ سب مجھ تک پہنچتے ہیں۔ اس کا حصہ ختم ہوا۔ ہوا یہ کہ ایک دن وہ مجھ سے اپنی بیوی کے لیے تعویذ لے گیا۔ اللہ نے اس کا مرض دور کر دیا۔ وہی شافی وہی کافی ہے۔ وہی جِلاتا اور مارتا ہے۔ اس کے بعد وہ میرا معتقد ہو گیا۔ بہت دکھی آدمی ہے۔

مولانا نے یہ بھی بتایا کہ پہلے آپ چالان اور رشوت سے بچنے کے لیے جب بھی اسے راستہ بدلنے کا حکم دیتے، وہ محکمہ والوں کو اس کا پیشگی نوٹس دے دیتا تھا۔ وہ ہمیشہ برضا و رغبت پکڑا جاتا تھا۔ بلکہ یہاں تک ہوا کہ ایک دفعہ انسپکٹر کو نمونیہ ہو گیا اور وہ تین ہفتے تک ڈیوٹی پر نہیں آیا تو رحیم بخش ہمارے آفس میں یہ دریافت کرنے آیا کہ اتنے دن سے چالان کیوں نہیں ہوا۔ خیریت تو ہے؟

بشارت نے دو تین سوال کوچوان سے متعلق تو کیے، لیکن مولانا کو کچھ کہنے سننے کا اب ان میں یارا نہ تھا۔ ان کا بیان جاری تھا۔ وہ مجوب خاموشی سے سنتے رہے:

"میرے والد کے کولھے کی ہڈی ٹوٹے دو سال ہو گئے۔ وہ سامنے پڑے ہیں۔ بیٹھ بھی نہیں سکتے۔ چارپائی کاٹ دی ہے۔ مستقل لیٹے رہنے سے ناسور ہو گئے ہیں۔ ایک تو اتنا گہرا ہے کہ پوری انگلی اندر چلی جائے گی۔ پتلی بال موتی ایک رگ اندر نظر آتی ہے۔ پیپ رستی رہتی ہے۔ زخم صاف کرتے ہوئے مجھے کئی دفعہ قے ہو چکی ہے۔ ڈالڈا کے ڈبوں میں پانی بھر کے چاروں پایوں کے نیچے رکھ دیے ہیں تاکہ دوبارہ لال چیونٹے زخموں میں نہ لگیں۔ پڑوسی کئی دن جھگڑتا ہے کہ تمہارے بڑھو دن بھر تو خراٹے لیتے ہیں اور رات بھر چیختے کراہتے ہیں۔ ناسوروں کی سڑاند کے مارے ہم کھانا نہیں کھا سکتے۔ وہ بھی ٹھیک ہی کہتا ہے۔ فقط چٹائی کی دیوار بیچ میں ہے۔ چار مہینے قبل فضلِ ایزدی سے ایک اور فرزند تولد پذیر ہوا۔ اللہ کی دین ہے۔ بن مانگے موتی ملیں مانگے سے نہ بھیک۔ اللہ نبی کی اُمت کو بڑھاتا ہے۔ چلے کے بعد ہی بیوی کو ye le e [illegible] ہو گئی۔ ہل نہیں سکتی۔ مرضی مولا۔ رکشا میں ڈال کر جناح اسپتال لے گیا۔ کہنے لگے، فوراً اسپتال میں داخل کراؤ۔ مگر یہاں کوئی بیڈ خالی نہیں ہے۔ ایک مہینے بعد پھر لے گیا۔ اب کی دفعہ کہنے لگے اب لائے ہو؟ لمبی بیماری ہے۔ ہم ایسے مریض کو ایڈمٹ نہیں کر سکتے۔ صبر کیا۔ راضی ہیں ہم اسی میں جس میں رضا ہو تری۔ فجر اور مغرب کی نماز سے پہلے دونوں مریضوں کا گو موت کرتا ہوں۔ نماز کے بعد خود روٹی ڈالتا ہوں تو بچوں کے پیٹ میں کچھ جاتا ہے۔ ایک دفعہ نورجہاں نے ماں کے لیے بکری کا دودھ گرم کیا تو کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں۔"

بشارت اب کہیں اور پہنچ چکے تھے۔ اب نہ انھیں بدبو آ رہی تھی نہ تسلی ہو رہی تھی۔ سناٹے میں آ گئے تھے۔

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے فسانۂ ہجر ؛ سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا

مولانا نے کہا دائی کا علاج ہے۔ عرق مکو، رومی مصطگی، مغز کنجشک اور افیم کا لیپ بتایا ہے۔ بڑی ہمدرد عورت ہے۔ فجر اور مغرب کی نماز کے بعد مسجد سے پانی دم کروا کے لاتا ہوں۔ سو ڈیڑھ سو نمازیوں کے انفاس متبرکہ بڑے بڑے رئیسوں کو نصیب نہیں ہوتے۔ مگر شاید مولا کو شفا منظور نہیں۔ مرضیِ مولا از ہمہ اولیٰ۔

مشیت ایزدی اور مرضی مولا کے جتنے حوالے اس آدھ گھنٹے میں بشارت نے سنے اتنے پچھلے دس برس میں بھی نہیں سنے ہوں گے۔ مولانا کی باتوں سے انھیں ایسا لگا جیسے اس بے نوا گھر میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ خدا کی عین منشا کے مطابق ہو رہا ہے۔

انھیں اس کھنڈر کے دوسری طرف بھی اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا۔ ایسی ناامیدی، ایسی بے بسی! ایسے اندھیرے اور اندھیر کی تصویر کھینچنے کے لیے تو دانتے کا قلم چاہیے۔

[illegible] مولانا کو جیسے کوئی بات اچانک یاد آ گئی اور وہ معذرت کر کے کچھ دیر کے لیے اندر چلے

گئے۔ ادھر بشارت اپنے خیالات میں کھو گئے۔ اس ایک آر پار جھگی میں جس میں نہ کمرے ہیں نہ پردے، نہ دیواریں نہ دروازے، جس میں آواز نہیں اور سوچ تک ننگی ہے، جہاں لوگ شاید ایک دوسرے کا خواب بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں ایک کونے میں بوڑھا باپ پڑا دم توڑ رہا ہے۔ دوسرے کونے میں زچگی ہو رہی ہے اور درمیان میں بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں۔ بھائی میرے! جہاں اتنی رشوت لی تھی وہاں تھوڑی سی اور لے کر بیوی کو اسپتال میں داخل کرا دیتے تو کیا حرج تھا۔ جان پر بنی ہو تو شراب تک حرام نہیں رہتی۔ لیکن پھر ہانڈی چولھا، جھاڑو بہارو کون کرتا؟ اس ٹبر کا پیٹ کیسے بھرتا؟ مولانا نے بتایا کہ زچگی کے دوسرے ہی دن بیوی نے بچوں کے لیے روٹی پکائی اور کپڑے دھوئے تھے۔ بشارت سوچنے لگے کہ ان جفاکش تاتاری عورتوں کے قصیدوں سے تو تاریخ بھری پڑی ہے جو عرب شاہ کے بیان کے مطابق تیمور کی فوج کے شانہ بشانہ نیزوں اور تلواروں سے لڑتی تھیں۔ اگر کوچ کی حالت میں کسی عورت کے دردِ زہ شروع ہو جاتا تو وہ دوسرے گھڑ سواروں کے لیے راستہ چھوڑ کر ایک طرف کو کھڑی ہو جاتی۔ گھوڑے سے اتر کر بچہ جنتی۔ پھر اسے کپڑے میں لپیٹ کر اپنے گلے میں حمائل کرتی اور دوبارہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر لشکر سے جا ملتی۔ مگر جھگیوں میں چپ چاپ جان سے گزر جانے والی ان بے نام بی بیوں کا نوحہ کون لکھے گا؟ بشارت کا دم گھٹنے لگا۔ اب تک مولانا نے کل ملا کر یہی سو ڈیڑھ سو روپے وصول کیے ہوں گے۔ وہ ناحق یہاں آئے۔ انھوں نے موضوع بدلا اور دم کے پانی کی تاثیر کے بارے میں سوچنے لگے کہ ابھی تو یہ بے چاری ایک بیماری میں مبتلا ہے۔ سوا دمیوں کا جھوٹا ہوا پانی پی کر سونتیس بیماریوں میں مبتلا ہو جائے گی۔

کچھ دیر بعد مولانا نے اندر پردہ کرا لیا۔ یعنی جب نور جہاں نے اپنی بیمار ماں کو سر سے پیر تک چیکٹ لحاف اڑھا کر لٹا دیا تو مولانا نے بشارت کو جھگی میں چلنے کو کہا۔ دونوں ایک چارپائی پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئے۔ ادوان پر ایک لقشین سینی میں تام چینی کی نیلی چینک اور دو کپ رکھے تھے۔ کپ کے کناروں پر مکھیوں کی کلبلاتی جھالر۔ مولانا نے کپ میں تھوڑی سی چائے ڈالی اور انگلی سے اچھی طرح رگڑ رگڑ کر دھویا۔ پھر اس میں چائے بنا کر بشارت کو پیش کی۔ اگر وہ اس انگلی سے نہ دھوتے جو کچھ دیر پہلے کیچڑ میں سنی ہوئی تھی تو شاید اتنی ابکائی نہ آتی۔ مولانا چائے دینے کے لیے جھکے تو ان کی داڑھی سے گڑ کی بو آ رہی تھی۔

مولانا کا بیان جاری تھا۔ بشارت میں اب اتنا حوصلہ باقی نہیں رہا تھا کہ نظر اٹھا کر ان کی صورت دیکھیں۔ مجھے محکمہ انسداد بے رحمی حیوانات ساٹھ روپے تنخواہ دیتا ہے۔ ایک بیٹا سات سال کا ہے۔ ذہن، ڈیل ڈول اور شکل صورت میں سب سے اچھا۔ چار پانچ مہینے ہوئے، اسے تین دن بڑا تیز بخار رہا۔ چوتھے دن بائیں ٹانگ رہ گئی۔ ڈاکٹر کو دکھایا۔ بولا پولیو ہے۔ انجکشن لکھ دیے۔ خدا کا شکر کس زبان سے ادا کروں کہ میرا بچہ صرف ایک ہی ٹانگ سے معذور ہوا۔ پڑوس میں یہ چار جھگی چھوڑ کر ایک بچی کی دونوں ٹانگیں رہ گئیں۔ وبا پھیلی ہوئی ہے۔ جو رب چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ بن باپ کی بچی ہے۔ ڈاکٹر کی فیس کہاں سے لائے۔ میں نے اپنے بیٹے کے تین انجکشن اس بچی کو لگوا دیے۔ کیا بتاؤں اس بیوہ بی بی نے کیسی دعائیں دی ہیں۔ پانچوں وقت اس بچی کے لیے بھی دعا کرتا ہوں۔ ہر جمعہ کو جنگلی کبوتر کے خون اور لونگ اور بادام کے تیل سے بیٹے اور اس بچی کی ٹانگوں کی مالش کرتا ہوں۔ ویسے اس ڈاکٹر کا علاج بھی جاری ہے۔ آپ کے کوچوان سے جتنی بار پیسے لیے اسی علاج معالجے کے واسطے لیے۔

بشارت کو ایسا محسوس ہوا جیسے دماغ سن ہو گیا ہو۔ بیماری، بیماری، بیماری! یہاں لوگ کیوں گھاس پھوس

پیدا کرنے اور بیمار پڑنے کے علاوہ کچھ اور بھی کرتے ہیں یا نہیں؟ اس آدھ گھنٹے میں ان کے منہ سے مشکل دس بارہ جملے نکلے ہوں گے۔ مولانا ہی بولتے رہے۔ بشارت کی زبان پر ایک سوال آ آ کر رہ جاتا تھا۔ کیا سب جھگیوں میں یہی حال ہے؟ کیا ہر گھر میں لوگ اسی طرح رینگ رینگ کر جیتے ہیں؟

مولانا جاری تھے "اسے قرضِ حسنہ سمجھ کر دیجیے۔ آپ کے کوچوان نے دھمکی دی تھی کہ ہمارا صاب کہتا ہے ڈھیل کو لول دیتا کہ ایسا ذلیل کروں گا، ایسا ملیامیٹ کروں گا کہ یاد کرے گا۔ یہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ برستا بادل ہمارا اوڑھنا اور کیچڑ ہمارا بچھونا ہے۔ اس کے آگے اب اور کیا ہوگا؟ مولا سے دعا کی تھی، اکلِ حلال اور صدق مقال عطا ہو۔ عزت کی روٹی ملے۔ گنہ گار ہوں۔ دعا قبول نہ ہوئی۔ اس پر سب کچھ روشن ہے۔ آج صبح ناشتے میں ایک روٹی کھائی تھی۔ اس کے بعد ایک کھیل کا دانہ بھی منہ میں گیا ہو تو لحم الخنزیر ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے، تم اتنے بے بس اور عاجز ہو کہ تمہارے ہاتھ سے مکھی بھی ایک ریزہ اٹھا کر لے جائے تو تم اس سے چھین نہیں سکتے۔"

مولانا نے کرتا اٹھا کر اپنا پیٹ دکھایا جس میں غار پڑا ہوا تھا۔ دھونکنی سی چل رہی تھی۔ بشارت نے نظریں جھکا لیں۔

"مدت سے حضرت ذہین شاہ تاجی سے بیعت ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک پڑوسی نے جو اس بیوہ بی بی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور مجھے اس میں حارج سمجھتا ہے، پیر و مرشد کو ایک گمنام خط بھیجا کہ میں رشوت لیتا ہوں۔ اب حضرت فرماتے ہیں کہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر علیہ الرحمۃ نے رزقِ حلال کو اسلام کا چھٹا رکن قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ جب تک تم رشوت کا ایک ایک پیسہ واپس نہ کر دو گے، پلید ہاتھ سے بیعت نہ لوں گا۔ خدا مجھ پر رحم فرمائے۔ میرے حق میں دعا کیجیے۔"

مولانا ان کے سامنے دعائیہ انداز میں ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے۔ ان کے ملیشا کے کرتے پر جذب ہوتے ہوئے آنسوؤں کا ایک سیاہ زنجیرہ سا بن گیا تھا۔ بشارت نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ دو لکیلے ... ایک ہفتے بعد دیکھا کہ مولانا کرامت حسین، بشارت کی دکان پر منشی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان کی تنخواہ مقرر ہو گئی۔ تین چار دن بعد بشارت نے صرف اتنی تنبیہ کی کہ مولانا ایمانداری اچھی چیز ہے، مگر آپ گاہک کے سامنے لکڑی کی گرہ کو اس طرح نہ تکا کیجیے جیسے گھوڑے کی گردن کے زخم کو دیکھ رہے ہوں۔ رحیم بخش کوچوان کو برخاست کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ مولانا کے آتے ہی وہ کہے سنے بغیر غائب ہو گیا۔

گھوڑے کے بکنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ مولانا کے لحاظ اور مروت میں "بے رحمی والوں" نے ستانا چھوڑ دیا۔ بشارت نے بزرگوار سے اشارتاً کہا کہ آپ کی دعا سے چالانوں کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ اب آپ ڈرائنگ روم سے اپنے کمرے میں تشریف لے جا سکتے ہیں۔ لیکن بزرگوار گھوڑے کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ کسی طرح نفل نماز اور وظیفہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ گھوڑا انھیں دیکھتے ہی بقول کوچوان کے ہنہنانے لگتا، یعنی مارے خوشی کے اپنے کان کھڑے کر کے دونوں سرے ملا دیتا۔ علی الصبح گھوڑا ڈرائنگ روم میں بالاصرار و بالالتزام بلوایا جاتا۔ جیسے ہی گھوڑا آ رہا ہے

کا غلغلہ بلند ہوتا تو جس کو دین و دل یا کچھ اور بھی عزیز ہوتا راستہ چھوڑ کر تماشا دیکھنے دُور کھڑا ہو جاتا۔ یہ منظر آرسی مصحف کی یاد دلاتا تھا۔ جب لونشہ کو زنانے میں بلوایا جاتا ہے تو بار بار اعلان کیا جاتا ہے "لڑکا آرہا ہے! لڑکا آرہا ہے!" یہ سن کر لڑکیاں بالیاں اور پردہ نشین بیبیاں نقاب اُلٹ کر طاق سے چہرے کھول کر بیٹھ جاتی ہیں۔ یہ بدگمانی بے جا نہیں معلوم ہوتی کہ بعض مرد بڑھاپے میں شادی فقط "لڑکا آرہا ہے" سننے کے لالچ میں کرتے ہیں ورنہ جہاں تک محض نکاح یا وظیفۂ زوجیت کا تعلق ہے تو

اس سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو

بزرگوار اس کی پیشانی پر انگشت شہادت سے "اللہ" لکھتے۔ کچھ عرصے سے اس کے پیر پر دم کر کے ہاتھ بھی پھیرنے لگے تھے۔ جس دن وہ ایال میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے، اس سے گھر والوں کی شکایتیں نام لے لے کر کرنے لگے، اس دن سے رشتہ انسان اور جانور کا نہیں رہا۔ جب وہ اپنی نئی تکلیفوں کا حال سنا کر چپ ہو جاتے تو وہ بڑے پیار سے اپنا منہ ان کے مفلوج جسم سے رگڑتا اور چہرہ جھکا لیتا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ بابا! آپ تو مجھ سے بھی زیادہ دُکھی نکلے!

غرض کہ بزرگوار اب اسے گھوڑا سمجھ کر بات نہیں کرتے تھے۔ ادھر گھوڑا بھی ان سے اس قدر مانوس ہو گیا اور ایسی یگانگت برتنے لگا جیسے وہ انسان نہ ہوں۔ وہ اب اسے کبھی گھوڑا نہیں کہتے تھے۔ بلبن یا بیٹا کہہ کر پکارتے۔ وہ آتا تو دونوں کی ملاقات دیدنی و شنیدنی ہوتی۔

جیسے مجذوب کے گھر دوسرا مجذوب آئے

بزرگوار ایک دن کہنے لگے کہ گھوڑا دراصل مزمن وجع المفاصل میں مبتلا ہے (انہی کی طرح اب گھوڑے کو بھی ہر مرض عربی میں ہوتا تھا) پھر صراحتہً فرمایا کہ ٹانگ کے جوڑ جکڑ گئے ہیں۔ چنانچہ اس کے جوڑ کھولنے کے لیے ڈرائنگ روم میں انگیٹھی جلوا کر اپنی نگرانی میں تین سیر کھوئے اور اصلی گھی میں گھیکوار کا حلوہ بنوا کر چالیس دن تک خود کھایا، جس سے ان کی اپنی زبان اور بھوک کھل گئی۔ اور کچھ دن سے وہ یہ بھی کہنے لگے تھے کہ گھوڑے میں جن سما گیا ہے۔ اسے اتارنے کے لیے جمعرات کی جمعرات مرچوں کی دھونی دیتے اور آدھ سیر دانے دار قلاقند پر نیاز دے کر مستحقین میں تقسیم کرتے۔ مطلب یہ کہ آدھا خود کھاتے، آدھا اپنے دوست چودھری کرم الٰہی کے ہاں بھجواتے۔ قلاقند کھاتے جاتے اور فرماتے جاتے کہ بعض جنوں کی نیت کسی طرح نہیں بھرتی۔ سائیس کو چوان رحیم بخش بھی کہتا تھا کہ یہ گھوڑا نہیں، جن ہے۔ جن پلید آدمیوں کو دکھلائی نہیں دیتے۔ اسی لیے روایت ہے کہ ایک دن میں بلبن کو صبح ڈرائینگ روم میں نہ لے جا سکا تو شام کو مغرب کے بعد رسّی تڑا کر خود ہی دم کروا کے واپس آگیا۔ میں دانا چارہ لے کر گیا تو جناب والا! ادھر کچھ اور ہی سماں تھا۔ دیکھا کہ اس کے سُم کا نور کے ہو گئے ہیں اور ان میں سے ایسی چکاچوند شعاعیں نکل رہی ہیں کہ آپ ادھر نگاہ بھر کے دیکھ نہیں سکتے۔ نتھنوں سے لوبان کا دھواں نکل رہا ہے۔ اس پر عبداللہ گزک والے نے رحیم بخش کے سر کی قسم کھا کر کہا کہ جس وقت کا یہ واقعہ ہے، عین اسی وقت میں نے گھوڑے کو کلفٹن میں حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ کی درگاہ کے سامنے کھڑا دیکھا۔ اس پر ایک نورانی داڑھی والے سبز پوش بزرگ سوار تھے۔

بزرگوار نے گھوڑے کی کرامات کو اپنی کرامات سمجھا۔ کرید کرید کر کئی بار سبز پوش بزرگ کا حلیہ پوچھا

اور ہر بار جھنجھلاہٹ کا اظہار کیا کہ بزرگ کا حلیہ ان سے نہیں ملتا تھا۔ اب وہ بلبن بیٹے کو مغرب کے بعد بھی اپنے پاس بلوانے لگے۔ دونوں عشا تک سر جوڑے ایسی باتیں کرتے کہ

لوگ سن پائیں تو دونوں ہی کو دیوانہ کہیں

اس واقعے کے بعد کوچوان گھوڑے کو بلبن صاحب اور شاہ جی کہنے لگا۔ بزرگوار اکثر فرماتے کہ یہ گھوڑا اہم ہے۔ بشارت کے ہاں لڑکے کی ولادت کو وہ گھوڑے کی آمد سے منسوب کرتے تھے۔ محلے کی چند بانجھ عورتیں شاہ جی کے درشن کو آئیں۔

"**وقوعہ ہوگیا**": ہم یہ بتانا بھول ہی گئے کہ رحیم بخش کے جانے کے بعد انھوں نے ایک نیا کوچوان رکھا: مرزا وحیدالزماں بیگ۔ مگر شرائط ملازمت کے مطابق بزرگوار اسے بھی الہ دین ہی کہہ کر پکارتے تھے۔ بات چیت اور شکل صورت سے مسکین لگتا تھا۔ اس نے اپنا حلیہ ایسا بنا رکھا تھا کہ اس کے ساتھ خواہ مخواہ بھلائی کرنے جی چاہتا۔ منگول نقوش، سانولا رنگ، گٹھا ہوا بدن، چھوٹے چھوٹے کان، کشادہ پیشانی۔ کاٹھی ایسی گانٹھی کہ عمر کچھ بھی ہوسکتی تھی۔ صدری کی اندرونی جیب میں پستول کے بجائے ایک گھسی ہوئی نعل کا شیر پنجہ تیز کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ بندر روڈ کے عقب میں ٹرام ڈپو کے پاس جو تھیٹریکل کمپنی تھی، اس کے کھیل "رستم و سہراب" میں وہ ڈیڑھ مہینے تک رستم کا گھوڑا "رخش" بنا تھا۔ اسٹیج پر پوری طاقت سے ہنہناتا تو تھیٹر کے باہر کھڑے ہوئے تانگوں کی گھوڑیاں اندر آنے کے لیے لگام تڑانے لگتیں۔ اس کی ایکٹنگ سے خوش ہو کر ایک تماشائی نے یہ نعل اسٹیج پر پھینکی تھی۔ چھوٹے سے جثے پر بڑی پاٹ دار آواز پائی تھی۔ روزمرہ گفتگو کے دوران اچانک تھیٹر کی یاد آجائے تو گھوڑے کو اسپ، گویتے کو آتش گر اور خود کو روسیاہ کہنے لگتا۔ آغا حشر کے دھواں دار ڈراموں کے گرجتے مکالمے زبانی یاد تھے، جنھیں گھوڑے کے ساتھ بولتا رہتا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ایسے مکالموں کے صحیح مخاطب بھی وہ ہو سکتے ہیں۔ آغا حشر کے مکالمے حجلۂ عروسی میں بھی خود اور زرہ بکتر پہنے، برہنہ تلوار لہراتے داخل ہوتے ہیں، جب میدان جنگ میں ان کا ہر قدم نقارے پر پڑتا ہے۔ الفاظ کے دھنی ہمیشہ قبضے پر گھنگرو باندھ کر تلوار چلاتے ہیں۔ اور اگر بہ تقاضائے بشریت یا پبلک کے پرزور اصرار پر آگیا عین لڑائی میں آگر وقتِ وصال، تو محبوبہ سے بھی اس مقفّیٰ شمشیر برہنہ زبان میں گفتگو فرماتے ہیں جس میں جانی دشمنوں کا قافیہ تنگ کرتے ہیں۔ ایسے نازک مقامات پر جہاں صبر یا شائستگی کا جامہ اترنے لگے، وہ قافیے کا دامن دانتوں سے پکڑے رہتے ہیں۔ آغا حشر کے ہیرو کی جان اور آن الفاظ کے طوطوں میں بند ہوتی ہے اور طوطا جتنا چھوٹا ہو، اس سے اتنی ہی بڑی توپ چلواتے ہیں۔ جس زمانے کا ذکر ہے تانگے والے، ٹھیلوں کے مزدور اور خوانچہ فروش تک آپس میں انہی مکالموں کے ٹکڑے بولتے پھرتے تھے۔

مرزا وحیدالزماں بیگ جس کے نام کے آگے یا پیچھے کوچوان لکھتے ہوئے کلیجہ خون ہوتا ہے، اپنا ہر جملہ "معاف!" سے شروع کرتا تھا۔ ملازمت کے انٹرویو کے دوران اس نے دعویٰ کیا کہ میں موٹر ڈرائیونگ بھی بہت اچھی جانتا ہوں۔ بشارت نے جل کر حقارت سے کہا، "تو پھر تم تانگہ کیوں چلانا چاہتے ہو؟" دعا کے انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہنے لگا، "پاک پروردگار آپ کو کار دے گا تو کار بھی چلا لیں گے۔"

بشارت نے اسے یہ سوچ کر ملازم رکھا تھا کہ چلو مسکین آدمی ہے۔ قابو میں رہے گا۔ مرزا عبدالودود بیگ نے ٹیپ دیا تھا کہ ذہانت پر ریجھ کر کبھی کسی کو ملازم نہیں رکھنا چاہیے۔ ملازم جتنا غبی ہوگا اتنا ہی [illegible]

اور خدمتی ہوگا۔ لیکن اس نے کچھ دن تو بڑی تابعداری دکھائی، پھر یہ حال ہوگیا کہ اسکول سے کبھی ایک گھنٹے لیٹ آرہا ہے، کبھی دن میں تین تین گھنٹے غائب۔ ایک دفعہ اسے ایک مزدوری الوائنس لے کر پاکستان ٹوبیکو کمپنی بھیجا۔ چار گھنٹے بعد لوٹا۔ بچے اسکول کے پھاٹک پر دھوپ کے پیاسے کھڑے رہے۔ بشارت نے ڈانٹا۔ اپنی پٹی کی طرف جسے راج اوزار کی پٹی بتاتا اور تانگے میں ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا، اشارہ کرکے کہنے لگا، قصور معاف، وقوعہ یہ ہوگیا ہو چل کارپوریشن کی بغل والی سڑک پر گھوڑا اسکندری (ٹھوکر) کھاکے گر پڑا۔ ایک نعل ٹوٹ گیا تھا۔ نعل بھی جھانجھن کی طرح بجنے لگی۔ انھیں ٹھیک کر رہا تھا۔ قصور معاف، نعل کی ایک بھی میخ ڈھیلی ہو تو ایک میل دور سے ٹاپ سن کے بتا سکتا ہوں کہ کون سا سُم ہے۔ بشارت نے حیرت سے پوچھا، تم خود نعل باندھ رہے تھے؟ اور نہیں تو۔ کہاوت ہے، کھیتی، پاتی، بیٹی اور گھوڑے کا تنگ۔ اپنے ہاتھ سنوار لیجے چاہے لاکھوں ہوں* گھوڑے کی چاکری تو خود ہی کرنی پڑتی ہے۔

وہ ہر دفعہ نئی داستان اور نیا عذر تراشتا تھا۔ جھوٹے لپاٹی آدمی کی مصیبت یہ ہے کہ وہ سچ بھی بولے لوگ جھوٹ سمجھتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ اس کی بات سچ نکلی۔ تاہم اس کی بات پر دل نہیں ٹھکتا تھا۔ ایک دن ت دیر سے آیا۔ بشارت نے آڑے ہاتھوں لیا تو کہنے لگا "جنابِ عالی" میری بپتا تو سنیے۔ میں ریس کلب کے طبل کے سامنے سے اچھا بھلا گزر رہا تھا کہ گھوڑا ایک دم اڑ گیا۔ چابک مارے تو بالکل الف ہوگیا۔ راہ گیر تماشا دیکھنے کھڑے ہوگئے۔ اتنے میں اندر سے ایک بڈھا سلوتری نکل کے آیا۔ گھوڑے کو پہچان کے کہنے لگا "ارے ے! تو اس شہزادے کو کائے کو مار رہا ہے۔ اس نے اچھے دن دیکھے ہیں۔ قسمت کی بدنصیبی کو صیّا دکھائے۔ دراصل یہ دُرِ شہوار (گھوڑی کا نام) کی لو لیتا یہاں آن کے مچلا ہے۔ جس ریس میں اس کی ٹانگ میں موچ آئی ہے دُرِ شہوار بھی اس کے ساتھ دوڑی تھی۔ رد الوار پہلے پہر اول نمبر پر آئی ہے۔ اخباروں میں فوٹو چھپے تھے۔ بھاگوان نے مالک کو لکھ پتی کردیا"، پھر اس نے اس کے پرانے سائیس کو بلایا۔ ہم تینوں اسے تانگے سے کھول کے اندر لے جانے لگے۔ اسے سارے رستے معلوم تھے۔ سیدھا ہمیں اپنے تھان پہ لے گیا۔ وہاں ایک بے ڈول سالا بھجنگ گھوڑا کھڑا پشتک (دولتی) مار رہا تھا۔ ذرا دور پہ دوسری طرف دُرِ شہوار کھڑی تھی۔ وہ اسے پہچان کے بے کل ہوگئی۔ یہاں تو یہ اتنا مچل رہا تھا اور کہاں یہ حال کہ بالکل چپکا، بے سدھ ہوگیا۔ گردن کے زخم کی مکھیاں تک نہیں اڑائیں۔ صاحب جی، اس کا گھاؤ بہت بڑھ گیا ہے۔ سائیس نے اسے بہت پیار کیا۔ کہنے لگا "بیٹا! اس سے تو بہتر تھا کہ تجھے اسی وقت انجکشن دے کے سلا دیتے۔ یہ دن تو نہ دیکھنے پڑتے۔ پر تیرے مالک کو ترس آگیا۔ پھر اس نے اس کے سامنے ریس کلب کا راتب رکھا۔ صاحب، ایسا چبینا تو انسان کو بھی نصیب نہیں۔ پر قسم لے لو جو اس نے چکھا ہو۔ بس سر جھکائے کھڑا رہا۔ سائیس نے کہا، اسے تو بخار ہے۔ اس نے اس کا نقیبہ ساز کھول دیا اور لپٹ کے رونے لگا۔

"صاحب جی! میرا بھی جی بھر آیا۔ ہم دونوں چنے بل کر آبدیدہ ہو رہے تھے کہ اتنے میں ریس کلب کا ڈاکٹر ٹپکا۔ اس نے ہم تینوں کو نکال باہر کیا۔ کہنے لگا، ابے اس جھنکی بتیا کو یہاں کائے کو لایا ہے؟ اور گھوڑوں کو بھی مارے گا؟

---

* پاتی، دست بستہ التجا اور گھوڑے کی زین کا تسمہ یہ سب اپنے ہاتھ سے کرنے کے کام ہیں۔ ملا تو ساتھ لاکھوں سے اہل ہوں۔

نتھ کا سائز: ایک اور موقع پر دیر سے آیا تو قبل اس کے کہ بشارت ڈانٹ ڈپٹ کریں، خود ہی شروع ہوگیا "صاحب جی! قصور معاف۔ وقوعہ ہوگیا۔ میونسپل کارپوریشن کے پاس ایک مشکی گھوڑی بندھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ایسا درپے ہوا کہ دونوں نے کلفٹن پہنچ کے دم لیا۔ آگے آگے گھوڑی اس کے پیچھے گھوڑا۔ پھر کیا نام، یہ روسیاہ۔ جوتے نمبر یہ گھوڑی کا دھنی۔ صاحب جی، اپنا گھوڑا اس طرح لپکا جا رہا تھا جیسے گلے سے ملائی اتر رہی ہو۔"

یہاں اس نے چابک اپنی ٹانگوں کے بیچ میں دبایا اور دوڑ کر بتایا کس طرح گھوڑا، آپ کا غلام اور گھوڑی کا مالک، اسی ترتیب سے گھوڑے کی مطلوبہ کے تعاقب میں سرپٹ جا رہے تھے۔ "جناب والا! اس شخص نے پہلے تو مجھے کیا نام کہ نرگسی کوفتے جیسی آنکھوں سے دیکھا۔ پھر الٹا مجھی پہ گرم آیا۔ حالانکہ میرا گھوڑا بے قصور تھا۔ سارے رستے اسی کی گھوڑی مڑ مڑ کے اِن کے گھوڑے کو دیکھتی رہی کہ پیچھے برابر آرہا ہے کہ نہیں۔ میں نے اس کو بولا کہ ایسا ہی ہے تو اپنی بے نتھی سنکھنی* کو سنبھال کے کیوں نہیں رکھتے۔ مالک کی آبرو تو گھوڑی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ راہ چلتے گھوڑے کے ساتھ زلیخائی کرتی ہے۔ جانور کو پیغمبری آزمائش میں ڈالتی ہے۔ آخر کو مرد ذات ہے۔ برف کا پتلا تو نہیں۔ صاحب جی! میں نے کیا نام کہ اس دیوث کو بولا کہ جا جا! تیری جیسی گھوڑیاں بہت دیکھی ہیں کراچی ٹھیٹر کمپنی میں اس جیسی ہی ایک اچھال چھکا چھوکری ہے۔ پر اس کی نائکہ ماں اسے اب بھی کنوار پنے کی نتھ پہنائے رہتی ہے۔ جیسے جیسے اس چھنال کا چال چلن خراب ہوتا جائے ہے، نتھ کا سائز بڑا ہوتا جائے ہے۔ صاحب جی! یہ سنتے ہی اس کا غصہ رفوچکر ہوگیا۔ مجھ سے ٹھیٹر کمپنی کا پتہ اور چھوکری کا نام پوچھنے لگا۔ کہاں تو گالی پہ گالی بک رہا تھا، اور اب مجھے استاد! استاد! کہتے زبان سوکھ رہی تھی۔ بولا استاد! غصہ تھوکو یہ پان کھاؤ! قسم سے! اپن کا گھوڑا تو نظریں نیچی کیے، توبڑے میں منہ ڈالے، میونسپل کارپوریشن کے پاس کھڑا جگالی کر رہا تھا۔ جناب والا! سوچنے کی بات ہے۔ اس کی گھوڑی تو دور کا بہ (بہت اونچی) تھی ڈھو کی ڈھو! جب کہ گھوڑا بہت سے بہت آپ کے قد کے برابر ہوگا۔"

بشارت کے آگ ہی تو لگ گئی "ابے قد کے بچے! تیرے گھوڑے کے ساتھ ہر وقوعہ میونسپل کارپوریشن کے پاس ہی ہوتا ہے!"

ہاتھ جوڑ کے بولا "قصور معاف! اب کی دفعہ وقوعہ گھوڑے کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ ....."

* سنکھنی: شاستروں میں عورت کی ایک قسم آئی ہے۔ اس وقت ہمارے پاس جو لغت ہے (علمی اردو لغت) وہ کہتا ہے کہ اس کا قد دراز، جسم چھریرا، مزاج چڑچڑا اور زلفیں اور خواہشِ نفسانی بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔

جی۔ایم۔احمد خواہ مخواہ
(بمبئی)

ضعیفی

انسان کی زندگی بچپن جوانی اور بڑھاپے پر مشتمل ہوتی ہے۔ بچپن لاشعوری طور پر گزر جاتا ہے۔ جوانی جذباتی ہوتی ہے، کم و بیش دیوانگی میں گزر جاتی ہے۔ لیکن بڑھاپا اتنا ظالم ہوتا ہے کہ بالآخر انسان کو مار کر ہی دم لیتا ہے اس آخری اور تکلیف دہ دور کو ہم ضعیفی جیسے لفظ کا کیپسول چڑھا کر ڈھلتی عمر، کمزور دل اور ٹھنڈے جذبات کو آسودگی بخشنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ انسان کتنا ہی بوڑھا کیوں نہ ہو اس کے دل میں دو آرزوئیں ہمیشہ جوان رہتی ہیں ایک تو یہ کہ لمبی عمر پائے۔ وہ دی گئی زندگی کو ٹھیک طرح سے گزارنے کی بجائے لمبی عمر کی خواہش میں ہر روز مرتا رہتا ہے۔ کاش وہ کچھ دن اور زندہ رہ کر مزید نیک کام کرتا، لیکن سنا ہے کہ گنہگار مرنے سے قبل اپنے گناہوں کو یاد کر کے کہتا ہے کہ وہ بہت پہلے مرجاتا تو اچھا تھا کہ اتنے سارے گناہ تو سرزد نہ ہوتے۔

مرد کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے۔ پچیس سال تک ماں باپ اس سے پوچھتے ہیں۔ تم کہاں جا رہے ہو؟ اس کے بعد تمام عمر بیوی پوچھتی رہتی ہے کہ "کہاں جا رہے ہو۔۔۔؟ اس کے بعد مزید زندہ رہ گیا تو قرض خواہ پکارتے ہیں، کہاں جا رہے ہو، ذرا آواز دو۔۔۔۔۔۔ اس معاملے میں خواتین چاہے شادی شدہ ہی کیوں نہ ہوں عمر کے آخری لمحے تک خود کو جوان اور خوب صورت ظاہر کرنے میں مصروف رہتی ہیں۔

کسی مشہور خاتون نے جو اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکی تھیں، گزری ہوئی عمر کے بارے میں کہا تھا "پیدائش کے بعد سے اٹھارہ سال کی عمر تک سمجھ بوجھ رکھنے والے والدین نے انھیں بنا سنوار کر خوب صورت دکھا۔ اٹھارہ سے پینتیس سال کی عمر تک وہ خود اپنے آپ کو بہتر صورت قبول صورت رکھنے۔۔۔ رکھنے کی کوشش میں مصروف رہیں، پینتیس سے پچپن سال کے بعد مرتے دم تک انھیں، کم سے کم بوڑھی دکھائی دینے کے لیے ایک اچھی خاصی رقم کی ضرورت درپیش رہی ہے"۔ اس طویل تجزیہ میں وہ جس اہم نکتے کو فراموش کر گئیں وہ ایک بہترین شریک زندگی کی رفاقت ہے جس کے بغیر یہ سارا تجزیہ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ بہر حال خواتین کو بچپن سے بڑھاپے تک صرف یہی فکر لاحق رہتی ہے کہ وہ خود کو دوسری ہم عمر عورتوں سے خوب صورت بنا کر پیش کریں۔ نتیجتاً وہ بڑھتی عمر کو کم دکھانے کی کوشش میں ہر سال عمر کے جتنے مہینے، دن اور گھنٹے کم کرتی ہیں اتنی ہی تعداد ان کے جسم اور وزن میں جمع ہو جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مردوں سے ان کی آمدنی اور عورتوں سے ان کی عمر نہیں پوچھنا چاہیے۔ جہاں تک مردوں کی

آمدنی کا سوال ہے وہ بیوی کو اپنی اصل آمدنی سے کم بتاتا ہے تو وہ اسے دوسرے کماؤ پوت مردوں سے چھوٹا سمجھتی ہے۔ اگر صحیح بتاتا ہے تو جھوٹا سمجھتی ہے اور اگر زیادہ بتاتا ہے تو بے دریغ خرچ کرنے پر آمادہ ہوتی ہے عورتوں سے ان کی عمر نہ پوچھنے کے مقولے پر ہم اتنی سختی سے پابند ہیں کہ آج تک اپنی بیگم سے منہ کھول کر یہ تک نہ پوچھا کہ "بیگم! آپ مجھ سے کتنے سال بڑی ہیں؟" بلکہ بڑھتی ہوئی عمر میں بھی انھیں اضطراری مائل بہ شباب دیکھ کر ان کی بلائیں لیا کرتے رہے۔

عورتیں اپنی حسب مرضی اور موقعہ و محل کی مناسبت سے اپنی عمر کو گھٹانے اور کم کرنے میں کس قدر ماہر ہوتی ہیں اس بات کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب ہم نے اپنی بیگم کی دو سہیلیوں کے درمیان ہوئی گفتگو اتفاقاً سن لی تھی۔ رشیدہ، رضیہ سے کہہ رہی تھی — میں نے طے کیا ہے کہ جب تک تیس برس کی نہ ہو جاؤں شادی نہیں کروں گی" رضیہ نے جواب دیا —

"یہ کیا بات ہوئی — میں نے تو یہ عہد کر لیا ہے کہ جب تک میری شادی نہ ہو جائے پچیس سال کی ہی رہوں گی"

اسی طرح ایک سیاح دوران سفر سیاحت افریقہ کے جنگل میں پیش آئے قصے سناتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"دوستو! بڑا نازک لمحہ تھا — مجھ کو اور میری بیوی کو آدم خور وحشیوں نے گھیر لیا تھا — جب ان کے سردار نے مجھے دیکھا تو بولا کہ وہ چالیس سال سے زیادہ عمر کے آدمی کو نہیں کھائے گا — اور شاید زندگی میں یہ پہلا اور آخری موقعہ تھا جب میری بیوی نے اپنی صحیح عمر بتائی اور اس طرح ہم دونوں آدم خوروں کی خوراک بننے سے بچ گئے۔

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شادی، ایک خاص عمر کو پہنچنے پر ہی کر لینی چاہیے۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد شادی کرنے والے ازدواجی زندگی کی حقیقی مسرتوں سے فیض یاب نہیں ہو پاتے — اس کلیے سے انگریز مستثنیٰ ہیں۔ یونائیٹڈ پریس آف انڈیا، لندن کی ایک تازہ خبر کے مطابق جب ایکیاسی (۸۱) سال کی عمر کے دولہا مسٹر آرنالڈ سے پوچھا گیا کہ "آپ کو اس کم عمری میں اکیاسی سالہ دوشیزہ مس جوائس ہیریسن کو اپنی شریک حیات کی حیثیت سے قبول کرتے ہوئے کیسا لگتا ہے —؟" انھوں نے جواب دیا "میں اپنے آپ کو چاق و چوبند محسوس کرتا ہوں — میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً وہ اس وقت نروس ہوتا — لیکن چوں کہ یہ میری تیسری شادی ہے اس لیے اب مجھے عادت سی ہو گئی ہے" یہی سوال دولہن سے پوچھا گیا تو اس اکیاسی سال کی دوشیزہ نے شرمانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا "ہمیں اپنے دو سال کے رومانس کو بہرحال کسی نہ کسی خوش گوار انجام کو پہنچانا ہی تھا" مزید برآں دولہا دولہن ایک دوسرے کے چال چلن سے اس لیے بھی مطمئن تھے کہ دونوں ہی چرچ میں وھیل چیئر یعنی پہیوں والی کرسی پر بٹھا کر لائے گئے تھے۔

بہرحال یہ ایک قصۂ معترضہ تھا اب آئیے مردوں، بالخصوص شوہروں کی چار روزہ عمر دراز کا تجزیہ کریں۔ کہتے ہیں کہ قدرت نے ہر شادی شدہ شوہر کی طبعی عمر صرف چالیس سال ہی طے کی ہے۔ جب لوگ شادی بیاہ چالیس سال کی عمر میں کرنے لگے تو قدرت نے بھی اپنے قانون میں بعد از نظر ثانی ترمیم کرتے ہوئے مزید دس سال کا اضافہ کیا لیکن حرص کے بندے نے درخواست کی کہ پچاس سال کے اس مختصر عرصے میں وہ زندگی کی نعمتوں سے نہ خود کما حقہ فیض یاب ہو گا اور نہ ہی نوع انسان کے علاوہ اپنی شریک حیات کی خاطر خواہ خدمت کر سکے گا لہٰذا بہتر ہو گا کہ مقررہ پچاس سالہ میعاد زندگی میں اضافہ کیا جائے۔ انسان کی اس درخواست پر قدرت بھی شش و پنج میں پڑ گئی اس لیے کہ وہاں بھی پرمٹ کا کوٹہ سسٹم، درازی عمر کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ لے دے کے یہی ایک صورت رہ گئی تھی کہ دوسرے

جان دار اپنی حیاتِ مقررہ میں سے کچھ سال مستعار دیں۔ اس تجویز پر سارے انسانوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا کسی نے بھی آگے بڑھ کر اپنی عمر کا ایک لمحہ بھی رضا کارانہ طور پر اپنے ساتھی انسان کو مستعار دینا پسند نہیں کیا۔ سب ایک دوسرے کی صورت ہی دیکھتے رہ گئے۔

جب یہ تجویز اشرف المخلوقات کے لیے قابلِ قبول ٹھہری تو ارزل المخلوقات یعنی جانوروں نے اس پر لبیک کہا۔ سب سے پہلے ایک گدھے نے اپنی عمر کے دس سال انسان کو یہ کہہ کر بھینٹ کیے کہ میں چاہے تیس سال تک زندہ رہوں لیکن رہوں گا گدھے کا گدھا۔ ساری عمر دھوبی کے گھر اور گھاٹ کے درمیان بوجھ ڈھو ڈھو کر گمنام مر جاؤں گا۔ اس لیے اگر میری اس فالتو زندگی کے دس سال انسان استعمال کرے تو میری زندگی میں کوئی نمایاں یا قابلِ ذکر فرق نہیں پڑے گا لیکن اضافی زندگی سے انسان شاید مجھ جیسے محنتی مگر سیدھے سادے بھائی بندوں کی کمزوریوں کو سمجھنے کی کوشش کرے اور انھیں گدھا کہنے سے باز آئے۔

اس طرح ساٹھا پاٹھا کہلائے جانے کے خیال ہی سے انسان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور نتیجتاً اس نے قدرت سے اپنی عمر میں مزید اضافہ کرنے کی اپیل کی۔ انسان کی اس حریص اور لالچ زدہ ذہنیت پر پاس ہی کھڑے خارش زدہ کتے کو ترس آگیا۔ اس نے کہا — "میں لاکھ زندگی بھر وفادار رہوں لیکن دنیا میں بہ استثناء چند اعلیٰ نسل کے کتوں کے اس حد تک حقارت کی نظر سے دیکھا جاؤں گا کہ انسان اپنے ہی طرح کے کسی انسان کو ذلیل و خوار کرنا چاہے گا تو اسے میرے نام سے پکارے گا۔ یہی نہیں میری ٹیڑھی دم پر نہ صرف فقرے کسے جائیں گے بلکہ ایک محاورہ بھی ایجاد ہوگا کہ میں بھی اپنے ستم رسیدہ دوست گدھے کی تقلید کروں اور اپنی عمر کے دس سال انسان کی نذر کروں کہ وہ بھی کیا یاد کرے گا۔"

لیکن حضرتِ انسان کی ستر سال سے بھی سیری نہیں ہوئی۔ ادھر قدرت بھی عالمِ حیرت و استعجاب میں انسان کی بڑھتی عمر کو اس کے نتائج کے پس منظر میں دیکھ دیکھ کر اپنے کیے پر نظرِ ثانی کرنا چاہتی تھی کہ درخت کی ٹہنی پر بیٹھے ایک ضعیف العمر اور جہاں دیدہ اُلّو نے قدرت سے یوں خطاب کیا:

"دنیا میں میرا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہمیشہ رات کے اندھیرے میں روپوش رہ کر زندگی گزارتے تنگ آگیا ہوں۔ اگر شومیٔ قسمت سے کسی کو نظر آگیا تو مجھے منحوس سمجھ کر بہ یک جنبشِ نظر، نظر انداز کر دیا جاتا ہوں۔ اس لیے کیوں نہ اپنی زندگی کے دس سال انسان کو بطورِ تحفہ دے کر زندگی بھر کے لیے اسے ممنونِ احسان رکھوں۔"

قدرت نے جانوروں کے اس جذبۂ ایثار کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔ اور اس طرح جب حضرتِ انسان اسّی سال کی عمر اپنے کھاتے میں جمع کرا چکے تب قدرت نے بھی فوراً منظور دستخط کر کے اس موضوع کو ختمت بالخیر کی منزل کو پہنچا دیا کہ مبادا کوئی اور جانور جیسے شیر، ہاتھی اور گدھ وغیرہ انسان پر ترس کھا کر اپنی طویل عمر میں چند سال انسان کی نذر کر کے اس کی درازیٔ عمر کا باعث نہ بنیں۔ اس طرح ہر شوہر اپنی چالیس سالہ حقیقی اور طبعی زندگی گزارنے کے بعد باقی کے چالیس سال (اگر وہ تب تک بقیدِ حیات رہے) بالترتیب گدھے، کتے اور الّو کی زندگی گزارتا ہے۔

اس حقیقت کی مختصر تفصیل یوں ہے کہ ساٹھ [60] سال تک وہ اپنے خاندان اور اہل و عیال کی پرورش کے لیے

گدھے کی طرح محنت کرنے میں جٹا جاتا ہے، ستر سال کی عمر میں اس کی حالت کتے جیسی ہوتی ہے اس نے
صبح سے شام تک اپنی تند مزاج بیوی، ناخلف اولاد اور شر پسند پڑوسیوں پر بھونکتا ہی رہتا ہے۔ لیکن کو
پہروں تک نہیں ہلتی ۔ آخری دس سال وہ ساری رات فکرِ عاقبت، بیماری کی صعوبت کے خوف سے جا
ہے اور دن بھر الو کی طرح اونگھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے گھر والے اسے الو ہی کی طرح منحوس سمجھ
بیاہ اور اسی قسم کی دیگر تقاریب میں اپنے ساتھ رکھنے سے گریز کرتے ہیں۔

ان دنوں میں بھی کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار ہوں۔ اگرچہ اسی سال کی عمر کو پہنچنے کے لیے مجھے مز
برس درکار ہیں لیکن میرے نواسے اور پوتے جب مجھے نانا اور دادا کہہ کر پکارتے ہیں تو:

ایک ٹیس جگر میں اٹھتی ہے
اک درد سا دل میں ہوتا ہے

ابھی کل ہی کی بات ہے کہ گلی کی نکڑ پر میوے کی دکان کا مالک اپنے سر پر سے گلے سنترے میرے گلے منڈھتے ہو
لگا۔ باؤجی! آپ وشواس رکھیں، میں آپ کو خراب سنترے کیسے دے سکتا ہوں میں تو آپ کو اپنے پتا سمان
خیریت اسی میں نظر آتی کہ سنترے لے کر چپ چاپ چلتا بنوں تا کہ اس کی بیوی مجھے سسر جی، کہہ کر نہ

مجھے اعتراف ہے کہ میرے بال سفید ہو گئے ہیں لیکن اس کی وجہ بڑھاپے کی بجائے نزلہ بھی تو ہو سکتا
دانت اگر اپنی جگہ چھوڑنے پر تلے ہوئے ہیں تو اس کی وجہ روزمرّہ کی غذا میں پروٹین اور حیاتین کی کمی بھی
ہے۔ بصارت اور سماعت میں بظاہر معمولی سا فرق محسوس ہونے لگا ہے وہ شہر کی گندی اور بیا آلودہ فضا
لینے کی مجبوری کا نتیجہ ہے۔ رہ گئی چہرے کی جھریاں ۔۔۔ ! تو صاحب آپ یقین کریں، یہ میں نے اپنے لیے
احتیاط کے طور پر عمداً اور خود پیدا کر لی ہیں تا کہ سند رہیں اور آڑے وقت میں کام آویں۔

یہ اور بات ہے کہ پچھلے دنوں سے بدن میں رعشہ سا محسوس ہونے لگا ہے لیکن میں اپنے طور پر معمولی
کو پوشیدہ رکھنے کی اور اس کمزوری پر قابو پانے کی کوشش میں اکثر کامیاب بھی ہوا ہوں۔ اس لیے آپ مجھے
سپاہی کی طرح اکڑ کر چلتا ہوا یا اسٹیج پر تن کر کھڑا ہوا دیکھیں تو سمجھ لیں کہ میں اسی کوشش میں مبتلا ہوں۔

اس عمر میں میری دماغی صلاحیت بھی اتنی گئی گزری نہیں ہے۔ میں ہر صبح پہلے اخبار کا آخری صفحہ
اس لیے کہ انسان کی تعمیری اور ترقی کے کارنامے اور کھیل کود میں کامیابی کی خبریں اسی صفحے میں آنکھوں
ٹھنڈک ہونچاتی ہیں۔ عجیب کہ صفحۂ اوّل پہ تباہی، ہلاکت، قتل و غارت گری کی لرزہ خیز خبریں بھیانک تصو
ساتھ جلی حروف میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتی نظر آتی ہیں۔ یہی نہیں بیشتر موقعوں پر حکا
ضروری امور کی طرف مبذول کرنے کی خاطر کئی روزناموں کے ایڈیٹروں کے نام خطوط لکھتا رہا ہوں۔ وہ
ایڈیٹر حضرات ان خطوط کی طرف توجہ نہ دیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ ۔ ۔ ۔ ہاں کبھی کبھی میرے نواسے
دیتے ہیں کہ میں جو اخبار پڑھ رہا ہوں وہ گزشتہ کل کا ہے۔ اس قسم کی معمولی بھول چوک تو سبھی سے ہو جاتی۔

ان دنوں میری بیوی بھی مجھ سے خفا ہونے لگی ہے کہ میں ان کی طرف سے لاپروا ہو گیا ہوں۔ ان کی با
دھیان نہیں دیتا۔ سنی ان سنی کر دیتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ بے شک میں ان کی باتوں پہ دھیان نہیں دیتا۔

باتیں ہی ایسی ہیں واپسی میں ترکاری لیتے آئیے ـــ وہاں! بھاجی دیکھ کر خریدیئے، پرسوں کی طرح سڑی گلی اٹھا کر نہ لائیے ـــ ملازم تنخواہ بڑھانے کی مانگ کر رہا ہے۔ دھوبی کا حساب کر کے رکھ دیجیے۔ ٹیلی فون ایکسچینج جا کر شکایت درج کرائیے کہ رانگ نمبر آنے لگے ہیں۔

مجھے ایسی فالتو اور غیر ضروری باتوں کے بارے میں سوچنے، ان کا جواب دینے یا ان پر عمل کرنے کا وقت ہی کہاں ملتا ہے۔ میرا دماغ تو ان دنوں دنیا میں پائیدار امن کے لیے اپنی اسکیم میں لگی، بھارت چین کے سرحدی تنازعے بھارت اور امریکہ کے دن بدن بگڑتے ہوئے تعلقات ملک میں سوکھے اور سیلاب کی وجہ سے پیدا شدہ نازک صورت حال : شہر میں پانی کی قلت، چینی کے بڑھتے ہوئے دام کے سبب عوام میں بڑھتی ہوئی بے چینی اور ان سب سے زیادہ مشاعرے کے لیے چٹ پٹی غزل لکھنے جیسے اہم ترین سیاسی، معاشی، ثقافتی اور ادبی مسائل کو سمجھنے اور سلجھانے میں الجھا ہوا ہے۔

ان حقائق کے پیش نظر اب بھی آپ مجھے ضعیف یا مائل بہ ضعیفی سمجھتے ہیں تو آپ کی خدمت میں عرض کروں گا کہ ضعیف ہونے کے لیے کافی وقت لگتا ہے اور فی الحال میں اتنا ضعیف ہوں کہ ضعیف ہونے کے لیے میرے پاس وقت ہی نہیں ہے۔

●●

اسمٰعیل آذر

ٹیچرس ٹریننگ اکزامینیشن

وہ جو آگے جا رہے ہیں بھاگے بھاگے ایک دم
آج ٹیچر کی ٹریننگ کا جو ہوگا امتحاں
پہلے بجروں کے لیے مخصوص تھی یہ رہ گزر
حکم یہ تھا پہلے اُستادی کا گُر حاصل کرو
حکم حاکم مرگِ ٹیچر ذات، سو اب کیا کریں
امتحاں سے یُوں بھی کیوں ڈرتے بھئی، استاد ہیں
دیکھئے خوش خوش وہ اُچکاتے ہوئے شانہ چلے
اللہ، اللہ کیا کتب بینی سے رکھتے ہیں یہ شغل
کچھ کتابیں ہیں بغل میں کچھ کمر کے جوڑ پر
جتنی گنجائش تھی اک جھولے میں اتنی ڈال دیں
کچھ کتابیں اور ڈھوتے پھر کہاں اتنی جگہ
مسئلے کا حل نکالا یوں کہ تھے تھوڑے فہیم
یعنی پرزوں پر لکھے باریک املائی حروف
کرلیا محفوظ کل پرزوں کو تیز اک آن میں
چار چھ کو ٹانک ڈالا آستینوں کے تلے
کچھ فلیتے بیل کر نیفے کے اندر بھر لیے
لیجیے حل ہوگیا سارا کتابی مسئلہ
اِس طرح علم الیقیں پر دسترس ہے آپ کو

ماسٹر صاحب ہیں اک اسکول کے یہ محترم
جانبِ اکزامینیشن ہال سرپٹ ہیں رواں
آ گئے نیچے چھُری کے آج خود ان کے پدر
بعد ازاں لونڈوں کو در دریائے فن واصل کرو
یُوں کرو ایسا کریں ایسا بھرو ویسا بھریں
علم کی کھیتی کے آخر فاسفورس کھاد ہیں
لے کے اپنے ساتھ اچھا اک کتب خانہ چلے
جیسے گوبر کی زمیں پر گوبریلے کا ہو دخل
ٹھونس لیں جیبوں میں کچھ گردن ذرا سی موڑ کر
مثل چوپائے کے اپنی پیٹھ پر بھی لاد لیں
جسم انسانی کے طول و عرض میں کتنی جگہ
مائیکرو فلمنگ کرلیں جو کتابیں تھیں ضخیم
شاعروں کی طرح دریا ٹھونس ڈالا در ظروف
کچھ رکھے موزوں کے اندر چند پائجامے میں
کچھ قبا کے چور درازوں پہ چپکاتے چلے
مالش کے آٹے سے کچھ میانی کے نیچے کرلیے
اب یہاں سے پاٹ لیں گے آپ باقی مرحلہ
پاس کرنا ہی پڑے گا ممتحن کے باپ کو

کل معلم آپ بن جائیں گے جب باقاعدہ
طالبانِ علم کو پہنچے گا بے حد فائدہ ۔

★

حیدر بیابانی
(ایلچ پور)

مثالی شوہر

عنوان دیکھ کر آپ اس گمان میں ہوں گے کہ مضمون صرف شوہروں کے لیے ہی سپرد قلم کیا گیا ہے لیکن بقول شخصے "مخاطب کوئی ہے اور گفتگو کسی اور کے سلسلے میں کی جارہی ہے"۔ اس لیے بیویوں کے لیے بھی لازم و ملزوم ہے کہ وہ اسے دو عدد آنکھیں اور ایک عدد دماغ کھلا رکھ کر پڑھیں تاکہ انھیں پتہ تو چلے کہ ان کے شوہر نام دار کتنے مثالی یا آئیڈیل ہیں بہ زبان دیگر کتنے زن مرید واقع ہوئے ہیں۔

بظاہر نیچے ایک سوال نامہ درج کیا جارہا ہے لیکن یہ باطن یہ تمام شوہروں کا اعمال نامہ ثابت ہوگا اور ختم ہوتے ہوتے فال نامہ بن جائے گا۔

ذیل میں کل بارہ سوالات کا ایک سہل ترین پرچہ دیا جارہا ہے جسے آپ کو یعنی شوہر صاحب کو حل کرنا ہوگا ہر سوال کے ساتھ "الف"، "ب" اور "ج" کے تحت تین ممکنہ جوابات بھی درج ہیں۔ ان جوابات میں سے جو بھی ایک جواب آپ کے خیالات و نظریات کے عین مطابق ہو، اس پر صحیح (✓) کا نشان لگا دیجیے۔ بعد ازیں سوال نامے کے آخر میں دیئے گئے طریقے سے اپنے حاصل کردہ نمبرات کا حساب لگائیں کہ پسندیدگی کی اس عمارت میں آپ کو کون سی منزل نصیب ہوپائی ہے۔ ہاں شرط یہ ہے نشان پوری ایمان داری کے ساتھ درست جواب پر خدا کو حاضر و ناظر جان کر ہی لگائیں۔

سوال نامہ

سوال نمبر ۱۔ بیوی کی گزشتہ سال گرہ پر آپ نے اسے کیا تحفہ دیا تھا؟

جوابات: (ا) بیوی کی سال گرہ؟ مجھے پتہ ہی نہیں کہ اس کی تاریخ پیدائش کیا ہے۔

(ب) گلاب کے تازہ پھولوں کا گلدستہ اور پیار!

(ج) سال گرہ کے ایک ماہ پہلے سے ہی اس نے فرمائش کرنی شروع کردی تھی کہ اب کی بار وہ سونے کے جھمکے لے گی اور جھمکے خریدنے کے لیے مجھے قرض لینا پڑا۔

سوال نمبر ۲۔ پڑوسن کی نئی ساری دیکھ کر اگر آپ کی بیوی بھی ساڑی کی فرمائش کرے تو آپ کیا کرتے ہیں؟

جوابات: (ا) اسے ڈانٹ کر خاموش کردیتا۔

(ب) ساڑی خرید لاتا ہوں۔

(ج) پڑوسن کی نئی ساڑیاں دیکھ کر میری بیوی فرمائش نہیں کرتی بلکہ اس کے برخلاف میری بیوی کی نئی نئی ساڑیاں دیکھ کر پڑوسن اپنے میاں کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔

سوال نمبر ۳۔ جب بیوی کی سہیلیاں اس سے ملنے گھر آتی ہیں تب آپ کیا کرتے ہیں؟

جوابات: (ا) اونچی آواز میں اپنے چھوٹے موٹے کاموں کی یاددہانی کراتا رہتا ہوں۔

(ب) کمرے میں لیٹ کر آرام سے اخبار پڑھتا ہوں۔

(ج) باورچی خانے میں، چائے ناشتہ تیار کرنے میں بیوی کی مدد کرتا ہوں۔

سوال نمبر ۴۔ آپ کے والدین کہاں رہتے ہیں؟

جوابات: (ا) ہمارے پاس رہتے ہیں اور کہاں رہیں گے؟

(ب) کبھی ہمارے پاس رہتے ہیں اور کبھی ہمارے آبائی گاؤں میں رہتے ہیں!

(ج) گاؤں میں رہتے ہیں سال میں ایک دو بار میں مل آتا ہوں۔

سوال نمبر ۵۔ کیا آپ کے سسرالی رشتے دار آپ کے گھر آتے جاتے ہیں؟

جوابات: (ا) لڑکی کے گھر اس کے ماں باپ یا رشتے داروں کے آنے کی کیا ضرورت ہے۔ پرانے زمانے میں تو لڑکی کے گھر کا پانی پینا بھی برا سمجھا جاتا تھا۔

(ب) سالے سالیاں اکثر آتے جاتے ہیں، ساس، سسر بھی کبھی کبھار آتے ہیں۔

(ج) خوش دامن صاحبہ اپنے بہو بیٹے سے سخت ناراض ہیں اس لیے مستقل ہمارے ساتھ ہی رہتی ہیں۔

سوال نمبر ۶۔ اگر آپ کی بیوی نوکری کرے تو کیا آپ اسے پسند کریں گے؟

جوابات: (ا) قطعی نہیں!

(ب) اگر مالی حالات مجبور کریں اور بیوی تیار رہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں!

(ج) میری پسند یا ناپسند کو کون پوچھتا ہے وہ تو نوکری کر رہی ہے۔

سوال نمبر ۷۔ بیوی کے سر میں اچانک درد ہو جائے تو آپ کیا کریں گے؟

جوابات: (ا) اسے کاہل اور کام چور کہہ کر طنز کرتا ہوں۔

(ب) اسے دردِ سر کی دوا دے کر آرام کا مشورہ دیتا ہوں اور اپنا کام خود کر لیتا ہوں۔

(ج) ڈاکٹر کو دکھاتا ہوں، دوا اپنے ہاتھوں سے پلاتا ہوں اور آرام سے لٹا کر اس کا سر دباتا ہوں۔

سوال نمبر ۸۔ کیا آپ اپنی بیوی کے ساتھ باہر تفریح کے لیے جاتے ہیں؟

جوابات: (ا) بیوی چراغِ خانہ ہوتی ہے شمعِ محفل نہیں! باہر کیوں لے جاؤں؟

(ب) مہینے میں دو تین بار لے جاتا ہوں

(ج) دوسرے یا تیسرے دن

سوال نمبر ۹۔ کیا آپ کا اپنی بیوی سے جھگڑا ہوتا ہے۔ اگر ہوتا ہے تو مہینے میں اوسطاً کتنی بار ہوتا ہے۔

جوابات: (ا) اگر وہ ذرہ برابر بھی چوں چرا کرتی ہے تو ڈانٹ دیتا ہوں یا پٹائی بھی کر دیتا ہوں تاکہ سیدھی ہو جائے۔
(ب) ہفتے، عشرے میں معمولی کھٹ پٹ ہو جاتی ہے لیکن جلد ہی صلح صفائی بھی ہو جاتی ہے۔
(ج) میری کیا مجال جو اس سے جھگڑا مول لوں جیسا وہ چاہتی ہے گھر میں ویسا ہی ہوتا ہے اس لیے کیسا جھگڑا اور کیسی لڑائی؟

سوال نمبر ۱۰۔ آپ کو بیٹا پسند ہے بیٹی؟

جوابات: (ا) بیٹا! بیٹا گھر کا چراغ ہوتا ہے۔
(ب) بیٹا ہو یا بیٹی۔ آج کے زمانے میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ مجھے دونوں پسند ہیں۔
(ج) فی الحال بیوی بیٹا چاہتی ہے نہ بیٹی، مستقبل میں اگر اس کے خیالات بدلیں تو دیکھا جائے گا۔

سوال نمبر ۱۱۔ آپ کے گھر کون کون سے رسائل آتے ہیں؟

جوابات: (ا) شاعر، شب خون، جواز
(ب) شمع، بیسویں صدی، کہکشاں
(ج) بانو، حجاب، خاتونِ مشرق

سوال نمبر ۱۲۔ آپ کی نظروں میں آپ کی بیوی کا کیا مقام ہے؟

جوابات: (ا) نوکرانی۔
(ب) ساتھی۔
(ج) ملکہ

نوٹ: اگر آپ نے تمام سوالات کے جوابات دے دیئے ہیں تو حاصل کردہ نمبرات کا حساب لگائیں۔ ہر "الف" جواب پہ صحیح کا نشان لگا ہو تو آپ نے صفر نمبر پایا ہے "ب" کے لیے ۵ نمبر ہیں اور "ج" ۱۰ نمبر ملنا طے ہے، اب تمام نمبروں کو جمع کرلیں اور پھر دیکھیں کہ آپ کتنے پانی میں ہیں۔

نتیجہ: اگر آپ کے حاصل کردہ نمبر ۱۰۰ سے ۱۲۰ کے درمیان ہیں!.... مبارک ہو! آپ مثالی ہی نہیں بہت زیادہ مثالی شوہر ہیں بڑی خوش نصیب ہے وہ عورت جس نے آپ کو شوہر کی صورت میں پایا اگر آپ کے دوست احباب یا والدین آپ کو جورو کا غلام کہتے ہیں تو کہنے دیجیے اور قطعی اثر نہ لیجیے۔ آپ کی ازدواجی زندگی انتہائی خوش حال ہوگی اور آپ کی بیوی پر لاکھوں عورتیں رشک کریں گے۔

★ اگر آپ کے حاصل شدہ نمبرات ۷۵ سے ۱۰۰ کے درمیان ہیں!.... شاباش! آپ اس امتحان میں فرسٹ کلاس پاس ہوئے ہیں۔ آپ ایک آئیڈیل شوہر ہیں۔ بہرحال میں آپ نے اپنی نصف بہتر کو خوش رکھا ہے اور اس سے حب کرتے ہیں اس وجہ سے آپ کا گھر مسرت کا گہوارہ ہے۔

★ اگر آپ نے ۳۵ سے ۷۰ کے درمیان مارکس لیے ہیں.... چلو ٹھیک ہے! آپ مکمل مثالی شوہر کا نمونہ نہیں ہیں۔ ہاں کام چلاؤ قسم کا گوارا شوہر ضرور ہیں۔ آپ کی بیوی بہت سمجھدار ہے جو آپ سے نباہ کر رہی ہے۔

لیکن ناامید ہونے کی ضرورت نہیں ہے آپ تھوڑی سی کوشش کریں تو ضرور کامیاب ہو سکتے ہیں۔ "جواب" ج "کی طرح اپنی زندگی گزارنے کی کوشش کیجیے انشاء اللہ ضرور کامیابی نصیب ہوگی۔

٭ اگر آپ نے ۵ سے ۳۵ کے درمیان نمبر حاصل کیے ہیں! برا نہ مانیے، آپ ایک نکمّے اور ناکام شوہر ہیں آپ کی بیوی کبھی بھی وقت بغاوت کا پرچم بلند کر سکتی ہے۔ وہ آپ سے خوں ریز جنگ چھیڑ دے گی یا پھر طلاق لے لے گی۔

اگر آپ کے نمبروں کی کل جمع صفر سے ۰ا کے درمیان ہے !۔ ۔ ۔ ۔ پہلی بات تو یہ کہ آپ اوّل نمبر کے جھوٹے ہیں آپ نے اصل جوابات پر نشانی لگاتے وقت انتہائی بے ایمانی کی ہے۔ ہندوستان میں کوئی شوہر ایسا ہو ہی نہیں سکتا جسے اس امتحان میں ۰ا سے کم نمبر ملیں۔ اگر یہ حاصل شدہ نمبرات درست ہیں تو آج کل آپ کنوارے ہیں یا پھر طلاق شدہ! شوہر تو قطعی نہیں ہیں۔

(مضمون کا مرکزی خیال ہندی کے ایک مضمون سے لیا گیا)

●●

ڈاکٹر سید حامد حسین
بھوپال

اردو میں مزاح کی موجودہ صورتِ حال

اردو ادب کے اکثر تاریخی جائزوں میں اردو کے جس آخری باضابطہ مزاح نگار کا نام دیکھنے کو ملتا ہے وہ رشید احمد صدیقی ہیں۔ ترقی پسند ادب پر بحث کرتے ہوئے بعض اوقات مروتاً کنھیا لال کپور اور فکر تونسوی کا ذکر مل جاتا ہے۔ لیکن آزادی کے بعد اردو ادب کی جب بھی بات کی جاتی ہے اس میں کسی مخصوص مزاح نگار کا ذکر تو دور کی بات، مزاحیہ نگارشات کو بحیثیتِ مجموعی بھی زیرِ غور لانا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔

اس کے دو اسباب ہیں۔ ایک خارجی جن کا تعلق اس زمانے کے مخصوص ادبی رویّے سے ہے اور دوسرے داخلی جو خود مزاحیہ ادب کی تخلیق سے متعلق ہے۔ گذشتہ ایک صدی کے دوران ہمارا ادب کسی نہ کسی کھونٹے سے بندھا رہا ہے۔ کبھی سماجی یا ادبی اصلاح کا مقصد ادیبوں کے ذہن پر حاوی رہا ہے تو کبھی قومی اور وطنی تقاضے ان کی توجہ کا خصوصی مرکز بنے رہے ہیں۔ اور پھر گذشتہ نصف صدی کے دوران ترقی پسند اور جدیدیت کی تحریکات کے زیرِ اثر واضح نظریاتی جانبداریاں مطمحِ نظر بنی رہی ہیں اور اس کے نتیجے میں ادب کی تخلیق اور پھر اس کی شناخت انھیں تحریکات اور نظریات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کی گئی ہے اور کیوں کہ مزاحیہ اسلوب کو ان تحریکات اور نظریات کے لیے واضح طور پر مفید وسیلے کی حیثیت سے استعمال نہیں کیا گیا اس لیے مزاح، نظریہ پرست ناقدین اور تحریک پسند مورخین کی بھرپور توجہ اپنی جانب نہیں کھینچ سکا اور رفتہ رفتہ کچھ اس قسم کا تاثر پیدا ہونے لگا جیسے مزاحیہ ادب کسی طرح سنجیدہ ادب سے کم تر درجہ کی تخلیق ہے۔ چنانچہ ایسے متعدد باصلاحیت ادیبوں نے جو مزاحیہ فن کو اپنی صلاحیتوں سے نیا نکھار اور نئی جہت دے سکتے تھے۔ خود کو پوری طرح سنجیدہ اسالیب میں محدود رکھا اور مزاح نگاری صرف چند گنے چنے سرپھروں کا شعار بن کر رہ گئی۔

اس کا واضح اثر مزاحیہ اسلوب کی گیرائی اور توانائی پر پڑا۔ آج مزاح کو تفریح اور سرسری پن کے مترادف سمجھ لیا گیا ہے اور وہ بیانیہ نثر اور غیر رسمی شعر گوئی کی بعض ہیئتوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے گویا ہم رفتہ رفتہ ادب میں طربیہ تصور کی اہمیت سے آنکھیں چراتے جا رہے ہیں اور اس کے نتیجے میں مزاح ہمارے لیے صرف ایک اتفاقی اور ہنگامی سا پیرایۂ اظہار بن گیا ہے۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ آج کے سنجیدہ ادب کی بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ طربیہ (COMIC VISION) سے عاری ہے۔ اس میں زندگی کے بہت سے ایسے نرم و نازک لطیف و شگفتہ اور ذکاوت و فراست کو تحریک بخشنے والے عناصر کی کمی ہے جن کے بغیر زندگی کی دل آویز تصویر گری مکمل نہیں ہوتی۔ طربیہ فن یعنی کامیڈی پر عالمی ادب کا ایک بہت اہم حصہ مشتمل ہے وہ صرف وقتی تفریح کا آلۂ کار نہیں بلکہ غیبی تضادات حسین تصادمات، دلچسپ بوالعجبیوں قابلِ برداشت بے ضابطگیوں کو نمایاں کرتے، انھیں اظہار بخشنے اور ان سے یکسر لطیف تاثراتی آہنگ ترتیب دینے کا مفید وسیلہ بھی ہے۔ دورِ حاضر میں نظریات کی تیزابی بارش ایک تخلیقی ریگ زار کو جنم دے

رہا ہے اور اس رنگ زار کی بڑھتی ہوئی حدوں پر روک لگانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے طربیہ فن کی قدریں پھر سے لگانے کا اور طربیہ فن کے بارے میں از سر نو اعتماد بحال کرنے کا۔ ایک اور اندیشہ جس کا ہمیں سامنا ہے وہ یہ ہے کہ نئے ذرائع ابلاغ کی ترویج میں کامیڈی کمرشیل بنتی جا رہی ہے اور مزاح کی سطح پستی اور لطیفہ بازی کی . . . . جانب مائل ہے۔ INSTANT COFFEE کی طرح (INSTANT HUMOUR) کی مانگ بڑھ رہی ہے اور بنے بنائے دساوری مال کی کھیپ کی کھیپ اُتر رہی ہے۔ بجائے غیر ملکی COMICS، اخبارات میں بدیسی COMIC STRIPS، ٹیلی ویژن پر باہر کے ...COMEDY SERIALS غرض بدیسی مال پاکستان ہر جگہ موجود ہے۔ ہنسو اور بھول جاؤ۔ یہ رویہ تجارتی نقطۂ نظر سے تو خوش آئند ہے۔ لیکن اعلیٰ ادب کی ضمانت نہیں۔ اعلیٰ طربیہ فن پارے بھلانے کے لیے نہیں بار بار دہرائے جانے کے لیے ہوتے ہیں۔ اُن کے لیے بلند فنی ریاض اور مزاج و اظہار کی بڑی نزاکتوں اور نفاستوں کی احتیاج ہوتی ہے۔ یہی چیلنج ہمارے آج کے مزاح نگار کے سامنے ہے۔

اگر ہم نظریاتی دلدل سے باہر نکل سکیں تو مزاحیہ اسلوب ادب کا مخصوص اسلوب بن کر اُبھر سکتا ہے۔ دورِ حاضر عقلی رجحانات کا دور ہے اور عقلی موشگافیاں آج کے اندازِ بحث کا خاصہ ہیں۔ ہم اپنی گفتگو میں، تحریروں میں، رسمی و غیر رسمی مباحث میں موضوع کو باریک نکات میں تحلیل کرنے کا رجحان رکھتے ہیں اور نکتہ آفرینی کے ذریعے دوسرے کی ذکاوت کو چھیڑ کر لطف لیتے ہیں۔ اسی ذہنی تربیت کے ساتھ جس وقت ادیب اپنا قلم اُٹھاتا ہے تو اس کے ذہن میں گوناگوں لطیف نکات اُبھرتے ہیں۔ انھیں نکات کی ہنرمندانہ ترتیب و پیش کش سے وہ نہ صرف لطیف انشا کو بروئے کار لاتا ہے بلکہ نکات کے تقابل، تضاد اور تصادم کے ذریعے وہ بعض صورتوں میں مزاح، بعض میں تبسم ظریفانہ صورتِ حال اور بعض میں طنز کے تاثرات پیدا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ عقلی مباحث سے کامیڈی کس طرح جنم لیتی ہے اس کی ایک نمایاں مثال برنارڈ شا کا فن ہے۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ طنز و مزاح دورِ حاضر کے عقلی مزاج کی ایک ترنگ ہے اور آج کا ادیب طربیہ کو نہ صرف ایک اسلوب کی شکل میں بلکہ ایک ادبی رویے کی شکل میں بھی اپنا کر ہم عصر زندگی سے تعلق رکھنے والے تاثرات و تاثرات کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ تخلیقی اظہار بخشنے میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ ہمارے ہی دور میں کرشن چندر کی تخلیقات "گدھے کی سرگزشت" اور "گدھے کی واپسی" فنکارانہ تخیل، مزاحیہ حس اور سماجی شعور کی ایک حسین مثال پیش کرتی ہیں۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں جس قسم کا مزاحیہ ادب تخلیق ہوا اُس میں تندی اور تلخی کا عنصر نسبتاً کم ہے۔ ترقی پسند تحریک کے دورِ عروج میں ایک واضح سماجی شعور اور نظریاتی وابستگی نے جس طنزیہ تندی کو جنم دیا تھا وہ ۱۹۵۰ء کے بعد ایک زیادہ محتاط رویے میں بدلتا نظر آتا ہے۔ اس کے نتیجے میں بذلہ سنجی، نکتہ آفرینی اور لطیف انشا کی جانب نمایاں رجحان دکھائی دیتا ہے۔ سماجی تنقید کا لہجہ نرم ہو گیا ہے اور منفرد کرداروں کے مضحک پہلوؤں کی پیش کش آج کا ایک بڑا مقبول پیرایہ ہے۔ بعض مزاح نگاروں نے خیالی کرداروں کے وسیلے سے کسی تاثر کی مضحک تصویر کشی کو ترجیح دی ہے لیکن ادھر کچھ عرصے سے مزاحیہ خاکہ نگاری کی جانب ہمارے مزاح نگار کافی توجہ دے رہے ہیں۔

ہندوستان میں رفتہ رفتہ اُردو صحافت کا دائرہ اثر جس طرح محدود ہو رہا ہے اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ صحافتی مزاح کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ اب گنے چنے روزناموں میں ہی مزاحیہ کالم باقی رہ گئے ہیں اور ہفتہ وار اخبارات میں بھی اتفاقاً ہی مزاحیہ مضامین جگہ پا رہے ہیں۔

گذشتہ تیس سال میں جو مزاح تخلیق ہوا ہے اس کا زیادہ حصہ انشائیوں اور خاکوں کی شکل میں ہے۔ ہندوستانی انشائیے میں بالعموم مزاح کی ایک لہر اور لطیف انشا اظہار بنیادی عناصر کا کام کرتے ہیں جن میں غیر رسمی فلسفہ طرازی کا رجحان نظر آتا ہے

یوں اس وقت ہندوستان میں خالص انشائیہ کم ہی لکھا جا رہا ہے۔ بیشتر مضامین میں واقعاتی مزاح اور بیانیہ مزاح کی مختلف تناسب میں آمیزش نظر آتی ہے۔ عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی کے مثل افسانوی مزاح کے میدان میں بھرپور مزاحیہ نگارشات کی تخلیق دورِ حاضر میں نہیں ہو سکی ہے۔

اس سے بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آزادی کے بعد جو مزاح نگار ابھرے ہیں انھوں نے مزاحیہ اسلوب کو خاصی توانائی کے ساتھ استعمال کیا ہے اور اپنی اختراعی صلاحیتوں کا خصوصی طور پر مظاہرہ کیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے مضامین ہوں یا خاکے، وہ تضاد سے چونکا دینے والی تفصیلات اور سادگی کے ساتھ چبھ جانے والے فقروں کے ذریعے اپنا تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔ یوسف ناظم نے جانے بوجھے معاملات و حادثات سے گدگدی کا سامان پیدا کرنے کا فن سیکھا ہے اور وہ اپنی بے تکلفی سے زیر کر لیتے ہیں۔ شفیقہ فرحت کا مزاح مضمون کے رگ و ریشے میں پیوست ہو کر بڑھتا ہے اور شاخ در شاخ پھیلتا ہے۔ وجاہت علی سندیلوی نے . . . . مزاحیہ صورت حال کو افسانوی تعمیر یا اجزا کی بنیاد بنا کر مزاحیہ نگاری کی دلکش مثالیں پیش کی ہیں۔ نریندر لوتھر نے مزاح کو سلیقے اور شائستگی میں تلاش کر کے اس کی توانائی کا راز رنگا رنگی میں پایا ہے۔ احمد جمال پاشا نے موضوع کے تنوع اور زبان کی ابلاغ شناسی سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ وآہی نے شعر سے شمشیر کا کام لیا ہے۔ ایک سیاہ طنز ہے کہ تیر و تبر گلوہ و خنجر سے آراستہ اُن کے مصرعے مصرعے میں قدم زن نظر آتی ہے اور خواجہ عبدالغفور اور بھارت چند کھنہ نے اردو مزاح کو عالمی مزاحیہ ادب کے آداب و شستگی سے واقف کرانے کا مقدس فریضہ انجام دیا ہے۔ اِن جانے پہچانے ادیبوں پر ہی کیا منحصر گذشتہ دس سالوں میں نثر و نظم میں مزاح نگاروں کی ایک پوری نسل ہمارے سامنے آئی ہے جس نے مزاحیہ اسلوب کو ایک نئی قوت اور نئی آواز بخشی ہے۔

شکایت بہرحال ادب کی جانب بالعموم اور مزاح کی جانب بالخصوص ہمارے رویّے سے ہے۔ مزاح نگار کے لیے اس وقت کامیڈی کے پستی کی جانب مائل کمرشیل رجحان ایک زبردست چیلنج ہے اور وہ اس سے اسی وقت عہدہ برآ ہو سکتا ہے جب وہ اپنے عمومی طربیہ تصور کو فروغ دے اور طربیہ اسلوب کو صرف اتفاقی پیرایے کی حیثیت سے اختیار نہ کرے بلکہ ناول، ڈرامے، افسانے، طویل نظم جیسی بسیط تر تخلیقات کے لیے بھی اس کو اپنائے ●●

اعجاز وارثی (سنبھل)

قطعات

ہزاروں میں کچھ ایسے لوگ بھی دس بیس ہوتے ہیں
جو طول و عرض کے مفہوم میں کٹ بیس ہوتے ہیں
بنا دیتے ہیں جو فرعون انساں کو خوشامد سے
در اصل ایسے مصاحب فطرتاً ابلیس ہوتے ہیں

کلامِ غیر پہلے صرف کچھ شاعر ہی پڑھتے تھے
مگر لکھے دلاور نثر میں بھی اب نمایاں ہیں
وہ اک مضموں حقیقت میں علی اسعد نے لکھا تھا
رسالے میں مگر مضموں نگار احمد علی خاں ہیں

زندگی کا لطف مرغ و سیب میں
جامہ زیبی مخمل و تن زیب میں
ہم سے پوچھو شیخ کی قسمت کا راز
مدرسہ کاغذ پہ چندہ جیب میں

کہنے لگے وہ تحت میں سن کر مری غزل
عرضِ ہنر فضول ہے جب تک گلا نہ ہو
کچھ ایسا ہے جناب کا ذوقِ سخن وری
کھانے میں جیسے مرغ ہو لیکن گلا نہ ہو

قابلِ تعریف تھا افطار میرِ شہر کا
خوانِ اکل و شرب لاتعداد و لامحدود تھے
روزہ دار و مولوی، ملا نمازی کم سہی
شہر کے حکام اور نیتا تو سب موجود تھے

پاگل عادل آبادی

الکشن نامہ

خدمت کی دہائی تو سدا دیتے ہیں لیکن
جنتا کے مسائل سے یہ انجان بہت ہیں
وہ کون ہے جس کو نہیں ووٹوں کی ضرورت
کرسی کے ہر اک شخص کو ارمان بہت ہیں
رہتی ہے سدا فکر انھیں سیٹ کی اپنی
خود اپنے ہی وعدوں سے یہ انجان بہت ہیں
ان بگلا بھگت دیش کے نیتاؤں سے پاگلؔ
اس ملک میں پھیلے ہوئے بحران بہت ہیں

آج کا فقیر

اسماعیل ظریف

پھر رہا تھا مانگتا خیرات ایک موٹا فقیر
ایک صاحب نے اٹھنی اس کو دی خیرات میں
وہ اٹھنی اس نے یہ کہتے ہوئے لوٹا دیا
مفلسوں سے بھیک ہم لیتے نہیں بندہ نواز
پانچ اٹھنی ہے مینمم ان دنوں اپنا حضور

رؤف پاریکھ
(کراچی)

شفیق الرحمٰن ـــــ نوجوان طبقے میں مقبولیت

شفیق الرحمٰن کا شمار ہمارے ان مزاح نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے آزادی سے قبل لکھنا شروع کیا اور آزادی سے قبل ہی ادبی شہرت نے ان کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ اپنے بعض معاصرین مثلاً ابراہیم جلیس، کنہیا لال کپور، کرشن چندر، رشید احمد صدیقی اور شوکت تھانوی کی طرح وہ بھی آزادی کے بعد لکھتے رہے گو اس کی رفتار کم ہو گئی خاص طور پر ۵۰ء کے عشرے کے بعد شفیق الرحمٰن نے لکھنا بہت کم کر دیا حتیٰ کہ تقریباً پچیس سال کے (بلکہ اس سے بھی زائد) وقفے کے بعد ان کی نئی کتاب دجلہ منظرِ عام پر آئی یہ ۱۹۸۰ء کا ذکر ہے اس سے چند سال قبل سید ضمیر جعفری شفیق الرحمٰن کی طویل خاموشی پر (جسے Hibernation کہنا غالباً زیادہ موزوں ہوگا) کچھ نہ لکھنے کی سلور جوبلی کے عنوان سے ایک کالم تحریر کر چکے تھے۔ اتنے طویل عرصے تک کچھ نہ لکھنے کے باوجود شفیق الرحمٰن کی مقبولیت کا وہی عالم رہا۔ ہر چند سالوں کے وقفے کے بعد ان کی کتابوں کے نئے ایڈیشن مارکیٹ میں آجاتے ہیں۔ یہ اعزاز اردو کے بہت کم ادیبوں کے حصے میں آیا ہے کہ طویل عرصے تک کچھ نہ لکھنے کے باوجود وہ مقبول و معروف رہے ہوں۔ ورنہ عام طور پر ادیبوں کو شہرت حاصل کرنے کے بعد اُسے قائم رکھنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور زبردستی کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا پڑتا ہے تاکہ وہ Fade out نہ ہو جائیں (یہ اور بات ہے کہ بسیار نویسی اور زود نویسی بھی تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔ مثلاً شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی کی مزاح نگاری کو بسیار نویسی ہی لے ڈوبی یہ دونوں بہت اچھے مزاح نگار ہوتے اگر کم لکھتے) لیکن شفیق الرحمٰن کی مقبولیت پر کچھ نہ لکھنے کے باوجود وقت کی دھول نہیں پڑی وہ دھندلاتے نہیں بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اردو کے مسلّم مزاح نگاروں میں اُن کا شمار ہونے لگا ہے۔ ان کی کتابیں یعنی لہریں، کرنیں، شگوفے، مدوجزر، پچھتاوے، حماقتیں، مزید حماقتیں اور دجلہ کئی ناشروں نے چھاپی ہیں بلکہ بھارت میں بھی ان کی کتابوں کے جائز ناجائز ایڈیشن چھپے ہیں مثلاً شگوفے کو وہاں نئے شگوفے کے نام سے چھاپا گیا۔

شفیق الرحمٰن کی اس مقبولیت میں نوجوان قارئین کا بہت بڑا ہاتھ ہے نوجوان طبقے کے پسندیدہ مصنفین کی فہرست میں شفیق الرحمٰن سب سے اوپر یا کم از کم دوسرے تیسرے نمبر پر ضرور آتے ہیں۔ اگر احمد فراز نوجوانوں کے شاعر ہیں تو شفیق الرحمٰن نوجوانوں کے مزاح نگار ہیں سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ نوجوان پڑھنے والوں میں ان کی بے پناہ مقبولیت کے اسباب کیا ہیں؟

سولہ سترہ سے بیس سال تک عمر ایسی ہوتی ہے کہ فرد ذہنی انتشار اور نفسیاتی کشمکشوں سے دوچار رہتا ہے ذہنی ناپختگی اور جذباتیت کے اس دور میں نوجوان طبقہ یاسیت، ذہنی پژمردگی، اضمحلال اور شدتِ احساس کی کیفیات سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوتا ہے چنانچہ وہ شعوری یا لاشعوری طور پر مسرت، تفریح، سکون اور ذہنی ہم آہنگی کی تلاش میں ہوتا ہے۔ مختلف فلسفوں اور نظریات کو سمجھنا

شگوفے

چاہتا ہے دنیا کی تلخیوں سے فرار چاہتا ہے کیوں کہ اس کی بعض حقیقتیں اس کے انتشار میں اضافہ کرتی ہیں اسے عشق و محبت
میں ایک عجیب سا لطف محسوس ہونے لگتا ہے احساسات اور تخیلات کے دھندلکوں میں لپٹی ہوئی ماورائے حقیقت باتیں اور
اسی سبب طرح کشش کرنے لگتی ہیں اُسے ہنسنے ہنسانے اور وقتی خوش گزرنے میں انجانی مسرت ملنے لگتی ہے ساتھ
وقفے سے قنوطیت اور رجائیت، افسردگی اور خوش باشی کے دورے سے بھی پڑنے لگتے ہیں ایک دن منہ بسورتے ہیں تو ا
مسرت سے قلانچیں مار رہے ہیں۔

شفیق الرحمن کی شگفتگی بذلہ سنجی، خالص مزاح کو سمجھنے اور اسے پیش کرنے کی صلاحیت، مسائل کی نیم رومانوی نیم
درمیان میں لطیفوں اور چٹکلوں کا چھڑکاؤ اور نوجوانوں کے سے انداز میں ہر چیز پہ کھلنڈرے پن اور بے فکری سے نظریں
یہ سب انھیں نوجوان طبقہ میں محبوب بنائے رکھتا ہے۔

گویا نوجوان طبقہ اُن کی تحریروں میں ایک ذہنی ہم آہنگی کے علاوہ ذہنی تسکین کا سامان بھی پاتا ہے۔ شفیق الرحمن ا
فلسفہ اور خوش رہنے کی طرف راغب کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی کتابوں سے کئی اقتباسات مثال کے طور پر پیش کیے جا
یہاں صرف ایک آدھ پر اکتفا کرنا پڑے گا۔

مضمون "بیزاری" میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"اب آپ کوئی اوسط درجے کا گھرانہ لے لیجیے بچے بیزار ہیں کہ انھیں ڈانٹ دیا جاتا ہے امی بیزار ہیں کہ نوکر کہنا
نوکر بیزار ہیں کہ میاں کے دوست بہت تنگ کرتے ہیں اور میاں بیزار ہیں کہ بچوں کے ماموں ہر تیسرے روز شکار کھیلنے آ
بیزار ہیں کہ رائفل کا لائسنس اب تک نہیں ملا چچا اگر چاہیں تو بآسانی لائسنس مل سکتا ہے چچا بیزار ہیں کہ ان کے صاحب زادے
مطابق شادی کریں گے ان کے صاحبزادے بیزار ہیں کہ جن خاتون کو وہ چاہتے ہیں وہ اب تک کنواری رہتی ہیں اور وہ خاتون:
ان کا ہاضمہ خراب ہوتا جا رہا ہے اور اکثر پسلی میں درد ہو جاتا ہے اب پتہ نہیں چلتا کہ یہ بیزاری شروع کہاں اور ختم کہاں ہوتی
سب بیزار کیوں ہیں؟ کیا بیزار رہنا ان کا شغل ہے؟"

(لہریں ص

اس مضمون میں آگے چل کر وہ اپنے اس فلسفہ رجائیت کی اور خوش رہنے کی یوں تلقین کرتے ہیں۔

"اس چمکیلی سنہری دنیا میں اس نیلے نیلے آسمان کے نیچے کیا کچھ نہیں، مسکراتے ہوئے پھول میں ناچتی ہوئی تتلیاں ہ
جھومتی برسات کی جھڑیاں غروب آفتاب کی رنگین شفق بھی کچھ تو ہے اور جب کسی ہنس مکھ اور مخلص انسان کی رفاقت میسر
ہو نا لُٹ رہا ہے"

(دجلہ

البتہ ایک پُر لطف نکتہ یہ ہے کہ شفیق الرحمن صرف خوش باشی کی ہی تلقین نہیں کرتے بلکہ اُن کی تحریروں میں کبھی کبھی
لگتی ہے وہ صرف چیزوں کے چمکیلے و رجائیت آمیز پہلو ہی نہیں دکھاتے کبھی کبھی ان کی نظر دنیا کی کجی اور کوتاہیوں پہ بھی
یہ نظر بڑی حسرت ناک ہوتی ہے۔ قنوطیت ان کی تحریر پہ اپنا سایہ ڈالنے لگتی ہے۔ تب اچانک مزاح اور اُمید کی کرنیں
کو چیر کر نکلتی ہیں اور قنوطیت کی جگہ پھر رجائیت لے لیتی ہے۔ شفیق الرحمن کے ہاں اس دھوپ چھاؤں کی کیفیت کا ایک ا
مزاح اور درد کی اس آمیزش کے ضمن میں بھی کئی مضامین بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں مثلاً نیلی جھیل ان کا ایک ایسا مض

اور غم، امید اور مایوسی کے عجیب و غریب اور متضاد رنگوں سے عبارت ہے۔ اس مضمون میں جہاں شفیق الرحمٰن کی مخصوص بذلہ سنجی چٹکلے چھیڑتے ہوئے فقرے اور کھلنڈرا پن ہے وہیں اس قسم کے ٹکڑے بھی ملتے ہیں۔

"دو لڑکو! یہ خود فریبی کی نیلی جھیلیں اور دوسرے کنارے عمر بھر پیچھا نہیں چھوڑتے ہم زندگی بھر اپنے آپ کو فریب دینے کی کوشش میں رہتے ہیں یہ یقین دلانے کی کوشش میں کہ جو چیز یہاں نہیں ہے وہ یہاں ہے۔ . . . دوسرا کنارہ بس دور ہی سے اچھا لگتا ہے۔"

(حماقتیں ص ۱۲۱)

اسی طرح :۔ "زندگی بڑی مشکل ہے جینے کے لیے مرتبہ کی ضرورت ہے آسائش کی ضرورت ہے اور ان کے لیے روپے کی ضرورت ہے اور روپیہ حاصل کرنے کے لیے، مقابلہ ہوتا ہے مقابلے میں جھوٹ بولنا پڑتا ہے دھوکہ دینا پڑتا ہے غداری کرنی پڑتی ہے یہاں کوئی کسی کی پرواہ نہیں کرتا دنیا میں دوستی محبت انس سب رشتے مطلب پر قائم ہیں محبت آمیز باتوں مسکراہٹوں مہربانیوں شفقتوں ان سب کی تہہ میں کوئی غرض پوشیدہ ہے یہاں تک کہ خدا کو بھی لوگ ضرورت پڑنے پر یاد کرتے ہیں۔ . . . دنیا کو تم کبھی خوش نہیں رکھ سکتے اگر تم سادہ لوح ہوئے تو دنیا، تم پر ہنسے گی تمہارا مذاق اڑائے گی اگر عقلمند ہوئے تو حسد کرے گی اگر الگ تھلگ رہے تو تمہیں چڑچڑا اور مکار گردانا جائے گا اگر ہر ایک سے گھل مل کر رہے تو تمہیں خوشامدی سمجھا جائے گا اگر سوچ سمجھ کر دولت خرچ کی تو تمہیں پست خیال اور کنجوس کہیں گے۔ اور اگر فراخ دل ہوئے تو بیوقوف اور فضول خرچ عمر بھر تمہیں کوئی نہیں سمجھے گا نہ سمجھنے کی کوشش کرے گا تم ہمیشہ تنہا رہو گے حتیٰ کہ ایک دن آئے گا اور چپکے سے اس دنیا سے رخصت ہو جاؤ گے یہاں سے جاتے ہوئے تم متحیر ہو گے کہ یہ تماشا کیا تھا اس تماشے کی ضرورت کیا تھی یہ سب کچھ کس قدر بے معنی اور بے سود تھا۔"

(ایضاً ۵۹۔ ۶۰)

لیکن اس قسم کے موڈ شفیق الرحمٰن پر ذرا کم ہی طاری ہوتے ہیں اور وہ بھی مختصر وقفہ کے لیے مجموعی طور پر شفیق الرحمٰن کے ہاں مزاح اور زندہ دلی حاوی ہے۔

لیکن یہی عارضی قنوطیت اور اس کے بعد مسرت اور ظرافت کی لہریں اور خوش دلی کی بلند پروازیاں شیطان (ان کا کردار) کی حماقتیں بلکہ مزید حماقتیں یہ سب مل کر شفیق الرحمٰن کو نوجوان پڑھنے والوں میں حیرت انگیز مقبولیت عطا کرتی ہیں اس کی وجہ شاید شفیق الرحمٰن کی تحریر کی نیرنگی ہی ہے جو نوجوان طبقے کے متنوع مزاج اور متلون رویے سے ہم آہنگ ہے۔

لیکن اُن کی مقبولیت میں صرف انہی چیزوں کا ہاتھ نہیں ان کی بذلہ سنجی، خوش دلی ان کی کامیاب اور انتہائی پر لطف تحریف نگاری ان کی لطیفہ گوئی، اُن کے صلوٰت آپا بجی اور شیطان جیسے عجیب اور دلچسپ کردار یہ سب اس مقبولیت کی وجہ ہیں اور سب علیحدہ علیحدہ مضمون کے متقاضی ہیں۔

سر دست یہ کہنا مقصود ہے کہ نوجوان طبقہ میں جو خود اکثر ذہنی انتشار کا شکار رہتا ہے شفیق الرحمٰن کی ان نیم فلسفیانہ تاویلات اور رجائیت کا ایک صحت مند اثر ضرور پڑتا ہے۔

نوجوانوں میں ان کی مقبولیت کا ایک اور بڑا سبب ان کے افسانوں اور مضامین میں نوجوان لڑکے، لڑکیوں کو آزادانہ رومان لڑاتے دکھانا ہے شفیق الرحمٰن کے عشقیہ افسانوں کی چند خصوصیات ہیں مثلاً آنکھیں فوراً چار ہوں گی پسندیدگی کا اکثر فوری اظہار ہوگا اور یہ کسی بھی جانب سے ہو سکتا ہے کوئی ایک آدھ مزاحیہ کردار یا شوخ اور فقرے باز لڑکا یا لڑکی ان لمحات کو بوجھل نہیں ہونے دے گا۔ لیکن یہ محبت عموماً ناکام ہوگی یا لڑکا آہیں بھرے گا یا لڑکی سسکیاں بھرے گی اور اس کی یاد کبھی کبھی دل میں چٹکیاں لے گی لیکن اس

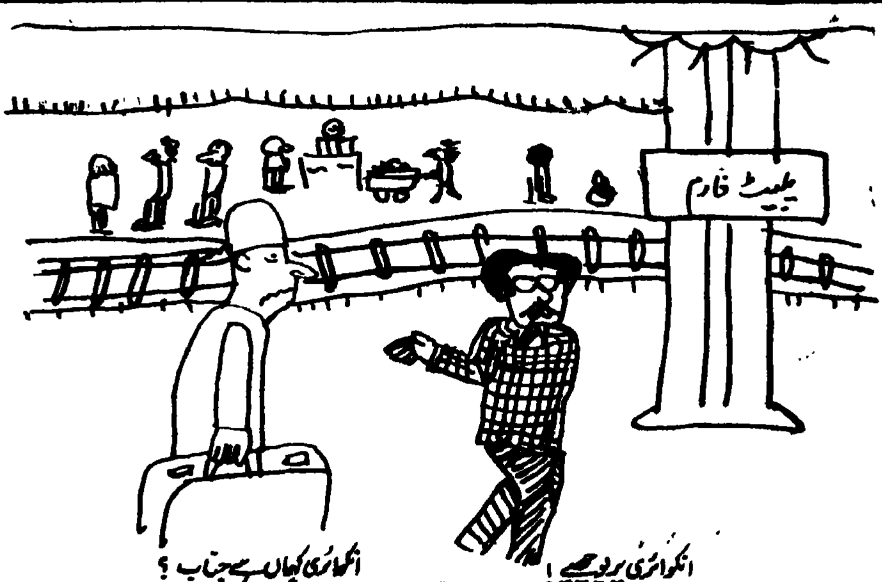
روگ کو مستقل بنانے کے شفیق الرحمٰن قائل نہیں ہیں۔

اُن کا خیال کچھ اس قسم کا ہے کہ محبت کرو اور آگے بڑھ جاؤ اور بھول جاؤ۔ ان کی دو کتابیں کرنیں اور مدوجزر خاص طور پر اسی قسم کے عشقیہ اور حزنیہ افسانوں پر مبنی ہیں جن کا انجام جدائی ہے لیکن شفیق الرحمٰن کا نقطہ نظر بعض دیگر تحریروں سے بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ "تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی" اُن کے ایک کردار شیطان کا یہ جملہ بڑا معنی خیز ہے اور کسی حد تک ان کے نظریے پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

"میاں اگر بس یا لڑکی ہاتھ سے نکل جائے تو ذرا فکر نہیں کرنا چاہیے۔ دوسری ابھی آتی ہوگی!"

(حماقتیں ص ۱۲۱)

لیکن یہ سوچنا درست نہیں ہوگا کہ شفیق الرحمٰن صرف نوجوانوں کے مزاح نگار ہیں ان کی مزاح نگاری کی دیگر خصوصیات اور دیگر پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ اس مضمون میں ممکن نہیں یا زندہ صحبت باقی ●●





(مجرگ)

خاتونِ اردو — صغریٰ عالم[1]

ہمارے ایک دوست نے ہم پر طنز کی تلوار سے وار کرتے ہوئے کہا تھا "وقار! تمہیں دولت مند گھرانے کے ... کی طرح کچھ کام ہے اور نہ کوئی کام ہی ہوتی اور بس کان پر قلم رکھ کر مکان سے نکل پڑتے ہو کسی ادیب، شاعر یا شاعرہ کا خاکہ ... تلاش کرنے۔ خصوصاً جب کسی فنکار کی قلمی کاوش کی منہ دکھائی کا موقع ہوتا ہے یا کسی شاعر یا ادیب کو تہنیتی جھاڑ پر چڑھا ... جلسہ تو صاحبِ کتاب یا تہنیتی اجلاس کے نوشہ پر خاکہ سنانے کے لیے تم اپنے پر اس طرح تولنے لگتے ہو جس طرح بعض شعراء ... کے وقت دولہے میاں کا سہرا سنانے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ ہم نے جواب دیا تھا "دوست! شادیوں میں سہرا سنانا ... نیت بخش فعل ہے کیوں کہ شاعر کو اس کی محنت کا معاوضہ نہ سہی کم از کم بریانی کے ساتھ آدھا چمچا ڈبل کا میٹھا تو مل جاتا ہے ... لیکن جلسوں میں خاکہ سنانے کے بعد خاکہ نگار کو کیا خاک ہاتھ لگتا ہے بس دو عدد نمکین بسکیٹ کے ساتھ ایک کپ ٹھنڈی چائے ... بھی تو محترمہ چائے بھی بڑی چالاکی سے چکمہ دے جاتی ہیں۔ بات دراصل یہ ہے ہم کسی کا خاکہ لکھتے نہیں بلکہ صاحبِ خاکہ کی شخصیت ... فنکار سے خود بخود خاکہ لکھواتی ہے" شاید ہماری یہ دلیل ہمارے دوست کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھی وہ ہمیں مشکوک نظروں سے ... دیکھتے ہوئے نو دو گیارہ ہو گئے تھے۔

ہم ایک عرصہ سے ہمارے ہی شہر کی ایک مقبول شاعرہ صغریٰ عالم صاحبہ پر خاکہ لکھنا چاہتے تھے لیکن جب بھی صغریٰ عالم ... کا ... صفحۂ قرطاس پر رقم کرنا چاہتے۔ غنی عالم صاحب کا نام لپک کر آ جاتا۔ ہم صغریٰ عالم صاحبہ کا خاکہ غنی عالم صاحب کے ذکر کے بغیر مکمل کرنے کی ... مگر ہماری اس کوشش کو ناکامی کا منہ ہی نہیں جھکا ہوا سر بھی دیکھنا پڑا۔ چناں چہ ہم غنی عالم صاحب کا ذکر صغریٰ عالم صاحبہ کے خاکے میں کس لیے کر رہے ہیں ... اگر آپ صغریٰ عالم صاحبہ سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے کے لیے "عالم بلڈنگ" میں قدم رنجہ فرمائیں گے تو آپ کا سامنا صغریٰ عالم صاحبہ سے پہلے غنی عالم صاحب سے ہوگا۔ صغریٰ عالم صاحبہ کے کچن روم سے ڈرائنگ روم میں داخل ہونے تک غنی عالم صاحب آپ کو بتا چکے ہوں گے کہ صغریٰ عالم صاحبہ کی کتنی غزلیں کن کن رسائل میں چھپ چکی ہیں ———— کن ان کو ادبی ... انجمنوں سے ایوارڈ اور اعزازات ——— حاصل ہوئے ہیں!! کہاں کہاں سے کل ہند مشاعروں میں شرکت کے لیے دعوت نامے مل چکے ہیں۔ صغریٰ عالم صاحبہ کس طرح کی شاعری کو پسند فرماتی ہیں اور کس طرح کی شاعری کو ناپسند!!! چنانچہ! آپ صغریٰ عالم صاحبہ سے شرفِ ملاقات سے قبل ہی ایسا محسوس کرنے لگتے ہیں کہ آپ ان سے مل چکے ہیں کیوں کہ آپ جو سوالات صغریٰ عالم صاحبہ سے کرنے کی تمنا لے کر "عالم بلڈنگ" میں قدم رکھ چکے تھے ان تمام سوالات کے جوابات غنی عالم صاحب سے مل چکے ہوتے ہیں ... صغریٰ عالم صاحبہ ... صرف سلام اور رسمی کلام کے بعد رخصت ہو جاتے ہیں۔ غنی عالم صاحب صغریٰ عالم صاحبہ کے شوہر ہیں ... [illegible]

بھی دے دی۔ شاید یہ غنی عالم صاحب کی پہلی داد ہی کا نتیجہ ہے کہ صغریٰ عالم صاحب کی ہر غزل مشاعروں میں داد کے دریا بہاتی ہے۔ "حیاتِ صدف" کی اشاعت کے لیے غنی عالم صاحب کی بھاگ دوڑ بھی کچھ کم نہیں تھی۔ اس بھاگ دوڑ کو دیکھ کر ہمیں تھوڑی دیر کے لیے لگا تھا کہ غنی عالم صاحب نے تحصیلداری کی ملازمت سے توبہ کر کے کہیں پیشۂ پبلیکیشن سے ناطہ تو نہیں جوڑ لیا۔ بعد میں پتہ چلا غنی عالم صاحب پبلشر تو بن گئے ہیں لیکن صرف "حیاتِ صدف" کی اشاعت کی حد تک۔ شاید ہی کوئی مشاعرہ یا ادبی اجلاس ہوگا جس میں صغریٰ عالم صاحبہ غنی عالم صاحب کے بغیر شرکت کرتی ہوں۔ ایک مرتبہ ہمارے ایک دوست نے غنی عالم صاحب سے سوال کیا تھا۔ "آپ کو شاعروں اور شاعروں سے جب اتنی دلچسپی ہے تو آپ خود شاعری کیوں نہیں شروع کر دیتے؟" غنی عالم صاحب نے جواب دیا تھا "جناب میں شاعری تو کرنا چاہتا ہوں لیکن میرے ساتھ مشکل یہ ہے میری غزل کو لوگ میری غزل کہاں تسلیم کریں گے سارا کریڈٹ تو صغریٰ عالم صاحبہ کو ہی جائے گا۔"

ہم نے اکثر کل ہند مشاعروں میں ایک آپ میں لت پت خاتون شعراء کو مٹک مٹک کر کبھی لہک لہک کر غزل گائیکی کا کمال دکھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ تیز آواز اور دل پھینک انداز کے ذریعے بے جان غزلوں میں مصنوعی جان ڈال کر سامعین کو محظوظ کرتی ہوئی خاتون شعراء کو دیکھ کر ہمیں سڑک چھاپ خاتون قوالوں کے جھٹکے یاد آتے ہیں۔ مگر صغریٰ عالم صاحبہ کے شعر سنانے کا انداز اس قدر باوقار ہوتا ہے کہ لگتا ہے ایک ایک لفظ کو ناپ تول کر لبوں تک لایا جا رہا ہے۔ گھر کی چار دیواری ہو یا کل ہند مشاعروں کا اسٹیج صغریٰ عالم صاحبہ کے چہرے پر مشرقی عورت کی حیا صاف جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے طبیعت میں حد درجہ سنجیدگی و متانت ہے، ادبی اجلاسوں اور مشاعروں میں پابندی سے شرکت کرتی ہیں گروہ بندیوں اور گروپ ازم سے دور مخصوص حلقۂ ادب یا مخصوص نظریۂ ادب کے نام سے نفرت کرتی ہیں۔ وہ ادب اور شاعری کو کسی ایک مخصوص رنگ یا ازم میں نہیں بلکہ کائنات کے ہر رنگ میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ ادب میں حقیقت نگاری کے نام پر فحش نگاری کو بالکل پسند نہیں کرتیں۔ انھیں اس شاعری پر یقین ہے جو زندگی سے پیار کرنا سکھاتی ہے۔

اردو ادب میں ایسے شعراء کی بھی کمی نہیں جو احساس برتری کی آخری حد کو پار کر چکے ہیں! احساس برتری کی بیماری میں اگر قادر الکلام اساتذہ مبتلا ہیں تو پھر بھی کوئی بات ہے مگر ڈیڑھ دو ڈیڑھ دو نٹ کے نوجوان شعراء بھی دو ڈیڑھ درجن غزل لکھ کر احساس برتری کی ریکھا پر چھلانگیں لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں تو ہم حیران ہو کر سوچنے لگتے ہیں یہ برتری اردو شاعری کی ترقی ہے۔۔۔۔۔یا۔۔۔۔؟ صغریٰ عالم صاحبہ کو ہم نے نہ احساس برتری کا شکار دیکھا اور نہ احساس کمتری میں مبتلا۔ ایک بار ہم عالم بلڈنگ پہنچے تو ہم نے دیکھا صغریٰ عالم صاحبہ میز پر کتابوں کے ڈھیر لگائے کچھ لکھنے میں مصروف ہیں پتہ چلا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھنے میں مصروف ہیں حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اسی ٹیبل پر ان کا چھ ماہ کا نواسہ کتابوں سے کھیل رہا ہے نانی جان کو چھیڑ رہا ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر ہمیں پتہ چلا دنیا کی شاہکار کتابیں معصوم بچوں کی پیاری بھری شرارت کے درمیان کس طرح تخلیق پاتی ہیں۔

صغریٰ عالم صاحبہ کی غزلیں اور نظمیں ملک کے موقر ادبی رسائل کے علاوہ کونے کونے سے نکلنے والے اخبارات اور رسائل میں تمکنت ایک مدت تصویر کے ساتھ پابندی سے چھپتی رہیں۔ صغریٰ عالم صاحبہ کی پہلی شعری تخلیق ۱۹۷۹ء میں ماہنامہ "روبی" (دہلی) میں شائع ہوئی تھی انہیں اتنی شہرت ملی کہ مدیروں کے خطوط خود صغریٰ عالم صاحبہ کے گھر شعری تعاون کے لیے پہنچنے لگے اور پھر چھپنے کا سلسلہ چل پڑا تو آج تک جاری ہے۔ اسی شعری سفر کے دوران انہیں مختلف ایوارڈ بھی ملے۔

تعلیمی میدان میں محترمہ کی خدمات کی ستائش کرتے ہوئے کرناٹک راجیہ اردو ٹیچرس اسوسی ایشن (بنگلور) نے ۱۹۸۹ء میں انھیں تہنیت پیش کی اور ملک گیر اردو بچاؤ تحریک (گلبرگہ) نے انھیں "خاتونِ اردو" کا خطاب عطا کیا ہے۔ ●

ڈاکٹر مجید بیدار
اورنگ آباد

بلدیہ نامہ

ذکر تیرا بتا کیا کریں بلدیہ
بس ترے ناز نخرے سہیں بلدیہ

مکھیوں، مچھروں کی ہے زد میں یہ شہر
بول کس کس کا نوحہ پڑھیں بلدیہ

سارا بھیجہ ہی بدبو سے اب سڑ گیا
ناک لے کر بھلا کیا کریں بلدیہ

زخم خوردہ ہیں مچھر کے مارے ہیں ہم
کس جگہ اب بتا دے بسیں بلدیہ

ہر گلی میں ندی کا سماں ہو گیا
کس طرح اس کی زد سے بچیں بلدیہ

شہر پانی کی قلت سے دوچار ہے
نالیاں خوب لیکن بھریں بلدیہ

کھٹملوں، مچھروں کی ہے یلغار بس
ہائے کس کس سے ہم اب لڑیں بلدیہ

اُف یہ سڑکیں کہ جن پر ہمیں ناز ہے
ان کے کھڈ میں بھلا کیا بھریں بلدیہ

پائے نازک جو رکھ دیں پھسلنے کا ڈر
پیر کیچڑ میں کیسے رکھیں بلدیہ

کوڑا کرکٹ ہے ہر سو صفائی نہیں
کس پہ الزام اب ہم دھریں بلدیہ

ہو کے بیدار پیدا ہوئے شہر میں
جی میں آتا ہے خود پر ہنسیں بلدیہ

لی شبنم کارواری
(کرناٹک)

غزل

(احمد فراز سے معذرت کے ساتھ)

بزنس ہی سہی مال کمانے کے لیے آ
آ بنک کا بیلنس بڑھانے کے لیے آ

شادی نہ سہی پیار کا چکر ہی چلا لے
دل پھینک جوانوں پھنسانے کے لیے آ

ماں باپ تیرے واسطے لے آئیں گے شوہر
آ بوائے فرینڈ مجھ کو بنانے کے لیے آ

شادی میں سہیلی کی وہ جانے کے بہانے
تو اپنا ہنی مون منانے کے لیے آ

ناپے ہے نگاہوں سے ترے جسم کو درزی
سوچے ہے کبھی تجھ کو سلانے کے لیے آ

بیٹا جو ہے زردار کا یہ کہہ کے چلا تو
آ باپ کی دولت کو لٹانے کے لیے آ

بیٹھا ہوں سوئمنگ پول پہ یہ آس لیے میں
تو تیراکی کیسے ہے دکھانے کے لیے آ

ہے شعلۂ جوالہ کڑاکے کی ہے سردی
شبنم کے کلیجے کو جلانے کے لیے آ

وے کے خط

مراسلے

عزیزی، مکرمی، سلام و رحمۃ

آپ کی کتاب "حیدرآباد میں اردو کی ترقی ...." ادراک میں آپ کا لکھا ہوا پڑھا۔ سبحان اللہ کرم بالائے کرم۔ بے حد مسرور کیا، متشکر کیا۔

سرسری طور پر ورق گردانی تو فوراً کر لی تھی اور یہ اندازہ کرنے میں ذرا دشواری نہ ہوئی کہ اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام ہے جس میں نئے مصادر سے استفادہ کر کے مستند باتیں کہی گئی ہیں۔

ایک اور بات جس کے لیے شکریہ ادا کرنا واجب ہے، شگوفہ پچھلے مہینے میں بھی ملا تھا اور اس بار بھی آیا ہے۔ دل کی کلی کھل گئی۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ یہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ حسب ضرورت شائع ہو جاتا ہوگا۔ بے تکلف کہہ سکتا ہوں کہ طنز و مزاح میں دوسرا کوئی رسالہ پورے برصغیر میں اس کا ہم پلہ نہیں ہے۔ آپ نے لکھنے والوں کی ایک پوری جماعت پیدا کر دی ہے۔ مضامین سب نہایت دلچسپ ہیں ابتذال اور سوقیانہ پن سے کوسوں دور اور شگفتگی سے معمور۔ طنز و مزاح میں مہذب رہنا اور دامن ادب کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مبارک باد۔

ڈاکٹر شہنشاہ احمد فاروقی، نئی دہلی

محترم و مکرم ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب

السلام علیکم۔ "شگوفہ" مل رہا ہے اور ملتا ہے تو گویا شگفتگی کا دریا بہہ نکلتا ہے۔ یہ ہمارے ہاں آپ کی بشاشت کا سفیر ہے۔ چنانچہ ہر شمارہ کئی کئی مہینے احباب کے ایک وسیع حلقے میں، اصل یا عکس (ایک آنکھوں آنکھ) گشت کرتا رہتا ہے۔ نریندر لوتھر صاحب کے سفرنامے کا بڑے اشتیاق سے انتظار رہتا تھا۔ کیوں نہ ہو آخر اس شخص نے ہمارے پوسٹوار ہی کے علاقے میں تو آنکھیں کھولی تھیں۔ قلم وہاں جا کر کھلا تو کیا ہوا۔ شگوفہ سے ہمیں ہندوستان میں فکاہی ادب کے نئے رجحانات سے بھی آگاہی ہوتی رہتی ہے مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم کی روشنی کسی ایک افق یا کسی ایک آسمان کی روشنی نہیں ہے۔ جدہ اور دوبئی کے مشاعروں کے "وڈیو کیسٹوں" سے حمایت اللہ صاحب اور طالب خوندمیری صاحب کے درشن بھی ہو جاتے ہیں۔ سب احباب تک سلام اور رسانیدلا۔ ڈاکٹر محمود علی صاحب کے مضمون سے یہ خوش خبری ملی کہ شگوفہ اب سڈنی میں بھی جا کھلا۔

سید ضمیر جعفری، اسلام آباد

مدیر محترم،

آداب عرض۔ طلوع افکار کے وسیلے سے شگوفہ کا سالنامہ نظر سے گزرا، اپنے مرحوم دوست ماجس لکھنوی کے سلسلے میں ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کی تحریر پڑھ کر بہت سی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ہائے کیسا ہیرا بے بہا بحر فنا میں غرق ہو گیا۔

بہرحال یہ تحریر محض تشکر نامے کے طور پر ارسال کر رہا ہوں۔ آپ نے ماجس کی روح کو شاد کام کیا ورنہ کسی کو آج تک ان کے بارے میں کچھ لکھنے کی توفیق نہ ہوئی تھی۔

مجاہد لکھنوی۔ کراچی

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب

سلام مسنون۔ ۱۱ر مئی کے اخبار سیاست سے جناب یونس حیدرآبادی کے انتقال پر ملال کی خبر ملی۔ دعا ہے کہ خدا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عنایت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۲۴
شمارہ ۶

جون
۱۹۹۱ء

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال

طباعت: دائرہ پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد

فی پرچہ: ۵ روپے زرِ انفرادی: ۵۵ روپے
لائبریریوں سے: ۶۰ روپے۔ عرب ممالک سے: ۲۵۰ روپے

شگوفہ ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ
فون: 557716 مکان: 521064

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مال مُفت (انشائیے)

مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

قندِ مکرر

ایسی کی تیسی (تنقید)

بال کی کھال

چوری (منظومات)

طنز

یوسف ناظم

حیاتین

انسان کو اگر بخیر و خوبی بقیدِ حیات رہنا اور اپنی ازدواجی زندگی کو قدرے خوشگوار بنانا ہے تو اُسے شب و روز حیاتین کھاتے رہنا چاہیے۔ حیاتین کھانے کی عادت سے آدمی میں استواری پیدا ہوتی ہے۔ یہ حیاتین اتفاق سے کھانے پینے کی ساری چیزوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں اور ان کے مابعد الطبیعیات اثرات ان کے استعمال کے بعد ہی آشکارا ہوتے ہیں۔ دوسرا اتفاق یہ ہے کہ یہ سارے حیاتین انگریزی حروفِ تہجی میں ہیں۔ اردو یا کسی دوسری زبان کے حروفِ تہجی ان مقوی حیاتین کی ماہیت ظاہر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور چونکہ حیاتین کا مسئلہ غذائی ہے اس لیے کسی بھی قوم یا ملک نے اس معاملے میں لسانی تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا اور حیاتین اسی طرح انگریزی زبان اور رومن رسم الخط میں رائج ہے۔ خام اور قدرتی حیاتین کو سہل الحصول بنانے کی خاطر آدمی نے جو کافی ذہین ہے کچھ وٹامن بھی تیار کیے۔ تیار شدہ وٹامنوں میں بی کامپلکس نام کا وٹامن بہت مقبول ہوا اور صحت مند لوگ بھی اس سے فیض حاصل کرتے رہے۔ (بعض لوگ یونی ورسٹی کامپلکس کو بھی ایک قسم کا وٹامن سمجھتے ہیں۔ یہ ان کی غلط فہمی ہے) بی کامپلکس وٹامن کے قرص بھی ملتے ہیں اور عرق بھی دستیاب ہوتا ہے۔ قرص ان لوگوں کے لیے بنائے جاتے ہیں جو عرق کا شیشہ لیے لیے نہیں گھوم سکتے اور اگر عرق ہی پینا ہے تو پھر کسی عرق کی تخصیص کی کیا ضرورت ہے۔ یہ قرص اور عرق اس لیے وجود میں لائے گئے کہ آدمی کو یہ یاد نہیں رہتا کہ کس ترکاری سے حیاتین سیل بند کیے گئے ہیں۔ ایک صاحب کو جو ہر متنفس اور غیر متنفس چیز کو دیکھنے کے عادی تھے۔ جب یہ بتایا گیا کہ بینائی کو مزید تیز کرنے کے لیے گاجریں کھانی چاہئیں تو یہ صاحب وفورِ جذبات میں گاجر کا نام تو بھول گئے ٹماٹر سے شوق فرمانے لگے۔ صبح ناشتے میں انڈا کھانا ترک کر دیا اور ٹماٹر آملیٹ کھانے لگے۔ کچے ٹماٹروں کے قتلوں پر قتلے کھائے۔ منوں ٹماٹر سوپ پیا۔ شام کی چائے کے ساتھ بھی فرائڈ ٹماٹر کھائے۔ کہتے ہیں بینائی تو ان کی کیا تیز ہوتی سماعت بھی متاثر ہو گئی۔ ثقلِ سماعت کے علاوہ کچھ ایسی درپردہ شکایتیں بھی لاحق ہو گئیں کہ ٹماٹروں کی بسیار خوری کی وجہ سے انھیں سرجری بھی کروانی پڑی۔ گاجر اور ٹماٹر کے سلسلے میں جو تسامح انھیں ہوا وہ ان کے اہل و عیال کے لیے کافی مہنگا ثابت ہوا۔ بچوں کی تعلیم تو جاری رہی لیکن ٹیوشن کا جو عام قاعدہ ہے بچے اس قاعدے اور اس کے فائدے سے مستفید نہیں ہو سکے۔

حیاتین حاصل کرنے کے لیے لوگ طرح طرح کی حرکتیں کرتے ہیں۔ کچھ لوگ دن میں دو مرتبہ چھاچھ ضرور پیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کی صحت بن رہی ہے۔ اس قسم کے خیالات عام ہیں (یہ [illegible] تعریف میں آتے ہیں) چھاچھ کا لفظ ہی صحت کے لیے کتنا مضرت رساں ہے۔ چھاچھ کے پرستاروں کا خیال ہے کہ اس کے استعمال سے ہاضمہ اچھا رہتا ہے۔ ہاضمے کے لیے سب سے آسان ترکیب یہ ہے کہ کھانا شرافت کے ساتھ کھایا جائے۔ کچھ لوگ

اپنے گھر میں بھی کھانا اس فراغ ذہنی اور وسیع الخیالی کے ساتھ کھاتے ہیں جیسے کسی دوسرے کے یہاں دعوت کھا رہے ہوں۔ پھر اس پر چھاچھ بھی پیتے ہیں۔ چھاچھ کے لیے جگہ رہی کہاں۔ حیاتین کے شوق میں جگہ بنائی جاتی ہے۔

حیاتین کی شوق میں کئی باتیں مشہور ہو گئی ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آدمی کو اپنی صحت کی بقا کے لیے امرود تو کھانا ہی چاہیے لیکن سالم امرود کھانا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں امرود میں ایک مخصوص بیج ہوتا ہے جو درازیٔ عمر کا باعث ہوتا ہے اس لیے وہ اپنے امرود مسلم میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتے۔ چلیے مان لیا کہ ہر امرود میں ایک مخصوص بیج دافع بلیّات اور نافع صحت ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ جو بھی امرود کھلایا جائے وہ پیمائش میں خربوزے سے کم نہ ہو۔ فالسے کے شربت کے بارے میں بھی اسی قسم کی باتیں مشہور ہیں اور ایک فالسے کا شربت تیار کرنے کے لیے خواتین اپنی پوری دوپہر ضائع کر دیتی ہیں۔ شوہر یہ شربت پی کر بھی بدلتے نہیں یا اتنے بدل جاتے ہیں کہ بیوی کو اپنے میکے سے کسی کو بلانا پڑتا ہے۔ بعض صورتوں میں حیاتین کے نتائج اچھے نہیں ہوتے۔

حیاتین اب صرف غذا کی حد تک محدود نہیں رہے۔ آدمی کو تندرست و توانا بنانے اور اس کے اندر ولولہ اور جوش پیدا کرنے کے لیے کچھ ایسے مشاغل بھی ایجاد کیے گئے ہیں جو وٹامن سے بھرپور ہیں۔ ان میں سے ایک دلچسپ مشغلہ انتخابات ہے۔ گو کہ یہ مشغلہ صرف بالغوں کے لیے ہوتا ہے لیکن اس سے بچے بھی محظوظ ہوتے ہیں اور تھوڑا بہت ولولہ ان میں بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ولولہ ان کے مستقبل کے لیے کارآمد ہوتا ہے۔ جن ملکوں میں غریبی زیادہ ہوتی ہے وہاں اسی حساب سے انتخابات بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر انتخابات نہ ہوں تو غربت یا فتہ لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ سرکار انھیں بھول گئی ہے۔ انتخابات میں ملک کے ہر فرد کو جو سنِ بلوغ کو پہنچ چکا ہو ووٹ دینے کا حق ہوتا ہے۔ وہ فلمیں جو خاص طور پر بالغوں کے لیے بڑی دیدہ ریزی اور محنت سے بنائی جاتی ہیں۔ وہ نابالغ بھی دیکھ سکتے ہیں لیکن انتخابات میں ووٹ دینے والے لڑکے اور لڑکی کی عمر کی کڑی جانچ کی جاتی ہے۔ اس کے پورے احوال سے واقف ہونے کے بعد ہی اسے امیدواروں کے نام کی فہرست دی جاتی ہے۔ فہرست کیوں کہیے یہ اچھا خاصہ کتابچہ ہوتا ہے۔ انتخابات میں ایسے ہی نوجوان ووٹر زیادہ حصہ لیتے ہیں۔ ان کے والدین پولنگ بوتھ پر نہیں جاتے۔ (صبح سویرے ہی تو وہ پولنگ بوتھ پر گئے تھے کیا دن بھر وہ اس بوتھ سے اس بوتھ پر حاضری دیتے رہیں گے۔)

انتخابات کا قریبی تعلق امیدواروں سے تو ہوتا ہی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ قریبی اور قلبی تعلق فسادات سے ہوتا ہے (قلبی تعلق اس لیے ہوتا ہے کہ فساد عام طور پر قلب شہر ہی میں منعقد ہوتے ہیں۔ پولیس چوکی کے قریب و جوار میں) اگر کسی انتخاب میں دو چار امیدوار انتخاب سے پہلے اللہ کو پیارے نہ کر دیے جائیں تو شبہ ہونے لگتا ہے کہ ملک میں حب الوطنی کے جذبے کا فقدان تو نہیں ہو گیا۔ یہ تو شخصی اور نجی فساد ہوا لیکن صرف دو چار امیدواروں کے جاں بحق ہو جانے سے انتخابات پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ جاتے کچھ لسانی، کچھ علاقائی اور اگر ممکن ہو تو کچھ فرقہ وارانہ فسادات کا بھی اہتمام کیا جانا چاہیے۔ اصل ولولہ اور جوش تو انہی فسادات سے پیدا ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ انتخابات اعلیٰ سطح پر ہو رہے ہیں۔ فسادات میں قومی یک جہتی کا مظاہرہ زیادہ ہوتا ہے۔ ملک کی پوری بالغ آبادی اس معاملے میں متفق الخیال اور متحد العمل نظر آتی ہے۔ سعادت مند ادلادیں آگے چل کر اس سے بھی زیادہ جوہر دکھائیں گی۔ مستقبل کتنا روشن ہے۔

انتخابات میں آزاد امیدوار بھی جی کھول کر حصہ لے سکتے ہیں۔ آزاد امیدواروں کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ اُن کی رائے ان کی اپنی رائے ہوتی ہے اور اس پر کسی کے ہاتھ کی چھاپ نہیں ہوتی۔ انھیں امیدوار بننے کے لیے گھر کے باہر کے کسی آدمی سے اجازت لینی نہیں پڑتی۔ جس کسی کا بھی دل چاہے کھڑے رہ کر اپنی ضمانت ضبط کروا سکتا ہے۔ نظم و ضبط اسی طرح برقرار رہتا ہے۔ الیکشن میں لوگ پہلے بڑی مشکل سے کھڑے ہوتے تھے۔ انھیں باضابطہ منانا پڑتا تھا اور امیدواروں کا وہ کال تھا کہ اکثر امیدوار تو الیکشن شروع ہونے سے پہلے ہی منتخب ہو جاتے تھے۔ بلا مقابلہ منتخب ہونے والے امیدوار کو لوگ پہلے تعجب کی اور اس کے بعد عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بعض امیدوار تین تین جگہوں سے کھڑے ہوتے تھے اور تینوں جگہ ان کا نتیجہ ایک ہی رہتا تھا۔

جیسے جیسے انتخابات کی رفتار اور تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ملک کے امن و امان میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ جدھر دیکھو چین کی بنسی بجتی سنائی اور دکھائی دینے لگتی ہے۔ اب تو یہ چین کی بنسیاں باہر سے درآمد کی جانے لگی ہیں۔ انتخابات کے بعد جب حساب کتاب کیا جاتا ہے تو سرکار بہت خوش ہوتی ہے۔ انتخابات پر صرف کی ہوئی رقم کی پابجائی ہونے کے بعد بھی کچھ رقم بچ جاتی ہے۔ یہ رقم ضبط شدہ ضمانتوں کی ہوتی ہے۔ بعض مدبرین کا خیال ہے کہ الیکشن روپے کے بل پر بھی جیتے جا سکتے ہیں کیوں کہ روپے میں طاقت ہوتی ہے۔ یہ غلط ہے کیوں کہ طاقت صرف طاقت میں ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ طاقت کے استعمال کے بعد بھی جو سرکار بنتی ہے طاقت ور نہیں ہوتی۔

ایک زمانہ تھا جب چھ چھ سال تک انتخابات کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ یہ بڑا طویل وقفہ تھا۔ حیاتین کی کمی وجہ سے سرکار اور عوام دونوں کی صحت متاثر ہونے لگی۔ چہرے اُتر گئے۔ یہ بہت بری بات تھی۔ جس ملک میں بھی لوگوں کا چہرہ اتر جاتا ہے وہاں سیاح نہیں آتے۔ خود سیاحوں کے چہرے کتنے ہی اترے ہوئے کیوں نہ ہوں لیکن وہ لوگ زرِ کثیر خرچ کر کے دور دراز ملکوں کی سیاحت اسی لیے کرتے ہیں کہ تر و تازہ چہرے دیکھ سکیں۔ سیاحوں کی دلجوئی کی خاطر بھی انتخابات ضروری مانے گئے ہیں۔ انتخابات کے حیاتین سے منتخب شدہ امیدوار کا رئیس بننا ضروری ہے۔ یہ ایک قدرتی عمل ہوتا ہے امیدوار کی مرضی کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ برستی بارش میں سبھی بھیگتے ہیں۔ اس بارش سے بچنے کی چھتری ابھی بنی نہیں ہے۔

جو لوگ اس وٹامن سے پوری پوری طرح فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ صرف ایک "ز" پہ نہیں رُک جاتے۔ اس برستی بارش کے علاوہ بھی تو دو "ز" اور ہیں۔ ان میں سے ایک خفیہ ہوتی ہے اور ایک خفتہ۔

ترکاریوں اور پھلوں کے حیاتین پرانے ہو گئے۔ آدمی عقل سے کام لیتا رہے گا تو نئے نئے حیاتین ہمیشہ مہیا ہوتے رہیں گے۔ آسمان کے لیے نئے ستارے بھی اسی طرح بنتے ہیں ●●

ضمیریات

ضمیر جعفری
(پاکستان)

سب لوگوں سے یاری کیا — اِتنی دُنیا داری کیا
مسجد کے منبر پر بھی — شیخ لگے درباری کیا
اب تک کسی الیکشن میں — جیتا کوئی 'ہاری' کیا
آنکھوں میں تو شرم نہیں — سر پہ آنچل بھاری کیا
حقّے اور پگڑی کے بغیر — خالی نمبرداری کیا
سب ہیں طبعاً حسن پرست — نوری کیا اور ناری کیا
"جمبو جیٹ" کی قوم کے ساتھ — اپنی گدھا سواری کیا
جس میں کوئی کتاب نہیں — صندل کی الماری کیا
اُس کی تلخ کلامی میں — دیکھ اِسے خوش رفتاری کیا
کٹ گئیں مہمل باتوں میں — راتیں پیاری پیاری کیا

ایک ادائے فرض ضمیر
ورنہ بات ہماری کیا

خیالات کا چانڈو خانہ

خیال و خواب کی دُنیا بھی کیا سہانی ہے
بپھرتا پھیلتا اک سیلِ سرگرانی ہے
زمانِ پیری میں ہیجانِ نوجوانی ہے
جہاز کوئی نہیں ہے جہاز رانی ہے

اُستاد

خشک ہے برگِ شاخ کی صورت
وہ جو ہر گام لڑکھڑاتے ہیں
نیم مردہ سے جی رہے ہیں جو
ایک اسکول میں پڑھاتے ہیں

مشتاق احمد یوسفی

پانچویں قسط

اسکول ماسٹر کا خواب

بشارت ہیر کٹنگ سیلون :

میونسپل کارپوریشن والا عقدہ بھی بالآخر کھل گیا۔ ان دنوں بشارت اپنی دکان میں سڑک کے رُخ کچھ تبدیلیاں اور اضافے کرنا چاہتے تھے۔ نقشہ پاس کرانے کے سلسلے میں میونسپل کارپوریشن جانے کی ضرورت پیش آئی، مگر کوچوان کا کچھ پتہ نہ تھا۔ تھک ہار کر وہ تین بجے رکشا میں بیٹھ میونسپل کارپوریشن چل دیئے۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ فٹ پاتھ پر مرزا وحید الزماں بیگ کوچوان پھٹی دری کا ٹکڑا بچھائے ایک شخص کی حجامت بنا رہا ہے۔ وہ اوٹ میں کھڑے ہو کر دیکھنے لگے۔ حجامت کے بعد اس نے اپنی کلائی پر لگی ہوئی صابن اور شیو کی قاشیں استرے سے صاف کیں اور اسے چمڑے اور اپنی کلائی پر تیز کیا۔ پھر گھٹنوں کے بل نیم قد کھڑے ہو کر بغلیں لیں۔ انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ لیکن "اوزاروں" کی جانی پہچانی پیٹی سے پھٹکری کا ڈلا اور تبت ٹیلکم پاؤڈر نکالتے دیکھا تو اپنی بینائی پر اعتماد بحال ہو گیا۔ اب جو غور سے دیکھا تو دری کے کنارے پر گتے کا ایک سائن بورڈ بھی نظر آیا جس پر نہایت خوش خط اور جلی حروف میں لکھا تھا:

بشارت ہیر کٹنگ سیلون
ہیڈ آفس
ہرچند رائے روڈ

بیچ بازار میں اسے بے آبرو کرنا مناسب نہ سمجھا۔ غصے میں بھرے، رکشا لے کر دکان واپس آ گئے۔

اس روز وہ اسکول سے بچوں کو لے کر سات بجے شام گھر لوٹا۔ بشارت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس کے ہاتھ سے چابک چھین کر دھمکی آمیز انداز میں لہراتے ہوئے بولے "سچ سچ بتا۔ ورنہ ابھی چمڑی ادھیڑ دوں گا۔ حرام خور! تم نائی ہو! پہلے کیوں نہیں بتایا؟ ہر بات میں جھوٹ۔ بات بے بات جھوٹ۔ آج دیکھتا ہوں کیسے جھوٹ بولتا ہے۔ سچ سچ بتا کہاں تھا؟" وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور تھر تھر کانپتے ہوئے کہنے لگا "قصور معاف! سرکار سچ ملتے ہیں۔ آج سے، قسم وحدہ لاشریک کی، ہمیشہ سچ بولوں گا۔"

چنانچہ اس کے بعد زندگی میں اس کی جتنی بھی خواری ہوئی، وہ سب سچ بولنے کے سبب [illegible]

کر سچ بول کر ذلیل و خوار ہونے کی بہ نسبت جھوٹ بول کر ذلیل و خوار ہونا بہتر ہے۔ آدمی کو کم از کم صبر تو آجاتا ہے کہ کس بات کی سزا مل رہی ہے۔

بشارت کی جرح پر پہلا سچ جو اس نے بولا وہ یہ تھا کہ میونسپل کارپوریشن کے بندھے ہوئے گاہکوں کو نمٹا کر میں ساڑھے چار بجے برنس روڈ پر ختنے کرنے گیا۔ ختنے کے "براتیوں" کو جمع ہونے میں خاصی دیر ہوگئی۔ پھر لونڈا کسی طرح راضی نہیں ہوتا تھا۔ اکلوتا لاڈلا ہے۔ آٹھ سال کا دھینگڑا۔ اس کے دادا حاجی مقصود الہٰی پنجابی سوداگران دلّی نے بہتیرا بہلایا پھسلایا کہ بیٹا! مسلمان ڈرا نہیں کرتے۔ ذرا تکلیف نہیں ہوگی۔ مگر لونڈا بضد تھا کہ پہلے آپ! آپ کے تو ڈاڑھی بھی ہے۔

بشارت کا چہرہ غصے سے سُرخ ہوگیا۔

ایک اور سچ بزور چابک اس سے یہ بلوایا گیا کہ اس کا اصل نام بدّھن ہے۔ اس کے میٹرک پاس بیٹے کو اس کے نام اور کام دونوں پر سخت اعتراض تھا۔ بار بار خودکشی کی دھمکی دیتا تھا۔ اس نے بہتیرا سمجھایا کہ بیٹا! بزرگوں کے نام ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ نام میں کیا دھرا ہے۔ جھنجھلا کے بولا "ابا جی! یہ بات تو شیخ پیر (شکسپیئر) نے کہی تھی۔ پر اس کے باپ کا نام بدّھن تھوڑا ہی تھا۔ وہ کیا جانے۔ تم اور کچھ نہیں بدل سکتے تو کم از کم نام تو بدل لو"۔ چنانچہ جب کچھ دن اس نے ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی میں چپراسی کی ملازمت کی تو اپنا نام مرزا وحید الزماں بیگ لکھوا دیا۔ بس اسی زمانے سے چلا آرہا تھا۔ دراصل یہ اس افسر کا نام تھا جس کی وہ بیس سال پہلے حجامت بنایا کرتا تھا۔ وہ لاولد مرا۔ رشوت سے بنائی ہوئی جائداد پر بھتیجوں بھانجوں نے اور نام پر اب اس نے قبضہ کرلیا۔

اب جو کم بخت سچ بولنے پہ آیا تو بولتا ہی چلا گیا۔ مرزا عبدالودود بیگ کا قول ہے کہ فی زمانہ سَو فیصد سچ بول کر زندگی کرنا ایسا ہی ہے جیسے بجری ملائے بغیر صرف سیمنٹ سے مکان بنانا۔ کہنے لگا "قصور معاف! اب میں سارا سچ ایک ہی قسط میں بول دینا چاہتا ہوں۔ میرا خاندان غیرت دار ہے۔ اللہ کا شکر ہے، میں ذات کا سائیس نہیں۔ سو سال سے بزرگوں کا پیشہ حجامی ہے۔ ماشاءاللہ سے دس بارہ کھانے والے ہیں۔ سرکار کے علم میں ہے کہ ایک گھوڑے پہ جتنا خرچ آتا ہے، اس کی آدھی تنخواہ مجھے ملتی ہے۔ ستّر روپے سے کس کس کی ناک میں دھونی دوں۔ ہار جھک مار کر یہ پرائیویٹ پریکٹس کرنی پڑتی ہے۔ برسوں اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کے بڑے لڑکے کو میٹرک کردیا۔ علیم الدین صاحب کے بال بیس برس سے کاٹ رہا ہوں۔ سر پہ تو اب کچھ رہا نہیں۔ بس بھویں بنوا لیتا ہوں۔ سرکار! اس فن کے قدردان سب اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اب تو بابر (باربر) اس طرح بال اتارتے ہیں گویا کہ بھیڑ کو مونڈ رہے ہیں۔ میری نظر موٹی ہوگئی ہے، مگر آج بھی پیر کے انگوٹھے کے ناخن نہرنی رو کے بغیر ایک دفعہ میں تراش لیتا ہوں۔ تو علیم الدین صاحب کے ہاتھ پیر جوڑ کے لونڈے کو مسلم کمرشل بینک میں کلرک لگوا دیا۔ اب وہ کہتا ہے مجھے تمہارے نائی ہونے سے شرم آتی ہے۔ پیشہ بدلو۔ سرکار! میرے باپ دادا نائی تھے، تو اب نہیں۔ محنت مشقت سے حق حلال کی روٹی کماتا ہوں۔ پر صاحب جی، میں نے دیکھا ہے کہ جن کاموں میں محنت زیادہ پڑتی ہے، لوگ انھیں نیچ اور ذلیل سمجھتے ہیں۔ بیٹا کہتا ہے کہ میرے ساتھ کے سب لڑکے اکاؤنٹنٹ ہوگئے۔ تجوری کی چابیاں بجاتے پھرتے ہیں۔ فقط ولدیت کی وجہ سے میری ترقی رکی ہوئی ہے۔ اگر تم نے نائی کا دھندا نہیں چھوڑا تو تمہارے ہی استرے سے اپنا گلا کاٹ لوں گا۔ کبھی کبھی اپنی ماں کو ڈرانے کے لیے کلائی لگے نرخرے سے

ایسی آوازیں نکالنے لگا جیسے بکرا ذبح ہو رہا ہو۔ وہ نیک بخت مجھے خدا رسولؐ کے واسطے دینے لگی۔ مجبور ہو کے میں نے کوچوانی شروع کر دی۔ یہ پرائیویٹ پریکٹس اس سے لُک چھُپ کے کرتا ہوں۔ اس کی بے عزتی کے ڈر سے پیٹی، اوزار، کِسبت وغیرہ کبھی گھر نہیں لے جاتا۔ یقین جانیئے، اسی وجہ سے اپنے ہیر ڈریسنگ سیلون کے سائن بورڈ پہ حضور کا نام پتہ لکھوا دیا۔ بڑی برکت ہے آپ کے نام میں۔ قصور معاف!"

الہ دین بے چراغ :

وہ ہاتھ جوڑ کر زمین پر بیٹھ گیا اور پھر ہل ہل کے ان کے گھٹنے دبانے لگا۔ جیسے ہی وہ پسیجے، اس نے ایک اور سچ بولا۔ کہنے لگا کہ سرکار کے چہرے پر روزانہ صبح کٹ دیکھ کر اس کا دل خون ہو جاتا ہے۔ دیسی بلیڈ بال کم اور کھال زیادہ اتارتا ہے۔ کھونٹیاں رہ جاتی ہیں۔ قصور معاف! قلمیں بھی اونچی نیچی۔ جیسے لونج کے بیس منٹ ہوئے ہوں۔ اس نے درخواست کی کہ اسے گھوڑے کا کھریرا کرنے سے پہلے ان کا شیو بنانے کی اجازت دی جائے۔ مزید خدمات یہ کہ بچوں کے بال کاٹے گا۔ بہاری کباب، بھنیا بریانی، مرغ کا قورمہ اور شاہی ٹکڑے لاجواب بناتا ہے۔ اور دیگ کا حلیم اور ڈھبرلوں* کی فرنی ایسی کہ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں۔ سو ڈیڑھ سو آدمیوں کی دعوت کے لیے تین گھنٹے میں پلاؤ زردہ بنا سکتا ہے۔ بشارت چٹور سے آدمی ٹھہرے۔ یوں بھی انگریزی محاورے کے مطابق، مرد کے دل تک پہنچنے کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔ کارل مارکس بھی یہی کہتا ہے۔

ہر رہ جو اِدھر کو جاتی ہے معدے سے گزر کر جاتی ہے

انھیں یہ حجام اچھا لگنے لگا۔

اس نے یہ بھی کہا کہ گھوڑے کے کھریرے کے بعد وہ ان کے والد کے پیر دبائے گا۔ اور رات کو ان (بشارت) کا مساج کرے گا۔ گردن کے پیچھے جہاں سے ریڑھ کی ہڈی شروع ہوتی ہے، ایک رگ ایسی ہے کہ نرم گرم انگلیوں سے ہولے ہولے دبائی جائے تو سارے جسم کی تھکن اتر جاتی ہے۔ یہ آنکھ کو نظر نہیں آتی۔ اس کے استاد مرحوم اللہ بخش میاں کہا کرتے تھے کہ مالشیا اپنی انگلی کی پور سے دیکھتا ہے۔ یہی اس کی دوربین ہے جو چھوتے ہی بتا دیتی ہے کہ درد کہاں ہے۔ پھر اس نے بشارت کو لالچ دیا کہ جب وہ روغن بادام سے سر کی مالش کرے گا۔ اور انگوٹھے سے ہولے ہولے کنپٹیاں دبانے کے بعد، دونوں ہاتھوں کو سر پر پرندے کے بازوؤں کی طرح پھڑ پھڑائے گا تو یوں محسوس ہوگا جیسے بادلوں سے نیند کی پریاں پرے باندھے روئی کے پہل در پہل گالوں پہ ہولے ہولے اُتر رہی ہیں۔ ہولے ہولے ہولے ہولے۔

بشارت دن بھر کے تھکے ہارے تھے۔ اس کی باتوں ہی سے آنکھیں آپ ہی آپ بند ہونے لگیں۔

اور آخری ناک آؤٹ وار اس ظالم نے یہ کیا کہ "ماشاء اللہ سے ننھے میاں تین مہینے کے ہونے کو آئے ختنے جتنی کم عمری میں ہو جائیں، وِتّا ہی جلدی کھرنڈ آئے گا!"

---

* ڈھبری و مٹی کی چھوٹی پیالی جس میں فرنی جمائی جاتی ہے۔ فرنی سے کورے برتن کی سوندھی لپٹ آتی ہے جو خوبی سمجھی جاتی ہے!

اب تو چہرے سا گلاب کھل اٹھا۔ بولے بھئی خلیفہ جی! تم نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ لاں حد کردی! تم تو چھپے رستم نکلے!"

تیس پر اس نے جیب سے وہ نقل نکال کر دکھائی جو اسے رستم کا گھوڑا بننے پر انعام میں ملی تھی۔

مرزا وحید الزماں بیگ اس دن سے خلیفہ کہلائے جانے لگے۔ ویسے یہ الہ دین جیسا تھا۔ کام کم، ڈینگیں بہت مارتا تھا۔ مرزا عبدالودود بیگ اسے الہ دین بے چراغ کہتے تھے۔ بزرگوار نے اس کو الہ دین کے بجائے خلیفہ کہنا اس شرط پر منظور کیا کہ آئندہ اس کی جگہ کوئی اور کوچوان یا ملازم رکھا جائے گا تو اسے بھی خلیفہ ہی کہیں گے۔

گھوڑے کے آگے بین :

رفتہ رفتہ مولانا، خلیفہ، گھوڑا اور بزرگوار ـــ بہ اعتبار اہمیت، اسی ترتیب سے خاندان کے فرد گردانے گئے اور یہ ادغام و اختلاط اتنا مکمل تھا کہ گھوڑے کی لنگڑی ٹانگ بھی کنبے کا اٹوٹ انگ بن گئی۔ گھوڑے کے طفیل گھر کے معاملات میں بزرگوار کا دوبارہ عمل دخل ہوگیا۔ عمل دخل ہم نے محاورۃً کہہ دیا، ورنہ سراسر دخل ہی دخل تھا۔ ایک عمر ایسی آتی ہے جب انسان دوسروں کے کاموں میں دخل دینے ہی کو اپنا عمل شمار کرنے لگتا ہے۔ بعض لوگ تو ساری عمر اوروں کی خطائیں گننے اور ان کی حماقتوں کی اصلاح یعنی دخل در نامعقولات میں گزار دیتے ہیں۔ اپنے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

محشر میں گئے شیخ تو اعمال ندارد
جس مال کے تاجر تھے وہی مال ندارد

سب گھر والے فرداً فرداً بلبن کو چمکارتے، تھپتھپاتے۔ دانہ چارا تو غالباً اب بھی اتنا ہی کھاتا ہوگا۔ پیار کی نظر سے اس کی ایال اور جلد ایسی چمکیلی اور چکنی ہوگئی کہ نگاہیں اور مکھیاں پھسلیں۔ بچے چھپ چھپ کر اسے اپنے حصے کی مٹھائی کھلانے آتے اور اسی کی طرح کان ہلانے کی کوشش کرتے۔ کچھ بچے اب فٹ بال کو آگے کک کرنے کی بجائے ایڑی سے دولتی مار کر پیچھے کی طرف گول کرنے لگے تھے۔ بیت بازی کے مقابلے میں جب کسی لڑکے کا گولہ بارود ختم ہوجاتا یا کوئی غلط شعر پڑھ دیتا تو مخالف ٹیم اور سامعین ہِن ہِن کر ہنہناتے۔ خود بزرگوار کوئی اچھی خبر سنتے یا سورج کے سامنے بادل کا کوئی اُودا ٹکڑا آجاتا تو فوراً گھوڑے کو ہارمونیم سنانے بیٹھ جاتے۔ اکثر فرماتے کہ جب واقعی اچھا بجاتا ہوں تو یہ بے اختیار اپنی دُم چنور کی طرح ہلانے لگتا ہے۔ ہمیں ان کے دعوے کی صداقت میں نہ جب شبہ تھا، نہ اب ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ انھوں نے یہ کبھی غور نہیں فرمایا کہ گھوڑا ان کے کمالِ فن کی داد کس عضو سے دے رہا ہے!

بلبن بزرگوار کا کھلونا، اولاد کا نعم البدل، مونس تنہائی، آنسوؤں سے بھیگا تکیہ ـــ سبھی کچھ تھا۔ اس کے آنے سے پہلے وہ تمام وقت اپنی زنگ خوردہ چُول پرانے گھڑ کواڑ کی طرح کراہتے رہتے، خواہ درد ہو یا نہ ہو۔ اگر ان کے سامنے کوئی دوسرا بوجھ اٹھاتا تو منہ سے ایسی آوازیں نکالتے گویا خود بھی بوجھوں مر رہے ہیں۔ کوئی پوچھتا طبیعت کیسی ہے تو جواب میں دائیں بائیں آسمان کی طرف اٹھا کر نفی میں ڈگڈگی کی طرح ہلاتے اور دو تین منٹ تک سر بدل بدل کر کھانستے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنی بیماری کو "انجوائے" کرنے لگے ہیں۔ بعض کہنہ مشق مریض یہ تسلیم کرنے میں اپنے مرتبۂ علالت کی توہین سمجھتے ہیں کہ اب تکلیف میں افاقہ ہے۔ بزرگوار بڑی زبردست قوتِ ارادی

کے مالک تھے۔ اگر کبھی مرض دور ہو جاتا تو محض اپنی قوتِ ارادی کے زور سے دوبارہ پیدا کر لیتے۔ آپ نے انھیں نہیں دیکھا، مگر اِن جیسے دائم المرض بزرگ ضرور دیکھے ہوں گے۔ جو اپنی پالی پوسی بیماریوں کا حال اس طرح سناتے ہیں جیسے ننادے پر آوٹ ہونے والا بیٹسمین اپنی اَدھوری سینچری اور دیہات کی عورتیں اپنی زچگیوں کے قصّے سناتی ہیں مطلب یہ کہ ہر دفعہ نئی کمنٹری اور نئے پچھتاوے کے ساتھ۔ بلبن کے آنے سے پہلے طبیعت بے حد چڑچڑی رہنے لگی تھی۔ لوگ عیادت سے احتراز کرنے لگے۔ سب نے ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ کسی کی جرأت نہیں تھی کہ ان کے لطفِ علالت میں مخل ہو۔

لیکن اب طبیعت میں نہ صرف اعتدال بلکہ انشراح پیدا ہو چکا تھا۔ ہر ایک کو اپنے امراض کی تازہ ترین کیفیت سے آگاہی بخشتے۔ ذات الجنب، وجع المفاصل اور احتباسِ بول کی تفصیلات بتاتے۔ پیٹ پر ہاتھ پھیر پھیر کر نفخ اور آنتوں کی قراقر کا حال، متعلقہ صوتی اثرات کے ساتھ سناتے۔ رات کو خواب میں جن جن محلے والوں کو مردہ حالت میں دیکھا تھا، ان کے نام گنواتے اور باز آنے اور بکرے کا صدقہ دینے کی تلقین کرتے۔ کبھی فرماتے کہ تین دن سے بلغم میں اس قدر لزوجت ہے کہ سر کو دس بارہ دفعہ زور زور سے جھٹکے دوں تب کہیں ٹوٹ کر اُگالدان میں گرتا ہے۔ ان دنوں بہار کالونی میں جاہل سے جاہل شخص کو ــــ حتیٰ کہ مہترانی اور پروفیسر عبدالقدوس کو بھی ــــ لزوجت* کے معنی مع مثال معلوم ہو گئے تھے۔ مرزا کہتے تھے کہ قبلہ کے امراض کے جراثیم عربی بولتے ہیں انگریزی دواؤں کے قابو میں نہیں آنے کے۔

نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں سے ملیں:

ان کے ایک پرانے وضع دار دوست فدا حسین خان تائب جمعہ کے جمعہ مزاج پرسی کو آتے تھے۔ کسی زمانے میں بڑے یار باش اور رنگین مزاج ہوا کرتے تھے۔ چوری چھپے پیتے بھی تھے، مگر مفت کی۔ گناہ سمجھ کر چوری چھپے پینے میں فائدہ یہ ہے کہ ایک پیگ میں سو بوتلوں کا نشہ چڑھ جاتا ہے۔ لیکن ایک عجیب منحوس عادت تھی۔ جب بہت زیادہ چڑھ جاتی تو سب موضوعات چھوڑ کر صرف اسلام پر گفتگو فرماتے۔ اس پر تین چار مرتبہ شرابی ان سے پٹ بھی چکے تھے۔ وہ کہتے تھے ہمارا نشہ خراب کرتے ہو۔ لیکن شیخ حمید الدین جن کے ساتھ تائب پیتے اور یاروں کو پلاتے تھے۔ عمدہ وہسکی، چیکوسلواکیا کے کرسٹل گلاس، نیز مرچوں کی بھنی کلیجی اور کباب، ریاض خیرآبادی کے

---

* لزوجت: پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے، بی ٹی کے شعور و لاشعور میں یہ لفظ ایسا بیٹھا کہ کئی سال بعد اسے تھیسس کا موضوع بنایا۔ ملٹن، جوش، ابوالکلام آزاد، علامہ مشرقی، آغا حشر کاشمیری، عبدالعزیز خالد، اور مشتاق احمد یوسفی کے یہاں لزوجت کا عنصر"۔ ان مشاہیر کو ہمارے ساتھ بریکٹ کرنے میں پروفیسر موصوف کا منشا ہماری توقیر بڑھانا ہرگز نہیں تھا۔ غزالوں کو اس عاجز کے ساتھ three-legged race میں نتھی کر کے انھیں رگیدنا اور ہمیں کھدیڑنا مقصود تھا۔ سنا ہے اس تھیسس کی آؤٹ لائن کو پروفیسروں نے اس بنا پر رد کر دیا کہ ایک پتھر سے اتنی ساری چڑیاں نہیں ماری جا سکتیں! اب انھیں کون سمجھاتا کہ پروفیسر قاضی عبدالقدوس تیر، تفنگ اور پتھر کے محتاج نہیں۔

کیوں وہ صیاد کسی صید پہ توسن ڈالے
صید جب خود ہی چلے آتے ہوں گردن ڈالے

اشعار ـــــ اور ایک تولیے سے مے نوشی کا آغاز ہوتا۔ تائب کو جیسے ہی چڑھتی، اپنی پہلی بیوی کو یاد کرکر کے پھوٹ پھوٹ روتے اور تولیے سے آنسو پونچھتے جاتے۔ کبھی لمبا ناغہ ہو جاتا تو شراب پر فقط اس لیے ٹوٹ کر پڑتے کہ

اک عمر سے ہوں لذتِ گریہ سے بھی محروم

کبھی نشہ زیادہ چڑھ جاتا اور گھریا محلّے میں جاکر چاندنی رات میں مرحومہ کو یاد کرکے دھاڑیں مارتے یا غُل غپاڑا کرنے لگتے تو موجودہ بیوی اور محلّے والے مِل کر ان کے سر پر بہشتی سے ایک مشک چھڑوا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ جنوری میں ٹھنڈی برف مشک سے انھیں زکام ہو گیا جس نے بعد میں نمونیے کی شکل اختیار کرلی اس واقعہ کے بعد بیوی ان کو ترکی ٹوپی اُٹھا کر مشک چھڑواتی تھی۔

فِداحسین خان تائب :

فِداحسین خان تائب کی عمر یہی ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ لیکن تاکنے جھانکنے کا لپکا نہیں گیا تھا۔ بقول شخصے' جس نظر سے وہ پرائی بہو بیٹیوں کو دیکھتے تھے، اس نظر کے لیے ان کی اپنی بیوی ایک عمر سے ترس رہی تھی۔ تیسرے بچے کے بعد ان کی شوہرانہ توجہات میں زق آگیا تھا کہ ہمارے ہاں گرہستی محبت کے لیے بچے اسپیڈ بریکر (رفتار شکن) کا کام دیتے ہیں۔ مجمع آزاد نے ایک بیوی پر توکل نہ کیا۔ مدتوں زنانِ کمیاب کی خوش بستی میں نرودان ڈھونڈا کیے۔ جب تک بدراہ ہونے کی استطاعت رہی، "تنگنائے نکاح سے نکل نکل کر شب خون مارتے رہے۔ اِدھر بے زبان بیوی یہ کچھ کرب کچھ انگیز کرتی رہی کہ

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے میاں کے لیے

لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ موصوف نے کیا سمجھ کے تائب تخلص اختیار کیا۔ کون سا عیب ہے جو ان میں نہیں۔ آخر کس چیز سے تائب ہوئے ہیں؟ پھر یہ سوچ کر خاموش ہو جاتے کہ شاید اشارہ نیکیوں کی طرف ہو۔

جب کسی زمانے میں ایک کوآپریٹیو بینک میں ملازمت اور شاعری کرتے تھے۔ اعداد و شمار کے ساتھ بھی شاعری کرنے کی کوشش کی اور غبن کے الزام میں نکالے گئے۔ شاعری اب بھی کرتے تھے، مگر سال میں صرف ایکبار۔ پچاسویں سالگرہ کے بعد یہ وتیرہ بنالیا کہ ہر سال یکم جنوری کو اپنا قطعہ تاریخ وفات کہہ کر رکھ لیتے جو بارہ تیرہ سال سے شرمندۂ تعبیر ہونے سے محروم تھا۔ کلام میں صفائی بیان، سلاست، بندش کی چستی، خیال آفرینی اور نحوست کوٹ کوٹ کے بھری تھی۔ دورانِ سال کسی دوست یا واقف کار کا انتقال ہو جاتا تو اس کا نام کسی مصرع میں ٹھونس کر اپنا قطعہ اسے بخش دیتے۔

*Thy need is yet greater than mine**

کلام میں آمد تھی نہ آورد۔ بس مرحومین کی آمد و رفت تھی۔ بزرگوار ان کے کلام کی داد ایک عجیب انداز سے دیتے جس کی نقل اتاری جاسکتی ہے، بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں مارے باندھے کی رسمی داد مجلسی شائستگی دانستہ طنز اور بے ساختہ ہنسی کی بحصۂ غیر مساوی آمیزش ہوتی تھی۔ ہنسی ایسی کہ دور سے کوئی سُننے تو طے نہ کر سکے

---

* سر فلپ نے زٹفن کے میدانِ جنگ (۱۵۸۶) میں زخمی حالت میں اپنی موت سے ذرا دیر پہلے پانی کی چھاگل ایک دم توڑتے ہوئے سپاہی کو دیتے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے جو امر ہو گئے۔

کر ہنس رہے ہیں یا رو رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ زار و قطار ہنستے تھے۔

نام کی تبدیلی کے سبب بہت سے قطعات میں سکتہ پڑنے لگا جسے وہ ضرورتِ شعری اور تقاضائے موت کے تحت روا سمجھتے تھے۔ بعض لبِ گور دوست محض ان کے قطعہ کے خوف سے مرنے سے گریز کر رہے تھے۔ بزرگوار کو تائب صاحب کا آنا بھی ناگوار گزرنے لگا۔ ایک دن کہنے لگے، یہ منحوس کیوں منڈلاتا رہتا ہے؟ میں تو جانوں اس کی نیت مجھ پہ خراب ہو رہی ہے۔ اس سال کا قطعہ میرے سر، گویا کہ میرے سرہانے چپکنا چاہتا ہے۔ پھر بطورِ خاص وصیت فرمائی کہ اوّل تو میں ایسا ہونے نہیں دوں گا، لیکن بالفرضِ محال بالفرضِ محال فدا حسین خان تائب سے پہلے مرجاؤں۔ گو کہ میں ہرگز ایسا نہیں ہونے دوں گا ——— تو اس کا قطعہ میری پائینتی لگانا۔ جن قبروں کے کتبوں پر یہ قطعات منقش مرحومین کے ناموں اور ان کے اپنے تخلص "تائب" کے کندہ تھے، ان سے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ درحقیقت قبر میں دفن کون ہے۔ یا بقول پروفیسر قاضی عبدالقدوس انتقال اہلِ قبر کا ہوا ہے یا شاعر کا۔ بعض لوگ یہ کتبے دیکھ کر تعجب کرتے کہ ایک ہی شاعر کو بار بار کیوں درگور کیا گیا۔ لیکن جب کلام پر نگاہ کرتے تو کہتے کہ ٹھیک ہی کیا۔ کسی شاعر ہی نے کہا ہے کہ "اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد"۔ مطلب یہ کہ بہت سے شاعر ایسے ہوتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ شاعر مر جاتا ہے، مگر کلام باقی رہ جاتا ہے۔ اردو شاعری کو یہی چیز لے ڈوبی۔

محفلِ سماع خراشی:

یوں کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا کہ بزرگوار مرنے کی دھمکی نہ دیتے ہوں۔ جنرل شیر علی کی طرح قبرستان میں ایک قطعۂ زمین خرید کر اپنا پختہ مزار بنوا لیا تھا جو کافی عرصے سے غیر آباد پڑا تھا کہ قبضہ لینے سے ہنوز کتراتے تھے۔ اکثر خود پر عالمِ یاس طاری کر کے یہ شعر پڑھتے:

دیکھتے ہی دیکھتے دُنیا سے اُٹھ جاؤں گا میں
دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دُنیا مجھے

شعر میں اپنی چٹ پٹ موت پر زبان کا کھیل دکھایا گیا ہے۔ "تذکیر و تانیث کی اُلٹ پلٹ سے، یعنی دیکھتے کا دیکھتے اور دیکھتی کی دیکھتی سے بیک وقت نزاکتِ زبان و تنوع اور لذتِ تجنیس دکھانی مقصود ہے۔ اس سے تو بقول مرزا عبدالودود بیگ یہی پتہ چلتا ہے کہ بزرگوار کی موت زبان کے چٹخارے سے واقع ہوئی۔ گویا زبان سے اپنی قبر کھودی۔ تاہم حق مغفرت کرے، عجب پابندِ محاورہ و روزمرّہ مرد تھا۔

جس دن سے گھوڑا بزرگوار کی محفلِ سماع خراشی میں شریک ہونے لگا، انھوں نے اپنی کمخواب کی اچکن ادھر موڑ کر ہارمونیم کا غلاف بنوا لیا۔ خلیفہ دھونکنی سنبھالتا اور وہ کانپتی لرزتی انگلیوں سے ہارمونیم بجانے لگتے۔ کبھی بہت جوش میں آتے تو منہ سے بے اختیار گانے کے بول نکل جاتے۔ یہ فیصلہ کرنا ذرا مشکل تھا کہ ان کی آواز زیادہ کپکپاتی ہے یا انگلیاں۔ جیسے ہی انترا سانس جھکولے کھانے لگتا ان کے پڑوسی چودھری کرم الٰہی، ریٹائرڈ ایکسائز انسپکٹر ٹہلتے ہوئے نکلتے۔ عرصہ ہوا گلاکوما (کالا پانی) سے ان کی دونوں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی۔ انھوں نے بطورِ خاص گجرات سے ایک گھڑا منگوا کر اس کی شوخ شنگرفی زمین پر ہالہ (سندھ) ٹائلز کے نقوش پینٹ کروائے تھے۔ کہتے تھے، اوروں کو تو ظرف آتا ہے۔ وہ جب اپنی آستین چڑھا کر چوڑی کلائی پر چنبیلی کا گجرا لپیٹے گھڑے پر سنگت کرتے تو سماں باندھ دیتے۔

وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جب سے آنکھیں گئی ہیں، مالک نے مجھ پر سُر سنگیت اور سُگندھ کے ان گنت بھید کھول دیے ہیں. گت ہو چکتی اور راگ خوشبوؤں کے سارے میں رچ بس جاتا تو بزرگوار فرماتے "واہ وا! چوئی صاحب! بھئی خوب بجاتے ہو" اور چودھری صاحب اپنی بے نور آنکھیں وفورِ کیف سے بند کرتے ہوئے کہتے "لو جی! تسی دی اج بڑا کمال کیتا اے" اور یہ واقعی کمالِ فن نہیں تو اور کیا تھا کہ دونوں معذور بزرگ جب جھوم جھوم کے اپنے ساز پر بیک وقت اپنے اپنے راگ یعنی راگ درباری اور تین تال میں ماہیا کی دُھن بجا کر ایک دوسرے کی سنگت کرتے تو یہ کہنا بہت دشوار تھا کہ کون کس کا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں!

بزرگوار اپنی مفلوج ٹانگ کی پوزیشن چودھری کرم الٰہی سے بدلواتے ہوئے اکثر کہتے کہ جوانی میں ایسا ہارمونیم بجاتا تھا کہ اچھے اچھے ہارمونیم ماسٹر کان پکڑتے تھے۔ ان کا یہ شوق اس دور کی یادگار تھا جب وہ بمبئی سے آئی ہوئی تھیٹریکل کمپنی کا ایک ہی کھیل ایک مہینے تک روزانہ دیکھتے اور بقیہ گیارہ مہینے اس کے ڈائلاگ بولتے پھرتے۔ ۱۹۲۵ء سے وہ ہر کھیل آرکسٹرا کے PIT میں بیٹھ کر دیکھنے لگے تھے جو اس زمانے میں شوقینی اور رئیسانہ ٹھاٹ کی انتہا سمجھی جاتی تھی۔ ہارمونیم ایک کمپنی کے ریٹائرڈ ہارمونیم بجانے والے سے سیکھا تھا جو میٹھو ماسٹر کہلاتا تھا۔ فرماتے تھے کہ پوروں کے جوڑوں اور انگلیوں کے رگ پٹھوں کو نرم اور رواں دواں رکھنے کے لیے میں نے مہینوں انگلیوں پر مہین روے کی سُوجی کا حلوہ باندھا۔ ان کا رنگ گورا اور جلد بہت شفاف اور نازک تھی۔ اتنی لمبی بیماری کے باوجود اب بھی جاڑے میں رخساروں پر سُرخی جھلکتی تھی۔ غلافی آنکھیں بند کر لیتے تو اور خوبصورت لگتیں۔ سفید اچکن۔ بھری بھری پنڈلیوں پر پھنسا ہوا چوڑی دار جوانی میں وہ بہت وجیہ اور جامہ زیب تھے۔

اپنی جوانی کا ذِکر کرتے ہی تڑپ اُٹھتے:

اک تیر تو نے مارا جگر میں کہ ہائے ہائے!

وہ بھی کیسے ارمان بھرے دن تھے، جب ہر دن ایک نئے کنول کی مانند کھلتا تھا۔ "جب سائے دھانی ہوتے تھے، جب دھوپ گلابی ہوتی تھی" ان کے تصور ہی سے سانس تیز تیز چلنے لگتی۔! بیتے ہوئے روز و مہ و سال خزاں کے پتوں کی مانند چاروں اور اُڑنے لگتے۔ ہائے! وہ استاد فیاض خان کی وحشی بگولے کی طرح اٹھتی ہوئی الاپ۔ وہ گوہر جان کی ٹھنکتی ٹھنکارتی آواز۔ اور مختار بیگم کیسی بھری بھری آسودہ آواز سے گاتی تھی۔ اس میں ان کی اپنی جوانی تان لیتی تھی۔ پھر خوابگینے پگھلنے لگتے۔ یادوں کا دریا بہتے بہتے خواب سراب کے آبِ گم میں اُترتا چلا جاتا۔ موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگتیں۔ زمیں سے لپٹ اٹھتی اور بدن سے ایک گرم مدماتی مہکار پھوٹتی۔ بارش میں بھیگے تر بہ سنز مہین کُرتے کچھ بھی تو نہ چھپا پاتے۔ پھر بادل باہر بھیتر ایسا ٹوٹ کے برستا کہ سبھی کچھ بہا لے جاتا۔

سینے سے گھٹا اٹھے، آنکھوں سے جھڑی برسے
پھاگن کا نہیں بادل جو چار گھڑی برسے
برکھا ہے یہ بھادوں کی، برسے تو بڑی برسے ٭

٭ انشاء اللہ خان انشاء

جما جھم مینہ برستا رہتا اور وہ ہارمونیم پر دونوں ہاتھوں سے کبھی بین، کبھی استاد جھنڈے خان کی چھپاتی دھوم مچاتی سلامیاں بجاتے تو کہنے والے کہتے ہیں کہ کالے ناگ بلوں سے نکل کے جھومنے لگتے۔ درختوں پر پیمانہ نکل آتے۔ کہیں ادھورے چرٹماؤ سے کورے پنڈے کی طرح سنسناتی چھتوں پر لڑکیاں دھنک کو دیکھ دیکھ کر اس کے رنگ اپنے لہریوں میں اتارتیں۔ اور کہیں چندن باہنوں پر سے ٹھکی اور کچی چنری کے رنگ چھڑائے نہیں چھوٹتے۔ انترے کی لے تیز ہوتی تو فضا کیسی جھن جھنن جھن گونج اٹھتی، جیسے کسی نے مستی میں آسمان اور زمین کو اٹھا کے مجیرے کی طرح ٹکرا دیا ہو اور اب رگ تاروں میں جھنک جھنکار ہے کہ کسی طور تھمنے کا نام نہیں لیتی۔



مجھے معلوم ہے یہ تمہارا پیچھا کرتا ہوا آگیا لیکن ہم اسے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔

غزل

نسیم سحر
(جدّہ)

دے جاؤ جو اک دن مجھے دیدار وغیرہ
کیا خوب ہو جل جائیں سب اغیار وغیرہ

کہتا ہے وہی ہم کو گنہ گار وغیرہ
ہم سے ہے زیادہ جو خطاکار وغیرہ

چھن جائے اگر شیخ کی دستار وغیرہ
چھٹ جائیں گے سب حاشیہ بردار وغیرہ

اک دن وہ کرے پیار کا اظہار وغیرہ
لکھے کوئی خط، بھیجے کوئی تار وغیرہ

جس کو ہے گماں، وہ ہے اداکار وغیرہ
صورت سے تو لگتا ہے چڑی مار وغیرہ

چھپ چھپ کے میں کرتا ہوں اُسے پیار وغیرہ
ڈرتا ہوں، نہ سونپے کوئی بیگار وغیرہ

شاعر کی غزل میں ہے بہت تذکرہ جس کا
رشتے میں وہ چاہے کوئی بینکار وغیرہ

ڈرتا ہوں کہ وِلیّن اُسے جیت ہی لے گا
دے کر اُسے سونے کا کوئی ہار وغیرہ

کر دیتے ہیں عشّاق کو قتل، ایک نظر میں
بُت ہاتھ میں رکھتے نہیں تلوار وغیرہ

کون اور سمائے مری نظروں میں کہ میں نے
دیکھے ہیں وہ زُلف ولب و رُخسار وغیرہ

صحرا کا مُسافر بھی یہ دریافت کرے ہے
رستے میں ہے کیا سایۂ اشجار وغیرہ؟

یہ شربتِ دیدار ہے، وِہسکی تو نہیں ہے
پیتے ہوئے مانو نہیں مقدار وغیرہ

احمق ہیں وہ سب لوگ جو گنتے ہیں ستارے
پڑھتے ہیں شبِ غم میں ہم اخبار وغیرہ

اب کھول کے بیٹھے ہیں لُغت ہم، کہ وہ اِک دن
غصّے میں ہمیں کہہ گیا حمّار[1] وغیرہ

کھا جائیں گے کیا ہم تمہیں؟ پاس آکے تو بیٹھو
سُن لو نا ذرا ہم سے بھی اشعار وغیرہ

نفرت ہے اُسے مجھ سے نسیمؔ اور میں چاہوں
کہہ دے مجھے اک روز وہ دلدار وغیرہ

[1] گدھا

عابد معز (ریاض)

فرنٹ وہیل ڈرائیو

ازدواجی زندگی دو پہیوں والی گاڑی ہے۔ ایک پہیہ خود بھی چلتا اور گاڑی کو بھی چلاتا ہے جبکہ دوسرا پہیہ پہلے کے سہارے ہے۔ لیڈیز فرسٹ کی مناسبت سے ازدواجی زندگی کا اگلا پہیہ ظاہر ہے کہ عورت ہے۔ باقی رہا پیچھے کا پہیہ تو وہ مرد ہے۔
یہ حقیقت ہر کوئی جانتا ہے کہ گاڑی کوئی بھی ہو، بیک وہیل ڈرائیو بہترین گاڑیاں ہوتی ہیں۔ خوب سبک رفتار چلتی ہیں۔ توازن برقرار ہے۔ رفتار بڑھانے سے جوکھم بھی کم رہتا ہے اور حادثات کم ہوتے ہیں جبکہ فرنٹ وہیل ڈرائیو سے گاڑی بے قابو ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ تیز رفتاری خطرناک نتائج کا باعث بنتی ہے۔ حادثات بھی زائد ہوتے ہیں شاید یہی وجوہات ہیں کہ فرنٹ وہیل کم لوگ پسند کرتے ہیں۔

ازدواجی زندگی کی گاڑی کی فطرت بیک وہیل ڈرائیو ہوتی ہے۔ لیکن بعض گاڑیاں فرنٹ وہیل ڈرائیو ہوتی ہیں۔ مختلف وجوہات [illegible] اتی ہیں۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے میں بیک وہیل کا پہل نہ کرنا۔ فرنٹ وہیل پر دل و جان سے قربان ہونا۔ فرنٹ وہیل سے مرعوب ہونا [illegible] سب سے اہم وجہ مصلحت اور مصالحت سے کام لیتے ہوئے زندگی کی گاڑی کو حرکت میں رکھنا بتائی جاتی ہے۔ گاڑی کے دو پہیے اگر اپنی اپنی زور لگانے لگے تو پھر رسہ کشی ہوتی ہے۔ کبھی فرنٹ وہیل تو کبھی بیک وہیل ڈرائیو سے ازدواجی زندگی کی گاڑی تھک کر ٹوٹ جاتی ہے۔
ایک دوست کی ازدواجی زندگی کی گاڑی فرنٹ وہیل ڈرائیو ہے۔ شادی سے پہلے وہ اپنی ازدواجی زندگی کی گاڑی بیک وہیل ڈرائیو [illegible] ہتا تھا۔ اونچی اونچی باتیں کیا کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ قدرت کی عطا کردہ برتری کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے محل میں خود بادشاہ و اپنی بیوی کو ملکہ بنا کر رکھنا چاہیے لیکن شادی کے بعد پتہ نہیں کیا ہوا کہ اس کی ازدواجی زندگی فرنٹ وہیل ہو گئی۔ اور وہ خود کو کولہو کے بیل کی طرح دفتر اور گھر کے چکر کاٹتا رہ گیا۔ گھر سے باہر نکلتا تو بیوی آگے ہوتی اور شوہر پیچھے۔ [illegible] اس کو شادی سے پہلے کی باتیں یاد دلائیں تو اس نے کہا "بندے کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو [illegible] خدا ہوتا ہے"۔

میں نے طنز کیا "لیکن تمہارے یہاں تو منظورِ زوجہ ہو رہا ہے"۔
اس نے ہار مانتے ہوئے کہا "یہی سمجھ لو، دیر سے گھر آؤں تو سوالنامہ تیار ہے دیر کیوں ہوئی، کہاں گئے تھے، کس سے ملنے گئے تھے۔ شروع میں سوال پیار سے کئے جاتے تھے۔ پھر ان میں تلخی آنے لگی۔ میں کچھ دن جھوٹ بولتا رہا۔ کب تک جھوٹ [illegible] سکتا تھا۔ تنگ آ کر وقت پر گھر پہنچنے لگا۔ یہی حال گھر کے کام کاج کے تعلق سے بھی ہوا۔ پیالہ [illegible] چائے بنانے کے لئے [illegible]

مجھے اچھا لگا۔ میں نے چائے بنائی۔ بیوی نے تعریف کی۔ میں چائے بنانے لگا تو برتن بھی دھونے کے لئے کہا گیا۔ انکار کیا تو روٹھ گئیں اور ایک داسے کہنے لگیں کیا میرے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتے۔ میں کونسا پہاڑ کھودنے کے لئے کہہ رہی ہوں۔

میں نے جل کر کہا "اور اسطرح تمہاری ازدواجی زندگی فرنٹ وہیل ڈرائیو ہو گئی"

جواب ملا "یار تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔ چوبیس گھنٹوں کی جھک جھک اور اضطراب سے بہتر ہے کہ وقت پر گھر پہنچا کروں گھر کا چھوٹا موٹا کام انجام دوں، بچوں کو سنبھالوں اور آرام کروں، لڑنے جھگڑنے اور تماشہ بننے سے محفوظ تو ہوں"۔

یوں ہمارا دوست راشد اپنی فرنٹ وہیل ڈرائیو ازدواجی زندگی سے مطمئن ہے لیکن میں پریشان ہوں۔ اٹھتے بیٹھتے میری بیوی راشد کی مثال پیش کر کے مجھے شرمندہ کرتی رہتی ہے ہاتھ روم میں ڈھکیل کر مجھ سے کہنے لگی "باتھ روم صاف کرنے سے نہ آپ کی عزت میں کمی ہوگی اور نہ کاشانہ میں فرق آئے گا" بچے کو گود میں ڈالتے ہوئے کہا "بچوں کو سنبھالنا باپ کی بھی ذمہ داری ہے۔ راشد بھائی کے بچے ماں سے زیادہ باپ سے ہلے ہوئے ہیں" ایک دن راشد کے گھر سے واپس آکر کہنے لگی "آج راشد بھائی کے گھر پارٹی تھی۔ ہم خواتین فلم "نوکر بیوی کا" دیکھتے اور محظوظ ہوتے رہے۔ راشد بھائی نے ہمارے لئے گرم گرم پکوڑے اور چائے بنائی آپ کو پتہ ہے، راشد بھائی پکوان بھی خوب بناتے ہیں۔ میٹھے بنانے میں جواب نہیں ہے آپ اپنے دوست سے سبق حاصل کیوں نہیں کرتے؟"

"اس لئے کہ میں راشد نہیں ہوں" بیوی کو یہ جواب دے کر میں راشد کی ازدواجی زندگی کی گاڑی کو فرنٹ وہیل سے بیک وہیل ڈرائیو بنانے کی ترکیب سوچنے لگا تاکہ مجھے دن رات راشد کا طعنہ نہ سننا پڑے۔ خیال آیا کہ گاڑی میں ایک اسپیر وہیل یعنی اسٹپنی بھی ہوتی ہے گاڑی کا فاضل پہیہ جو گاڑی میں جوتا نہیں جاتا۔ لیکن چلنے والے پہیوں کے خراب ہونے پر ان کی جگہ لینے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اسٹپنی کے بھروسے اطمینان سے گاڑی چلتی ہے۔ اسٹپنی کا استعمال شاذونادر ہوتا ہے لیکن اس کی موجودگی سے گاڑی چلانے والے میں خود اعتمادی آتی ہے۔ یہی کچھ سوچ کر میں نے ایک منصوبہ تیار کیا۔

ایک شام میں اپنی بیوی کے ساتھ گپ شپ کرتے ہوئے راشد کے ہاتھ کے بنے ہوئے چھولے کھا رہے تھے میں نے کھسر پھسر کے انداز میں راشد سے کہا "یار وہ ملی تھی"۔

راشد نے چونک کر پوچھا "کون"

اس دوران خواتین متوجہ ہو گئیں۔ میں نے راشد کے کان میں کہا "بعد میں بتاؤں گا" اسطرح کہا کہ خواتین بھی سن لیں۔

راشد کی بیوی کا تجسس بڑھتا گیا۔ بار بار پوچھنے لگیں "بھائی صاحب کون ملی تھی"۔

میں نے تجسس کی آگ کو مزید بھڑکانے کے لئے جواب دیا "ایک پرانی بلی جو کبھی راشد کا راستہ کاٹا کرتی تھی"۔

میں ٹک کا ریج پوچھا" تو راشد کی بیوی مختلف سوالات کرنے لگیں "بلی کا نام کیا ہے؟ اس کی عمر کیا ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ کیا کرتی ہے؟ راشد اُسے کیسے جانتے ہیں؟ وغیرہ تمام سوالوں کے جوابات گول کر کے میں خود گم ہو گیا۔ دو ایک مرتبہ راشد کی بیوی نے اس تعلق سے بات کرنا چاہی لیکن میں نے انھیں تسلی دی "بھابی کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ بلی کے راستہ کاٹنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ سب پرانی اور دقیانوسی باتیں ہیں۔ اور پھر راشد جیسے شریف اور نیک انسان پر کوئی بلا اثر نہیں کر سکتی"۔

چند دن بعد میں راشد کے گھر گیا۔ راشد کچن میں چائے بنا رہا تھا میں وہیں جا کر خیر خیریت پوچھنے لگا۔ راشد کی بیوی چھپ کر دیوار سے کان لگا کر ہماری باتیں سننے لگیں۔ میں نے موقع پاکر راشد سے کہا "وہ آج پھر ملی تھی"۔

راشد نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا "تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ اس دن بھی کہہ رہے تھے کہ وہ ملی تھی آخر وہ ہے کون؟" میں نے راشد کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "آج تو اس سے بات بھی ہوئی ہے"

راشد زچ ہو کر کہا "میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے"

میں نے ایک اور وار کیا "وہ تمہیں پوچھ رہی تھی۔ راشد کیسے ہیں؟ کیا ان کی شادی ہو چکی ہے کیا اب بھی میں انھیں یاد آتی ہوں"۔ راشد کی بیوی سے مزید سننا برداشت نہ ہوا۔ وہ کچن میں آئیں چہرہ اترا ہوا، آنکھیں بھر آئی تھیں۔ راشد کے ہاتھ سے چائے کی پیالیاں لیتے ہوئی بولیں "آپ لوگ چل کر بیٹھئے میں چائے لاتی ہوں"۔

کچن سے نکلتے ہی راشد نے میری گردن پکڑ کر پوچھا "جناب والا کیا فساد برپا کر رہے ہیں اور آپ کے ارادے کیا ہیں؟"

میں نے راشد پر احسان کرتے ہوئے کہا "خاموشی سے دیکھتے جاؤ عنقریب تمہاری زندگی میں انقلاب آنے والا ہے"

راشد مزید سوالات کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے "آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا" کہہ کر خاموش کر دیا۔ راشد کی بیوی نے چائے کے ساتھ دیگر لوازمات لے آئیں اور میری خاطر مدارات کرنے لگیں۔ بسکٹ اور کیک کھلایا۔ میٹھی چائے پلائی اور کہنے لگیں "آپ کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ میرا بڑا بھائی میری حفاظت کے لئے میرے پاس موجود ہے۔ شادی کے بعد بےچاری عورتیں میکے سے دور ہو جاتی ہیں اور یوں بھی میرا میکہ یہاں سے سات سو کلو میٹر دور ہے۔ اپنے آپ کو اکیلی محسوس کرتی ہوں"

میں نے ڈھارس بندھائی "بھابی آپ دل چھوٹا نہ کریں مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھیں" میں چائے پی کر اپنے گھر چلا آیا۔

کچھ دن بعد راشد کی بیوی میرے گھر آئیں راستہ کاٹنے والی بلی کے بارے میں دریافت کرنے لگیں میں انھیں ٹالتا رہا "بھابی جی یوں ہی مذاق کر رہا تھا۔ بلی ہے نہ بلا آپ بے فکر رہیں"

راشد کی بیوی کے آنسو ٹپک پڑے ان آنسوؤں کو دیکھ کر میری بیوی تڑپ اٹھی تفصیلات کے لئے دونوں اصرار کرنے لگیں۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے کہا "وہ ہمارے ساتھ پڑھتی تھی۔ خوبصورت اور ہوشیار لڑکی تھی۔ ہماری جماعت کے اور بھی لڑکے اس کے پیچھے تھے لیکن وہ راشد میں اور راشد اس میں دلچسپی لینے لگا۔ چھپ کر ملنے لگے۔ اظہار محبت اور ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھانے سے پہلے وہ ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔ لڑکی اپنے والد کے ساتھ امریکہ چلی گئی تعلیم حاصل کرنے کے بعد شادی کے لئے واپس آئی ہے۔ اتفاقیہ ملاقات ہوئی تھی ظاہر ہے پرانے دوستوں کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ بس اتنی سی بات ہے بھابی کچھ دن بعد وہ شادی کر کے اپنے شوہر کو لے کر امریکہ چلی جائے گی۔ کھیل ختم اور پیسہ ہضم"

راشد کی بیوی آنسو بہاتی ہوئی کہنے لگیں "بھائی صاحب آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔ اگر وہ انھیں ساتھ لے گئی تو ...... پرانی دوستی ہے اور پھر امریکہ جانے کا موقع بھی ہے کیا وہ امریکہ جانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں"

میں نے کہا "پتہ نہیں بھابی مسلسل گھر پر رہتے ہوئے اور گھریلو کام کاج سے اکتا کر اگر راشد امریکہ جانے کے بارے میں سنجیدہ ہے تو کوئی تعجب بھی نہیں ہے"۔

راشد کی بیوی نے آنسو پونچھتے ہوئے مجھ سے پوچھا "اب میں کیا کروں"

میں نے مشورہ دیا "بھابی آپ راشد کا خیال رکھیں اس کی دلجوئی کریں [illegible] سے محسوس ہونے دیجئے کہ وہ آپ کا مجازی خدا ہے باقی مجھ پر چھوڑ دیجئے میں ملی کو [illegible] واپس امریکہ بھیج دوں گا"

راشد کی بیوی گھر چلی گئی۔ میں اپنے کامیاب پلان پر خوش ہونے لگا تو میری بیوی نے پوچھا "بہت خوش نظر آ رہے ہیں"

آپ امریکہ کب جائیں گے؟"

میں نے تعجب سے پوچھا "جی میں امریکہ کیوں جانے لگا۔"

بیوی نے ترش لہجہ میں جواب دیا "راشد بھائی کی کہانی آپ کی اپنی آپ بیتی ہے وہ بھی آپ کا راستہ تکا کرتی تھی۔"

میں نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا "بیگم آپ بہت دور کی کوڑی لائی ہیں۔ میں نے ایک مظلوم کی مدد کرنے کے لئے یہ کہانی گھڑی ہے" جواب ملا "مجھے سب پتہ ہے شادی کے بعد میں نے آپ ہی کے لوگوں سے یہی کہانی سنی تھی۔ خاموشی اس لئے تھی کہ وہ امریکہ چلی گئی ہے وہ کب واپس آئی اور کہاں ٹھہری ہوئی ہے۔"

میں پریشان ہو اٹھا۔ بہلانے کے لئے کوئی اور کہانی نہ سوجھی تو میں نے اپنی کہانی گھڑ دی تھی لیکن لڑکی کے امریکہ جانے کی حد تک میری کہانی سچ تھی لیکن اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ نہ کبھی اس کے بارے میں سنا اور نہ اسے دیکھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ واپس آئی بھی ہے یا امریکہ میں ہے۔ اب وہ میرے لئے اجنبی ہے۔ ماتھے پر آئے پسینے کو پونچھتے ہوئے میں نے گذارش کی "خوامخواہ شک نہ کرو اور بات کا بتنگڑ نہ بناؤ۔"

جواب میں میری بیوی نے آواز اونچی کرتے ہوئے دھمکی دی "میں بھابی کی طرح ڈرنے والی نہیں ہوں۔ میرا میکہ اسی شہر میں ہے۔ سب کو اور آپ کی بی کو دیکھ لوں گی۔"

اس واقعہ کے بعد راشد کی ازدواجی کی گاڑی خیر سے بیک وہیل ڈرائیو ہو گئی لیکن میری اپنی گاڑی آہستہ آہستہ فرنٹ وہیل ڈرائیو ہونے لگی ہے۔ اور یہ مضمون ختم کرنے کے بعد شام کی چائے بنانے کے لئے مجھے کچن کا رخ کرنا ہے۔ ••

رضیہ فصیح احمد
پاکستان

کاتب کا خط کاتبِ تقدیر کے نام

اے کاتب تقدیر!

مجھے اتنا بتا دے کیوں مجھ سے خفا ہے تو؟ کیا میں نے کیا ہے۔ اے کاتب تقدیر میں سہگل کی طرح یہ مصرعہ گا نہیں سکتا، اگر گا سکتا آج کاتب نہ ہوتا۔ گانے والے فی ریکارڈ ہزاروں روپے لیتے ہیں اور ہم سیاہ بخت کاتب فی صفحہ چند پیسے کے چکر ہی سے نہیں نکل سکے۔ گانے والے ہر لفظ کی قیمت سو روپے ہے تو یہاں ہر سو الفاظ کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ پھر گانے والا آسمان شہرت کی بلندیوں پر پرواز کرتا ہے اور غریب کاتب گمنامی کے تحت الثریٰ سے بھی نیچے رہتا ہے۔ فوجی مشغولے کے لئے بنایا گیا "مارگیٹ" اتنی جاندار کا نشانہ نہیں بنتا جتنا ہم کاتب بنتے ہیں، ہر ایک کا نزلہ کاتب پر گرتا ہے۔ کوئی رسالہ ایسا نہیں ہوتا جس میں بے چارے کاتب کو دوچار جگہ برے الفاظ سے یاد نہ کیا گیا ہو کوئی نہ کوئی بہتان لگایا گیا ہو۔ ستم اس پر یہ کہ ہر بہتان کی کتابت بھی خود کرنی پڑتی ہے۔ جس کو دیکھو یہی کہتا ہے کہ کاتب کی مہربانی سے میرے مضمون کا مطلب خبط ہو گیا ہو۔ حالانکہ ان کے مضمون کا مطلب پہلے ہی خبط تھا ورنہ کاتب غلط کتابت نہ کرتا۔ کاتب کی غلطیاں سب کو نظر آتی ہیں۔ مگر اہل قلم کے خط کو کوئی نہیں دیکھتا کہ ان کو پڑھ لینا ہی ہفت اقلیم سر کر لینے کے برابر ہے۔ جب تین چار دائرے ایک کے اندر ایک بنے ہوں تو ان کو انسان کیا پڑھے؟ یا جب چند کشتیاں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی ہوں تو آدمی اسے کیا سمجھے؟ بعض اوقات تو ایڈیٹر صاحب یہ تحریر ہے تو سب سے پہلے اسے "سلیس اردو" میں لکھنا ضروری ہوتا ہے تو تنقید کے خواندہ اور ناخواندہ حضرات مع دفتر میں آ سے گئے۔ مفت خوار ادیبوں کے کسی نہ کسی طرح رد پیش کے کر لیتے ہیں۔ دراصل غلطیوں کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے اور چشم بینا رکھنے والے تاڑ جاتے ہیں کہ ایک مضمون میں اتنی بہت سی غلطیاں اس بے چارے ایک کاتب کے بس کی بات نہیں۔ اپنی مرضی کا املا لکھتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ اسے جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ پھر کہیں گنوار کی زبان ہے تو کہیں بنگلے کی اور کہیں ملک میں بولنے والے کی کہیں اردو میں پنجابی ہے تو کہیں پنجابی میں بنگالی ہے۔ ادھر کاتب نہ ماہر لسانیات ہے، نہ عالم ہے نہ پروفیسر ہے، نہ نقاد ہے اور نہ اسے اتنی فرصت کہ لکھنے سے پہلے پڑھے بھی اور سمجھے بھی۔ اسے تو لکھا ہوا نظر آتا ہے وہ لکھ دیتا ہے۔ اس ایک خطا پر اسے ہزاروں صلواتیں سنائی جاتی ہیں۔ اگر ہم کاتبوں کا بھی کوئی پرچہ ہوتا اور ہم لکھنے والوں کی تحریریں جوں کی توں چھاپ دینے پر قادر ہوتے تو آج کتنے ہی مشہور مصنف اور شاعر عمر بھر پاتال میں بیٹھ کر خاک چھان رہے ہوتے۔ یہ بات بھی یقینی ہے کہ ایسے ہر پرچے کے ساتھ ہمیں اس پرچے کی کنجی بھی چھاپنی پڑتی تاکہ لکھنے والے کے علاوہ بھی کوئی اس کی چیز پڑھ سکے۔

کاتب کو بیچارہ پڑھیے نہیں خیالات اور احساسات سے بھی عاری سمجھا جاتا ہے۔ جیسے وہ دوسروں کے خیالات پہلے

کاغذ پر منتقل کرنے والی مشینیں ہوں۔ کبھی کسی لکھنے والے نے کاتب کے ذہنی۔ مذہبی اور اخلاقی احساسات کا خیال کیا ہے؟ کیا کیا کذب و افترا لکھنے کا ہمارا قلم گنہگار نہیں ہوتا؟ دل جھوٹ جھوٹ پکارتا ہے مگر لکھتے ہیں۔ ذہن لاحول پڑھتا ہے مگر لکھتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ کاتب کے دل پر کیا گذرتی ہے۔ اگر کبھی اپنے جذبۂ تہذیب سے مجبور ہو کر یا یونہی غیر شعوری طور پر کسی ننگے لفظ کو زرق پہناوے تو الٹے گالیاں ملتی ہیں۔ لیکن اس کاتب کے جگر کی داد کوئی نہیں۔ "ذکی پشتیں" میں مادر زاد برہنہ گالیاں اپنے ہاتھوں سے لکھیں مگر شاید "نہیں" میں بھولتا ہوں "یہ کتاب تو ٹائپ میں چھپی ہے۔ شاید کوئی کاتب ملے سے لکھنے راضی نہ ہوا۔ مگر عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ کاتب سب کچھ لکھتے ہیں۔ اتنی بھی اجازت نہیں ہوتی کہ مضمون کے حاشیے پر کاتب کا "مضمون نگار سے متفق ہونا ضروری نہیں" لکھ سکیں۔ دوسری طرف جب کوئی کتاب "بین" ہو کر شہرت کی ساری منزلیں ایک دن میں طے کر لیتی ہے اور اس کا پہلا ایڈیشن راتوں رات فروخت ہو جاتا ہے، تب بھی بے چارے کاتب کا اس شہرت و دولت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا، جس نے اس کتاب کو سب سے پہلے اپنے دستِ خاص سے کتابت کا جامہ پہنایا یعنی بلندی کے زینے پر چڑھنے کے لئے "ڈریس اپ" نہ سہی "انڈر گارمنٹ" پہنائے اور پھر ایک "اپ" نہ سہی "فاؤنڈیشن میک اپ" تو کیا آج کوئی نہیں جانتا کہ منٹو کا "دھواں" اور "کالی شلوار" اور عصمت کا "لحاف" کس کاتب نے سطر پر منتقل کیا تھا۔ آہ فراموش کردہ کاتب!

دُنیا میں ہر پیشے کی عزت اور اُجرت بڑھ رہی ہے۔ مگر کتابت ہی ایک ایسا پیشہ ہے جس کی ساکھ راکھ بنتی جا رہی ہے۔ کل کے نائی آج کے ہیر ڈریسر ہیں۔ جو فون پر وقت طے کئے بغیر اپنے شیشے لگے سیلون میں آپ کو گھسنے نہیں دیتے۔ کل کے درزی آج کے ٹیلر ماسٹر ہیں جو گھر بیٹھے انگلینڈ کی کٹنگ سیکھ آتے ہیں اور عید بقرعید پر ہر شریف آدمی کو وہ تنگ کرتے ہیں کہ سب سفید پوشی دھری رہ جاتی ہے کل کے دھوبی آج کے "سفید ہیرے" اور "سفید برف" جو کپڑے ہی نہیں اتروا تے کھال بھی کھینچ لیتے ہیں۔ آج بڑے سے بڑا صاحب بہادر اُن سے جھک کر ملتا ہے اور چاند رات کو ان کے دیدار کے لئے قطار میں کھڑا ہوتا ہے غرضکہ کہاں تک گنواؤں۔ کل کا مالی آج "گل بین البراعظم" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کل کا حلوائی آج کا "گنبدِ شیریں" ہے۔ کل کا موچی آج "پاپوش" اور "پیزاز" ہے۔ کل کا مستری آج فرانسیسی زبان کا "ابلاڈر" ہے۔ مگر کل کا خوش نویس کے خوبصورت لفظ سے یاد کئے جانے والا آج کم بخت کاتب ہے۔ کاتب بروزن راتب سے زیادہ بدشکل و بدہیئت اور بے سُرا نام کوئی بتا دے تو اس کے ہاتھ پر بیعت کر لوں۔ آج کہاں ہے وہ منشی اور خوش نویس جس کا ذکر مرزا غالب اپنے خطوں میں کیا کرتے تھے؟ آج کوئی نہیں جانتا کہ نشر و اشاعت کے محکمے میں کاتب نام کی کوئی چڑیا بھی پائی جاتی ہے۔ ریڈیو میں اناؤنسرز کو دیکھئے اصل مضمون پر کیا کیا حاشیہ آرائی کرتے ہیں۔ بہلانے پھسلانے اپنا نام بھی بکتے رہتے ہیں۔ اب تو ریڈیو انجینیروں اور صدا بندی کرنے والوں کے نام بھی گوش گذار کئے جاتے ہیں۔ پہلے خوش نویس اپنا یہ حق پہچانتے تھے مگر اب کے کاتب اس سے بھی دستبردار ہو گئے ہیں۔ صرف ایک ناول! ایسا چھپا ہے جس کے سرورق پر کاتب اور پروف ریڈر کے ناموں کے ساتھ ان کی رائے بھی چھاپی گئی ہے۔ اس میں کاتب نے بانگِ دہل اعلان کیا ہے کہ اس کتاب کا ایک ایک لفظ میں نے لکھا ہے اور پروف ریڈر نے فخریہ کہا ہے کہ میں نے اس ناول کا ایک ایک لفظ پڑھا ہے۔ ممکن ہے کہ کاتب اور پروف ریڈر کو ان کی اجرت اسی شکل میں دی گئی ہو مگر ایسے کاتبوں کی تعداد اس مہنگائی کے زمانے میں بہت کم ہو گی جو نقد کے بجائے اپنی اجرت "جنس" کی شکل میں وصول کر سکیں۔ پھر بھی یہ ناول کاتبوں کے لئے فال نیک ہے۔ کتابوں کی ہر اس دکان سے مل سکتا ہے جہاں خواتین کتابیں خریدنے جاتی ہیں۔ مگر ذکر اس خوش نصیب کاتب کا ہے۔ عام کاتبوں کی زبوں حالی کا کر رہا تھا۔ یہ دیکھئے کہ نائی گیروں کے چہرے [illegible] کرتے سیلون میں جا بیٹھے۔

ملٹ چھوڑا اور بڑی بڑی سفید مشینیں لگا کے بڑے بڑے کمرے سجا بیٹھے۔ مورچی اپنے ناموں کے شہر بسا بیٹھے۔ مگر کاتب کی تقدیر
ہی اندھیری کوٹھری، وہی نیچا سا تخت، وہی بابا آدم کے وقتوں کا قلم اور وہی (کالی) سیاہی جس سے خود اس کی تقدیر لکھی
۔ اجرت کا مقابلہ تو آج کسی سے کر ہی نہیں سکتا۔ ہر کتاب کی اشاعت میں سب سے کم اجرت مصنف کے بعد بے چارے
بی کی ہوتی ہے۔ لیکن رسوائی ہر طرح سے سب سے زیادہ اسی شوم بخت کی۔ ناشر صاحب کتاب کی اشاعت میں کسی وجہ سے
ریں ہی سالہا سال کے سارے سیاہ بخت کاتب کے سر تھوپتے جائیں گے۔ کاتب بیمار ہے، کاتب مفلوج ہو گیا ہے۔ کاتب گاؤں جا کر
ہے، واپس آئے دیکھئے کیسی خبر لیتا ہوں۔ کاتب بیچارہ تو ہمیشہ کا بیمار اور مفلوج ہے۔ ورنہ یوں ہر کہہ دو جہہ اس کا ناطقہ
نہ کرتا۔ اگر کسی کتاب میں مصنف کا ایک لفظ بھی لکھنے سے رہ جائے تو وہ ایسا پریشان ہوتا ہے۔ جیسے یہی ایک لفظ اسے
بیر کا ہم پلہ بننے والا تھا۔ ادیبوں کی ایک بڑی انجمن کے اشاعتی مینجر کو ایک صاحب نے ناراض ہو کر خط لکھا "معلوم
ہے۔ آپ کے کاتب بھی آنریری ہیں" ان صاحب کو شاید معلوم نہیں کہ کاتب کہیں بھی ہو اعزازی ہی ہوتا ہے اور اس کا
اہرہ ادیبوں کے اعزازیئے سے کچھ ہی زیادہ ہوتا ہے۔

دوسرے لوگوں کو دیکھئے۔ درزی تنگ لباس سی دیتا ہے تو کہتا ہے آج کل یہی فیشن ہے۔ ڈھیلا کر دیتا ہے تو سرہوتا
لنذ فٹ "Loos - fit" ہے۔ جوتے والا جوتا پہنا کر بڑے وثوق سے کہتا ہے کہ ابھی تو یہ تنگ ہے گا۔ چھوٹے کو کہتا
پہننے سے ڈھیلا ہو گا۔ دھوبی ہر داغ کو کہتا ہے پہلے سے لگا ہوا تھا گویا کپڑا اسے دھونے کے لئے نہیں داغ جوں کا توں
نے کے لئے کہا تھا۔ نائی چاہے بالوں پر مشین یوں پھیرے جیسے گھاس پر لان موور پھیرا جاتا ہے مگر آخر میں آئینہ دکھا کر
ہمیشہ چاہے اور اگر آپ داد نہ دیں تو قینچی یا استرا اس کے ہاتھ میں ہے ہی، لیکن کاتب کو مجبور کیا جاتا ہے کہ ہر اخبار اور
لے میں اقرارِ جرم خود کرے اور بار بار کرے کہ کل جو مصرعہ اخبار میں یوں چھپا ہے ؎ ارے او بے حجامت ارے او بے حیا"۔
مل یوں ہے ؎ ارے او بے مروت ارے او بے حیا" اور جس تصویر کے نیچے محترمہ ادا قرمزی لکھا ہے وہ دراصل
م جوالکھنوی کی ہے۔ اور موسیقی والے مضمون میں کاتب کی غلطی سے امانت علی خیانت علی لکھا گیا ہے اصل میں وہ امانت
یانت علی ہے۔ قارئین تصحیح فرمالیں۔ یہ لکھتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے وہ کلنک کا ٹیکہ خود اپنے ماتھے پر سجا
ہے اور کہہ رہا ہے" دیکھو لوگو میں احمق جاہل اور بے وقوف ہوں، غلطیوں کی پوٹ ہوں، ننگ جہاں ہوں، مجھے دیکھو"۔
اے کاتبِ تقدیر کاتبان بتا ہم کب تک یوں کسمپرسی میں بسر کریں گے۔ تیرے نام کے ساتھ لگے لفظ کاتب کا واسطہ ہم
م کر ہمارے دن پھیر اور بواپسی ڈاک یہ جواب عنایت فرما کہ کیا عالم بالا کے کراماً کاتبین کی بھی یہی حالت ہے۔

کمترین، کاذب اکبر
(سابق خوشنویس، حال کاتب)

نوٹ:۔ نام غلطی سے کاذب لکھا گیا ہے، دراصل کاظم ہے۔ تصحیح فرمالیں۔ نیز یہ بھی تحریر فرمائیں کہ اگر ہم انجمن
بان بنائیں تو سب سے بڑے کاتب کی حیثیت سے کیا آپ اس کا صدر بننا قبول فرمائیں گے؟

قلمی معاونین براہ کرم مسودات پر اپنا پورا پتہ ضرور لکھیں — ادارہ

غزلیں

اسمٰعیل ظریف
حیدرآباد

مطلع غزل کا گھر میں سنانا پڑا مجھے — مقطعے پہ داد بیٹے سے پانا پڑا مجھے
ویسے تو ذات ہی سے کبھی میں نے یہ غزل — پھر بھی کسی کا مال گلانا پڑا مجھے
تکمیل ایک دن میں غزل کی نہ ہو سکی — اشعار کچھ خرید کے لانا پڑا مجھے
مخلص بڑا نے داعیٔ محفل ہیں اس لیے — چھ میل چل کے ہانپتے آنا پڑا مجھے
ذاتی مفاد کے لیے دونوں کو گھیر کر — آپس میں بھائیوں کو لڑانا پڑا مجھے
جب خواہ مخواہ ہی اُس نے پریشان کردیا — تب خواب میں پڑوسی کے جانا پڑا مجھے
میں بھی بشر ہوں کوئی فرشتہ تو ہوں نہیں — جھوٹی قسم گواہی میں کھانا پڑا مجھے
اخبار میں چھپی ہوئی اک نیوز دیکھ کر — محفل میں بے بلائے ہی جانا پڑا مجھے
میں سینما بھی جاتا ہوں چھپ کر کبھی کبھی — پکچر نئی انہیں بھی دکھانا پڑا مجھے

بے پردہ اسکوٹر پہ بٹھا کر انہیں ظریف
شادی میں کل نواسے کی جانا پڑا مجھے

مذاق جھانسوی

★

شب کا وعدہ جو کر گیا ہوگا — اس کا مشکل سے دن کٹا ہوگا
دیکھیں کس کس کی دال گلتی ہے — اُن کی چھت پر مشاعرہ ہوگا
مینڈکی کو زکام پیدا شد — ناک والوں کا حال کیا ہوگا
اس کا شجرہ بتائیں گے کچھ لوگ — اب الیکشن میں وہ کھڑا ہوگا
راستے بند ہو گئے ہوں گے — ان کا دروازہ جب کھلا ہوگا
روز بیوی حساب لیتی ہے — حشر کے دن حساب کیا ہوگا
یوں تو ہوں میں مذاق بند کتاب — پھر بھی ہر شخص پڑھ رہا ہوگا

★

یوسف یکتا
سکندرآباد

'وہ' تو خوابوں میں آتے رہے — اور ہم سر کھجاتے رہے
مار بیگم کی پڑتی رہی — اور ہم مسکراتے رہے
ناچ کر ناچ بیگم کا ہم — ہر کسی کو نچاتے رہے
ظرف دیکھے ہمارا کوئی — خود نہ کھایا کھلاتے رہے
زیج کر جھٹکے بیگم کے ہم — دوستوں کو پلاتے رہے
خود ہوٹنگ کا بڑھتا رہا — شعر پھر بھی سناتے رہے
شاعری کر کے یکتا میاں — اور بھی رنگ جماتے رہے

منظور الامین

لالچ

اُس لکڑہارے سے تو ہم اور آپ بخوبی واقف ہیں جو نہایت ایماندار فراخدل تھا۔ ایک بار اس کا کلہاڑا دریا میں گر گیا تو وہ بہت اداس ہوگیا۔ وہ کنارے پر بیٹھا ہوا سوچ میں گم تھا کہ اتنے میں ایک رحم دل پری پانی کے اندر سے کلہاڑا لئے نمودار ہوئی یہ کلہاڑا چاندی کا تھا۔ اس نے لکڑہارے سے کہا کہ وہ غم نہ کھائے اور اپنا کلہاڑا لے لے۔ لکڑہارے نے ایک نظر اس کلہاڑے کو دیکھا اور یہ کہہ کر اسے لینے سے انکار کردیا کہ وہ اس کا کلہاڑا نہیں ہے جو درحقیقت تھا بھی نہیں، پری پانی کے اندر چلی گئی وہ مہربان پری سونے کا کلہاڑا لئے ہوئے سطح پر آئی اور لکڑہارے کو دکھایا۔ اس نے وہ کلہاڑا بھی نہیں لیا۔ جب وہ پری لکڑہارے کا لوہے کا اصلی کلہاڑا لئے آئی تو لکڑہارے نے اسے پہچان لیا اس نے پری کا شکریہ ادا کیا اور اس سے کہا کہ وہی اس کا اصلی کلہاڑا ہے نیک دل پری نے لکڑہارے کی ایمانداری اور فراخ دلی سے خوش ہو کر تینوں ہی کلہاڑے اس کے حوالے کر دیئے۔

آج کے دور میں یہی کہانی پھر سے جنم لیتی ہے لیکن کسی اور روپ میں پرانے زمانے کے اس قصے کو سن کر ایک شخص کا دل بہت للچایا یہ شخص پڑھا لکھا تھا۔ مگر تھا بڑا لالچی، اس نے سوچا لکڑہارے کی مثال پر عمل کرکے وہ لوہے کے کلہاڑے کے ساتھ ساتھ چاندی اور سونے کے کلہاڑے بھی حاصل کر سکے گا۔

پس ایک دن اس نے لکڑہارے کا لباس پہنا اور اپنے لوہے کے کلہاڑے کو پاس کے کنویں میں پھینک دیا۔ لالچی کافی دیر انتظار کرتا رہا لیکن پری کو نہ آنا تھا نہ آئی، اتفاق سے مسز لالچی کنویں پر پانی بھرنے آئی، لالچی غصے میں تھا آؤ دیکھا نہ تاؤ کنویں میں بیوی کو ڈھکیل دیا۔ اچانک پانی ابلنے لگا اور کنویں کی منڈیر تک آ پہنچا اور وہی مہربان پری نمودار ہوئی۔

ہر روز غسل شیر کرنے والی، نیل کی ساحرہ قلوپطرہ حسین پری کے ساتھ تھی، پری نے لالچی سے پوچھا "کیوں مسٹر کیا یہی تمہاری بیوی ہیں؟" لالچی نے قلوپطرہ کو ایک نظر دیکھا اور ایک پل سوچا اور پری کو "ہاں" میں جواب دے دیا۔ یہ مان کر کہ اتنی حسین، اتنی دیدہ زیب اور اتنی مشہور عورت اس دنیا میں اسے پھر کہاں مل سکے گی! پری جواب سن کر مسکرائی اور قلوپطرہ کو لئے کنویں کے اندر چلی گئی۔ لالچی فکر میں پڑ گیا ابھی وہ ...سے ہم کلام ہی تھا کہ اس بار پری پھر ابھری، اس بار اس کے ساتھ یونانی حسینہ ہیلن آف ٹرائے تھی جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہی وہ حسین دلنشین چہرا ہے جسے حاصل کرنے کے لئے ہی سو جہاز اور ہزاروں جہازراں سمندر میں اتار دیئے گئے جس کی ایک شعلہ بار نظر الیم کے برہنہ میناروں کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔؟"

لالچی کو ہیلن کے بارے میں کہے گئے یہ فقرے یاد تھے، پوچھے جانے پر کہ کیا وہی اس کی بیوی تھی لالچی سے صبر نہ ہو سکا۔

اور اس نے پھر ہاں میں جواب دیا، لیکن پری نے اس بار بھی اس کی ان سنی کردی۔

تیسری بار پری اصل سزا لالچی کے لئے نمودار ہوئی۔ لالچی بیوی سے ڈرتا بھی تھا۔ وہ بہت گھبرا گیا اسے اندیشہ ہوا کہ پری کہیں اسی کی اپنی بیوی کے ساتھ قتالۂ عالم قلوپطرہ اور حسینۂ یونان ہیلن کو بھی اس کے حوالے نہ کردے، اس نے سوچا تین کلہاڑوں کے ساتھ نباہ کرنا تو آسان ہے لیکن ایک ساتھ تین عورتوں سے نپٹنا جیالوں ہی کا کام ہے خواہ وہ قلوپطرہ اور ہیلن ہی کیوں نہ ہوں، پس لالچی نے مالِ عرب پیشِ عرب سمجھتے ہوئے اصلی بیوی پر قبضہ کیا اور جائے واردات سے بھاگ نکلا۔

آج کی دنیا کو لکڑہارے کی ضرورت نہیں ایماندار لکڑہارے کی تو بالکل ہی نہیں۔ ہماری چھٹی حس کہتی ہے کہ اب وہ چھٹی انگلی بن کر رہ گیا ہے، ایک زمانے میں لکڑہارا اگر ایک پیڑ کاٹتا تھا تو دس اگاتا بھی تھا وہ بیج بوتا چلتا تھا۔

"آج کا انسان صرف پیڑ کاٹنا جانتا ہے۔ پیڑ اگانے سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ بیج بوتا ضرور ہے مگر نفرت کے ہر دو انسانوں کے بیچ بیج۔ جو شجرۃ الزقوم اگاتے ہیں۔ مسئلہ ایک کا نہیں لاکھوں کروڑوں کلیجوں کا ہے!

پہلے پتہ پتہ انسان کو معرفتِ کردگار کا دفتر نظر آتا تھا۔ پتے بھی انسانوں کو جانتے تھے پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے خاص کر گاؤں، قصبوں میں پیڑ بہت عزیز سمجھے جاتے تھے۔ پیڑ بھی گاؤں والوں کی محبت کا جواب محبت سے دیا کرتے تھے اب کسی گاؤں والے کو کسی کام میں کامیابی ہوتی تو گاؤں کے پیپل کے پتے تالیاں بجا کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اب نہ وہ پیپل ہیں نہ وہ پتے ——!

کہتے ہیں مادی ترقی کے اس دور میں نہ تو سچائیاں باقی ہیں اور نہ دنیا کو سچوں کی ضرورت ہی رہ گئی ہے۔ آج کے دور کی سچائی صرف اتنی ہے کہ اس قدر جھوٹ بولو کہ اس جھوٹ کو دنیا سچ مان لے، جرمنی کے ڈکٹیٹر ہٹلر کے وزیر گوبلز نے اس صنف میں کمال پیدا کرکے دکھایا تھا۔ His Unholiness گوبلز نے اس دنیا میں اپنے کئی سجادہ نشین چھوڑے ہیں جو اپنے پیر و مرشد کے نام کو بلند کرنے میں دن رات کوشاں رہتے ہیں۔

شیخ سعدی نے اپنی ایک حکایت میں ایک لالچی کا ذکر یوں کیا ہے:

ایک لالچی خوارزم کے بادشاہ کے حضور صبح سویرے گیا، شاہ کو دیکھ کر پہلے تو لالچی جھکا پھر اس نے زمین پر اپنا چہرا رگڑا پھر سر اٹھا کر شاہ کے حضور دستِ طمع دراز کیا۔ اتفاق سے لالچی کا بیٹا بھی باپ کے پیچھے پیچھے شاہی محل پہونچا تھا، باپ کو اس حال میں دیکھا بولا۔ "اے باپ! کیا تو نے یہ نہیں کہا تھا کہ حجاز کی سرزمین قبلہ ہے۔ اب پھر آج تو نے شاہِ خوارزم کی طرف نماز کیوں پڑھی؟"

طمع، حرص، لالچ ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں، اس کنبے کی سربراہ ہے خود غرضی جو ان سب کی ماں ہے، جب یہ ماں لائقِ گردن زدنی ہے تو ظاہر ہے بیٹیاں سوختنی ہوئیں!

لالچی انسان کو نفسِ امارہ ذلیل کرتا ہے جیسے سعدی نے اپنی حکایت میں ذکر کیا۔ نفسِ امارہ (جس کے بارے میں ٹھیک ہی کہا گیا ہے کہ بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا) کی فرمائشیں لالچی کو اہانت، ذلت اور ہلاکت کے راستے پر لے جاتی ہیں ہر انسان دنیا میں اپنا Image بنانا چاہتا ہے لیکن لالچ انسان کے وقار کو کھو دیتی ہے اسے ہمیشہ کے لئے معتوب کردیتی ہے۔

دیکھا جائے تو آج کے انسان کو اتنی راحتیں اور آسائشیں میسر ہیں کہ پچھلے ہزاروں لاکھوں سال میں بھی انسان کو کبھی نہیں رہی تھیں۔ آج کا علاؤالدین پرانے چراغ کو نہیں گھستا بلکہ ایک بٹن دباتا ہے جس کے دباتے ہی راحت کا جن

حاضر ہو جاتا ہے۔ اسی لئے آج کے دور کو push- butt on civilization بھی کہتے ہیں جیسے آج کا دور میکانیکی تہذیب کا دور ہے جو اعلیٰ انسانی قدروں کی نفی کرتا ہے۔

اتنی آسائشیں میسر ہونے کے باوجود آج کا انسان ایک قسم کے Divine discontentment مسلسل غیر اطمینانی کا شکار ہے کیونکہ اسے سونے کا کلہاڑا ہی چاہیئے اور اگر اسے ایک کلہاڑا مل بھی جائے تو اس سے اس کی تشفی نہیں ہوتی اسے لگاتار سونے کے کلہاڑے ملتے رہنے چاہیئیں۔

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ آج کا بے نام انسان، بے رخی کے شہر میں ایک بے مقصد سی زندگی گزار رہا ہے لگتا ہے لالچ ہی اس دنیا کی ایک سچائی بن گئی ہے، مشعلچی سے لیکر نقارچی تک خزانچی سے لیکر باورچی تک ہر شخص لالچی بن گیا ہے۔

قدیم حکایتوں میں چین کے ایک حکمران کا ذکر آتا ہے جس نے اپنے محل میں ایک جھیل بنوائی تھی۔ یہ جھیل پانی کی جھیل نہیں تھی بلکہ روز شراب ناب سے بھر دیا جاتا تھا۔ اس کے کنارے بیٹھے شہنشاہ ایک طرف تو اپنی محبوبہ کی آنکھوں کی جھیلوں میں غرق رہتا۔ دوسری طرف لالچی مے خواروں کو جھیل تک لایا جاتا انھیں شراب کی اس جھیل میں پھینک دیا جاتا جہاں وہ اس قدر پیتے کہ پھر انھیں تن بدن کا ہوش نہ رہتا، اس کے بعد کوشش کرتے کہ وہ اس جھیل سے باہر نکل آئیں شہنشاہ اور اس کی محبوبہ ان مے نوشوں کے اس سنگھرش سے لطف اندوز ہوتے، ان لالچیوں کو پھر باہر آنا نصیب نہ ہوتا اور وہ اپنی اپنی صلیب لئے اسی جھیل میں غرق ہو جاتے اس صلیب پر تحریر ہوتا۔ "پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا"

لالچ کا تعلق کسی خاص علاقے یا خطے یا سرزمین سے نہیں ہوتا ہے وہ تو ہر جگہ، ہر آب و ہوا اور ہر منطقے میں پایا جاتا ہے وہ خط استوا پر بھی ملتا ہے اور خط جدی پر بھی اسے دساور سے منگوانے کی ضرورت پیش نہیں آتی اور نہ کسی شخص کو یہ بتانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ دیکھو تبت کا لالچی جا رہا ہے یا فلاں لالچی ٹمبکٹو کا رہنے والا ہے۔

لالچ، لالچی کی آنکھوں سے یوں جھلکتا ہے جیسے کسی بادہ خوار کی آنکھوں میں شراب یا کسی رشوت خور کی آنکھوں میں روپئے کا ڈھیر۔ لالچی کے منہ سے نہیں بلکہ آنکھوں سے رال ٹپکتی ہے اور یہ رال لالچ کی رال ہوتی ہے لالچی کو ڈھونڈنے کی زحمت نہیں کرنی پڑتی، وہ تو خود اپنے ماتھے پر تختی لگائے پھرتا ہے۔ جس پر لفظ لالچی خفی اور جلی دونوں انداز سے تحریر ہوتا ہے اس کو شناخت کی دقت پیش نہیں آتی، کیا کسی عیار، دھوکے باز یا کسی سادہ لوح کو بھی شناخت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ؟ ان دو انواع کے جانوروں کو تو آپ دور ہی سے سونگھ سکتے ہیں اسی طرح لالچی کو بھی ایک نظر میں پہچان لیا جا سکتا ہے۔

کہتے ہیں لالچ انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ تب آنکھیں رکھتے ہوئے یہ اندھا کاٹھ کا الو بن جاتا ہے۔ زر، زن زمین کی لالچ انسان کو ان گہرائیوں میں اتار دیتی ہے جنہیں اندھا کنواں ہی کہہ سکتے ہیں۔ آئے دن ہم یہ تماشے دیکھتے رہتے ہیں لالچ کی وجہ سے اندھے انسان کو اندھے کنوئیں میں اترنے کا سب بائسکوپ دیکھنے کے بعد بھی ہمارے عاشق، ہمارے شاعر باز نہیں آتے اس طرح کی دعائیں کرنے سے ؟

خدا عاشق کو زر دے یا اسے زیر زمین کر دے
خدا دلبر کو پر دے یا اُسے پردہ نشین کر دے

واحد انصاری
(برہان پور)

جیسا آئینہ ویسا عکس

دو دوستوں میں ذکر ہوا میرا جس گھڑی
گالی گلوج حجت و تکرار تک ہوئی

حامی تھا میرا ایک مخالف تھا دوسرا
دونوں اٹل تھے اپنی جگہ میں کہوں تو کیا

اِس نے کہا مزاح کا شاعر نہیں رہا
اُس نے کہا تو واحد کم بخت مر گیا

یہ بولا شاعری کا وہ نقصان کر گیا
اُس نے کہا کہ مر کے وہ احسان کر گیا

اِس نے کہا کہ شعر سلیقے سے کہتا تھا
اُس نے کہا کہ اَوروں سے لے کر وہ پڑھتا تھا

اِس نے کہا وہ صاحبِ دیوان ہو گیا
اُس نے کہا ہے سارا کلام اس کا چھپا

اِس نے کہا کہ شعر و ادب کی وہ جان تھا
اُس نے کہا وہ فتنہ گری میں مہان تھا

یہ بولا سیدھا سادا ملنسار تھا بہت
وہ بولا ہنس کے پیارے وہ مکّار تھا بہت

یہ بولا خصلتیں تھیں مسلمان کی طرح
وہ بولا مجھ کو لگتا تھا شیطان کی طرح

علم و ادب کا اس نے کہا جینیس بانڈ تھا
بے خوف ہو کے اُس نے کہا وہ تو بھانڈ تھا

توہین میری حامی نہ برداشت کر سکا
جھنجھلا کے گھونسا میرے مخالف کو جڑ دیا

تنتو ڈگری پارہ پھر تو مخالف کا چڑھ گیا
حامی کو سر سے اونچا اٹھا کر پٹک دیا

حیراں تھے لوگ دونوں کی اس ہاتھا پائی پر
دونوں اَڑے تھے دوستو اپنی ڈھٹائی پر

آئی سمجھ میں بات تو لوگوں نے یوں کہا
ہے صرف اپنی اپنی عقیدت کا ماجرا

اچھے کو یہ زمانہ بھی اچھا سدا لگے
دل میں ہے گر بُرائی تو سب کچھ بُرا لگے

دِل صاف ہے تو کیسے نگاہوں میں میل ہو
ہر آدمی بُرا ہے اگر تم بُرا کہو!

آئینہ جیسا ہوگا یہ واحد تو جان لے
ویسا ہی عکس اس میں نظر آئے گا تجھے

★

غزل

منہ پھٹ

بوڑھے کنویں نے رکھا ہے کچھ جل سمیٹ کر
ظالم ہوائیں لے گئیں بادل سمیٹ کر

بازار کے دلال چلاتے ہیں اپنا گھر
گیہوں سمیٹ کے کبھی چاول سمیٹ کر

کوئی تو کاروبار کریں تھوک بھاؤ میں
لے آئے اُن کی بزم سے چپل سمیٹ کر

یارو خدا گواہ حسینوں کے واسطے
لایا ہوں کوہِ طور سے کاجل سمیٹ کر

سالی کی اس ادا کو سمجھنا محال ہے
ڈالے مری پلنگ میں کھٹمل سمیٹ کر

فرصت سے ان کے پاس جو بیٹھیں تو پھر کھلے
کچھ حاجیوں نے لائے ہیں بنڈل سمیٹ کر

منہ پھٹ یہ اس کا لطف و کرم ہے کہ دل لگی
تحفے میں اُس نے بھیجے سڑے کٹھل سمیٹ کر

سید رحیم الدین توفیق
(حیدرآباد)

عورت تیرا نام کامیابی ہے

مشہور ہے کہ ہر کامیاب آدمی کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے اور اس کی کامیابی میں اس کا ہاتھ ہوتا ہے بلکہ اس کا ہی ہاتھ ہوتا ہے گو کہ یہ ایک مشکوک حقیقت ہے اگر یہ شرط لازمی ہے تو ماننا پڑے گا کہ جو ناکام ہیں وہ محض اس لیے ناکام ہوتے ہیں کہ ان کے پیچھے کوئی عورت نہیں ہوتی یا پھر انھوں نے کسی عورت کو اپنے زعم مردانگی میں پیچھے نہیں رکھا اور منہ کی کھائی۔ یہ کہاوت یقیناً مغربی ممالک کی دین ہے ورنہ ایشیا اور خصوصاً ہمارے ملک میں عورت کو ناقص العقل کہا جاتا ہے۔ اس کی ہوشیاری اور ذہانت کو مکاری سمجھا جاتا ہے۔ اور کچھ حضرات اسے پیر کی جوتی بھی بنا کر رکھتے ہیں یہاں کچھ اس قسم کی کہاوتیں ہیں کہ "عورت کی مایا دیو نہ پایا" "عورت تیرا دوسرا نام فریب ہے" وغیرہ وغیرہ دیومالائی کہاوت گڑھنے کے لیے ایک بیوقوف دیو کی فرضی کہانی لکھی گئی اور اس دیو کو ایک چالاک اور سیانی عورت کے ذریعے بیوقوف بنایا گیا اور یہ کہاوت وجود میں آگئی۔ کہاوت کیا یہ اس کہانی کا "قصہ مختصر ہے"!

اگر خدانخواستہ کسی مرد کی کامیابی میں اس کہاوت والی عورت کا ہاتھ ہوتا بھی ہے تو اس کی انا یا مردانگی اس کا اعتراف کرنا گوارا نہیں کرتی لیکن آج کل محض مغرب کی نقل میں یہ کہاوت ہمارے معاشرہ میں بھی در آئی ہے۔ ویسے پہلے سے ہمارے یہاں "بیرونی ہاتھ" بہت مقبول ہے اور لوگ اس پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیتے ہیں۔ اس "بیرونی ہاتھ" کا دخل ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں ہے۔ یہ ہاتھ ہمیشہ تخریبی کارروائیوں میں ملوث رہتا ہے۔ ہم آگاہ ہوتے ہوئے بھی اس ہاتھ کو نہیں پکڑ سکتے۔ "اتنا مجبور ہیں"۔

جب بھی کسی کامیاب انسان کا ذکر ہوتا ہے تو مذکورہ بالا کہاوت بھی فوراً یاد آجاتی ہے ایسی کہاوت والی عورت بہت پُر اسرار ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ اس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ بس "ایک عورت" کے نام یاد کی جاتی ہے۔ یہ عورت بڑی بے لوث ہوتی ہے اپنے سامنے والے مرد کی کامیابی کے بعد بھی یہ دعویٰ نہیں کرتی کہ اس مرد کی کامیابی اس کی مرہونِ منت ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ایک دن اس عورت کو بھی اپنی اہمیت کا احساس ہوگا اور کسی مرد کے پیچھے رہ کر اسے کامیاب بنانے کی بجائے خود کامیاب ہوگی جس طرح الکشن جتانے والے ڈاکو، غنڈے اور غیر سماجی عناصر آج کل اس ڈگر پر سوچنے لگے ہیں کہ سیاست دانوں کو کامیابی دلا کر اپنی انگلیوں پر نچانے کے بجائے کیوں نہ خود ان کی کرسی پر قبضہ کر لیں۔ اور دوہری محنت سے بچ جائیں غور طلب بات یہ ہے کہ آخر یہ عورت کے پیچھے کیوں رہتی ہے اور اسے کامیاب بنانے کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کرتی ہے۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ انسان کی دُم (پونچھ) کی طرح دم ہوتی ہے اور نہ وہ کسی تانگے میں جتا ہوا گھوڑا ہے جو یہ سمجھ لیا جائے کہ اس عورت نے اپنی دم مروڑ مروڑ کر اسے ہانک کر اسے کامیابی کی منزل تک پہنچایا۔ ہر کامیاب انسان کے ساتھ ایک عورت ہوتی ہے جسے وہ محفلوں اور جلسوں میں لیے پھرتا ہے۔ بعض کامیاب لوگوں کی بیویاں اس قابل نہیں ہوتیں کہ انھیں محفلوں میں ساتھ رکھا جائے اس لیے وہ فوراً نئی شادی کر لیتے ہیں یا سکریٹری رکھ لیتے ہیں۔ یہ خود میں

محض محفل میں ان کی شو بھا بڑھانے کے کام آتی ہیں۔ یقیناً یہ عورت وہ پُراسرار عورت نہیں ہو سکتی کبھی کبھی لوگ محض اس آدمی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کی بیوی کو تنک کا فائدہ دے کر اس کی کامیابی کے "ہاتھ والی عورت مان لیتے ہیں اور پھر پریس والے اپنی جولانی دکھاتے ہیں۔ ایک نہایت ہی مرنجان مرنج قسم کا آدمی محض اتفاق سے جب اپنے ملک کا صدر بن گیا تو صحافت نے اس کی گھریلو قسم کی غیر تعلیمیافتہ لیکن سمجھ دار بیوی کو اس کامیاب صدر کے "پیچھے والی عورت" ثابت کر دیا۔ اس خاتون کی مہمان نوازی اور گھریلو پن کی بنا پر اس خاتون کو انا پورنا دیوی کے خطاب سے نوازا گیا شوہر بیچارہ چپ چاپ مسکرا کر ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ حالاں کہ اسے اپنی معصوم بیوی سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ مگر کبھی کبھی گائے بھی تو سینگ مار دیتی ہے۔

کئی کامیاب ٹھیکے دار اپنی بیویوں کی سفارش پر بڑے بڑے ٹھیکے حاصل کر لیتے ہیں۔ ہمیں ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے کہ ایک چالاک شخص نے جو اپنے باس کی کمزوری سے واقف تھا ایک اعلیٰ درجہ کی CALL G I RL سے معاہدہ کیا اسے اس کی منہ مانگی رقم ادا کی اور بہن کی حیثیت سے اس کا تعارف باس سے کروایا۔ فوراً اس کی ترقی ہو گئی۔ کامیابی میں ایک ہاتھ ایسا بھی ہوتا ہے۔

تاریخ میں "پیچھے والی عورت" کی ایک ہی واضح مثال ملتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جہانگیر کی کامیاب جہانگیری میں نور جہاں کا ہاتھ تھا وہ بڑی قابل اور عقلمند عورت تھی وہ دربار میں جہانگیر کی پشت پر بیٹھتی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فیصلے "واغ" کرتی اور جہانگیر جب بھی آپے سے باہر ہوتا تو اس کے کندھے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھا کر اسے قابو میں کر لیتی۔ جہانگیر کو نور جہاں نے ہی جہانگیر بنایا ورنہ وہ ایک منشی عیاش شہزادہ تھا۔

دوسری مثال سکندر کی ہے مگر یہاں انداز دوسرا ہے سکندر کو کامیاب بنانے کے لیے اس کے استاد نے چالاکی سے اس کی محبوبہ کو اس کے آگے یا پیچھے؟ سے ہی ہٹا دیا۔ اور پھر اس کے بعد سکندر نے بے لگام ہو کر جو فتوحات کا سلسلہ شروع کیا تو سیدھے ہندوستان آ کر دم لیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سکندر کی کامیابی بھی اس کی محبوبہ کی مرہون منت ہے اگر وہ اس کے راستہ سے نہیں ہٹتی تو؟ تو کیا ہوتا۔ سکندر وہیں اپنی چھوٹی سی ریاست میں اپنے تخت کا وارث پیدا کر کے مر جاتا اور تاریخ میں اس کا نام اتنا مشہور نہ ہوتا۔

ہمارے یہاں چند ایسی تاریخی عورتیں بھی ہیں جو بذات خود کامیاب ہیں۔ پشت پناہی کے لیے انھیں کوئی مرد نہ ملا تو یہ خود کامیابی کی راہ پر چل پڑیں۔ یہ ہیں۔ چاند بی بی۔ مہارانی جھانسی۔ وغیرہ لیکن افسوس یہ سلسلہ ان پر ہی ختم ہو گیا۔ اب ایسی عورتیں ناپید ہیں ●●

ڈاکٹر جاوید وششٹ
★
[فرید آباد]

آخ تھو

عام طور پر کھنکھار کر تھوکنے کی آواز کو 'آخ تھو' کہتے ہیں۔ جب آخ تھو خالص اپنے وجود سے وابستہ ہوتا ہے تو وہ معصوم اور بے ضرر ہی ہوتا ہے۔ لیکن جب لغوی سطح کو ترک کر کے معنویت کی سرحد میں داخل ہوتا ہے تو اس کی سادگی، پرکاری اور معصومیت، مکاری بن جاتی ہے۔ کیوں کہ پھر اس کا اظہار، بغیر کھانسی اور بغیر کھنکھار کے تھوکنے میں ہونے لگتا ہے۔ اور اسی مقام پر 'آخ تھو' اظہارِ نفرت کا آئینہ دار بن جاتا ہے۔

بیماری یا نقاہت کی وجہ سے اگر کوئی پوری طرح کھنکھار نہ سکے تو اس کے دہن سے 'آخ' کی جگہ 'اَخ' کی منحنی سی آواز نکلتی ہے۔ اس سے 'آخ' اور 'اَخ' میں کچھ رابطہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن 'آخ' اردو کا اور 'اَخ' عربی کا لفظ ہے۔ آخ کے الف پر مد اور اخ کے الف پر زبر ہے۔ بہرصورت مد اور زبر کے بیچ 'اخ' ہے اس سے ظاہر ہے کہ آخ اور اخ میں ضرور کوئی سمبندھ ہے۔ اخ مثبت اور آخ منفی ہے۔ عربی میں 'اخ' ماں جائے بھائی کو کہتے ہیں۔ لیکن جب 'اخ' 'تھو' کی سنگت اور صحبت میں پڑ جاتا ہے تو بگڑ جاتا ہے۔ اسی لیے تو بزرگوں نے بری صحبت سے بچنے اور دور رہنے کو کہا ہے۔

مگر اس کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ ماں کے پیٹ سے بھائی (اخ) ہی نہیں 'مادر زاد دشمن' بھی پیدا ہوتا ہے تو وہ یقیناً 'آخ تھو' ہو کر رہ جاتا ہے۔ گاؤں کی ایک مشہور کہاوت ہے کہ — 'بھائی کاٹھی کا یا لاٹھی کا' — یعنی مرنے پر بھائی ہی جنازے کو کاندھا دیتا ہے یا پھر کسی سے لڑائی ہونے پر بھائی کاندھے سے کاندھا ملا کر لاٹھی سے دشمن پر وار کرتا ہے۔ لیکن جب آخ تھو یعنی مادر زاد دشمن سے ہی مہابھارت کرنا پڑتا ہے تو کہاوت ہی چت ہو جاتی ہے۔ اور 'اخ' اور 'آخ تھو' برسرِ پیکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی مزے کی بات ہے کہ جب ان میں سے کوئی ایک شہید ہو جاتا ہے تو دوسرا اس کی نعش کو سامنے ہی ڈال دیتا ہے۔ یہیں سے یہ کہاوت ابھری کہ — 'بھائی مارتا ہے تو سائے میں ڈالتا ہے' — اسی مقام پر 'اخ' اور 'آخ تھو' میں اخ کا رشتۂ اشتراک کام کرتا ہے، لہو جوش مارتا ہے اور مارنے والے بھائی کی آنکھیں بھی نم ہو جاتی ہیں۔ مگر پھر بھی سماج میں اس کی تھو تھو ہو جاتی ہے کہ کم بخت نے ماں جائے کو

ہی ماردیا۔

محبت اور نفرت کو عام طور سے ایک دوسرے کی ضد خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو وہ دونوں ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ محبت کے نیچے نفرت ڈھکی رہتی ہے، اسی طرح نفرت کے پیچھے محبت چھپی رہتی ہے۔ محبت کے بغیر نفرت اور نفرت کے بغیر محبت ممکن نہیں۔ تضاد قانون قدرت ہے۔ دوئی کے بغیر وجود ناممکن ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس دوئی میں بھی وحدت کا رشتہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ یعنی ایک سرا اگر محبت ہے تو دوسرا سرا نفرت، دوسرے الفاظ میں ایک سرا 'اخ' ہے تو دوسرا 'آخ تھو'۔ اخ کے بغیر آخ تھو اور آخ تھو کے بغیر اخ کے ہونے کا امکان نہیں۔ اخ اور آخ تھو کے مابین جو رشتۂ وحدت ہے وہی انہیں، تضاد کے باوصف، ملاکر اخ + آخ تھو بنا دیتا ہے۔

حضرت عیسیٰ کا مشہور قول ہے کہ ــــ "اپنے دشمن سے بھی محبت کرو"ــــ یہ قول بڑا معنی خیز ہے۔ عام آدمی کے گلے اترہی نہیں سکتا کہ دشمن کو پیار بھی کیا جاسکتا ہے۔ دشمن کے لیے تو نفرت ہی اجاگر ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس پر غور کیا جائے تو یہ قول بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ محبت اور نفرت ایک ہی حقیقت کے دو رُوپ ہیں۔ جب محبت و نفرت کی اصل ایک ہے تو پھر دشمن سے محبت کیوں نہیں کی جاسکتی؟ حضرت عیسیٰ نے مقام محبت پر یہ اعلان بھی کیا تھا ــــ "خدا محبت ہے"ــــ گویا دوسرے الفاظ میں نفرت کو ترک کرنے اور محبت کو اپنانے کی تلقین کی۔ اور یہی سب سے بڑی دشواری تھی کہ اگر نفرت کو ترک کرتے ہیں تو درپردہ محبت بھی باقی نہیں بچتی۔ کبیر نے اپنے ایک مشہور دوہے میں، اس کا حل پیش کیا ہے۔ ؎

کبیرا کھڑا بجار میں مانگے سب کی کھیر
ناکا ہوئے دوستی، ناکا ہوئے بیر

یعنی محبت و نفرت دونوں سے گزر جانے کی تلقین کی ہے کہ دوستی اور دشمنی دونوں سے بے نیاز ہونا، تبھی وہ مقام حاصل ہوتا ہے جس کی طرف حضرت عیسیٰ نے دشمن سے محبت کرنے کی بات کہی ہے۔ اگر کوئی دوستی یا محبت کے مقام پر رُک جاتا ہے تو وہ دوستی اور محبت سے نہیں بچ سکتا۔ دوسرے لفظوں میں اخ اور آخ تھو دونوں کو چھوڑنے سے ہی آخ تھو سے بچا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ اخ اور آخ تھو لازم ملزوم ہیں۔ اور یہ تیسرا مقام ویدانت میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یعنی مثبت و منفی سے ماورا جو مقام ہے اسے ویدانتی "ساکشی" کہتے ہیں۔ گویا محبت و نفرت سے الگ کھڑا ہوکر "شاہد محض" ہونا ہی وہ تیسرا مقام ہے جس کی کوئی ضد نہیں۔ یہ مقام تصوف میں بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ عشق حقیقی اس مقام کا دوسرا نام ہے۔ یہی مقام، مقام احدیت اور مقام الوہیت ہے۔ عیسیٰ کے قول میں اسی مقام کی طرف بڑا بلیغ اشارہ ہے۔

گاؤں کی ناخواندہ عورتیں، خاص کر سن رسیدہ خواتین جب مغلظات کی رزم گاہ میں اُترتی ہیں تو وہ منظر دیدنی ہوتا ہے۔ لڑتے لڑتے جب ان کے مغلظات کا ذخیرۂ الفاظ ختم ہوجاتا ہے تو ان کا سارا زور حرکات و سکنات یعنی BEHAVIOURISM پر اُتر آتا ہے۔ یوں تو گالیوں کے درمیان بھی ہاتھوں کی اداکاری جاری رہتی ہے۔ اور جب فریقین لڑتے لڑتے (یہ زبانی لڑائی ہوتی ہے مگر کبھی کبھی گتھم گتھا ہونے کی نوبت بھی آجاتی ہے) اس مقام پر پہنچتے ہیں، وہ آخ تھو کا مقام ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو غضب ناک لہجے میں کہتی ہیں ــــ "آخ تھو

تیرے جنم میں، آخ تھو" ـــ اور نہ جانے کا ہے کا ہے میں ؟ یہاں زلیقین عملی طور پر تھوک تھوک کر آخ تھو کا خوب مظاہرہ کرتے ہیں. اور مہا بھارت کا خاتمہ بالخیر ہو جاتا ہے. تماشائی بھی اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں ـ لڑنے والی اگر پڑوسین ہیں تو وہ گھر جا کر پانی پی کر، تازہ دَم ہو کر ایک بار پھر آواز بلند کوسنے کاٹنے شروع کر دیتی ہیں. غالبًا اسی مقام پر "پانی پی پی کر کوسنا" محاورہ نازل ہوا ہوگا.

ایک نیستا نے ایک جلسے میں اپنی دھواں دھار تقریر یعنی بھاشن کے دَوران میں تیرہ گلاس پانی پیا. ہم اسے 'پانی پی پی کر بھاشنا' کہہ سکتے ہیں. اس "بھاشنے" میں کوسنے از خود شامل ہو جاتے ہیں.

کہتے ہیں بھجن اور بھوجن ایکانت میں کرنا چاہیئے. یعنی عبادت کرنا اور کھانا کھانا خلوت میں اچھا رہتا ہے. لیکن اکثر تیرتھ استھانوں پر ایک دل چسپ منظر دیکھنے کو ملتا ہے کہ آپ کہیں بیٹھ کر کھانا شروع کریں تو وہاں آٹھ دس بھکاری آجاتے ہیں اور اپنے رٹے رٹائے جملے دہرانے لگتے ہیں کہ بابا بھوک لگی ہے، کچھ کھانے کو دو ــ اگر آپ نے کسی کو ایک روٹی دے دی تو ان گنت بھک منگے وہاں مکھیوں کی طرح بھنکنے لگتے ہیں. ایک بار ایک بزرگ لالہ گنگا کنارے کھانا کھانے بیٹھے تو ایک بھکارن لڑکے نے روٹی کا سوال کیا. لالہ غرّایا اور اسے ٹال دیا اور کھانا جاری رکھا. مگر وہ لڑکا بھی بڑا شاطر تھا. اس نے 'آخ تھو' کا وِرد شروع کر دیا اور لالہ کے گرد نصف دائرے میں تھوک تھوک کر اسے عاجز کر دیا. آخر لالہ اس گھناؤنے ماحول سے اکتا کر، بچا کھچا کھانا بھکاری کو دے کر ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ یہ لے اور میرا پیچھا چھوڑ. وہ جیسے ہی کھانا لے کر وہاں سے کھسکا، لالہ نے بڑے زور سے آخ تھو کر کے زمین پر تھوک دیا.

■■

انوار انصاری (رانچی، بہار)

"بے" دو حرفوں کا مجموعہ ہے مگر بے حد ہیجان انگیز ہے۔ تنہا اس کی کوئی حیثیت نہیں مگر جب یہ کسی لفظ کے پہلے آجاتا ہے تو انسان کا سارا بھرم کھل جاتا ہے اور چشم زدن میں اس کی حقیقت کم ہوجاتی ہے اور معاملہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے مثلاً ادب کو ہی لیجیے۔ ادب کتنا مہذب اور شائستہ لفظ ہے۔ ادب سے بیٹھنا ادب سے گفتگو کرنا ادب سے پیش آنا مہذب انسانوں کا وطیرہ ہے اور جب شعر و ادب کی بات ہوگی تو ادب کا تصور ہی کچھ اور ہوگا۔ اعلیٰ ادب کی تخلیق کی خاطر لوگ اپنی جانِ عزیز گنوا دیتے ہیں پھر بھی ادب کی خدمت پوری طرح انجام نہیں دے پاتے لیکن ادب کے پہلے یہ دو حرفی لفظ "بے" لگ جائے تو ادب کی ساری اہمیت ہی ختم ہوجائے گی اور منظر کچھ اور ہی ہوجائے گا ساری عزت دھری رہ جائے گی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زمانہ آج بے ادبوں کے لیے بے حد ساز گار ہے۔ اب بے ادب بن کر ہر طرف دھاک بٹھائی جاسکتی ہے۔ چوری، ڈاکہ زنی، قتل اور اغوا کا فعل آرام سے انجام دیا جاسکتا ہے۔ بے ادبی کو بطور فن بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ نظم و نثر کا سہارا لے کر ادب میں بے ادبی کی دھوم مچائی جاسکتی ہے معاشرے کو زیر و زبر کیا جاسکتا ہے۔ ادب کے نام پر گندگی پھیلائی جاسکتی ہے۔ دراصل بے ادب بننا بھی ایک آرٹ ہے۔ بغیر آرٹ کو بروئے کار لائے آپ کی بے ادبی بدمعاشی کے زمرے میں آئے گی لہٰذا آرٹ کا سہارا لے کر بے ادبی کی نمائش کیجیے۔ اس پر لوگوں کی نگاہیں نہیں اٹھیں گی بلکہ واہ واہ کا نعرہ بلند ہوگا۔

چلیے بے ادبی کو جانے دیجیے۔ ہر انسان کی عزت پیاری ہوتی ہے۔ عزت کی خاطر جان ضائع کردی جاتی ہے۔ ہر ذی نفس کوشاں رہتا ہے کہ کسی طرح اس کی عزت سلامت رہے اور عزت پر حرف نہ آئے مگر عزت کے پہلے اگر "بے" نمودار ہوجائے تو انسان کے پاس کیا بچے گا۔ بے عزتی کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ آج کل تو دن دھاڑے غریبوں کی بے عزتی کی جاتی ہے۔ ان کی عصمت لوٹی جاتی ہے۔ اکیسویں صدی میں داخل ہونے والا انسان ایک مجبور انسان کی بے عزتی پر خاموش تماشائی بن کر انسانیت کا مذاق اڑاتا ہے۔

غیرت خوددار انسانوں کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اگر غیرت نہ ہو تو زندگی بے کار ہے مگر غیرت کے پہلے بے لگنے سے کتنا انارچیز معاذ برپا ہوجاتا ہے بے غیرت انسان کی کیا قدر و قیمت ہے۔ بے غیرت انسانوں کا جینا اور مرنا

کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ بھی سچ ہے کہ دنیا کی ایک تہائی آبادی بے خبری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔
"بے" کی جلوہ سامانیوں کا مزید تماشہ دیکھیے۔ کسی لفظ کے پہلے "بے" کے اضافے سے کیا کیا گل بوٹے کھلتے ہیں اور کیسے کیسے نقش ابھرتے ہیں یہ دیکھ کر عقل پریشان ہو جاتی ہے۔

ان دنوں بے کاری کا دور دورہ ہے۔ ایک طرف کالجوں اور اسکولوں میں تعلیم کا معیار گر رہا ہے۔ دوسری طرف ملک میں پڑھے لکھے بے کاروں کی تعداد میں روزافزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ بے کاری کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر انسانی زندگی بیزار نظر آنے لگا ہے۔ ملک کی معیشت بھی بے لگام چل رہی ہے یہی وجہ ہے کہ چیزوں کی قیمتیں آسمان کو چھونے لگی ہیں۔ نہ ملکی اقتصادیات پر کنٹرول ہے اور نہ کسی حکومت کا دباؤ۔ حکومتیں بے آبرو ہو کر ختم ہو رہی ہیں۔
ایک شاعر کی لن ترانی تو دیکھیے:

وہ ایم۔اے پاس بے کاری کا مارا ؛ میونسپلٹی میں سوئیپر ہو گیا ہے

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بے روزگار ہی سماج میں آتنک پھیلا رہے ہیں اور سماج انہی بے رحم انسانوں کے شکنجے میں پھنسا ہوا ہے۔ چناں چہ بے روزگاری کا سہارا لے کر امداد مانگنے کے اس انوکھے انداز کو ملاحظہ کیجیے:

تنہا تھے رات دو بجے گھر جا رہے تھے ہم
اک شخص اک گلی سے اچانک نکل پڑا
کہنے لگا حضور کچھ امداد کیجیے
نادار ہوں، غریب ہوں بے روزگار ہوں
اب میرے پاس کچھ نہیں پستول کے سوا

بے روزگار آتنک وادیوں کو گولی ماریئے اور آگے بڑھیے۔ ہزار نصیحت کیجیے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ نصیحت کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا بے وقوفی کی علامت ہے۔ نصیحت دوسروں کو راہِ راست پر لانے کے لیے کی جاتی ہے کہ اپنے آپ کو سدھارنے کے لیے۔ اب انسانیت بے جان اور مردہ ہو چکی ہے۔ طاقت کی باگ ڈور بے رحم اور بے ایمان سیاست دانوں کے ہاتھ میں آ چکی ہے۔ مستقبل سے بے خبر یہ بے بہرہ رہنما اقتدار کے نشے میں سرشار صرف بے تکی باتیں کہنا جانتے ہیں۔ لوگ ان کی بے تکی باتوں سے بے دم ہو جاتے ہیں۔
چھوٹی اور سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے کچھ رہنما پیسہ کا بے جا استعمال کرتے ہیں۔ پھر بھی نصیب نصیب کی بات ہے کسی کو شہرت مل جاتی ہے .... اور کوئی گم نام یا بے نام زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ شہر میں ایسی وارداتیں اکثر ہوتی ہیں جہاں بچے اپنے باپ کے نام کے بغیر زندگی بسر کرنے کے لیے بے بس ہے۔ بچے کی ماں بے نام زندگی بسر کرتی ہے۔ اب یہی انسانیت کی معراج ہے۔
"بے" کی کرشمہ سازیوں اور فسوں طرازیوں کے کوئی کہاں تک گن گائے۔ بے کا دخل ہر جگہ ہے۔ اگر آپ "بے" کو اپنی زندگی سے خارج کریں گے تو آپ کی شریکِ حیات یعنی بیگم آپ سے روٹھ جائیں گی اور آئے دن بات بے بات پر "بے لن" سے آپ کا سواگت کریں گی اور آپ بے حس نہیں ہیں تو بے دم ہو کر بے وجہ گھر چھوڑنے پر بے بس ہو جائیں گے۔

اکبر الٰہ آبادی نے بہت پہلے کہا تھا

بے پردہ نظر آئیں جو کل چند بی بیاں
اکبر شرم سے غیرتِ قومی میں گڑ گیا

لیکن کیا آج معاشرے میں بے پردگی سر چڑھ کر نہیں بول رہی ہے اور ہم سنبھلنے کے بجائے "بے غم" ہو کر اپنی دھن میں مست رواں دواں ہیں۔

انسان سماج اور معاشرے کا ایک فرد ہے وہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے کیوں کر بے گانہ رہ سکتا ہے جب کہ کل حالت لمحہ بہ لمحہ بدل رہی ہے۔ بے کا کمال تو آپ نے دیکھ ہی لیا کہ کسی لفظ کے پہلے آکر حضرت "بے" اس کی دنیا ہی بدل دیتے ہیں مگر جب بے کے پہلے "الف" نمودار ہوتا ہے تو حضرت "بے" کی سب ہیکڑی ختم ہو جاتی ہے اور وہ خود ناتواں اور بے بس نظر آنے لگتے ہیں۔ آپ ہی غور فرمایئے کہ اگر کسی کو "اَبے" کہہ کر مخاطب کیا جائے تو اس کی کیسی درگت بنے گی اور سماج میں کیا وقار سلامت رہے گا! یہ دوسری بات ہے کہ یار غار ایک دوسرے کو ایسے تیے سے مخاطب کرنے میں ذرا بھی جھجک نہیں محسوس کرتے ہیں۔ اب چھوڑیئے ان فرسودہ باتوں کو۔ آپ نے بے پیر کی بے تکی لنترانی کو بہت حد تک گوارا کر لیا ہے۔ میں بھی کیا بے حیا اور بے شرم ہوں کہ آپ کو "بے" کی بھول بھلیوں میں کئی منٹ تک الجھائے رکھا۔! ▼▲

محمد یوسف مترکی
(حیدرآباد)

انتظار

۲۷ دن آنجہانی نیتا کی پیدائش کا دن تھا۔ یہ نیتا ملک کی آزادی کی جنگ میں اپنا سب کچھ نچھاور کر کے عوام کے سامنے سرخرو ہونے والے چند نیتاؤں میں سے ایک تھے۔ ملک کو آزاد ہوئے چالیس سال گذر چکے تھے۔ تقریباً بیس سال پہلے جب ان نیتا کا دیہانت ہوا تھا تو ان کی خدمات اور ان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے شہر کے ایک وسیع چوراہے پر ان کا ایک بیس پچیس فیٹ بلند آہنی مجسمہ کچھ اتنے ہی اونچے کشادہ پلیٹ فارم پر نصب کیا گیا تھا۔ مجسمہ ساز نے اس مجسمہ کی تیاری میں بڑی مہارت دکھائی تھی۔ مجسمے کے دونوں ہاتھ آگے کی طرف اور کچھ اس انداز میں اٹھے ہوئے تھے گویا یہ مجسمہ بھگوان کے آگے آزادی کے لئے پرارتھنا کر رہا ہو۔

آزادی تو خیر مل ہی گئی تھی۔ ملک کے عوام خوش تھے کہ چلو آزادی مل گئی ہے۔ اب ہمیں اور کوئی آندولن واندولن نہیں کرنا ہے۔ اب تو ہمیں چین کی بانسری بجانا ہے۔ عوام کو چین کی بانسری بجاتے دیکھ کر ملک کے چند ناعاقبت اندیش لیڈروں کی بے چینی بڑھ گئی تھی اور وہ عوام کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عوام کی محنت کی دولت لوٹ کر اور اپنی اور اپنے حواریوں کی تجوریوں کو بھر کر عوام ہی کے درمیان گم ہو جانا چاہتے تھے۔ ایسے ہی لٹیرے لیڈروں میں ایک بڑے درجے کے لیڈر تھے جن کو آج اس آنجہانی نیتا کی سالگرہ کے موقع پر ان کے قوی ہیکل مجسمے کی گلپوشی کا فرض انجام دینا تھا۔

گلپوشی کا پروگرام شام ٹھیک [illegible] تھا۔ لیڈر موصوف کی جانب سے احکام صادر کر دیئے گئے تھے کہ "کسی بھی صورت میں" عوام کی ایک اچھی خاصی تعداد کو اس پروگرام [illegible] سے کم از کم ایک گھنٹہ قبل "جگہ پر" موجود ہونا چاہیئے۔ ان احکامات کو ہاتھ میں لے کر لیڈر کے ایک منہ چڑھے حواری نے پوچھا کہ "کسی بھی صورت میں" سے کیا مراد ہے؟ کہیں وہ ایسا تو نہیں جیسے کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ "کسی بھی صورت میں حاضر کیا جائے زندہ یا ....." حواری نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ اس پر لیڈر نے ایک زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا تھا کہ تم اتنے عرصے سے میرے ساتھ کام کرتے رہے ہو۔ تم کو ہی جاننے [illegible] اس سے کیا مراد ہے۔ حواری سر ہلا کر احکامات کی تشہیر کے لئے نکل گیا۔

آج پروگرام کا دن تھا۔ عوام کا ایک بڑا مجمع دوپہر دو بجے ہی سے مجسمہ کے اطراف جمع تھا [illegible] موسم تھا۔ لوگ پسینے سے شرابور اور گرمی سے پریشان تھے۔ لیکن حکم حواریان حاکم تھا۔ حکم کی تعمیل میں سب کچھ برداشت کر رہے تھے۔ لیڈر موصوف غلیظ ہرکارے کو اسی کام پر لگا رکھا تھا کہ وہ ہر دس منٹ کے وقفے سے "دیکھو" [illegible] حالات سے واقف کراتا رہے کہ کتنے لوگ ہیں اور کیا صورت حال ہے۔ دھوپ سے چار بج گئے لیکن لیڈر کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ بالآخر کوئی پانچ بجے

لیڈر صاحب کی چمکتی ہوئی کار آتی دکھائی دی۔ تپے ہوئے لوگوں میں سے چند ایسے بھی تھے جو لیڈر کو آتا دیکھ کر دبے لفظوں میں اُسے گالیاں بھی دے رہے تھے چند ایسے تھے جو اپنے ساتھیوں سے کہہ رہے تھے کہ پانچ روپیوں کی خاطر آج تو دس روپیوں کا خون پسینہ کرنا پڑ رہا ہے اور چند یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ ان کا بھتہ پانچ سے بڑھا کر دس کر دینا چاہیئے۔

لیڈر موصوف کی کار عوام کی بھیڑ کو ہٹاتی ہوئی مجسمہ کے قریب پہونچی۔ جیسے ہی لیڈر کار سے برآمد ہوئے حواریوں کی ٹولی نے اپنے حلق پر پورا زور ڈالکر لیڈر کی شان میں مختلف قسم کے نعرے بلند کئے۔ نعروں کے جوش کا اثر لیڈر پر ایسا ہوا جیسے ایک نئے نئے شرابی پر پرانی شراب کا اثر ہوتا ہے۔ ان کی موٹی گردن جو عوام میں سے کسی کے ہاتھ میں نہیں آسکتی تھی۔ اکڑ گئی۔ لیڈر کے ہاتھ پیر اور سر کے مقابلہ میں ان کی گردن ایک نمایاں حیثیت کی مالک تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ لیڈر نے اپنی گردن کی خاص پرورش کی تھی۔ جیسے کچھ لوگ اپنے پالتو جانوروں کی خصوصی پرورش کر کے ان کو تندرست و توانا بناتے ہیں تاکہ وقتِ ضرورت یہ ان کی حفاظت یا کام آسکیں۔!

لیڈر ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ عوام کی طرف دیکھتے ہوئے مجسمہ کی گلپوشی کے لئے آگے بڑھے۔ ایک بڑی سیڑھی کے ذریعہ بڑی مشکل سے اپنے فربہ جسم کو سنبھالتے ہوئے یہ اوپر چڑھنے لگے۔ ان کا ایک حواری پھولوں کا ایک بڑا سا ہار لئے ان کے پیچھے پیچھے آیا۔ جب یہ مجسمہ کے پلیٹ فارم پر پہنچے تو انھوں نے حواری سے پھولوں کا ہار لیا اور ایک جھڑکی دیتے ہوئے اسے نیچے اتر جانے کے لئے کہا۔ اس کے بعد پھولوں کا ہار لئے وہ ایک اور سیڑھی پر چڑھنے لگے جو اس موقع کے لئے بنائی گئی تھی تاکہ لیڈر موصوف باآسانی مجسمہ کی گلپوشی کر سکیں وہ بڑی شان و تمکنت سے اوپر چڑھ گئے۔ نیچے لوگوں کی طرف ایک حقارت آمیز نظر دوڑائی۔ سب کو پھولوں کا ہار دکھایا اور بڑی اکڑ کے ساتھ جیسے ہی مجسمہ کو ہار پہنانے لگے۔ لوگوں نے ایک بڑا ہی عجیب و غریب منظر دیکھا

ادھر لیڈر صاحب پھولوں کا ہار مجسمہ کے گلے میں ڈال رہے تھے اُدھر مجسمہ کے ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے آنے لگے اور پھر مجسمہ نے اپنے ہاتھوں سے لیڈر کی گردن کو پکڑ لیا۔ مجسمہ قوی ہیکل تھا۔ مجمع پر سکتہ طاری تھا۔ پولیس مجمع کو دور رکھنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ لوگ قریب آ آ کر دیکھنا چاہتے تھے۔ سبھی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور ایک دوسرے کو پوچھ کر یقین کرنا چاہتے تھے کہ ان کے سامنے وہی ہو رہا ہے جو وہ دیکھ رہے ہیں۔ اتنے میں مجسمہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا" اب میرے قابو میں آیا ہے تو! کتنے دنوں سے میں تیرے انتظار میں تھا۔ بول دھوکے باز عوام کو تو نے کتنے دھوکے دیئے ہیں؟ ہم نے آزادی اس لئے حاصل نہیں کی تھی کہ تم جیسے دھوکے باز، معصوم عوام کو فریب دے دے کر انھیں اس حالت میں پہونچا دیں کہ ان کی زندگی غلامی کی زندگی سے بھی بدتر ہو جائے!" لیڈر کی گردن مجسمہ کے آہنی شکنجہ میں تھی۔ گردن کی رگیں تن گئیں تھیں چہرہ سرخ ہو گیا تھا مجسمہ نے اپنے آہنی شکنجہ کو کچھ ڈھیلا کیا تاکہ لیڈر بول سکے۔ لیڈر بری سٹپٹا گئے تھے۔ مجسمہ کے آگے گڑگڑانے لگے" معاف کر دیجئے نیتا جی معاف کر دیجئے!" مجسمہ نے گرج کر پوچھا" معاف کر دوں؟ تجھے معاف کر دوں؟" یہ سُن کر لیڈر سمجھے شاید یہ معاف کرنے ہی والے ہیں۔ بولے" ہاں معاف کر دیجئے۔ ہم کو آپ نے غلط سمجھا جی ہم تو عوام کے خدمت گذار ہیں اپنا سب کچھ عوام کی خدمت میں لگا دیتے ہیں۔ وہ غلامی کا زمانہ تو رہا نہیں۔ آپ کی کرپا سے آزادی تو مل ہی گئی تھی۔ اب ہم لوگ عوام کی خدمت کر رہے ہیں" اتنا سننا تھا کہ مجسمہ کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ مجسمہ نے کہا جھوٹے، فریبی، مکار تو ان معصوم لوگوں کو دھوکہ دے سکتا ہے مجھے نہیں دے سکتا۔ میری آتما ان لوگوں کے درمیان ان کے دکھ درد کو دیکھتے ہوئے گھومتی رہتی ہے اور تڑپتی رہتی ہے۔ تو کتنا پاکھنڈی ہے میں سب جانتا ہوں۔ وہ کونسا موقع ہوتا ہے جہاں تو عوام کو لوٹنے سے باز رہتا ہو ہر موقع پر تو کوئی نہ کوئی ترکیب نکالا کر عوام کو ہر طرح سے نقصان ہی پہونچاتا ہے اور اس میں تجھے کتنا لطف آتا ہے

تو مزے لیتا ہے۔ جب لوگ بھوک کے مارے تڑپتے ہیں۔ تو سیدھے سادھے لوگوں پر، بے گناہ لوگوں پر گولی چلواتا ہے اور اس کی خبر سن کر اپنے محل میں قہقہے لگاتا ہے۔ آج میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا" یہ کہہ کر مجسمہ نے لیڈر کی گردن کی گرفت پھر ایک بار سخت کر دی۔ قریب تھا کہ لیڈر مر ہی جاتے۔ مجسمہ نے گرفت ڈھیلی کی۔ لیڈر پھر رو رو کر معافی مانگنے لگے۔ بچانے اور لیڈر کے حواریوں نے لیڈر کو پہلی بار روتے چلاتے دیکھا۔ آج ان کی اصلی آواز سے سب واقف ہو رہے تھے۔ لیڈر نے روتے روتے مجسمہ سے درخواست کی کہ وہ انھیں چھوڑ دیں۔ مجسمہ نے پوچھا "کیوں چھوڑ دوں"؟ لیڈر کے پاس تو جوابات ہر وقت تیار ہی رہتے تھے۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ملتا دیکھ کر جھٹ سے بولے "میں آپ کے چرن چھونا چاہتا ہوں" مجسمہ نے یہ سن کر ان کی گردن چھوڑ دی۔ لیڈر سیڑھی سے اتر کر پلیٹ فارم پر آئے اور جھٹ ان کے پاؤں پر گر پڑے۔ اپنی پیشانی کو مجسمہ کے چرنوں میں رگڑنے لگے۔ چند لمحے ایسا کرتے ہوئے انھوں نے سوچا "اب کیا کرنا چاہیئے۔ یہ بھوت نہ جانے کب سے میرے انتظار میں تھا اور نہ جانے وہ کونسی منحوس گھڑی تھی جب میں نے اس بھوت کی گلپوشی کے لئے رضامند ہوا۔ کسی خیال کے آتے ہی وہ فوراً اٹھے اور بڑی جلدی جلدی بڑی سیڑھی کے ذریعہ نیچے اترنے لگے اتنے میں لوگوں نے دیکھا یکایک مجسمہ کی آنکھیں اور سرخ ہو گئیں اور وہ پلیٹ فارم سے اچھل کر ایک بڑے دھماکے کے ساتھ زمین پر کود گیا۔ پہلے ہی سے دم بخود کھڑے لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ اب یہ عالم تھا لیڈر سیڑھی کے درمیان کھڑے گھگھیا رہے تھے اور تھر تھر کانپ رہے تھے۔ دیوہیکل مجسمہ کا چہرہ بالکل ان کے سامنے تھا۔ مجسمہ نے کہا "پاکھنڈی ہمارے ساتھ بھی دھوکہ کرنا چاہتا ہے" پھر لوگوں کی طرف انگلی اٹھا کر کہا "تو ان لوگوں کو دھوکہ دے سکتا ہے، مجھے نہیں! آج تجھے ان سب کے سامنے اعتراف کرنا پڑے گا کہ اب تک تو ان معصوم لوگوں کو زبردست فریب دیتا آیا ہے۔ عوام کی دولت کو تو نے اپنے حواریوں پر بے دریغ خرچ کیا ہے۔ تو نے ان کی کتنی ہی دولت لوٹ کر اپنی تجوریوں میں سجا رکھا ہے۔ تو نے کتنے ہی لوگوں کو گھر سے بے گھر کر دیا ہے۔ ان کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے" لیڈر نے جب دیکھا کہ اس کمبخت کی سب باتوں پر صاد کرنے اور اس بلائے ناگہانی سے جلد از جلد نجات حاصل کرنے کے سوا چارہ نہیں تو اس نے چلا کر عوام سے کہا۔ "لوگو! میں آپ سے شما چاہتا ہوں۔ نیتا جی جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ وہ سب صحیح ہے اور میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اب سے ایسا نہیں کروں گا سب کی بھلائی کے لئے کام کروں گا۔ عوام کو دھوکا نہیں دوں گا" یہ کہہ کر لیڈر نیتا کی طرف ہاتھ جوڑ کر شما چاہنے لگے کہ وہ اب انھیں چھوڑ دیں۔ وہ آئندہ سے ایسے کام نہیں کریں گے لیکن لوگوں نے تو ایک اور حیرت انگیز منظر دیکھا۔ مجسمہ نے کہا "تو زبان سے کچھ کہہ رہا ہے۔ لیکن میں سب جانتا ہوں جو تیرے دل میں ہے۔ تیرا دل کبھی صاف نہیں ہوگا۔ چاہے تو زبان سے کتنی ہی بار کیوں نہ کہے۔ تیرا صرف ایک ہی علاج ہے" یہ کہہ کر مجسمہ رک گیا۔ لیڈر نے بڑی عجلت سے پوچھا "وہ کیا؟" مجسمہ نے طنز سے کہا "ہاں — بڑی جلدی ہے تجھے سننے کی! اور وہ علاج یہ ہے" یہ کہتے ہوئے قوی ہیکل مجسمہ نے لیڈر کی کمر پکڑ کر انھیں اوپر اٹھایا اور اپنے ہاتھوں پر تولا اور پھر دور پھینک دیا۔ لیڈر کی ایک دلخراش چیخ بلند ہوئی اور ان کا جسم اطراف لگی ہوئی مضبوط ریلنگ کی نوک دار آہنی سلاخوں پر گر کر کچھ اس طرح اٹک گیا جیسے ان سلاخوں پر کباب بنانے کے لئے لگا دیا گیا ہو۔ لوگ چلا کر وہاں سے گرتے پڑتے بھاگ گئے۔ سارے شہر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی مانند پھیل گئی۔ اس جگہ جانے کی کوئی ہمت نہیں کر سکا۔ تین دنوں بعد پولیس بڑی مشکل سے وہاں پہونچی اور دیکھا کہ مجسمہ اپنی جگہ کھڑا ہے۔ مجسمہ کے چہرہ پر اطمینان ہے۔ لیڈر کا کہیں پتہ نہیں تھا اور دور دور تک باوجود تلاشش کے ان کی لاش تک نہ مل سکی۔

میر حسین علی امام
(کراچی)



بے بال

بال سب کو پسند ہوتے ہیں کسی کو [illegible] بکھری ہوئی زلفِ پریشاں، کسی کو اچھی لگتی تھی تو کسی کو کمر پر ناگن کی طرح [illegible] آتی تھی۔ آج بھی زلفِ پریشاں پریشان ضرور کرتی ہیں لیکن پریشانی یہ ہے کہ [illegible] پہنچ گئی ہیں بلکہ فیشن ایبل طبقہ میں تو مونڈھوں تک رہ گئی ہیں۔ دراز ہوں تو [illegible]

جب کسی شخص کے بال گرنے شروع ہوتے [illegible] قابل ہوتی ہے۔ شیمپو، ہیر ٹانک وغیرہ کا استعمال شروع ہو جاتا ہے، بال مزید گرتے ہیں تو [illegible] کی نوبت آجاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب سر کے بال کم ہونے لگتے ہیں تو دولت آنے لگتی ہے اور جب پیشانی اوپر کی طرف اٹھنے لگتی ہے تو علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک نوجوان شوہر کے سر کے بال گرنے لگے تو اپنی بیگم سے فرمانے لگے "میرے سر کے بال گر رہے ہیں۔ یقیناً خوش حالی کے دن آنے والے ہیں"۔ نوجوان شوہر کی محترمہ نے فرمایا "اگر بال کے گرنے سے دولت آتی ہے تو آپ کے سر کے بال سلامت رہیں۔ ہمیں دولت نہیں چاہیے"۔ اگر یہ جوڑا کچھ پرانا ہو جاتا تو بیگم صاحبہ یوں فرماتیں۔ "مجھے ہر حالت میں دولت چاہیے بھلے آپ گنجے ہو جائیں!"

ایک صاحب کے بال تیزی سے گرنے لگے تو ایک واقف کار نے دریافت کیا "کس وجہ سے آپ کے بال گر رہے ہیں؟" تو انھوں نے جواب دیا "بال گرنے کی فکر سے" یعنی جتنی زیادہ فکر کرتے بالوں کی گریں گے اتنی ہی تیزی سے بال گرتے جائیں گے۔ گویا گرتے بالوں کی فکر چھوڑ دیں تو یقیناً بال گرنا بند ہو جائیں گے۔ کیمیکل انڈسٹری خواتین کی ممنون ہے جن کی وجہ سے لاکھوں روپے کے شیمپوز کی فروخت کا شعبہ کھل گیا ہے۔ ساتھ ہی بالوں کی حفاظت اور ہیر ڈریسنگ آج ایک فن بن چکا ہے۔ نائی حضرات ترقی کر کے ہیر ڈریسر ہو گئے۔ امید ہے کہ آئندہ برسوں میں ہیر کٹنگ اسپیشلسٹ اور ہیر کٹنگ ٹیکنالوجسٹ بآسانی دستیاب ہونے لگیں گے [illegible] اور شیمو ٹیکنالوجی اہم صنعت بن جائے گی اور ہمارے ماہرین دوسرے ممالک۔ جا کر ملک کے لیے [illegible]

ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں [illegible] بیٹھ کر سکون سے بال بنواتے تھے کرکٹ کمنٹری سنتے یا حالات حاضرہ پر تبصرہ ہوتا۔۔

اخبار بھی پڑھ لیتے تھے۔ اس سے پہلے گھر گھر پھرنے والے نائی آٹھ آنے میں بچوں کے بال بنایا کرتے تھے۔ نائی کے پیشے کو ترقی ہوئی تو حجام کی شرح مزدوری تین روپے ہوئی۔ ہیر کٹنگ سیلون بنا تو پانچ روپے مقرر ہوئے، ہیر ڈریسر کا روپ ملا تو آٹھ روپے وصول کیے گئے، لیڈیز اینڈ جنٹس ہیر ڈریسرز، بیوٹی پارلر کے بورڈ آویزاں ہونے لگے تو پندرہ روپے سے تیس روپے تک حجامت کا معاوضہ لیا جانے لگا۔

امید ہے کہ آئندہ پانچ سالوں کے بعد ہیر کٹنگ ٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ اینڈ سرویسز، ہیر کٹنگ سنٹر، ہیر کٹنگ پولی کلینک وغیرہ سو روپے فیس لیں گے اور کنسلٹنسی فیس ہوگی پانچ سو روپے! اور اشتہار یوں شائع ہوں گے کہ امریکہ کی جدید ہیر ٹیکنالوجی کے ذریعے شیو بنائی جاتی ہے اور جرمن ٹیکنالوجی کے ذریعے مونچھ! دیگر ممالک کے اسپیشل کورسز سے بھی استفادہ کر سکتے ہیں!

بال جب تک سیاہ اور کالے رہتے ہیں، نہ صرف جوانی قائم رہتی ہے بلکہ جوان حوصلے بھی قائم رہتے ہیں۔ جہاں سر میں ایک سفید بال نظر آیا جوانی رخصت ہوئی اور حوصلے پست ہوئے۔ حالاں کہ سبھی جاننے والے جانتے ہیں کہ بال دھوپ میں سفید ہوتے ہیں یا نزلہ سے۔ ان سفید بالوں کو ڈائی کیا جاتا ہے یا مہندی لگائی جاتی ہے۔ اور نئے حوصلے حاصل کرتے ہیں، جب آرزوئیں پوری ہونے سے پہلے بال سفید ہو جاتے ہیں تو سخت افسوس ہوتا ہے اور زندگی و زمانے کی ناقدری و ظلم پر رونے کو دل چاہتا ہے۔ آرزوئیں عمر بھر قائم رہتی ہیں لیکن سفید بالوں کو نوچ نوچ کر پھینک دیا جاتا ہے یا انھیں سیاہ رنگ دیا جاتا ہے اور راہ فرار حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور جب اس کے باوجود بال سفید ہونے لگتے ہیں تب اس کی سفیدی بھلی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ان کے لیے احترام، محبت، عقیدت کے جذبات جنم لیتے ہیں۔ تب کم بال کے اور چاندی جیسے بالوں والے سر تاج بھی اچھے لگتے ہیں۔

بالوں کا ذکر خیر ہوا اور جوئیں موضوع سخن نہ ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ دو گھریلو خواتین بیٹھی کنگھی کرنے لگیں تو بات جوئیں مارنے کے فن تک جا پہنچتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری فلموں اور ڈائجسٹ کہانیوں ہی میں یہ ہوتا ہے لیکن حیرت یہ ہوئی کہ لائس کا تصور مغرب میں بھی ہے اور اینٹی لائس سلوشن جدید کیمیکل ریسرچ کا بھی اہم موضوع ہے۔

اینٹی لائس سلوشن کا استعمال ناخنوں پر چٹا پٹ جوئیں مارنے کا لوک ورثہ یا گھریلو صنعت یا سینہ بہ سینہ چلنے والا فن سب ایک دوسرے کے متوازی جاری و زندہ ہیں ــــ کہتے ہیں کہ بال کھلے کیے ہوئی کوئی خاتون باورچی خانے میں ہو اور اتفاق سے کسی دال یا کری میں زیرہ کا بگھار ہو تو لوگ احتیاط سے کھانا کھاتے ہیں۔ حد سے زیادہ احتیاط ٹھیک نہیں مگر بے احتیاطی سے دال یا کری پینا بھی مناسب نہیں ــــ خیر چھوڑیے آج دیسی انداز میں بال بنانے کا نظام ختم ہو چلا ہے، ہیر ڈرائی کرنا سیٹ کرنا، کانوں پر رکھنا، کانوں پر آدھا رکھنا، کانوں کے پیچھے رکھنا، غرض بالوں کے مردانہ انداز بدلتے جا رہے ہیں۔ عورتوں میں تیزی سے بالوں سے پیچھا چھڑانے کی روایت چل پڑی ہے اب مشرقی دوشیزہ کی زلفیں صرف شاعری میں نظر آتی ہیں۔ دراز زلفوں ملا کو جانے کا تصور ختم ہو رہا ہے کیوں کہ مرد اپنی زلفیں بڑھا رہے ہیں اور خواتین کم کر رہی ہیں۔ اب مغرب کی طرح مشرق کے بڑے شہروں میں بھی پہچاننا مشکل ہو رہا ہے کہ وہ کون ہے ہم ــــ ہمارے دیہات کی عورتوں میں اب تک بال بڑھے رکھنے کی روایت قائم ہے۔ خوب صورت رنگ برنگے ریشمی سوتی دھاگوں کے بنے موباف جب بالوں میں گوندھ کر گاگریں لے کر کنوئیں کے کنارے پانی بھرنے آتی ہیں تو یہ دوشیزائیں فطرت کا حسن اور شاہکار معلوم ہوتی ہیں تب اسی مغربی تہذیب پر غصہ آتا ہے جس نے بل کھاتی چوٹیاں اور ریشمی موباف ہم سے چھین لیے۔ مشرقی حسن کی یہ بھی تو ایک اہم نشانی تھی!!

دلہن اور حیدرآباد دکن کی منہ دکھائی

مرزا یٰسین بیگ
(پاکستان)

حیدرآباد دکن ہمارے تصور میں ایسے بسا ہوا ہے جیسے کسی کنوارے کے سپنے میں اس کی تصوراتی دلہن۔ ناک ایسی ہوگی آنکھیں ایسی ہوں گی، رنگ ایسا ہوگا، چلتی یوں ہوگی بولتی یوں ہوگی۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے "اماں، بابا" اور "نانی اماں" کو حیدرآبادی کے گن گاتے دیکھا ہے۔ نامپلی، ملے پلی اور غالباً سراج کی دیوڑھی یہ نام تو حافظے میں اٹک کر رہ گئے ہیں۔ جہاں کسی دفتر یا کام کی جگہ یا بزم میں کسی حیدرآبادی صاحب کو براجمان دیکھتے ہیں تو ہمارے منہ سے یہی نکلتا ہے "میں بھی حیدرآبادی ہوں، میرے والد نامپلی کے اور والدہ ملے پلی کی ہیں (ترتیب الٹی بھی ہوسکتی ہے) میرے دادا مرحوم چنچل گوڑہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، ان کا نام مرزا محمد علی بیگ تھا۔" سننے والا خوش ہوتا ہے اور اکثر کہتا ہے "ایسا!!" مگر ہمارا کام پھر بھی "جیسے کا تیسا" ہی رہتا ہے۔

بڑا شوق ہے حیدرآباد دیکھنے کا مگر کراچی کا تو یہ حال ہے کہ آئینے میں اپنی شکل دیکھنے کی فرصت نہیں ملتی پھر بھلا حیدرآباد کیسے دیکھیں؟ کبھی کبھی بڑے رومانٹک سے خواب آتے ہیں جیسے میں حیدرآباد پہنچ گیا ہوں۔ اسٹیشن سے باہر آتا ہوں تو مجھے اپنے نانا کی ہوٹل نظر آتی ہے جس کا نام کبھی "غوثیہ" تھا اب کچھ اور ہے۔ شہر میں پرانی عمارتوں کا ڈھیر ہوگا اور وہ ایک دوسرے کے پہلو سے یوں لگی بیٹھی ہوں گی جیسے بوڑھے بوڑھیاں ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہوتے ہیں۔ شہر میں تانگوں کی ریل پیل ہوگی، شہر سے پرے کوئی تالاب ہوگا، دھول مٹی اور گندگی کافی ہوگی، لوگ چلتے پھرتے ہوں گے تو کہتے ہوں گے "کہاں جارئیں حضت؟ کائی کو تو بی ادھر آئے؟" لوگوں کے سر پر تیل لگا ہوگا، بال اوپر کی طرف جمے ہوئے ہوں گے۔ عورتیں ساڑھیاں اور زیورات پہنے گھوم رہی ہوں گی۔ "کالوں" کی اکثریت ہوگی اور کالوں کے بیچ سے چند گورے اور گوریاں یوں جھانک رہی ہوں گی جیسے بدلی کی اوٹ سے چاند جھانکتا ہے۔ بازار میں املی کی بہتات ہوگی۔ جس گھر میں جاؤ بگھارے بیگن، ڈبل کا میٹھا، کھٹی دال، پاپڑ، بمبل مچھلی، مرچوں کا سالن اور گوشت کی کری سے تواضع کی جارہی ہوگی۔ بڑا شوق ہے کہ میر عثمان علی خاں کا محل دیکھوں اور وہ جگہ بھی دیکھوں جہاں کبھی وہ سونے کی اینٹیں رکھتے تھے!

ادھر پاکستان کا یہ حال ہے کہ "حیدرآبادی" سنتے ہی لوگ نعرہ لگاتے ہیں۔ "حیدرآبادی بڑے فسادی"۔ دوست احباب کو جب پتہ چلتا ہے کہ میں حیدرآبادی ہوں تو وہ کہتے ہیں "کشتی چلائے کیسے بلا رہے ہو؟" پھر یہ بھی مشہور ہے کہ حیدرآبادی بڑے سازشی ہوتے ہیں، ہوتے ہوں گے مگر ہمارا تو یہ حال ہے کہ ہم ہمیشہ سازش کا

کار ہوئے ہیں۔ خود سازش کبھی نہ کرسکے۔ پھر "غ" اور "ق" کی وجہ سے نشانہ بننا پڑتا ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ ریڈیو پاکستان ٹریننگ کی وجہ سے کم سے کم "خ" اور "ق" کی مار سے محفوظ ہیں ورنہ یہ جملہ تو ہر حیدرآبادی کو سننا پڑتا ہے "خاید اعظم کے مخبرے پر خوّے، خائیں خائیں خر رہے ہیں" (قاید اعظم کے مقبرے پر کوّے، کائیں کائیں کر رہے ہیں)

ایک بار دُور کے (اتنا ہی دُور جتنا کہ کراچی سے حیدرآباد دکن ہے) رشتے دار حیدرآباد دکن سے آئے ہوئے تھے، یوں کہ ہم سے دور کی رشتے داری تھی اس لیے صرف ایک گھنٹے کے لیے ہمارے گھر آئے۔ بڑے سادہ لوگ تھے، بیوی کہنے لگیں "میرے میاں کا اپنا بزنس ہے۔" شوہر مردانے میں بتا رہے تھے: "سائیکل کی دوکان پر کام کرتا ہوں"۔ بڑا بیٹا میرے چھوٹے بھائی پر رعب جما رہا تھا: "ہمارے گھر واشنگ مشین ہے، وہ کپڑے بھی سکھاتی ہے" میں اسکول جانے سے ½ گھنٹہ پہلے کپڑے دھوتا ہوں، سکھاتا ہوں اور پہن کر اسکول چلا جاتا ہوں۔ اسی بڑے بچے کی چھوٹی بہن میری بہن کی گود میں بیٹھی کہہ رہی تھی "ہماری خالہ سے امّی بولے جاتے وقت مجھے ایک بجلی کی استری دلا دینا، ہاتھ سے کپڑے دھونے کے بعد کوئلے کی استری کرنے کو جی نہیں چاہتا۔" کراچی والے اتنے سادہ نہیں ہوتے ہیں، پہلی بات تو یہ کہ وہ بچوں کو لے کر گھر سے نکلتے نہیں ہیں اور اگر نکلتے ہیں تو پوری ٹریننگ دے کر نکلتے ہیں کہ ابا کی تنخواہ کیا بتائیں اور دوپہر میں جو دال کھائی تھی اس کی جگہ کون کون سی مرغن ڈشوں کے نام بتانے ہیں۔ آنے والوں سے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ موٹر سائیکل کو حیدرآباد دکن میں "پھٹ پھٹی" بھی کہتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے بہتر نام اس چیز کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کم از کم ہماری اپنی موٹر سائیکل کے لیے یہ نام اسم بامسمّیٰ ہے کم بخت اتنا پھٹ پھٹاتی چلتی ہے کہ ہم رمضان میں اس "پھٹ پھٹی" سے محلے والوں کو سحری میں اٹھانے کا کام لیتے ہیں۔

اگر ہم نے اب تک حیدرآباد دکن کا منہ نہیں دیکھا ہے تو اس کی وجہ ہمارے والدین کی قوتِ ارادی ہے۔ والد صاحب جتنی بار حیدرآباد جانے کا ارادہ باندھ کر توڑتا ہے، جتنی بار انھوں نے ہمیں باندھ کر ہمارے جسم پر ڈنڈا توڑا ہے، ان دونوں معاملات میں وہ اس مصرعے کی تفسیر ہیں:

ارادہ باندھتا ہوں اور توڑ دیتا ہوں

اب گھر میں کھچڑی پک رہی ہے کہ حیدرآباد جانا ہے اور [illegible] سے جاکر "یسین" کی دلہن لانا ہے۔ گویا ہم حیدرآباد دکن اور دلہن دونوں کا منہ ایک ساتھ دیکھیں گے۔ خدا ہمارے والدین کو توفیق دے۔ ★★

فاروق شکیل
حیدرآباد

درد

دَرد مختلف قسم کا ہوتا ہے جیسے ہلکا دَرد، میٹھا دَرد، تکلیف دہ دَرد، ناقابلِ برداشت دَرد وغیرہ میٹھے دَرد کا شکار اکثر وہ عاشق ومعشوق ہوتے ہیں جن کا عشق نیا نیا ہوتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ دَرد یہ مٹھاس سٹر سٹر کے تلخی میں تبدیل ہوجاتی ہے جسے ناقابلِ برداشت درد کہا جاتا ہے۔ ابتدائے عـ میں عاشق ومعشوق "اوئے اوئے" کی گردان کرتے ہیں لیکن بعد میں "روئے روئے" کی تفسیر اور تصو جاتے ہیں۔ سَر کے درد کا ادبَ ۔ سے خاص تعلق ہے اکثر شاعروں اور ادیبوں سے لوگ ا درد میں مبتلا ہوتے ہیں اور بعض اوقات جب سر کا درد ناقابل برداشت ہوجاتا ہے تو لوگ شا ر اور ادیبوں کو جسمانی درد میں مبتلا کردیتے ہیں۔ تخلیق کا درد خواتین کی قسمت میں لکھا ہے جو اکث مَردوں سے ملتا ہے اور جب اس درد کا نتیجہ نکلنے لگتا ہے تو مَردوں کے حق میں بُرا ثابت ہوتا ہے ! بیکار شوہروں کی بیویوں کو ہر سال پابندی سے اس درد میں مبتلا دیکھا گیا ہے اور جب تیرہ چودہ نـ کے بعد تخلیق کا درد ختم ہوجاتا ہے تو ایک دوسرا درد شروع ہوجاتا ہے جو سکرات کے تک قائم رہتا ہے داڑھ کا درد بھی بہت بُرا درد ہوتا ہے اس درد کے نتیجہ میں چہرے کا حُلیہ بگڑ جاتا ہے۔ ایک دفعہ ہم نے جب محلے کے ایک صاحب کا ایک طرف کا گال پھولا ہوا دیکـ تو اُن سے اُس کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے بتایا کہ داڑھ میں درد ہے اور ہمیں یقین آگیا لیکن بـ پتہ چلا کہ دراصل اِنھیں داڑھ کا درد نہیں ہے بلکہ کسی لڑکی کے پہلوان بھائی نے اِنھیں اس در مبتلا کردیا ہے۔

داڑھ کا درد واحد درد ہوتا ہے جو عورتوں کا مسلسل بولنا روک دیتا ہے ورنہ تاریخ گواہ کہ دُنیا کی کوئی طاقت عورتوں کو مسلسل بولنے سے نہیں روک سکتی۔

درد ننانوے فیصد شاعروں کا موضوعِ سخن ہوتا ہے جسے وہ اپنے اشعار کے ذریعہ سا اور قاری میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک اور درد ہوتا ہے جسے "گلے کا دَرد" کہتے ہیں ویسے یہ درد خـ

یں اگر کسی کے گلے یں ہو تو قابلِ تعریف کہلاتا ہے یعنی یہ درد خُدا کی طرف سے گانے والوں کو ملتا ہے یہ واحد درد ہوتا ہے جو انسان کو دولت اور شہرت سے نوازتا ہے مگر بعض اوقات یہ درد خُدا کی طرف سے نہیں ملتا بلکہ زبردستی پیدا کر لیا جاتا ہے تو تکلیف دہ ہو جاتا ہے جیسے کبھی شاعر کا ترنم اچھا نہ ہو۔ بھی وہ ترنم میں کلام سُناتے تبھی تو سامعین "معاف کرو" کے نعرے بلند کرتے ہیں یا مشاعرہ گاہ سے رفوچکر ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات منتظمینِ مشاعرہ کی تلاش شروع کر دیتے ہیں اِسی طرح اگر گلوکار یا گلوکارہ کے گلے میں خدا کی طرف سے مِلا ہوا درد نہ ہو بلکہ زبردستی پیدا کر لیا گیا ہو تو مصیبت کا باعث بن جاتا ہے ایک دفعہ ایک گانے کی محفل میں ایک گلوکار جن کے گلے میں قطعی درد نہ تھا۔ گا رہے تھے اور جیسے ہی ان کا گانا ختم ہوتا تھا لوگ once more چِلّا اُٹھتے تھے اور گلوکار صاحب خوشی سے پھولے نہ سماتے اور دوسرا گانا شروع کر دیتے لیکن جب اسی طرح مسلسل دس گانے، گا کے بعد بھی سامعین نے once more چِلّانا نہیں چھوڑا تو بے چارے گلوکار نے خوشی اور بے چارگی سے کہا "بھائیو میں بہت تھک گیا ہوں اور آپ لوگوں کی پسند کو ملحوظ رکھتے ہوئے تھوڑی دیر بعد پھر سناؤں گا" لیکن سامعین میں سے ایک پہلوان نُما آدمی اُٹھا اور غصہ میں منہ سے جھاگ اُڑاتے ہوئے کہنے لگا "نہیں جب تک تُو اچھا نہیں گائے گا تجھے گاتے رہنا پڑے گا"

ایک اور درد ہوتا ہے جسے "قوم کا درد" کہا جاتا ہے جو اکثر لیڈروں میں ہوتا ہے اور یہ قوم کا درد صرف الیکشن کے موسم میں زور پکڑتا ہے۔ بجلی کی طرح کڑکتا ہے اور جیسے ہی الیکشن ختم ہو جاتا ہے یہ درد بھی ختم ہو جاتا ہے اور آج یہ درد صرف "انتخابی درد" ہو کر رہ گیا ہے۔ انتخابات کے بعد یہ درد اس طرح ختم ہو جاتا ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

دل کا درد بھی دو قسم کا ہوتا ہے ایک قدرتی اور دوسرا مصنوعی۔ قدرتی درد بڑھ جاتا ہے تو "ہارٹ اٹیک" کہلاتا ہے جو اکثر ایسے لوگوں کو ہوتا ہے جو بہت زیادہ مرغن غذائیں استعمال کرتے ہیں نتیجے کے طور پر دل کی شریانیں بغاوت کر کے دورانِ خون کو روک دیتی ہیں اور دل پر حملہ ہو جاتا ہے۔ مصنوعی درد عشق میں ناکامی یا جُدائی کے سبب پیدا ہوتا ہے جو عام طور پر وقت کے ساتھ ساتھ کم ہو جاتا ہے لیکن اگر اس درد کو سیریس لے لیا جائے تو پھر یہ دردِ سر حچڑھ کر بولتا ہے یعنی دل سے چڑھتا ہوا دماغ تک پہنچ جاتا ہے اور دماغ کی وائرنگ کو ناکارہ کر کے دماغی امراض کے دواخانے پہنچا دیتا ہے یا سڑکوں پر خستہ حالت میں چھوٹے بچوں سے بچنے کے لیے بھگاتا ہے۔

لفظ "درد" سے پہلے اگر ایک سہ حرفی لفظ "ہم" لگا دیا جائے تو بات کچھ اور ہو جاتی ہے یہ کوئی جسمانی درد نہیں بلکہ وہ درد ہے جو انسان اپنے دل میں دوسروں کے لیے محسوس کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس دَور میں ہمدرد آدمی کہیں نظر نہیں آتا جبکہ ہمدرد دواخانہ بہت مشہور ہے اب یہ لفظ صرف دواخانے کی حد تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے ورنہ اس لفظ "درد" کے سابقہ "ہم" کو نکالے ہوئے ایک زمانہ بیت گیا ہم نے ابتداء میں عرض کیا ہے کہ سر کے درد کا ادب سے بہت بڑا تعلق ہے اس سے پہلے کہ ہم اس کا ثبوت مہیا کریں اس مضمون کو ختم کرتے ہیں ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !!

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
(مارواڑی کالج بھاگلپور)

انور سدید کی انشائیہ نگاری

انشائیہ کی تعریف کرتے ہوئے خود انور سدید نے لکھا ہے کہ "انشائیہ زندگی کے موجود مظاہر، اشیاء، تجربات اور معمولات کو آنادہ روی، خوش خیالی اور زندہ دلی سے دیکھنے اور اس کے ان دیکھے گوشوں کو نثر کے تخلیقی اسلوب، کفایت لفظی، غیر رسمی انداز اور دوستانہ ماحول میں پیش کرنے سے عبارت ہے۔"

زندگی کے موجود مظاہر، اشیا، تجربات اور معمولات میں کبھی دور، ادیب میں جلوہ گر ہوتا ہے اور کبھی ادیب کسی عہد میں منعکس ہوتا ہے۔ انور سدید نے اپنے دور کو اپنی شخصیت اور کارنامے سے منور کیا ہے۔ ان کا شمار اس زمرے میں کیا جاتا ہے جو اپنے ماضی اور خود اپنے دور سے انسباط پاکر ابدی یا ایک طویل عرصہ پر محیط اقدار کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کے اظہار کے لیے انہوں نے انشائیہ جیسی صنف کو بھی اپنایا ہے۔ ملک کے سیاسی اور جذباتی طور پر مشتعل اور سماجی طور پر بیدار حالات کے تقاضے انہیں انشائیہ کی صنف کی طرف متوجہ کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ اپنے دور کے تمام انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں کو براہِ راست اور موثر انداز میں انہوں نے پیش کیا ہے اور معاشرے کے اجتماعی احساس کو پوری جزئیات کے ساتھ سمجھنے کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ واقعات سے اور کرداروں کے ذریعہ انہوں نے زندہ دلی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کے انشائیے میں فنی رکھ رکھاؤ، مطالعہ کی وسعت اور زندگی کی ٹھوس ناہمواریوں کو ہمدردانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

لفظ "کرکٹ" کو اگر لیا جائے تو آج کا سب سے زیادہ استعمال ہونے والا لفظ ہے اور بچے بچے تک کی زبان پر ہے!

"بیسویں صدی کی طغیانی زندگی میں سے اگرچہ لمحۂ فراغت نکالنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ لیکن جب بھی کرکٹ کا موسم آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس صدی کی طغیانی رو نے اپنی سمت یکدم تبدیل کر لی ہے اور اس کے داخل سے عافیت، مسرت اور بہجت کے ان گنت لمحات کا فوارہ پھوٹ پڑا ہے۔ کرکٹ کا موسم آتا ہے تو زندگی کی خارجی تیز رفتاری رک جاتی ہے۔ لیکن انسان کا داخل بیدار ہو جاتا ہے اور وہ اپنے اندر کے مست بلاوے پر کسی مخصوص سمت میں بے اختیار لپکتا چلا جاتا ہے۔ یہ بلاوہ کوہِ ندا کا بلاوا نہیں کہ آدمی اس پر لبیک کہے تو واپس ہی نہ آئے اور پیچھے مڑ کر دیکھے تو پتھر بن جائے۔ یہ بلاوا تو محبوب کے اس بلاوے کی طرح ہے جس میں تجدیدِ حیات کی نوید تازہ موجود ہوتی ہے اور ایک طویل ملاقات کے بعد زندگی کرنے کی نئی آرزو بیدار ہو جاتی ہے۔"

انیسویں صدی کے وسط سے اختتام تک ہندوستانی معاشرے کے انتشار کے باہمی عمل اور رد عمل نے معاشرے میں سیاسی، مذہبی اور تہذیبی سطحوں پر بعض چیزوں کے رد و قبول کا ایک مخصوص رویہ پیدا کر دیا تھا اور یہ رویہ ترکیبی سے زیادہ تحلیلی نقطۂ نظر کا طالب تھا۔ انور سدید نے تمام تاریخی پس منظر کو "کرکٹ" کی نگاہ سے دیکھا اور پرکھا ہے۔

[illegible] ایک [illegible]

آتا ہے۔ یہ کھیل اگر بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں ایجاد ہو جاتا تو شہنشاہ عالم پناہ کو پھول والوں کا میلہ سجانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ قطب صاحب کے گرد و نواح میں جو طویل و عریض میدان ہے اس میں کرکٹ کے پانچ روزہ مقابلوں . . . . . .

. . . . . . کے انعقاد کا حکم دے دیتے اور خود قلعۂ معلیٰ میں بیٹھ کر کرکٹ کی کمنٹری سنتے۔ افسوس کہ مغلوں نے یہ کرکٹ رائج کرنے کے بجائے اپنا طھاٹھ ہی سمیٹ لیا اور برصغیر کا طویل و عریض میدان انگریزوں کے لیے خالی کر دیا تاکہ وہ ڈلیو ہو جانے کے خطرے کو خاطر میں لائے بغیر بے تحاشا اور بے محابا کرکٹ کھیلیں۔ گیند کو معمولی سا بلّا دکھائیں اور جس سمت چاہیں پھینک دیں اور پھر خود ہی باونڈری کی لکیر پار کرنے کا اعلان بھی کر دیں۔"

نوآبادیاتی جبر کے سیاسی اور سماجی اصولوں کے اطلاق اور مغربی علمی اور تہذیبی اقدار پر مشرقی تہذیب کو جانچنے پر اصرار کے توسط سے ایک بچھڑے ہوئے معاشرے کو سرمایہ دارانہ دور میں داخل ہونے کا چیلنج ملا۔ معاشی غلامی سیاسی غلامی کا نتیجہ تھی جسے بلا احتجاج قبول کر لیا گیا مگر تہذیبی غلامی کو قبول کرنا اپنی تاریخ سے دست بردار ہونے کے مترادف تھا۔ لہٰذا مزاحمت ضروری تھی اس کے باوجود مغربی تہذیب نے اپنے روشن پہلوؤں یعنی عقلیت پسندی اور جدید علوم کے سبب مشرقی ذہن پر اپنے اثرات جمانے شروع کر دیے اور رفتہ رفتہ ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو علم اور تہذیب کے ان عناصر کو جذب کرنے پر مائل ہو گیا۔ مگر جذب و ایقان کی یہ حالت تہذیب کو جانچنے کا صحیح انداز اور تاریخ سے آگاہی کے سلسلے میں مزاحمت کی قوت انور سدید کے لکھنے کے مطابق اسی وقت ممکن ہے جب "انسان" اونگھنے "کو اپنا شعار بنا لے۔ الغرض "اونگھنا" سے یہ نکتہ آفریں اور تخلیقی قوتوں سے بھرپور اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"جب لیڈر اونگھتا ہے تو اس کی (انفرادی) ترقی کا راستہ نکلنے لگتا ہے۔ لیکن جب قوم اونگھتی ہے تو ضرور انقلاب کا ہمارا ہوتا ہے۔ سالہا سال کے غور و فکر کے بعد جوں ہی ٹائن اپنے اُدیپا او نگھنے کی کیفیت طاری کی تو اس پر معرفت حق کے دریچے وا ہونے لگے۔ ہستی اور نیستی کا فرق مٹنے لگا . . . . . . اونگھنے کی صوفیانہ کیفیت طاری کیے بغیر نہ تو آدمی شخص بن سکتا ہے نہ خلوت کو انجمن سمجھنے پر قادر ہو سکتا ہے۔"

اونگھنا ایک صحت مند فعل ہے۔ اس سے اعصاب کو سکون ملتا ہے۔ سوچنے کی قوت بڑھتی ہے۔ دنیا کے بڑے منصوبے اونگھتے ہوئے سوچے گئے ہیں۔

تہذیبی انتشار اور شخصی بے اعتمادی کو بھی انور سدید نے "اونگھنا" میں ہی تلاش کیا ہے۔

"آپ تین یا چار بڑوں کی چوٹی کانفرنس کا تصور کیجیے۔ کشمیر یا ویت نام یا فلسطین کا مسئلہ در پیش ہے۔ مندوبین دھواں دھار تقریروں میں مصروف ہیں دلائل و براہین کے دفتر کھل رہے ہیں۔ ایڑی چوٹی کا زور لگ رہا ہے لیکن ایک طرف وہ نو شیا اور بوجن کے ناتواں کندھوں پر ساری دنیا کے امن عامہ کی ذمہ داری ہے دانتوں میں پائپ دبائے بڑے سکون سے اونگھ رہے ہیں اور رائے شماری کے وقت انگشت شہادت کے ایک اشارے سے ساری دنیا کی دائمی اونگھ میں خلل ڈال دیتے ہیں۔"

انور سدید کے انشائیے میں مواد اور اسلوب دونوں باہم گتھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں خیال کی [illegible] کا احاطہ بھی ہے۔ ان کے انشائیے میں ظرافت کا بنیادی عنصر طنز ہے لیکن طنز میں بھی [illegible]

[illegible]

برمحل استعمال سے بجا ہے۔ یہ قاری کو متبسم کرنے کے ساتھ ہر جملے پر سوچنے کے لیے مجبور کرتے جاتے ہیں۔ طنز، تبسم اور گہری سوچ کی ایک مثال "مچھر کی مدافعت میں" سے دیکھیے!

" فطرت نے اس کے ہونٹوں کو خود لگا دیا ہے اس لیے بالعموم شراب کے قریب بھی نہیں جاتا۔ تاہم کسی محفل میں مفت کی مل جائے تو انسان ہی کی طرح بے بنائے ملکسار انکار نہیں کرتا۔"

"چپراسی دفتر کا مستقل ملازم ہے۔ دفتر کی آرائش اور زیبائش میں اس کی کہنہ مشقی اور طویل تجربہ شامل ہے۔ فائل سے اس کی دوستی دیرینہ اور رچتی ہے۔ چنانچہ جس فنکارانہ انداز میں فائیل کے بند قبا چپراسی کھولتا ہے۔ یہ انداز کسی بڑے سے بڑے مشتاق افسر کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ ہر چند وہ کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہے لیکن اس کی چھٹی حس بہت مضبوط ہے۔ وہ فائیل کو دیکھتے ہی بتا سکتا ہے کہ اس کے اندر کون سے انا دی راز پنہاں ہیں۔ فائیل چپراسی کی محبوبہ ہے اور اس سے کوئی راز پوشیدہ نہیں رکھتی اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کرتے ہی فائیل اپنا سینہ بنات النعش گردوں کی طرح اس کے سامنے بلا خوف عریاں کر ڈالتی ہے۔"

(ذکر اک پری وش کا)....

"مونچھوں کا اگنا ایک فطری عمل ہے۔ مگر انہیں پالنا ایک تہذیبی عمل شمار ہوتا ہے۔ جس طرح معاشرے کی انفرادی حیثیت کو ابھارنے کے لیے اسے تہذیب کی حد اتنی ہے کاٹنا ضروری ہوتا ہے، اسی طرح اگر مونچھوں کی تراش خراش میں سلیقہ نہ برتا جاتے تو یہ الجھے ہوئے معاشرے کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور شخصیت کو ابھارنے کی بجائے اسے دبانے لگتی ہیں۔ خوبصورت انداز میں تراشیدہ مونچھیں تو مرد کے چہرے کا زیور ہیں۔" (مونچھیں)

انور سدید زبان کی سلاست، بیان کی وضاحت اور خیال کے حسن کے توسط سے امکانات کی مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ ان کے فن کا راز صحیح الفاظ کے برمحل استعمال میں پوشیدہ ہے۔ اور ان کی نظر بہت بادون، مگر بیباک بھی ہے:

"میں نے اپنی خواہشات کا تجزیہ کبھی نہیں کیا۔ تجزیہ کرنے سے خواہشیں اپنا اصلی رنگ کھو دیتی ہیں۔ خواہشوں کے ہزاروں رنگ اور سینکڑوں روپ ہیں۔ خواہشیں تو بادل کی طرح لچکیلی اور نرم ہوتی ہیں۔ لاشعور کے سمندر سے اٹھتی ہیں اور پھر بلندی پر پہنچ کر آپ کی شخصیت کے پورے کرنے کو اپنے حصار مسرت میں لے لیتی ہیں۔ یہ ہر لمحہ نیا پیکر تراش کر آپ کو نت نئے جلوؤں سے مسحور کرتی ہیں۔ یہ کبھی سمندر کی طرح گہری اور پرسکون ہوتی ہیں اور کبھی مفلس کی جیب کی طرح کھوکھلی اور مضطرب۔ دونوں صورتوں میں خواہشیں موجود سے برسرِ پیکار رہتی ہیں اور حسب آرزو ایک نیا موجود تشکیل دینے کی کوشش کرتی ہیں۔" (ہزاروں خواہش ایسی)۔

انور سدید کے یہاں موضوعات میں تنوع ہے اور تازگی کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔

" اس وقت میں اپنے جسم کو کھردری چارپائی پر چھوڑ دیتا ہوں اور روح کے آزاد سفر پر روانہ ہو جاتا ہوں۔ اب میری منزل نہ زمینوں پر ہے، نہ آسمانوں پر بلکہ میں خلاء کا ایک مسافر ہوں جس کا دل ستاروں کے ساتھ دھڑک رہا ہے۔ اب یہ مٹی کا بیا بان یہ مٹی کا ٹکڑا نہیں رہا۔ بلکہ مجسم نور بن گیا ہے۔ اس سے مدھم مدھم روشنی نکل رہی ہے۔ یہ روشنی زمین کے محیط پر ایستادہ ہونے کے باوجود ان گنت ستاروں کی روشنی میں مدغم ہو رہی ہے اور کہکشاں کے اس راستے کو استوار کر رہی ہے جو الا تمام روشنیوں کو جلو میں لے کر ساتویں آسمان کو جاتا ہے۔"

(تاروں بھری رات)

طنز کا مقصد صرف تمسخر نہیں بلکہ اصلاح بھی ہے۔ اس کی بنیاد ناپسندیدگی یا نفرت کے اس جذبہ پر ہے جو وسعت پا کر آفاقی ہو جائے۔ مکمل طنزیہ اسلوب اور طنزیہ رنگ کی مثالیں اردو میں کم ملتی ہیں۔ انور سدید کے یہاں طنز بھرپور، گہرا اور آفاقی

اسلوب لیے ہوئے ہے:

"ہمارے سب سے بڑے قومی شاعر اقبال نے ثابت کر دیا ہے کہ مرد مومن میں جن اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے وہ سب شیطان میں موجود ہیں۔ وہ خودی کو بلند رکھتا ہے، جھپٹتا ہے، پلٹتا ہے اور پھر جھپٹنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ شیطان کے نزدیک یہ لہو گرم رکھنے کا بہانہ نہیں بلکہ ایک طرزِ حیات ہے۔" (دخل در معقولات / تنقید)

"میرا انسانی تہذیب کی ارتقائی علامت ہے۔ لیکن ہیجان انسان کے اوّلین حیوانی دور کا مظہر ہے۔ جون میں انسان کلچر سے قطعاً محروم ہو جاتا ہے۔ تہذیب کے سارے آداب بھول جاتا ہے اور بدن کا فطری لباس زیب تن کر کے، ہڈیوں کے چٹخنے کی پروا کیے بغیر اپنے بالوں بھرے جسم کو زمین کی خوشبو دار مٹی میں روندنے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے۔ اس مہینے میں انسان ایک بار پھر آدم کی طرح اکیلا ہو جاتا ہے۔ تہذیب کے جملہ لوازم پر تین حرف بھیج کر کھلے میدان کو اپنا مسکن بناتا ہے۔ اور تاروں کی چھاؤں تلے بیوی بچوں سے بے نیاز تنہائی کی گپھا میں ڈوب جاتا ہے۔ مردم بیزاری کے اس لمحے میں اگر بیوی پنکھا لے کر قریب آنے کی کوشش بھی کرے تو بڑی بے رحمی سے دھتکار دی جاتی ہے۔"

(دسمبر)

بامحاورہ اور شستہ زبان، لہجہ کی بےباکی اور اظہار کی صفائی جیسے جوہر کے ساتھ انور سدید نے اپنی نظر کے دائرے کو بعد وسعت دی ہے:

"پڑوسی ایک ایسی مخلوق ہے جو معاملے کو ذاتی فائدے کے علاوہ کسی اور نظر سے دیکھ ہی نہیں سکتی۔ سچ میں چونکہ زبان ہی زبان ہے اس لیے پڑوسیوں کو ایک نظر نہیں بھاتا اور اگر کبھی آپ سچ کا ارتکاب کر ڈالیں تو پڑوسی کوس کوس کر آپ کا جینا حرام کر ڈالتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ کے محلے میں کسی شریف آدمی نے اسمگلنگ کا کاروبار شروع کر رکھا ہے اور آپ اُسے پیشے کی مناسبت سے "اسمگلر" قرار دیتے ہیں تو بظاہر یہ ایک ایسا سچ ہے جو گرامر کے اعتبار سے بھی درست ہے لیکن یہ کڑوی گولی آپ کے پڑوسی کے حلق سے قیامت تک نہیں اترے گی۔ اور اُسے اس وقت تک ہرگز چین نہیں آئے گا جب تک کہ وہ آپ کے آباؤ اجداد کو بھی اسمگلروں کے زمرۂ شرفا میں شامل نہ کر لے گا۔ پس کیا اس سچ کو آپ کی حماقت قرار دینا مناسب نہیں؟ اس کے برعکس اگر آپ اپنے اس معزز پڑوسی کا تعارف ایک نامور امپورٹر اور ایک معتبر ایکسپورٹر کے طور پر کرائیں گے تو یقیناً آپ کو منہ کا ذائقہ تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ لیکن فائدہ یہ ہوگا کہ آپ کے آباؤ اجداد کی عزت محفوظ رہے گی۔" (جھوٹ، سچ)۔

اندرونی اور بیرونی عوامل نے آج ہمارے معاشرے کو طبعی، نفسیاتی اور ذہنی اعتبار سے پیچیدہ بنا رکھا ہے۔ انور سدید واقعات اور مسائل کی ان پیچیدگیوں میں مزہ لیتے ہیں کیوں کہ زندگی کے موجودہ طور طریق کو وہ سمجھتے ہیں۔

میرا تجربہ ہے کہ غیر متعارف لوگوں سے بامعنی یا بے معنی اختلاف کرنا عقلمندی کی نشانی ہے۔ لیکن اختلاف جب دوستوں پر عمل میں لایا جائے تو قرض کی طرح ... نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے۔ (فٹ نوٹ)

"کل صبح جب میں اپنے ننھے بیٹے کی انگلی تھامے باغ میں سیر کے لیے گیا تو دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی بوسیدہ لباس پہنے دبیز چشمہ لگائے، موٹی سی سفید چھڑی ہاتھ میں لیے ٹہلتی روش پر ٹہل رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک ملکوتی چمک اور چہرے پر بے پایاں تقدس تھا۔ کمر کی خمیدگی کے باوجود وہ ایک عجیب سے احساسِ تفاخر سے سر اٹھا کر چل رہا تھا۔ اس کی راہ میں بے شمار کانٹے بکھرے تھے۔ لیکن اس کے قدم لغزیدہ نہیں تھے۔ میں اُسے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا اور سامنا ہوتے ہی خوشی سے بے دم ہو گیا۔

"ارے! یہ تو میرا محسن دیرینہ بوڑھا بچہ ہے!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور میں لپک کر اس سے بغل گیر ہو گیا۔ اسی لمحے میرے بیٹے نے اپنی انگلی چھڑائی اور یہ کہتے ہوئے بھاگ گیا "ابو! یہ تو ہمارا ہیڈ ماسٹر ہے۔ (جھوٹ سچ)

انشائیے فرد کے احساسات اور خیالات کے موازنہ میں مدد و معاون ہوتے ہیں۔ انشائیے نفسیاتی تسکین دیتے ہیں۔ فرد کے اور تصورات، نظریات اور معتقدات کو معقولیت بخشتے ہیں۔

JAMES SUTHERLAND نے طنز نگار کے بارے میں لکھا ہے کہ:

THE SATIRIST IS NOT THE ONLY MAN WHO MAKES US LOOK BENEATH THE SURFACE OF THINGS, WHAT WE HAVE FORGOTTEN OR HAVE HITTO IGNORED, WHO MAKES US SEE FAMILIAR THINGS IN A NEW AND POSSIBLY SHOCKING LIGHT

(ENGLISH SATIRE-P-11)

اگر اس تعریف کو انشائیہ پر منطبق کیا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کیونکہ وہ صرف سطحی چیزوں کی جانب ہماری توجہ مبذول نہیں کراتے، بلکہ اس بات پر بھی آمادہ کرتے ہیں کہ جن باتوں کو ہم فراموش کر چکے ہیں ان کو دوبارہ تازہ کیا جائے اور ایسی اشیاء جن سے ہم واقف ہیں اور جو ہماری نظروں سے اوجھل ہیں انہیں روشنی میں لایا جائے۔

چشم دید

(طنزیہ و مزاحیہ مضامین)

مبصر: ڈاکٹر محبوب راہی (بارسی ٹاکلی)

مصنف: حیدر بیابانی ، قیمت: بیس روپے

ملنے کے پتے: حیدر بیابانی۔ بسیرا۔ اچل پور سٹی۔ ضلع امراوتی

اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵۔

ہندوستان میں طنز و مزاح کی ترویج و اشاعت اور
سے عز و وقار عطا کرنے میں زندہ دلانِ حیدرآباد اور ان کا
جان ماہنامہ شگوفہ بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں
ں ضمن میں انکسار کے تکلفات سے پرے اس روشن حقیقت
طرف اردو حلقوں کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ مہاراشٹر
علاقہ ودربھ میں اور بالخصوص اس کے دو ضلعوں اکولہ
امراوتی میں طنز و مزاح میں لکھنے والوں کی ایک بڑی ٹیم
ار دمیعاد دونوں اعتبار سے ہندوستان گیر شہرت کی حامل
اور انھیں یک جا کیا جائے تو "زندہ دلانِ ودربھ" کسی
حالت میں زندہ دلانِ حیدرآباد سے کم تر نہ ہوگی۔
طنز و مزاح کے لیے اس علاقے کی مٹی بے حد زرخیز
ت کے لیے سید صفدر، فیاض افسوس، بانو سرتاج،
در بیابانی، بابو آر کے، شیخ رحمٰن اکولوی، شکیل اعجاز،
س فاروقی، اسد اللہ اور اصغر جمیل کے نام پیش
ے جاسکتے ہیں جو اپنی تخلیقات کے ذریعے وسیع سے وسیع تر ادبی
ں میں بحیثیت طنز و مزاح نگار خاصا نام کما چکے ہیں
یں زیر تبصرہ کتاب کے مصنف حیدر بیابانی اپنا ایک
یازی مقام رکھتے ہیں۔

حیدر صاحب شعر و ادب کی تمام اصناف پر ہاتھ صاف
تے رہتے ہیں۔ ان کی ادبی فتوحات کا دائرہ خاصا وسیع
ہے۔ اخبار و رسائل کے توسط سے شعر و ادب کے ہر میدان
میں شہرت و ناموری کے جھنڈے گاڑ چکے ہیں۔ "چشم دید"
ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ اسی
نوع کا ایک شعری مجموعہ "الٹی سیدھی باتیں" عنقریب شائع
ہو رہا ہے۔ ثابت ہوا کہ طنز و مزاح حیدر بیابانی کی گھٹی میں
میں پلایا گیا ہے۔ ان کی فطرت میں رچا بسا ہے۔ "چشم دید" کے
۱۲۸ صفحات پر محیط ان کے اکیس مضامین ان کے حقیقی اور
اور فطری مزاح نگار ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ طنز و مزاح
کو انھوں نے اپنے اوپر اوڑھا نہیں ہے بلکہ یہ کیفیت خون بن
ان کے رگ و پے میں دوڑ رہی ہے۔ اپنے دعوے کی صداقت
میں انھی کے مضامین سے چند اقتباسات پیش کر رہا ہوں:

"سرکاری اکادمیوں کی فراخدلی دیکھ کر لگتا ہے
کہ آئندہ چند سالوں میں ہر گھر سے ایک صاحبِ کتاب
کے نکلنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔"

(ہم صاحبِ کتاب ہوئے)

"فرصت میں کام کئی کام کیے جاسکتے ہیں۔ اپنے چھیتے
کتے کی دم سیدھی کی جاسکتی ہے۔ فراق یار میں تارے
گنے جاسکتے ہیں ..... شعر لکھے جاسکتے ہیں اور
عرض کیے جاسکتے ہیں۔"

(فرصت کے دن رات)

کالج کی سرزمین مخالفت کے پودے اگنے بڑھنے، پھلنے پھولنے کے لیے بڑی زرخیز ہوتی ہے۔ یہاں مخالفت کرنے کے طریقے سکھائے جاتے ہیں اور مخالفت کے نئے نئے سبق پڑھائے جاتے ہیں۔

(مخالفت)

آخر میں چند عنوانات ملاحظہ فرمائیے اور حسِ مزاح کو بروئے کار لاتے ہوئے لفافہ دیکھ مضمون بھانپ لیجئے۔

"ڑ کی اہمیت" "فنِ دماغ گری" "تیل کے کھیل" "نمک کی چا" "باکمال شوہر" "بدزبان بیویاں" وغیرہ۔ خوب صورت خوش رنگ سرورق، دیدہ زیب کتابت۔ اعلیٰ ستھری طباعت کی خوبیوں سے آراستہ یہ کتاب مذکورہ بالا پتہ خرید کر پڑھی جاسکتی ہے خود بھی محظوظ ہوا جاسکتا ہے سنا کر یاروں کی ضیافتِ طبع کا سامان بھی کیا جاسکتا

دے کے خط

مراسلے



برادرم مصطفیٰ کمال صاحب

آپ کی تصنیف حیدرآباد میں اردو کی ترقی ؛ کا ایک نسخہ ملا ، بے حد شکر گزار ہوں۔

جستہ جستہ کتاب کو دیکھا تو اندازہ ہوا کہ ریاست حیدرآباد میں اردو کے چلن اور اس کی ترقی کا کوئی گوشہ آپ سے چھوٹا نہیں ہے اور اس میدان میں آپ نے تحقیق کا حق ادا کردیا ہے اصل دستاویزات تک رسائی حاصل کرکے آپ نے حقائق جمع کیے اور پھر ان کو علمی استدلال سے اور نہایت سلجھے ہوئے اسلوب میں پیش کیا۔ مسعود صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ آج کل ایسے تحقیقی مقالے شاذ و نادر لکھے جاتے ہیں۔

اس قابلِ قدر تصنیف پر دلی مبارک باد قبول کیجیے۔

ڈاکٹر قمر رئیس۔ نئی دہلی

محبی و آداب !

آپ کی گراں قدر تصنیف کی رسم اجرا کی تقریب کا دعوت نامہ مل گیا تھا۔ یہاں کی مصروفیات کے باعث اس موقع پر حیدرآباد آنا ممکن نہ ہوسکا ورنہ ضرور حاضر ہوتا۔ میں نے "شگوفہ" کے دفتر میں مبارک باد دے دی تھی۔ ایک اور مرتبہ مبارک باد قبول فرمایئے۔

رسم اجرا کی تقریب کی روداد حیدرآباد کے اخباروں میں پڑھ چکا تھا اور چند لمحوں تک محسوس کرتا رہا کہ میں بھی اس تقریب میں شریک ہوں۔ آپ نے بھی مجھے وہاں محسوس کیا ہوگا۔ "شگوفہ" میں بھی روداد ایک اور مرتبہ پڑھنے کو ملی۔ گویا ایک اور مرتبہ میں اس تقریب میں شریک رہا۔ مسیح انجم کا

کا خاکہ اور طالب خوندمیری کی نظم ، دونوں عمدہ ہیں۔ آپ کی تخلیکی پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں یہ دونوں اصحاب کامیاب رہے۔ ان دونوں کو بھی مبارک باد۔

قبل ازیں سالنامہ مل چکا تھا۔ دلیپ سنگھ کا انشائیہ خاص طور پر پسند آیا۔ بالخصوص آخری حصے میں انھوں نے اپنے والد کا حوالہ دیتے ہوئے بے پناہ اور غضب کا طنز کیا ہے۔ انتہائی بلیغ انداز میں —

(پروفیسر) سلیمان اطہر جاوید، تروپتی

محترمی مصطفیٰ کمال صاحب

السلام علیکم

ابھی کل ہی مارچ ۱۹۹۱ء کا "شگوفہ" ملا اس میں آپ کی کتاب "حیدرآباد میں اردو کی ترقی" کی رسم اجرا کی اطلاع بھی ملی۔ آپ کو بہت بہت مبارک باد ہو۔ آپ نے اپنی تحقیق کے لیے جس موضوع کا انتخاب کیا تھا وہ بڑی دیدہ ریزی کا متقاضی تھا اور اس سے آپ ہی جیسا باعزم محقق تکمیل تک پہنچا سکتا تھا۔ حیدرآباد آئے کافی عرصہ ہوگیا۔ حیدرآباد آنے اور آپ سب اصحاب سے ملاقات کا بڑا جی چاہ رہا ہے۔ بہانے کی تلاش میں ہوں۔

(ڈاکٹر) سید حامد حسین۔ بھوپال

مکرمی ایڈیٹر صاحب

اپریل کا شگوفہ ملا۔ مضمون کی اشاعت اور کاپی کی روانگی کے لیے شکریہ۔

کتابت اور طباعت میں تبدیلی کی اطلاع بہت خوشگوار ہے اب براہ مہربانی ذرا پروف ریڈنگ پر بھی توجہ دیجیے۔ آپ نے میرا مضمون شائع کرکے مجھے حیران کردیا ہے لوگ تو صرف اونچی دکان ، بڑا نام اور سفارشوں سے چھاپا کرتے ہیں۔

یوسف بیگ ، کنیڈا

[illegible] مکمل
[illegible] لکھا ہے کہ [illegible] خوبی تھی [illegible]
[illegible] کے مدیر صاحب
[illegible] صاحب چاہیں تو پہلے
[illegible] مصنف بن جانا کوئی کمال
[illegible] کہ آپ نے ہر ماہ پابندی سے
[illegible] قلمکاروں کو موضوع نگار بنا دیا اور
[illegible] کو صاحب کتاب بھی مدیر نے مصنف
[illegible] میری جانب سے تہہ دل سے مبارکباد
[illegible] نے مسیح انجم کا خاکہ لکھنے میں اپنے فن کا
[illegible] مسیح نے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر خاکہ
[illegible] اس لیے خاکہ جاندار اور شاندار ہو گیا ہے۔"

منظور وقار – گلبرگہ

[illegible] صاحب، آداب و تسلیمات!

[illegible] صاحب کتاب ہونے پر مبارکباد قبول

[illegible] اللہ کرے زور قلم اور زیادہ"
[illegible] منظر عام پر آ رہا ہے۔ ۲۵ سال نمبر کر دیا
[illegible] گا۔ میرا خیال ہے پچیسویں سال گرہ پہ
[illegible] بہتر ہوگا۔

مجیب [illegible]

[illegible] مسیح انجم کا خاکہ کیا
[illegible] بہتر اور دلچسپ [illegible] سب
[illegible] آپ [illegible] حل کر [illegible]
[illegible]

[illegible]
نے "مرد شہر" میں میرے دل کی بات کہی ہے۔ حقیقت [illegible] کی
نظر میں خوب ہے "حسرت [illegible] ایک [illegible]" [illegible]
ادبی [illegible] میں سے ایک ہے۔

انور [illegible] – [illegible]

بوگس حیدرآبادی کے انتقال پر تعزیت

بوگس کے انتقال کا بہت دکھ ہے۔ ساتھی اور وہ بھی ہم سے کم عمر ساتھی اس طرح بچھڑ جائیں تو بے حد دکھ ہوتا ہے۔

مجتبیٰ حسین – نئی دہلی

شگوفہ [illegible] خوشی ہوئی مگر اداریہ پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔ میرے بہت اچھے دوست اور زندہ دلان حیدرآباد کے سرگرم اور سینیئر رکن حضرت بوگس حیدرآبادی مرحوم، جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے دل بیٹھا جا رہا ہے کی خبر پڑھی اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور مرحوم کے خاندان کے لوگوں کو صبر جمیل عطا کرے۔ مرحوم سے میری آخری ملاقات شری نگر کشمیر میں ہوئی تھی۔ موصوف بہت نیک ہونے کے ساتھ بڑے باغ و بہار انسان تھے۔

خورشید [illegible] – [illegible]

محترم بوگس حیدرآبادی کے انتقال کی خبر [illegible]
بے حد رنج ہوا۔ مرحوم [illegible]
بہت اچھے [illegible]
[illegible]

زندہ دلان حیدرآباد کا
ترجمان

شگوفہ

جلد ۲۴ شمارہ ۷
جولائی ۱۹۹۱ء

ایڈیٹر :
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلس ادارت :
مضطر مجاز
محمد عنایت اللہ
صلاح الدین نیر
طالب خوندمیری،

مجلس مشاورت :
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
یوسف ناظم
مجتبیٰ حسین،

خصوصی نمائندے :
بمبئی — فیاض احمد فیضی
ریاض — عابد معز
دوبئی — غلام نجم الدین
آسٹریلیا — ایس ایم حسینی

طباعت : دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد
فی پرچہ : ۵ روپے زرِ انفرادی : ۵۵ روپے
لائبریریوں سے : ۶۰ روپے، غیر ممالک سے : ۲۵۰ روپے۔

شگوفہ ۳۱ میڈیکل کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۔ ۱
فون آفس : 557716 مکان : 521064

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

ابراھیم یوسف
(بھوپال)

شرافت اور شریف

لفظ شریف ایک عزت دار اور باوقار لفظ ہے لیکن عزیز محترم خدا کو حاضر ناظر جان کر قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ جس شخص کے لئے بطور صفت استعمال ہوتا ہے وہ یا تو بے حد مسکین ہوتا ہے یا بے ضرر یا پھر بزدل اور احمق۔ ہم تہذیب کے دائرہ میں رہ کر یہ نہیں کہتے کہ وہ احمق یا چغد ہے بلکہ کہتے ہیں کہ "بیچارہ بڑا شریف ہے" عزیز محترم کی تحقیق کے مطابق شرافت دو لفظوں سے مل کر بنا ہے یعنی شر اور آفت سے۔ جس شخص کے لئے یہ صفت استعمال کی جاتی ہے شر اور آفت اس کا گھر دیکھ لیتی ہیں اور تمام عمر وہ ان کی ستم ظریفیوں کا شکار رہتا ہے۔ عزیز محترم دعوے سے کہتے ہیں کہ اس لفظ کا استعمال تاریخ کے اس دور میں شروع ہوا جب جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون نافذ تھا۔ جو لوگ اس قانون سے مستفید ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے حقارت سے شریف کہلاتے تھے۔ یہ لوگ چونکہ قدرت کی ستم ظریفی سے دنیا میں ورود فرما لیتے تھے اسلئے بالعموم ایسے پیشے اختیار کرتے تھے جو موجودہ اصطلاح میں غیر پیداواری کہلاتے تھے جیسے تصنیف و تالیف یا معلمی وغیرہ اور آدھا پیٹ کھا لینے کو اپنی خوش بختی سمجھتے تھے کہ خدا نے ان کی قسمت میں اتنا ہی لکھا ہے۔ عزیز محترم نہایت رنج و افسوس کے ساتھ فرماتے ہیں کہ تاریخ میں ایک ایسا دور بھی گذرا ہے جب ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جو خود کو شرفاء کے نام سے موسوم کرتا تھا اس نے اپنا رہن سہن، اپنی زبان اور اپنی تہذیب علحدہ سے تشکیل دی تھی جو دیکھنے میں بڑی دلکش نظر آتی تھی لیکن درحقیقت یہ دور کل یگ تھا جس میں شرافت کے نام پر انسان ہزاروں پابندیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ بھلا یہ کونسی شرافت تھی کہ چھوٹوں کو بزرگوں کے سامنے زبان کھولنے کی بھی آزادی نہیں تھی اور خطائے بزرگاں گرفتن خطا است پر عمل کیا جاتا تھا۔ اٹھنے بیٹھنے، پہننے اوڑھنے، ملنے جلنے یعنی ہر چیز پر شرافت نے قبضہ جما رکھا تھا۔ نوجوانوں کو لڑائی جھگڑے، مار پیٹ وغیرہ سے دور رکھا جاتا تھا تاکہ وہ بزدل بن جائیں ہاں عزت کے نام پر عدالتوں کے چکر میں پڑ کر اپنی لاکھوں کی جائیداد تباہ کر دینے میں یہ طبقۂ شرفاء فخر محسوس کرتا تھا لیکن یہ کل یگ زیادہ عرصہ قائم نہیں۔ عوام نے طبقۂ شرفاء ان کی تہذیب اور شائستگی وغیرہ کو بیک قلم منسوخ کر کے ایک ایسے طبقہ کو ابھارا جو پیسہ کمانے کا گر جانتا تھا۔ تم نے وہ کہاوت تو سنی ہوگی۔ مایا تیرے تین نام۔ پرسا، پرسوں، پرس رام۔ بس جس دن پرسا پرس رام بنے ساری تہذیب ان کی مٹھی میں آگئی اور بقول بھوپالیوں کے شرافت پٹیوں پر آگئی، پرانی تہذیب اور شائستگی دھائی دیتی رہ گئی اور نوجوانوں کو خدا خدا کر کے شرافت کے بندھنوں سے چھٹکارا ملا۔ اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ اگر سڑک پر دو چار ہیرو ٹائپ نوجوان آتے ہیں تو اپنے آپ کو شریف کہنے والا بیچارہ سڑک کنارے سے سر جھکا کر گذر جانے ہی میں عافیت محسوس کرتا ہے کہ کہیں وہ اس کی شرافت کا اپنے ڈھنگ سے سودا کرنے پر آمادہ نہ ہو جائیں، سچ مانو میاں لفظ شرافت تو اب گالی کے مترادف بن

گیا ہے اور شرافت مصیبت بن گئی ہے۔ ابھی دو چار روز کا ذکر ہے کہ معین بھائی کے ساتھ عجیب واقعہ پیش آیا۔ معین بھائی کو تم جانتے ہو اپنے آپ کو شریف کہتے ہیں۔ ان کے پڑوس میں ایک گرلس اسکول ہے۔ دن بھر ان کے گھر کے سامنے سے آنا جانا لگا رہتا ہے اور چھٹی کے وقت تو پرے کے پرے گذرتے ہیں۔ محلہ میں کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جسے ناخوشگوار کہا جاسکے لیکن اب معین بھائی دو چار دن سے دیکھ رہے تھے کہ تین چار نوجوان جن کے بال پتھر کے دور کے انسان کی یاد دلاتے تھے اور جنہوں نے شوخ رنگ کے شرٹ نیلے پیلے لباسوں کو اپنے جسموں پر منڈھ رکھا تھا آتی جاتی لڑکیوں پر آواز کستے اور سیٹیاں بجاتے معین بھائی کو یہ بات نہایت ناگوار گذرتی جب انھوں نے لڑکوں سے اس حرکت سے باز رہنے کو کہا تو ان میں سے ایک بولا "بڈھے وہ تیری کیا لگتی ہیں جو تجھے فکر پڑی ہے۔ "بڑا آیا شریف کہیں کا" معین بھائی شریف ہونے کی گالی کو تو برداشت کر لیتے مگر بڈھے جیسی گالی کو برداشت نہ کرسکے کیونکہ کوئی مرد یہ گالی برداشت نہیں کرسکتا بس انھیں بھی طرارہ آگیا اور بات اس قدر بڑھی کہ ان لڑکوں نے معین بھائی کے گھر پر سنگ باری شروع کی مکان کے شیشوں نے شہادت کا درجہ حاصل کرلیا۔ وہ تو محلہ ایک دادا آگیا اور اس نے لڑکوں کو دو چار گالیاں دے کر بھگا دیا لڑکے بھاگتے بھاگتے معین بھائی کو دیکھ لینے کی دھمکی دے گئے اس واقعہ کا عبرت ناک پہلو یہ ہے کہ کوئی شریف معین بھائی کی مدد کو نہیں آیا۔ معین بھائی نے یہ سوچ کر کہ ان کا مالی نقصان ہوا ہے اور انھیں دیکھ لینے کی دھمکی بھی دی گئی ہے اس لئے پولیس میں رپورٹ درج کرادینا چاہیئے پولیس اسٹیشن جا پہونچے گھنٹے دو گھنٹے تو پولیس والوں نے انھیں شریف سمجھ کر لفٹ ہی نہ دیا لیکن جب ان کا اصرار بڑھا تو ایک پولیس والا ان کی طرف متوجہ ہوا اور پورا واقعہ سننے کے بعد بولا "آپ نے دوسروں کے پھٹے میں پیر کیوں الجھایا تھا جو کچھ ہو رہا تھا ہونے دیا ہوتا یہ لڑکیوں اور لڑکوں کا مسئلہ تھا خود سلجھا لیتے" اس پر معین بھائی بولے "مگر یہ کونسی شرافت ہے کہ ——" پولیس والا پھر بات کاٹ کر بولا۔ "ہماری لغت میں شرافت اور شریف جیسے نامعقول لفظ نہیں ہیں جو شخص بھی پولیس اسٹیشن میں داخل ہوتا ہے اپنے شریف ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور اپنی شرافت کی دُھائی دیتا ہے جیسے یہ الفاظ دافع آفات اور بلیات کا تعویذ ہوں"

"لیکن جناب والا! غور فرمایئے کہ چھوٹی چھوٹی معصوم بچیوں کے ساتھ ایسی نازیبا حرکات کیسے برداشت کی جاسکتی ہیں"

معین بھائی نے کہا۔

"آپ خدائی فوجدار ہیں کہ سارے جہاں کا درد آپ کے جگر میں ہے اور آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ لڑکیاں بھی آپ کی طرح شریف ہیں جیسے کو تیسا جواب دینا نہیں جانتیں اور یہ کہ ان کے پیروں میں چپلیں نہیں ہوتیں"۔

اب تو معین بھائی چکرا گئے کہ اس منطق کا کیا جواب دیں ہکلاتے ہوئے بولے "مگر جناب والا ——" کہ پولیس والا بات کاٹ کر طنزیہ بولا "جناب شریف صاحب! ان لڑکوں کو تو ہم بعد میں دیکھیں گے ہی مگر آپ کے خلاف بھی نقضِ امن کا مقدمہ قائم ہوگا آپ جیسے بہ خود شریف بلا وجہ پولیس کا کام بڑھاتے رہتے ہیں۔ آپ یہیں ٹھہریئے اور اپنی ضمانت کا انتظام کیجئے" یہ کہہ کر وہ پولیس والا تو چلا لیکن معین بھائی کی شرافت کو دن میں تارے نظر آنے لگے وہ تو محلہ کے اسی دادا نے آکر پولیس والوں سے دو چار باتیں کیں تب کہیں جا کر معین بھائی کی جان چھوٹی ورنہ محلے کے شریف شرفا تو دم دبا کر بیٹھ گئے تھے۔ بخدا میاں اب تو خود کو شریف کہتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں اس کی وجہ سے کسی شر کا شکار ہو کر کسی آفت میں مبتلا نہ ہو جائیں کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ ہم نے شرافت کا جو لبادہ اوڑھ رکھا ہے کہیں وہ ہمارے جسموں پر اس قدر نہ کس جائے کہ ہم سانس بھی نہ لے سکیں؟ عزیز محترم کچھ دیر خاموش رہے پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولے "باہر کے لوگوں کا کیا رونا خدا! گھر والوں کی حالت کہاں کی بہتر ہے۔ ایک روز میں نے اپنے چھوٹے صاحبزادے سے کہا میاں آپ نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے

بھیڑوں کے بال بھی سال میں ایک بار تراش دیئے جاتے ہیں مگر آپ نے تو سالہا سال سے حجام کو تکلیف نہیں دی بس کھچڑی چوٹی اور پچکے سا موباف ڈالنے کی کسر رہ گئی ہے۔ کم از کم صورت ہی شریفوں جیسی بنالو اس پر صاحبزادے نے فرمایا "پاپا ابھی تک آپ فرمایا کرتے کہ یہ کام شریفوں کا ہے یہ کام شریفوں کا نہیں اب آپ کو صورت میں بھی شریف اور غیر شریف نظر آنے لگے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ جسے شرافت کہتے ہیں اس کا دائرہ کہاں تک پھیلا ہوا ہے کسی روز آپ یہ نہ کہنے لگیں کہ یہ کھانا شریفوں کا ہے اور یہ شریفوں کا نہیں۔ اس شرافت نے تو زندگی دوبھر کر رکھی ہے۔ آخر مجھے سوسائٹی میں موو کرنا ہوتا ہے۔ اگر میں آپ کی شرافت کا جامہ پہن لوں تو سوسائٹی میں میری کیا عزت رہ جائے گی۔ آج کل آپ کی مردہ شرافت کا زمانہ نہیں فیشن کا دور ہے" عزیز محترم سانس لینے کے لئے رکے پھر بولے "میاں شرافت پر انھوں نے ایک گھونسہ مارا کہ ہم خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اول تو اس لئے کہ انھوں نے شرافت کو مردہ قرار دیا۔ گویا ان کے نزدیک شرافت ہمارے زمانہ کا فیشن تھا جس کا زمانہ ہو چکا ہے۔ دوسرے اسلئے کہ انھوں نے ہمیں پاپا کہا جبکہ ہم انھیں کئی مرتبہ تاکید کر چکے ہیں کہ وہ ہمیں اباجان کہا کریں پاپا تاپا نہیں۔ ان کی ماں نے ہمیں بتلایا کہ صاحبزادے پوچھ رہے تھے کہ ممی یہ کھچڑی چوٹی کیسی ہوتی ہے اور یہ پچکے کا موباف کیا ہوتا ہے کیا یہ شرافت میں استعمال کیا جاتا ہے انھوں نے اپنی ماں سے یہ بھی کہا کہ یہ دور پاپاؤں کا ہے۔ اباجانوں کا نہیں۔ کیا پاپا کے خیال میں اباجان میں بھی شرافت کے جراثیم ہیں کہ میرے اباجان کہنے سے ان کی شرافت میں چار چاند لگ جائیں گے۔ شرافت کی دہائی دیکر وہ اپنی اولاد کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ عزیز محترم کچھ دیر چپ رہے پھر ٹھنڈی سانس لیکر بولے "میاں اب اور کیا کہیں انھوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ہماری وضع قطع دیکھ کر دکاندار ہمیں ٹھگ لیتا ہے اور ہر چیز کی زیادہ قیمت وصول کر لیتا ہے جب گھر میں ہی صاحبزادے شرافت کا جنازہ کاندھے پر اٹھا چکے ہیں تو باہر شرافت کی کھوج فضول ہے۔ اب شرافت تو محض کفن ہے جو آپ نے ہم نے پہن رکھا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ایسا چاک ہو کہ ہم بالکل ننگی لاشیں رہ جائیں" عزیز محترم اسقدر جذباتی ہو چکے تھے کہ آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

●●

حضرت ضمیر جعفری کی زمین پر "سخن بوئی" ـــــ طالب خوندمیری

بے کاروں سے یاری کیا!
ایسی بھی لاچاری کیا!

سیدھے سادے جینے میں
دکھلائیں فن کاری کیا!

قطرہ قطرہ پینے سے
پیاس بجھے ہے، ساری کیا!

چپ رہنا ہی جب ٹھہرا
غفلت کیا، بیداری کیا!

سچ کہنے میں، کیا بولیں
ہوتی ہے دشواری کیا!!

اک نشّہ ہے دونوں میں
تقویٰ کیا، مے خواری کیا!

مرنا جب آسان نہ ہو
جینے سے بے زاری کیا!!

دن نکلا، پھر بھی، ہم پر
نیند ہوئی ہے طاری کیا!

اب کے، اگلی قدروں پر
ضرب لگی ہے کاری کیا!

سر منڈوایا واعظ نے
ہوگی ژالہ باری، کیا!

زو میں چیتے، شیر، ببر
کھاتے ہیں ترکاری کیا!

چھت میں جب کھپریل نہ ہوں
گھر کی آستر کاری کیا!

بند ہیں اس میں کیا کیا بھید
دل بھی ہے، الماری کیا!

تنہائی میں ہوتی ہیں
باتیں پیاری پیاری کیا!

طالب تیرے لہجے میں
نشتر ہیں دو دھاری کیا

خورشید اکرم (دہلی)

ادبی رسالہ

کہتے ہیں کہ کتاب انسان کی بہترین دوست ہے۔ اس کہاوت کو اگر درست تسلیم کر لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ رسالہ بہترین دوستوں کی انجمن ہے اور دوستی انسان کی سرشت میں ہے اس طرح انسان اور رسالے میں گہرا رشتہ ہے۔ لیکن رسالہ اور انسان میں سب سے نمایاں فرق یہ ہے کہ رسالہ کی پیشانی پر اس کا نام لکھا ہوتا ہے۔ اس فرق سے قطع نظر رسالہ اور انسان میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ جس طرح مختلف قسم کے انسان ہوتے ہیں، لمبے، ناٹے درمیانے، گورے، کالے گندمی (گیہوں کے نہیں) . . . . بدصورت، مہذب، غیر مہذب، وغیرہ وغیرہ اسی طرح رسالے بھی مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ڈیمائی سائز، فل اسکیپ سائز، رائل سائز، کراون سائز (کراؤن اس کو کہتے ہیں جو عہد شاہی میں ملکہ ممکلت کے سر پر ہوتا تھا، جمہوریت میں ملکہ حسن کے سر پر ہوتا ہے) ٹریڈل پریس میں چھپنے والے رسالے، لیتھو پر چھپنے والے اور آفسٹ پر چھپنے والے رسالے ایک دوسرے سے اتنے ہی مختلف ہوتے ہیں، جتنا گاؤں، قصبہ اور شہر۔ سادہ، باتصویر اور رنگین رسالے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور مختلف ہی نظر آتے ہیں۔ انسان کی طرح نہیں کہ (بہ زبان غالب)؎

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

اردو کا ادبی رسالہ تیسری دنیا کے بچے کی طرح ہے۔ اس کے پیدا ہونے کی گارنٹی ہے، مرنے کی گارنٹی ہے مگر جینے کی کوئی گارنٹی نہیں۔ تاہم کچھ ایسے بھی رسالے ہیں جن کا آواگون ہوتا رہتا ہے۔ سائنس کے اس دور میں آواگون کی تھیوری کی یہی سب سے پریکٹکل مثال ہے۔

رسالہ اور مدیر دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ مدیر کے بغیر رسالہ اس 'حسن' کی طرح ہے جس کے بارے میں ملا مکی نے کہا تھا کہ اکیلا حسن انسان تو کیا چڑیا کا بچہ بھی نہیں پیدا کر سکتا جبکہ رسالے کے بغیر مدیر عام طور پر ادیب ہوتا ہے یا شاعر۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ادیب اس کو کہتے ہیں جس کا کام لکھنا ہے، پڑھنا اور سوچنا نہیں۔ شاعر اس کو کہتے ہیں جس کی جیب مطلع اور مقطع کے سوا خالی ہوتی ہے۔ عموماً دماغ بھی خالی ہوتا ہے۔

میں نے ایسے کئی رسالے دیکھے ہیں جن پر ادبی رسالہ لکھا ہوتا ہے۔ لیکن کوئی ایسا رسالہ نہیں دیکھا جس پر غیر ادبی رسالہ لکھا ہو۔ آپ نے شریف شہر کے نام کے ساتھ شریف لکھا ہوا دیکھا ہوگا لیکن شہر کے دوسرے لوگوں کے نام کے

ساتھ غیر شریف لکھا ہوا نہیں دیکھا ہوگا۔ گویا کہ ادبی رسالے کو دوسرے تمام رسالوں پر فوقیت حاصل ہے جو شریف
کو شہر کے دوسرے تمام شرفا پر حاصل ہے۔

رسالے کا سب سے بڑا حصہ اس کی مشمولات پر مشتمل ہوتا ہے۔ حالاں کہ اس حصے پر سب سے زیادہ لے
دے ہوتی ہے۔ لیکن ہر مدیر اسی حصے کو چھاپنا سب سے زیادہ ضروری سمجھتا ہے۔ خدا بچائے کہ یہ لے دے کا چکر بھی عجیب

رسالے کی باضابطہ شروعات فہرست سے ہوتی ہے۔ فہرست۔ اس سرحد پر کھڑی فوج کی طرح ہے جسے دیکھ کر
لگایا جا سکتا ہے کہ ملک کتنا مضبوط ہے۔

ہر رسالے میں سب سے پہلے ایک اداریہ ہوتا ہے۔ کسی نے پوچھا: "اداریہ سب سے پہلے ہوتا ہے۔ ایسا!
جواب ملا: ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ مدیر کے خیال میں ایسا ہی ہونا چاہیے۔ (مدیر کا لکھا اور سوچا ہوا مقدم ہے) یہ
میں اداریہ کیوں ہوتا ہے۔ اس پر تحقیق جاری ہے۔ جیسے ہی محققین کسی نتیجے پر پہنچیں گے قارئین کو باخبر کیا جائے
ہمیں امید ہے کہ محققین نہ صرف اس کی وجہ تصنیف جاننے میں کامیاب ہو جائیں گے بلکہ یہ جاننے میں بھی کامیاب
جائیں گے کہ پہلا اداریہ کس نے لکھا گیا تھا۔ اداریہ لکھنے کا خیال مدیر کے ذہن میں لکھنے سے پہلے آیا تھا یا لکھنے کے
جس قلم سے لکھا گیا تھا وہ خریدا ہوا تھا یا تحفے میں ملا ہوا۔ جب لکھنا شروع کیا گیا تھا تب GMT میں کیا وقت
اس روز صاحبِ تصنیفِ اداریہ نے جو دال کھائی تھی وہ تیل میں بگھاری ہوئی تھی یا گھی میں وغیرہ وغیرہ۔ اداریہ کے بغیر
ایسا ہوتا ہے جیسے بالوں کے بغیر سر۔ میں نے بے بال کے سر دیکھے ہیں مگر بغیر اداریہ کا رسالہ نہیں دیکھا۔ بیش تر رسا
ایسے ہیں جو اداریہ بھی لکھے جانے کے لیے نکالے جاتے ہیں لیکن کچھ رسالے ایسے ہوتے ہیں جو اداریہ ہی لکھے جانے
لیے نکالے جاتے ہیں۔

ادبی رسالہ میں عام طور پر اداریہ کے بعد ادبی مضامین کو اولیت دی جاتی ہے۔ ادبی مضامین ان کو کہتے
جن کو پڑھنے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا اور نہ پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ادبی مضامین تنقید و تحقیق سے متعلق
ہیں۔ تنقید و تحقیق کو ادب کی اکوانی کا مجاز کیوں کر سمجھا جاتا ہے مجھے نہیں معلوم لیکن مجھے بچپن میں پڑھی ہوئی ایک کہانی
یاد آتی ہے۔ سرد رات میں ایک تاجر خیمہ لگا کر آرام کرنے کو لیٹا۔ ذرا دیر کے بعد اس کے اونٹ نے اپنی گردن
کے اندر گھسا کر کہا "میرے آقا! باہر بہت سردی ہے۔ اجازت ہو تو میں اپنی گردن خیمے کے اندر کر لوں"۔ تاجر
کی حالت پر رحم آگیا۔ اس نے ذرا سا سمٹ کر اونٹ کو گردن بھر اندر داخل ہونے کی اجازت دے دی۔
دیر کے بعد اونٹ نے اپنے اگلے دونوں پاؤں اور پھر اپنا پورا وجود خیمہ کے اندر داخل کر دیا۔ خیمے کا مالک سمٹ
اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ خیمے سے باہر ہو گیا۔ فی الوقت بے چاری تخلیق اسی تاجر کی طرح خیمہ بدر اور تنقید
و تحقیق...... کاش ارسطو نے 'بوطیقا' نہ لکھی ہوتی۔

منظومات کا حصہ اس کے بعد افضل ترین حصہ ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں یارانِ خوش نگاہ کی رائے
کہ تخلیقی ادب میں اس کی حیثیت وہی ہے جو کل مخلوقات میں انسان کی ہے۔ یہ اور بات کہ ان کا فرمایا ہوا اب
تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔

اس کے بعد کا حصہ فکشن یا افسانہ کا ہوتا ہے۔ شریف لوگ جب کسی اور کے سامنے اپنا جھوٹ نہیں

تو ایک دوسرے کے سامنے بڑا سے بڑا جھوٹ بولنے کا بہانہ تلاش کرتے ہیں اور اس کے لیے رسالے کے حصے کا سہارا لیتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہی وہ جھوٹ ہے جس کا بولنے والا اور سننے والا دونوں اس جھوٹ کو حرف بہ حرف صادق کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

طنز و مزاحیہ اور انشائیہ ـــــــ ان تینوں میں کم سے کم ایک اور زیادہ سے زیادہ تینوں رسالے کے کچھ صفحوں پر ضرور قابض ہو جاتے ہیں۔ ادبِ لطیف کی اصناف میں ان تینوں کا حال رفیوجیوں جیسا ہے۔ جس طرح مختلف ملکوں میں رفیوجیوں کے لیے الگ الگ پالیسی ہوتی ہے۔ اسی طرح مختلف رسائل میں ان کے لیے الگ الگ ریزرویشن پالیسی ہے۔ کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں رفیوجی بستے ہوں۔ لیکن ایسے کئی رسالے ہیں جو ان رفیوجیوں کے زیرِ تسلط ہیں۔ وہاں ان کے علاوہ کسی دوسرے کا داخلہ ممنوع ہے۔

طنز، مزاح اور انشائیہ میں سے طنز وہ ہے جو کمزور لوگ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے بند کمرے میں بیٹھ کر لکھ لیتے ہیں۔ مزاح وہ ہے جو لکھنے والا اس لیے لکھتا ہے کہ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آدمی جب ہنستا ہے تو کیسا لگتا ہے۔ انشائیہ کی کوئی جامع تعریف میری نظر سے نہیں گزری۔ میرے نزدیک انشائیہ آسمان کی طرح ہے۔ مختلف اوقات میں آسمان کا رنگ بدلتا رہتا ہے .... لیکن آسمان ہر رنگ میں آسمان ہی نظر آتا ہے۔

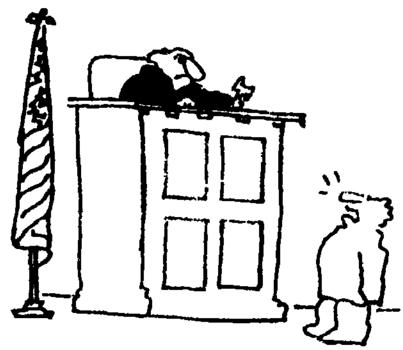
خاکے اور سفرنامے بھی ادبی رسالوں میں جگہ پاتے ہیں۔ خاکہ عام طور پر دو قسم کا ہوتا ہے: ہجویہ یا مدحیہ۔ دونوں قسم کے خاکے لکھنے کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے ـــ جس پر خاکہ لکھا جا رہا ہے اس کی زندگی ہی میں اس پر خاک ڈالنا۔ سفرنامہ عام طور پر وہ لوگ لکھتے ہیں جو گھر بیٹھ کر کچھ نہیں پاتے اور جب باہر نکل پڑتے ہیں تو ان کی جولانیٔ تحریر کو جوش آنے لگتا ہے۔ سفرنامہ، سفر کرنے کے بعد لکھا جاتا ہے۔ میں نے آج تک کوئی ایسا سفرنامہ نہیں پڑھا جو سفر کرنے سے پہلے لکھا گیا ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کسی ادیب نے آج تک قبر کا سفرنامہ نہیں لکھا۔

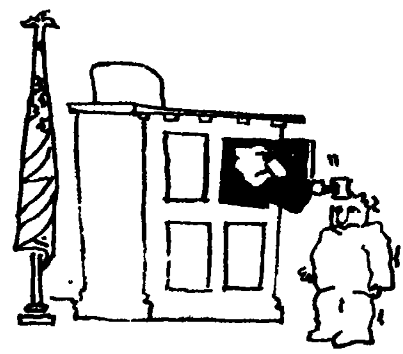
ادبی رسالوں میں تبصرے کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ تبصرہ کی جدید تعریف یہ ہے کہ یہ کتاب کا مفت کا اشتہار ہے۔ اشتہار کی طرح اس کا خاص مقصد یہ ہوتا ہے کہ قاری کو تمام موجود و ناموجود اور عدم موجود خوبیوں سے آگاہ کرایا جائے بلکہ للچایا جائے اور خامیوں کا ذکر کچھ اس طرح کیا جائے جیسے اندھیری رات میں سامنے سے کوا اڑ کر چلا جائے۔

"قارئین کے خطوط" کو رسالے کی زیب و زینت کے لیے سب سے اہم سمجھا جاتا ہے۔ عام طور سے اس میں خطوط کے ان حصوں کو بہت خوب صورتی سے تراش کر چھاپا جاتا ہے جس میں مدیر کی صلاحیتوں اور رسالے کی مشمولات کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں۔ اس طرح کے خط لکھنے والے مدیر کی نظر میں صاحبِ ذوق اور صائب الرائے ہوتے ہیں۔

اردو کے رسالے کے مدیر کو جو عام طور پر رسالے کا مالک، مدیر، مشیر اور منشی سب کچھ ہوتا ہے، رسالے کے لیے وہ چیز سب سے زیادہ پسند ہے جسے نہ وہ خود پڑھتا ہے اور نہ اپنے قارئین سے اس پر رائے جاننے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ میری مراد اشتہار سے ہے۔ بعض رسالے اشتہار کی کثرت سے بھاری بھر کم ہو جاتے ہیں جیسے جاڑے میں ایک کے اوپر ایک کئی کپڑے پہن لینے کے بعد دبلا پتلا آدمی بھی لحیم شحیم لگتا ہے۔ اشتہار کی کمی سے رسالہ ایسا سوکھنے لگتا ہے جیسے وٹامن ڈی کی کمی سے بچہ سوکھنے لگتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اشتہار کے بغیر رسالہ نہیں نکل سکتا۔ یہ عجیب بات میری خام عقل میں آج تک نہ سمائی کہ جس سے قاری اور مدیر دونوں کو کوئی دلچسپی نہ ہو وہ رسالے کے لیے ناگزیر کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں اسکول کا

طالب علم تھا تو ایک رسالے کے مدیر سے چائے خانہ میں گفتگو ہو رہی تھی۔ مدیر موصوف کہنے لگے "بھئی! رسالہ نکالنا بڑا مشکل ہو رہا ہے۔" میں نے کہا "حضور! کیا تخلیقات کی کمی کا مسئلہ درپیش ہے۔" کہتے کہتے میں اپنا ہاتھ اپنی جیب میں لے گیا جس میں میری تین تازہ غزلیں تھیں (جب تک غزل چھپ نہ جائے تازہ رہتی ہیں) سوچا کہ یہ غزلیں انھیں پیش کر دوں۔ میرا اور ان کا دونوں کا مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن میرے سارے ارمانوں پر اوس پڑ گئی جب انھوں نے کہا "مواد کی کوئی کمی نہیں۔ میرے پاس روز اتنی تخلیقات آتی ہیں کہ آدھی اگر لوٹا دوں اور آدھی اگر نہ چھاپوں تب بھی روزانہ ایک شمارہ نکال سکتا ہوں۔" میں نے کہا...... "تو حضرت! آدھی ادھر اور آدھی اُدھر کے باوجود جب اتنا باقی بچ جاتا ہے تو پھر یہ پس و پیش کیوں ہے۔" کہنے لگے۔ "بھئی اشتہار نہیں ملتے۔" میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔ "تو کیا حضور! آپ کے قارئین اشتہار ہی پڑھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔" انھوں نے میری طرف کچھ اس طرح دیکھا جیسے میری اس ناسمجھی کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ چند ثانیے کے بعد بولے "تم نہیں سمجھو گے۔"!





سید عباس متقی
(حیدرآباد)

انتخابات سے فسادات تک

اسامی و میں طنز و مزاح کے موضوعات اس درجہ قلیل ہیں کہ مزاح نگاروں کو لے دے کے چارپائی، کرکٹ اور گنجے ملتے ہیں یا ایک درجن یاسی لیڈر- مزاح نگاروں کی مسلسل قلم کاری اور خامہ فرسائی کے سبب چارپائی کی چول چول ڈھیلی ہوگئی تو کرکٹ نے میدان چھوڑ دیا اور گنجے گئے۔ رہ گئے لیڈر وہ تو آل پروف ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے لیکن آج کل ایک ایسا موضوع بھی سر اٹھایا ہوا ہے جس پر قلم اٹھانا ہلا اپنا فرض منصبی خیال کر رہا ہے کہ یہ اور بات ہے کہ اردو میں ایسے قلم کار بہت کم بلکہ عنقا ہیں جو قلم اٹھانے کے علاوہ زندگی کے دوسرے ابوجھ بھی اٹھا سکتے ہیں۔ چنانچہ فسادات پر قلم اٹھانے والوں میں سرفہرست اخبار نویس اور افسانہ نگار نظر آتے ہیں۔ ان حضرات کی چاند ماری سے یہ موضوع اس درجہ چھلنی ہو چکا ہے کہ فسادات کے تابوت میں طنز و مزاح کی آخری کیل ٹھونکنے کے لئے کوئی جگہ ہی نظر نہیں آتی۔ تاہم موضوع اس قدر دلچسپ واقع ہوا ہے کہ قلم اٹھائے بغیر چارہ بھی نہیں۔ اور ہم اس امر پر خدا کا شکر بجا لاتے ہیں کہ فسادات میں اگر ہم بھی مٹنے والوں کی طرح دنیا سے اٹھ گئے ہوتے تو فسادات پر قلم کہاں اٹھا سکتے۔ پھر مزید شکر اس امر پر بھی واجب ہے کہ فسادات میں نخواستہ کسی سورما کا خنجر بکف ہاتھ ہمارا ہاتھ قلم کر دیتا تو قلم اٹھانے کے لئے ہاتھ کہاں سے لاتے بہرحال ہم خدا کا شکر عظیم بجا لاتے ہیں "نکلا ہوا" شخص ہم تک نہیں پہنچ سکا اور ہمیں کرفیو اور فسادات میں گھر سے باہر نکلنے کی توفیق نہیں ہوئی۔

جب جب حیدرآباد میں فسادات کی آندھیاں چلتی ہیں، کرفیو کی تاریکی چھا جاتی ہے، قتل و خون کی بجلیاں چمکنے لگتی ہیں اور افواہوں ن اٹھنے لگتے ہیں۔ ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ موسم تبدیل ہو گیا ہے۔ موسم چاند، سورج کی گردش کے تابع ہوتے ہیں۔ لیکن فسادات کے موسم ا گردش کے تابع - کچھ ہو اس سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے لیڈر چاند سورج سے کم نہیں۔ کوئی دن لے آتا ہے تو کوئی رات۔ آتا ہے تو کوئی امن۔ کسی کے دور میں خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے تو کسی کے دور میں امن کے پرچم لہراتے ہیں۔ کسی کے عہد میں ہوتی ہے تو کسی کے عہد میں سکے تبدیل ہوتے ہیں۔ کسی کے دور میں غریبوں کا چاول دو روپے فی کلو فروخت ہوتا ہے تو کسی کے دور میں کی قیمت دو روپے دس پیسے کم دو روپے ہو جاتی ہے۔ جمہوریت میں ایسا تو کچھ ہوتا ہی ہے ورنہ جمہوریت بے فیض ہو جائے گی للک کے لئے۔

ہم بچپن سے اقبال کے شیدائی ہیں درجۂ صفر سے میٹرک تک پہلے گھنٹے سے پہلے "لب پہ آتی ہے دعا" اس شد و مد سے پڑھی نظم کا ایک ایک مصرع ازبر ہو گیا ہے۔ اقبال کے کلام میں بعض مقامات پر غالب کی دراز کاری کا گمان ہونے لگتا ہے اور بعض مصرعے ملاک کے بغیر سمجھ میں نہیں آتے چنانچہ اقبال کا یہ مصرع "تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جوان ہوئے ہیں" ہماری عقل دنگ اور

دانش خفتہ کے قابو میں آتا ہی نہ تھا۔ ہم لاکھ سر پٹختے کہ تیغوں کے سائے اور ان سایوں میں پل کر جوان ہونے سے کیا مراد ہے اور بہت غور کر اقبال نے تیغوں کے سائے کو عالم شباب تک ہی کیوں رہنے دیا عہد ضعیفی بھی تو ایک چیز ہے بلکہ جوانی، جوانوں سے زیادہ ضعیفوں کا

قصہ کوتاہ اقبال کا مذکورہ مصرع ایک عرصے تک ہماری سمجھ شریف سے باہر رہا لیکن جب حیدرآباد میں فسادات شروع ہو گئے گلا، خنجر آزمائی، چھرے بازی اور تیغ زنی گویا کرکٹ کا کھیل ہو گئی تو اقبال کا یہ مصرع اپنے مکمل معنی و مفہوم اور شرح و بسط کے ساتھ واضح: دراصل اس مصرع کے مصداق فسادات میں زندہ بچ جانے والے نوجوان ہیں۔ ہندستان کے جو بچے فسادات کے باد سموم میں اپنی سخت جا بچ کر جوان ہوتے ہیں وہ گویا تیغوں کے سائے میں پل کر جوان ہوتے ہیں۔ اقبال نے اس شعر میں ضعیفوں کو اس لئے در خور اعتنا نہیں فسادات میں جوانوں کو حدود ضعیفی میں داخل ہونے کا موقع نہیں ملتا۔

آج تک یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ فسادات آیا کسی وبا مثلاً ہیضہ، پلیگ وغیرہ کی طرح از خود پھوٹ پڑتے ہیں؟ ٹسٹ ٹیوب بے بی کی طرح ارادی کوششوں سے جنم لیتے ہیں۔ صوفی مسکین ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی کا کہنا ہے فسادات کروائے جاتے ہیں۔ ان فسادات میں لیڈروں اور غنڈوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ہمیں ان کی اس بات میں لفظ "غنڈوں" پر اعتراض ہے کیونکہ جب لیڈر کا کہہ دیا ہے تو اب غنڈوں کا لفظ کہنا مترادفات کا غیر ضروری اضافہ ہے۔ صوفی مسکین ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی کا خیال ہے کہ فاسد مادہ اضافہ سے جسم میں ہیجان اور جنون برانگیختہ ہوتا ہے اور کرسی اقتدار کے دعویداروں میں کثرت کے سبب فسادات پھوٹ پڑتے ہیں؛ بعض سیاستداں ہر فساد کے پیچھے کسی بیرونی ہاتھ کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن صوفی مسکین کا کہنا ہے کہ جہاں لیڈر کا ہاتھ ہوتا ہے وہاں کسی بیرونی ہا کیوں اور گنجائش کہاں۔

بعض لوگوں کے لئے فسادات کا موسم، موسم آرام ہوتا ہے۔ اسی موسم میں شاعر اپنی غزلوں کے مسودے صاف کرتے ہیں، مصنف کتابیں مکمل کرتے ہیں۔ سرمایہ دار اپنے بنک بیلنس کا حساب کتاب کرتے ہیں۔ عام طور پر ہندستانی بیویوں کو اپنے شوہروں سے اس بات کا ہوتی ہے کہ وہ دو گھڑی ان کے ساتھ نہیں گزار سکتے لیکن اب کرفیو کے سبب مسلسل سنگت میں گذرتی ہے۔ پروفیسر ٹی اے جوسن کسی یونیورسٹی کے پروفیسر نہیں ہیں بلکہ پی سی سرکار کے قبیل کے پروفیسر ہیں۔ انھیں کیا پتہ کہ کرفیو اور شعبدے میں بہت فرق ہوتا ہے لیکن حیرت ہے کہ اعلیٰ ترین دماغ بھی کرفیو کو شعبدہ ہی سمجھتے ہیں۔

ہم عصر ترقی یافتہ دور میں اخلاقیات کی تعلیم رجعت پسندی سمجھی جاتی ہے۔ پتہ نہیں اخلاقیات کا یہ بے چارہ اصول کہ انسان بہانا ہر مذہب میں گناہ ہے اور انسانی جان سب سے زیادہ محترم ہوتی ہے پتہ نہیں کس ردی کی دوکان پر پڑا سڑ رہا ہے۔ صوفی بقول جدیدیت اور ترقی کی علامتوں میں سے خاص علامتیں یہ ہیں کہ بچوں میں معصومیت، مردوں میں فراست اور عورتوں میں حیا اس معیار پر ہم واقعتاً ماڈرن اور ترقی یافتہ ہو گئے ہیں۔

عالمی منڈی میں ڈالر کی شرح گر رہی ہے یا چڑھ رہی ہے، ریال کی قدر گھٹ رہی ہے یا بڑھ رہی ہے یا روس میں مارکس مرتبہ سپرد لحد کیا جا رہا ہے یہ اس قدر تشویش ناک نہیں ہے لیکن ایڈس اور فسادات کی وجہ سے تشویش میں مبتلا ہونا انسانیت کا اقل ترین معیار اور تقاضا ہے۔ ہماری اس بات سے کسی کو تشویش نہ ہو تو ہم کیا کر سکتے ہیں کیونکہ تشویش تجسس سے ہوتی ہے۔ کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے اور ادراک کا تعلق عقل سے ہے اور عقل بازار میں نہیں ملتی۔ ہمارا خیال ہے ایڈس پر قابو پانے کے۔ کلچرڈ کرفیو لگانا اور فسادات پر قابو پانے کے لئے ہندستانی کرفیو کو "کلچرڈ" بنانا ضروری ہے تاکہ کرفیو پاس رکھنے والے شہریوں اور صحافیوں وغیرہ کے سر بشمول عزت پولیس کے ڈنڈوں سے محفوظ رہ سکیں۔

سُنا ہے امریکہ اور لندن میں بھی فسادات ہوتے ہیں جنھیں نسلی فسادات کا عنوان دیا جاتا ہے لیکن صوفی مسکین کے بقول وہاں کے فساد اور یہاں کے فساد میں وہی نسبت ہے جو رباعی اور قصیدے میں ہے۔ وہاں کی تیز زندگی میں فسادات کا منصوبہ بنانے کی فرصت کسے ہے۔ وہاں اتفاقاً کسی کو بھڑک سی ہوتی ہے تو فساد ہو جاتا ہے۔ مگر ہم ہندستانی ایسی بدسلیقگی کے قائل نہیں۔ ہم بڑی فرصت اور دلجمعی سے فساد کرتے ہیں۔ ایک ایک فساد کے لئے مہینوں منصوبہ بندی ہوتی ہے اور بڑے اہتمام سے کسی عید، تہوار یا جلوس کا انتظار کرتے ہیں کہ فساد کی کوئی وجہ تسمیہ تو ہونی چاہیئے۔ وجہ تسمیہ کے بعد محل وقوع کا تعین کیا جاتا ہے۔ جب سارے انتظامات مکمل ہوتے ہیں۔ تب کہیں جا کر ایک فساد ہوتا ہے جو ہفتوں بلکہ مہینوں چلتا ہے۔

وطن عزیز میں جلسوں اور جلوسوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو فسادات کی تمہید ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو اس کے تدارک کی سعی کرتے ہیں یعنی ع ایک فساد ہونے سے پہلے ایک فساد ہونے کے بعد۔ ایک میں انسان کو درندگی کا جامہ پہنایا جاتا ہے اور دوسرے میں انسان کو انسانیت کے جامے میں رہنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ حیوان اپنا جامہ کبھی نہیں بدلتے لیکن آدمی، آدمی ہوتا ہے۔ کوئی بھروسہ نہیں۔ کیا معلوم کب انسانیت کا چولہ اتار پھینکے اور درندگی کا جامہ پہن لے۔

جوں ہی حیدرآباد میں فسادات کا موسم اپنے سرخ شامیانے تان دیتا ہے افواہوں کی آندھیاں چلنی شروع ہو جاتی ہیں اور وہ افواہیں اڑتی ہیں کہ الامان والحفیظ۔ گذشتہ دنوں کی بات ہے۔ ایک دوست کی شادی میں جانے کے لئے ہم اپنی شادی کی شیروانی جھٹک رہے تھے کہ بیگم آدھمکیں اور ہماری شیروانی کی آستین تھام لی۔ ہم نے کبھی انھیں اس والہانہ انداز میں شیروانی کی آستین تھامتے ہوئے نہ دیکھا تھا ایسا لگا جیسے اردو کے روایتی عاشق نے روایتی محبوب کا دامن روایتی انداز سے تھام لیا ہو۔ بیگم کہنے لگیں خدا کے لئے باہر نہ جایئے لوگ آپ کو دور ہی سے پہچانتے ہیں۔ تمہید کے بغیر ربط مضمون کو نظر انداز کرتے ہوئے تمتہ کے طور پر کہے جانے والا یہ جملہ شاید علی حیدر نظم طباطبائی کے پتے بھی نہیں پڑتا۔ بھلے ہی انھوں نے غالب کے اشعار کی شرح لکھی ہو۔ ہم حیران کہ ہمارے پہچانے جانے یا نہ پہچانے جانے سے ہمارے باہر نکلنے کا کیا تعلق ہے۔ ہماری آنکھوں سے استفسار کے چشمے اُبلنے لگے۔ وہ پان کا اگال نگلتی ہوئی کہنے لگیں۔ ابھی میں پڑوس سے آرہی ہوں۔ جانی بھائی کہہ رہے تھے کہ چارمینار پر چل گئی ہے۔ اور غیر معینہ مدت کا کرفیو لگ چکا ہے۔ ہم نے کہا تم بے وقوف ہو فسادات اور کرفیو کی بیشتر اطلاع لیڈروں کو ہوتی ہے یا پولیس کے اعلیٰ عہدہ داروں کو۔ ہم افواہ پر جبکہ بیگم اڑا رہی ہوں ہرگز کان نہیں دھرتے' لیکن ان کے والد ماجد بھی ہمارے باہر نکلنے کے ارادے کو ملتوی کرنے تشریف لائے اور کہنے لگے' ارے میاں میں نے خود اپنی آنکھوں سے ایک شخص کی نعش کو گلزار حوض کے گٹر سے پانی میں خون میں لت پت تیرتا ہوا دیکھ کر آرہا ہوں۔ ہم نے کہا حضرت آدمی تیرتا ہے نہ کہ نعش، کہنے لگے پہلے آدمی ڈوبتا ہے پھر لاش تیرتی ہے۔ میری بیٹی کے حال پر رحم کرو اور باہر مت نکلو شادی کو گولی مارو۔ ہم نے کہا تب شادی کو گولی مارنے کا سوال ہی کیا ہے۔ شادی ہوتے ہی خود بخود گولیاں چلنے لگتی ہیں۔ غرض انھوں نے ہمارا ہاتھ زبردستی ہماری شیروانی کے آستین سے باہر کر دیا۔ خسر بھی عجیب شخصیت ہوتا ہے۔ بیٹی دے کر آزادی چھین لیتا ہے۔ عقد ثانی کی آزادی تو یقیناً۔ بادل نخواستہ ایک عدد افواہ کے طفیل ہمیں اپنے دوست کی شادی میں شرکت سے محروم ہونا پڑا۔ بہت افسوس ہوا کہ بعد مدت ایک لیمہ ہاتھ آرہا تھا۔ کرفیو کے طفیل اس سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔

حیدرآباد آج کل افواہوں کا شہر ہو گیا ہے۔ سعید آباد میں افواہ اڑتی ہے کہ مشیرآباد میں فساد پھوٹ پڑا۔ مشیرآباد میں افواہ اڑتی ہے کہ سعید آباد میں کرفیو لگ گیا۔ جی میں آتا ہے کہ افواہ پھیلانے والوں کے منہ کو علی گڑھ کے تالے ڈال دیں مگر سنتے ہیں وہاں تا افواہ پھیلتی ہے افواہ پھیلانے والے نظر نہیں آتے، شاید شیاطین کی طرح پردۂ غیب میں رہتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ

شیطان لاحول سے بھاگ جاتا ہے ۔

ایک دن ہم نے روایتی انداز سے سیکل چلاتے ہوئے تھکے ماندے مدرسہ سے گھر آ رہے تھے کہ ایک صاحب سیکل چلاتے ہوئے
بازو آئے۔ سرگوشی میں کہا جلدی بھاگو۔ چھاؤنی گلی میں دس —— دس کہہ کر انھوں نے اپنے حلق پر اپنی انگلی پھیر لی اور بس تو
ہماری چین تیزی سے پھرنے لگی۔ ہم چڑھاؤ پر رکشہ والوں کی طرح اتر کر جاتے ہیں۔ لیکن یہ خبر سننے کے بعد تو اترنے کا سوال ہی نہیں تھا
کون سیکل سے اتر کر زمین میں اترنے راہ ہموار کرے۔ اٹھ اٹھ کر ڈنڈا مارنے لگے ۔ اتنے میں ایک دوسرے حضرت ٹرانک کاٹتے
ہمارے قریب آئے ۔ ہاتھ ملایا کہنے لگے ۔ آپ یہاں ہیں شیروانی اوپر سے داڑھی کچھ خبر ہے یاقوت پورہ میں کرفیو ہو گیا ۔ کرفیو
نام سنتے ہی ہمارے اوسان خطا ہو گئے ۔ ذہن کی وادیوں میں پولیس والوں کے ڈنڈے رقص کرنے لگے ۔ کانوں میں سیٹیاں بجنے لگ
کرفیو میں ہمیں قاتلوں سے زیادہ پولیس والوں کا خوف طاری رہتا ہے۔ کیونکہ ہم موت سے تو نہیں گھبراتے البتہ سکرات سے گھبراتے
سیکل کی رفتار موٹر سیکل کا مقابلہ کرنے لگی۔ ہم خدا سے التجا کر رہے تھے کہ خدایا رستے میں سیکل کی چین نہ گرے۔ کیا عجب ہے کہ ہم
کی چین چڑھانے بیٹھیں اور دفعتاً چار کاندھے چڑھنے کی نوبت آجائے۔ کم بخت بہت دنوں سے آئیلنگ بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہم
طے کر لیا ہے فسادات کے زمانے میں سیکل کو پابندی سے آئیلنگ کرنی چاہیئے ۔ بد حواسی کے عالم میں ہمیں ہر شخص حملہ آور معلوم ہو رہا تھا
کوچے کوچہ قاتل لگتے تھے جو بھی قریب سے ہو کر گذرتا ہم اس کے ہاتھوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے ۔ محلے میں پہنچ
جان میں جان آئی مگر افسوس ہوا کہ ہم نے بلاوجہ "سیکل مذش" کر ڈالی ورنہ یہاں تو دکانیں کھلی ہوتی ہیں بازار گرم ہے ۔ ڈنڈی
ماری جارہی ہے ۔ دھوکہ دیا جارہا ہے ۔ ملاوٹ کا کاروبار ہو رہا ہے خوب روایتی چہل پہل ہے۔ چہرے کا پسینہ پونچھا اور
سپاہی کی طرح آگے بڑھنے لگے ۔

افواہوں کے طفیل بنتے کام بگڑتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ بگڑتے کام بن بھی جاتے ہیں ۔ ہم ایک دفعہ آٹو چکا رہے تھے
آٹو والا ہی کیا جو میٹر سے چلے۔ پانچ روپے زیادہ لینے پر وہ ادھر مصر اور اس نقصان عظیم پر ہم ادھر متفکر۔ کیونکہ ہم ایک مدرس ہیں۔ کہ
تحصیل کے کلرک نہیں لیکن اچانک ایک کھلبلی مچ گئی کسی نے کہا "چل گئی" یہ سنتے ہی آٹو والے نے میٹر ڈال دیا اور ہم معہ جبر و دستار
کل ہی کی بات ہے کہ ہم روایتی انداز میں ایک حجام کے آگے سر نیاز خم کئے بیک وقت اس کی قینچی اور زبان کی چخ چخ سے
لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اچانک گڑبڑ کی آوازیں آنے لگیں جس تیزی سے گڑبڑ کا شور ابھرتا تھا اسی رفتار سے اس کی قینچی اور ز
خاموش ہو رہی تھی ۔ ایک موقع پر اس کی قینچی رک گئی اور زبان تالو سے لگ گئی ۔ ہماری آدھی حجامت ہوئی تھی ۔ آدھی باقی تھی ۔ گڈ
کے سیرونگ رہے تھے ۔ حجام کو آواز آئی "چل گئی" اتنا سنتے ہی حجام نے ہمارے سینے سے کپڑا چھین لیا ۔ پیچھے سے کچکے دے
چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے سر اٹھایا "صاب باقی حجامت کرفیو کھلنے کے بعد"

کرفیو سے پہلے، کرفیو کی افواہیں اڑتی ہیں اس کے بعد ایک انتظار سا انتظار ہوتا ہے ۔ بالآخر خدا خدا کر کے کرفیو
پڑ جاتا ہے ۔ کرفیو کی افواہ ۔ آمد اور رخصت اپنے ہنگاموں کے سبب ایک مثلث مساوی الافواہ ہوتا ہے جس کی ذنگا ذنگ
سامانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کرفیو میں نرمی جوں ہی ہوتی ہے لوگ گھروں سے باہر نکل جاتے ہیں ۔ گویا کسی نے دفعتاً
ڈھکنا اٹھا دیا ہو ۔ ایک دوسرے پر ٹوٹتے ہوئے خرید و فروخت میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ خرید و فروخت میں لوٹ
کا مترادف محاورہ ہوتا ہے۔ اس موسم میں چاقو مارنے کے علاوہ ڈنڈی مارنے کا فن بھی خوب آزمایا جاتا ہے ۔
کرفیو میں ناگزیر وجوہات کے سبب نکلنے ہی پر جب مجبور ہو جاتے ہیں تو پہلے حسب تقدیر اپنی بیویوں سے فرا

کر دیتے ہیں۔ مائیں زندہ ہوں تو دودھ بخشوا لیتے ہیں۔ بچوں کو جی بھر کر پیدا کر لیتے ہیں۔ اور آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے سیدھا پاؤں باہر نکالتے ہیں۔ شرفاء میں جو بہت ہی شرفاء ہیں وہ قرض تک معاف کرواتے ہیں۔ ہمارے دوست صوفی صاحب جب کرفیو میں باہر نکلے تو ہمارے پاس بادل ملول تشریف لائے۔ بھرے گلے سے کہنے لگے بھائی کرفیو ہے دودھ لینے جا رہا ہوں۔ میرا بولا چالا معاف کر دیجئے۔ آپ کی کچھ کتابیں اور کیسٹس بھی میں لوٹا نہیں سکا۔ وہ بھی معاف کر دیجئے۔ آپ کی زمین جو غصب کر لی تھی وہ بھی معاف کر دیجئے۔ کرفیو ہے کیا بھروسہ ہے زندگانی کا۔ آدمی بلبلا ہے پانی کا۔ ہم نے جواب دیا کہ حضرت اگرچہ آپ کے خیال میں ہم نے آپ کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا۔ مگر جواباً آپ بھی معاف کر دیجئے۔ ہم شریف آدمی ہیں۔

صاحبو یہ سب تو ایک طرف لیکن آخر میں ہم لیڈروں، غنڈوں اور پولیس کی سرخ ٹکڑی کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جن کے طفیل ہماری تخلیقات میں ایک نئے موضوع اور ایک نئے مضمون کا بہرحال اضافہ ہوا ہے۔

الکشن کے نتیجے نے عجب صورت دکھائی ہے — پروفیسر حفیظ بناز

کہیں ہے مرثیہ خوانی کہیں نغمہ سرائی ہے
کسی کے سر پہ سہرا ہے کسی کی جگ ہنسائی ہے
کہیں ہے وصل کا عالم کہیں شام جدائی ہے
الکشن کے نتیجے نے عجب صورت دکھائی ہے

کسی کی لٹ گئی محفل، کوئی محفل سجا بیٹھا
کسی کی چھن گئی گدی کوئی گدی پہ آ بیٹھا
کسی کا غرق ہے بیڑا کسی کی ناخدائی ہے
الکشن کے نتیجے نے عجب صورت دکھائی ہے

وہ سنا ہے کارین بیٹھا جو کل تک اک کباڑی تھا
کھلاڑی تھا کوئی لیکن سیاست میں اناڑی تھا
ہے کوئی سرخرو، ذلت کسی کے ہاتھ آئی ہے
الکشن کے نتیجے نے عجب صورت دکھائی ہے

انگوٹھا چھاپ تھا جو شخص ایم پی ہو گیا یارو
جو سب سے آگے آگے تھا پھسڈی ہو گیا یارو
نہ طاقت کام آئی ہے نہ دولت کام آئی ہے
الکشن کے نتیجے نے عجب صورت دکھائی ہے

جو کل تک تھا نہایت کامیاب و کامراں یارو
بنا پھرتا تھا جو سب کا امیر کارواں یارو
چھپاتا ہے وہ منہ اپنا کچھ ایسی منہ کی کھائی ہے
الکشن کے نتیجے نے عجب صورت دکھائی ہے

مقدر پھر گیا اس کا کہ قسمت پھر گئی اُس کی
اچھالے تھا جو سب کی پگڑی پگڑی گر گئی اس کی
ہمارے دور روشن نے خبر کیسی سنائی ہے
الکشن کے نتیجے نے عجب صورت دکھائی ہے

نئی سرکار کیا ہوگی یہ کوئی کہہ نہیں سکتا
بہت دن تک مگر گدی پہ کوئی رہ نہیں سکتا
یہی تصویر ابھر کر سامنے آنکھوں کے آئی ہے
الکشن کے نتیجے نے عجب صورت دکھائی ہے

قدیر زماں
حیدرآباد

اگر میں شاعر ہوتا

شاعر ہونا کیسے نصیب ہوتا ہے۔ شاعر تو پیدا ہوتے ہیں۔ فن کار اور آرٹسٹ! یہ تو فطرت کی دین ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک شخص فن کار پیدا تو ہوتا ہے لیکن ریاضت نہ کرنے کی وجہ سے اپنے فن کو کھو بیٹھتا ہے۔ چھوڑیے۔ ہمیں اس قدر سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سوال صرف اتنا ہی تو ہے کہ کوئی ایک پیشہ ور کوئی دوسرا پیشہ اختیار کر سکتا ہے کہ نہیں۔ مثلاً ایک لُہار ایک خیاط کیوں نہیں بن سکتا۔ ایک معمار ایک آرکیٹیکٹ کیوں نہیں بن سکتا یا ایک چرواہا ایک گوالا کیوں نہیں بن سکتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ہاں جناب یہ تو بالکل ممکن ہے کیوں کہ بات پیشہ وروں کی ہے۔ ایک ایڈمنسٹریٹر ایک سیاست داں بھی بن سکتا ہے اور ایک منسٹر ایک انڈسٹریلسٹ بھی۔ لیکن بات تو شاعری کی ہے۔ شاعری کوئی پیشہ گری تو نہیں کہ وراثت میں مل جائے۔ ارے صاحب اس کے لیے تو ضروری ہے کہ آپ جب پیدا ہوں تو شاعری کا مزاج لے کر پیدا ہوں۔ اس رُجحان کو قائم رکھنے کا ماحول ملے۔ پھر آپ اسی فن میں لگے رہیں۔ آپ کو کوئی اچھا استاد ملے۔ سارا کلام قدیم و جدید آپ پڑھ ڈالیں۔ خیال، امیج، لفظیات، آہنگ ان سب کی آپ ریاضت کرتے رہیں۔ لیکن میں یہ کام کر چکے تو جوانی تک پہنچتے پہنچتے کہیں کوئی چوٹ کھالیں۔ چوٹ جتنی گہری ہوگی، احساس جس قدر شدید ہوگا اُسی پایہ کی شاعری تخلیق ہوگی۔ یگانہ کا ایک شعر یاد آیا ؎

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر　　کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

یا پھر میر تقی میر کا وہ شعر ؎

گلی میں اُس کی گیا سو گیا نہ بولا پھر　　میں میر میر کر اُس کو بہت پکار رہا

خیر یہ بات تو چوٹ کھانے والی تھی۔ ایسی چوٹ تو شاید ہم نے کبھی نہیں کھائی۔ کھائی بھی تو اپنی جان کو اہم جانا۔ اہم جاناہی تھا تو کیوں نہ اپنی شخصیت میں غالب جیسا دبدبہ ہی پیدا کرتے ؎

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر　　جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

غزل کا مزاج نہ ہو تو اقبال کی طرح ”ساقی نامہ“ جیسی کوئی نظم ہی لکھتے یا ن۔م۔ راشد کی طرح ایک ”سفر نامہ“ جیسی نظم ہی تخلیق کرتے اور کسی مشاعرے میں لہرا لہرا کر ترنم سے لوگوں کے سامنے پیش کرتے۔

”اُسے ضد کہ فن کے ناشستہ ہیں“

شریک ہو

ہمیں خوف تھا سحرِ ازل
کہ وہ خود پرست نہ روک لے
ہمیں اپنی راہِ دراز سے

یا پھر فیض احمد فیض کے حوصلے کا ایک ترانہ ہی لکھ سکتے:

اے ظلم کے ماتو لب کھولو چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو اُن سے اُٹھے گا کچھ دور تو نالے جائیں گے۔

بڑے شاعروں کے یہ چند نام سُن کر آپ مجھ سے بے اختیار سوال کر سکتے ہیں کہ "کیوں جناب! شاعر بننے کے لیے ضروری ہے کہ آ۔ شاعری ہو۔ ۔۔آخر اچھا کہ صدی نصف صدی میں کوئی پیدا ہوا تو ہوا ورنہ نہیں۔ جس فن سے بھی متعلق ہیں اُس میں آپ نے کتنا بڑ مارا کہ آپ کا شمار بھی مشاہیر میں ہونے لگا!"

آپ نے بڑا الجھا لیکن بہت ہی مناسب سوال کیا ہے۔ اور سچ بھی کیا ہے۔ اتفاق نہیں کرتا ہوں تو میری مزید سُبکی ہوتی ہے جناب مجھ سے آپ یہ سوال کیوں کرتے ہیں۔ میں تو اپنے مرنے کے پچاس، ساٹھ یا سو سال بعد جانا جاؤں گا۔ جیسا کہ اسداللہ خاں غالب فراز کافکا کے ساتھ ہوا ہے۔ اور بہت سے فن کاروں کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ اگر میں شاعر ہوتا تب بھی یہی بات کہتا۔ شرط ہے تو آز لیجیے۔ یا تو کوشش کر آپ ہی کیا ہے۔ بس دوسری شرط یہ ہے کہ آپ اگلے سو سال تک جیتے رہیں۔ یوں بھی ایمان کی بات تو یہ ہے کہ آپ بھی کسی بھی فن میں طبع آزمائی کرتے رہے ہوں ضروری نہیں کہ مشاہیر کے ساتھ ہی آپ کا نام لیا جائے۔ آپ کسی چمن کا رُخ کیجیے۔ طرح طرح کے پھولوں پر آپ کی نظر پڑتی ہے۔ خوبصورت پھول، نازک نازک پھول، حسین و جمیل پھول، کچھ واضع کچھ خوشبودار۔ ان سب کے وجود چمن کی رونق ہے۔ سارے چمن میں صرف دو ایک گلاب کے پھول نظر آئیں تو آپ چمن کے منظر سے لُطف اندوز نہ ہو پائیں گے۔ یہی انسانی زندگی کی ہے۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ خوبرو ہیں۔ کارآمد ہیں۔

اسی خیال کو مان کر میں ایک چھوٹا موٹا شاعر بن جاتا ہوں۔ شاعر بن کر اب میں کیا کروں گا اُسے آپ نوٹ کر لیجیے تاکہ سند اور وقت ضرورت کام آئے۔

اگر شاعر ہوتا تو سب سے پہلے میں "کچھ علاج گردش" "ڈال کی فریاد" "جگنو اور پرندہ" اور "ماں کا خواب" جیسی نظمیں ازبر کر لیتا آہستہ آہستہ ولی، میر، سودا، ناسخ، انیس، ذوق، غالب....... اور تمام اساتذہ کا کلام کئی کئی بار پڑھتا۔ اُن کے کم از کم ایک ا دو دو سو شعر حفظ کر لیتا اور پھر جب خود سے شعر کہنے لگتا تو کسی اُستاد کا تلمذ حاصل کرتا۔ جب شعر کہہ چکا ہوتا تو اُسے لکھ کر ایک محفوظ کر لیتا۔ کسی مشاعرے میں شریک ہو کر ہرگز شعر نہ پڑھتا۔ کبھی کسی ادارے کے اصرار اور اپنا جیب خرچ حاصل کرنے کی نوبت آنے پر کسی مشاعرے میں شریک ہوتا تو تب منتظمین سے کہتا کہ "جناب میں اس شرط پر چلوں گا کہ مجھے نہ تو ابتدا میں پڑھایا جائے اور نہ آخر میں درمیانی شاعروں کی فہرست میں ہونا چاہیے تب ہی میں مشاعرے میں شریک ہوں گا۔" مشاعرے میں شریک ہو کر میں اپنا کلام ترنم سے سناتا کہ اس سے میری شاعری کے محاسن خطرے میں پڑ جاتے۔ تحت اللفظ میں سُنانے کی پہلے سے خوب مشق کر لیتا اور لغات کی مدد اطمینان کر لیتا کہ کسی لفظ کا تلفظ غلط تو نہیں پڑھ رہا ہوں۔ مشاعرہ پڑھ کر پیچھے سے سامعین کی صف میں جا کر بیٹھ جاتا کہ میرے بعد میں آنے والے ہیں اُن کی شعر گوئی پر مناسب داد دے سکوں کیوں کہ آدھا وقت تو میں نے شہ نشین پر گزار لیا تھا اور وقت بے وقت جلسے کی طرح صدرِ مشاعرہ۔ ساتھ ہی اس لیے کہ صدر تو کوئی شاعر ہوتا نہیں! میں نے چند ایسے اشعار کی مدح کی تھی جو کبھی چھپنے کا

سنانے کے قابل بھی نہ تھے۔ چھپنے کی بات آئی تو عرض کر دوں کہ اگر میں شاعر ہوتا تو میرا فیصلہ یہی ہوتا کہ اتفاق ہی سے کبھی کبھار کسی خاص محفل میں شعر سناؤں ورنہ اپنی ساری شاعری کا جائزہ دمِ آخر لوں اور ایک مختصر سا انتخاب چھپواؤں۔

صاحبان! دوسروں کے قدم میں قدم ملا کر میں نے ابھی تک بڑی ڈینگیں ماری ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھ میں شاعر بننے کی کوئی صلاحیت ہی نہیں۔ ہاں ایک خواہش ضرور ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے ساری اچھی شاعری پڑھ ڈالوں۔ اسے سمجھ پاؤں اور اس سے متاثر ہو سکوں۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو آس پاس میں بے شمار آدمی ہیں۔ اُن کے ساتھ جڑا رہوں۔ "وہ آدمی کے دامن سے زندگی ہے وابستہ"۔ آپ میری بات مان گئے؟ آپ کا بھلا ہو۔ آپ نے نہ مانا تب بھی آپ کا بھلا ••



یہ ہے بمبئی میری جاں

بدر عبید اللہ مہدی (بمبئی)

کم خرچ عالم بالا نشین

اولادِ آدم نے یوں تو ترقّی کے نام پر تا دم تحریر ایجادات کے ڈھیر لگا دیئے ہیں اور ایجادات بھی ایسی آفت کی پرکالہ کہ ان کے آتے ہی موت کا منہ بھی کالا ہو جائے جیسے "ایٹم بم"، "ہائیڈروجن بم" "مہلک میزائلس" "کیمیائی اسلحہ" وغیرہ۔

تعمیر کے پردے میں تخریب کا ساماں مہیا کرنے والی ایسی ایجادات کو دیکھ کر ہی غالباً یہ کہا گیا ہے کہ ایجادِ بندہ اگرچہ گندہ — لیکن افسوس ہے کہ آج تک کسی بندۂ خدا نے ایسا کوئی آلہ یا نسخہ ایجاد نہیں کیا جو طبقاتی خانوں میں بٹے ہوئے ترقّی یافتہ انسانوں کے دلوں میں اور گھروں کے بیچ پائے جانے والے فاصلوں اور دوریوں کو پاٹ سکے۔

ویسے بمبئی میں لوگ کبھی کبھار اپنے طور پر فاصلوں کی یہ دیوار ڈھانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں یعنی برضا و خوشی یا مجبوراً ایک دوسرے کے "سمدھی" بننے کی حماقت کر بیٹھتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فاصلہ کم ہونے کے بجائے اور بڑھ جاتا ہے کیونکہ فریقین ایک دوسرے سے سانپ اور نیولے کی طرح بدکنے لگتے ہیں۔ فریقِ اوّل یہ سمجھ کر تاؤ کھاتے رہتے ہیں کہ فریقِ ثانی نے اپنے لڑکے کے توسط سے ان کی لڑکی کو پھانس کر انھیں زک دی ہے جبکہ فریقِ ثانی یہ سوچ کر تاؤ کھاتے رہتے ہیں کہ فریقِ اول نے اپنی لڑکی کو مچھلی کے کانٹے کی صورت ان کے ہونہار برخوردار کے گلے میں اٹکا کر انھیں نیچا دکھایا ہے۔ نتیجۃً غلط فہمی کی ایک ایک اینٹ فاصلوں کی دیوار کو اور بھی اونچا اٹھا دیتی ہے۔ البتہ جو لوگ کسی وجہ سے ذاتی طور پر سمدھی بننے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں وہ فاصلوں کی دیوار کو نہ ڈھاتے ہیں نہ گراتے ہیں۔ بلکہ دیوار کی آڑ لیے صرف تماشا دیکھتے رہتے ہیں۔

ان ناقابلِ عبور فاصلوں کو کوئی خدائی کرشمہ یا چمتکار ہی پاٹ سکتا ہے۔ البتہ مضافات اور قلب شہر کے مابین پائے جانے والے فاصلوں کو عبور کرنے کے لیے بمبئی میں بے شمار ذرائع حمل و نقل موجود ہیں جیسے الیکٹرک عرف بجلی سے چلنے والی ٹرینیں، بسیں، ٹیکسیاں اور آٹو رکشا وغیرہ۔

اوّل الذکر کو مرکزی سرکار کی سرپرستی، ثانی الذکر کو مقامی میونسپلٹی کی پشت پناہی اور آخر الذکر سواریوں کو خانگی حیثیت حاصل ہے۔

چونکہ بمبئی میں لوگ اپنی اپنی حیثیت و استطاعت کے مطابق سواری کا انتخاب کرتے اور حسبِ مقدور اپنی عاقبت بگاڑتے ہیں ظاہر ہے جس شخص کا مقامِ رہائش اور مقامِ روزگار میں بعد المشرقین ہو، وہاں آدمی گھر سے نکلتے ہی سواری کا محتاج ہو جاتا ہے اور یہ محتاجی و مجبوری آدمی کو مختلف ذرائع حمل و نقل کے ہتھے چڑھا دیتی ہے۔

بد قسمتی سے بمبئی کی ۹۰ فی صد آبادی کی معاشی سطح سطحِ سمندر سے بھی کئی فٹ نیچے ہے سستے ذرائع حمل و نقل کا انتخاب کرتی ہے اور کم خرچ بالا نشیں بننے کی کوشش میں بالآخر کم خرچ عام بالا نشین ہو جاتی ہے

لوکل ٹرین کے لٹکے جھٹکے :

بمبئی میں جو برقی بلا گجردم سے نصف شب تک ہر چند منٹ کے وقفے سے اس شہر کی تین چوتھائی آبادی کو شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچانے کا کارِ خیر انجام دیتی ہے وہ عرف میں "لوکل ٹرین" کہلاتی ہے۔ اس عبرتِ ناہید کی دندناتی اسپیڈ کو دیکھ کر زبان پر بے ساختہ یہ شعر آجاتا ہے :

یہ دوڑتی لوکل ہے کہ اک برقِ بلا خیز
شعلہ سا لپک جائے ہے رفتار تو دیکھو

اپنی رفتار، کردار اور وسعت کے اعتبار سے بلاشبہ یہ دیگر ذرائع حمل و نقل کو بہت پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔ اسی لیے لوگوں کی اکثریت اس پر جان دیتی ہے . . . . (محاورۃً نہیں حقیقتاً)۔ بمبئی کی لوکل ٹرینیں نہ ڈیزل سے چلتی ہیں اور نہ بھاپ سے اور نہ اپنے آپ سے بلکہ بجلی سے چلتی ہیں اسی لیے برق رفتار ہوتی ہیں۔ ان میں بھی وہی کوندا وہی لپکا وہی طرّہ وہی غرّہ ہوتا ہے جو کہ بجلی کا خاصّہ ہے یعنی :

اِدھر کڑکی، اُدھر بھڑکی اِدھر چمکی اُدھر چمکی

یوں بھی بجلی چاہے تانبے یا المونیم کے تاروں میں ہو دوڑتی ہو یا ہائی ہیل (HIGH HEEL) کا سینڈل پہنے اسکینڈل (SCANDAL) کی طرح سڑکوں پر آزادانہ سرگشتی کرتی ہو، دونوں کا کام زد میں آنے والے کو شاک پہنچانا ہوتا ہے۔ ایک ہی جھٹکے سے کام تمام کرتی ہے، دوسری لٹکنے سے۔ چنانچہ بمبئی میں ہر دوسرا شخص یا تو جھٹکے سے مرتا ہے یا پھر لٹکنے سے۔ اب رہا پہلا شخص تو یہ جھٹکے اور لٹکنے کے بیچ پینڈولم کی طرح جھولتا رہتا ہے جو خوش نصیب جھٹکے سے مرتے ہیں وہ تو ایک ہی جھٹکے میں زندگی کا سارا بوجھ جھٹک کر فی الفور اللہ، بھگوان، گاڈ، واہگرو، یا جسے بھی وہ اپنا معبود مانتے ہوں اس کے پیارے ہو جاتے ہیں۔ البتہ جن بدنصیبوں کی قسمت میں لٹکنے سے مرنا لکھا ہوتا ہے وہ لٹک لٹک کر ایک ایک کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر قسطوں میں مرتے ہیں۔

اتفاق سے بمبئی کی لوکل ٹرینوں میں یہ دونوں ہی خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ تب ہی تو یہ مسافروں کو پیس کر اس کا سرمہ بنا دیتی ہیں۔

اردو میں ایک ضرب المثل ہے "کوزے میں دریا بند کرنا" آپ نے یقیناً سنی ہوگی لیکن اگر اس کی جیتی جاگتی بلکہ دوڑتی بھاگتی تصویر دیکھنا ہو تو بمبئی کی لوکل ٹرینیں دیکھ لیجیے۔

ایک مرتبہ ہمارے ایک حیدرآبادی دوست نے ان "اوورلوڈڈ" ٹرینوں کو دیکھ کر کہا تھا "یہ لوکل ٹرینیں نہیں بلکہ عمرو عیار کی زنبیلیں ہیں جنھیں (فولادی) پہیے لگا کر پٹریوں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔"

اس عجیب و غریب تمثیل کی روشنی میں ہم نے جب لوکل ٹرینوں کے ڈبوں عرف کمپارٹمنٹ کی ساخت اور بناوٹ پر غور کیا تو عقدہ کھلا کہ واقعی لوکل ٹرین کا ہر کمپارٹمنٹ عمرو عیار کی تاریخی زنبیل کا تازہ اور نو بہ نو ایڈیشن ہے۔ تبھی تو اپنی محدود وسعت کے باوجود لامحدود بوجھ اٹھاتا ہے اور چوں نہیں کرتا اگر آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے کہ کس طرح ڈیڑھ دو سو مسافروں کی گنجائش والے ڈبے میں ڈیڑھ دو ہزار کے لگ بھگ مسافر سما جاتے ہیں پھر بھی نہ تو ڈبے کی ہیئت بدلتی ہے نہ ٹرین کی چال میں کوئی فرق آتا ہے۔ اس حیرت انگیز چمتکار کی دو ہی وجوہات ہماری سمجھ میں آتی ہیں یا تو کہ یہ

کے ہر کمپارٹمنٹ کی تعمیر میں دھات اور پترے کی جگہ ربر کی پرتیں استعمال کی جاتی ہیں یا بمبئی کے باشندوں کے خمیر ہی میں کوئی لچک دار مادّہ وافر مقدار میں موجود ہے جو بوقت ضرورت اپنے آپ میں پھیلنے اور سکڑنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ یعنی بھیڑ زیادہ ہوئی تو جسم کے خلیوں میں چھپے لچک دار مادے کی سکڑنے والی صلاحیت کو بروئے کار لاکر اپنے وجود کو مختصر کرلیا اور کم ہوئی تو پھیل کر واپس اصلی حالت میں لوٹ آئے۔

مجبوری بھی آدمی کو کیسے کیسے ناچ نچاتی ہے جس آدمی کو انسان ہونا میسّر نہیں اسے دو کوڑی کا غبارہ بنا دیتی ہے جو ہوا بھرتے ہی پھول جاتا ہے، نکلتے ہی پچک جاتا ہے۔ آدمی کی اسی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر بمبئی کی لوکل ٹرینیں، اس کی ہوا ہی نہیں، تیل پانی بھی نکال لیتی ہیں۔ سچ ہے:

پھیلنا، سمٹنا، سمٹ کر پھیلنا
لچک نرم رکھنے کا ہے یہ بہانا

★

مشتاق احمد یوسفی

چھٹی قسط

اسکول ماسٹر کا خواب

اخبار ی ٹوپی :۔

تین چار مہینے بڑے سکون و عافیت سے گذرے۔ بچوں کا اسکول گرمیوں کی تعطیلات میں بند ہو گیا۔ ایک دن بشارت نے تانگہ جُتوایا اور کوئی دسویں دفعہ نقشہ پاس کروانے میونسپل کارپوریشن گئے۔ چلتے چلتے مولانا سے کہہ گئے کہ آج نقشہ پاس کروا کے ہی لوٹوں گا۔ بہت ہو چکی۔ دیکھتا ہوں آج باسٹرڈ کیسے پاس نہیں کرتے۔ یہ فقط گالی بھری شیخی نہیں تھی۔ اب تک وہ نظیریں اور دلائل براہین ساتھ لے کے جاتے تھے۔ لیکن آج وہ پانچ "سبزوں"* سے لیس ہو کر جا رہے تھے کہ شمشیر زر ہر گتھی اور گرہ کو کاٹ کے رکھ دیتی ہے۔ تانگہ گلیوں، گلیوں، بڑے لمبے راستے سے لے جانا پڑا، اس لئے کہ بہت کم سڑکیں بچی تھیں جن پر تانگہ چلانے کی اجازت تھی۔ تانگہ اب رکشہ سے بھی زیادہ چھیچھڑ چیز سمجھی جانے لگی۔ لہٰذا صرف انتہائی غریب علاقوں میں چلتا تھا جو شہر میں ہوتے ہوئے بھی شہر کا حصہ نہیں تھے۔ نیرنگیٔ زمانہ کو کیا کہیے۔ کانپور سے یہ خواب دیکھتے ہوئے آئے تھے کہ اللہ ایک دن ایسا بھی لائے گا۔ جب فٹن میں تانگوں پر اٹالین کمبل ڈال کے نکلوں گا تو لوگ ایک دوسرے سے پوچھیں گے، کس رئیس کی سواری جا رہی ہے؟ لیکن جب خواب کی تعبیر نکلی تو دنیا اتنی بدل چکی تھی کہ نہ صرف تانگہ چھپ کر نکلتا، بلکہ وہ خود بھی اس میں چھپ کر بیٹھتے۔ ان کا بس چلتا تو اٹالین کمبل سر سے پیر تک اچھی طرح لپیٹ کر نکلتے کہ کوئی پہچان نہ لے۔ دن میں جب بھی تانگے میں بیٹھتے تو "ڈان" اخبار کے دونوں ورق اپنے چہرے اور سینے کے سامنے اس طرح پھیلا کر بیٹھتے کہ ان کی لٹکی ہوئی ٹانگیں اخبار کا ضمیمہ معلوم ہوتی تھیں۔ مرزا عبدالودود بیگ نے تو ایک دن کہا بھی کہ تم اخبار کی ایک ٹوپی بنوا لو جس میں اپنا منہ چھپا سکو۔ ویسی ہی جلاد کی ٹوپی جیسی مجرم کو پھانسی پر لٹکانے سے پہلے پہنائی جاتی ہے۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ مجرم کو اخبار کی ٹوپی پہنا کر پھانسی دینی چاہیئے تاکہ اخبار والوں کو بھی تو عبرت ہو۔

اسپ کی ایک جست نے ....

میونسپل کارپوریشن کی عمارت کوئی چار پانچ سو گز دور رہ گئی ہو گی کہ اچانک گلی کے موڑ سے ایک جنازہ آتا دکھائی دیا۔ خلیفہ کو ملازم رکھتے وقت انھوں نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ گھوڑے کو بہر صورت جنازے سے دور رکھنا۔ لیکن اس وقت اس کا

---

* سبزے :۔ سو روپے کے نوٹ اپنے سبز رنگ کے سبب سبزے کہلاتے تھے۔ جب نوٹ کا رنگ سرخ ہو گیا تو لوگ نوٹ کو نوٹ ہی کہنے لگے۔ سرخا کسی نے نہیں کہا۔

دھیان کہیں اور تھا اور جنازہ تھا کہ گھوڑے پر چڑھا چلا آرہا تھا۔ بشارت اخبار پھینک کر پوری طاقت سے چیخے "جنازہ! جنازہ! خلیفہ جنازہ!!!" یہ سنتے ہی خلیفہ نے چابک مارنے شروع کر دیئے۔ گھوڑا وہیں کھڑا ہو کے ہنہنانے لگا۔ خلیفہ اور بدحواس ہو گیا۔ بڑے نے خود لگام پکڑ کر گھوڑے کو دوسری طرف موڑنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اڑیل ہو کر دولتیاں مارنے لگا۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ دراصل یہ وہ جگہ تھی جہاں خلیفہ گھوڑے کو باندھ کر حجامت کرنے چلا جاتا تھا۔ وہ چیخے "زرا طاقت سے چابک مار" ادھر خطرہ یعنی جنازہ لمحہ لمحہ نزدیک آرہا تھا۔ ان پر اب دہشت طاری ہو گئی۔ ان کے بوکھلائے ہوئے اندازے کے مطابق جنازہ اب اسی "رینج" میں آگیا جہاں چند ماہ پیشتر بقول اسٹیل مل کے سیٹھ کے

"اسپ کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام"

وہ خود اس وقت گھوڑے سے بھی زیادہ بدکے ہوئے تھے، اسلئے کہ گھوڑے کے پیٹ پر لات مارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی ہنہناہٹ ان کی چیخوں میں دب گئی۔ گھوڑے کے اس بار خلیفہ دیوانہ وار چابک چلا رہا تھا۔ چابک زور سے پڑتا تو گھوڑا پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو جاتا۔ خلیفہ نے غصے سے بے قابو ہو کر دو مرتبہ اسے "تیرا دھنی مرے" کی گالی دی تو بشارت سناٹے میں آگئے کیا سردست وہ گھوڑے کو قابو میں لانا چاہتے تھے۔ خلیفہ کو ڈانٹنے لگے "ابے کیا ڈھیلے ڈھیلے ہاتھوں سے مار رہا ہے۔ خلیفے!"

یہ سننا تھا کہ خلیفہ فاسٹ بولر کی طرح اسٹارٹ لے کر دوڑتا ہوا آیا اور دانت کچکچاتے ہوئے، آنکھیں بند کر کے پوری طاقت سے چابک مارا جس کا آخری سرا بشارت کے منہ اور آنکھ پر پڑا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے تیزاب سے لکیر کھینچ دی ہو۔ فرماتے تھے "یہ کہنا تو understatement (کسر بیانی) ہوگا کہ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ مجھے تو ایسا لگا جیسے دونوں آنکھوں میں فیوز اڑ گیا ہو" خلیفہ سے خلیفے، خلیفے سے ابے اور ابے سے الّو کے پٹھے تک کی تمام منزلیں ایک ہی چابک میں طے ہو گئیں۔ عالمِ وحشت میں وہ خلیفہ تک کیسے پہنچے۔ گھوڑے کو پھلانگ کر یا ٹانگوں کے نیچے سے یاد نہیں۔ خلیفہ کے ہاتھ سے چابک چھین کر دو تین اسی کو رسید کئے۔ اس نے اپنی چیخوں سے گھوڑے کو سر پر اٹھا لیا۔

ایک آنکھ میں اتنی سوزش تھی کہ اس کے اثر سے دوسری بھی بند ہو گئی۔ اور وہ بند آنکھوں سے گھوڑے پر چابک چلاتے رہے کچھ دیر بعد دفعتاً احساس ہوا کہ چابک کو روکنے کے لئے سامنے کچھ نہیں ہے۔ زخمی آنکھ پر ہاتھ رکھ کر بائیں آنکھ کھولی تو نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ جنازہ بیچ سڑک پر اریب (diagonal) رکھا تھا۔ تانگہ سرپٹ جا رہا تھا۔ کندھا دینے والے غائب، خلیفہ لاپتہ۔ البتہ سوگوار بزرگ جو زرد املتاس کے پیڑ سے لٹکے ہوئے تھے۔ گھوڑے کے شجرۂ نسب میں پدری حیثیت سے داخل ہونے اور اپنا وظیفۂ زوجیت حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کر رہے تھے۔

چند منٹ بعد لوگوں نے اپنی اپنی کمین گاہ سے نکل کر انہیں نرغے میں لے لیا جسے دیکھو۔ اپنی ہی دھائیں کر رہا ہے۔ ان کی سننے کے لئے کوئی تیار نہیں۔ طرح طرح کی آوازیں اور آوازے سنائی دیئے۔

"اس پر سالے اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں"

"گھوڑے کو شوٹ کر دینا چاہیئے"

"گھوڑے کو نہیں مالک کو"

"تھانے لے چلو"

(بشارت کی ٹائی پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے) "ہماری میت کی بے حرمتی ہوئی ہے" اس کا منہ کالا کر کے اسی گھوڑے پر جلوس نکالو۔"

بشارت نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ بلبن کو انجکشن سے ہلاک کروا دیں گے۔

گھر آ کر انہوں نے بلبن کو چابک سے اتنا مارا کہ محلے والے جمع ہو گئے۔

اس رات وہ اور بلبن دونوں نہ سو سکے۔ اس سے پہلے انہوں نے نوٹس نہیں کیا تھا کہ خلیفہ نے چابک میں بجلی کا تار باندھ رکھا ہے۔

۸

بلبن کو سزائے موت

صبح انہوں نے خلیفہ کو برخاست کر دیا۔ وہ پیٹی بغل میں مار کے جانے لگا تو ہاتھ جوڑ کے بولا "بچوں کی قسم! گھوڑا بے قصور تھا ۔وتو چپکا کھڑا تھا۔ آپ ناحق میں پٹوا رہے تھے۔ اتنی مار کھا کے تو مُردہ گھوڑا بھی اٹھ کے سرپٹ دوڑنے لگتا۔ السلام علیکم (لوٹ کر آتے ہوئے) ...ور معاف! حجامت بنانے جمعہ کو کس وقت آؤں؟

ایک دوست نے رائے دی کہ گھوڑے کو "ویٹ" سے انجکشن نہ لگواؤ۔ جانور بے انتہا اذیت اٹھا کے تڑپ تڑپ کر مرتا ہے ...منے اپنے السیشن کتے کو اسپتال میں انجکشن سے مرتے دیکھا تو دو دن تک ٹھیک سے کھانا نہ کھا سکا۔ وہ میرے کڑے وقتوں کا ساتھی تھا۔ مجھے ...ی بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا۔ یہ بڑا بدنصیب، بزادکھی گھوڑا ہے۔ اس نے اپنی معذوری اور تکلیف ...ے باوجود تمہاری، تمہارے بچوں کی بڑی خدمت کی ہے۔

اسی دوست نے کسی شخص سے فون پر بات کر کے بلبن کو گولی مارنے کا انتظام کر دیا۔

بلبن کو ٹھکانے لگوانے کا کام کرامت حسین کے سپرد ہوا۔ وہ بہت اچھے بڑی منطق چھانٹی۔ کہنے لگے، پالتو جانور، جانور نہیں ...ا۔ وہ تو بیٹی بیٹا ہوتا ہے۔ بشارت نے جواب دیا "آپ کو معلوم ہے گھوڑے کی کتنی عمر ہوتی ہے؟ اس لنگڑے دین کو آٹھ نو سال تک کھڑا ...ن کھلائے گا؟ میں نے تمام ایسے ٹھسانے، زندہ رکھنے کا ٹھیکہ تو نہیں لیا۔ مولانا اپنی ماتحتانہ حیثیت بھول کر یکایک جلال میں آ گئے۔ ...بین کے قینچے کا رُخ آسمان کی طرف موڑتے ہوئے کہنے لگے کہ انسان کی یہ طاقت، یہ مجال کہاں کہ کسی کو روزی دے سکے۔ رزاق تو ...ہی ہے جو پتھر کے کیڑے کو بھی رزق دیتا ہے۔ جو بندہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی کو روزی دیتا ہے، وہ درحقیقت خدائی کا دعویدار ہے۔ ...رذی روح اپنا رزق اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اللہ کا وعدہ برحق ہے وہ ہر حال میں ہر صورت میں رزق دیتا ہے۔

"بے شک! بے شک! رشوت کی صورت میں بھی!" بشارت کے منہ سے نکل گیا۔ فقرہ ترازو ہو گیا۔ مولانا ہی نہیں خود بشارت ...دھک سے رہ گئے کہ کیا کہہ دیا۔ جس کمینے انتقامی فقرے کو آدمی برسوں سینے میں دبائے رکھتا ہے وہ ایک نہ ایک دن اچھل کر اچانک ...نہ پر آ ہی جاتا ہے۔ پٹی باندھنے سے کہیں دل کی پھانس نکلا کرتی ہے۔ اور جب تک وہ نہ نکل جائے آرام نہیں آتا۔

مولانا صبح تڑکے بلبن کو لینے آ گئے۔ گیارہ بجے اسے ناظم آباد کی پہاڑیوں کی تلیٹی میں گولی ماری جانے والی تھی۔

بشارت ناشتے پر بیٹھے تو ایسا محسوس ہوا جیسے حلق میں پھندا لگ گیا ہو۔ آج انہوں نے بلبن کی صورت نہیں دیکھی۔ ...ولی تو ظاہر ہے پیشانی پر ہی مارتے ہوں گے" انھوں نے سوچا۔ بائیں آنکھ کے اوپر والی بھونری واقعی منحوس نکلی۔ جان لے کے رہے گی۔ ...ولانا کو انھوں نے رات ہی کو ہدایت کر دی تھی کہ لاش کو اپنے سامنے دفن کرا دیں۔ جنگل میں چیل کوؤں کے لیے نہ چھوڑیں۔ انھیں جھرجھری ...ائی اور وہ کباب پراٹھا کھائے بغیر ہی اپنی دکان روانہ ہو گئے۔ راستے میں انھوں نے اس کا ساز اور دُم پٹھ کا وہ خون آلود پیڈ پڑا ...یکھا۔ جو اس کی زخمی گردن پر باندھا جاتا تھا۔ ایسا لگا جیسے انھیں کچھ ہو رہا ہے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے نکل گئے۔

بزرگوار کو اصل صورتِ حال سے آگاہ نہیں کیا گیا۔ انھیں صرف یہ بتایا گیا کہ بلبن دو ڈھائی مہینے کے لئے چرائی پر پنجاب گیا ہے۔ وہ کہنے لگے "کاٹنے بھینسوں کو چرائی پر جاتے سُنا تھا۔ مگر گھوڑے کو گھانس کھانے کے واسطے کراچی سے صوبہ پنجاب جاتے ہی سُنا! کراچی سے تو صرف سیٹھ اور کچھ پتی سیزن کے سیزن چرائی پہ کوہ مری جاتے ہیں" یہ اُن سے اُلجھنے کا موقع نہیں تھا۔ اُن کا بلڈ پریشر پہلے ہی بہت بڑھا ہوا تھا۔ انھیں کسی زمانے میں اپنی طاقت اور کسرتی بدن پر بڑا ناز تھا۔ اب بھی بڑے فخر سے کہتے تھے کہ میرا بلڈ پریشر دو آدمیوں کے برابر ہے۔ وہ آدمیوں کے برابر والے دعوے کی ہم بھی تصدیق کریں گے کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ انھیں غصہ دورہ ہوتا تو دو آدمیوں کی طاقت سے چیختے تھے۔ لہٰذا بشارت اپنے دروغِ مصلحت آمیز پر ڈٹے رہے اور ٹھیک ہی کیا۔ مرزا کہتے ہیں کہ اپنے چھوٹوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے انھیں بھی جھوٹ بولنے کی تحریک ہوتی ہے۔ لیکن بزرگوں کی اور بات ہے۔ انھیں کسی خارجی تحریک کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مولانا راس پکڑے بلبن کو بزرگوار سے ملوانے کے لئے لے گئے۔ ان کا آدھے سے زیادہ سامان ان کے کمرے میں منتقل تھا۔ ہارمونیم رحیم بخش کے لال کھیس میں لپیٹا جا رہا تھا۔ بلبن کا فوٹو جو ریس جیتنے کے بعد اخبار میں چھپا تھا۔ ابھی دیوار سے اتارنا باقی تھا۔ وہ رات سے بہت مغموم تھے۔ خلافِ معمول عشاء کے بعد دو مرتبہ حقہ پیا۔ اب وہ صبح و شام کیسے کاٹیں گے۔ اس وقت جب بلبن پاس لایا گیا تو وہ سر جھکائے دیر تک اپنی ایال میں انگلیوں سے کنگھی کراتا رہا۔ آج انھوں نے اس کے پاؤں کا دم نہیں کیا۔ جب وہ پیشانی پر اللہ لکھنے لگے تو ان کی انگلی چابک کے اُبھرے ہوئے لمبے نشان پر پڑی اور وہ چونک پڑے۔ جہاں تک یہ لکیر جاتی انگلی کی پور سے خود کو زخماتے رہے۔ پھر دکھ بھرے لہجے میں کہنے لگے "کس نے مارا ہے ہمارے بیٹے کو؟" مولانا سے بے جا تو اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے " اچھا۔ بلبن بیٹے! ہمارا تو چل چلاؤ ہے۔ خدا جانے واپسی پہ ہمیں پاؤ گے کبھی یا جاؤ! اللہ کی امان میں دیا۔"

بلبن کی جدائی کے خیال سے بزرگوار ڈھے گئے۔ اب وہ اپنے دل کی بات کس سے کہیں گے؟ کس کی شفا کے لئے بے اختیار ہاتھ اٹھیں گے؟ انھوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ قدرت کو اتنا سا آسرا، ایک جانور کی دِسراتھ تک منظور نہ ہوگی۔ جو خود تنہائی کے جان کو گھلا دینے والے کرب سے نہ گذرا ہو وہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اکیلا آدمی کیسی کیسی دسراتھ کا سہارا لیتا ہے۔ بانشائیوں کے مصنف چارلس لیمب نے ایک عمر کرب و تنہائی میں گذاری۔ پیر ۱۲ / مئی ۱۸۰۰ء کو وہ کولرج کو اپنے خط میں لکھتا ہے "گذشتہ جمعہ کو ہیٹی (ضعیف خادمہ) آٹھ دن کی علالت کے بعد چل بسی۔ اس کی میت اس وقت کمرے میں میرے سامنے رکھی ہے۔ میری (چارلس لیمب کی بہن جسے دیوانگی کے دورے پڑتے تھے) اس صدمے کی تاب نہ لاسکی اور اس پر شدید دورہ پڑا۔ اسے دوسری جگہ منتقل کرنا پڑا۔ اب اس گھر میں میں تنہا ہوں اور دِسراتھ کے لئے ہیٹی کی نعش کے سوا اور کوئی نہیں۔ میں اسے بھی دفن کر دوں گا تو بالکل ہی تنہا رہ جاؤں گا۔ پھر سوائے اس بلی کے اور کوئی نہ ہوگا۔ جو مجھے یاد دلائے گا کہ ان آنکھوں نے کبھی اس گھر کو بھرا پُرا دیکھا تھا۔ کبھی اس میں مجھ جیسے ذی روح رہتے تھے"

مولانا دن بھر غیر حاضر رہے۔ دوسرے دن وہ بند بند اور کھنچے کھنچے سے نظر آئے۔ کئی سوال ہونٹوں پر لرز لرز کر رہ گئے۔ کسی کو ان سے پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ بلبن کو گولی کہاں لگی۔ کہتے ہیں جانوروں کو موت کا premonition (پیش آگہی) ہو جاتا ہے۔ تو کیا جب وہ ویران پہاڑیوں میں لے جایا جا رہا تھا تو اس نے بھاگنے کی کوشش کی؟ اور کبھی آخری لمحے میں بھی ہو جایا کرتا ہے۔ وہ بہت جفاکش، سخت جان اور حوصلے والا تھا۔ دل نہیں مانتا کہ اتنی آسانی سے اس نے مو

بارسائی ہوگی۔

> Do not go gentle into that good night
> Rage rage against the dying of the light.

۹

آہا آہا! ابر کھا آئی!

کوئی دو ہفتے بعد بشارت کی طاہر علی موسیٰ بھائی سے اسپنسر آئی ہاسپٹل کے سامنے مڈبھیڑ ہوگئی۔ موسیٰ بھائی بوہری تھا اور اس کی لکڑی کی دکان ان سے اتنے فاصلے پر تھی کہ پتھر پھینکتے تو ٹھیک اس کی سنہری پگڑی پر پڑتا۔ یہ حوالہ اس لئے دینا پڑا کہ کئی مرتبہ بشارت کا دل اس پر پتھر پھینکنے کو چاہا۔ وہ کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا ان کے لگے ہوئے گاہک توڑتا اور طرح طرح کی افواہیں پھیلاتا رہتا۔ دراصل وہ ان کی بزنس خراب کر کے ان کی دکان خریدنا چاہتا تھا۔ اس کی چھدری داڑھی طوطے کی چونچ کی طرح مڑی رہتی تھی۔

وہ کہنے لگا "بشارت سیٹھ! لاسٹ منتھ ہم کو کسی نے بولا آپ گھوڑے کو شوٹ کرڈالے ہو۔ ہم بولا، باپ رے باپ! یہ تو ایک دم ہتیا ہے۔ وہ گھوڑا تو عشرہ (محرم) میں دُلدل بنا (ذوالجناح) بنا تھا! ہماری آرا مشین پہ ایک مجور کام کرتا ہے۔ تراب علی۔ اس نے ہم کو آکے بولا کہ میری جھگی کے سامنے سے دُلدل کی سواری نکلی تھی۔ آپ ہی کا گھوڑا۔ سیم ٹو سیم۔ سولہ آنے۔ تراب علی نے اس کو اپنے ہاتھ سے دودھ جلیبی کھلائی۔ آپ کے چوان نے اس کا پورا بھاڑا وصول کیا۔ پچاس روپے۔ وہ بولتا تھا بشارت سیٹھ دُلدل بھاڑے ٹیکسی پہ چلانا مانگتا ہے۔ دُلدل کے آگے آگے وہ شاہِ مرداں، شیرِ یزداں، وگیرہ وگیرہ گاتا جارہا تھا۔ اس کے پندرہ روپے الگ سے۔ گھوڑے کو ہمارے پاس بھی سلام کرانے لایا تھا۔ گریب بال بچے دار مانس ہے۔"

اس کے اگلے روز مولانا کام پر نہیں آئے۔ دو دن سے مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ چار دن قبل جیسے ہی ریڈیو کراچی والوں نے بارش کا پہلا قطرہ گرتے دیکھا، ساون کے گیت موسلا دھار نشر کرنے شروع کر دیئے۔ گیتوں ہی سے اطلاع ملی کہ یہ ساون ہے ورنہ ساون کے مہینے کو کراچی میں کون پہچانتا ہے۔ لیکن ذرا سوچئے تو گیت میں اگر ساون کی بجائے جون/جولائی لکھیں تو برکھا رت کا سارا رومانس پروا اڑا کے لے جائے۔ وہ مسکرا دیئے۔ آج صبح گھر سے چلتے وقت کہہ آئے تھے۔ "بیگم! آج تو کڑھائی چڑھنی چاہیئے۔ کراچی میں تو ساون کے پکوان کو ترس گئے۔ خستہ سموسے، کرارے پاپڑ اور پھلوریاں۔ کراچی کے پپیتے کھا کھا کے ہم تو بالکل پلپلا گئے۔" شام کو جب وہ دکان بند کرنے والے تھے۔ ایک شخص خبر لایا کہ کل شام مولانا کے والد کا انتقال ہوگیا۔ آج ظہر و عصر کے درمیان جنازہ اٹھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ چلو اچھا ہوا۔ اللہ نے بچارے کی سن لی۔ برسوں کی جانکنی ختم ہوئی۔ مٹی عزیز ہوگئی۔ بلکہ یوں کہیئے، کیچڑ سے اٹھا کر خشک مٹی میں دبا آئے۔ وہ تعزیت کے لئے سیدھے مولانا کے گھر پہنچے۔ بارش تھم چکی تھی اور چاند نکل آیا تھا۔ آسمان پر ایسا لگتا تھا جیسے چاند بڑی تیزی سے دوڑ رہا ہے اور بادل اپنی جگہ ساکت ہیں۔ اینٹوں، پتھروں اور ڈالڈا کے ڈبوں کی پگڈنڈیاں جابجا پانی میں ڈوب چکی تھیں۔ ننگ دھڑنگ لڑکوں کی ایک ٹولی پانی میں ڈبک ڈبک کرتے ایک ایک گھڑے میں باری باری منہ ڈال کر فلمی گانے گا رہی تھی۔ ایک ڈھئی ہوئی جھگی کے سامنے ایک کریہہ صورت شخص بارش کو رکوانے کے لئے اذان دیئے چلا جا رہا تھا۔ ایک ہفتے پہلے اسی جھگی کے سامنے اسی شخص نے بارش لانے کے لئے اذانیں دی تھیں۔ اس وقت بچوں کی ٹولیاں گھروں کے سامنے "مولا میگھ دے! مولا پانی دے! تال، کنویں، مٹکے سب خالی۔ مولا پانی! پانی! پانی!" الاپتی اور ڈانٹ کھاتی پھر رہی تھیں۔

عجیب کسمپرسی کا عالم تھا۔ کہیں چٹائی، ٹاٹ، سرکی اور اخبار کی ردی کاغذ سے بنی ہوئی چھتوں کے پیالے پانی کے لبالب بوجھ سے

لگے پڑے رہے تھے۔ اور کہیں گھر کے مرد پھٹی پرانی چٹائیوں میں دوسری پھٹی چٹائیوں کے پیوند لگا رہے تھے۔ ایک شخص ٹاٹ پر پگھلا ہوا تار کول پھیلا کر ٹاٹ سے اس حصے کے لئے ترپال بنا رہا تھا جس کے نیچے اس کی بیمار ماں کی چارپائی تھی۔ فدا حسین کی جھگی بالکل ڈھیر ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مرمت کہاں سے شروع کرے۔ چنانچہ وہ ایک بچے کی پٹائی کرنے لگا۔ جگہ جگہ لڑکے نالیاں بنا رہے تھے جن کا مقصد بظاہر اپنی فراغت سے بچوں کی فراغت کو محفوظ رکھنا تھا۔ ایک صاحب آٹے کی بھیگی بوری میں بغل تک ہاتھ ڈال کر دیکھ رہے تھے کہ اندر کچھ بچا بھی ہے یا سارا ہی پیڑے سے ملنے کے لائق ہو گیا۔ ایک جھگی کے باہر بکری کی اوجھڑی پر برساتی مکھیاں جو مصاحبوں کی طرح چپکو اسلام ہو گئی تھیں، خارشی کتے کے اڑائے سے اڑ رہی تھیں۔ یہ اس دودھ دینے والی مگر بیمار اور دم توڑتی ہوئی بکری کی اوجھڑی تھی جسے تھوڑی دیر پہلے اس کے دو مہینے کے بچے سے ایک گز دور تین پڑوسیوں نے مل کر فرت پھرت ذبح کیا تھا تاکہ چھری پھرنے سے پہلے ہی ختم نہ ہو جائے۔ اس کا خون معاملوں نالوں اور نالیوں کے ذریعہ دور دور تک پھیل گیا تھا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے کہ ایک بھائی کی حق حلال کی کمائی کو ضائع ہونے سے بال بال بچا لیا موت کے منہ میں سے کیسا نکالا تھا انہوں نے بکری کو! چند جھگیوں میں مہینوں بعد گوشت پکنے والا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت انہیں اس وقت ہوئی جب وہ اس جھگی کے سامنے سے گذرے جس میں لڑکیاں شادی کے گیت گا رہی تھیں۔ باہر لگی ہوئی کاغذی رنگ برنگی جھنڈیاں تو اب نظر نہیں آ رہی تھیں، لیکن ان کے کچے رنگوں کے باؤلے ریلوں سے ٹاٹ کی دیوار پر psychedelic patterns بن گئے تھے۔ ایک لڑکی آٹا گوندھنے کے تسلے پر سنگت کر رہی تھی کہ بارش سے اس کی ڈھولک کا گلا بیٹھ گیا۔

اماں! میرے بابا کو بھیجو ری کہ ساون آیا!
اماں! میرے بھیا کو بھیجو ری کہ ساون آیا!
کہ ساون آیا

ایک جھگی کے سامنے میاں بیوی لحاف کو رسی کی طرح بل دے کر نچوڑ رہے تھے۔ بیوی کا بھیگا ہوا گھونگھٹ ہاتھی کی سونڈ کی طرح لٹک رہا تھا۔ بیس ہزار کی اس بستی میں دو دن سے بارش کے سبب چولہے نہیں جلے تھے۔ نشیبی علاقوں کی کچھ جھگیوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا تھا۔ جھگیوں کی پہلی قطار کے سامنے ایک نیک، خداترس، باریش بزرگ قورمہ اور تندوری روٹیاں تقسیم کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو وہ ٹیکسی میں رکھ کر لائے تھے۔ تین ہزار کی بستی میں تین لحاف لے جانا ایسا ہے جیسے کوئی انجکشن کی سرنج سے آگ بجھانے کی کوشش کرے۔ پھر یہ بھی تھا کہ کسی بھی جھگی میں دو گز زمین کا ایسا خشک جزیرہ نہ تھا جہاں کوئی لحاف اوڑھ کر سو سکے۔ اس بزرگ کے چاروں طرف کوئی ڈیڑھ دو سو ننگ دھڑنگ بچوں کا ہجوم تھا جسے وہ کیو بنانے کے فوائد سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ان ان پڑھ ٹھوٹ بچوں کی حسِ حساب ان سے کہیں بہتر تھی کیونکہ ان کے اندر کا بھوکا حساب داں، بچہ بھی جانتا تھا کہ اگر تیس روٹیوں کو دو سو بھوکوں اور تین لحافوں کو بیس ہزار مستحقین میں تقسیم کیا جائے تو حاصل تقسیم میں مخیر بزرگ کے تن پر ایک دھجی بھی باقی نہ رہے گی۔ اور اس وقت یہی صورت پیدا ہو چلی تھی۔ بشارت آگے بڑھے تو دیکھا کہ کوئی جھگی ایسی نہیں جہاں سے بچوں کے رونے کی آواز نہ آ رہی ہو۔ پہلی مرتبہ ان پر یہ انکشاف ہوا کہ بچے رونے کی ابتداء ہی سر انترے سے کرتے ہیں۔ جھگیوں میں آدھے بچے تو اس لئے پٹ رہے تھے کہ بلبلا رہے تھے اور بقیہ آدھے اس لئے بلبلا رہے تھے کہ پٹ رہے تھے، تو وہ سوچنے لگے، تم ایک شخص کو پرسا دینے چلے تھے۔ یہ کس دکھ کے ساگر میں آ نکلے۔ طرح طرح کے خیالوں نے گھیر لیا۔ بڑے میاں کو تو کفن بھی بھیگا ہوا نصیب ہوا ہوگا۔ یہ کیسی بستی ہے جہاں بچے نہ گھر میں کھیل سکتے ہیں۔ نہ باہر۔ جہاں بیٹیاں دو گز زمین پر ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے درختوں کی طرح بڑی ہو جاتی ہیں۔ جب یہ دلہن بیاہ کے پردیس جائے گی تو اس کے ذہن میں بچپن اور میکے کی کیا تصویر ہوگی؟ پھر خیال آیا، کیسا پردیس، کہاں کا پردیس، یہ تو بس [illegible] کہیں ایک جھگی

سے دوسری جھگی میں پیر پھیلا چلی جائے گا۔ یہی سکھیاں سہیلیاں کہتی ہیں کہ بیاہ پیا بدیس دے! لکھی بابل مورے! کاٹی ہوئی اسے دو گز پرائی زمین کے ٹکڑے تک پہنچا آئیں گی۔ پھر ایک دن مینہ برستے ہیں جب ایسا ہی سماں ہوگا، وہاں سے آ مری دو گز زمین کی جانب ڈولی اٹھے گی۔ اور زمین کا بوجھ زمین کی چھاتی میں سما جائے گا۔ مگر سنو! بندۂ خدا! تم کاہے کو یوں جی بھاری کرتے ہو؟ کہیں اس طرح آنکھوں میں آنسو بھر کے دنیا کو دیکھا کرتے ہیں؟ درختوں کو کپڑ مارے سے گھن تھوڑا ہی آتی ہے۔ کبھی پھول کو بھی کھاد کی بدبو آئی ہے؟ -

انھوں نے ایک جھرجھری لی اور ان کے ہونٹوں کے دائیں کونے پر ایک کڑوی سی، ترچھی سی مسکراہٹ کا جھونپڑ پڑ گیا۔ جو بچنے یاد نہیں دیکھتے وہ اسی طرح مسکرا دیتے ہیں۔

انھوں نے پہلے پہل اس اگھور بستی کو دیکھا تھا تو کیسی ابکائی آئی تھی۔ آج خوف آ رہا تھا۔ بھیگی بھیگی چاندنی میں یہ ایک شہر سیب لگتا تھا جو کسی طور کراچی کا حصہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ حد نگاہ تک اونچے نیچے بانس ہی بانس۔ اور ٹیکتی چٹائیوں کی گپھائیں۔ بیچ میں بستی کا پنجر لگتا تھا جیسے ایٹمی دھماکے کے بعد بچ جانے والوں نے کھڑا کیا ہو۔ ہر گڑھے میں چاند نکلا ہوا تھا اور عجیب دلدلوں آسیبی کرنیں اپنا چھلاوا ناچ ناچ رہی تھیں۔ جھینگر ہر جگہ بولتے سنائی دے رہے تھے اور کسی جگہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ بھنگی رتینگوں کے ڈر سے لوگوں نے لالٹینیں گل کر دی تھیں۔ عین بشارت کے سر کے اوپر سے چاند کو کاٹتی ایک ٹیٹری بولتی ہوئی گزری۔ دفعتاً انھیں ایسا لگا جیسے اس کے شہپر کی ہوا سے ان کے سر کے بال اڑ رہے ہوں۔ نہیں یہ سب کچھ ایک بھیانک خواب ہے جیسے ہی موڑ سے نکلے۔ اگر بتیوں اور لوبان کی ایک سوگوار لپٹ آئی اور آنکھیں یکایک چکاچوند ہو گئیں۔ یا خدا ہوش میں ہوں یا عالم خواب ہے۔

کیا دیکھتے ہیں مولانا کرامت حسین کی جھگی کے دروازے پر ایک پٹرومکس جل رہی ہے۔ چار پانچ پرسہ دینے والے کھڑے ہیں اور باہر اینٹوں کے چبوترے پر ان کا سفید براق گھوڑا بلبن کھڑا ہے۔ مولانا کا پولیو زدہ بیٹا اس کو پڑوسی کے گھر سے آئے ہوئے موت کے کھانے کی نان کھلا رہا تھا۔

■ ■

رؤف پاریکھ
(کراچی)

یارو! قصہ یہ ہے...

عبدالرؤف عروج کا خاکہ

عبدالرؤف عروج مرحوم کا یہ خاکہ ان کے مجموعۂ کلام "چراغ آفریدم" کی تقریب رونمائی کے موقعے پر شائع ہونے والے سوونیر کے لیے لکھا گیا تھا۔ یہ سوونیر کبھی شائع نہیں ہوا' نہ ہی وہ تقریب رونمائی کبھی منعقد ہوئی۔ عروج صاحب نے احباب کے اصرار پر تقریب رونمائی کے انعقاد کی حامی تو بھرلی تھی لیکن یہ سب ان کے مزاج کے خلاف تھا لہٰذا اسے ٹالتے رہے۔ حتیٰ کہ کارکنانِ قضا و قدر نے ان کے ساتھ ایک اور تقریب منا ڈالی۔ چناں چہ یہ خاکہ بھی غیر مطبوعہ ہی رہا۔ گو عروج صاحب اسے ناراض ہوئے بغیر پڑھ چکے تھے۔

۱۷ر مئی ۱۹۹۱ء کو عروج صاحب کی پہلی برسی تھی۔ اس موقع پر یہ خاکہ نذرِ قارئین ہے

رشید احمد صدیقی کے بارے میں کسی نے لکھا ہے کہ وہ مزاح نگار تھے لیکن مرثیہ نگار نظر آتے تھے۔ عروج صاحب اس دو رخی کے قائل نہیں۔ چناں چہ وہ مرثیہ نگار ہیں اور مرثیہ نگار ہی نظر آتے ہیں۔ ان کے چہرے پر مرثیہ نگاری کے اسرار کے اعلان کے علاوہ نمایاں ترین چیز (شناختی کارڈ کے دفتر والوں کے الفاظ میں "ظاہرہ شناختی علامت") ان کا گنج گراں مایہ ہے۔ آج کل دانشوروں میں بال بنانے کا یہ انداز بڑا مقبول اور مروّج ہے۔ درمیان میں صفاچٹ اور تین طرف جھالر۔ اس میں کئی سہولتیں ہیں۔ مثلاً حجامت کی اجرت نصف لگتی ہے اور بال سنوارنے کی ضرورت نہیں رہتی کیوں کہ بال چاہے سنورے ہوں یا الجھے ہوئے یکساں نظر آتے ہیں۔ ایک فائدہ اس چمکتی چندیا کا یہ بھی ہے کہ سر کو متواتر اور براہ راست دھوپ ملنے سے دماغ روشن رہتا ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو سر تاریکی میں بھی چمکتا ہے۔ اسی لیے دانشور روشن دماغ ہیں۔ اس ہیر اسٹائل میں' جس میں ہیر کم ہوتے ہیں اور اسٹائل زیادہ ہوتا ہے' صرف ایک ہی قباحت ہمیں نظر آتی اور یہ وہی ہے جو مشتاق احمد یوسفی صاحب کو بھی محسوس ہوتی ہے یعنی منہ دھوتے ہوئے پتہ نہیں چلتا کہ پیشانی کہاں ختم ہوتی ہے۔

عروج صاحب کے سراپے میں دوسری اہم چیز ان کے دانت ہیں جو کثرتِ پان خوری کے سبب اپنی اصل

اور تاب و تواں کھو چکے ہیں۔ ہمیں اکثر تعجب ہوتا ہے کہ عروج صاحب کے اس ظلم و ستم کے باوجود ان کے دانت اب تک نہ صرف لگے ہوئے ہیں بلکہ برابر کام کیے جا رہے ہیں۔ اللہ ایسے صابر دانت اور رشتے دار سب کو دے۔

عروج صاحب کے قامت اور جثے کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ شاید غلطی کو یہ نام عروج صاحب کو دیکھنے کے بعد ہی دیا گیا ہے اور چلتے ہیں تو لگتا ہے کہ ان کے پاؤں اس عمل میں ان کے ساتھ تعاون نہیں کر رہے۔ ان کی نحیفی کو دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ یا اس قسم کا کوئی شخص بیک وقت شاعر، صحافی، محقق اور نقاد ہونے اور سارے جہان کا درد اپنے معصوم، ہمدرد اور کمزور سے جگر میں سمیٹے لیے پھرنے کا متحمل ہو سکتا ہے۔

عروج صاحب کو ہم پہلے نقاد، محقق اور صحافی سمجھتے تھے۔ محقق سمجھ کر رہنمائی حاصل کرنے گئے تو انکشاف ہوا کہ شاعر بھی ہیں اور روزانہ ایک قطعہ اتنی ہی پابندی سے کہتے ہیں جتنی پابندی سے بعض سمجھ دار بیبیاں روزانہ صبح اپنے شوہر نام دار اور دیگر گھریلو سامان کو جھاڑتی ہیں۔ آندھی ٹلے، طوفان ٹلے، بارش ٹلے، قیامت تک ٹل سکتی ہے۔ نہیں ٹل سکتا تو عروج صاحب کا قطعہ اور گھریلو سامان کی جھاڑ پونچھ۔

ان سے ہماری پہلی ملاقات کے وقت تک ان کا مجموعۂ کلام منظرِ عام پر نہ آیا تھا۔ برسوں نظمیں اور غزلیں کہتے اور چھپواتے رہے لیکن قلندری نے کبھی انھیں یک جا نہ ہونے دیا۔

چناں چہ ان کی شاعری کا اندازہ صرف ان کی قطعہ نگاری سے (روزنامہ حریت کی وساطت سے) ہوتا تھا۔ ملاقاتیں بڑھیں اور کچھ کھلے تو پتہ چلا کہ مرثیے بھی کہتے ہیں ہمیں اک گونہ اطمینان ہوا کہ ان کے چہرے مہرے کو دیکھ کر ہمارے ذہن میں میر کا یہ مصرع جو بار بار چکر کاٹتا تھا کہ:

ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

وہ بالکل بجا تھا اور اس کی شانِ نزول ان حضرات کی مرثیہ نگاری ہی تھی بلکہ بعض اوقات تو ان جناب کی آنکھیں دیکھ کر خیال آتا ہے کہ میر نہ صرف روتے روتے سو گیا تھا بلکہ اٹھنے کے بعد پھر رویا ہے اور اب دوبارہ سونے کی تیاری میں ہے۔

مرثیہ نگاری کے علاوہ بھی عروج صاحب نے کئی علتیں پال رکھی ہیں مثلاً پان خوری، چائے نوشی، جاں سوزی، ادیب پروری، سیر چشمی اور خلوص کیشی اور ان میں سے کسی بھی عادتِ بد کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں۔

عروج صاحب میں ایک بڑا عیب یہ بھی ہے کہ وہ ہر آدمی سے یکساں خلوص، محبت اور توجہ سے ملتے ہیں۔ ان کی یہ خامی اور مساوات کا یہ نعرہ ان کے کئی ملنے والوں اور چاہنے والوں کو، جن میں ہم بھی شامل ہیں، بہت کھلتا ہے۔ بھلا بتائیے کہ منافقت اور پبلک ریلیشننگ کے اس دور میں یوں اپنا خلوص لٹانا کہاں کی عقل مندی ہے؟ اور پھر ہم اس لیے بھی "خلوصِ عام" کے مخالف ہیں کہ ہم جیسے توجہ کے طالب اپنے خاص خلوص کے کوٹے کو کم ہوتا محسوس کرتے ہیں۔

عروج صاحب جب کسی کو بے تکلفی سے پکارتے ہیں تو اسے "یارو!" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں چاہے مخاطب صیغۂ واحد حاضر کا مستحق ہو۔ کسی چیز کی تفصیل بتانی ہو تو بات "قصہ یہ ہے ....." کہہ کر شروع کرتے ہیں۔ اگر کوئی کتاب، مضمون، کالم یا غزل غیر معیاری ہو تو کہیں گے "بوگس ہے"۔ اگر کوئی نقاد یا محقق سطحی سی بات کہے تو کہیں گے "بوگس آدمی ہے"۔ البتہ ہمارا اتنا لحاظ کرتے ہیں کہ ہمارے کالموں کو "WEAK ہے" کہہ کر سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں اور ہم تاڑ جاتے ہیں کہ کالم اس بار بوگس ہے۔

ہے نئے شاعر اور ادیب کی حوصلہ افزائی کو انھوں نے گویا اپنے مذہب میں داخل کر رکھا ہے نئے لکھنے والے بھی پلائیں گے، کھانا بھی کھلائیں گے اور مشورے بھی دیں گے۔ اگر ٹوکو تو بے چارگی سے کہیں گے "یار واکیا کر اپنا ابتدائی وقت یاد آجاتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ اگر کسی آدمی میں لکھنے کی صلاحیت ہے تو اسے KILL کیوں کریں انہیں میں جوہر ہوں گے تو نکھر جائے گا، ورنہ بس ہوگا تو خود ہی کام ختم ہو جائے گا۔"

عروج صاحب کی خامیوں کی فہرست خاصی طویل ہے لیکن اس مادہ پرست اور ظاہر بین معاشرے میں ان ناقابلِ معافی ہے کہ وہ بغیر کسی صلے، ستائش یا ڈگری کی تمنا کے علم اور ادب کو اتنی سنجیدگی سے لیتے ہیں کہ پی ایچ ڈگری .... کے امیدوار بھی اس طرح آنکھوں کا نکالتے ہوں گے۔ شاید اسی لگن کی بدولت پی ایچ ڈی کے طالب علم بھی ان سے رہنمائی حاصل کرتے پائے جاتے ہیں بھی ان کو اپنی نایاب کتابیں بلا توقف تھما دیتے ہیں اور بعد میں افسوس کرتے ہیں۔ اس بات پر نہیں کہ کتابیں واپس اس بات پر کہ بے چارہ پی ایچ ڈی نہ کر سکا۔

کتابیں خریدنے، پڑھنے اور رکھنے کی ان کو دھت ہے۔ کراچی میں بھارتی کتابوں کی ایک دکان "وین گ نام سے کھلی۔ ہم نے انھیں اس کی اطلاع دی تو بے تاب ہو گئے۔ موٹر سائیکل کی سواری پر ان کو کچھ زیادہ اعتماد ہمارے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار ہو کر وہاں گئے۔ کتابیں خریدیں اور خوش خوش آئے۔ لیکن راستے میں افسوس "یارو! قصہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کو دیر سے اطلاع ملی۔ نہ جانے کون کون سی کتابیں ہوں گی جو ہم سے پہلے لوگ خرید البتہ کبھی کبھی کتابیں خرید کر ڈرتے ہوئے بھی پائے گئے ہیں۔ اس ڈر کی وجہ یا خدا جانتا ہے یا وہ خود ہاں ایک اور ہستی ہے جو شاید نہ جانتی ہو۔

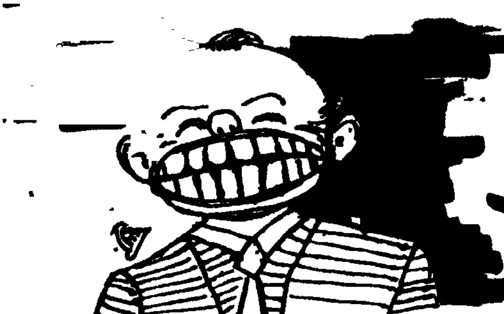
موٹر سائیکل کی سواری کا قصہ چھڑا ہے تو ذرا اس کی تفصیل بھی ملاحظہ فرمائیے۔ قصہ یہ ہے کہ عروج موٹر سائیکل پر بہت ڈر ڈر کر بیٹھتے ہیں۔ اور اس طرح کہ دیکھنے والے سمجھتے ہیں ہم انھیں زبردستی اور اغوا جا رہے ہیں پچھلی نشست پر ہونے کے باوجود انھیں یہ خیال رہتا ہے کہ موٹر سائیکل کو چلانے، روکنے اور کی پوری ذمہ داری ان کے ناتواں شانوں پہ ہے۔ نتیجہ یہ کہ جہاں مڑنا ہوتا ہے اس سے کوئی سو میٹر قبل ہی اسی سمت جاتے ہیں اور ہمیں توازن برقرار رکھنے کے لیے دوسری طرف جھکنا پڑتا ہے۔ دیکھنے والے اگر ہمیں اس پھٹ پھٹ کر الخلقت موٹر سائیکل پر اس طرح دائیں بائیں جھکا دیکھ کر ہمیں چینی سرکس کے بازی گر سمجھ لیں تو اس میں ان کا کوئی نہ ہوگا۔

تیز رفتاری سے بھی بہت گھبراتے ہیں۔ مثلاً کبھی کہیں گے "یارو! یہ سپر ہائی وے ہے۔ یہاں ٹرک بھی چلا ہم عرض کرتے ہیں "اسی لیے تو تیز چل رہے ہیں سست چلنے والے کو یہاں تیز رو کچل کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔"

غرض موٹر سائیکل پہ بیٹھتے بھی ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ ہمیں دل میں کوستے بھی ہوں گے۔ لیکن کتابوں کی محبت اس شیطانی چرخے پر ہماری ہم رکابی کے لیے اکساتی ہے اور وہ ہم سے ہر ایک آدھ ماہ بعد کہتے ہیں:

"یارو! وین گارڈ چلنا ہے؟"

جی ایم احمد خواہ مخواہ (بمبئی)



دانت

دانت قدرت کا ایسا عطیہ ہے جو انسان کو اس کی پیدائش کے سال دو سال بعد مصلحتاً یا بطور آزمائش عارضی طور پر عطا کیے جاتے ہیں۔ پھر ایک ایک کر کے چھین لیے جاتے ہیں۔ پھر اس کے چال چلن کی تفتیش کے بعد دوبارہ کارآمد تحفے کے طور پر، بڑھاپے تک استعمال کرنے کی غرض سے نوازے جاتے ہیں۔

ہر نومولود کا چہرہ پیدائش کے بعد سے دودھ کے دانت برآمد ہونے تک بغیر دانت کے بھی خوب صورت لگتا ہے۔ لیکن ضعیفی میں یہی چہرہ دانتوں کے بغیر ناقابلِ دید ہو جاتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ صرف بڑھاپے ہی میں چہرے کو خوب صورت بنانے یا بگاڑنے میں دانت بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

دانت غذائی نوالے کا دوسرا باب الداخلہ ہوتے ہیں (ہونٹ پہلا باب الداخلہ ہیں) زبان دانتوں کے [illegible] کے اندر خود کو محفوظ رہتی ہے لیکن اپنی زبان درازی، دروغ گوئی اور غیبت کی مرتکب ہو کر صاحبِ زبان کی عزت کے درپے رہتی ہے جس کے نتیجے میں بعض اوقات پٹائی کے دوران دانتوں کے حلق میں آجانے کی نوبت آجاتی ہے۔

بعض حضرات کے پورے بتیس دانت ٹوتھ پیسٹ کے اشتہار جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے دانتوں میں شاید چغلی کھاتے رہنے کے سبب .... کیڑا پڑ جاتا ہے ایسے حضرات کی مسکراہٹ کو "ٹوتھ برش اور ٹوتھ پیسٹ کے استعمال سے قبل .... والے اشتہار کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ اس لازمی اور دائمی عیب کو چھپانے کے لیے صاحبِ ثروت حضرات اس پر سونے کا کیپسول چڑھا کر اور بات بات پر ہنس کر اپنی امارت کا مظاہرہ کرنے سے نہیں چوکتے ـــــــ بعض ایسے حضرات جن کے آخری ڈاڑھ پر سونا منڈھا ہوتا ہے اس کی نمائش کے لیے اپنی باچھیں اس قدر چیرتے ہیں کہ اس کوشش میں ان کے ہونٹوں کے دونوں سرے کانوں کی لو تک مل جاتے ہیں لیکن سونے کا داڑھ بمشکل نظر آتا ہے ایسی حالت میں منہ زیادہ دیر تک کھلا ہوا رکھنا تکلیف دہ بھی ہو جاتا ہے اور صورتِ حال کچھ ایسی مضحکہ خیز ہو جاتی ہے کہ دیکھنے والا سمجھ ہی نہیں پاتا کہ وہ شخص ہنس رہا ہے یا رو رہا ہے۔

اگر انسان کے دانت، ہاتھی کی طرح کھانے اور دکھانے کے علاحدہ علاحدہ ہوتے تو سونا چڑھے دانتوں کی بہتات تو ہو جاتی ہے، لیکن وہ بھی اس طرح کم یاب ہو جاتے جیسے ان دنوں ہاتھی کے دانت کم یاب ہیں۔ ان دنوں جبکہ معقول وجہ کے بغیر انسان دوسرے انسان کا خون کر رہا تو دکھانے کے ان قیمتی دانتوں کے لیے جانے کس قدر

خون خراب ہوتا۔

دانت کے درد کو آپ ڈاڑھ کا درد بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں کا درمیانی فاصلہ کسی بھی منہ میں دو انچ سے زیادہ نہ دانت کا درد اس درد دوسری کی بہ نسبت بے حد تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یہ درد برداشت بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اس تکلیف کے دو مسوڑھے سوجھ جانے سے چہرے کا جو حلیہ بگڑ جاتا ہے خود مریض کے لیے ناقابلِ دید لیکن ڈاکٹر کے لیے قابلِ دید ہوتا ہے۔ تناولِ طعام میں جو زحمت ہوتی ہے وہ ایک یا دو وقت کے ناغے پر ختم نہیں ہوتی بلکہ مسلسل کئی دنوں کے فاقے کھنچواتی۔ میرے ساتھ تو اکثر ایسا ہوا ہے کہ جب بھی دانت کے درد نے پریشان کیا انہی دنوں متعدد ولیمے کے ڈنر کی دعو صبر آزما آزمائش میں مبتلا کرتی رہیں۔

میں اپنی زندگی میں موت کے ڈر کے سوا ہر طرح کے ڈر اور خوف پر قابو پا چکا ہوں۔ جیسے اندھیرے کا ڈر، ز انسانوں اور جانوروں کا ڈر، بیوی کا ڈر اور افسر کا ڈر وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ایک ڈر جو رہ رہ کر سر اٹھا رہا تھا وہ اس کر تھا جس پر بیٹھ کر اپنے متاثرہ دانت سمیت سارے منہ کو ڈاکٹر کے رحم و کرم پر چھوڑنا پڑتا ہے۔ آخر ایک دن اس آزمائش سے بھی گزرنا پڑا۔ میٹھی اشیائے خوردنی کو بہ رضا و رغبت اور بہ کثرت کھاتے رہنے کی پاداش میں جب میں دانت نکلوانے ایک ڈینٹسٹ کی ڈسپنسری پہنچا تو ڈاکٹر نے پہلے تو خندہ دہنی سے میرا استقبال کیا۔ تب مجھے تعجب ہوا کہ اس ڈاکٹر کے کئی دانت اپنی جگہ پر موجود نہ تھے اور جو موجود تھے وہ نقلی دکھائی دے رہے تھے ــــ بہر اس نے میرے بیمار دانت کی مزاج پرسی کرنے کی بجائے میرے منہ میں ایک تیز دھاری چمٹا نما اوزار داخل کر کے مو سیاست، کرکٹ اور مہنگائی جیسی غیر اہم باتوں میں مجھے الجھائے رکھا ــــ مجھے جواب دینے سے قاصر پا کر وہ اپنے سیدھے سوالات کا جواب خود ہی دیتا رہا۔ تبھی ایک ہلکا سا جھٹکا محسوس ہوا اور چمٹا دانت سمیت باہر نکل آیا۔ نہ ز ہوئی اور نہ خون ہی نکلا۔ تب مجھے خیال آیا کہ ان دنوں مصنوعی دانتوں کی بہتات کیوں ہے۔ اپنے سے علاحدہ ہوئے دانت کو میں یوں دیکھ رہا تھا جیسے کبھی امریکیوں نے چاند سے لائی ہوئی مٹی کو دیکھا ہوگا۔ ڈاکٹر کمال فراخ دلی سے ا دانت کو روئی میں لپیٹ کر میری ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا "یہ رہا آپ کا دانت" ــــ مگر اب وہ میرا کب تھا:

فاصلے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا۔
دانت میرا تھا ہتھیلی پر مگر میرا نہ تھا

کچھ دیر تک میں اس دانت کو یوں دیکھتا رہ گیا جیسے کوئی زچہ اپنے نومولود کو پہلی بار دیکھتی ہے۔ میں جسے بدن کا اٹوٹ سمجھتا تھا وہ بھی وقت آنے پر اس طرح مجھ سے الگ ہو سکتا ہے۔ یہ سوچ کر مجھے دکھ ہوا۔ پھر کچھ اطمینان بھی ہوا کہ اکتیس دانت ابھی میرے ساتھ ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ عوام کو اخبار اور ٹی وی کے ذریعے لاکھ بار دانتوں کی حفاظت اور صحیح طریقے سے برش کرنا سکھا جائے۔ دانت میں بہرحال خرابی پیدا ہو گی یہاں تک کہ انھیں بالجبر نکالنا پڑتا ہے۔

جس طرح سگریٹ بنانے والی کمپنیوں کے منافع میں، مخالف مہم اور پروپگنڈے کے باوجود روز بروز اضافہ جا رہا ہے۔ اسی طرح دانتوں کی حفاظت، ٹوتھ پیسٹ اور برش کی تشہیر کے باوجود بھی دانتوں کے ڈاکٹروں کی آمدنی بھی دن بہ دن اضافہ ہوتا رہے گا۔

معمر حضرات اپنے اصلی دانتوں سے محروم ہوجانے کے بعد اپنے چہرے کو مزید بگڑنے سے بچانے کے لیے نقلی دانتوں کا۔ اپنے اصلی دانتوں سے بھی خوب صورت سٹ لگوا لیتے ہیں جسے بتیسی کہا جاتا ہے پہلے اس کی ایک ہی قسم ہوتی تھی جسے سونے سے قبل بہ کمالِ احتیاط منہ سے نکال کر پانی بھرے گلاس میں رکھ دیا جاتا اور صبح برش سے صاف کرکے منہ میں فٹ کرلیا جاتا ــــــ کچھ لوگ جن کے منہ میں بتیسی پوری طرح فٹ نہیں ہوتی، فرصت کے اوقات میں اسے زبان کے ایک جھٹکے سے مسوڑھوں سے الگ کرکے منہ ہی منہ میں کھیلتے رہتے ہیں اور اتفاقاً ایسا کرتے .... ہوئے "رنگے دانتوں" پکڑے جانے پر جھٹ سے بتیسی کو منہ میں یوں فٹ کرلیتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ آج کل مصنوعی دانت منہ میں مستقل طور پر نصب کیے جانے لگے ہیں۔

مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ میرے دفتر میں ایک کام چور چپراسی نے جب چوتھی بار عقل داڑھ نکلوانے کے بہانے چھٹی مانگی تو افسر نے اس سے استعفیٰ کی مانگ کی۔ چپراسی نے ہکا بکا ہوکر پوچھا۔

"صاحب! مجھے تو صرف اپنا عقل داڑھ نکلوانا ہے۔ استعفیٰ کیوں دوں؟

افسر نے کہا ــــ "تم اب تک چار بار عقل داڑھ نکلوا چکے ہو ــــ ایسا شخص جو خدا کی طرف سے عطا کردہ عقل داڑھ چار بار نکلوا چکا ہو وہ کوئی کام کے لائق نہیں رہتا ــــ"

لگے ہاتھوں میرا واقعہ بھی سن لیجیے۔ کچھ دنوں قبل میرے دونوں داڑھوں میں درد رہنے لگا ــــ ایک صبح بیگم نے نیند سے جگایا اور میری صورت دیکھ کر خوشی سے چلانے لگیں ــــ ہائے اللہ! آج آپ کتنے خوب صورت لگ رہے ہیں۔" میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر غور کرنے پر یاد آیا کہ رات دونوں داڑھوں میں ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ چہرے پر ہاتھ پھیرا تو وہ کسی اور کا لگا۔ دوڑا دوڑا آئینہ دیکھا تو آپ سے کیا چھپاؤں ــــ خود اپنی صورت پر مجھے پیار آنے لگا۔ مسوڑھے سوجھ جانے سے میرے پچکے ہوئے گال بھرے بھرے نظر آرہے تھے۔ بیگم، جو عرصے سے میری پچکی ہوئی لمبوتری صورت سے نالاں تھیں، بھرے بھرے گالوں والا گول مٹول مکھڑا دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سماتی تھیں۔ یہاں تک کہ مجھے ڈاکٹر کے پاس جانے سے تک منع کردیا۔ کہنے لگیں ــــ میری خاطر یہ درد برداشت کرلیں۔ موئے ڈاکٹروں کا کیا ہے۔ علاج کردیں گے تو درد جاتا رہے گا لیکن سوجن اتر گئی تو آپ کا یہ خوب صورت چہرہ پھر پچک جائے گا۔" جب درد میں بے انتہا شدت ہوگئی اور صورت حال ناقابلِ برداشت ہوگئی تو وہ اس شرط پر ڈاکٹر کے ہاں لے جانے پر راضی ہوئیں کہ ڈاکٹر سے میری کیفیت وہ خود بیان کریں گی۔ میں مجبوراً راضی ہوگیا۔

ڈاکٹر کے ہاں پہنچ کر کہنے لگیں: ــــ

"ڈاکٹر صاحب! ذرا انھیں دیکھیے۔ کتنے خوب صورت لگ رہے ہیں۔ ہے نا! داڑھ کے درد کی وجہ سے کچھ پریشان ہیں۔ آپ بے شک ان کا درد کم کردیجیے لیکن پلیز! سوجن اسی طرح رہنے دیجیے۔ کافی عرصے کے بعد یہ مجھے اچھے دکھائی دینے لگے ہیں" ــــ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کتے کے دانت کا زہر مہلک ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں ایسے سیاسی رہنماؤں کی کمی نہیں ہے جنھیں کاٹ کر خود کتے اپنی جان سے ہاتھ دھو سکتے ہیں ــــ اشتعال انگیز تقاریر سے فرقہ واریت کا زہر پھیلانے کے لیے زندہ و سلامت ہیں۔ خدا ایسے رہنماؤں سے ہم سب کو محفوظ اور کتوں کو مامون رکھے ــــ آمین۔

سید رحیم الدین توفیق (حیدرآباد)

معاف کیجیے آپ کو کہیں دیکھا ہے

ایک محفل میں ہم محوِ گفتگو تھے کہ اچانک ایک اطلاع ہمارے کان میں پڑی "معاف کیجیے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے" آپ خاں صاحب کے بھائی تو نہیں ہم پوچھتے ہیں کون خان صاحب۔ جواب ملتا ہے آپ خان صاحب کو نہیں جانتے ارے وہی جو ملک پیٹ میں رہتے ہیں۔ ہم ان سے معذرت چاہتے ہیں کہ ہم کسی خاں صاحب کو نہیں جانتے نہ ہم کسی خان صاحب کے بھائی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ہم "سید صاحب" ہیں۔ وہ صاحب شرمندہ ہو کر کہتے ہیں "معاف کیجیے مجھے غلط فہمی ہوئی آپ کی شکل ان سے اتنی ملتی ہے کہ میں نے آپ کو ان کا بھائی سمجھا۔ حیرت ہے اتنی مشابہت اسی پر یاد آیا ایک پروفیسر صاحب نے ہم سے مزاج پرسی کرتے ہوئے کہا کہ میں نے جو آپ سے نقشہ بنوانے کے لیے کہا تھا..... ہم نے فوراً ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا "معاف کیجیے میں وہ نہیں ہوں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ اس پر انھوں نے کہا مگر آپ کی شکل اس آرکیٹیکٹ سے اتنی ملتی ہے کہ میں دھوکہ کھا گیا (حالانکہ یہ ہماری دوسری ملاقات تھی) بعد میں یہی بات میں نے ان آرکیٹیکٹ سے کہی تو انھوں نے چھوٹتے ہی غصہ سے کہا ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کیا میں اتنا بھونڈا ہوں۔

ایک محفل میں ایک بہت ہی نورانی چہرے والے بزرگ ہمارے قریب آئے اور ہمارے دوست کو دیکھ کر فرمایا میاں میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ دوست نے پوچھا کہاں دیکھا ہے۔ کہنے لگے دیکھا ہے پر کمبخت دماغ کچھ ایسا ماؤف ہو گیا ہے کہ کچھ یاد نہیں آ رہا ہے کہ کہاں دیکھا ہے۔ ہم نے انھیں یاد دلایا کہ آپ نے مکہ مسجد میں دیکھا ہوگا۔ کہنے لگے نہیں وہاں نہیں اور کہیں دیکھا ہے۔ ہماری رگِ ظرافت پھڑک اٹھی ہم نے انھیں چھیڑنے کے لیے کہا "محبوب کی مہندی میں دیکھا ہوگا۔ انھیں غزل سننے کا بہت شوق ہے یہ اکثر وہاں بھی آتے جاتے ہیں۔ اس پر انھوں نے غصہ سے ہمیں گھورتے ہوئے کہا کیا میں آپ کو اس قماش کا آدمی نظر آتا ہوں۔ ہم نے انھیں ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا قبلہ آپ ہمیں غلط مت سمجھئے۔ ہمارا مطلب تھا کہ آپ وہاں بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لیے جاتے ہوں گے۔ جس طرح طوائفیں نیک اور سیدھے سادے لوگوں کو اپنے کوچہ کی راہ دکھانے درگاہوں پر جاتی ہیں۔ یوں بھی بعض پہنچے ہوئے لوگوں کو خالق کا جلوہ اور نور ایسی ہی جگہوں پر نظر آتا ہے اور وہ پہلے عشقِ مجازی اور پھر عشقِ حقیقی کی منزلیں تیزی سے طے کرنے لگتے ہیں۔

ایک بار ایک لیوٹ قسم کے حضرت سے سابقہ پڑا۔ انھوں نے وہی گھسا پٹا جملہ دہرایا تو ہم نے قسم کھا کر خود اعتمادی سے کہا کہ حضرت نا آج تک ہم رئیس کورس گئے ہیں نہ کبھرے دیکھنے۔ البتہ مجھے خیال آتا ہے کہ میں نے آپ کو عابڈز کے نکڑ پر کھڑے دیکھا۔ آپ شاید وہاں بیٹھے فرصت سے بنائے گئے شاہکاروں کا نظارہ کرتے ہیں۔ اس پر انھوں نے برا سا منہ بنایا کہنے لگے تبد

ایسا شخص میں نے بھی دیکھا ہے اور حیران بھی ہوں۔ وہ میرا ہم شکل ہے میں نہیں آئندہ آپ مجھے کسی ایسی ویسی جگہ دیکھیں تو مجھ سے تصدیق کر لیجیے کہ وہ میں ہی ہوں یا میرا ہم شکل ہم نے کہا حضرت ہم ایسی ویسی جگہ جاتے ہی نہیں تو آپ کو کیا دیکھیں گے۔ عابد ایسی ویسی جگہ تو نہیں۔

یہ دیکھا ہے کہ جملہ اس لیے چلتا ہے کہ لوگوں نے آپ کو روا روی میں کہیں دیکھا اور بھول گئے اور دوبارہ دیکھنے پر ان کو وہ چہرہ پھر یاد آنے لگتا ہے یا پھر وہ آپ سے ملتا جلتا چہرہ دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ اور انھیں یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ وہ آپ ہی تھے۔ اس طرح انھیں تجسس ہوتا ہے اور جب تک وہ اس کی تصدیق نہیں کر لیتے ذہنی کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں۔

ہم شکل ہونا بڑا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں "گرے داڑھی والا اور پکڑا جائے مونچھ والا" والی مثال بھی صادق آسکتی ہے۔ اگر آپ کی شکل کسی ایسی شکل سے ملتی ہے جس کی پولیس کی تلاش ہے تو اس کے ساتھ ساتھ آپ کی بھی خیر نہیں۔ جب بھی آپ پولیس کی نظروں میں آئینگے پولیس کہے گی چلیے ہمیں آپ کی تلاش تھی ہم نے آپ کو "وہاں" دیکھا تھا۔ یہ مصیبت تھوڑی دیر کی بھی ہو سکتی ہے مگر پولیس کی بھی کچھ دیر کے لیے سکون مل جاتا ہے جیسے انتہائی غمگین اور ڈرامائی فلموں کے ناظرین کو چند کامیڈی سین کی وجہ ذہنی تناؤ سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ عوام کو بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ پولیس کچھ کام کر رہی ہے اور اس کی تلاش میں کافی پیشرفت ہوئی ہے۔

بعض وقت اس جملہ کا استعمال لوگ محض جان پہچان بڑھانے کے لیے کرتے ہیں۔ وہ پہلے تو اطلاع دیتے ہیں کہ انھوں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے پھر اپنا تعارف کرواتے ہیں کہ میرا نام یہ ہے میں فلاں محکمہ میں کام کرتا ہوں وغیرہ وغیرہ پھر باتوں باتوں میں وہ آپ کا نام مصروفیات اور باقی حالات معلوم کر لیتے ہیں۔ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ آپ کو پسند کرنے لگے ہیں۔ یا پھر وہ آپ سے کوئی کام نکلوانا چاہتے ہیں۔ پہلی صورت میں کچھ خطرہ کا احتمال بھی ہے اس لیے فوراً چوکنا ہونے میں عافیت ہے۔ جب ہم طالب علم تھے تو فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا ہر فلم کا پہلے دن پہلا شو دیکھتے۔ ہماری طرح ایک اور شوقین بھی تھیٹر میں نظر آتے۔ وہ ہمیں دیکھتے اور ہم انھیں۔ کچھ دن بعد مسکراہٹوں کا تبادلہ شروع ہوا اور پھر سلام علیک۔ تعارف ہونے پر پتہ چلا کہ وہ کسی اسکول میں ٹیچر ہیں۔ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔

ایک بار ہم گرین سگنل کے انتظار میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ ایک صاحب ہمارے قریب آئے اور سلام کر کے کہنے لگے معاف کیجیے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ پھر خود ہی یادداشت پر زور ڈال کر کہنے لگے آپ الوین میں "Foreman" ہیں ہم نے کہا نے جی نہیں ہم آئی۔ ڈی۔ پی۔ ایل میں کام کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا تو آپ یقیناً آئی ڈی پی ایل ٹاؤن شپ جا رہے ہونگے۔ مجھے بھی ادھر ہی جانا ہے کیا آپ مجھے لفٹ دینگے۔ آپ مجھے ٹاؤن شپ کے پاس ہی ڈراپ کر دیجیے۔ آگے کیلئے کسی اور جان پہچان والے سے لفٹ لے لونگا۔

بعض لوگوں کی یادداشت اتنی اچھی ہوتی ہے کہ وہ پہچاننے کی کوشش ہی نہیں کرتے بلکہ فوراً پہچان جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی کبھی ان کی یادداشت انھیں دھوکہ دے جاتی ہے ایک دن ہم نمائش میں گھوم رہے تھے کہ پیچھے سے ایک زبردست ہاتھ ہماری پیٹھ پر پڑا کہ ہم اوندھے منہ گرتے گرتے بچے۔ اس بے تکلفی پر بہت غصہ آیا پلٹ کر دیکھا تو ایک صاحب جن کی باچھیں کان کی لو سے اس لو تک کھلی ہوئی تھیں ہمیں بڑی اپنائیت سے دیکھ رہے تھے۔ ہم نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا معاف کیجیے ہم نے آپ کو پہچانا نہیں تو فرمانے لگے ارے میں ہوں حاجی شریف ابن دونوں امعد شریف میں

پڑھتے تھے میں ہمیشہ کلاس میں فرسٹ رہتا اور آپ سکنڈ۔ امتحان میں بھی آپ کی سیٹ میرے پیچھے ہوتی اور میں آپ سوالات حل کر کے دیتا تھا۔ ہم نے کہا جناب ہم نے اس اسکول کی بلکہ آپ کی بھی شکل تک نہیں دیکھی اور یہ بھی نہیں معلوم وہ شہر کے کس محلّہ میں ہے اور آپ کس کھیت کی مُولی ہیں۔ آپ ضرور فرسٹ آتے ہونگے لیکن ہم سکنڈ کبھی نہیں آئے ہمیں نقل مارنے کی عادت تھی۔" انھوں نے اسی بے تکلفی سے کہا کوئی بات نہیں اسی بہانے آپ سے ملاقات تو ہوگئی آپ مِل کر بڑی خوشی ہوئی۔ خوب گزرے گی جو مِل بیٹھینگے دیوانے دو۔ ہم نے کہا قبلہ پہلے آپ ہمیں دیوانہ تو ثابت کیجیے خوب بعد میں گزرے گی۔ کہنے لگے آپ تو مذاق کر رہے ہیں میرا مطلب اس دیوانگی سے نہیں تھا۔ ہم نے کہا ہم کسی بھی قسم کے دیوانے نہیں ہیں لیکن آپ کس کے دیوانے ہیں۔ اتنے میں ہمارے ایک اور دوست آگئے اور انھوں نے جو ان کی باتیں سُنیں تو مخاطب ہو کر کہا "یار سُنا ہے نمائش میں کوئی پاگل گھس آیا ہے اور والنٹرس اس کی تلاش میں ہیں" وہ یہ سن کر ان کے کان کھڑے ہوئے انھوں نے فوراً کہا اچھا اجازت دیجیے میرے دوست ملیتھ کلب پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ پھر ملیں گے۔ خدا حافظ وہ صاحب جھپ سے ہو گئے اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔

بعض حضرات اس پہیلی کے بوجھنے کا بار آپ پر ڈال دیتے ہیں کہ معاف کیجیے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میں نے آپ کو کہاں دیکھا ہے۔ جواب یہی ہے کہ ہم کیا جانیں دیکھا آپ نے ہے ہم نے نہیں۔ . . . . ایک ملالہ صاحب نے اسی طرح سوال ہم سے کیا۔ ہم نے کہا قبلہ آج کل موسم بہت گرم چل رہا ہے ۴۴ درجہ حرارت ہے ایسے میں دماغ پر بار ڈالنا بہت خطرناک ہے۔ پر وہ مصر ہو گئے ہم نے انھیں ٹالنے کے لیے کہا قبلہ ہم اس شہر کے نہیں ہیں دو روز پہلے ہی اس شہر میں نئے وارد ہوئے ہیں یقیناً آپ نے پچھلے دو روز میں تو ہمیں نہیں دیکھا۔ انھوں نے بُرا سا منہ بنایا اور بڑبڑانے لگے۔ کیا واقعی آپ اس شہر کے نہیں۔ پھر میں نے آپ کو کیسے دیکھ لیا۔ ہم نے کہا قبلہ بعض چہرے ہی ایسے ہوتے ہیں جو جانے پہچانے لگتے ہیں اس میں قصور آپ کا نہیں۔ ان چہروں کا ہے۔ اور ساتھ میں کچھ کچھ موسم کا بھی۔ یہ سن کر انھوں نے غصّے سے ہمیں گھورا ہم نے اسی میں عافیت سمجھی کہ وہاں سے رفوچکّر ہو جائیں۔ کیا جانے موسم کیا گل کھلائے ●●

اقبال علی جاوید
حیدرآباد

بوگس ـــــ ایک ادیب ایک شاعر

کسے امید تھی کہ بوگس کی زندہ دلی یک لخت موت کے بے رحم ہاتھوں کا نشانہ بن جائے گی اور مجھ جیسے کمزور قلم والا کو دوستی کے جذبات اس قدر بے چین کریں گے خراج دینے کے لیے قلم اٹھانے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ اس موقع پر طالب نگار کے یہ اشعار بے ساختہ یاد آرہے ہیں:

آئندہ نہ آئے کسی زندہ دل کو موت
گھر سے چلے تھے ٹھیک شفاخانے جا کے فوت

کب تک یہ بدلہ سنج یونہی زخم کھائیں گے
ہم کتنے دوستوں کے جنازے اٹھائیں گے

بوگس کو یوں تو اخباروں میں پڑھا تھا اور مشاعروں میں سنا تھا لیکن شخصی طور پر پہلی مرتبہ ہماری ملاقات ۱۹۷۴ء میں ایم۔اے کی کلاس میں پوسٹ گریجویٹ سنٹر بشیر باغ میں ہوئی۔

سید شاہ خواجہ نصیر الدین احمد قادری بوگس ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول کے زمانے ہی سے سنجیدہ شاعری کرنے لگے۔ مجاہد مجھی تخلص تھا ۱۹۶۴ء میں مڈل ٹرینڈ ٹیچر کی حیثیت سے سرکاری اسکول میں تقرر ہوا ۱۹۶۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے میٹرک کامیاب کیا ۱۹۶۹ء میں شادی ہوئی ۱۹۷۴ء میں بی اے ۱۹۷۶ء میں ایم اے اور پھر بی۔ایڈ کیا۔ ۱۹۶۰ء سے مزاحیہ شاعری شروع کی۔ ہندوستان کے سبھی شہروں میں کل ہند اور ہند پاک مشاعرے پڑھنے کے علاوہ پاکستان کے پاک ہند مشاعروں میں شرکت کی۔ ۱۹۹۰ء میں حیدرآباد کی چار سو سالہ تقاریب کے مشاعروں کے سلسلے میں خلیج کا سفر کیا۔ ہر جگہ بہت پسند کیے گئے۔ ۱۹۶۲ء میں زندہ دلان حیدرآباد کا پہلا آرگنائزر بنایا گیا۔ بعد میں وہ اس ادارے کے جنرل سکریٹری بھی رہے اور وفات تک اس ادارے سے وابستہ رہے۔

بوگس کے کن کن اوصاف کا تذکرہ کریں۔ وہ بہ یک وقت مزاحیہ شاعر، سنجیدہ شاعر، مضمون نگار، محقق اور سماجی کارکن تھے۔ ان کی شخصیت میں تواضع اور انکساری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ان کی انفرادیت یہ تھی کہ وہ طبعاً نرم مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت حوصلہ مند اور بلند ہمت انسان تھے۔ بڑی سے بڑی ادبی یا سیاسی شخصیتوں سے

سے بڑی بے تکلفی سے نڈر اور بے باکانہ طور پر ملتے اور اپنی دل کش گفتگو اور حسنِ اخلاق سے بہت جلد اسے اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔

بوگس ایک سچے پکے مسلمان تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ اکثر مشاعروں اور محفلوں میں اسٹیج کے پیچھے جا کر نماز ادا کرتے تھے۔ شراب سے انھیں نفرت تھی۔ وہ ایک پاکیزہ اور صاف دل انسان تھے۔ ان کے گھر کا ماحول بھی بڑی حد تک دین دارانہ ہے۔

بوگس انتہائی مہمان نواز تھے۔ میں نے ان کے دستر پر بلا لحاظ مذہب و ملت اور بلا لحاظ مرتبت ہندو مسلم بڑے آفیسر اور معمولی ملازم سرکار، سیاست داں اور سماجی کارکن، ادیب و شاعر، محقق و نقاد سبھی کو یک جا دیکھا اور وہ ہر ایک کو جب تک خود اپنے ہاتھ سے دو چار مرتبہ SERVE نہ کرتے چین سے نہ بیٹھتے تھے۔

بوگس ہر ایک کے حقیقی دوست تھے دوستوں کے ہر چھوٹے بڑے کام میں وہ اپنا پورا پورا حصہ ادا کرتے تھے۔ دوستوں کی ضرورت پر دامے، درمے، سخنے اپنے آپ کو سب سے آگے رکھتے تھے۔ عطا محمد صاحب نے اپنے مضمون "وہ بوگس نہ تھے" (روزنامہ منصف "۱۹- مئی ۱۹۹۱ء) میں بوگس کے ایک سینیر ساتھی ٹیچر جناب واحد علی مر کا ذکر کیا ہے جن کے دونوں پاؤں مفلوج تھے۔ بوگس کئی برس تک انھیں اپنی سیکل پر بٹھا کر اسکول لاتے اور لے جاتے خود پیدل چلتے تھے۔ مستعد پورہ اسکول کے ایک حافظ قرآن ساتھی ٹیچر کے لیے شخصی طور پر کوشش کرکے بوگس نے آل انڈیا ریڈیو پر قراءتِ قرآن مجید کے لیے نامزد کروایا۔ محلہ کے پڑوسی جناب حافظ عبدالمجید صاحب کے بھائی جو کینسر کے بیمار تھے، کے لیے چیف منسٹر فنڈ سے مالی امداد دلوانے کے لیے ہفتوں سرگرداں رہے۔ انھوں نے بے شمار افراد کے ساتھ حسن سلوک کا جو معاملہ کیا ہے اس کا احاطہ مشکل ہے۔ مستعد پورہ اور کاروان حلقہ کی امن کمیٹی کے ارکان اور مجموعی طور پر ہندو احباب جنازہ میں اشک بار تھے۔ بہ یک وقت بوگس ان تمام مختلف طبقات کے دل کی دھڑکن بنے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ ان کی سادہ مزاجی اور نیک نیتی تھی۔ انھیں خود پرستی اور خود ستائی پسند نہ تھی۔ وہ ہر مشاعرہ، جلسے، ادبی محفل یا اور کسی بھی تقریب کو کامیاب بنانے کی ممکنہ کوشش کرتے تھے اور ایک عام ورکر کی طرح کام کو بھی عیب نہ سمجھتے تھے۔ رشتہ داروں اور دوست احباب کی تقاریب، اردو کی تحریکات، زندہ دلانِ حیدرآباد، فائن آرٹس اکیڈیمی کی گوناگوں مصروفیات، "منصف" کے لیے مضمون نگاری، درس و تدریس، امن کمیٹی کے جلسے اور جلوسوں سے لے کر ملیؔ اور رفاہی کیمپس تک ہر جگہ بوگس نے نہایت ٹھوس تعمیرانہ اور نتیجہ خیز رول ادا کیا ہے۔

بوگس کو بہ حیثیت مزاحیہ شاعر سبھی جانتے ہیں۔ وہ ساتھ ہی ایک بہترین مضمون نگار، محقق، سنجیدہ شاعر اور [illegible] بھی تھے۔

"زندہ دلانِ حیدرآباد کے ممتاز مزاحیہ شعرا" اور "یادِ رفتگاں" کے عنوان کے تحت انھوں نے ۱۹۸۱ء میں حیدرآباد کے ممتاز مزاحیہ شعرا کا تعارف، سوانحی شخصیت اور شاعری پر مسلسل مضامین لکھے جو روزنامہ "منصف" کے سنڈے ایڈیشن کو زینت بخشتے رہے۔ بوگس نے کوئی ۲۲ تا ۲۵ طنز و مزاح کے شاعروں کی زندگی کے حالات، اور کلام پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ بوگس نے طنز و مزاح کے شاعروں کے علاوہ ہندی کے اولین شاعر کبیر داس سے پاکستان کی ادبی شخصیت خواجہ حمید الدین شاہد تک کسی کو بھی نہ چھوڑا۔

لکھنا بوگس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس نوعیت کے مضامین کی زبان صاف اور سلیس ہے پڑھنے والے کی نظر میں مشاعرے کا منظر چھا جاتا ہے اور وہ خود کو محفل مشاعرہ میں شریک محسوس کرتا۔

"اردو اخبارات کے طنزیہ اور مزاحیہ کالم نگار" کے عنوان کے تحت بوگس نے اردو صحافت میں کالم نگاری کے ذریعے اردو کی خدمت کرنے والوں کا جائزہ لیا ہے۔ اردو طنز و مزاح کے فروغ و ارتقا میں دیگر طنزیہ و مزاحیہ اصنافِ ادب کے ساتھ کالم نویسی کی برق رفتار ترقی اور اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ "شعرائے عثمانیہ" کے موضوع انھوں نے قدیم عثمانین شعرا کا تعارف کرایا تھا۔

تاریخی مضامین میں "جامع مسجد حیدرآباد"، "دنیا کا ایک قدیم پل۔ پرانا پل"، "تلاش آثار دکن" وغیرہ میری نظر سے گزرے ہیں۔ ان میں سب سے دقیق اور تحقیقی مضمون موئے مبارک اور آثار مبارک پر ہے جس میں انھوں نے ان آثار کا عربستان سے دکن پہنچنے تک کے طویل سفر کا تحقیقی جائزہ لیا ہے اور حیدرآباد میں موجود تمام آثار مبارک کی تفصیلات اور ان کے دیدار کے متعلق لکھا ہے۔

بوگس نے جناب ست نارائن موہنتی آئی۔اے۔ایس سابق کلکٹر حیدرآباد اور جناب محمد علی رفعت صاحب ایگزیکیٹو مجسٹریٹ حیدرآباد و سکندرآباد کے علاوہ مختلف سرکاری عہدیداروں، سماجی، ادبی اور سیاسی شخصیتوں کے انٹرویوز بھی لیے ہیں جو "منصف" میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

روزنامہ "منصف" کی جانب سے منعقدہ پہلے "مزاحیہ ادبی مقابلے" کے وہ کنوینر بھی تھے۔ یہ مقابلہ ریاست بھر میں بہت مقبول ہوا۔

ایم۔اے میں لکھا ہوا مقالہ "فکر تونسوی۔ شخصیت اور طنز نگاری" بوگس کے تنقیدی شعور کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں انھوں نے طنز و مزاح کی تعریف، اس کا تاریخی پس منظر، فارسی اور اردو میں طنز و مزاح کے اہم رجحانات پر سیر حاصل تفصیل لکھی ہے۔ طنز نگاری کے باب میں شاعری، ڈرامہ نگاری، ناول نگاری، روزنامچہ نگاری، تنقید نگاری کالم نگاری، انشائیہ نگاری وغیرہ کا بھی تفصیل سے احاطہ کیا ہے۔ اردو زبان میں مختلف زمانوں کے اہم مزاح اور طنز نگاروں کے بارے میں بھی تفصیل لکھی ہے اور پھر فکر تونسوی کا ان مزاح نگاروں سے مقابلہ کیا ہے۔

بحیثیت شاعر ابتدا میں بوگس صاحب ایک سنجیدہ شاعر تھے اور مجاہد تخلص کرتے تھے۔ علامہ حیرت بدایونی کو اپنا کلام سناتے تھے۔ سنجیدہ شاعری کے چند نمونے پیش ہیں:

ہے معراجِ محبت اپنی ہستی کو مٹا دینا
یہی تو درس دیتا ہے ہمیں جل جل کے پروانہ

فلک اس کا زمیں اس کی جہاں چاہے چلا جائے
مجاہد کا وطن کوئی، نہ کوئی اس کا کاشانہ

گم ہوگئے اس کے تصور میں اس قدر ؎ اپنی خبر نہیں ہے تو اس کی خبر کہاں

یہ سوچ کر ہی پھینک دیے جام ارغوانی
ساقی تمھاری چشم مست کا اس میں اثر کہاں
میری نگاہ شوق سے آئینہ دیکھ تو
تجھ کو ترے جمال کی اپنے خبر کہاں
ہندوستان میں یوں تو سخنور ہزار ہیں
لیکن مراد آباد کا ہائے جگر کہاں

بوگس نے مزاحیہ شاعری کا رخ کیا تو بہت کھل کر موجودہ سماج اور معاشرے کی برائیوں کو بے نقاب کیا ہے اپنی وفات سے صرف دو روز پہلے بوگس صاحب کا کلام "انجمن" میں ٹیلی کاسٹ کیا گیا تھا جس میں انھوں نے موجودہ سیاست پر خوب طنز کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

منتخب کرتے ہیں اپنے ووٹ سے مجھ کو جو لوگ
کونسل میں جا کے ان پر ٹیکس بڑھواتا ہوں میں
ان کے وعدے بھی غلط میری وفاداری بھی جھوٹ
مجھ کو بہلاتے ہیں وہ اور ان کو بہلاتا ہوں میں

اپنے جیسے لیڈروں کا ساتھ دینا تھا مجھے
کوئی موزوں نام جز بوگس نہ تھا میرے لیے

ہوا ہے سامنا لیڈر سے اپنے ہی محلے میں
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

آج کل کلرک ہے ایم۔اے پاس
ساتویں تک پڑھا یہ لیڈر ہے
کتنا چالاک ہے یہ بوگس بھی
شب میں شاعر ہے دن میں ٹیچر ہے

آدھی غزل بوگس کی شاعری کی خصوصیت تھی۔ وہ پہلا مصرع اپنا اور دوسرا غالب کا استعمال کرتے تھے۔ یہ آدھی غزل ان کی ہندوپاک میں شہرت کا ذریعہ بنی۔ غالب جیسے سنجیدہ شاعر کے پہلے مصرع کی جگہ اپنا طنزیہ مصرع

لگاکروگس نے جو تیر نشتر تیار کیے ہیں وہ معاشرے کے ناسور کا خوب آپریشن کرتے ہیں :

کر رہی تھیں کل کلب میں رقص جنداک لڑکیاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

ووٹ لیتے ہیں چوٹ دیتے ہیں
اب کسے رہنما کرے کوئی

نہ ہوا تقرر اپنا اسی غم میں مر گئے
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ہمیں کوئی غم نہیں ہے، نہیں مانتے ہم اس کو
غم دل اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

ڈاکو بہت نحیف ہے جھپٹوں تو پکڑ لوں
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ملاوٹ بھی گرانی بھی ہے اور بے روزگاری بھی
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

مطمئن ہیں اگر غریب عوام
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ طے ہے کہ غالب سے کہیں یار ہے لوگس
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

قلمی معاونین سے التماس ہے کہ
وہ اپنی تخلیقات 'خوش خط' اور روشنائی سے تحریر کی ہوئی روانہ کریں

محمد علی رفعت
(حیدرآباد)

باتیں بوگس کی

بوگس کی اپنے آخری سفر پر روانگی اس قدر اچانک و غیر متوقع تھی کہ اس کی وفات کی خبر سننے کے لئے کوئی بھی ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ جس نے بھی سنا اسے کچھ دیر کے لئے یقین نہیں آیا۔ ۷/ مئی ۹۱ء کی شب بوگس نے شولا پور میں مشاعرہ پڑھا۔ ۸/ مئی کی شب حیدرآباد پہونچا۔ سینے میں شدید تکلیف کی شکایت کی اور اسی سپر نظام انسٹیٹیوٹ میں شریک کروایا گیا دو دن تک فریش رہا اور دس گیارہ تاریخ کی شب چپ چاپ دنیا سے رخصت ہوگیا۔ بہت سے احباب کو اس کی علالت کی بھی اطلاع نہ تھی۔ ۹/ مئی کی شب جبکہ ابھی بوگس بستر مرگ پر تھا حیدرآباد دوردرشن سے انجمن پروگرام میں بوگس کو پیش کیا گیا جو اس کا دس دن قبل ریکارڈ کردہ پروگرام تھا۔ ۹/ مئی کی شب اس پروگرام کے بعد ۱۱/ مئی کی صبح کے اخبارات میں اس کی موت کی اطلاع پڑھ کر یقین کرنا مشکل تھا، خود میرے لئے بھی مشکل تھا کیونکہ اس کی آخری سانس سے صرف دو گھنٹے قبل ہی میں نے اس سے رخصت چاہی تھی اور اس کے پروگریس چارٹ دیکھنے کے بعد کافی اطمینان بھی ہوگیا تھا کہ خطرہ ٹل گیا، لیکن گھر پہنچنے کے صرف دو گھنٹے بعد دو بجے شب جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو یہ خیال ہوا کہ شاید اس کی "اوپن ہارٹ سرجری" کی خبر ہو ڈاکٹرس نے پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ ایسی ضرورت بھی پیش آئے۔ بوگس کے چند رشتہ داروں اور دوست احباب نے اپنے اپنے خون کی گروپنگ کروالی تھی تاکہ آپریشن کی صورت میں خون کے لئے بھاگ دوڑ کرنا نہ پڑے۔ میرا ذہن بھی پہلے اسی طرف گیا کہ شاید خون دینے کے لئے پہونچنا پڑے۔ لیکن جب اقبال جاوید نے پہلی سانس میں ہی اس کی وفات کی خبر دی تو دل بیٹھ سا گیا!

بوگس کے قلب کے تین Valve ناکارہ ہوچکے تھے اور صرف ایک (Valve) کے سہارے زندگی کی گاڑی کو ہنستے کھیلتے ڈھو رہا تھا۔ اسی حالت میں وہ چلتا رہا پھرتا رہا۔ احباب سے ملاقاتیں کرتا رہا۔ مشاعرے پڑھتا رہا۔ ملازمت بھی کرتا رہا اور [illegible] کے پھول بکھیرتا رہا۔ اور ان پھولوں کی مہک ابھی باقی ہی تھی کہ وہ ہمیں "ہاتھ دے گیا"۔

اب دیکھئے نا انتقال سے صرف دس دن قبل اس نے مجھے فون کیا اور کہا۔ "میاں ایک خوشخبری ہے میری بڑی لڑکی پاس ہوگئی ہے" جہاں تک مجھے یاد تھا۔ بوگس کی بڑی لڑکی میٹرک میں بھی نہیں تھی۔ یہی کوئی آٹھویں جماعت کی طالبہ ہوگی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آخر کس امتحان میں؟ جواب ملا کہ نویں جماعت میں۔ میں نے کہا کہ میاں تمہارے انداز سے تو یہ گمان ہوا کہ اس نے میڈیسن میں داخلہ کا امتحان تو نہیں پاس کرلیا۔ بوگس نے وضاحت کی کہ میاں بات یہ ہے کہ میری لڑکی شنکر جی اسکول میں پڑھتی ہے اور اس اسکول کا معیار بہت بلند ہے۔ عام جماعتوں میں کامیاب ہونا بورڈ کے امتحان میں کامیاب ہونے سے مشکل ہے۔ میں نے کہا قبلہ جب اس مدرسہ کا معیار اتنا اچھا ہے تو آپ بھی ایک آدھ امتحان اسی مدرسہ سے دے

معیار بڑھا کیوں نہیں لیتے۔ بہتر ہے کہ ایک بار ایس ایس سی کا امتحان سٹی گرجی اسکول سے بھی دے لیجئے" بوگس نے تھوڑے توقف کے بعد کہا کہ "ہاں! لیکن میں ایس ایس سی نہیں بلکہ ساتویں کا بورڈ اگزام دوں گا۔"

میں نے کہا لگتا ہے کہ آپ کو معیار بڑھانے کی کچھ زیادہ ہی ضرورت ہے بہتر ہے آپ پانچویں جماعت سے شروع کریں۔ بنیاد مضبوط ہوگی تو عمارت بھی پختہ ہوگی۔ بوگس نے برجستہ کہا "یہ امتحان میں آپ کے ساتھ دوں گا"

بہت عرصے پہلے کی بات ہے کہ میرے اور بوگس کے ایک مشترکہ دوست اقبال علی جاوید نے اپنے گھر پر بوگس سے میرا تعارف کروایا اس کے چند ماہ بعد سائیکل پر چھتہ بازار سے گذر رہا تھا میں نے سلام کیا سیکل رکوائی اور تجدید ملاقات کی نیت سے پوچھا کہ آپ بوگس ہی ہیں نا؟ جواب ملا۔ "انتہائی"

اس کے بعد سے جب بھی بوگس سے ملاقات ہوتی اس کو چھیڑے بغیر چین نہ آتا اور بوگس چاہے کسی حال میں ہو، معقول جواب دیئے بغیر نہ رہتا۔

بوگس کی زندہ دلی کے چند واقعات آپ بھی سن لیجئے۔

پچھلے سال کا واقعہ ہے۔ وہ میرے دفتر آیا۔ کچھ اور احباب بھی جمع تھے میں نے چائے کیلئے کہلوایا۔ کسی وجہ سے چپراسی نے غیر معمولی تاخیر کردی۔ لوگ انتظار کر رہے تھے اور چائے کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ بوگس کا پیمانۂ صبر چھلکنے لگا تو اس نے نہایت متانت سے کہا "بھائی آپ چائے کے پیسے دیجئے ہم باہر جاکر پی لیتے ہیں"۔

وہ اکثر دفتر آجایا کرتا اور دفتر کے بعد شگوفہ کے دفتر اور دیگر احباب سے ملاقاتوں کا پروگرام بنتا اور گھوم پھر کر جب گھر لوٹنے کا وقت ہوتا تو اس کو گھر پہونچانے کے لئے یا تو سواری کا انتظام کرنا پڑتا یا ہم میں سے کوئی اسے گھر چھوڑ آتا۔ ایک مرتبہ یوں ہوا کہ وہ دفتر آیا اور ہم لوگ کسی اور کام میں مصروف تھے۔ میں نے اقبال علی جاوید سے کہا کہ میاں ان کو ان کے گھر پہونچانے کا کچھ انتظام کرو۔ بوگس نے کہا کہ آپ لوگ میری فکر نہ کریں "میں بار بار بھونگیری بننا نہیں چاہتا" اس کے بعد جب کبھی بوگس کو گھر چھوڑنا ہوتا ہم پوچھ لیتے۔ "آج آپ بار بھونگیری ہیں یا صرف بوگس؟"

ایک نشست میں ہمارے ایک ساتھی (جو کافی سن رسیدہ ہیں) بوگس کی شہ پر مزاحیہ شاعری کی مشق کر رہے تھے کسی شعر میں ایک مصرعہ تھا "وہ گھر کے اندر ملکیاں کائی کو کتے" سبھی احباب کی رائے تھی کہ مصرعہ مہمل ہے اور حذف کردیا جانا چاہئے۔ بوگس سے جب پوچھا گیا تو اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا "رہنے دو کم از کم کرایہ آجائے گا۔"

وہ ایک ٹیچر تھا اور ہر سال ایس ایس سی امتحانات میں نگران کاری کے فرائض بھی انجام دینا پڑتا۔ پچھلے مارچ/اپریل کے امتحانات میں بوگس کا روان کے علاقے کے ایک سنٹر پر نگران تھا اور اس کے ہال میں جو نسٹھ بچے امتحان دے رہے تھے ایک دن فلائینگ اسکواڈ نے کچھ سختی کی اور کچھ بچوں کو "بک" بھی کیا۔ میں نے کہا بوگس یہ سب تمہاری کمزوری کا نتیجہ ہے۔ اگر تم نے مناسب نگرانی کی ہوتی تو فلائینگ اسکواڈ کو یہ ناخوشگوار فریضہ انجام دینا نہ پڑتا۔ اس نے کہا کہ میاں فلائینگ اسکواڈ والوں کو کیا مل گیا سوائے ایک یا دو کیسس کے میرے ہال سے صرف ایک "بک" ہوا ہے۔ میں نے کہا آخر آپ کیا کر رہے تھے؟ جواب دیا "میں ہر روز جونسٹھ بچوں کی دعا لے رہا ہوں"۔

ایک نشست میں کسی صاحب نے درد شکم کی شکایت کی خیریت پوچھی تو ان صاحب نے کہا کوئی خاص بات نہیں مجھے ایک عرصے سے گیاس کی شکایت ہے۔ کسی صاحب نے مشورہ دیا آپ فلاں چورن استعمال کیجئے۔ گیاس سے آرام

ہوگا۔ بوگسؔ نے اپنی آدھی غزل کا ایک ٹکڑا دے مارا ہے

" کہا کے یوں وہ جان جائیں گے "

" ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے "

طنز و مزاح بوگسؔ کے مزاج میں دخیل تھا۔ اس کی گفتگو سے مزاح غیرارادی طور پر پھوٹ پڑتا۔ اپنے غم کو وہ بڑے سلیقے سے چھپالیتا اور دوسروں کے غم میں فوراً شریک ہوجاتا۔ کسی کو تکلیف میں دیکھتا تو جب تک اس کی تکلیف دور نہ ہوجاتی بساط کے مطابق برابر کوشش کرتا رہتا۔ فرقہ وارانہ فسادات کے دوران بوگسؔ نے امن کمیٹی اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے اتنا کام کیا کہ محلے کے غیر مسلم احباب نے بادیدۂ نم یہ اعتراف کیا کہ محلے کا باہمی اتحاد اور امن صرف اس شخص کی محنت کی وجہ سے قائم تھا۔

بوگسؔ کی کتنی باتوں کو یاد کیا جائے۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ زندہ دل بوگسؔ کو لوگ نہیں بھول پائیں گے۔ " حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا "

●●

رشید الدین
حیدرآباد

بوگس حیدرآبادی

چند یادیں - چند باتیں

بوگس حیدرآبادی مرحوم سے میرے تعلقات کی کہانی کوئی دو چار برس کی بات نہیں بلکہ یہ ایک ربع صدی سے بھی زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔ ان سے میری پہلی ملاقات علامہ حیرت بدایونی مرحوم کے دیوان خانے میں ہوئی تھی۔ علامہ مرحوم سے انھیں بے حد عقیدت تھی اور وہ انھیں اپنا کلام دکھاتے تھے۔ غالباً انھوں نے ہی انھیں یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی رفتار طبع کے لحاظ سے سنجیدہ کی بجائے مزاحیہ شاعری کریں۔ پہلے وہ سنجیدہ شاعری کرتے تھے اور اپنا ابتدائی کلام اپنے ماموں سید محبوب علی مرحوم کو دکھایا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ مزاحیہ میدان میں آگئے اور خوب شہرت پائی وہ ایک مصرعہ غالب کا رکھتے اور دوسرا مصرعہ خود کہتے تھے۔ اس لیے دوست احباب انھیں ازراہ مذاق ایک مصرعہ کا شاعر بھی کہا کرتے تھے۔ لیکن ان کا یہی رنگ خوب چلا اور اسی میں انھوں نے خوب خوب شہرت پائی۔ پھر کمال یہ کہ ان کا کلام رسالوں کے ذریعہ عام نہیں ہوا بلکہ مشاعروں کے ذریعہ۔ ہندوستان کا کوئی شہر ایسا نہیں تھا جہاں انھوں نے مشاعرہ میں اپنا مزاحیہ کلام نہ سنایا ہو۔

وہ ایک بار پاکستان بھی ہو آئے۔ گئے تو تھے وہ اپنے رشتہ داروں سے ملنے لیکن وہاں بھی بہت مشاعرے پڑھے انتقال سے پہلے بھی وہ شولاپور مشاعرہ پڑھنے گئے تھے۔

بوگس مرحوم دل کے مریض تھے اور اس سے قبل دو دل کے دورے پڑ چکے تھے۔ ان کے بہت سے دوستوں کو اس بات کی خبر بھی نہ ہونے پائی کہ وہ ایک بار پھر دل کے عارضے کے سبب شریک دواخانہ ہیں جب اچانک ان کے انتقال کی خبر تمام اخبارات میں چھپی تو سب دنگ رہ گئے جب انھیں دل کا پہلا دورہ پڑا تھا تو اخباری اطلاع پڑھ کر میں ایک دوست کے ساتھ ملنے گیا کہ وہ اس وقت بھی ... ہسپتال میں لیٹے ہوئے تھے اور ہم سے آہستہ آہستہ باتیں کیے جا رہے تھے۔ میں نے کہا "ڈاکٹر کو اطلاع کر دوں" بولے "نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر کہاں ڈاکٹر کو بلائیں گے"۔

اس کے کچھ دن بعد وہ ہاسپٹل سے ڈسچارج ہو گئے اور اپنی معمول کی زندگی میں جٹ گئے۔ ایک بار لونا پر بے اینڈ اکاونٹس آفس پر بہت تپاک سے ملے۔ میں نے کہا "تم لونا چلا رہے ہو یہ تمھارے لیے ٹھیک نہیں"۔ بولے "ارے یار اس سے کیا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ایسا ہی کہتے ہیں"۔ بہرحال انھوں نے ایک دل کے عارضے کے باوجود زیادہ احتیاط نہیں کی اور صرف ۵۰ سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ان کا گھر میرا ایف حیدرآباد تھا ان کا میرا ساتھ ایم اے میں بھی رہا اور ہم دو سال تک ایک ہی کالج اور ایک ہی جماعت میں

پڑھتے رہتے تھے۔

کالج کے زمانہ میں مجھے انھیں قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقعہ ملا۔ وہ بے حد شفیق اور ملنسار تھے۔ مجلسی قسم کے آدمی تھے اور کسی سے بھی بہت جلد دوستی کر لیتے تھے۔ اس زمانہ میں ہمارے ساتھ شاہد نامی ایک صاحب پڑھتے تھے۔ ان سے اُن کی گاڑھی چھنتی تھی ہمیشہ نوک جھونک چلتی رہتی۔ کبھی کبھی معاملہ سنجیدگی بھی اختیار کر لیتا لیکن وہ دل میں کوئی بات نہیں رکھتے تھے بوگس چلت پھرت قسم کے آدمی تھے۔ محفلیں اور وہ بھی ادبی محفلیں برپا کرنے کا انھیں بہت شوق تھا۔ وہ ہر ایک کو ملا کر رکھنے کے فن سے واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسال میں کبھی کسی لیکچرر یا طالب علم سے ان کی ناچاقی نہیں ہوئی۔

بوگس مرحوم سے پھر میرا ساتھ زندہ دلانِ حیدرآباد میں ہوا۔ اس تنظیم سے وہ بہت طویل عرصہ سے وابستہ تھے اور حمایت بھائی سے بہت قریب تھے بلکہ یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ ان کے چہیتے تھے جب میں اس کی مجلس عاملہ کا رکن ہوا تو وہ شریک معتمد تھے۔ پھر دوسرے سال معتمد بھی ہو گئے۔ اس طرح انھیں ایک سال تک زندہ دلانِ حیدرآباد کا معتمد بنے رہنے کا بھی شرف حاصل ہوا جو ایک اہم عہدہ ہے "شگوفہ" کے دفتر میں ان سے اکثر ملاقاتیں رہتیں اور کالج کے زمانہ کی پرانی یادیں تازہ ہوتی رہتیں۔

ان کا دوست احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اور وہ ہر ایک سے بہت اچھی طرح پیش آتے۔ خصوصاً بڑوں سے پیش آنے کا ان کا انداز بڑا مودبانہ ہوتا۔ اس کی وجہ ان کا خاندانی پس منظر تھا۔ علامہ حیرت بدایونی انھیں بہت چاہتے تھے۔ ایک بار علامہ مرحوم نے ان کی موجودگی میں کہا تھا کہ "رشید صاحب! آپ ان کے تخلص پر مت جایئے۔ انھوں نے اپنا تخلص یکسر الگ رکھا ہے۔ اصل میں یہ بہت چوکس ہیں۔

ان کی تصانیف میں صرف ایک نثر کی کتاب شامل ہے جو اصل میں ان کا ایم اے کے امتحان کے لیے لکھا ہوا مقالہ ہے۔ حیات میں ان کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ جب ۱۹۸۰ء میں میرے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "خواہ مخواہ" شائع ہوا تو اس کی ایک جلد میں نے انھیں بھی دی۔ بہت خوش ہوئے اور بولے "رشید! تم نے یہ کام بہت اچھا کیا۔ میں نے کہا "اب تمہارا بھی کوئی مزاحیہ شاعری کا مجموعہ شائع ہو جانا چاہیئے۔ اس پر بولے "میں بھی اسی فکر میں ہوں لیکن یہ دنیا کے جھنجھٹ ایسے ہیں جو وقت ہی نہیں دیتے۔" میں نے کہا "اسے بھی دنیا کا جھنجھٹ سمجھ کر کر ڈالو" بڑے اعتماد کے ساتھ بولے "انشاءاللہ"۔

لیکن اس بات چیت کو دس سال گزر جانے کے باوجود وہ وقت نہیں آیا اور وہ بغیر مجموعہ شائع کئے ہی دنیا سے گزر گئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے مزاحیہ کلام کو یکجا کر کے شائع کیا جائے۔ ●●

اِنتخابِ کلام ——— بوگس حیدرآبادی

قطعات

بکواس کو راگنی میں گا لیتا ہوں
بوگس ہوں مگر رنگ جما لیتا ہوں
جمہور کو اللہ سلامت رکھے
جمہور کو دیوانہ بنا لیتا ہوں

○

چٹنی میں کوئی مست کوئی دال میں مست
رہتا ہے کوئی بخشی ہوئی کھال میں مست
ہم زندہ دلانِ حیدرآبادی ہیں
ہر رنگ میں ہم مست ہیں ہر حال میں مست

○

اِس دَور میں ہے ہر کس و ناکس شاعر
اِس قحط میں ہیں ٹکے کے دس دس شاعر
مالی، دھوبی، کلال، درزی، حجّام
مجھ جیسے ہیں بے شمار بوگس شاعر

○

محفل کا پتہ جو پا گیا ہے بوگس
مدعو نہ تھا پر آ گیا ہے بوگس
ڈائس پہ بھی آ گیا ہے جرات کرکے
بکواس سنا کے چھا گیا ہے بوگس

○

اُنگلیاں مجھ پہ اُٹھائیں نہ میرے یار بہت
مجھ کو معلوم ہیں یاروں کے بھی اسرار بہت
مختصر یہ ہے کہ میں ہی نہیں تنہا بوگس
میرے جیسوں کی ہے ہر شہر میں بھرمار بہت

○

جب مجھے بیروزگاری نے پھیچر کردیا
یار لوگوں نے لگا کر زور ٹیچر کردیا
چند دن کے بعد ہی آخر وہ دن بھی آگیا
پارٹی والوں نے بوگس کو منسٹر کردیا

○

ایک لڑکے نے یہ جھنجھلا کے کہا ابّا سے
اُلّو اُلّو مجھے ہر وقت نہ ابّا کہیے
آٹھ نو سال کا بچّہ نہیں ہوتا اُلّو
مَیں تو بچّہ ہوں مجھے اُلّو کا پٹھا کہیے

ادھوری غزلیں

○

یہ بعدِ عقد کھلے گا کہ میری خو کیا ہے — "ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے"
کوئی ذلیل کوئی بے وقوف کوئی گدھا — "تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے"
کتر کے لے ہی گیا بس میں کوئی ساری جیب — "ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے"
شکار کاکھوں میں تھیلیاں نہ چکنے چکنے گھڑے — "یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے"
میرے رقیب سے شادی بھی ہو چکی ہے جب — "تو کس امید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے"

بنا ہے مسخرہ شاعر پھرے ہے اِتراتا
وگر نہ شہر میں بوگس کی آبرو کیا ہے

○

وہ دلہن ہماری قسمت جو اُسے بھی پیار ہوتا — "یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا"
نہ ہوا تقرر اپنا اسی غم میں مرگئے ہم — "اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا"
کوئی چاند کا مسافر وہیں جاکے مر بھی جاتا — "نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا"

کئی بار ہیرو بن کر میں فلم میں مرچکا ہوں
مجھے کیا بُرا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

○

کہیں سسرے کی چہیتی ہی نہ بیوہ ہو جائے — "وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا"
قیس و فرہاد سب ہی عشق میں ناکام رہے — "ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا"
غرق سے پہلے پولس نے ہمیں آکر پکڑا — "ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا"

مسکراہٹ سے تیری ہو گیا زندہ بوگس
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

○

حسن والوں کو گھورتا کیا ہے
"دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے"

خالہ ماں سے کریں گی امی بات
"کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے"

مطمئن ہیں اگر غریب عوام
"پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے"

ایک زردار جد کا ہے سوال
"اور درویش کی صدا کیا ہے"

ایسے کم سن بُتوں سے دل نہ لگا
"جو نہیں جانتے وفا کیا ہے"

اور بھی ہیں بہت سے گُن اُن کے
"غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے"

کھا کے چُورن وہ خود سمجھ لیں گے
"ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے"

کوئی بیوہ بھی مجھ سے بوگس کر
"مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے"

ہوگئیں اللہ کو پیاری وہ جب اماں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

کر رہی تھیں کل کلب میں رقص چند اک لڑکیاں
شب کو اُن کے دل میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں

بھاگ جانا جیل خانے سے تو ممکن ہی نہ تھا
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

دوسری دُلہن بھی آجائے میرے گھر میں اگر
میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہوگئیں

خلد کو بھی جائیں گے ہیروئینوں کے نام خط
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

ایک دن طوق و سلاسل میں وہ جکڑا جائے گا
تیری زُلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

آپ تو ہوٹنگ کرتے ہیں میرے نغمات پر
بُلبلیں سُن کر میرے نالے غزلخواں ہوگئیں

چاک جب میرا گریباں تم نے قینچی سے کیا
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں

اُس بُتِ ظالم کو اب کوسے نہ دوں تو کیا کروں
یاد تھیں جتنی دُعائیں صرف درباں ہوگئیں

رکھ دیا تھا ایک دن ظالم نے میرے دل پہ ہاتھ
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

پہلے داروں میں بہائے سب نے اپنے اپنے دہن
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

بیویاں مرتی گئیں، میں شادیاں کرتا گیا
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہوگئیں

یوں ہی گر بڑھتی گئی بوگس سخن گویوں کی بھیڑ
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

روز دارُو دیا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

بنتِ مریم کی ہے تلاش مجھے
ابنِ مریم ہوا کرے کوئی

ووٹ لیتے ہیں چوٹ دیتے ہیں
اب کِسے رہنما کرے کوئی

میرے خط دے دیئے رقیبوں کو
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

خود طبیبوں کو ہے شکایتِ قبض
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کم سے کم لکھ پتی ہو جس کا باپ
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

دشمنوں سے جو مار کھا جائے
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

میں بھی بوگس ہوں وہ بھی بوگس ہے
کیوں کسی کا گِلہ کرے کوئی!

○

چاپلوسی مگر نہیں آتی
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

ان کو بچپن میں آتی تھی غیرت
اب کسی بات پر نہیں آتی

نہ خدا ہی ملا نہ وصلِ صنم
کوئی اُمید بر نہیں آتی

انڈین سے ہے مغربی اچھی
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

کی ہے کالج میں گرلز نے ہڑتال
کوئی صورت نظر نہیں آتی

بن گئے سیٹھ لے کے رشوت اب
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

عقد کا ایک دن مقرر ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

روز غنڈوں کی خبریں چھپتی ہیں
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

کان کا مَیل صاف کرواؤ
میری آواز گر نہیں آتی!

جاگتے میں فراق خواب میں وصل
موت آتی ہے پر نہیں آتی

داڑھی رکھ کر بھی عاشقی بوگس!
شرم تم کو مگر نہیں آتی

○

وہ اُڑاتے ہیں اگر بے پر کی
ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں

اَبر کو سہرا میں باندھوں وہ اگر
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

بوگس اب اُن کو چکھائیں گے مزہ
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

سلسلۂ انتخابِ کلام

— بوگس —

کون سا وقتِ ملاقات کیسے پیش کروں
دن کے پیش کروں رات کیسے پیش کروں

گھر میں بیگم ہے تو دفتر میں ہے افسر برہم
میں پریشاں ہوں کہ خدمات کیسے پیش کروں

دِل ہے صرف ایک مگر اس کے طلب گار ہزار
آپ فرمایئے حضرات، کیسے پیش کروں

رنگ پکّا ہے یہ کہہ کر مجھے دھتکار دیا
اب میں ارمانوں کی بارات کیسے پیش کروں

کوئی سُنتا نہیں دیوان لیے پھرتا ہوں
اپنی بکواس خرافات کیسے پیش کروں

ہر حسیں ہے مرضِ ہجر کا بیمار یہاں
دل ہے اک زندہ طلسمات کیسے پیش کروں

ڈال دوں گا کسی ہرّاج میں بوگسؔ، دل کو
کوئی لیتا نہیں سوغات کیسے پیش کروں

○

"میّت کو کندھا دیوے ہے لنگڑا رقیب بھی
چلتے ہیں خود بخود مرا مذہ کھی سکے پاؤں"

رؤف رحیم

آہ بوگس

افسوس اِس جہان میں بوگسؔ نہیں رہے — منزل کو مرکے پاگئے وہ، ہم یہیں رہے
بوگسؔ تھے فطرتاً ہی ملنسار اس قدر — دشمن بنے رہے وہ ہر اک دِل کی عمر بھر
ہندوستان گیر تھی شہرت انھیں نصیب — سب تھے رفیق ان کے کوئی بھی نہ تھا رقیب
زندہ دلانِ شہر کا وہ اِک وقار تھے — حیرت یہی ہے دل کے مرض کا شکار تھے
بوگسؔ نہیں تھے شاعرِ زندہ دلاں تھے وہ — دنیائے شاعری میں ابھی تک جواں تھے وہ
وہ پیکرِ خلوص تھے طنّازِ وقت بھی — وہ سایہ بھی تھے اور ثمر در درخت بھی
بے وقت بن کے رہ گئے وہ لقمۂ اَجل — کیا اس کے پاس اور نہیں تھا کوئی بدل
ہر لب پہ آج ہے یہ مچلتی ہوئی دُعا — "اللہ ان کی روح کو تسکین کرے عطا"

ہنستے ہنساتے ملکِ عدم کی طرف چلے
یا رب عطا مقام ہو خلدِ بریں تلے

○

سیّد عباس متقی

قطعۂ تاریخ

فکر کو بوگسؔ نے اپنی آن دی — شعریت کو قہقہوں کی شان دی
طنز کو دی طرزِ تعدیلِ کہن — ذوقِ گویائی کو اک میزان دی
کھول کر رازِ خراباتِ جہاں — بند ہونٹوں کو عجب مُسکان دی
جب تلک جیتا رہا۔ کہتا رہا — جان اپنی ہر گھڑی ہر آن دی
اس کی گرہیں یاد رکھی جائیں گی — مصرعۂ سنجیدہ کو مُسکان دی
تھا علمبردارِ یک جہتی و خُلق — دوستوں کو اپنی اک پہچان دی

روتے روتے متقیؔ تاریخ کہہ
ہنستے ہنستے آخرِ دم جان دی

۱۹۹۱ء

فیاض احمد فیضی کے مضامین قند وزقند کی رسم اجرا

پچھلے دنوں نوجوان طنز و مزاح نگار فیاض احمد فیضی کے طنزیہ و مزاحیہ مجموعے "قند وزقند" کی شان دار رسم اجرا ہوٹل پریزیڈینٹ قلابہ، بمبئی میں پروفیسر جاوید خاں، وزیر ہاؤسنگ حکومت مہاراشٹر کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی۔ تقریب کی صدارت برصغیر کے ممتاز مزاح نگار، جناب مجتبیٰ حسین نے فرمائی جو جشن اجرا میں شرکت کے لیے خصوصی طور پر دلّی سے بمبئی تشریف لائے تھے۔ مہمان خصوصی میں "شگوفہ" حیدرآباد کے مدیر ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، بمبئی ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس وی۔ ایس دیشپانڈے اور کوکن مرکنٹائل کوآپریٹیو بینک کے چیرمین جناب علی ایم شمسی تشریف فرما تھے۔ جلسہ کی نظامت پروفیسر انور ظہیر نے کی۔ "قند وزقند" کی اس غیر معمولی تقریب کا اہتمام بمبئی شہر کی چار نمائندہ ادبی انجمنوں، زندہ دلانِ بمبئی، ادارۂ ہم سب، کردار آرٹ اکادمی اور رائیٹرز گروپ نے مشترکہ طور پر کیا۔

اپنی صدارتی تقریر میں جناب مجتبیٰ حسین نے منفرد مزاحیہ انداز میں اپنے ایک غیر اردو داں ادب نواز دوست سے "قند وزقند" پر ہونے والی اپنی بحث کو مکالمے کی شکل میں پیش کر کے محفل کو قہقہہ زار بنا دیا۔ انھوں نے فرمایا کہ ہندوستان کے نئے مزاح نگاروں میں فیاض احمد فیضی کو زبان کے تخلیقی استعمال پر جو قدرت حاصل ہے وہ بہت کم کے حصے میں آئی ہے۔

اس سے قبل پروفیسر جاوید خاں چیرمین اردو اکادمی نے تالیوں کی گونج میں "قند وزقند" کی رسم اجرا ادا فرمائی۔ اپنی تقریر میں انھوں نے فرمایا کہ فیاض احمد فیضی بڑی نمایاں اور شان دار شخصیت کے مالک ہیں انھیں ۱۹۷۰ء سے بہت قریب سے جانتا ہوں اور ان کی صلاحیتوں کا اسی زمانے سے معترف ہوں۔ ان کی کتاب پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان طنز و مزاح نگاروں میں سے ہیں جو زندگی کی عام حقیقتوں کو دل نشیں پیرائے میں بیان کر دیتے ہیں۔ اس کتاب پر میں انھیں دلی مبارکباد دیتا ہوں اور ان کی مزید کامیابی کے لیے دعاگو ہوں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال مدیر شگوفہ، جناب یوسف ناظم، محترمہ سلمیٰ صدیقی، جسٹس وی۔ ایس دیشپانڈے، جناب علی ایم شمسی، حسن کمال، مشہور افسانہ نگار انور خاں، شام کرشن نگم، اور جاپان کے اسکالر سویاما نے بھی اظہار خیال کیا۔

پروگرام کے آخر میں فیاض احمد فیضی نے مقررین اور سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ مستقبل میں وہ نئی نئی اور اس سے بہتر تخلیقات سے طنزیہ و مزاحیہ ادب کی خدمت کرتے رہیں گے۔ تقریب کے اختتام پر پرتکلف عشائیہ پیش ہوا۔ شہر میں ایک عرصۂ دراز کے بعد اس قدر خوب صورت اور دل چسپ اور باوقار تقریب کا اہتمام ہوا جس کی یاد برسوں تک طلا کو گرماتی رہے گی۔

اس تقریب میں بمبئی کے تمام نمائندہ قلم کاروں، صحافیوں اور عمائدین شہر نے شرکت کی۔

وسے کے خط

محبی ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، سلام و دعا۔
روزنامہ 'معظم اردو' لکھنؤ میں بوگس حیدرآبادی کے انتقال کی خبر پڑھ کر طبیعت بے حد مضمحل ہوگئی۔ ایک اچھا فن کار ایک شریف انسان اٹھ گیا۔ یوں تو جو آیا ہے اسے جانا ہی ہے لیکن بعض موتیں قبل از وقت ہو جاتی ہیں، قبل از وقت سے میری مراد ان عزیزوں اور دوستوں کی موت ہے، جو ساٹھ پینسٹھ سال کے اندر ہی مالک حقیقی سے جا ملتے ہیں۔ ان سے میری ملاقات ۱۹۶۸ء میں حیدرآباد میں ہوئی تھی۔ وہ برابر جشن ظرافت میں پیشتر آیا کرتے تھے۔ آخری ملاقات چند سال پیشتر ہوئی تھی، جب وہ چھپرا کے مشاعرے کے بعد پٹنہ ہوتے ہوئے حیدرآباد واپس جا رہے تھے۔ میری خط و کتابت بھی ان سے ہوتی رہتی تھی۔ اسی قربت کی وجہ سے میں نے ان کی موت سے حد درجہ پژمردہ ہوگیا ہوں۔ ان کے گھر والوں کو میری جانب سے پیغام تعزیت پہنچا دیجیے۔

رضا نقوی واہی۔ پٹنہ

برادر محترم۔ آداب
ہر بار کی طرح اس بار بھی شگوفہ کا تازہ شمارہ میں نے اشتیاق سے پڑھنا شروع کیا کہ یہ رسالہ آج کی زندگی میں جہاں مسکرانا کار دشوار ہے، بہت سی مسکراہٹیں لے کر آتا ہے۔ لیکن پہلا صفحہ یعنی اداریہ پڑھتے ہی دم بخود رہ گیا۔۔۔! بوگس حیدرآبادی نہیں رہے!! اس خبر پر یقین کرنا مشکل ہے۔ مسکراتا، کھلکھلاتا ہوا، زندگی کی توانائی سے بھرپور وہ شخص جو محفل کی جان بن جاتا تھا، اچانک خاموش ہوگیا! بوگس سے جب میری پہلی ملاقات ہوئی تھی تو پہلے تو میں اس کے تخلص پر چونکا تھا لیکن چند ہی لمحوں میں۔ نسبتاً یہ محسوس کیا تھا کہ بوگس دراصل بہت پیارا شخص ہے، بہت ذہین اور ملنسار! اس کے بعد جتنی بھی ملاقاتیں ہوئیں حیدرآباد ہی میں ہوئیں۔ اور مختصر ہوئیں لیکن ہر بار اس کی محبت کے نقوش گہرے ہوتے رہے۔ اس کے خط آتے تھے تو ان میں بھی وہی تفصیلی گفتگو کا سا انداز ہوتا تھا۔ زندہ دلان حیدرآباد کا ایک زندہ دل ممبر چلا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ آپ بھی اس کی کمی کو محسوس کر رہے ہوں گے۔
لیکن اسی کا نام زندگی ہے کہ عزیز دوستوں کے بغیر بھی زندہ رہنا ہوتا ہے۔

ان دنوں وہاں کے (اور یہاں کے بھی) حالات ویسے ہی دگرگوں ہیں ملک کی صورت حال اچھی خاصی تشویش ناک ہے۔ لیکن وقت گزر رہا ہے۔ یہی غنیمت ہے۔

آزاد گلاٹی۔ نابھ

محترمی مصطفیٰ کمال صاحب۔

آداب۔
شگوفہ کے جون کے شمارے میں حضرت بوگس حیدرآبادی کے انتقال کی خبر پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔ یوں تو مرنا برحق ہے پر بوگس جیسے ذہین آدمی کی کمی طنز و مزاح کی دنیا میں ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی۔ موصوف سے میری ملاقات سری نگر کشمیر میں ہوئی تھی۔ ان ملاقاتوں کا سلسلہ بمبئی اور دلی میں بھی جاری رہا۔ بے حد نیک نفس اور نہایت درجے کے شریف آدمی تھے۔ خدا مغفرت کرے۔ آمین۔

سوگوار
فیاض رفعت
اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اے آئی آر) بمبئی

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد: ۲۴ شمارہ: ۸

اگست ۱۹۹۱ء

ایڈیٹر:

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت:

مضطر مجاز
محمد حمایت اللہ
صلاح الدین نیر
طالب خوندمیری

خصوصی نمائندے:

بمبئی — فیاض احمد فیضی
ریاض — عابد معز
دوبئی — غلام نجم الدین
آسٹریلیا — ایس۔ ایم۔ حسینی

مجلسِ مشاورت:

بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
یوسف ناظم
مجتبیٰ حسین

طباعت: دائرہ الکٹرک پریس چھتہ بازار حیدرآباد

فی پرچہ: ۶ روپے ۔ سالانہ خریداری: ۶۰ روپے
بیرونی ممالک سے: ۲۵۰ روپے

شگوفہ: ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
فون: 557716 مکان: 521064

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

مال مفت (انشائیے)

قاضی جی دُبلے (کوائف بمبئی)

مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

فن اور فن کار (انٹرویو و انتخاب)

چوسر (منظومات)

نریندر لوتھر

امتحان اور ہم

غالباً یسوع مسیح نے یہ تلقین کی تھی کہ دوسروں کا امتحان مت لو مبادا تمہیں بھی امتحان نہ دینا پڑے لیکن دنیا کے کسی بھی تعلیمی ادارے نے یہ نیک نصیحت قبول نہیں کی پڑھائی ہو یا نہ ہو لیکن امتحان لازمی طور پر لیے جاتے ہیں ہندوستان کی بیشتر یونیورسٹیوں کے طلبا یسوع کی اس نصیحت پر عمل کروانے کی کوشش میں ہڑتالیں بھی کرواتے رہتے ہیں لیکن حکام ٹس سے مس نہیں ہوتے ہاں کوئی بار امتحان ملتوی ہو جاتے ہیں لیکن بالآخر منعقد کیے جاتے ہیں حکام کا کہنا ہے کہ اگر امتحان نہ دیں تو نوجوان تعلیم یافتہ بے روزگار کیسے بنیں گے ہاں طلبا کے بار بار اصرار پر اتنی رعایت ضرور دی گئی ہے کہ وہ امتحان میں نقل ماریں۔ ہم نے زندگی میں بہت امتحان دیئے ہیں۔ اسکول، کالج، یونیورسٹی میں تو قریب سب لوگ امتحان دیتے ہیں ہم نے تو سروس شروع کرنے کے بعد بھی امتحان دیئے ہیں اور آج تک ہمیں ڈراؤنے خواب آتے ہیں کہ ہم امتحان میں پاس ہو گئے۔ ہم نے شروع سے ہی ایک اصول اپنالیا تھا جس مضمون میں ایک بار فیل ہو جاتے تھے اسے ترک کر دیتے تھے ہائی اسکول میں ایک بار سائنس میں فیل ہو گئے ہم نے فوراً سائنس چھوڑ کر اردو کا مضمون لے لیا اسی لیے ہم آج تک سائنس میں بالکل کورے ہیں ہمیں یہ تک معلوم نہیں کہ ایٹم بم کیسے گرایا جاتا ہے نہ ہی ہمیں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ تھرماس بوتل میں گرم چیز گرم اور ٹھنڈی چیز ٹھنڈی کیسے رہتی ہے گرم چیز کو گرم رکھنا یا ٹھنڈی کو ٹھنڈا رکھنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن تھرماس کو یہ کیسے معلوم ہوتا ہے کہ اس چیز کو گرم رکھنا ہے اور اس چیز کو ٹھنڈا۔ ویسے ہمیں سائنس نہ پڑھنے کا کوئی افسوس نہیں کیونکہ سائنس اس رفتار سے ترقی کر رہی ہے کہ جن لوگوں نے ہمارے زمانے میں سائنس کی تعلیم حاصل کی وہ اب بھی نئی نئی ایجادوں کو سمجھ نہیں پا رہے ہیں اس کے برعکس اردو میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ ویسی کی ویسی ہے۔ بس ہم جیسے دو چار ادیبوں کا اضافہ ہوا ہے لیکن ہمیں سمجھنا مشکل نہیں۔

سائنس کے علاوہ ہم حساب میں بھی بہت کمزور تھے۔ لیکن اس میں فیل ہونے سے بچ گئے۔ ایک بار امتحان میں ہمیں دس سوال دیئے گئے۔ ماسٹر نے کہا کہ جتنے سوال غلط ہوں گے اتنے ہی بید پڑیں گے۔ امتحان کے بعد سوالوں کے جواب بلیک بورڈ پر لکھ دیئے گئے اور ہر ایک طالب علم سے کہا گیا کہ وہ بتلائے کہ اس کے کتنے سوال غلط ہیں۔ ہمارے بہت سے ہم جماعتوں کو کافی مار پڑی۔ جب ہماری باری آئی تو ہم نے کہا کہ ہمارا ایک سوال غلط ہے۔ اس طرح ہمیں سب سے کم بید پڑے۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم نے صرف دو سوال ہی حل کیے تھے۔ باقی کے آٹھ سوالوں کو حل کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ ایک بار ہمارا زبانی امتحان ہوا۔ اس میں پوچھا گیا کہ چھ جمع چار کتنے ہوتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ تقریباً گیارہ، ماسٹر نے کہا غلط۔ چھ جمع چار دس ہوتے ہیں۔ ہم نے کہا چھ جمع چار دس نہیں ہو سکتے کیوں کہ پانچ جمع پانچ دس ہوتے ہیں۔ اس پر ہمیں بید پڑا۔ ایک بار ہمیں حساب

ہیں انعام بھی ملا۔ سوال پوچھا گیا کہ بیس ضرب دو کتنے ہوتے ہیں۔ ہم نے کہا ۴۲۔ بلاشبہ یہ غلط تھا اب ہمیں معلوم ہے کہ بیس ضرب دو چالیس (۴۰) ہوتے ہیں لیکن ہمارا جواب صحیح جواب سے نزدیک ترین تھا۔ باقی سب طالب علموں کا جواب ۴۲ سے کم تھا اس لیے ہم انعام کے حق دار ہوگئے۔ مڈل اسکول کے فائنل امتحان میں ہم جغرافیہ کے سوا تمام مضامین میں فیل ہوگئے۔ جغرافیہ میں اس لیے فیل نہیں ہوئے کہ وہ مضمون ہم نے لیا ہی نہیں تھا اس کے بعد ہم نے اسکول ہی بدل دیا دوسرے ہی اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے ہمیں پہلے اسکول کے امتحان کے نتیجہ کی بنا پر پاس کردیا۔ ہم یہ بتانا بھول گئے کہ ہم فیل ہونے پر اسکول چھوڑ دیا کرتے تھے۔ ہمیں خواہ مخواہ کی رسوائی ہرگز منظور نہیں تھی۔ ایک بار اردو میں ہمارے سو میں سے ایک سو دس نمبر آئے ہیڈ ماسٹر نے اعتراض کیا کہ سو فی صد سے زیادہ نمبر نہیں آسکتے۔ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ حضور وہ تو صحیح ہے لیکن اس بچے نے ایک ایسے سوال کا جواب بھی دیا ہے جو پرچے میں نہیں تھا۔ ہمارا یہ ریکارڈ آج تک نہیں ٹوٹا آج کل ایسے استاد کہاں ملتے ہیں۔

جب ہم نے میٹرک کا امتحان دیا تو اس وقت آزادی کے نام پر فساد ہو رہے تھے۔ جس سنٹر سے ہم نے امتحان دیا اس کو جلا دیا گیا لیکن امتحان سے پہلے کرفیو لگ گیا وہ امتحان بھی نہ ہوسکا۔ اس اثنا میں ہم ہندوستان آگئے تھے یہاں ہمیں پھر ایک بار امتحان دینے کو کہا گیا ہم نے صاف انکار کردیا کہ زندگی میں میٹرک کا امتحان دینے کے علاوہ ہمیں اور بھی کچھ کرنا ہے پھر حکومت نے ایک اسکیم نکالی۔ ہمیں ایک مہینے کے لیے ایک رفیوجی کیمپ میں سوشیل سروس کرنے کو کہا گیا اس کے بعد ہمیں میٹرک پاس قرار دے دیا گیا۔ کالج میں نقل اڑانے کا عام رواج تھا۔ پہلی بار ہم نے نقل ماری تو فیل ہوگئے۔ اگلی بار ہم ایک ذہین طالب علم کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے اور اس کے جوابوں کی نقل کی ہم سکنڈ کلاس پاس ہوگئے۔ اس کے جواب ہو بہو ہمارے جوابوں سے ملتے تھے اس لیے نقل مارنے کی سزا کے طور پر اسے فیل کردیا گیا۔ جب ہم نوکری کے لیے تیار ہوئے تو وہاں بھی امتحانوں کا رواج ہو چکا تھا۔ پاکستان سے آئے ہوئے طلبا کو یہ رعایت دی گئی کہ ان کا زبانی امتحان لیا گیا امتحان میں صرف دو سوال پوچھے گئے۔ تمہارا نام کیا ہے؟ اس میں ہمیں ۷۵ فی صدی نمبر ملے۔ دوسرا سوال تھا تمہارے والد کا کیا نام ہے؟ اس میں ہمیں (۵۰) فیصد نمبر ملے لیکن دونوں ملا کر ہم ۶۲ فی صد نمبر لے گئے۔ اس طرح ہمیں نوکری مل گئی۔ نوکری ملنے کے بعد ہم نے سوچا اب تو امتحانوں سے خلاصی ہوئی لیکن یہاں پر بھی ہر مرحلہ پر امتحان تھے۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ امتحان لینے والے ہمارے افسر ہی تھے انھیں ہماری امتحانوں سے الرجی کے بارے میں پورا علم تھا اس لیے انھوں نے ہمیں ہر امتحان میں پاس کردیا۔ اس طرح ہم ترقی کی منزلیں طے کرتے رہے۔ اب ہم ریٹائرمنٹ کے قریب آگئے ہیں۔ اب سنا ہے کہ ایک نیا امتحان شروع کیا گیا ہے جو افسر امتحان پاس نہیں کریں گے انھیں ریٹائر نہیں کیا جائے گا۔ اس امتحان میں فیل ہونے کی ہمیں کوئی فکر نہیں اس لیے ہمارا فیل ہونے کا دیرینہ تجربہ ہمارے کام آئے گا۔

محمد طارق غازی
(جدہ)

اب کیا لکھوں

لکھنا میری پہلی محبت ہے، بات فقط دعوے کی نہیں۔ دعویٰ کیا ہے تو اسے نباہ کر بھی دکھایا ہے۔ لیکن جب لکھا تحریری امتحان بن جائے تو لوگ ایم اے میں بھی اس سے ہیبت کھاتے ہیں۔ میں یونیورسٹی سے آخری بار باہر آیا تھا تو خوشی تھی کہ اب کم سے کم ان امتحانوں سے پیچھا چھوٹا مگر بھلا کیوں۔ کوئی سن نہ لے، ڈرتے ڈرتے بتاتا ہوں کہ خوش اتفاقی سے مجھے رسول احمد کلیمی، مصلح الدین سعدی اور امجد حسین جیسے تین دوست میسر ہیں اور سچی بات یہ ہے ان جیسے دوست میسر آجائیں اور پھر آدمی مجھ جیسا کہ مزاحمت بھی نہ کر سکے تو زندگی بھر تحریری امتحان دینے پڑتے ہیں۔

اب کچھ لکھنے کو جی بھی نہ چاہے، کوئی بھلا سا موضوع بھی نہ ہو، مگر ایک بے عنوان تقریب بہر ملاقات کی ٹھان لی گئی ہو تو تقاضہ کیوں نہ ہو۔ سیّد نے پٹھان کا روپ دھارن کیا اور پھر طارق غازی کو خود اپنی فردِ جرم تحریر کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ کاش آپ لوگ اس وقت موجود ہوتے تو دیکھتے کہ حکم ایسا دیا جا رہا تھا جیسے درخواست کر رہے ہوں۔ بس یہیں تو میں ان دوستوں کے سامنے بے بس ہو جاتا ہوں۔ آخر یہ بھی تو میری محبتیں ہیں۔ اس محبت کو کیسے رد کر دوں۔

مگر مسئلہ یہ ہے کہ کلیمی و سعدی کراماً کاتبین کی طرح اپنے نیک سرشت مجرم سے مشورہ نہیں کرتے۔ بس پکڑوا دیتے ہیں۔

سنا تھا فرشتے دھمکیاں نہیں دیتے۔ مگر یہ دیتے ہیں کہ مضمون نہ لکھا تو برجستہ تقریر کرنی پڑے گی۔ جب یہ دھمکی بلا شرکتِ غیرے ہوش میں پہنچی تو میرے تو ہوش اڑ گئے۔ اس وقت جی چاہا کہ محاورةً ہی سہی فرشتے کوچ کر جائیں۔ فرشتوں کا ہماوقتی ایک میرا ہی دماغ کیوں رہ گیا۔ آخر اور بھی تو بہت انسان جنت سے نکالے ہوئے ہیں۔ آخر ہاتھ جوڑ کر فرشتوں کی ان تین جوڑیوں سے پوچھا کہ یار فرشتو، یہ تو بتاؤ کہ کیا لکھوں؟ جواب ملا ہم دردِ سر سے فارغ ہیں لہٰذا یہ ہمارا دردِ سر نہیں ہے۔

دل کو ڈھارس دی۔ آخر ۱۹۵۳ء سے لکھ رہا ہوں۔ کروڑوں لفظ لکھے ہوں گے۔ لاکھوں چھپے ہوں گے۔ لفظ شماری نہیں کی، اندازہ تو کیا ہے اور اندازے قائم کرنا تو صحافیوں کا پیدائشی حق ہے۔ مگر یہی یہ صحافی کوئی مضمون نگار تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ سچے کھرے اہلِ قلم تو انھیں منہ بھی نہیں لگاتے۔ آپ خود بتلائیے، تاریخ ادب میں کبھی کسی صحافی کا تذکرہ چھوڑئیے نام بھی آیا ہے؟

ایسے بھی دیکھیے کہ اعجاز صدیقی اور مغنی تبسم رسالے بھی شائع کریں اور پھر تاریخ ادب میں اپنا نام بھی لکھ لیں،

ظفر علی خاں اور شورش کاشمیری شاعری بھی کریں تو کس نمی پسند کو بھیا کیسی - امداد صابری نے شاید اسی کا اہتمام لیا تھا کہ اپنی تاریخ صحافت اردو میں سے چن چن کر ان شاعروں اور ادیبوں کے نام نکال دیے جو چور دروازے سے صحافی بن گئے تھے۔ مگر یہ اندر کی بات کچھ اور ہے۔ اب آپ سے کیا پردہ ، بات کہیں باہر تو نہیں جائے گی۔ یہ جو شمالی ۲۳ درجہ عرض البلد کے جنوب میں صحافیوں کی فصل اگتی ہے اس کی پھلیوں میں دانے نہیں ہوتے ، دور کیوں جائیں ، یہیں جدہ میں ایک بار کچھ آٹھ دس عرب صحافی بیٹھے اچھے مقالہ نگار صحافی کی تعریف طے کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سب نے جب بال کی کھال نکال لی اور پھر بھی بات بے نتیجہ رہی تو الاہرام کے ایڈیٹر نے ایک جملے میں تعریف متعین کر دی۔ فرمایا اچھا مقالہ نگار صحافی وہ ہے جو بغیر مطالعہ و تحقیق آدھے گھنٹے میں دو کالم کا اداریہ لکھ دے۔ حاضرین میں سے ہر ایک اسے اپنی تعریف بمعنی ستائش سمجھ کر الاہرام کے ایڈیٹر کا شکریہ ادا کیا اور اداریہ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

جو لوگ مجھے جانتے ہیں اور مجھ سے مل کر اپنے بچوں کو صحافی نہ بننے کی وصیت کر چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ شمالی ۲۳ درجہ کے جنوب کی فصل والا صحافی بے حد مصروف ہوتا ہے۔ شمال میں چوں کہ سردی پڑتی ہے اس لیے وہاں لوگ کاہل ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں ٹائم میگزین کے ایک مضمون نگار کی باری اوسطاً چھ ماہ میں ایک مرتبہ آتی ہے اور اس چھ ماہ میں اپنا وقت تحقیق و مطالعہ پر ضائع کرتا رہتا ہے۔ چند سال پہلے لندن سے اخبار انڈیپنڈنٹ نکلا تو فی صفحہ چار صحافیوں کا تقرر کیا گیا۔ حاصل وہ لوگ پیسے اور وقت کی قدر نہیں جانتے ۔ اب ہمارے صحافی کو دیکھیے۔ نصف گھنٹہ میں اداریہ لکھنے کے بعد اس کے پاس ساڑھے تیئس گھنٹے فارغ ہوتے ہیں۔ چناں چہ معاشرہ چوں کہ پیسے اور وقت کی قدر کرتا ہے اس لیے اس ½۲۳ گھنٹے کے ایک ایک منٹ سے پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ حتیٰ کہ جب شمال کا صحافی چھ مہینے میں پڑھ پڑھ کر بور ہو جاتا ہے تو اس وقت تک جنوب کا صحافی ۱۸۳ اداریے لکھ چکا ہوتا ہے اور چار صفحے روزانہ کے حساب سے ۷۳۲ صفحے مرتب کر چکا ہوتا ہے، یعنی اتنا بہت کہ جمیل جالبی کی پوری تاریخ ادب اس میں سما جائے اور پھر رام بابو سکسینہ کی تاریخ کے لیے بھی گنجائش رہ جائے۔

اسلام، بلکہ مسلمانوں کو ہمیشہ خطرہ میں دیکھنے والے ایک صحافی سید انیس الرحمٰن مرحوم تھے۔ ان کے تابڑ توڑ قسم کے اداریوں سے خوش ہو کر ان کے ایک مداح نے از راہ حوصلہ افزائی انھیں پنڈت انیس البھگوان کا خطاب دیا تھا کیوں کہ ہندوستان میں بطور انعام قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی اور ایک صحافی کی قدر کرنی بھی ضروری تھی۔ بہرحال سید انیس الرحمٰن بڑے معرکے کے صحافی تھے۔ وہ کسی تحریک وغیرہ کے قائل نہیں تھے بلکہ خود ایک تحریک متواتر قرار دیتے تھے۔ سقوط کشمیر اور سقوط حیدرآباد کے بعد انھوں نے طے کیا کہ ایک سابق راجہ شاہی اور ایک سابق مسلم راج کے مابین مشترک اقدار تلاش کی جائیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے پیسے حاصل کرنے کی تحریک شروع کی جو تاریخ عالم میں روزنامہ شیب حیدرآباد کے نام سے مشہور ہوئی۔ سنا ہے جب تک ان کی اداریتی میز کی بائیں دراز میں بادام سے بھرا ہوا ڈبہ نہیں ہوتا تھا وہ اداریہ نہیں لکھ سکتے تھے۔ ویسے بھی بادام کے بغیر حیدرآباد اور کشمیر میں کوئی رابطہ قائم کرنا ایک مہمل بات تھی۔ اب رئیس الدین فریدی کا بیان ہے کہ ایک روز چند غیر اداریہ نگار بلکہ بالکل ہی غیر ذمہ دار قسم کے صحافیوں نے دراز کا تالہ توڑ کے سارے بادام کھا لیے۔ سید صاحب دفتر آئے اور اداریہ لکھنے بیٹھے۔ بادام کا ڈبہ خالی تھا۔ بولے اب اداریہ کیسے لکھوں۔ چناں چہ

انھوں نے ڈبّے کی طرح دفتر خالی کیا۔ تحریک ختم ہوگئی اور اخبار بند کر کے وہ بہار واپس چلے گئے اور جب تک لال بہادر شاستری جی نے دوبارہ سرمایہ فراہم نہیں کیا انھوں نے اپنی تحریک بند رکھی۔

سید انیس الرحمٰن پیسے گنتے تھے یا بادام۔ کچھ لوگ ذرا مختلف قسم کی گنتی کرتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی نے جب فلم "دستک" لکھی تو دروغ برگردن راوی خواجہ احمد عباس نے ان سے پوچھا کہ بیدی گیارہ تک کب لکھو گے؟ بیدی نے بہ اطمینان سے جواب دیا کہ قطعی طور پر تو کچھ نہیں کہہ سکتا مگر ۱۲ سے پہلے ہی لکھ دوں گا۔

خواجہ احمد عباس، آخر خواجہ تھے یعنی سب کچھ۔ چناں چہ صحافی بھی تھے۔ انھیں کچھ لوگ انگریزی صحافت کا آخر صفحہ کہا کرتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب لارنس کے ناول لیڈی چیٹرلیز لوَر پر ہندوستان میں پابندی عائد ہوئی تھی۔ عدالت نے اس ناول کو شہوانی قرار دیا۔ خواجہ احمد عباس نے فوراً آکسفورڈ ڈکشنری اٹھائی اور بیبیں کا مطلب دیکھا پھر مطلب کا مطلب دیکھا، پھر مطلب کی بات آخری صفحہ پر لکھ دی کہ ۱۲ مرحلوں سے گزرنے کے بعد شہوانی کا مطلب طاقت ور ہو جاتا ہے۔ لہٰذا لارنس کے طاقت ور ناول کو بکنا چاہیے۔ درحقیقت یہ انہی کا حق اور حصہ تھا۔ ان کے آخری صفحہ پر طاقت کے اشتہار کے طور پر ہر ہفتے ایک حسینہ کی تصویر جو چھپتی تھی۔

خیر یہ تو تذکرہ تھا ان لکھنے والوں کا جنھیں جمیل جالبی لکھنے والوں میں شمار نہیں کرتے۔ سچے اور کھرے لکھنے والوں کے سلسلے میں تو بڑی بحث و تحقیق ہوئی ہے۔ ابھی چھینک اور بادام کا ذکر آیا تھا اس پر یاد آیا کہ حکمائے تحریر نے لکھنے کے مرض کی کئی علامتیں بتائی ہیں۔ کہتے ہیں فصیح الملک حکیم اجمل خاں کے پاس ایک تفصیلی قرابادین تھی جسے وہ بوطیقا کہتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ افلاطون نے نہ صرف ان کی کتاب چرا کر یونان میں چھپوا دی تھی بلکہ کتاب کا نام بھی چرا لیا تھا۔ افلاطون نے واقعی بڑی زیادتی کی تھی بلکہ شرمندہ بھی تھا۔ دراصل اسے مکالمات لکھنے تھے اور یہ ذرا پیچیدہ مرض ہے کہ جب مریض بولتا بھی ہے اور لکھتا بھی ہے۔ اسی لیے وہ حکیم اجمل خاں کی بوطیقا لے گیا تھا۔

بہر حال اس کتاب کے مطابق عمومی امراضِ تحریر کا علاج کرنے والے کہتے ہیں کہ اس مرض کی علامت موڈ ہے۔ یہ طاری کرنے کے لیے لکھنے والے کو طرح طرح سے منہ بنانے پڑتے ہیں جس کو دیکھ کر آتش نے کہا تھا کہ خبر لیجے دہن بگڑا۔ علامتِ مرض ظاہر ہونے سے پہلے مریض قلم ہاتھ میں لے کر بہت دیر تک بے حس و حرکت، بلکہ بے حس بیٹھا رہتا ہے۔ چناں چہ بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی ایسی تصاویر مشہور آرٹ گیلریوں کی دست برد سے محفوظ رہ گئیں۔ جن میں وہ قلم ہاتھ میں لیے موڈ بننے کا انتظار کرتے دکھلائے گئے ہیں۔

تحریر کے امراض باطنی کے ماہرین بتاتے ہیں کہ لکھنے سے پہلے کچھ تحریک ہوتی ہے جیسے نزلے کے اعلان سے پہلے تین چار چھینکیں آتی ہیں۔ جب تحریک ہو جاتی ہے تو نزلہ کاغذ قلم پر گرتا ہے اور چند استرخا اور تشنج کی کیفیت سے گزرنے کے بعد مریض کو افاقہ ہو جاتا ہے۔

اب یہاں حکما کے دو طبقوں میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ موڈ اور تحریک ایک ہی کیفیت ہیں، فرق صرف اپنی اور فرنگی زبان کا ہے دوسرا گروہ جو ذرا زیادہ پڑھا لکھا ہے، یہ کہتا ہے کہ فرنگیوں کے ہاں صرف موڈ ہوتا ہے تحریک نہیں ہوتی۔ کیوں کہ تحریک کا نام آتے ہی وہاں مرد تو مرد عورتیں بھی جلسے، مظاہرے شروع کر دیتی ہیں۔ صرف مشورہ دینے والے طبیب بالعموم سیاست دانوں کے تحریری امراض کا علاج کرتے ہیں' یہ رائے رکھتے ہیں کہ اردو میں تحریک چوں کہ

جدا مختلف معنوں میں آتی ہے اس لیے ہمارے خطے میں ٹمسیڈوینزم فروغ نہ پاسکا۔ اور تاج محل جیسی عمارتوں کی تعمیر ممکن ہے
شبلی نعمانی ان تمام باتوں کو نہیں مانتے تھے۔ لکھنے کے لیے ان کی شرائط بالکل مختلف تھیں۔ وہ کہتے تھے کہ چکنا
روشن، سفید ولائتی کاغذ، چمک دار سیاہی اور درست خط کے قلم کے بغیر جو شخص لکھنے کا ارادہ کرے اسے دارالمصنفین
سے باہر نکال دو۔ اسی لیے لوگوں نے مارے ڈر کے شبلی کو منشی کے بجائے علامہ کہنا شروع کر دیا۔ حالاں کہ منشی نول کشور
ابھی موجود تھے اور منشی پریم چند اور منشی تیرتھ رام فیروز پوری وغیرہ اس پر چیں بہ جبیں ہوئے تھے مگر تکنیکیات کے ماہرین
کہتے ہیں کہ منشی قسم کے لکھنے والے شبلی کے برعکس صرف ایک فرشی ڈیسک کو ضروری سمجھتے ہیں۔ آنکھوں پر ایک گول پیالا
عینک بھی ہونی چاہیے، البتہ اس کا راست تعلق لکھنے سے نہیں بلکہ خود اپنی تحریر پڑھنے کے قابل ہونے سے ہے۔ ورنہ گول
عینکیں تو آج کل عورتیں بھی بہت لگا رہی ہیں۔ انھیں کوئی منشی کہہ دے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ جب سے فرشی
ڈیسک بننے بند ہوئے ہیں، منشیوں کی فصل اگنی بھی بند ہو گئی۔

اب لوگ میز کرسی پر بیٹھ کر لکھتے ہیں۔ میز پر اگر ایک لیمپ بھی نمائشی طور پر رکھا ہو تو لکھنے والے کو آج کل ڈاکٹر کہا جاتا
ڈاکٹر قسم کے لکھنے والے دو طرح کے ہوتے ہیں، اگرچہ دونوں میں قدر مشترک یہ ہوتی ہے کہ وہ خود کچھ نہیں لکھ سکتے
تھے۔ تحریک وغیرہ کے وہ قائل نہیں ہوتے۔ ان کی اہم ترضروریات یہ ہے پہلے سے کچھ لوگوں نے کتابیں لکھ کر چھاپ دی ہوں
اور پھر اندرونی سرورق پر دو لفظ۔ "بصد خلوص" لکھ کر انہیں پیش کی ہوں۔ اور یہ ثبوت فراہم کرنے کے لیے کہ کتاب
چوری کی نہیں ہے اور نہ ہی اسے خریدا گیا ہے۔ اس پر اپنے دستخط بھی ثبت کر دیئے ہوں۔

جب اس طرح شرعی طریقے سے کتاب ہاتھ میں آجاتی ہے تو ڈاکٹر اپنی کتاب لکھنے کا کام شروع کر دیتے ہیں۔ اب اگر
کوئی شخص کتابوں کا دھنی ہے اور وسیع تعلقات کی وجہ سے اس کا گھر کباڑی کی دکان بن چکا ہے۔ تو وہ ہر کتاب میں
دو تین جملے کر انھیں اس ترتیب سے فٹ کرتا چلا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کو اس پر ایک مسلسل مضمون کا شبہ ہونے لگتا
ہر دو جملے کے بعد وہ کسی مصنف اور اس کی اس کتاب کا حوالہ بھی دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے بعض نے بطور
حاشیہ ایجاد کیا گیا ہے۔ حاشیے سے مارکیٹ میں ساکھ بنتی ہے۔ اس قسم کی تحریروں کو انگریزی زبان میں ری سرچ کہتے ہیں
مگر اردو میں تلاش ثانی نہیں کہتے کیوں کہ اس ترکیب سے بعض بادشاہوں، مثلاً اکبر ثانی کو شکایت پیدا ہونے کا اندیشہ
ہوتا ہے۔ ویسے بھی جو بادشاہ ثانی ہوتے ہیں ان کے اول کو لوگ زیادہ یاد رکھتے ہیں۔ ری سرچ کرنے والوں کو ملٹی اکسٹر کہا جاتا
چوں کہ انھیں بہت سی کتابوں کے نام حفظ ہوتے ہیں اس لیے یونیورسٹیوں میں ایسے لوگوں کی بڑی مانگ ہوتی ہے تاکہ طلبہ
عبرت پکڑیں اور پڑھنے لکھنے میں دھیان لگائیں۔

دوسری قسم کے ڈاکٹر عموماً بزعم خود ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ ان کا حلقۂ احباب وسیع نہیں ہوتا یا ملنے جلنے والے شاعری کرتے
ہیں، ٹوکریاں بنتے ہیں مگر کتابیں نہ لکھتے ہیں نہ چھپواتے ہیں۔ لہٰذا اس دوسری قسم کے ڈاکٹروں کے پاس کتابیں نہیں ہوتیں
یہ لوگ اس وقت تک انتظار کرتے ہیں جب تک انھیں کسی ایسے مصنف کی کتاب نہ مل جائے جسے قسم اول کے ڈاکٹر
نے مسترد کر دیا ہو۔ یہ ایک کتاب ملتے ہی دوسری قسم کے ڈاکٹر کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ اب وہ اسی ایک کتاب میں
بہت جملے اخذ کر کے انھیں از سر نو مرتب کرتا ہے۔ انگریزی میں اس قسم کے کام کو سرچ کہتے ہیں۔

یونیورسٹیاں ان لوگوں کو ڈاکٹر نہیں گردانتیں، مگر یہ لوگ ڈاک کے پھیر میں رہتے ہیں۔ یعنی اپنا مضمون ہر رسالے

باری باری ڈاک سے بھیجتے ہیں اور پھر ڈاک میں رسالے کے اعزازی نسخے کا انتظار کرتے رہتے ہیں تا آنکہ ڈاکیہ آجائے اور انھیں ایڈیٹر کا خط دے جاتا ہے جس میں مضمون کی اشاعت سے معذرت ہوتی ہے۔ ایسے لوگ ہمت نہ ہاریں تو دس برس میں اصلی ڈاکٹر بن جاتے ہیں۔

ڈاکٹروں کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اقوال زریں نہیں لکھتے، اگرچہ ممکن ہے ڈاکٹر بننے سے پہلے وہ ایسی بچکانہ حرکت کر بیٹھے ہوں۔ خورشید الاسلام نے ایک جملہ لکھا تھا کہ شبلی پہلے یونانی تھے جو ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ پھر وہ ڈاکٹر بن گئے۔ لہٰذا اب وہ ایسے جملے لکھنے سے حد درجہ احتیاط برتتے ہیں۔ مبادا لوگ انھیں غلط سمجھنے لگیں۔

لکھنے کے سلسلے میں شبلی نے مقام کی کوئی شرط نہیں رکھی تھی۔ مگر بعض لوگ اسے شبلی کی تمام شرائط پر ترجیح دیتے ہیں۔ بہر حال دار الفکر کا بھی ایک مقام تو ہوتا ہے۔ ایک بزرگ بیت الخلا سے برآمد ہوئے تو اس ہیئت میں کہ ایک ہاتھ میں لوٹا اور دوسرے میں ۵۰۰ صفحے کا رجسٹر لیے تھے۔ بیت الخلا کے باہر ایک اور بزرگ دیر سے خلا میں جانے کے لیے قطار لگائے ہوئے قہر بر جانِ درویش کی مثال بنے کھڑے تھے۔ برآمد ہونے والے بزرگ کے ہاتھ میں رجسٹر دیکھ کر جل کے بولے حضرت پانی کم پڑتا ہے کیا؟ پہلے بزرگ نے متانت سے کہا: جواہر لال جی کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آبادی ساٹھ کروڑ ہے اور اتنے ہی یہاں مسئلے ہیں۔ دوسرے بزرگ نے پوچھا کہ مسئلہ کیا ہے؟ بولے اس موضوع پر تین گھنٹے سے نظم لکھ رہا تھا۔ دوسرے بزرگ نے خلا میں قدم رکھتے ہوئے کہا ارادہ ترک کر دیجیے، مجھے تو ابھی سے نظم سے بدبو آ رہی ہے۔

باوجودیکہ یہ بزرگ رجسٹر در بغل تھے، حکیم مجل خاں انھیں لکھنے والوں میں شمار نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ نظم کہی جاتی ہے لکھی نہیں جاتی۔ لہٰذا یہ حضرت کہنے والوں میں ہیں لکھنے والوں میں نہیں۔

دراصل کہنا بجائے خود ایک فن ہے اور آپ جانتے ہیں فنون کا جوڑ تہذیب سے ہے یعنی مہذب آدمی ہر فن ہوتا ہے، تہذیب نے کہنے کے لیے بھی شرطیں طے کر رکھی ہیں۔ دراصل آدمی مہذب ہو جاتا ہے تو پھر اسے کوئی اور کام رہتا نہیں، بیٹھ کر صرف قانون، ضابطے بناتا رہتا ہے۔ مصر میں تہذیب چوں کہ طویل ترین عرصہ تک سروں پر مسلط رہی اس لیے ضابطہ سازی میں مصری طاق ہوتے ہیں۔ ان سے ایک آلپن بھی مانگئے ہو تو تحریری درخواست کا مطالبہ کرتے ہیں اور پھر اس پر ایک فائل کھول دیتے ہیں۔ بہر حال بات ہو رہی تھی کہنے کی اور اس میں مصریوں کو یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ مرزا غالب البتہ چند کلیوں پر قناعت کر لیتے تھے۔ بس ساغر و مینا سامنے آتے ہی گل افشانیِ گفتار دکھلانے لگتے ہیں۔ انھی کے قبیلے کے ایک بزرگ ہمارے زمانے میں ہوئے ہیں جو محض یہ بات کہنے کے لیے امریکہ تک چلے گئے تھے کہ وہ شراب ہی تو پیتے ہیں، آدمی کا خون تو نہیں پیتے، یہ بڑے دل گردے کی بات ہے۔ آخر غالب بھی تو سؤر نہیں کھاتے تھے۔ سری نگر میں مجھے بھی ایک ایسے ہی جراءت مند صحافی ملے تھے۔

مقبول احمد ایک اردو روزنامہ کے ایڈیٹر تھے۔ ریختی کے شاعر جان صاحب کی اردو ان سے اچھی تھی، تو ایک دفعہ سرکار کو جوش آیا انھیں صحافیوں کے ایک طائفے کے ساتھ بمبئی کی سیر کے لیے بھیج دیا۔ ایک پنج تارہ ہوٹل میں کھانے سے پہلے شراب آئی۔ وہ بہت دن کے پیاسے تھے جی بھر کے پی۔ پھر کھانے پر وہی غالب کے آدھے اسلام کا دشمن ایک قاب میں رکھ کر انھیں بھی پیش کر دیا گیا پھر کیا تھا وہ ہتھے سے اکھڑ گئے اور بیرے کو لتاڑ پلائی کہ وہ بیچارہ مسلمان ہوتے ہوتے بچا۔ کہنے لگے: بدمعاش ہمیں سؤر کھلاتا ہے۔ جانتا نہیں ہم مسلمان ہیں اور وہ بھی

کشمیر کے۔

نہ جانے کتنی دیر ذہن کو ٹٹولا، یادوں کو آوازیں دیں، کونوں کھدروں میں پڑی ہوئی کتابوں پر دستکیں دیں اور ہر قسم کے لکھنے اور پڑھنے والوں سے پوچھا کہ اے گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے درویشو، کوئی موضوع دو، کچھ بتاؤ میں کیا لکھوں اور کس طرح ان دو فرشتوں کو ٹالوں۔ باغ و بہار عرف قصۂ چہار درویش کے مٹیالے صفحوں میں سے میر امن کی منحنی سی آواز آئی کہ تم کم بختوں نے علم دوست سرکار انگلیشیہ کی قدر نہ کی، اسے ٹکنے نہ دیا۔ ورنہ فرشتوں کی دست برد سے بچا کر تمہیں فورٹ ولیم کے تہہ خانے میں چھپا دیتا، نوکری دلواتا اور خود لکھنے کی تربیت دیتا۔ گل بکاولی نے بات کاٹی۔ بولی میری کہانی لکھ دے، محفل میں جان پڑ جائے گی۔ سید انیس الرحمن نے مشتبہ نگاہوں سے گھور کر دیکھا جس طرح میرے مضمون کا معاوضہ گول کر گئے تھے، اسی طرح چھپا کر ان کے بادام ہڑپ کرنے والوں میں میں بھی تو نہیں، ظ انصاری شیریں کی پانچویں منزل سے اتر کر آئے اور بولے: ظ انصاری، تم پر میرا قرض ہے، تم قد شناسی لکھو۔ ادھر شبلی کی نظر پڑی تو الفاروق کا درہ ہاتھ میں لے کر دوڑے کہ آ تجھے میں بتا دوں تو کیا لکھے گا۔

پھر تو وہاں وہ قلم چلے کہ میں نے بھاگ آنے میں عافیت دیکھی۔

تو صاحبو، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا لکھوں۔ اب فرشتے خوش ہوں کہ ناخوش، میں کچھ نہیں لکھتا۔ ●●

نسیم سحر (جدہ)

غزل

مذہب کا احترام کیے جا رہا ہوں میں
چائے کے کپ کو جام کیے جا رہا ہوں میں

میکے کے پاس دیر سے اس کا ہوں منتظر
برباد اپنی شام کیے جا رہا ہوں میں

پچپن کا میں ہوں اور وہ سولہ کی ہے مگر
بہرِ نکاح رام کیے جا رہا ہوں میں

کام آگئیں "بلیک منی" کی کمائیاں
اب خود کو نیک نام کیے جا رہا ہوں میں

آنکھوں کی بھوک ختم نہ ملّا کی ہو سکی
کیوں مرغیاں حرام کیے جا رہا ہوں میں

قسمت سیاہ تل کی جو دیکھی تو رشک سے
خود کو سیاہ فام کیے جا رہا ہوں میں

وہ یہ سمجھ رہے ہیں اڑاتا ہوں مکھیاں
کب سے انھیں سلام کیے جا رہا ہوں میں

کٹ جائے کچھ تو کوچۂ جاناں میں میرا وقت
غیروں سے بھی کلام کیے جا رہا ہوں میں

دل لے کے بھی جو ان کی تسلّی نہ ہو سکی
گردے بھی ان کے نام کیے جا رہا ہوں میں

اب اس زمیں میں کہہ نہ سکے گا کوئی غزل
سب قافیے تمام کیے جا رہا ہوں میں

کرکے مجھے سلام وہ جا بھی چکے نسیم
"وعلیکم السلام کیے جا رہا ہوں میں"

مختار یونس (مالیگاؤں)

آ کے بس جائیے دل کا یہ فلیٹ اچھا ہے
داخلے کے لیے آنکھوں کا یہ گیٹ اچھا ہے

تو مرے قلب میں شریان کے رستے آ جا
اپنے بیمار کو خوں کر دے ڈونیٹ، اچھا ہے

اوپلے آئیں گے دوکان سے مہنگا ہے تو کیا
جامِ جم سے یہ کلر ٹی وی کا سیٹ اچھا ہے

قوم کے غم کو کرپشن میں فرائی کر کے
ہضم کر جاتے ہیں نیتاؤں کا پیٹ اچھا ہے

دل کے کُوکر میں خیالی ہی پکاتا ہے پلاؤ
زندگی کے لیے بس ہاف پلیٹ اچھا ہے

ذات اونچی ہے مری تھوڑی سی نیچی کر دے
نقد کچھ لے لے، نہ دامن کو سمیٹ اچھا ہے

ہو گئے آہ! رقیبانِ سیہ رو سب فیل
پرچۂ عشق کیا حسن نے سیٹ اچھا ہے

رات دن اشکوں کی برسات سے کیچڑ ہوگا
سامنے رکھ لے اسے مختار بکیٹ اچھا ہے

بلبل کاشمیری (لندن)

الکشن نامہ

الکشن ہو تو زرداروں کی زرداری نہیں جاتی
یہ جنگِ زرگری ہے جو کبھی ہاری نہیں جاتی

ضرورت پر گدھے کو باپ کہنا ٹھیک ہوتا ہے
الکشن میں گدھوں کی نازبرداری نہیں جاتی

الکشن میں سڑک بنتی ہے گاؤں میں مگر فرضی
جہاں رہرو نہیں چلتے۔ جہاں لاری نہیں جاتی

الکشن میں فلک پر بستیاں تعمیر ہوتی ہیں
زمیں پر "آرزوئے چار دیواری" نہیں جاتی

الکشن میں وہی نوٹوں سے ووٹوں کی تجارت ہے
کبھی ایماں فروشوں کی خریداری نہیں جاتی

الکشن کے نشے میں چور رہتے ہیں متوالے
یہ مت سمجھو کہ مت والوں کی مت ماری نہیں جاتی

ڈنر کھاتے ہیں لیڈر لوگ اس کا غم نہیں کھاتے
الکشن میں مگر ووٹر کی غمخواری نہیں جاتی

الکشن میں عداوت بھی سفر کرتی ہے ریلوں میں
جہازوں سے خباثت کی وہ بمباری نہیں جاتی

الکشن میں نئے فیشن کی گالی وضع ہوتی ہے
جو آدھی کان میں جاتی تو ہے ساری نہیں جاتی

الکشن میں تو الزامات کی کیچڑ اچھلتی ہے
حریفوں پر غلاظت کی گراں باری نہیں جاتی

الکشن میں وطن دشمن بری ہوتے ہیں جیلوں سے
بری ہو کر بھی غداروں کی غداری نہیں جاتی

بدل جاتے ہیں بیلٹ بکس ہاتھوں ہاتھ لمحوں میں
یہ ہاتھوں کی صفائی اور فنکاری نہیں جاتی

کبھی جبہ پہنتے ہیں کبھی برقع پہنتے ہیں
فریبی ووٹروں کی بھی اداکاری نہیں جاتی

کھلے بازار میں چیزیں بکیں گی یہ بھی دعویٰ ہے
مگر بازار سے یہ چور بازاری نہیں جاتی

الکشن میں کوئی وعدہ وفا ہوتے نہیں دیکھا
مگر لیڈر سے ووٹر کی وفاداری نہیں جاتی

الکشن میں ادھر جب دھاندلی کی بات ہوتی ہے
ادھر اخبار میں تردیدِ سرکاری نہیں جاتی

ادھر فتح و ظفر کی تاج پوشی کے نظارے ہیں
ادھر ناکامیوں کی ذلت و خواری نہیں جاتی

رگوں میں خون فاسد ہے بدن ناسور سے زخمی
یہ انڈو پاک کی دیرینہ بیماری نہیں جاتی

عابد معز
(ریاض)

ہم نے گواہی دی

چھٹی کا دن تھا ہم گھر پر بیٹھے بور ہو رہے تھے بوریت دور کرنے کے لئے دو ڈبی سگریٹ پھونک چکے تھے۔ گھر پر سگریٹ کا اسٹاک ختم ہوا تو ہم بازار سے سگریٹ لانے کے لئے گھر سے باہر نکلے۔ گھر کے سامنے لوگوں کا جمگھٹا نظر آیا۔ دریافت کیا تو پتہ چلا کہ بچوں کی شرارت بڑوں کی لڑائی بن گئی ہے۔ ہمارے پڑوسی شرافت شریف صاحب کا مقابلہ محلہ کے لڑاکو خاں پہلوان سے چل رہا ہے۔ لڑائی تو تو میں میں تک محدود تھی۔ ابھی ہاتھا پائی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ زبانی لڑائی میں بھی لڑاکو خاں پہلوان کا پلڑا بھاری تھا۔ موصوف گالی گلوج ایسے کر رہے تھے جیسے ان کی مادری زبان یہی ہے۔ شرافت شریف صاحب کو عزت، شرافت اور اخلاق نے جکڑ رکھا تھا۔ لڑاکو خاں پہلوان کو گالیوں کے علاوہ سیدھی بات کرنا آتا نہ تھا۔ انھوں نے ایسی گالیاں دیں جنھیں ہم نے اپنی زندگی میں پہلی بار سنا۔ شرافت شریف صاحب کا پیمانہ صبر لبریز ہوا۔ غصہ میں کانپنے لگے۔ آستین چڑھائی۔ چپل چھوڑی گھڑی اور عینک اتار کر بچے کے حوالے کیا اور لڑاکو خاں پہلوان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ ہم نے انھیں روکا۔ دیگر پڑوسیوں نے انھیں جکڑا۔ پھڑ پھڑاتے ہوئے شرافت شریف صاحب کہنے لگے "مجھے چھوڑ دیجئے صاحب میں اسے مزا چکھاؤں گا۔" ہمیں یقین تھا کہ ہاتھا پائی ہوگی تو لڑاکو خاں پہلوان ان کا سر مربنا دے گا۔ ہم انھیں سمجھانے لگے "آپ لڑائی کیا جانیں یہ پیشہ ور لڑاکو ہے۔ صبر کیجئے اور اپنے آپ کو سنبھالئے۔" شرافت شریف صاحب نے ڈھیلے پڑتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "آپ نے سنا نہیں وہ کیسی نازیبا باتیں کر رہا ہے۔ اس بے عزتی سے تو بہتر ہے کہ لڑ کر ختم ہو جاؤں" ہم نے معاملہ کی سنجیدگی کو سمجھتے ہوئے کہا "ہم ہیں آپ کے دشمن۔ قانون آپ کی حفاظت کے لئے موجود ہے۔ آپ ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ کیجئے" شرافت شریف صاحب نے معمول ہوتے ہوئے پوچھا "گواہی کون دے گا" ہم نے کہا "ہم بھی دیں گے" اس جملہ کے بعد ہم نے دیکھا دوسرے لوگوں نے جو شرافت شریف صاحب کو تھامے ہوئے تھے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ شرافت شریف صاحب کے ساتھ ہم تنہا رہ گئے۔ ہم نے انھیں یقین دلایا کہ کوئی اور گواہی دے یا نہ دے ہم ضرور آپ کا ساتھ دیں گے"۔

باہر ہنگامہ سے نمٹنے کے بعد گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا بیوی محاذ کھولے بیٹھی ہیں۔ کہنے لگیں "اب آپ ہی ایک فوجدار بچے ہیں۔ بیچ بچاؤ کیا۔ نیکی کی لیکن اب گواہی دیں گے۔ کبھی عدالت کی سیڑھیاں چڑھی ہیں۔ کیا شرفاء عدالت جاتے ہیں" ہم سوچنے لگے عدالت کی سیڑھیاں تو دور عدالت کے قریب جانے سے بھی ہمیں ڈر ہوتا ہے۔ لڑائی مار دھاڑ چوری ڈکیتی، رہزنی، قتل و غارت گری جیسے واقعات پر بحث و مباحثہ اور سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لئے قابل لوگوں کی بھرمار ہے۔ ہمیں خوف ہونے لگا کہ اگر ہمیں گواہی دینی پڑی تو کیا ہوگا۔ غیرت نے للکارا۔ اگر امن پسند شریف شہری ایک دوسرے

کی مدد نہ کریں تو کیا دنیا میں امن و امان ہوگا۔ اگر ہم خاموش رہے تو آج پڑوسی کی عزت پر حملہ ہوا ہے۔ کل ہماری باری ہوگی۔ گواہی تو دینی ہے۔ سچ کہہ کر کون سا زہر کا پیالہ پینا یا سولی پر لٹکنا ہے۔ اپنے آپ کو ہمت دلانے کے باوجود بھی ہم پر ایک خوف سا طاری تھا۔ ہم شرافت شریف صاحب سے ملنے سے کترانے لگے۔ وہ ایک مرتبہ ہمارے گھر بھی آئے ہم نے سچ کہنے سے باز رہنے کے لئے جھوٹ کہلوایا کہ ہم گھر پر نہیں ہیں" ایک مرتبہ شرافت صاحب نے ہمیں پھانس لیا اور کہنے لگے کہ آپ کے کہنے پر میں نے ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ آپ کو گواہی دینی ہے۔"

گھر پر ہمارے نام سمن آیا۔ کانپتے ہاتھوں سے وصول کیا۔ بیوی کی آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے کہ ان کی قسمت میں یہ دن دیکھنا بھی لکھا ہے۔ ہم نے ڈھارس بندھائی اور گواہی دینے کے لئے تیاری کرنے لگے۔ کتابیں پڑھیں، دوستوں سے مشورہ کیا۔ وکیل سے رجوع ہوئے فیس دے کر وکیل نے گواہ اور گواہی پر روشنی ڈالی۔ گواہی دینے کے اہم نکات اور پینترے بتائے۔ مقررہ دن ہم نے امام ضامن بندھوایا اور گواہی دینے عدالت گئے۔ عدالت کی سیڑھیوں پر ہی ہمیں اختلاج ہونے لگا۔ ڈھیر سارے کالے گون دیکھ کر پسینہ چھوٹنے لگا۔ محسوس ہوا تمام وکلاء ہمارے فریق کی جانب سے ہیں جوں توں کر کے ہم اس اجلاس پر پہنچے جہاں شرافت شریف صاحب کی عزت داؤ پر لگی تھی۔ ہماری نظر لڑاکو خاں پہلوان سے ملی۔ وہ ہمیں گھور رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں "باہر نکل دیکھ لوں گا" عدالت کی کاروائی جاری تھی ہمیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہمارا نام پکارا گیا۔ کسی نے ہمیں اٹھایا اور کٹہرے کی جانب چلنے کے لئے دھکیلا۔ کٹہرے میں پہنچنے سے پہلے ہی ہماری حالت غیر ہوئی اور ہم میز پر رکھی ہوئی قانون کی کتابوں پر گر پڑے حواس بجا ہوئے تو پتہ چلا کہ پیشی ملتوی کر گئی ہے۔

اگلی پیشی تک کے لئے ہمیں خاصا وقت ملا۔ ہم اپنے دل سے عدالت کا خوف دور کرنے کے لئے کئی مرتبہ عدالت گئے۔ دوسرے مقدموں کی کاروائیوں کو سنا۔ پیشہ ور گواہوں کو دیکھا اور سنا۔ ان سے بہت کچھ سیکھا۔ شرافت شریف صاحب ہماری طرف سے پریشان تھے۔ وہ ہمیں ان کے وکیل کے پاس لے گئے۔ وکیل ہمیں دیکھ کر کہنے لگے۔ گواہی دینا ان کے بس کا روگ نہیں۔ میں گواہوں کا انتظام کر لوں گا" ہم نے کہا کہ ہم خود گواہی دیں گے۔ وکیل نے پوچھا "آپ کیا کہیں گے" ہم نے کہا "وہی جو ہم نے دیکھا سنا اور محسوس کیا ہے۔" وکیل نے سوال کیا"

"کیا آپ کو چھ ماہ قبل کا واقعہ یاد ہے۔ جو کچھ ہوا تھا بھول جائیے بلکہ آپ بھول گئے ہوں گے میں جو کہوں اس طرح بیان دیجئے ہمیں مقدمہ جیتنا ہے۔"

ملتوی شدہ پیشی کا دن آپہنچا۔ شرافت شریف صاحب ہمیں ساتھ لیکر عدالت پہونچے۔ اس مرتبہ ہم نے عدالت کی سیڑھیاں سکون سے چڑھیں۔ کمرہ انصاف میں داخل ہوئے دیکھا منصف اونچی کرسی پر براجمان ہیں ان کے سامنے میدان کارزار لگا ہے دو کا بحث کٹہروں میں ملزمین اور گواہ وکلاء کے مددگار، عدالت کے لوگ، پولیس اور حریفین اور حریفین کے ہمنوا۔ اتنے لوگوں کی موجودگی اور شور شرابہ کے درمیان مقدموں کی کاروائی جاری ہے۔ ہر مقدمہ پر کچھ دیر بحث ہوتی اور پھر مقدمہ اگلی پیشی کے لئے ملتوی ہو جاتا شرافت شریف صاحب کا مقدمہ پیش ہوا اور ہمارا نام پکارا گیا۔ ہم بغیر کسی مدد کے اٹھے اور عدالت کے کٹہرے میں جا کھڑے ہوئے۔ لڑاکو خاں پہلوان اور ان کے وکیل پر نظر پڑی تو کچھ خوف سا لگا لیکن جلد ہی ہم نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ سچ اور صرف سچ بولنے کے لئے ہمیں قسم دلائی گئی۔ خوشی ہوئی کہ اس دارِ فانی میں ایک جگہ تو ہے جہاں سچ بولنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ سچ کہنے کی قسم دلانے کے بعد شرافت شریف صاحب کے وکیل اٹھے، اپنا کالا گون ٹھیک کیا اور ہم سے

سوالات کرنے لگے نام، عمر اور پیشہ پوچھا۔ ہماری دماغی صحت کا اندازہ کرنے کے لئے تاریخ، دن اور وقت پوچھا، تاج محل بنانے والے کا نام دریافت کیا اور اس ملک کا نام بتانے کو کہا جس میں دریائے نیل بہتی ہے۔ شرافت شریف صاحب کی جانب اشارہ کرکے پوچھا "کیا آپ انھیں پہچانتے ہیں" ہم نے کہا "ہاں یہ ہمارے پڑوسی ہیں" جواب کے بعد وکیل نے واقعہ کی روداد بیان کرنے کے لئے کہا۔ ہم پہلے ہی سے تیاری کر چکے تھے "فرفر سنا دیا جیسے کوئی بچہ "ایک کوا پیاسا تھا" والی کہانی سناتا ہے وکیل صاحب کہنے لگے، "آپ نے عدالت کو بتایا کہ ملزم نے شرافت شریف صاحب کو گالیاں دیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ گالیاں کیا تھیں؟ ہم تذبذب میں پڑ گئے وکیل صاحب نے اپنا سوال دہرایا۔ ہم نے جواب دیا "ہم گالیاں کیسے بتائیں۔ یہ اچھی تو ہیں نہیں کہ انھیں ہر کسی کو سنایا جائے۔ وکیل نے کہا "عدالت جانتی ہے گالیاں خراب ہوتی ہیں ہمیں بھی معلوم ہو کہ وہ کونسی گالیاں ہیں جنھیں سن کر شرافت شریف صاحب مرنے مارنے بلکہ آپ کی دانست میں خودکشی کر لینے پر آمادہ ہو گئے کیا یہ حقیقت میں گالیاں ہیں؟ کیا ان کو سن کر شرافت شریف صاحب کا انتہائی قدم اٹھانا ٹھیک تھا"۔ ہم نے اس سوال کو آخری سوال جان کر زندگی میں پہلی اور آخری بار گالیاں چننے کا قصد کیا؟ پھر خیال آیا کہ معززین گالیاں سنتے ہوئے کیا سوچیں گے۔ ہم پس وپیش میں تھے کہ ہمیں وقت ضائع نہ کرنے کی تاکید کردی گئی۔ ہم نے آنکھیں بند کئے گردن جھکائے۔ کانوں میں انگلیاں ٹھونسے وہ گالیاں سنائیں جو ہم نے لڑاکو خاں پہلوان سے سنی تھیں۔ گالیاں سننے کے بعد وکیل نے کہا "اب مجھے کچھ نہیں پوچھنا ہے"

ہم کٹہرے سے واپس جانا چاہتے تھے کہ ہمیں روک لیا گیا۔ مخالف وکیل کی جرح باقی تھی۔ لڑاکو خاں پہلوان کے وکیل ہمیں گھورتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھے اور ہمارے قریب پہنچ کر سوال کیا "کیا نام بتایا تھا آپ نے" ہم نے اپنا نام بتا دیا۔ انھوں نے جرح کا آغاز کیا "آپ نے میرے فاضل دوست کے سوال کے جواب میں کہا کہ آپ ادیب ہیں یعنی تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ہم خوش ہوئے اور جھوم کر کہا "جی" وکیل نے سوال کیا "کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کا بیان کردہ واقعہ آپ ہی کی تخلیق ہو میرے خیال میں یہ آپ کے نئے افسانے کا پلاٹ ہے۔ حقیقت سے اس کا تعلق نہیں ہے" ہم چیں بچیں ہوئے اس سوال نے ہمیں اس سوال کی یاد دلائی جو ہم سے اکثر کیا جاتا ہے "آپ افسانے اور کہانیاں کیسے لکھتے ہیں؟ بلا مختصر جواب ہوتا "ہم حقیقت کی بنیاد پر افسانے اور کہانیاں لکھتے ہیں" لیکن محسوس ہوا وکلاء وہ قابل اشخاص ہیں جو حقیقت کو افسانہ ثابت کرنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ ہم نے وکیل سے سوال کیا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وکیل کہنے لگے، "بہت آسانی سے آپ اپنی صلاحیتوں کو میرے باعزت موکل کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ کاغذ کالا کرنے کے بجائے اپنی تخلیق کو عدالت میں سنا دیا" ہمیں حیرت ہوئی کہ لڑاکو خاں پہلوان کو جس سے سارا محلہ پریشان رہتا ہے۔ وکیل "باعزت" بتا رہے ہیں۔ ہم نے بے بسی سے شرافت شریف صاحب کے وکیل کی طرف دیکھا۔ انھوں نے کہا "معزز گواہ قسم لے چکا ہے کہ وہ سچ بولے گا۔ اس کے بیان کو جانچنے کے سوالات کئے جائیں نہ کہ اس کے بیان کو سرے سے غلط کہہ کر ہراساں کیا جائے۔ شرافت شریف صاحب کے وکیل کا اعتراض قبول کر لیا گیا۔ وہ اپنے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ سجائے اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

وکیل مخالف کو غصہ آیا "اپنے گون کے کنارے کھینچتے ہوئے جیسے ہمارے کان کھینچ رہے ہوں کہا "اچھا تو آپ نے فلاں تاریخ کو دیکھا کہ لڑاکو خاں پہلوان نے اپنے پڑوسی کو گالیاں دیں" ہم نے اثبات میں "جی ہاں" کہا۔ وکیل ہم پر حملہ آور ہوئے "گالیاں سنتے ہیں گالیوں کو کھا سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں سچ بتائیے آپ نے کیا دیکھا" ہمیں بھی غصہ آیا۔ آخر ہم ادیب ہیں۔ موضوع قائم رکھتے ہوئے الفاظ بھی بدل سکتے ہیں۔ ہم نے جواب دیا "ہم نے دیکھا لڑاکو خاں پہلوان کے ہونٹ ہل رہے تھے"

پل رہے تھے۔ کبھی دانت بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ساتھ میں وہ اپنے ہاتھ بھی نچا رہے تھے۔ ان حرکات سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہہ رہے ہیں۔ وکیل نے حکم دیا۔ "انھوں نے کیا کہا سنا دیجئے" یعنی ہمیں پھر وہی گالیاں دہرانی تھیں۔ ہم خاموش رہے۔ ہماری خاموشی کا فائدہ وکیل نے یوں اٹھایا "اس کا مطلب ہوا کہ لڑاکو خاں پہلوان خاموش تھے" ہم نے احتجاج کیا "نہیں وہ گالیاں بک رہے تھے"۔ وکیل نے ہمیں زیر کرنا چاہا۔ "پھر آپ خاموش کیوں ہو گئے تھے۔ ہم نے طیش میں آکر گالیاں سنائیں۔ وکیل غور سے گالیاں سنتے رہے ہم خاموش ہو گئے تو فرمایا۔ اس مرتبہ دو نئے الفاظ کا اضافہ ہے" ہم نے دل میں کہا یہ فیاضی آپ کے لئے ہے وکیل نے جرح جاری رکھی۔ حیرت ہے آپ انھیں گالیاں سمجھتے ہیں اور آپ کے بیان پر مجھے افسوس ہوتا ہے

۔۔۔ کہ کوئی انھیں سُن کر خودکشی کرنے تیار ہو سکتا" جی میں آیا کہ کہہ دیں۔ آپ یہ کہتے ہیں۔ لڑاکو خاں پہلوان گالیاں نہیں دے رہے تھے" ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے تھے ان الفاظ سے انسانیت کی توقیر ہوتی ہے۔ لیکن صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے اپنے بیان پر قائم رہے۔ یقیناً وہ گالیاں تھیں اور ان سے کسی کی عزت میں کمی ہوتی ہے وکیل نے ہمیں پریشان کرنے کے لئے کہا "میں ایسا نہیں سمجھتا" ہمارے دل نے چاہا کہ ان سے کہیں۔ یہ آپ کی گالیاں نوازی ہے ورنہ لڑاکو خاں پہلوان کس قابل۔ ہمارے جواب دینے سے پہلے شرافت شریف صاحب کے وکیل اعتراض لئے اٹھ کھڑے ہوئے "یہ فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے کہ لڑاکو خاں پہلوان کے ارشادات گالیاں ہیں یا نہیں میرے فاضل دوست کے سمجھنے اور سمجھانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میرے گواہ کو پریشان نہ کیا جائے" اس مرتبہ شرافت شریف صاحب کے وکیل کا اعتراض قبول کیا گیا اور مخالف وکیل کو احتیاط سے کام لینے کی تاکید ہوئی۔

ہدایت کے باوجود وکیل نے اپنے انداز سے جرح جاری رکھی" آپ نے اپنے بیان میں بتایا کہ لڑاکو خاں پہلوان کی باتیں بقول آپ کے گالیاں سُنکر شرافت شریف صاحب اپنے فریق پر حملہ کرنے گئے۔ سوچ کر بتائیے۔ عین ممکن ہے کہ شرافت شریف صاحب اپنے مخالف پر حملہ آور ہونے کے بعد میرے موکل نے صلواتیں سنائیں ہوں گی۔ ہم وکیل کے ارادوں کو بھانپ چکے تھے۔ ہم ان چکموں میں آنے والے نہیں تھے۔ ہم نے جواب دیا" وکیل صاحب لڑاکو خاں پہلوان نے شروعات ہی گالیوں سے کی۔ گالیاں سنکر شرافت شریف صاحب لڑنے مرنے کو تیار ہو گئے لیکن ہم نے انھیں روک دیا" اس سوال پر" آپ نے کیوں روکا" ہم نے لاپرواہی سے جواب دیا" "امن و امان قائم رکھنا ہر شہری کا فرض ہے اور یوں بھی شرافت شریف صاحب کی زندگی ہمیں عزیز ہے" وکیل نے سوال کیا" جب آپ شرافت شریف صاحب کو لڑنے سے روک سکتے تھے تو آپ نے لڑاکو خاں پہلوان کو زبان چلانے سے کیوں نہیں روکا" ہم نے کہا "ہمارے بس میں جو کام تھا وہ ہم نے انجام دیا" ایک مرتبہ پھر لڑاکو خاں پہلوان کے وکیل کو غیر ضروری سوالات سے پرہیز کرنے کیلئے ہدایت ملی۔ ہم سوچنے لگے۔ اگر وکیل غیر ضروری سوالات سے گواہوں کو پریشان نہ کریں تو انھیں اپنے بیان سے کیسے انحراف کروا سکتے ہیں اور پھر ان سوالات کا مقصد ہوتا ہے کہ گواہ کو سچ بولنے کی قسم دلا کر اپنے مطلب کی باتیں اگلوا لیں۔

لڑاکو خاں پہلوان کے وکیل خاموش ہوئے ہم شش و پنج میں مبتلا کہ اب کیا ہونے والا ہے بے بسی سے کبھی شرافت شریف صاحب کے وکیل کو دیکھتے تو کبھی چور نگاہوں سے منصف کا جائزہ لیتے کہ سرکار کے کیا ارادے ہیں۔ کچھ دیر کی خاموشی کو منصف نے توڑا "کیا آپ کو مزید سوال کرنا ہے؟" لڑاکو خاں پہلوان کے وکیل ہمیں گھورتے ہوئے اٹھے، راستہ کے اسٹول کو پاؤں سے دھکیلا ہم "جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو" وظیفہ کا ورد کرنے لگے وہ قریب آئے کٹہرے کی لکڑی پر ہاتھ مارا اور کہا "اچھا بتلائیے" خاموشی سے کچھ سوچنے لگے۔ اور کہا "مجھے آپ سے کچھ نہیں پوچھنا ہے۔ آپ جا سکتے ہیں۔ ہم تیر کی طرح عدالت سے نکلے اور سیدھے گھر پہونچے۔ پیچھے پلٹ کر تک نہیں دیکھا۔ ناگاہ کہیں پھر گواہی دینے کے لئے بلا لئے جائیں۔ ●●

محمد برہان حسین
(حیدرآباد)

سِنشُو والے

شرفو میاں نے پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کرلیا تھا، جی ہاں یہ کوئی تیس[30] پینتیس[35] سال پرانی بات ہے.. ان کے پاس ہونے پر اُن کے والد صاحب نے خوشی کا اظہار کیا تھا، پھر آہ بھر کر کہا تھا "افسوس! اس امتحان کا معیار کس قدر گر گیا ہے۔"

شرفو میاں کے سامنے سے اب بے روزگاری کا سین اس طرح ہٹ گیا تھا جیسے سینما کے پردے پر سے اشتہار کے سلائیڈ ہٹ جاتے ہیں۔ اب دوسرا سین تھا کہ نوکری کہاں ملے گی..... یعنی کس ضلع پر رہنا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے آندھرا پردیش کا نقشہ خریدا اور ان اضلاع کو نشان زد کیا جس میں قیام پر انھیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ باقی اضلاع میں سے انھوں نے دو ایسے اضلاع چنے یعنی عادل آباد اور سریکاکولم جہاں وہ قطعاً نہیں رہنا چاہتے تھے۔

والد صاحب نے آواز دی "بھئی کیا کر رہے ہو کمیشن کے دفتر جاکر دیکھو، تمھاری تعیناتی کہاں ہو رہی ہے.... خواب خرگوش میں پڑے رہو گے تو کہیں وہ تمھیں کسی الٹی سیدھی جگہ نہ پٹک دیں۔"

شرفو میاں نے اپنی فہرستیں پیش کیں تو والد صاحب نے کہا۔ "پتہ نہیں تمھارے بارے میں میرا ہمیشہ ایسا خیال کیوں رہا ہے کہ تم کند ذہن اور بے وقوف ہو۔"

لیکن شرفو میاں بالکل اس خرگوش کی طرح سو گئے جس نے کچھوے سے مات کھائی تھی۔ یعنی انھوں نے سوچا "۲۱ میں سے صرف دو اضلاع انھیں ناپسند ہیں تو کیا ضروری ہے کہ انھیں وہیں تعینات کیا جائے۔ اسمٰعیل میرٹھی نے لکھا تھا":

حیف خرگوش رہ گیا سوتا
ثمرہ غفلت کا اور کیا ہوتا

اور کھلی جب آنکھ تو شرفو میاں نے دیکھا کہ ان کو واقعی عادل آباد میں تعیناتی دی گئی تھی۔ شرفو میاں عادل آباد میں آرام سے تھے لیکن انھیں شہر حیدرآباد کے ندی نالوں کی بدبو، ابلتے ڈرینج کے مین ہول، کچرے کے ڈھیر، سینما کی قطاروں میں دھکم دھکے، کالج کے لڑکے، لڑکیاں، کالجوں کے نااہل استاد بہت یاد آتے تھے۔ اور وہ ہر ہفتے عشرہ میں بغیر اجازت حیدرآباد آجاتے تھے۔

اس طرح ان کا کام جب کا توں پڑا رہتا۔ آفیسر بے چارہ پورا کام تو کر نہیں سکتا تھا۔ البتہ جن سے رشوت یا کمیشن لیا ہوتا اس کا کام شرفو میاں کو غائبانہ گالی گلوج کرکے انجام دے ہی دیتا۔ وہ بے چارہ بھی مجبور تھا ایک تو شرفو میاں

پبلک سروس کمیشن کے کامیاب امیدوار تھے جنھیں نوکری سے نکالا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ دوسرے وہ ریاست کے سب سے پچھڑے ہوئے ضلع میں تعینات تھے جہاں سے بطور سزا کہیں اور بدلی بھی ممکن نہیں تھی۔ پھر بھی اس نے ڈائرکٹر کو لکھا کہ شرفو میاں کی لاپرواہی اور نااہلی کی کچھ تو سزا دی جائے۔ لیکن ڈائرکٹر نے جواب دیا کہ خود آفیسر کو بطور سزا عادل آباد بھیجا گیا تھا۔ اب اگر وہ تحتیوں کی شکایت کرے گا تو اس پر اس سے کام نہ لے سکنے کا الزام آجائے گا اور ہو سکتا ہے اس کو جبری ریٹائر کر دیا جائے۔

شرفو میاں جب بھی عادل آباد جاتے تو بس گھنے جنگلوں اور پہاڑوں میں سے ہو کر جاتی' وہ سوچتے کہ اتنے جنگلوں اور خطرناک پہاڑوں کو چھوڑ کر کے لگ عادل آباد میں کیوں جا بسے پھر خیال آتا شاید انھیں بھی غفلت میں پکڑ کر وہاں لا چھوڑا گیا ہو۔

ایک دفعہ ایک خطرناک موڑ پر ساتھی مسافر نے ان سے کہا " دیکھیے یہ ہیرپن بنڈ ہے۔"

شرفو میاں نے اسے حیرت سے دیکھ کر کہا " آپ کو بس میں سے سڑک پر پڑا ہوا ہیرپن نظر آرہا ہے..... اور اس کا بنڈ BEND بھی' وہ مسافر ہنسا۔ آپ پڑھے لکھے آدمی نظر آتے تھے اس لیے یہ ٹرم TERM میں نے استعمال کی تھی۔ اس کا مطلب ہوتا ہے ایسا موڑ جو ہیئرپن کے خم کی سمت میں آجاتا ہے۔

شرفو میاں حیدرآباد آتے تھے صرف دو دن کے لیے لیکن کبھی وہ دس دن سے پہلے نہیں لوٹ سکتے تھے کیوں کہ دو دن کے ختم پر دو دن اور ڈ صبح کی جاتی پھر سوچا جاتا کہ صبح پانچ بجے کی بس پکڑی جائے تاکہ شام سے پہلے عادل آباد پہنچ کر اس دن کی حاضری بھی پوری کی جائے اس کے لیے چار بجے صبح اٹھنے کی کوشش کی جاتی اور اس میں تین دن لگ جاتے آخر طے پاتا کہ رکشہ والے سے کہہ دیں کہ وہ صبح انھیں اٹھا کر بس اسٹانڈ لے جائے اور رکشہ والا بھی دو دن کی کوشش کے بعد کامیاب ہوتا۔

ایک دن آفیسر کے پی اے نے رجسٹر پر دستخط لے کر ایک لفافہ ان کے حوالے کیا۔ اس میں لکھا تھا کہ آفیسر کی رپورٹ کی بنیاد پر ڈائرکٹر نے ازراہ مہربانی شرفو میاں کو اور ان کے ساتھی مہندر ناتھ کو سنشور SENSURE ایوارڈ کیا ہے۔

دونوں نے ایک دوسرے سے سنشور کے معنی پوچھے۔ معلوم نہ ہونے پر شرفو میاں نے جھنجلا کر کہا " سالے یہ الفاظ کہاں سے آتے ہیں۔ پتہ نہیں۔ ہم پندرہ پندرہ سال تک اسکول اور کالج میں پڑھتے ہیں لیکن کبھی ایسے الفاظ نہ کتابوں میں نظر آتے ہیں نہ ہی سننے میں آتے ہیں

مہندر نے کہا۔ مگر یار۔ اس کے ساتھ ایوارڈ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی انعام قسم کی چیز ہے۔

شرفو میاں نے کہا " ہم کو ایوارڈ؟! تجھے بھی خوب سوجھی میاں۔ مہندر نے کہا " ارے اپنا افسر بہت شریف آدمی ہے اور خود سند یافتہ بدمعاش ہے..... میرا مطلب ہے وہ خود سند کے طور پر یہاں ہے سوچا ہوگا کہ نوجوان لڑکے ہیں اس کے لڑکوں کے برابر کیوں ان کا کیریر خراب کروں اور شاید ہم انعام پا کر خود کو سدھار لیں گے۔"

شرفو میاں " واقعی یار! ہمیں اس شریف انسان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے........ کہیں اس کی نظر تجھ پر دامادی کے لیے تو نہیں ہے...... خیر چلو پہلے شکریہ تو ادا کردیں۔ مہندر ناتھ نے بڑی لجاجت سے کہا " سر ہم اس ایوارڈ کے لیے پہلے آپ کا شکریہ ادا کرنے حاضر ہوئے ہیں پھر ڈائرکٹر صاحب کو بھی شکریہ اور احسان مندی کا خط لکھیں گے۔"

شرفو میاں نے سلسلہ جاری رکھا " اور سر! یہ انعام ہم کو محض آپ کی مہربانی سے ملا ہے ورنہ ہم نے تو شرارتوں اور نافرمانیوں سے آپ کو بہت پریشان کیا تھا۔ لیکن سر اب ہم پوری محنت اور خلوص سے کام کریں گے۔"

مہندر ناتھ نے کہا: "سر! آپ کی خاندانی شرافت، بردباری، بلند حوصلگی اور رحم دلی کے ہم لوگ قائل ہو گئے۔ سر! پتہ نہیں آپ جیسے کوہِ نور کو اس ضلع پر کیوں رکھا گیا ہے۔ آپ کو تو ڈائرکٹوریٹ بلکہ سکریٹریٹ یا سنٹرل سکریٹریٹ میں ہونا چاہیے تھا۔"

شرفو میاں نے کہا "حیرت ہے سر۔ UNO آپ کی خدمات کیوں MISS کر رہی ہے۔"

دونوں بغیر وقفہ دئیے بولے جا رہے تھے کہ آفیسر نے انھیں روکا، دونوں کے ہاتھوں سے کاغذات لیتے ہوئے پی اے کو بلوایا پھر دونوں کو باہر انتظار کرنے کے لیے کہا۔

آفیسر نے پی اے سے کہا "ارے مسٹر! ان لڑکوں کو یہ کاغذات دیتے وقت آپ کو سمجھانا چاہیے تھا کہ سنشور کیا ملا ہے۔ ان کو تو اس لفظ کے معنی ہی نہیں معلوم۔"

پی اے نے کہا: "بس سر! ان لوگوں نے ڈکشنری مانگی تھی مگر سر! ڈکشنری تو آپ سے پہلے کے آفیسر صاحب اپنے لڑکے کے لیے گھر لے گئے تھے اور لوٹایا ہی نہیں۔ یہاں تو ایک سے بڑھ کر ایک آتے ہیں نا۔ معاف کرنا صاحب۔"

آفیسر "یہ لڑکے سنشور کو انعام سمجھ رہے ہیں اور میرا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا مجھے پہلا سنشور ملا تھا تو میں نے مٹھائی بانٹی تھی۔"

جب پی اے نے معنی سمجھائے تو دونوں برہم ہوئے اور آفیسر سے کہا: "سر! آپ ہم کو ٹرانسفر کر دیجیے۔"

آفیسر نے کہا "دیکھو ینگ مین! عادل آباد آنے کے لیے کام چوری، لاشوری کرنی پڑتی ہے۔ لیکن یہاں سے جانے کے لیے اعلیٰ کارکردگی کی ضرورت ہے۔ گڈ لک، میں نے سنا ہے محکمہ میں کئی لوگ عادل آباد ٹرانسفر کے قابل قرار دیئے گئے ہیں۔"

اسمٰعیل ظریف (حیدرآباد)

شہر میں

ایک ہنگامہ بپا ہے شہر میں
جانے یہ کیا ہو رہا ہے شہر میں

اب کہاں شرم و حیا ہے شہر میں
بے حیائی کی وبا ہے شہر میں

حسن ہے بے باک اب فٹ پاتھ پر
عشق بھی بھٹکا ہوا ہے شہر میں

جا کے پبلک گارڈن میں دیکھیے
کیا تماشا ہو رہا ہے شہر میں

اُن کو اسکوٹر پہ پیچھے دیکھ کر
کوئی پیچھا کر رہا ہے شہر میں

دل کا سودا ہو رہا ہے روڈ پر
یہ بھی دھندا چل رہا ہے شہر میں

نمبری نکلا ہے بیٹا شیخ کا
روز سٹہ کھیلتا ہے شہر میں

گاؤں والی بیوی جل کر مر گئی
عقد بیوہ سے ہوا ہے شہر میں

کالے دھندوں کا ہے جو ماہر حضور
اس کا طوطی بولتا ہے شہر میں

گاؤں میں چھپر نہ تھا ذاتی کوئی
اس کا گھر چھ منزلہ ہے شہر میں

کل جو پاپڑ بیلتا تھا روڈ پر
اس کا اب ہوٹل سجا ہے شہر میں

کار میں بے کار پھرتا ہے کوئی
کوئی رکشا ہانکتا ہے شہر میں

آج بھی مرغے لڑاتا ہے کوئی
کوئی بلبل پالتا ہے شہر میں

نسل تو امراض میں ہے مبتلا
اب طبیبوں کا بھلا ہے شہر میں

فرق ہے کھوٹے کھرے میں اب کہاں
کھوٹا سکہ چل رہا ہے شہر میں

ان دنوں اندھوں کی بستی میں ظریف
کوئی چشمے بیچتا ہے شہر میں

غزل

مجیب الرحمٰن بزمی (رانچی)

گھر جلانے کی سیاست آپ کی اچھی لگی
مندر و مسجد کی یہ رسہ کشی اچھی لگی

شہر و قصبہ سب کو پہلے کر دیا تاراج خوب
پھر کفِ افسوس ملتے واپسی اچھی لگی

شہر کے خوش حال منظر آنکھ میں چبھنے لگے
رہبروں کو شہر کی بے رونقی اچھی لگی

مسخ کرنا جھوٹ سے تاریخ کے اوراق کو
یہ ہنرمندی مورخ کی بڑی اچھی لگی

بھائیوں کو بھائیوں کے خون کا پیاسا کیا
تاجدارِ ملک تیری سروری اچھی لگی

حکم حملہ دے کے اپنا کر لیا دروازہ بند
اپنے ہمسائے کی فہم و آگہی اچھی لگی

یہ مرے اشعار بزمی وقت کی تصویر ہیں
لوگ کہتے ہیں کہ میری شاعری اچھی لگی

پرویز یداللہ مہدی

یہ کنارہ چلا کہ ناؤ چلی!

چند برس پہلے کا ذکر ہے ہمارے ایک دور کے ماموں پہلی بار ہمارے پاس بمبئی تشریف لائے تھے موصوف کی آمد سعید کا مقصد ظاہر ہے وہی تھا جو بمبئی گھومنے کی نیت سے آنے والے اکثر زائرین کا ہوا کرتا ہے یعنی میزبان کی چھٹیاں برباد کرنا اور خود تفریح کرنا اور مزے لوٹنا البتہ ماموں صاحب کا شمار ان نادر روزگار زائرین میں ہوتا ہے جو نکلتے تو تفریح کی نیت سے ہیں لیکن خود تفریح کا سامان بن جاتے ہیں یوں بھی موصوف نے اپنی زندگی کے ابتدائی، آخری اور درمیانہ ایام جس چھوٹے سے مقام پر بتائے تھے اس کا شمار نہ تو شہر میں ہوتا ہے نہ قصبے میں اتفاق سے وہاں ایک چھوٹا سا میٹر گیج کا ریلوے اسٹیشن انگریزوں کی یادگار کی شکل میں موجود ہے۔ جہاں سے آج بھی چوبیس گھنٹے کے وقفے میں صرف ایک عدد لوکل ٹرین قرب وجوار کے دیہاتوں کے لئے چھوٹا کرتی ہے جسے اب بھی اسٹیم انجن کھینچتا ہے، جس کی گج گامی چال کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر مسافر کمر ہمت کس کے ٹرین سے اتر جائے اور پیدل چلنا شروع کر دے تو ٹرین کے پہنچنے سے پہلے شرطیہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکتا ہے چنانچہ جو شخص ایسی ہٹیلی شرمیلی بلکہ اڑیل ٹٹو قسم کی لوکل ٹرین میں سفر کرنے کا عادی رہا ہو۔ جو دھوئیں کے مرغولے چھوڑنے اور مسافروں کو ہچکولے دینے میں تو صبا رفتار ہو لیکن چال کے اعتبار سے بالکل "پیدل" ہو اس کا بمبئی کی برق رفتار لوکل ٹرین کو دیکھ کر ہکا بکا رہ جانا لازمی ہے۔ لہٰذا ماموں صاحب پہلے دو دن تک دور ہی سے ان لوکل ٹرینوں کو دیکھتے اور ہکا بکا ہوتے رہے۔ اصل میں موصوف کی شریعت میں دیو ہیکل اسٹیم انجن کے بغیر ٹرین کا تصور بھی حرام تھا۔ چنانچہ بمبئی کی لوکل ٹرینوں کو بغیر انجن کے دوڑتے دیکھ کر جو پہلا سوال انھوں نے پوچھا وہ یہی تھا "برخوردار تمہاری بمبئی کی ٹرینیں تو بالکل شتر بے مہار کی طرح ہیں ان کا انجن کہاں ہے!" عرض کیا "یہ ٹرینیں بجلی سے چلتی ہیں اسلئے ان میں انجن نہیں ہوتا۔ موٹر ہوتی ہے وہ بھی دونوں طرف ٹرین کے اگلے سرے پر اور پچھلے سرے پر بھی! تو خوفزدہ لہجے میں بولے "پھر یہ ٹرین کاہے کو ہوئی، دو منہ کا سانپ ہوا، آگے بھی ایک منہ، پیچھے بھی ایک منہ، تبھی یہ کسی بدکے ہوئے گھوڑے کی طرح کسی کو اپنے پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتیں ایسی لفنڈوری ٹرینوں سے شرافت کی امید چہ معنی دارد" ایسی خطرناک ٹرینوں میں تو کیا میرے فرشتے بھی سوار نہیں ہو سکتے"۔ لیکن تیسرے روز ہمارے بہت سمجھانے، ہمت دلانے پر موصوف مع اپنے فرشتوں کے ٹرین میں سوار ہونے کو تیار ہو گئے۔ خدا خدا کرکے ادھر ہم دونوں پلیٹ فارم پہنچے ادھر ٹرین داخل ہوئی اور جیسے ہی ٹرین رکی ہم نے ماموں صاحب کو از روئے معاہدہ ٹرین کے دروازے کی طرف دھکیلنا شروع کیا لیکن جواب میں اترنے والے مسافروں نے از روئے قاعدہ انھیں واپس دھکیل دیا۔ بقول غالب "کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے" والا معاملہ تھا۔ کافی دیر تک عمل اور رد عمل

کی اس تھیوری سے عملی طور پر گزرنے کے بعد بے چارے بہ مشکل تمام دروازے تک پہنچ پائے تھے کہ ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ چل پڑی۔ گویا دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز کہ ایک اور قیامت ٹوٹ پڑی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے موصوف کے قدموں تلے سے پلیٹ فارم اور پلیٹ کے پہلو سے سالم ٹرین نکل گئی۔ یہ جھٹکا اس قدر زوردار تھا کہ بڑی دیر تک ماموں صاحب کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ یہ کس نے اچھلا کر ناؤ چلی!

سفر وسیلۂ خطر :-

اگلی ٹرین کے آتے آتے ماموں صاحب کے حواس کسی قدر بحال ہو چکے تھے چنانچہ جیسے ہی ٹرین پلیٹ فارم پر رکی ہم نے ایک بار پھر موصوف کو کمپارٹمنٹ کے دروازے کی طرف دھکیلنا شروع کیا اس مرتبہ وہ خود بھی اپنے طور پر آگے بڑھنے کے لئے زور لگا رہے تھے۔ گویا پچھلے تجربے نے انھیں بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ نتیجتاً نہ صرف وہ دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے بلکہ مینڈک کی طرح پھدک کر ڈبے کے اندر بھی داخل ہو گئے۔ اسی پل ایک ٹوکرا بردار مسافر کو اترنے کی سوجھی اس نے ٹوکرے کو ڈھال بنا کر اترنے کی جو کوشش کی تو ہمیں اور ہمارے ساتھ کچھ اور مسافروں کو پلیٹ فارم پر ڈھیر کر دیا تب ہی ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ اسٹارٹ ہوئی اور دندناتی ہوئی پلیٹ فارم سے نکل گئی۔

ہم چلا کر ماموں صاحب کو یہ اطلاع بھی فراہم نہ کر سکے کہ ہم پلیٹ فارم پر ہی رہ گئے ہیں۔ آپ اگلے اسٹیشن پر اتر کر ہمارا انتظار فرمائیے۔ ہم اگلی ٹرین سے وہاں پہنچتے ہیں۔ سانپ نکل چکا تھا اب لکیر پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہمیں اپنے پیچھے نہ پا کر ماموں صاحب کا جانے کیا حال ہوا ہوگا؟ یقیناً ان کی حالت غیر ہو گئی ہوگی! اس سچویشن کا تصور کر کے ہی ہماری حالت غیر ہونے لگی۔ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ آیا اگلی ٹرین پکڑ کر اگلے اسٹیشن پر انھیں ڈھونڈیں یا یہیں ٹھہر کر ان کی بخیر سلامت واپسی کا انتظار کریں۔ پھر خیال آیا کہ موصوف بمبئی کے لئے نئے بھی اللہ کے لئے نئی نہ راستوں سے واقف نہ کسی سے شناسائی ایسے غریب الوطنی کے عالم میں کہ جب خدا بھی دور ہو اور ناخدا بھی دور! پتہ نہیں ان پر کیا بیت رہی ہوگی؟ اس خیال کے آتے ہی ہم نے اگلی ٹرین پکڑی اور ماموں صاحب کی تلاش کی مہم شروع کر دی۔ ایک ایک اسٹیشن چھان مارا لیکن موصوف جیسے گدھے کے سینگ ہو گئے تھے کہیں نظر نہیں آئے۔ پورے چار گھنٹے اس ناکام مہم میں سر کھپا کر ناشاد و نامراد۔ واپس گھر کا راستہ لیا۔ یہی سوچتے ہوئے کہ ان کی گمشدگی رپٹ علاقے کے پولیس اسٹیشن میں درج کرائیں یا مقامی اخباروں میں تلاشی گمشدہ کا اشتہار چھپوائیں۔ آخری بات جی کو لگی۔ اسلئے کہ پولیس والوں سے زیادہ صحافیوں سے ہماری جان پہچان تھی۔ کام سستے میں نپٹ سکتا تھا۔ لہٰذا گھر پہنچتے پہنچتے ذہن میں اشتہار کا مضمون بھی تیار کر لیا تھا جو اسطرح تھا۔

”پیارے ماموں جان! آپ کہاں ہیں؟ خدا کرے جہاں بھی ہوں خیریت سے ہوں۔ اس اشتہار کے پڑھتے ہی گھر چلے آیئے۔ آپ سے کوئی بازپرس نہیں کی جائے گی۔ آپ کی جدائی میں گھر کے تمام افراد کا بُرا حال ہے!!

نوٹ :- بذریعہ ہذا عوام الناس کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ہمارے ماموں جان اگلے وقتوں کے ان لوگوں میں سے ہیں جو سفر کو وسیلۂ ظفر سمجھتے ہیں تاحال اس بات سے بے خبر ہیں کہ بمبئی کی لوکل ٹرینوں میں سفر وسیلۂ ظفر نہیں رہا ”وسیلۂ خطر“ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ہمارے بھولے بھالے ماموں جان اسی وسیلۂ خطر کی نذر ہو کر ہم سے بچھڑ گئے ہیں ہو سکتا ہے اس وقتی صدمے نے انھیں خبط الحواس بنا دیا ہو خدارا ان کی خبط الحواسی کو پاگل پن سے نہ تعبیر کیا جائے موصوف کی آنکھیں چھوٹی ناک موٹی، قد کے ناٹے اور عمر کے اعتبار سے ساٹھے پاٹھے ہیں۔ جس کسی کو ہمارے اشتہاری ماموں جہاں اور جس حالت میں دستیاب ہوں براہ مہربانی نیچے دیئے ہوئے پتے پر پہنچا کر سیلی خرچ کے علاوہ ثواب دارین بھی حاصل فرما سکتا ہے۔

ماموں صاحب کی گمشدگی کے تعلق سے اشتہاری مضمون تیار ہو چکا تھا بس موصوف کی تصویر حاصل کرنے کی دیر تھی۔ ہم تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے گھر پہنچے۔ اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا بیگم نے فوراً دروازہ کھولا ہم تیزی سے اندر داخل ہوئے اور دریافت کیا۔ بیگم، ماموں جان کی کوئی پرانی تصویر ہے۔ گھر میں؟ بیگم جھنجھلا کر بولیں پتہ نہیں آج آپ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے آپ ماموں جان کی تصویر پوچھ رہے ہیں اور وہاں اندر بیڈروم میں ماموں جان خود تصویر بنے گم سم لیٹے ہوئے ہیں۔ اس اطلاع پر ہم نے غیر یقینی لہجے میں کہا۔ کیا! ماموں جان اندر لیٹے ہوئے ہیں۔ مطلب وہ گھر آ گئے۔ تلاش گمشدہ کا اشتہار چھپنے سے پہلے ہی وہ واپس آ گئے۔ کب آئے۔۔!

بیگم نے جواب دیا۔ ابھی آدھا گھنٹہ پہلے میں سبزی لے کر لوٹ رہی تھی کہ دیکھا بلڈنگ کے نیچے، ماموں جان ایک ٹیکسی والے سے کرایے کی بابت تو تو میں میں کر رہے تھے اس کا کہنا تھا کہ چرچ گیٹ سے یہاں تک بھٹکتے بھٹکاتے آئیں گے تو اتنا تو بھاڑا ہوگا ہی خیر میں سو اسو کے لگ بھگ کرایہ ادا کر کے ماموں جان کو ٹیکسی والے سے کسی غیر طلبیدہ پارسل کی طرح چھڑا کر گھر لے آئی۔ جب سے آئے ہیں۔ چپ شاہ کا روزہ رکھے ہوئے ہیں۔ نہ منہ کھولتے ہیں نہ کچھ بولتے ہیں میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ آخر ان کی ناراضگی کی کیا وجہ ہے؟ گھر سے تو آپ دونوں ساتھ گئے تھے، پھر وہ اکیلے کیوں لوٹے وہ بھی ٹیکسی میں؟ بیگم کے جواب طلب سوالات کو یکسر نظر انداز کر کے ہم سیدھے بیڈروم کا رخ کیا۔ ہمیں دیکھتے ہی ماموں نے غصے سے منہ پھیر لیا۔ ہم نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ان سے دست بستہ التجا کی "ماموں جان! خدا کے لئے غصہ تھوک دیجئے، جو کچھ ہوا۔ اس پر خاک ڈالئے اور بھول جائیے۔!"

بس ہمارا اتنا کہنا تھا کہ جیسے چنگاری لگ گئی بھڑک کر بولے۔ بھول جاؤں تم نے جو دشمنی میرے ساتھ کی اسے بھول جاؤں؟ کھچا کھچ بھری ہوئی ٹرین میں جو قیامت مجھ پر گزری اسے بھول جاؤں؟ لوکل ٹرین میں جو ٹھوکریں میں نے اپنے تن ناتواں پر جھیلیں انہیں بھول جاؤں؟ ارے اتنی بے دردی سے تو ہمارے ہاں کے لونڈے لپاڑے فٹ بال کو بھی ٹھوکریں نہیں لگاتے۔؟

"مہمان نوازی کا بڑا اچھا مظاہرہ کیا میاں تم نے! خدا تمہیں اس کا اجر ضرور دے گا"

تب ہی بیگم چائے کا ٹرے لئے ہوئے وہاں آئیں۔ انہیں دیکھ کر ماموں کا چرخہ از سر نو شروع ہو گیا۔ بہو بیگم، آج جو سلوک تمہارے میاں نے اس غریب الدیار کے ساتھ کیا۔ اس کی مثال تو تاریخ میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔ ایسا کٹھور سلوک تو آدمی دشمن کے ساتھ بھی نہیں کرتا مجھے جہنم کی بھٹی میں جھونک کر خود داروغۂ جہنم کی طرح پیچھے رہ گئے ٹرین کے چلتے ہی پلٹ کر جو دیکھتا ہوں تو جناب غائب میرے تو ہوش و حواس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ پیروں تلے سے سالم ڈبہ نکل گیا۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، نوبت بہ ایں جا رسید حالت یہ ہو گئی کہ اک اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں' اور جواب میں لوگوں کی بے نیازی و لاپرواہی کا یہ عالم۔ سمجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو۔ اگر تمہارے میاں کو میرا آنا اتنا ناگوار گزرا تھا تو صاف صاف کہہ دیا ہوتا یہ ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی!"

بیگم نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا آج ان سے جو غلطی ہو گئی سو ہو گئی، آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ ماموں جان۔ میں اس کا ذمہ لیتی ہوں"

ہم نے فوراً کانوں کو چھو کر کہا "بالکل میں اسی وقت اسی گھڑی خدا کو حاضر ناظر جان کر قسم کھاتا ہوں کہ آگے سے میں پہلے لوکل ٹرین میں چڑھوں گا پھر آپ!!"

مگر بگڑ کر بولے ہرگز نہیں احمق و نقال کا جو جان لیوا ذریعہ شرطیہ حاملاؤں کا حمل ساقط اور غیر حاملاؤں کی زندگی ساقط کر سکتا ہے اس میں سفر کرنا تو درکنار بات اس کی طرف دیکھنا بھی میرے لئے حرام ہے۔ لہٰذا آئندہ مجھے جہاں کہیں لے جاؤ گے صرف ٹیکسی میں لے جاؤ گے اگر تمہیں میری شرط منظور نہیں تو فوراً۔ میرا بوریا بستر باندھو اور

مجھے رخصت کردو"

شرط اگرچہ کڑی اور ہماری اوقات سے زیادہ بھاری تھی لیکن چونکہ ہمیں موصوف کی دلجوئی اور مہمان نوازی بھی تھی۔ چنانچہ ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

نتیجۃً ماموں صاحب جتنے دن بھی ہمارے ہاں مہمان رہے ٹیکسیاں دوڑاتے، ہمارے حقیر نقیر بجٹ کے پرخچے اڑاتے رہے۔!!!

••

محمد سعد اللہ
سدوڑ (امراوتی)

بائیسیکل کی رفاقت میں

سفر کی تکالیف کا احساس وہ اولین شہ سوار ہے جو گھوڑے کی زین کسنے سے پہلے ہی اُچک کر مسافر کے اعصاب پر سوار ہو جاتا ہے۔ ایسے ہر موقع پر جب میں نے سائیکل پر سوار ہو کر بھیڑ بھرے راستوں سے گذرنے کا قصد کیا، میرے اندر براجمان آدمی نے مجھے ڈرایا کہ میاں! تم خود کو غالب بھلے ہی سمجھ لو کہ یہاں ہر تیسرا شاعر اسی خبط میں مبتلا ہے لیکن یہ کیسا فاسد خیال پال رکھا ہے کہ تم سندباد بھی ہو، دیکھو سامنے راستہ نہیں سمندر بچھا ہوا ہے۔ موٹریں کاریں ہیں کہ طوفانی موجوں کی طرح بڑھی چلی آ رہی ہیں۔

سندباد نے سمندر کو یقیناً ایک بے قرار وجود کے روپ میں دیکھا ہو گا جو ایک پر اسرار اور نادیدہ دنیا کی رعنائیاں اپنی باہوں میں سمیٹ لینے کی آرزو میں لپٹا ہوا، موجوں کے سراپے میں بار بار اچھل پڑتا، پل پل کسی اندھے سانپ کی طرح ادھر ادھر سر ٹپکتا ـــــ، سندباد آگے بڑھا اور سمندر کی آنکھ بن گیا۔ یہ ہوتا آیا ہے کہ جو شخص بھیڑ بھرے راستے یا سمندر کی آنکھ بن کر اس کی بے قراری اوڑھ لے تو، راستہ یا سمندر دونوں اسے ایک نئی دنیا کے روبرو لے جا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔

قبل اس کے کہ میرے سائیکل نما وجود پر سفر کی جانکاہ تکالیف کا احساس اور وسوسوں کی ننھی انگلیاں سرسرائیں اور میرے پیروں کو مضبوطی سے تھام کر پہیوں کی طرح جام کر دیں میں سائیکل پر سوار ہو کر بے جادہ جا خلاء میں تیرتے ہوئے وجود میں ڈھل جاتا ہوں۔ سائیکل چلانا ایک ایمان افروز تجربہ ہے بالخصوص اس شخص کے لئے جو مردم گزیدہ ہو۔ آئینے کے علاوہ بھیڑ بھرے راستوں سے گھبراتا ہو۔

راستے میرے نزدیک میدان کارزار سے کم نہیں۔ ان میں ٹھنسی ہوئی TRAFFIC SENSE سے عاری مخلوق۔ گم کردہ راہ دشمن کا لشکر ہے اس خطۂ ارض کو عبور کرنا جہاد کے برابر ہے سو میں مرد مجاہد کی طرح سائیکل پر سوار انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کو چیرتا ہوا گذر جاتا ہوں اختتام سفر پر یہ سوچ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ مجھ سے ایک معجزہ سرزد ہو گیا۔ سائیکل پر سوار ہونے سے پہلے لوگوں کا یہ اژدھام میرے سامنے ایک ٹھوس اور جامد پہاڑ کی طرح کھڑا تھا جسے عبور کرنا محال تھا لیکن میرے آگے بڑھتے ہی یہ بھیڑ ایک الجھی ہوئی ڈور کی طرح گرہ در گرہ کھلتی چلی گئی۔ جیسے دریائے نیل نے حضرت موسیٰؑ کے لئے اپنا سینہ وا کر دیا تھا۔

بھیڑ بھاڑ سے نکل کر سائیکل کے دوش پر سوار بھٹکتے پھرنا مجھے بہت پسند ہے۔

خاص طور پر وہ لمحہ جب طویل ڈھلان سے گذرتے ہوئے سائیکل کا وجود ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے اور میرے بازو پر دو بڑے بڑے پنکھ اُگ آتے ہیں۔ پنکھ جو اڑنے کی معصوم سی خواہش کا سراپا ہیں۔ ہوا میں لہراتا ہوا خزاں رسیدہ پتہ خواہش پرواز یعنی زندگی سے محروم ہو تا ہے۔ اسی لئے اس کے پر نہیں ہوتے۔ ہوا کے ہاتھ میں اس کا ننھا سا وجود ایسا ہے جیسے میرے

ہاتھوں میں سائیکل کا ہینڈل، جس طرف بھی چاہے موڑلوں۔

میں اسی عالم میں سر اٹھا کر دیکھتا ہوں، بگلوں کی ایک ڈار آسمان میں "V" کا نشان بناتے ہوئے اڑی جارہی ہے۔ میں سوچتا ہوں "یہ وی فار وکٹری VICTORY ہے۔ پرندوں نے زمین پر بکھری چیزوں سے بے نیازی اختیار کرکے چیزوں پر فتح پائی اور میں جو خیالی پرواز میں ہر شئے سے بے نیاز ہوچکا تھا۔ ڈھلان ختم ہوتے ہی سائیکل کو ایک سنگلاخ حقیقت کے روپ میں دیکھتا ہوں جو چڑھائی کے مرحلے میں دیا کی بھیک مانگنے لگتی ہے تو محسوس ہوتا ہے گویا میری آزادی سلب کرلی گئی ہے۔ سائیکل میری مٹھی میں نہیں میں خود اس کے چنگل میں پھنس گیا ہوں اور وہ کسی بوسیدہ شہنشاہی نظام کی طرح میرے اوپر لاد دی گئی ہے۔ یقین مانئے سائیکل اپنے چلنے بشرطے سے اسی نظام کی نمائندگی کرتی ہے۔ آپ کیریر اور سیکل کے اگلے بار پر اپنی بیوی اور بچوں کو لاد کر لے جارہے ہیں تو گو سائیکل نہیں حکومت چلا رہے ہیں۔ آپ کی سیٹ دیگر سواریوں سے ایک امتیازی بلندی پر واقع ہے جو ڈکٹیٹر شپ کی یاد دلاتی ہے۔ آپ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ چاہیں جنگ کے جس گڑھے میں اپنی حکومت (سائیکل) کو جھونک دیں۔

اس کے برعکس موٹر کار میں نشستوں کا انتظام سوشلسٹ ڈیموکریٹک حکومت کی نمائندگی کرتا ہے کہ یہاں تمام سواریاں ایک ہی سطح پر شانہ سے شانہ جڑائے بیٹھی ہیں۔ میرے ہاتھوں میں حرکت کرتا ہوا ہینڈل مجھے ہر وقت یہ باور کرواتا ہے کہ صاحب خدا نے آپ کو بھی صاحبِ اختیار بنایا ہے کہ جس سمت میں جی چاہے سائیکل اڑائے چلے جائیے۔ مگر میں جانتا ہوں تخت و تاج اور ملک و مال کی طرح سائیکل کا ہینڈل بھی متاعِ فانی ہے۔ یہ اختیار بھی فریبِ ہستی سے کم نہیں۔ اس وفا ناآشنا کا ایک آدھ پہیہ پنکچر ہوجائے تو پوری سائیکل بیوی کی طرح روٹھ جائے گی۔ جبر و قدر کا سارا فلسفہ اپنی جگہ دھرا رہ جائے گا سوائے اس کے مائیکے یعنی سائیکل ریپئرنگ شاپ بھجوانے کے چارۂ کار نہیں۔

کشتی، تانگہ وغیرہ سواریوں پر چڑھ کر بارہا زمین کو روندنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، میں برسوں اپنے قدموں کے نشانات زمین کے سینے پر اس بات کے ثبوت میں ثبت کرچکا ہوں کہ یہ واقعی بود و باش کے قابل ہے۔ زمین پر حرکت کے تمام پیمانوں میں سائیکل ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کی رفاقت میں میرا ذہن مسافت زیست میں درکار قوت فراہم کرنے والے نظام کے تجزیے میں گم ہوجاتا ہے۔ یوں تو میں اپنے ذہن کی دیگر گتھیاں بھی چہل قدمی ہی کے دوران سلجھاتا رہا ہوں کہ اس عمل سے بہتر نفسیاتی معالجہ میری نظر سے آج تک نہیں گذرا، البتہ سائیکلنگ کی بات ہی نرالی ہے۔ سیکل چلاتے ہوئے لگتا ہے پنجوں کی مدد سے اپنے پورے وجود کو آگے کی طرف دھکیل رہا ہوں اور وہ ایک فٹبال کی صورت سبزہ زار میں لڑھکتا جارہا ہے۔

سائیکل کے دو پہیئے، پرندے کے دو بازو یا آدمی کے پاؤں، ان تمام چیزوں کو میں تکمیل کے روپ میں دیکھتا ہوں۔ اس تکمیل کے دو سرے ہیں جنہیں دو ہاتھوں نے تھام رکھا ہے۔ ایک ہاتھ ہماری ذات کے اندر چھپا ہوا ہے دوسرا باہر موجود ہے۔ تکمیل کے ان ہی دونوں سروں کے ذریعے قوتِ حیات بجلی کی رو کی طرح مسلسل سپلائی ہوتی رہتی ہے۔ اس کا ایک سرا ہمارے اندر سے برآمد ہوتا ہے۔ جبکہ دوسرا باہر سے آکر ہماری ذات سے جڑ جاتا ہے، کتے کے گلے میں بندھی رسی کی طرح۔ یہ دیکھئے ایک سرا میری ذات سے برآمد ہوا اور میری ٹانگوں کے وجود میں گم ہوگیا اب قوتِ حیات بجلی کی ایک رو کی صورت میرے پنجوں سے اچھل کر پیڈل میں اور پھر چین CHAIN سے گذر کر سائیکل کے دونوں پہیوں میں گردش کرنے لگی۔ سائیکل کے سفر میں قوت کا سرچشمہ ہماری اپنی ذات ہوتی ہے گویا سائیکل اور ہم۔ یک قالب دو جان ہو چکے ہیں۔ اس کے پہیوں میں جس لہو سے روانی ہے۔ اس کی تحصیل ہمارے ہی خون جگر سے جاری ہے۔ ہمارے پاؤں تو محض دو بڑی بڑی رگیں ہیں۔ سائیکل اور

غریب طبقے کی نمائندگی کرتی ہے جو اپنے بل پر بے نیازانہ زیست کرتا ہے۔ جیسے ریل اپنے شکم میں موجود ایندھن کے سہارے دوڑتی ہے۔ البتہ بجلی کی ٹرین شاید سامراجیوں کے طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔

حقیقی گردش درا صل سائیکل کے پچھلے پہیے میں ہی ہوتی ہے، اس کا انداز بالکل ایسا ہی ہے جیسے شعر میں آمد۔ اگلا پہیہ محض دھکیلے جانے کا سزاوار ہے اور بھرتی کے شعر کی طرح ہے، جس کی حرکات وسکنات میں آورد کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ خاص طور پر کسی خاندان کے اکلوتے کماؤ پوت کی طرح جو اپنی پوری توانائی سمیت زندگی کی دوڑ میں شامل ہوتا ہے۔ اس کی کہنی کے مسلسل کچوکوں سے دیگر افراد خاندان حرکت میں رہتے ہیں۔ اس متحرک پہیے سے ان کا تعلق ٹوٹ جائے تو چند لمحے ٹک کر زندگی کے وقفے کے بعد اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر نکیل کا ایک سرا برآمد کر کے اپنے پہیے نما وجود میں بجلی کی رو دوڑا دیتے ہیں یہ تو ہوا نکیل کا پہلا سرا جو داخلی قوت سے عبارت ہے دوسرا سرا مرزا غالب کے اس مصرع میں ملاحظہ فرمایئے۔ سے "رات دن گردش میں ہیں سات آسماں"

کرۂ ارض بھی سائیکل کے پہیے کی طرح مسلسل گھوم رہا ہے دوسرا سرا ماہ و سال کی گردش ہے جو ہم چاہیں نہ چاہیں ہمیں آگے کی طرف برابر گھسیٹتی ہوئی لے جا رہی ہے۔ اس کا احساس سینے میں دل کی طرح ہر وقت دھڑکتا تو نہیں البتہ جب کبھی برق رو زندگی ہمارے کان ذرا قریب سے سہلا کر گذر جاتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ زندگی ایک طویل ڈھلان پر چھوڑی ہوئی بغیر بریک کی سائیکل ہے۔ جس پر سوار روح اپنی گہرائیوں تک کپکپا رہی ہے۔ کرۂ ارض، چاند، سورج اور ستاروں کا گول مٹول سائیکل کے پہیوں جیسا وجود بھی اسی طرف لطیف اشارہ ہے کہ تمام غیر مرئی مخلوقات اپنے وجود کی سائیکل پر سوار ازل سے ابد کی طرف محوِ سفر ہیں۔

••

قطعات

نثار عباسی (الہ آباد)

کاؤنٹنگ

ضبط ہوگئی مری ضمانت کیا
کوئی اچھی خبر نہیں آتی
کاؤنٹنگ کا تو دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

بل

محکمہ کون سا ہے دیکھنا تو
"افی شنسی" کو اس کی "بل" لگے ہے
ہے ریڈنگ کچھ نہیں پیسے بہت ہیں
مجھے تو بجلی کا یہ "بل" لگے ہے

کرفیو

سڑکیں ویران ہیں دوکانیں بند
ہو کا عالم ہے دیکھیے ہر سُو
سرپھرے چند لڑ گئے کل رات
'فیو' کی کرنی سے لگ گیا کرفیو

انتظارِ وصل

اف انتظارِ وصل کی مدت نہ پوچھیے
دورِ شباب سارا بڑھاپے میں ڈھل گیا
اعصاب ڈھیلے پڑ گئے چربی پگھل گئی
اب جا کے دال گل سکی جب گوشت گل گیا

بیلٹ

'بلٹ' کے زور پر بیلٹ پہ قبضہ
بزعمِ خود شدہ گدی پہ پل رہے ہیں
سیاست کے یہ سب کھوٹے ہیں سکے
یہ جب تک چل رہے ہیں چل رہے ہیں

رکشہ

اسی رکشہ سے مرے پیر ہوئے ہیں زخمی
اسی رکشہ سے مرا پیٹ بھی پلتا ہے جناب
پھر مرے پیر کے زخموں پہ تعجب کیسا
رکشہ پیروں سے نہیں پیٹ سے چلتا ہے جناب

علی الاعلان

یہ ہے کشمیر اپنا اور اسے پنجاب کہتے ہیں
یہاں پہ گھر کا آنگن جنگ کا میدان ہوتا ہے
جو سر درکار ہوتے ہیں تو پٹ لیسٹ آ گئی ہوتی ہے
یہاں جو قتل ہوتا ہے علی الاعلان ہوتا ہے

علی الاطلاق

اگر پکڑا بھی جائے تو نکل جاتا ہے ہاتھوں سے
کہ اس کا کرنے والا فن میں اپنے طاق ہوتا ہے
وہ رشوت ہی سے چھٹتا ہے جو پھنس جاتا ہے رشوت میں
کہ دھندا ہے یہ رشوت کا علی الاطلاق ہوتا ہے

داخلہ

تھا جہاں پہلے سلیکشن "کمپیٹیشن" ہو گیا
کس کو تھی اس کی خبر ایسا بھی "لا" ہو جائے گا
نقل سے تو پاس کر کے آئے ہیں انٹر نثار
پوچھتے ہیں ورسٹی میں داخلہ ہو جائے گا

میوچول بفولنگ

وہ جو ہوتے ہیں ڈپلومیٹ نثار
"ٹیکٹ" وہ جانتے ہیں رولنگ کا
جس کو کہتے ہیں "ڈپلومیسی" نثار
آرٹ ہے "میوچول بفولنگ" کا

[illegible] قسط

مشتاق احمد یوسفی

اسکول ماسٹر کا خواب

کارِ کابلی والا اور الہ دین بے چراغ

۱

اعصاب پہ گھوڑے سوار :-

علامہ اقبال نے ان شاعروں، صورت گروں اور افسانہ نویسوں پر بڑا ترس کھایا ہے، جن کے اعصاب پر عورت سوار ہے، مگر اسے حبیب لبیب اور ممدوح بشارت فاروقی ان بدنصیبوں میں سے تھے جن کی بے داغ جوانی اس شاعر کے کلام کی طرح تھی جس کے بارے میں کسی نے کہا تھا کہ موصوف کا کلام غلطیوں اور لطف دونوں سے پاک ہے۔ بشارت کی ٹریجیڈی شاعروں، آرٹسٹوں اور افسانہ نویسوں سے کہیں زیادہ اور گمبھیر تھی، اسلئے کہ ذکیہ کے اعصاب پر ہمیشہ کوئی نہ کوئی سوار رہا۔ سوائے عورت کے اس دور میں جسے ناحق جوانی دیوانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جن کے اعصاب پر بالترتیب ملا، ناصح بزرگ، ماسٹر فاخر حسین، ممتحن، مولوی مظفر، داغ دہلوی، سیکل اور خسر بزرگوار سوار رہے۔ خدا خدا کر کے اسی ترتیب سے ان پر سے اترے تو گھوڑا سوار ہو گیا، جس کا قصہ ہم "اسکول ماسٹر کا خواب" میں بیان کر چکے ہیں۔ وہ بزعم خود ان کے خواب ہی اسکول اور گھریلو بجٹ پر جھاڑو پھیر گیا۔ روز روز کے چالان، جرمانے اور رشوت سے وہ اتنے عاجز آ چکے تھے کہ اکثر کہتے کہ اگر مجھے چوائس ہو جائے کہ تم گھوڑا بننا پسند کرو گے یا اس کا مالک یا کوچوان تو میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے S P C A کا انسپکٹر بننا پسند کروں گا جو ان تینوں کا چالان کرتا ہے۔

٭ کابلی والا :- برصغیر کی تقسیم سے قبل تقریباً ہر بڑے شہر میں سود پر قرض دینے والے افغانی بکثرت نظر آتے تھے ان کی شرح سود بالعموم سو فیصد سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔ اور وصولی کے طریقے اس سے بھی زیادہ ظالمانہ۔ قرض لینے والے عموماً غریب غربا اور نوکری پیشہ لوگ ہوتے تھے۔ جس نے ان سے ایک دفعہ قرض لے لیا وہ تادم مرگ سود ہی ادا کرتا رہتا تھا۔ اور تادم مرگ زر اصل اور خان صاحب سر پر ملک الموت کی طرح کھڑے رہتے تھے۔ بنگال اور بعض دوسرے علاقوں میں بھی یہی طرح یہ دھندا چلانے والے افغانیوں کو کابلی والا کہتے تھے۔ ٹیگور نے اسی عنوان سے ایک بہت خوبصورت کہانی لکھی ہے۔ جس کا ہمارے قصے کا قصے سے کوئی تعلق نہیں۔

گھوڑا تانگہ بکنے اور اسے ٹھکانے لگانے کے بعد بشارت میں بظاہر دو متضاد تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ پہلی تو یہ کہ گھوڑے اور اس کے دور دراز کے تمام متعلقات سے ہمیشہ کے لئے نفرت ہوگئی۔ تنہا ایک لنگڑے گھوڑے نے انھیں جتنا نقصان پہنچایا اتنا تمام ہاتھیوں نے مل کر پورس کو نہیں پہنچایا ہوگا۔ دوسری تبدیلی یہ آئی کہ وہ اب سواری کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ آدمی کو ایک دفعہ سواری کی عادت پڑ جائے تو پھر اپنی ٹانگوں سے ان کا فطری کام لینے میں توہین کے علاوہ نقاہت بھی محسوس ہونے لگتی ہے۔ ان کی لکڑی کی بزنس اب کافی پھیل گئی تھی جسے وہ کبھی اپنی دوڑ دھوپ کا پھل اور کبھی اپنے والد بزرگوار کی جوتیوں کا طفیل بتلاتے تھے، جبکہ خود بزرگوار اسے بھاگوان گھوڑے کے قدموں کی برکت سمجھا کرتے تھے۔ بہرصورت قابل غور بات یہ ہے کہ ان کی ترقی کا محرک اور سبب کبھی پیروں اور جوتیوں کی سطح سے اوپر نہیں گیا۔ کسی نے بلکہ خود انھوں نے بھی ذہانت اور فراست کو اس کا کریڈٹ نہیں دیا۔ لکڑی کی بکری بڑھی تو دفتروں کے چکر بھی بڑھے اسی قدر سواری کی ضرورت میں بھی اضافہ ہوا۔ اس زمانے میں کمپنیوں میں رشوت نہیں چلتی تھی۔ لہٰذا کام نکالنے میں کہیں زیادہ ذلت و خواری ہوتی تھی۔ ہمارے ہاں ایماندار افسر کے ساتھ مصیبت یہ ہے جب تک وہ بیچ ساتھ خوردہ گیری اور اڑیل اور سڑیل پن سے سب کو اپنی ایمانداری سے عاجز نہ کردے وہ اپنی ملازمت کو پکا اور خود کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ بے ایمان افسر سے بزنس میں بآسانی نمٹ لیتا ہے۔ ایماندار آفیسر سے اسے ہول آتا ہے۔ چنانچہ صورتحال یہ تھی کہ کمپنی سے لکڑی اور کھوکھوں کا آرڈر لینے کے لئے پانچ چکر لگائیں تو بل کی وصولی کے لئے دس چکر لگانے پڑتے تھے۔ جب سے کمپنیاں بگڑ گئیں انہوں نے دس پھیروں کا کرایہ اور محنت بھی لاگت میں شامل کر کے قیمتیں بڑھا دیں۔ ادھر کمپنیوں نے نئی قیمتوں کو تسلیم کر کے دس فیصد کٹوتی شروع کر دی۔ بات وہیں کی وہیں رہی۔ فرق صرف اتنا پڑا کہ ہر دو فریق ایک دوسرے کو لالچی کائیاں اور چور سمجھ کر لین دین کرنے لگے۔ اور یہ چوکس اور کامیاب بزنس کا بنیادی اصول ہے۔

اب بغیر سواری کے گذر نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کون سی سواری موزوں رہے گی۔ ٹیکسی صرف خاص خاص موقعوں پر استعمال ہوتی تھی۔ مثلاً ہارٹ اٹیک کے مریض کو اسپتال لے جانے، اغوا کرنے، ڈاکہ ڈالنے اور پولیس والوں کو لفٹ دینے کیلئے اور یہ جو ہم نے کہا کہ مریض کو ٹیکسی میں ڈال کر اسپتال لے جاتے تھے تو فقط یہ معلوم کرنے کے لئے لے جاتے تھے کہ زندہ ہے یا مر گیا! اگر اس زمانے میں بھی جناح اور سیول اسپتال میں صرف ان ہی مریضوں کو داخلہ ملتا تھا جو پہلے اسی اسپتال کے کسی ڈاکٹر کے پرائیویٹ کلینک (preparatory) (ابتدائی) علاج کروا کے اپنی حالت اتنی غیر کر لیں کہ اسی ڈاکٹر کے توسط سے اسپتال میں آخری منزل آسان کرنے کے داخلہ مل سکے ہم اسپتال میں مرنے والوں کے خلاف نہیں۔ ویسے تو مرنے کے لئے کوئی بھی جگہ ناموزوں نہیں، لیکن پرائیویٹ اسپتال اور کلینک میں مرنے سے فائدہ یہ ہے کہ مرحوم کی جائیداد، جمع جتھا اور بینک بیلنس کے بٹوارے پر پسماندگان میں خون خرابہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ سب ڈاکٹروں کے حصے میں آجاتے ہیں۔ افسوس شاہ جہاں کے عہد میں پرائیویٹ اسپتال نہ تھے۔ وہ ان میں داخلہ لے لیتے تو قلعہ آگرہ میں اتنی طویل مدت تک اسیر رہنے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جینے سے صاف بچ جاتا اور اس کے چاروں بیٹے تخت نشینی کی جنگ میں ایک دوسرے کا سر قلم کرنے کے جتن میں سارے ہندوستان میں آنکھ مچولی کھیلتے نہ پھرتے کیونکہ فساد کی جڑ یعنی سلطنت و خزانہ توبلوں کی ادائیگی میں نہایت پرامن طریقوں سے جائز وارثوں یعنی ڈاکٹروں کو منتقل ہو جاتا۔ بلکہ انتقالِ اقتدار کے لئے فرسودہ ایشیائی رسم یعنی بادشاہ کے انتقال کی بھی ضرورت نہ رہتی۔ اسلئے کہ جیتے جی تو ہر حکمران انتقالِ اقتدار کو اپنا ذاتی انتقال سمجھتا ہے۔

چلی سمتِ غرب سے اک ہوا ...

بلوں کی وصولی کے سلسلے میں وہ کئی بار سائیکل رکشا میں بھی گئے۔ لیکن ہر بار طبیعت منغص ہوئی۔ پیڈل رکشا چلانے

کو لینے نے ڈگی والی ڈھونی پڑتی تھی، جبکہ خود سواری کو اس سے بھی زیادہ بھاری بوجھ اٹھانا پڑتا تھا کہ وہ اپنے [illegible] مرتی تھی۔ ہمارے خیال میں آدمی کو آدمی ڈھونے کی اجازت صرف دو صورتوں میں ملنی چاہیئے۔ اول، اس صورت میں جب [illegible] میں سے ایک وفات پا چکا ہو۔ دوسرے، اس صورت میں جب دونوں میں سے ایک [illegible] ہو۔ جس پر ٹرے ڈھونا [illegible] نہیں۔ ذریعہ معاش اور وجہ شہرت بھی ہو۔ دو دھریوں کی ہڑتال کے دوران بشارت کو سائیکل پر بھی جانا پڑا تو ان پر انکشاف ہوا کہ کراچی میں بارہ ماسی بادِ مخالف کے سبب سائیکل اور سیاست دس قدم بھی نہیں چل سکتی۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا گویا سارا شہر ایک بگولے کی آنکھ میں بسا دیا گیا ہے۔ اب اسے مغرب سے چلنے والی سمندری ہوا کہئے۔ پیدل کہئے یا کراچی والوں کی شومئ قسمت آپ سیاست میں یا سائیکل پر کسی بھی سمت نکل جائیں، آپ کو ہوا ہمیشہ مخالف ہی ملے گی۔ ہر وہ عمل ایسے ہی ہیں جیسے کوئی آندھی میں پتنگ اڑانے کی کوشش کرے۔

خودکشی غریبوں کی دسترس سے باہر:-

ایک آدھ دفعہ خیال آیا کہ بسوں میں دھکے کھانے اور اسٹرپ ٹیز کروانے سے تو بہتر ہے کہ آدمی موٹر سائیکل خرید لے۔ موٹر سائیکل رکشا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، اس لئے کہ تین پہیوں پر خودکشی کا یہ سہل اور شرطیہ طریقہ ابھی رائج نہیں ہوا تھا۔ اس زمانہ میں عام آدمی کو خودکشی کے لئے طرح طرح کی صعوبتیں اور کھکیڑ اٹھانی پڑتی تھی۔ گھروں کا یہ نقشہ تھا کہ ایک ایک کمرے میں دس دس [illegible] اس طرح ٹھنسے ہوتے کہ ایک دوسرے کی آنتوں کی قراقر تک سن سکتے تھے۔ ایسے میں اتنا تخلیہ کہاں نصیب کہ آدمی پھانسی کا [illegible] باندھ کر تنہا سکون سے لٹک سکے۔ علاوہ ازیں کمرے میں صرف ایک کڑا ہوتا تھا جس پہ پہلے ہی ایک پنکھا ہوتا تھا۔ اگر مرنے کے [illegible] کو لٹکنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ رہے پستول اور بندوق، تو ان کے لئے لائسنس کی شرط تھی۔ جو صرف امیروں، وڈیروں اور افسروں کو ملتے تھے۔ چنانچہ خودکشی کرنے والے ریل کی پٹڑی پر دن دن بھر لیٹے رہتے ہیں کہ ٹرین میں [illegible] گھنٹے لیٹ [illegible] آخر غریب موت سے مایوس ہو کر کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے۔

موٹر سائیکل میں بشارت کو سب سے بڑی قباحت یہ نظر آئی کہ موٹر سائیکل والا سڑک کے کسی بھی حصے پر موٹر سائیکل چلائے محسوس یہی ہوتا ہے غلط جگہ چلا رہا ہے۔ ٹریفک کے حادثات کے اعداد و شمار پر ریسرچ کرنے کے بعد ہم بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمارے ہاں پیدل چلنے اور موٹر سائیکل چلانے والے کا نارمل مقام ٹرک اور منی بس کے نیچے ہے! دوسری مصیبت یہ کہ ہم نے آج تک کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو پانچ سال سے کراچی میں موٹر سائیکل چلا رہا ہو اور کسی حادثے میں ہڈی پسلی نہ تڑوا چکا ہو۔ مگر ٹھہریئے۔ ایک یاد آیا۔ ایک شخص ایسا ملا جو سات سال سے کراچی میں بغیر کسی ایکسیڈنٹ کے موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ مگر وہ مرد [illegible] کنویں (well of death) میں چلاتا تھا۔ تیسری قباحت انہیں یہ نظر آئی کہ موٹر سائیکل چلاتے وقت [illegible] دو باتوں کا خوف لگا رہتا ہے۔ اول یہ کہ وہ ہمیشہ [illegible] رہیں تاکہ [illegible] دیکھ کر [illegible] اور آپ کو خواہ مخواہ [illegible] جانے کا [illegible] ہے۔ دوم [illegible] موٹر سائیکل چلانے والا اس میں [illegible] بغیر کسی [illegible] کے [illegible] جاتا ہے آسانی کے ساتھ [illegible] کے ساتھ [illegible] سواری کے ساتھ

[illegible]:-

[illegible] کہ [illegible] یہ سوال [illegible] کہ جب [illegible]

یہ بھی تو گدھے اور گدھا گاڑی کو کیوں چھوڑ دیا۔ ایک وجہ تو یہی ہے جو معاً آپ کے ذہن میں آتی ہے [illegible] کہ
ہمنے گدھے پر چیسٹرٹن کی معرکۃ الآرا نظم پڑھی ہم نے اس جانور پر ہنسنا اور اسے حقیر سمجھنا چھوڑ دیا۔ گیارہ برس لندن میں رہنے کے
بسبب یہ بالکل واضح ہو گیا کہ مغرب میں گدھے اور الو کو گالی نہیں سمجھا جاتا۔ بالخصوص الو تو علوئے فکر اور دانائی کا سمبل ہے یہاں
اہل لوگ ایسا نہیں مانے گا جو صحیح معنوں میں الو کہے جانے کا مستحق ہو۔ لیکن اگر کسی کو الو کہہ دیا جائے تو لپٹے جائے بلکہ اپنے پروں
پھیلا نہیں سمائے گا۔ لندن کے چڑیا گھر میں الوؤں کے کچھ نہیں تو پندرہ پنجرے تو موجود ہوں گے۔ ہر بڑے مغربی ملک کا نشان
الو موجود ہے۔ ہر پنجرہ اتنا بڑا جتنا اپنے یہاں شیر کا ہوتا ہے اور ہر الو اتنا بڑا جتنا یہاں کا گدھا۔ اپنے یہاں کا الو تو ان کے
سامنے بالکل ہی الو معلوم ہوتا ہے۔ انگلینڈ میں بینک سازوں کی سب سے بڑی کمپنی logo V. Donald Aitcheson
(تجارتی نشان) الو ہے جو ان کے سائن بورڈ لیٹر ہیڈ اور بلوں پر ہوتا ہے۔ اسی طرح امریکہ کے ایک بڑے اسٹاک بروکر کا "لوگو"
الو ہے۔ یہ محض سنی سنائی بات نہیں ہے۔ ہم نے خود ڈانلڈ ایچسن کی چینک لگا کر اسٹاک بروکر مذکور کے مشورے اور پیش گوئی کے
مطابق کمپنی شیئرز (حصص) اور بونڈز کے تین چار "فارورڈ" سودے کئے، جن کے بعد ہماری صورت دونوں کے لوگو سے ملنے لگی۔

سابق پریسیڈنٹ کارٹر کی ڈیموکریٹک پارٹی کا نشان گدھا تھا بلکہ ہمیشہ سے رہا ہے۔ پارٹی پرچم پر بھی یہی بنا ہوتا ہے تا۔
پرچم تلے پوری امریکی قوم ایران کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑی رہی۔ ہمارا مطلب ہے بے حس و حرکت۔ مغرب کو گدھے
میں قطعی کوئی مضحکہ خیز بات نظر نہیں آتی۔ فرانسیسی مفکر اور انشائیہ نگار مونتین تو اس جانور کے اوصاف حمیدہ کا اس قدر معترف وطرف
تھا کہ یہ لکھتا ہے کہ "روئے زمین پر گدھے سے زیادہ پر اعتماد، مستقل مزاج، گمبھیر، دنیا کو حقارت سے دیکھنے والا اور اپنے ہی دھیان اور
دھن میں مگن رہنے والا اور کوئی ذی روح نہیں ملے گا۔" ہم ایشیائی دراصل گدھے کو اس لئے ذلیل سمجھتے ہیں کہ اس میں کچھ انسانی خصوصیتیں
پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اپنی سہار اور بساط سے زیادہ بوجھ اٹھاتا ہے اور جتنا زیادہ پٹتا اور بھوکوں مرتا ہے۔ اتنا ہی اپنے
آقا کا مطیع فرمانبردار اور شکر گزار ہوتا ہے۔

بے کار مباش :۔

سوالیوں کے حسن وقبح پر مدلل بحث سے صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ بشارت نے ظاہر یہ کیا کہ وہ فقط استدلال اور
وقبول کے عمل کے اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کار خریدنا کار و باری ضرورت سے زیادہ ایک منطقی تقاضا ہے اور خدانخواستہ نہ خریدی تو کار
تو شب ہوگا نو ہوگا، منطق کا خون ہو جائے گا اور ارسطو کی روح جنت میں یا جہاں کہیں بھی وہ ہے تڑپ اٹھے گی، جبکہ حقیقۃً
اس کے برعکس تھی انہیں زندگی میں جس شے کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ دراصل کار نہیں، اسٹیٹس سمبل تھا۔ جب کوئی
شخص دوسروں کو قائل کرنے کے لئے نعرہ و شور سے فلسفہ اور منطق بگھارنے لگے تو سمجھ جائیے کہ اندر سے وہ بچارا خود ہی ڈھل رہا ہے
اور کسی ایسے جذباتی اور نامعقول فیصلے کا عقلی جواز اور توجیہ تلاش کر رہا ہے جو وہ بہت پہلے کر چکا ہے۔ ہنری ہشتم نے تو محض اپنی ملکہ
کو طلاق دینے اور دوسری عورت سے شادی رچانے کی خاطر پاپائے روم سے قطع تعلق کر کے ایک نئے مذہب کی داغ بیل ڈال دی۔
یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انگلینڈ کے مذہب یعنی چرچ آف انگلینڈ کی بنیاد ایک طلاق پر رکھی گئی جس کو [illegible] سمجھتے ؛
کہ [illegible] نئے مذہب کی ایجاد کا اس سے زیادہ معقول جواز اور ہو بھی نہیں سکتا۔



خط (مراسلے)

مصطفیٰ کمال صاحب!

السلام علیکم۔

"شگوفہ" کا تازہ شمارہ (ستمبر ۹۱ء) بہت ساری خوشخبریاں لے کر آیا ہے۔ مجلس مشاورت میں دلیپ سنگھ صاحب کی شمولیت، ڈاکٹر عابد معز اور غوری صاحب کی سعی و کاوش سے سعودی عرب کے مختلف شہروں میں سالانہ خریداروں اور معاونین کی تعداد میں اضافہ اور جناب عزیز ابرار کو شگوفہ کی ادبی خدمات پر سنٹرل یونی ورسٹی حیدرآباد کے شعبۂ اردو میں ایم فل کی ڈگری (اس مقالے کو زیور طباعت سے آراستہ ہونا چاہیے)۔ ویسے بھی اس شمارے میں پڑھنے کو بہت کچھ ہے۔ گوشۂ فیاض احمد فیضی میں لکھے گئے تمام مضامین دل سے لکھے گئے ہیں بلا نہیں ٹالی گئی ہے۔ موصوف اتنی ساری خوبیوں کے حامل ہیں اس کا اس سے پہلے مجھے پتہ نہیں تھا۔ بینک کی آفیسری سے لے کر ان کی موٹر کار تک سب چیزیں ان کے تمول کی نشان دہی کر رہی ہیں۔ ان کی تحریریں تو پہلے ہی سے مالا مال ہیں۔ شگوفہ صوری اور معنوی اعتبار سے روز بروز نکھرتا جا رہا ہے جس کے لیے میری طرف سے مبارک باد۔ مشتاق احمد یوسفی کی قسط حسب معمول اچھی ہے۔

رشید الدین
(حیدرآباد)

السلام علیکم۔ شگوفہ کا شمارۂ اگست ۹۱ء موصول ہوا جس سے آپ کی اور شگوفہ کی صحت کی جانب سے لاحق پریشانیاں ختم ہوگئیں۔ اللہ دونوں کی عمر دراز کرے۔ آمین رؤف پاریکھ، کراچی

مجھے اپنے دوست اور کلاس فیلو رضا شاہ کے ذریعہ شگوفہ سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ آپ یقین جانیے کہ پہلے تو یہ یقین ہی نہیں ہوا کہ یہ رسالہ ہندوستان ہی سے شائع ہوا ہے۔ بہرحال! دل کو سمجھانا پڑا۔ سالنامہ، مارچ کا شمارہ اور اس کے بعد کا شمارہ خوب سے خوب تر ہے۔

آج کے اس زمانے میں جب کہ اردو برائے اردو ہی رہ گئی ہے۔ جہاں ریسرچ اور مباحثوں کا موضوع کسی کی تاریخ پیدائش کا تعین ہے تو کسی کی جائے پیدائش کا تعین۔ کوئی اردو ادب کے اصل مقصد کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ ادب کا اولین مقصد معاشرہ کی تعمیر ہوتا ہے، سماج کو صحیح رخ دکھانا ہوتا ہے۔ خواہ یہ سماج میں رائج برائیوں کی نشاندہی کر کے ہو یا پھر یہ کہ ایک صحت مند معاشرہ کے لوازم سے واقف کرانے کی صورت میں ہو۔ طنز و مزاح ان مقاصد کے حصول کے لیے اہم اور کارآمد ذریعہ ہے۔ یہ وہ ذریعہ ہے جو بیک وقت تلخ بھی ہے اور شیریں بھی۔ ہنستے ہنساتے وار کر جانا اصلاح کا بہترین ذریعہ ہو سکتے ہیں اور پھر یہ انسان کی creativity اور imagination power کا غماز بھی ہوتا ہے کہ کس خوب صورتی سے آدمی کتنی پتے کی بات کر جاتا ہے اور کسی کا دل بھی نہیں دکھتا۔

آپ نے طنز و مزاح کے ممتاز ماہرین کو ایک پلیٹ فارم پر یک جا کر کے صحت مند معاشرے کی تعمیر کے لیے اچھا قدم اٹھایا ہے۔ اردو ادب کے ماتھے سے بے مقصدیت کے کلنک کا ٹیکا اٹھانے کی اچھی کوشش کی ہے۔

اس سے کم از کم مجھ جیسے نوجوان جو اردو ادب کے براہ راست طالب علم نہیں ہیں لیکن اردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں استفادہ حاصل ضرور کر سکتے ہیں۔

میں مشکور ہوں اپنے کلاس فیلو رضا شاہ کا جو آپ کے ہم وطن ہیں کہ جن کی عنایتوں سے شگوفہ کے چند شمارے

اس واقعے کا ان کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ آئندہ کسی کا کسی کام کا بل بننے تو یہ لحاظ مروت سے کہتے کہ کم سے کم قیمت پر مال بیچیں تاکہ کم سے کم رقم ڈوبے۔ اور مرحوم نادہندگی حسین بیوہ مستقل قسم کے لوگوں کی کوئی چیز لینی پڑے تو کم سے کم داموں میں ہاتھ لگ جائے۔

میں خود آئی نہیں، لائی گئی ہوں!

بشارت اس زعم میں مبتلا تھے کہ انھوں نے سستے داموں کار خریدی ہے جب کہ حقیقت یہ تھی کہ انھوں نے اپنے گھر کو کھوٹ سے بیچے تھے۔ لیکن خوش فہمی اور مغالطے سے دل خوش ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ مرزا اسی بات کو اپنے بقراطی انداز میں یوں کہتے ہیں کہ ہم نے باولے گز گرے ایسے اندھے کنویں بھی دیکھے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ وہ خود کو اوندھا دیں یعنی سر کے بل الٹے کھڑے ہو جائیں تو باون گز کے مینار ہو جائیں گے۔ بہر کیف بشارت نے beige رنگ کی کار خرید لی۔ وہ انتہائی منکسر مزاج آدمی ہیں۔ چنانچہ دل تو سے یہ تو نہیں کہا کہ ہم بھی کار والے ہو گئے۔ البتہ اب ایک ایک سے کہتے پھر رہے ہیں کہ آپ نے بیژ رنگ دیکھا ہے؟ ہر شخص نفی میں گردن ہلاتا۔ فرماتے "صاحب! انگریز نے عجب رنگ ایجاد کیا ہے۔ اردو میں تو اس کا کوئی نام بھی نہیں۔ یہ نمونہ حاضر خدمت کروں گا۔"

کار خریدتے ہی وہ بے حد سوشیل ہو گئے اور ایسے لوگوں کے گھر بھی بیژ رنگ کا نمونہ دکھانے کے لئے جانے لگے جن سے وہ عید بقرعید پر بھی ملنے کے روادار نہ تھے۔ جو دوست احباب یہ عجوبہ دیکھنے ان کے گھر آتے۔ انھیں مٹھائی کھلائے بغیر نہیں جانے دیتے تھے۔ اسی مبارک سلامت میں ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک دن ایک دوست کے ہاں کار کی رونمائی کروانے جا رہے تھے کہ وہ آدھے راستے میں ہچکولے کھانے لگی۔ پھر اس پر کالی کھانسی کا دورہ پڑا۔ جس دم کے سبب دھڑکن کبھی ہلکی ہلکی سنائی دیتی کبھی بالکل غائب۔ خیال ہوا کہ رک گئی پڑی ہے۔ دفعتاً سنبھالا لیا۔ ہیڈ لائٹ میں ایک لحظہ کے لئے روشنی آئی۔ ہارن نے کچھ بولنا چاہا۔ مگر نقاہت مانع ہوئی۔ چند لمحوں بعد دھکڑ دھکڑ دھک دھک دھوں کر کے جہاں کھڑی تھی وہیں انجر پنجر بکھیر ڈھیر ہو گئی۔ radiator کے ایک سرے سے بھاپ اور دوسرے سے قُل قُل پانی نکلنے لگا۔ گدھا گاڑی سے کھنچوا کر گھر لائے۔ مستری کو گھر بلا کر دکھایا۔ اس نے بونٹ کھولتے ہی تین دفعہ دائیں ہاتھ سے اپنا ماتھا پیٹا۔ بشارت نے پوچھا "خیر تو ہے؟" بولا بہت دیر کر دی۔ اس میں تو کچھ رہا نہیں۔ سب پرزے جواب دے چکے ہیں۔ آپ کو مجھے چھ مہینے پہلے بلانا چاہیے تھا۔ بشارت نے جواب دیا کہ بلاتا کہاں سے۔ خریدے ہوئے کل ایک مہینہ ہوا ہے۔ بولا "تو پھر خریدنے سے پہلے پوچھا ہوتا۔ آدمی مراد آدمی کو خریدنے سے پہلے ٹھوک بجا کر دیکھ لیتا ہے۔ یہ تو کار ہے۔ آپ زیادہ خرچ نہیں کرنا چاہتے تو میں فی الحال کام چلاؤ مرمت کئے دیتا ہوں۔ بزرگ کہہ گئے ہیں کہ آنکھوں کے ڈوروں میں پانی اتر آئے تو سجدہ اور جیسی مالش کارگر نہیں ہوتی۔ پھر تو ڈاکٹری ہی کا ... چاہئے۔" بشارت کو اس کی یہ بے تکلفی بہت ناگوار گزری، مگر غرض مند صرف آئینے کا منہ چڑا سکتا ہے۔

اس کے بعد کار مستقل خراب رہنے لگی۔ کوئی پرزہ درست معلوم نہیں ہوتا تھا۔ صرف rear view mirror یعنی پیچھے کا ٹریفک دکھانے والا آئینہ صحیح کام کر رہا تھا۔ بعض اوقات کار کی رفتار گدھا گاڑی سے بھی زیادہ سست ہو جاتی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اسی میں باندھ کر کشاں کشاں لائی جاتی تھی۔

"میں خود آئی نہیں، لائی گئی ہوں"

[illegible] شروع کرنے سے پہلے وہ گوما گاڑی کا کرایہ اور باندھنے کے لئے رسی وغیرہ مزید رکھ لیتے تھے۔ اسی مشین چلانے سے [illegible] میں کھینچنے بھرنے کا عمل [illegible] باکرنا کہتے تھے۔ اس کثرت سے دہرایا گیا کہ گھر میں کسی نیفے میں کمربند اور چارپائی میں ادوائن نہ رہی اور [illegible] کو سونے جانے والے رات بھر کروٹ کروٹ جھولا جھولنے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک دن بنارس خان چوکیدار کی بکری کی زنجیر کھول لائے۔ مرزا کہتے ہی رہ گئے کہ جو زنجیر بالشت بھر کی بکری کو جو تین دفعہ "ہری" (امید سے) ہو چکی ہے۔ سنبھال نہ سکی۔ وہ تمہاری بے کی کار کو کیسا باندھ کے رکھے گی۔

••

قیسی قمرنگری

کارنامہ

میرے سرکار کی کار شہکار ہے — صرف شہکار کیا ہے چمتکار ہے
اس کے ٹائروں میں پائل کی جھنکار ہے — اس کی سیٹوں چڑیوں کی چہکار ہے
ہیڈ لائٹوں میں سانسوں کی مہکار ہے — اس کی آواز بچوں کی کلکار ہے
دندنائے تو ناگوں کی پھنکار ہے — گڑگڑائے تو بیوہ کی دھتکار ہے
کار کیا ہے محض اک اداکار ہے — کارساز اس کا شاید اداکار ہے
بیٹھنا اس میں اک کارِ فن کار ہے — عزم و ہمت کا معیار درکار ہے
کیوں کہ یہ اپنی چال کی دھتکار ہے — آگے بڑھنے سے کردیتی انکار ہے
کیسے کہہ دیں کہ یہ کام بے کار ہے — آخرش اک قلم کار کی کار ہے
یوں کہیں گے کہ بے حد نکوکار ہے — صرف سجدوں سے اس کو سروکار ہے
سارے کار اس کو کہتے ہیں بیکار ہے — ہم سمجھتے ہیں یہ ان کا اُپکار ہے
مالکِ کار گر لائقِ کار ہے — کام آمد بڑی یہ سیہ کار ہے
کار دکھ کر بھی ہوتا جو بے کار ہے — پھر بھی لگتا ہے وہ مالکِ کار ہے
کوئی مہماں اگر واقفِ کار ہے — حوصلہ اس میں گر یہ سرکار ہے
دھکا دینے میں گر تجربہ کار ہے — تب اُٹھتی کا کرتی دستکار ہے

جو خصا کار کا کار یہ لائق کرے
کار کو ایسی قیسی نمسکار ہے

○

طارق محی الدین سترمینیا

غزل

اپنی الفت کا پلا کر تو نے پیمانہ مجھے
غیر سے رسوا کیا اپنوں سے بیگانہ مجھے

پھٹ گئی ہے اس قدر چپل تمہاری کھوج میں
ہوگیا دشوار موچی سے بھی سلوانا مجھے

مار کھانا ڈنڈے سے بے شک ہمیں منظور ہے
چھوکری کے ساتھ پکڑے ہے مگر جانا مجھے

کیا ضرورت آ پڑی کافی تھا عورت کا وجود
کیوں بنائی تو نے دوزخ یہ تو سمجھانا مجھے

دیش سے مطلب نہیں ہم لیڈرانِ قوم ہیں
چاہیے بس ہر ڈنر میں مغلیہ کھانا مجھے

پھر بہن سے ہر کچن بننے میں ہے عار کیا
ذات کے جب نام پہ ہو نوکری پانا مجھے

جانِ جاں خرمیلا اس پر میں نے کر دی ہے نثار
کرتی ہے رغبت پھر بھی جانِ جانا نہ مجھے

●

انیس سلطانہ (بھوپال)

خموشی آرزو دارم

اللہ میاں نے دو کان دیئے ہیں سننے کے لیے۔ لیکن زبان بھی دی ہے کچھ بولنے کے لیے۔ یہاں حال یہ ہے کہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کبھی ہم پر جاتے تھے۔ مگر اب ہم اپنے مائی باپ خود ہو چکے ہیں۔ اور برے بھلے کی تمیز ہم میں بخوبی آگئی ہے۔ اور اپنے آپ کو مہابھارت کے سچے سپوت سمجھنے لگے ہیں۔ تبھی سے ہماری نیندیں حرام ہونے لگی ہیں۔ سچ ہے ذمہ داری بڑی چیز ہے۔ ایک ذمہ داری ہزار پریشانیوں کو جنم دیتی ہے۔" احساس ذمہ داری نے ہمیں اپنی نگاہوں میں معتبر بنا دیا ہے۔ بھارت مہان ہماری طرف آس بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے کہ اے بندہ بے خبری کچھ تو اپنی بھی خبر لے

ادھر حال یہ ہے کہ پہلے جو چیز ہم دیرپا اور مضبوط سمجھ کر لیتے تھے، اب اس سے بہت جلدی اکتا جاتے ہیں۔ مثلاً خواتین کے بدلتے ہوئے فیشن...... جب تک کراچی سے سل کر کپڑے امریکہ پہنچتے ہیں۔ یا تو فیشن بدل جاتا ہے یا پہننے والے کا بدن اس میں سمانے کے قابل نہیں رہتا۔ اسی طرح جب تک کوئی وزیر تراش خراش کر کرسی کو اپنے بیٹھنے کے قابل بناتا ہے یا اپنے قد کو اس تک پہنچاتا ہے، کرسی اس کے بیٹھنے کے ارادہ کے ساتھ ہی شریروں کی کھینچ لی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ گرتے ہیں اور واویلا کرتے ہیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنا قد اونچا کر لیتے کھجور کے قد کی طرح کہ نہ ان سے کسی کو چھاؤں ملتی ہے، نہ اس تک کسی کا ہاتھ پہنچتا ہے۔ تب کوئی نادان جیالا درخت کو ہی جڑ سے کاٹنے کی کوشش کرتا ہے اور کامیاب بھی ہوتا ہے۔ کھجور زبردست شور کے ساتھ زمین پر گرتے ہیں۔ اور اپنی غلطیوں کو بظاہر محسوس کر کے کھجور نشیں، کھجور زمین نشیں رہ جاتا ہے مگر آنے جانے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے کہتا ہے کہ یارو اب تو میں زمین پر آگیا ہوں، اب تو مجھے پہچانو —!!!

جو کھجور تک نہیں پہنچ سکتے، وہ کسی خاردار درخت پر اپنا آشیانہ بناتے ہیں۔ تاکہ کس و ناکس کی گزند سے دور رہیں۔ لوگ انھیں دور سے دیکھ کر ہاتھ جوڑ دیتے ہیں۔ وہ بھی دور سے ہاتھ جوڑ دیتے ہیں اور تمکنت سے سر جھکا دیتے ہیں۔ مگر وقتاً فوقتاً چاہنے والوں کی طرف کانٹے اچھالتے ہیں جن سے کبھی تو وہ صرف زخمی ہوتے ہیں — اور کبھی ان کے

+ Democracy by the people, for the people & the people.

تیروں کی طرح ٹوٹ کر گرتے ہیں، نوجوان مسرت سے جھل اٹھتے ہیں۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر بھرے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ مگر منھ سے نکلی بات کی طرح ان تیروں کو بھی واپس نہیں لے سکتے کہ واپس لینے میں جان کا خطرہ ہے۔ جان کے خطرے سے کتنے جھٹ گئے، مگر کوئی کوئی یا نہ الٹا بھی پڑتا ہے۔ وہ کانٹے جنھیں وہ اپنا محافظ سمجھ رہے تھے، انگلیوں میں نشتر بن کر چبھتے ہیں اور وہ ہائے وائے کرتے تھوتنے راستے پر آ رہتے ہیں۔

اور جب سارے مبتق کر کے یہ بلند نشین زمین پر گرتے ہیں، تو انکا شور بھی اتنا ہی زبردست ہوتا ہے۔ پہلے یہ ہر پانچ سال بعد بخوبی کرسی خالی کر دیتے تھے؛ مگر اب بیساکھیوں کی مدد سے چلنے والی ٹوٹی ہوئی کرسی کو بھی غنیمت جانتے ہیں۔ بلکہ تمام سیاسی پارٹیوں نے اتفاق رائے سے ٹوٹی کرسی کو اپنا قومی نشان تسلیم کر لیا ہے۔

چنانچہ اس کے سائے میں دم بھر ٹھہر لینے کو بھی باعث فخر جانتے ہیں۔ اور جب کوئی بوسیدہ پایہ جواب دے جاتا ہے تو اسے بدلنے کی تو کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ میں ایک نیا پایہ باقی بچتا ہے، باقی تین بوسیدہ پائے گریز پائی اختیار کرتے ہیں۔

پھر غریب عوام الکشن کی چکی میں پستے ہیں۔ پھر سے قوم کا سرمایہ اگر وہ کہیں ہے تو الکشن کی نذر ہو جاتا ہے۔ ماسٹر اسکولوں میں پڑھاتے ہیں۔۔!!

الف سے الکشن، ب سے بیروزگاری 'پ' سے پیٹرول 'ت' سے تیل۔

اور بجائے امتحان دینے کے الکشن کی تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ شہر کے بارہ امیدواروں میں سے پانچ شہید الکشن ہو جاتے ہیں، پانچ حلقوں کا الکشن ملتوی ہو جاتا ہے۔ پانچ علاقوں کے شور میں وقتی کمی آجاتی ہے۔ اور تب مجبور کے حامی خارزاروں میں الجھتے اور خاربزاروں کے جو یا اپنا رُخ کہیں اور کر لیتے ہیں ..... جس بیساکھی میں زیادہ فائدہ نظر آئے اسی کا سہارا لینا چاہیے ..... گرفت بھی مضبوط اور رفتار بھی تیز ..... کچھ دن ایک جگہ رہے، جب دیکھا آبلہ پائی میں اضافہ ہونے والا ہے، کسی اور پارٹی کا رُخ کر لیتے ہیں۔ بارہ برس کا انتظار آج کل کوئی نہیں کرتا۔ دن پھرنے کے لیے بارہ ماسہ بہت ہے۔ اور اگر بارہ دن میں کام چل جائے تو کیا کہنے۔ اختصار پسند قوم نے بارہ کے عدد کے لئے ایک درجن کا لفظ ایجاد کیا تھا۔

جنگ رکنے کے بعد قیدیوں کے تبادلے ہوا کرتے ہیں۔ الکشن کی جنگ سے پہلے تبادلے ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اہم لوگوں کو توڑ لیا جاتا ہے۔ جو جتنے زیادہ لوگوں کو توڑتا ہے اس کی جیت یقینی ہوتی ہے۔

قوم پرستی کے گانے جتنے زیادہ اس زمانے میں گائے جاتے ہیں، اتنے کبھی سننے میں نہیں آتے۔ گلی گلی اور ہر معروف چوراہے پر ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ اور جس حلقہ اور جس علاقہ میں جس کے چاہنے والے زیادہ ہونگے وہاں گانوں کا لب ولہجہ بھی اسی سیاست میں رنگا ہوگا۔

سُنا ہے آل انڈیا سطح پر ایک گالیوں کا مقابلہ بھی ہونے والا ہے۔ عورتیں گالی دینے میں ذرا بھی نہیں لگتیں۔ تقریر بہت کم خواتین کر سکتی ہیں۔ چیختے چیختے آواز میں بیٹھ جاتی ہیں تب کہیں دو ٹرس متعین ہوتے ہیں۔ اس لیے سب و شتم اور کوسنوں کا مقابلہ ہونے والا ہے۔ گھروں گھر اسکے اشتہار پہنچائے جا رہے ہیں۔ خوانچہ والے پھیری لگا لگا کر کارخیر میں لگے ہوتے ہیں۔ ویڈیو کیسٹ تیار ہو رہے ہیں۔

آٹے، دال، نمک کے بھاؤ تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ بجٹ آنے سے پہلے اور آنے کے بعد میں اتنا

کا فاصلہ تو بدستور رہا لیکن تمام ضروریاتِ زندگی کا سامان چشم بد دور ہو گیا۔ جو کل تک مخالف گروپ میں تھے، آج 'بادِ مخالف' کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ اور پڑوس میں ریکارڈنگ ہو رہی ہے۔

"کچھ نہیں ہے تو سیاست ہی سہی"

ظفر کمالی (بہار)

غزلیں

جاننا چاہو اگر ہے کیا مزہ شمشیر میں
شوق سے بندھ جاؤ پیارے عقد کی زنجیر میں

بوم کے سر پر ہما کا سایہ دیکھا خواب میں
دیکھیے نکلے ہے کیا اس خواب کی تعبیر میں

ہوش کی باتیں بلا سے ہوں نہ ہوں لیکن سدا
جوش ہوتا ہے غضب کا آپ کی تقریر میں

بھائی جان سے کو بڑھاپے کے رستے نکلے ہیں وہ
کیا کہیں گے ہم اسے ڈالے نمک جو کھیر میں

خوف کی تلوار سر پر بے یقینی کی فضا
جی رہے ہیں ہم ظفر لگتا ہے عہدِ میر میں

○

وفاداری ہوئی رخصت جو تھی شیخ و برہمن میں
مگر پینگیں بڑھی ہیں مصلحت سے رام راون میں

یہاں برسات میں بھی ویڈیو، ٹی وی کا چرچا ہے
ہوئے رخصت وہ دن پڑتے تھے جھولے جب کہ ساون میں

ہوئے بچے بھی دس سال ہی میں عاقل و بالغ
عجب حکام نے جادو بھرا ہے دورِ کمسنی میں

ترقی کا نشانہ ہے محبت نے ترقی کی
کھڑی ہوتی ہیں دیواریں نئی ہر گھر آنگن میں

بالو آر کے
(نانپارہ)

شادی خانہ بربادی

شادی کا خیال آتے ہی کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ ہائے وہ بھی کیا دن تھے اپنی نیند سوتا اپنی نیند جاگتا آدھو کا لینا نہ مادھو کا دینا۔ رات میں کبھی بھی گھر لوٹو بھوکے ہونے کا ڈر نہ کاٹنے کا خوف۔ ہم تو اس دن کو روتے ہیں جس دن ہماری شادی کا بھوت جا گھر میں چھوڑا۔ جس دن گھر کی بڑی بوڑھیوں کو ہمارے سکڑ وجود میں گبرو جوان دکھائی دیا۔ اور جواب میں ہمارے ہاتھ پیلے کرنے کی سزا منظور ہوئی... ہماری سونی پسلی کو ادھر اُدھر لیجا کر اس کا جوڑ ڈھونڈا گیا پسلی کے جوڑے کے ساتھ ساتھ جوڑے گھوڑے اور جہیز کے آئٹم بھی دیکھے گئے۔ لینا دینا کھرا کھرا دو ٹوک طے ہو جانے کے بعد شادیانے بجے منہ میٹھے ہوئے اور اعلان ہوا کہ ہمارا۔ رشتہ پکا ہو گیا گویا یہ منادی تھی کہ ہم نیلام ہو گئے۔

منگنی کے بعد اب صاحب شادی کی تاریخ کا معاملہ سامنے آیا۔ تاریخ نکالنے کے لیے سب سے پہلے تو دونوں جانب کے کرتا دھرتاؤں کے بیچ ایک عدد اسلامی کلینڈر کھول کر بچھایا گیا۔ کتنی ہی دیر تو مہینہ پر اتفاق نہ ہوا پھر مہینہ طے ہو جانے کے بعد دن نٹ کھٹ لگے اور اس کے بعد تاریخ طاق اور جفت کے جھمیلے میں پڑی۔ کبھی رات اندھیری تھی تو کبھی قمر در عقرب۔ شادی کی تاریخ مقرر کرتے وقت علم ہوا کہ میاں عقرب کو ڈنک مارنے کے ساتھ ساتھ شادیاں روکنا بھی عزیز ہوتا ہے۔ خیر صاحب ان ساری مصیبتوں کو پھلانگ کر ایک تاریخ مقرر ہو گئی۔ اس کے بعد پریس میں شادی کے رقعے دیے گئے۔ اس معاملے میں الداعیان میں رشتہ داروں کے ناموں کا پرابلم آیا۔ اس کا نام دیں تو اُس کا کیوں نہیں، اور اُس کا دیں تو اِس کا کیوں نہیں، اب اگر سب کے نام دیے گئے تو پھر رقعے اور روڈ لسٹ میں کیا فرق بچے گا، جوں توں کر کے رقعے آئے اور تقسیم بھی ہوئے اب جناب دیکھتے ہی دیکھتے ہماری شادی کے پانچ دنوں کا پہلا دن نمودار ہوا۔ یعنی خواتین کی اصطلاح میں منڈوے کا دن۔ اس دن گھر کے آنگن میں رنگین پردے اور جاجم وغیرہ تانے گئے ہری ہری ٹہنیاں اور ہرے پتے باندھے گئے۔ کچے ہلدی خور رمے الیوا اور کھوپرے کے توران لٹکائے گئے۔ کھانے پکے حصے بٹے۔ لڑکیوں نے گیت گائے ڈھول بجائے۔ پھر ہمیں ہلدی کا جوڑا پہنایا گیا۔ یا پانچ دن ہلدی میں رنگے بچھے پرانے کپڑے یہ کہہ کر ہمیں پہنائے گئے کہ شادی کے دن نئے کپڑوں میں ہم پر نور اترے گا۔ ادھر پیدائش کے دن سے ہم پر بد صورتی کا بھوت سوار ہو تو نور کی کیا مجال ہے جو وہ اتر جائے۔ خیر اسی دن گلے میں کنٹھا لٹکائی گئی اور ہاتھ میں کنگنا باندھا گیا۔ پھر وقفہ وقفہ سے خواتین ہمیں تیل اور بٹنہ ہمیں لگانے لگیں۔ ویسے ہلدی کے طبی نکتے سے ہم واقف تھے کہ اس کی تاثیر گرم ہے اور یہ مار کی جگہ پر درد دور کرنے کے لیے مفید جاتی ہے۔ گویا بیماری سے پیشتر علاج ہوا۔ پھر خدا خدا کر کے ہمارے حق کا دن ہمارے غریب ہونے کا پیغام لے طلوع ہوا۔ ہم نے نماز فجر ادا کی۔ پھر اس کے بعد ہمیں سہرا باندھا گیا...... یہ سہرا وہ سہرا تھا جس کو ہمارے مربیہ دیکھنے کے لیے [illegible]

کی قمیص میں جگ مگ جگ مگ جیو سہرے کے پھول کھلیں، دعا مگر کی بڑی بوڑھیوں نے اس وقت سے دینی شروع کردی تھی جب ہم پہلا پہلا انگوٹھا چوسا کرتے تھے۔ خیر ایک ہنگامے کے بیچ ہمارے سر سہرا باندھا گیا۔ ہمارے سہرے کے پھول بڑے زبردست قسم کے تھے۔ یہ پھول بجائے چنبیلی موگرے گلاب کے سیمنٹ کے وزنی پھول تھے جس سے ہوا یہ کہ سہرے کے وزن سے ہماری گردن کا منکا ڈھل گیا۔ سہرے کے وزن سے عقد کے پہلے عقدہ یہ کھلا کہ سہرا سر سے باندھا ہی اس لیے جاتا ہے کہ نوشہ میاں کا سر عقد سے جھک جائے تاکہ پھر زندگی بھر وہ سر نیچا رکھنے کی عادت بنائے رکھیں۔

پھر سہرے میں لپٹے ہمارے پوٹلی نما وجود کو ع۔ پا بدست دیگرے دست بدست دیگرے کے مصداق گھوڑے کی پیٹھ پر بٹھایا گیا۔ ہمارے اسلاف گھوڑے پر بیٹھ کر سر سے کفن باندھتے تھے جہاد کرتے تھے اور ہم سہرا باندھ کر گھوڑے پر بیٹھتے ہیں اور شادی کرتے ہیں۔ وہ گھوڑے پر بیٹھ کر تلوار چلاتے تھے ہم سہرے کی لڑیاں ہلاتے ہیں۔ وہ گھوڑے پہ بیٹھ کر خون میں نہاتے تھے ہم ہلدی مہندی اور خوشبوؤں میں نہاتے ہیں۔ . . . . . ان ہی سوچوں کے دوران ہماری بارات دلہن کے گھر شادی کے منڈپ کے قریب پہنچ گئی۔ عین منڈپ کے گیٹ پر جوانوں اور بچوں نے تین پلایا ہوا بانس اڑا کر ہماری پیش قدمی روک دی اور پیسیوں کا مطالبہ کیا۔ . . . . اس غنڈہ گردی کو ہمارے یہاں "دھینگا نا" کہتے ہیں۔ یہ رسم ہماری شادیوں میں کئی صدیوں سے جاری ہے۔ ابن بطوطہ نے آج سے ساڑھے چھ سو سال قبل اپنے سفر نامے میں اس کا ذکر کیا تھا۔ محمد بن تغلق کی بہن شہزادی اخوند عالم کا عقد امیر مسعود سیف الدین غدا ابن ہبۃ اللہ کے ساتھ ہوا تھا۔ رسم کے مطابق گھوڑے پر سوار دولہے کے ساتھی ہاتھوں میں چھڑیاں لیے آئے۔ دلہن والوں نے بزور بازو بارات کو روکا باقاعدہ طاقت آزمائی ہوئی۔ اس وقت نوشہ میاں کے ساتھیوں نے دلہن والوں پر حملہ کیا اور پچھاڑ پچھاڑ کر سب کو بھگا دیا۔ یہ سن کر تغلق بہت خوش ہوا اگر دلہن والے غالب آتے تو نوشہ میاں کو منہ مانگا انعام دلہن والوں کو دینا ہوتا چونکہ ہم امیر سیف الدین غدا ابن ہبۃ اللہ نہیں تھے اس لیے ہم مغلوب ہوئے اور دلہن والوں کو منہ مانگی رقم دیکر آگے منڈپ میں کوچ کیا۔ اب صاحب ایک وکیل اور دو گواہوں کے بیچ پانچ ہزار روپیہ سکہ رائج الوقت مہر کے عوض قاضی صاحب نے ہمارا عقد پڑھایا۔ بعد از عقد ہمارے رشتہ داروں اور دوستوں کو دولہن والوں نے شال۔ ٹاول اور دستیوں کے نذرانے حسب قرابت پیش کیے۔ اس رسم پر بھی ہم نے اکثر شادیوں میں ہنگامے اور تو تو میں میں ہوتے دیکھی۔ طرفین سمجھدار ہوئے تو ٹھیک ورنہ کھانے کی نوبت کا منہ کھلنے سے پہلے طرفین کے سر کھل جاتے ہیں۔ ان نذرانوں کے بگاڑ کو لیکر اکثر دولہے اٹھ جاتے ہیں دولہنیں بیٹھ جاتی ہیں۔

مہر کے تعلق سے ہماری شادیوں کا المیہ یہ ہے کہ نوشہ میاں لگے منڈپ میں اپنا مہر قبول تو بیانگ دہل کرتے ہیں لیکن ہمارے معاشرے میں مہر کی ادائیگی کا تصور یہ ٹھہرا ہے کہ شوہر کی موت پر بیوی سے بخشوایا جائے یا شادی منقطع ہو جانے پر ہی مہر واجب الادا ہے ورنہ نہیں۔ اسی لیے اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی شرعی شوہر اپنی منکوحہ کو اس کا مہر دینا چاہتا ہے تو بیوی رو دھو کر نیا جھمیلا کھڑا کر دیتی ہے اور یہ سوچ سوچ کر اپنا لہو پانی کرتی ہے کہ . . . . میاں دوسری لا رہے ہیں اس لیے مہر چکا رہے ہیں۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو آپ بھی اپنی بیوی کا مہر ادا کرنے کا ارادہ کر کے دیکھ لیجیے ۔۔

انصاری اصغر جمیل (ناگپور)

شاعرہ بیوی

انسان غلطیوں کا پُتلا ہے۔ اس سے زندگی میں آئے دن کچھ نہ کچھ غلطیاں سرزد ہوتی ہی رہتی ہیں۔ کبھی دانستہ اور کبھی نادانستہ طور پر۔ اگر ہمارے جدِاعلیٰ آدم غلطی نہ کرتے تو حوّا کے ساتھ زمین پر ہرگز بھیجے نہ جاتے۔ چنانچہ غلطیوں کا سلسلہ روزِ اوّل سے جاری ہے اور انشاءاللہ ابد تک جاری رہے گا۔ ہم بھی اس کی ایک کڑی ہیں۔ ہم سے بھی ایک بھیانک غلطی ہوئی ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک شاعرہ بیوی کے شوہر بن کر ناکوں چنے چبا رہے ہیں۔

قصہ یوں پیش آیا کہ تقریباً ایک سال قبل ہم اچانک اپنے والدین کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بن گئے۔ گھر میں کافی چہل پہل نظر آنے لگی۔ مہمانوں کی آمد کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ پھر مہمانوں کے سامنے ہماری ان خوبیوں کا ذکر ہونے لگا جو ہم میں موجود ہی نہیں تھیں اور ہماری ساری برائیوں پر پردہ ڈال دیا گیا۔ ہم نے اپنی ناقص عقل پر کافی زور ڈالا اور صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن افسوس کہ ہمیں اس واقعہ کی حقیقت معلوم نہ ہو سکی۔

آخر ایک روز کسی بے حیا کی طرح بھابی جان سے اس کا راز دریافت کیا۔ اُن سے یہ پتہ چلا کہ ہم خیر سے جوان ہو چکے ہیں اور ہمارے لیے ایک عدد شریکِ حیات کی تلاش کی جارہی ہے۔ یہ راز جان کر ہم سوائے مُسکرانے کے اور کچھ بھی نہ کر سکے۔ اُدھر والدہ صاحبہ کی ٹولی ہمارے لیے شریکِ زندگی تلاش کرنے میں جُٹ گئی اور ادھر ہماری ٹولی کل ہند مشاعرے کی تیاری میں مصروف ہوگئی... مشاعرہ ہمارے مکان سے قریب ہی ایک میدان میں ہو رہا تھا۔ مشاعرے میں ملک کے نامور شعراء کے ساتھ ساتھ شاعرات بھی مدعو تھیں۔ والدہ صاحبہ بھی اپنی ٹولی کے ہمراہ مشاعرہ گاہ پہنچ گئیں۔ اُن کی مشاعرے میں شرکت کا اصل مقصد بہو تلاش کرنا تھا۔

مشاعرے کے اختتام پر بھابی جان نے ہمیں بتایا کہ والدہ صاحبہ کو ایک شاعرہ جو لہک لہک کر اپنے معیار سے بھی بلند اشعار پڑھ رہی تھی بے حد پسند آگئی اور وہ اس کو اپنی بہو بنانے کے لیے بضد ہیں۔ ہم سے اُن شاعرہ کا پتہ مانگا گیا جسے ہم نے خوشی خوشی دیدیا اور اس طرح کچھ دنوں بعد غیر ضروری رسموں کے سہارے ہم ایک شاعرہ کے شوہر ہوگئے۔

آئیے! ہم آپ سے بھی اپنی شاعرہ بیوی کا تعارف کروا دیتے ہیں ورنہ اُن سے مل کر آپ تمام عمر کفِ افسوس ملتے رہیں گے۔

نام: نازک فریب پوری
عمر: گزشتہ کئی سالوں سے ۲۲ سال
قد: اتنا اونچا کر ان سے بات کرنے کے لیے ہمیں اپنا چہرہ پوری طرح آسمان کی سمت کرنا پڑتا ہے۔

رنگ : کولتار سے ذرا دبتا ہوا لیکن ہم سے بہت صاف
مشغلہ : حکم چلانا اور شاعری کرنا گویا اجتماعِ ضدین۔

ہم ایک شاعرہ کے شوہر کیا بنے ہماری دُنیا ہی بدل گئی۔ شادی کے فوراً بعد انھوں نے ہم پر رُعب اور حکم چلانا شروع کر دیا جو بفضلِ خدا آج تک جاری ہے۔

ابتدائی کچھ دن تو کافی خوشگوار گزرے کیوں کہ بیگم کے جواب میں ہم گمنام شعراء کے منتخب اشعار انھیں سُناتے رہے جس کا اثر اُن پر اتنا ہوا کہ وہ بھی ہمیں کہنہ مشق شاعر سمجھنے لگیں۔ اس کے بعد انھوں نے ہم پر ایک ذمہ داری یہ ڈال [illegible] کہ ہم انھیں مشاعروں میں پڑھنے کے لیے مشقی کلام [illegible] کریں۔ [illegible] نے انھیں [illegible] بتایا کہ جو ہم اشعار ہم انھیں سنایا کرتے ہیں دراصل وہ چوری کے ہیں پھر بھی وہ اس بات پر مصر رہیں کہ وہ اشعار [illegible] اپنے ہیں اور ہم ان سے جھوٹ [illegible] رہے ہیں۔

کچھ دنوں تک تو ہمارا کمرہ مشاعرہ گاہ، پلنگ اسٹیج، بیگم شاعرہ اور ہم سامع بنے رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے پیر نکالنا شروع کر دیا۔ انھیں احساس ہونے لگا کہ وہ گھر کی نہیں بلکہ اسٹیج کی زینت ہیں۔ چنانچہ ہماری بیوی بننے کے بعد انھوں نے ادبی نشستوں میں بھی جانا شروع کر دیا۔ باقاعدہ مشاعروں کی زینت تو بن ہی چکی تھیں۔

ہم نے مشاہدہ کیا کہ مشاعروں میں ہماری بیگم وہی تین چار غزلیں پڑھ رہی ہیں جو ہم نے شادی سے قبل مشاعروں میں بارہا سُنا تھا۔ بعد میں ہم پر یہ عقدہ کھلا کہ ہماری بیگم دراصل شاعرہ ہیں ہی نہیں۔ دراصل وہ کسی زمانے میں میلاد پڑھا کرتی تھیں۔ ان کی آواز بہت مدھر تھی۔ جس کی وجہ سے ان کے پڑوس کے ایک استاد شاعر نے انھیں سبز باغ دکھایا اور اپنا کلام مشاعروں میں اُن سے پڑھوانا شروع کر دیا بس مقطع میں وہ ان کا نام ڈال دیتے۔

اِن دنوں ہماری حالت جس قدر خراب ہے خدا نہ کرے کسی شوہر کی ہو۔ مشاعروں کا موسم چل رہا ہے۔ صبح سے شام تک ہم کولھو کے بیل کی طرح بیگم کی خدمت میں حاضر رہتے ہیں۔ صبح انھیں بستر سے جگانا، بیڈ ٹی پیش کرنا، ناشتہ بنانے میں اُن کی مدد کرنا، کپڑے دھونا، پریس کرنا، مشاعرے کے لیے ان کا مزاج بنانا اور ان کے اشعار پر داد دینا۔ یہ سب ہماری روز مرہ کی مصروفیات ہیں۔ ہر وقت خود کو لیے دیئے رہتی ہیں۔ ہمارے ہاتھ لگانے سے ان کا میک اپ خراب ہوجاتا ہے۔ مجال ہے کہ کبھی کپڑوں پر شکن آجائے۔ مشاعروں میں یہ خوب چھا جاتی ہیں۔ اس لیے ہماری تعریف و تحسین کی ان کو کوئی پرواہ ہی نہیں۔ شادی سے پہلے لوگ ہمیں ہمارے نام سے جانتے تھے اب ہم نازک فربہ پوری کے شوہر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ پہلے ڈاکیہ ہمارا خط لایا کرتا تھا اب وہ بیوی کے خطوط لایا کرتا ہے۔ پہلے لوگ محلے کے نوجوان ہمیں دیکھ کر راستہ کاٹ جایا کرتے تھے لیکن اب معاملہ اس کے برعکس ہے اب وہ ہم سے ملاقات کو خوش نصیبی سمجھتے ہیں [illegible] اپنی [illegible] وہ کان کے آگے کھڑا [illegible] ہمیں [illegible] مگر شادی کے بعد ہر روز کا مدار ہمیں دور سے آواز دیکر بُلاتا ہے اور خاطر تواضع کرتا ہے۔

اِدھر ہمارے گھر کے حالات اس کے برعکس ہیں۔ ہمارے والدین کی نظروں میں ہماری کوئی وقعت نہیں رہ گئی ہے۔ وہ ہمیں دو کوڑی کا سمجھنے لگے ہیں۔ بھابی ہمیں جورو کا غلام کہتی ہیں۔ ہم اپنے دوستوں کی جھڑکیاں کھا رہے ہیں لیکن [illegible] ہمارے [illegible] اس لیے کہ ہمیں اپنی شاعرہ بیوی سے بے حد پیار ہے۔ اور کیوں نہ ہو [illegible] ایک [illegible] مشاعروں سے [illegible] [illegible]

تمنا مظفرپوری (بہار)

پاکستان کے مشہور ڈرامہ نگار و اسٹیج آرٹسٹ

کمال احمد رضوی سے انٹرویو

[پاکستان کے مشہور ڈرامہ نگار اور اسٹیج آرٹسٹ کمال احمد رضوی اپنے رشتہ داروں سے ملنے ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ کمال احمد رضوی کا نام پاکستانی سیریل الف اور نون کی وجہ سے سننے میں آتا تھا کیوں کہ یہ سیریل پاکستان ٹی وی پر بڑا مقبول تھا۔ پھر اس سیریل کا انتخاب کتابی صورت میں مجھے ان کی ہمشیرہ کے ہاں دیکھنے کو ملا۔ میں نے وہ کتاب حاصل کی اور پڑھی، جی خوش ہو گیا بلکہ خوب دل کھول کر ہنسا۔ ان کے لطیف طنز کو محسوس کر کے داد بھی دی الف اور نون کے مطالعے کے بعد مجھے ان کی دوسری تخلیقات پڑھنے کی خواہش ہوئی اور یہ خواہش بھی ان کے ہندوستان تشریف لانے کی وجہ سے پوری ہو گئی۔

لمبے قد کے خوب صورت خد و خال والے کمال احمد رضوی بڑے تپاک سے ملے۔ ان سے بہت سی ادبی اور سماجی باتیں ہوئیں ادب اور ڈرامہ کے تعلق سے جو گفتگو ہوئی، قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔]

تمنا مظفرپوری: آپ کا اصلی اور پورا نام کیا ہے؟

کمال احمد: کمال احمد رضوی میرا اصلی اور پورا نام ہے۔

ت۔م: آپ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

ک۔ا: یکم مئی ۱۹۳۰ء گیا (بہار) میری جائے پیدائش ہے۔

ت۔م: آپ نے ابتدائی تعلیم کہاں پائی؟

ک۔ا: رفیع گنج گیا (حالیہ ضلع اورنگ آباد) میرا آبائی وطن ہے۔ میں نے میٹرک رفیع گنج ہائی سکول سے کیا پھر بعد میں پاکستان چلا گیا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا اور وہیں سے بی اے کیا

ت۔م: آپ پاکستان کب گئے؟

ک۔ا: ۱۹۴۹ء یا ۵۰ء میں پاکستان گیا تھا۔

ت۔م: ہجرت کی وجہ آپ بتا سکتے ہیں؟

ک۔ا: یہ تو آج بھی میں نہیں بتلا سکتا کہ ہجرت کیوں کی؟

ت۔م: اچھا کمال صاحب یہ تو بتلائیے کہ آپ کے ادبی ذوق کی وجہ یا اس کا محرک کیا ہے؟

ک۔ا: انگریزی کے کلاسیکی ادب کے مطالعے نے یہ ذوق پیدا کیا اور اسی ذوق نے مجھے [illegible]

ت۔م: ڈرامہ لکھنے کا شوق کب اور کیوں ہوا؟

ک۔ا: بچپن سے نوٹنکی دیکھنے کی وجہ سے اور پھر ڈرامائی ادب کے مطالعے سے

ت۔م: آپ نے پہلا ڈرامہ کون سا لکھا؟

ک۔م: حق بحق دار رسید۔

ت۔م: کمال صاحب آپ نے پہلے ڈرامہ لکھا یا اداکاری کی۔

ک۔م: میں نے کہا نا کہ ڈرامائی ادب کے مطالعے نے مجھ میں شوق پیدا کیا تو میں نے پہلے ڈرامے تحریر کیے اس کے بعد ریڈیو کے لیے صداکاری شروع کی اور بہت بعد میں اداکاری میں آگیا۔

ت۔م: آپ کا پہلا ڈرامہ کون سا ہے جو آپ نے اسٹیج کیا؟

ک۔ا: شیکسپیر کا جولیس سیزر، گورنمنٹ کالج لاہور میں اسٹیج کیا۔

ت۔م: وہ کون سا ڈرامہ ہے جو پہلی بار ریڈیو سے نشر ہوا اور کب ہوا؟

ک۔ا: ۱۹۵۳ء میں میرا پہلا ڈرامہ بعنوان "جب آنکھ کھلی" نشر ہوا تھا۔

ت۔م: ریڈیو کے بعد ٹی وی پر آپ کا ڈرامہ کون سا تھا۔

ک۔ا: آدھو کری کریں یہ ظاہر آغا ناصر صاحب ڈائرکٹر ٹی وی سنٹر لاہور کی فرمائش اور مشورے سے ۱۹۶۴ء میں لکھا تھا جو بڑا مقبول ہوا۔

ت۔م: ٹی وی والے اپنے شائقین کو ڈرامے کے علاوہ سیریل بھی دکھاتے ہیں۔ آپ نے بھی کوئی سیریل لکھا ہے اور اداکاری کی ہے؟

ک۔ا: آدھو کری کریں، کی شان دار کامیابی اور مقبولیت کو دیکھتے ہوئے آغا ناصر صاحب نے نیا سلسلہ شروع کرنا چاہا اور انھیں کے مشورے سے میں نے ایک نیا سیریل لکھا، الف اور نون جس میں الف یعنی الن کا کردار میں نے ادا کیا اور ان یعنی ننھے کا کردار رفیع خاور نے کیا۔ رفیع خاور ایک بینک میں ملازم تھے بالکل نون کی طرح کل شامل تھے۔ یہ پروگرام بہت مقبول ہوا۔ ایک سو سے زیادہ قسطیں لکھی گئیں۔ بعد میں اسی اسکرپٹ سے ۲۴ قسطیں منتخب کر کے فیروز سنز لمیٹڈ لاہور نے کتابی صورت میں شائع کی ہے۔

ت۔م: الف اور نون سیریل کب ٹیلی کاسٹ ہوا تھا۔

ک۔ا: یہ سلسلہ پہلی بار ۱۹۶۵ء میں شروع ہوا تھا جب کہ ٹی وی میں ریکارڈنگ کے وسائل نہ تھے جو ہم لوگوں کے سامنے سب سے بڑی دقت تھی۔ ہم لوگ ریہرسل کر کے اسٹوڈیو جاتے تھے اور ڈائرکٹ شیل کاسٹ ہوتا تھا۔ ذرا بھی غلطی ہوتی تو سامنے شائقین اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے تھے۔ پھر جب ویڈیو سسٹم رائج ہوا تو اس کی [illegible] کی گئی۔

ت۔م: الف اور نون جب بہت ہی مقبول سیریل تھا تو اسے بار بار پیش کیا گیا ہوگا۔

ک۔ا: جی ہاں۔ پہلی بار ۱۹۶۵ء میں [illegible] کے بعد ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۱ء [illegible] چوتھی بار جب رنگین ٹی وی پروگرام شروع ہوا [illegible] ۱۹۸۲ء میں [illegible]

ت۔م: [illegible]

ک۔ا: ایک سو سے زیادہ

ت۔م: آپ کی تحریر میں شگفتہ مزاح ہے اور طنز کے نشتر بھی۔ کیا آپ مزاحیہ ادیب سے تعلق کی وجہ بتا سکتے ہیں۔

ک۔ا: جی ہاں۔ حق لطیف۔

ت۔م: کمال صاحب آپ یہ بتائیے کہ ڈرامے میں آپ اپنے لیے کون سا کردار پسند کرتے ہیں۔

ک۔ا: جو بخوبی ادا کر سکوں۔

ت۔م: بہ حیثیت ڈرامہ نگار آپ یہ بتائیں کہ آپ کس ڈرامہ نگار سے متاثر ہیں؟

ک۔ا: دنیا کے تمام ڈرامہ نگاروں سے متاثر ہوں۔

ت۔م: اداکاری میں کس سے متاثر ہیں؟

ک۔ا: اداکاروں سے متاثر ہونا میں نے نہیں سیکھا۔

ت۔م: آپ نے اپنی تحریر کے ساتھ ہی دوسروں کے تحریر کردہ ڈرامے بھی اسٹیج کیے ہیں۔ ان میں سے کون سا ڈرامہ آپ کو سب سے زیادہ پسند ہے؟

ک۔ا: دیکھیے تمنا صاحب! سبھی ڈرامے مجھے پسند ہیں۔ ویسے بانو قدسیہ کا "آدمی بات" ان میں سب سے زیادہ ہے۔ یہ ایک ریٹائرڈ اسکول ماسٹر سے متعلق ہے اور بہت زندہ ڈرامہ ہے۔ جب بھی اسٹیج کیا جائے گا لوگ پسند کریں گے صرف اداکاری اور ہدایت کاری اچھی ہونی چاہیے۔

ت۔م: کمال صاحب، آپ اپنی تخلیقات کی تفصیل بتانے کی زحمت کریں تو مہربانی ہوگی۔

ک۔ا: میری طبع زاد تخلیق میں:

(الف) کمال احمد رضوی کے پانچ ڈرامے، جسے ادارۂ ثقافت پاکستان اسلام آباد سے ڈاکٹر خالد سعید بٹ نے شائع کیا۔ ان پانچ ڈراموں کے نام ہیں:

(۱) رابعہ (۲) ہم سب پاگل ہیں (۳) کس کی بیوی کس کا شوہر (۴) ایک بیوی کا سوال ہے بابا۔ (۵) میرا ہمدم میرا دوست۔

(ب) منتخب اردو ڈرامے (دو جلدوں میں)

(ج) الف اور نون

(د) اس کے علاوہ میں نے کچھ دوسری زبان سے بھی ڈراموں کے ترجمے کیے ہیں۔ ان میں سے چند کا عنوان [illegible] کی ڈائری۔ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا۔ طلوع۔ پیارا بالتو۔ جرم و سزا وغیرہ۔

ت۔م: اب تک آپ نے کتنے ڈرامے لکھے ہیں؟

ک۔ا: ٹی وی سیریل چھوڑ کر بیس ڈرامے۔

ت۔م: ان ڈراموں اور سیریل میں آپ کی سب سے اچھی تحریر کون سی ہے۔

ک۔ا: الف اور نون۔

ت۔م: الف اور نون میں نے پڑھی ہے۔ اس کے پڑھنے کے بعد آپ کی دیگر تخلیقات پڑھنے کی خواہش تھی۔ میری یہ خوش [illegible] ہے کہ آپ سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے پانچ ڈراموں کا مجموعہ پڑھنے کو دیا۔ اب تو جی چاہتا ہے کہ آپ کی اداکاری بھی [illegible]

ک۔ا: جی، آپ وہ بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اپنے چند ڈراموں کا ویڈیو کیسٹ ساتھ [illegible]

کمال احمد رضوی

الف اور نون

رشتے داری میں

[ایک بس سٹاپ سے متصل فٹ پاتھ کا چائے خانہ الن اور ننھا ایک میلی سی بنچ پر بیٹھے ہیں۔ دونوں مغموم اور افسردہ ہیں۔ ان کے پیچھے ایک طرف ایک شخص بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا ہے اور بن پر مکھن لگا کر چائے کے ساتھ کھا رہا ہے]

ننھا: الن، ہم یہاں کتنی دیر اس طرح بیٹھے رہیں گے؟

الن: جب تک اٹھا نہیں دیئے جاتے، بیٹھے رہنے میں کیا حرج ہے۔

ننھا: تو نے کچھ غور کیا؟

الن: کیا؟

ننھا: وہ جو پیچھے آدمی بیٹھا ہے، وہ تین بن مکھن کے ساتھ کھا چکا ہے، اور یہ چوتھی پیالی چائے کی پی رہا ہے۔

الن: کسی کی جیب پہ ہاتھ صاف کر دیا ہوگا۔

ننھا: واقعی؟ پوچھوں اس سے کہ اتنی صفائی سے کیسے جیب صاف کرتا ہے؟

(اٹھتا ہے)

الن: بک نہیں بیٹھا رہ۔ (ایک مسکین شکل آدمی داخل ہوتا ہے اور الن کو دیکھ کر اس کے پاس آتا ہے)

مسکین: کیوں بھائی، آپ مجھے ماڈل ٹاؤن کا راستہ بتا سکتے ہیں؟

ننھا: کیا راستہ پوچھنے کا ارادہ ہے؟ میں بتا دیتا ہوں۔ یہاں سے سیدھے سات میل ہے۔

مسکین: مجھے راستہ نہیں چاہیے۔

الن: [illegible] سامنے سڑک جا رہی ہے

اس پر چلنا شروع کر دیجیے۔ یہ سڑک چلتے چلتے ایک بڑی سڑک سے جا ملے گی۔ وہاں سے بائیں ہاتھ مڑ جائیے، چلتے جائیے۔ وہ سڑک آپ کو ایسے لگے گا جیسے ختم کبھی ہی نہ ہوگی، حتیٰ کہ آپ کے جوڑوں میں درد شروع ہو جائے گا، پاؤں میں چھالے پڑ چکے ہوں گے، دھوپ کی تپش سے سر چکرانے لگے گا اور آپ منہ کے بل پڑے ہوں گے۔ بس سمجھ لیجیے وہی ماڈل ٹاؤن ہے۔

مسکین: (گھور کر دیکھتا ہے) توبہ! یہاں تو راستہ پوچھنا بھی گویا دو دشمنوں میں۔ ان سے کیا امید ہو سکتی ہے۔ (مسکین بن والے کو دیکھتا ہے۔ اور اس کے پاس جاتا ہے)

مسکین: بھائی جان۔

دوسرا گاہک: جی؟

مسکین: بھائی جان، عزت دار آدمی ہوں۔ کچھ مطلب سے لیجیے گا۔

گاہک: جی جی، فرمائیے؟

مسکین: ماڈل ٹاؤن کا راستہ بتا سکتے ہیں؟

گاہک: سامنے بس سٹاپ پہ ایک سرخ رنگ کی بس [illegible] اس پر بیٹھ جائیے گا۔ وہ ماڈل ٹاؤن جاتی ہے۔

مسکین: بھائی [illegible]

تشگوفہ: ٹانگوں میں اب بھی اتنی طاقت ہے۔ میں کسی کی مدد کے بغیر جا سکتا ہوں۔

گاہک: مگر بھائی پیدل کیوں جاتے ہو؟ یہاں سے بہت دور ہے۔

مسکین: آپ پریشان نہ کریں۔ کتنا ہی دور ہو، آدمی ہمت سے کام لے تو پہنچ ہی جاتا ہے۔ اپنی منزل تک۔

گاہک: ارے بھائی، اس گرمی میں تو انسان، بس سے وہاں ادھ موا ہو کے پہنچتا ہے۔ تم پیدل کی بات کر رہے ہو!

مسکین: کوئی بات نہیں میں عزت دار آدمی ہوں۔ اپنی تکلیف رفع کرنے کے لیے دوسروں کو کیوں تکلیف دوں۔

گاہک: ارے بھائی، تکلیف کی کوئی بات نہیں۔ یہ لو پانچ روپے رکھ لو۔ میں جانتا ہوں تم عزت دار ہو۔ سفید پوشی نبھا رہے ہو۔

مسکین: نہ نہ، ایسا نہ کیجیے۔ یہ میرے اوپر ظلم ہوگا۔

گاہک: ارے اس میں ظلم کی کیا بات ہے۔

مسکین: جی وہ، ایک بار انسان کا ہاتھ پھیل جائے تو پھر اسے عادت ہو جاتی ہے۔ کوئی بات نہیں۔ آپ راستہ بتا دیں۔

گاہک: (جیب سے روپے نکال کر دیتا ہے) ارے بھائی یہ رکھ لو۔ انسان پر ہر طرح کا وقت آتا ہے۔ تمہاری شکل سے میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ تم نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔

مسکین: کوئی بات نہیں۔ آپ کی ہمدردی کا شکریہ (چلا جاتا ہے)

گاہک: ایک بن اور چائے اور دو۔

ننھا: یار اللن، تو نے دیکھا؟ دنیا میں اچھے لوگ بھی تو ہیں نا۔

اللن: کیوں نہیں۔ اگر اچھے لوگ نہ ہوتے تو ایسے فراڈ کس طرح زندہ رہتے، سوسائٹی میں (ایک شخص ہوٹل کے سامنے کھڑے ہو کر پکارتا ہے)

آدمی: ٹیکسی! او ٹیکسی!

(ٹیکسی کے گزرنے کی آواز اور لیپ ...)

آدمی: کم بخت رکتی ہی نہیں . . .

(آدمی اللن کی طرف غور سے دیکھتا ہے، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو)

ننھا: اللن وہ آدمی تجھے بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔

اللن: میں بھی اسے غور سے دیکھ رہا ہوں۔

ننھا: تو نے اس کے ساتھ کوئی فراڈ کیا ہوگا، ورنہ اس طرح کوئی کسی کو نہیں دیکھتا۔

اللن: نہیں یار میں نے تو اس کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

ننھا: یاد کر اس سے کوئی ادھار تو نہیں لیا؟

اللن: مجھے تو یاد نہیں آتا۔

ننھا: تو بس اسے یاد آگیا ہے۔ (آدمی مسکراتا ہوا قریب آتا ہے)

آدمی: ارے بیٹا منّن!

اللن: جی؟

آدمی: تم یہاں کیسے بھئی؟

ننھا: (آدمی سے) آپ اسے جانتے ہیں؟

آدمی: جانتا ہوں! ارے خون کا رشتہ بھی کوئی چیز ہوتی

ننھا: جی ہاں۔ خون کا بدلہ خون ہوتا ہے۔

آدمی: (اللن سے) تم پہچانتے نہیں؟

اللن: ہاں جی، اس وقت آپ کو دیکھ کر خون میں کشش سی محسوس کر رہا ہوں۔

ننھا: تیرا تو خون ہی خراب ہے، اللن، بالکل سفید ہوگیا ہے۔

اللن: بکو نہیں (آدمی سے) ٹھہر جائیے میں یاد کرتا ہوں۔ آپ کی شکل دیکھ کر عجیب سی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔

ننھا: جی ہاں، کوئی پرانا جاننے والا مل جائے تو میرے بھی عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

آدمی: تو بھلا پہچان تو میں کون ہوں

اللن: آپ . . . آپ . . . [illegible]

لن : بھلا آپ کو میں کیسے بھول سکتا ہوں آپ کو جب میں نے
ٹیکسی کو پکارتے سنا اسی وقت کھٹکا تھا کہ یہ تو اپنے
. . . . . اپنے۔
آدمی : پھوپھا ابا ہیں۔
لن : ہائے ! پھوپھا ابا ! (گلے سے لپٹ جاتا ہے)
نھا : لو لگڑا گیا۔ اب ان کی خیر نہیں۔
آدمی : ارے بیٹا، منی۔ تم یہاں اس حال میں ؟ یہ میں
کیا دیکھ رہا ہوں !
نھا : صحیح دیکھ رہے ہیں۔
آدمی : تم لوگوں کی خیریت دریافت کر کے میں تو تھک گیا
چٹا گانگ سے ہر آنے والے سے پوچھا، آپا
زینب کا بیٹا منن کہاں ہے۔ کچھ پتا نہ چلا۔ کراچی پہنچا
کہ بھئی پتا کر کے بتاؤ۔ میری سالی کا ایک ہی بیٹا تھا
منن، وہ کہاں ہے کس حال میں ہے تمھاری پھوپھی
کی رو رو کر آنکھیں کمزور ہو گئیں۔ تم زندہ ہو بیٹے ؟
نھا : ہاں جی ہم کئی سال سے زندہ ہیں۔
آدمی : بھئی یہ بچہ کون ہے ؟ اسے میں نے پہچانا نہیں۔
لن : اسے نہیں پہچانا ؟ یہ نھا ہے، مجھ سے دو سال چھوٹا
آدمی : ارے ہاں ! اب یاد آیا۔ وہ تو بڑا مریل سا تھا ہر وقت
بیمار رہتا تھا۔ ہم سمجھتے تھے یہ بچے گا نہیں مر جائے گا
مگر اس کا نام تو پپو تھا۔
لن : وہ نام بدل دیا تھا کیوں کہ ابا کا خیال تھا کہ یہ نام
اسے سوٹ نہیں کرتا۔ اسی لیے بیمار رہتا ہے۔ جب
سے اسے نھا کہنا شروع کیا، اس روز سے یہ ٹھیک
ہونا شروع ہو گیا اور اب آپ کے سامنے ہے۔
آدمی : بہت اچھا بھئی ! ہم یہاں سڑک پر کیوں کھڑے ہیں ؟
نھا : جب کہ ہوٹل موجود ہے۔
آدمی : بھئی گھر چلو۔
لن : گھر وہی ہے، جہاں پہلے تھا ؟
آدمی : [illegible] ۔ آؤ ٹیکسی کر لیں۔

لن : مگر امی تو کہتی تھیں آپ کے پاس اپنی کار ہے۔
آدمی : ہاں بھئی کار بھی ہے وہ زرینہ لے گئی ہے۔ مجھے یہاں ایک
دفتر میں کام تھا۔ میں نے کہا تم مجھے ڈراپ کر دو واپسی
پر ٹیکسی لے لوں گا (ٹیکسی کی آواز اور لپک ہو تھے ہیں ٹیکسی
ٹیکسی ! (ٹیکسی رک جاتی ہے) آؤ بیٹا، آؤ (تینوں فریم
سے نکل جاتے ہیں۔ ٹیکسی کا دروازہ کھلنے اور بند کرتے
ہیں۔ ٹیکسی اسٹارٹ ہوتی ہے چلی جاتی ہے)
(دوسرا منظر کھلتا ہے۔ یہ نہایت شان دار
ڈرائنگ روم ہے۔ وہی آدمی جو خان صاحب
کہلاتے ہیں داخل ہوتا ہے)
خان صاحب : ارے بھئی سنتی ہو بیگم ! . . . . . بیگم ! . . .
دیکھو تو کون آیا ہے بھلا . . . . .
(ایک اٹھارا انیس سال کی لڑکی برآمد
ہوتی ہے)
نھا : آہ پھوپھی جان ! (اس کی طرف بڑھتا ہے) پھوپھی جان
آپ کو دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ فوراً گلے سے لگ
جائیے۔
لن : (اسے روکتا ہے) پاگل ہوا ہے ! یہ پھوپھی جان ہیں ؟
نھا : ابھی پھوپھا خود ہی تو پکار رہے تھے۔ (نقل اتار کر)
"بیگم . . . . . او بیگم ارے دیکھو تو کون آیا ہے ؟"
خان صاحب : ارے نہیں نہیں بھئی۔ یہ تو بیٹی زرینہ ہے۔
نھا : ہیلو زرینہ۔
خان صاحب : بھئی، یہ دونوں تمھارے کزن ہیں۔
زرینہ : آداب۔
لن : آداب۔
نھا : تمھیں نہیں، مجھے کہہ رہی ہیں۔
خان صاحب : بھئی لڑو نہیں۔ تم دونوں کو کر رہی ہے۔ زرینہ
بیٹیا، یہ اپنا منن ہے اور یہ نھا ہے۔ کہاں گئیں امی
تمھاری ؟
(ایک نہایت خوب صورت ادھیڑ عمر خاتون داخل

بیٹھتا ہے)

بیگم : بھئی کون آیا ہے خان صاحب؟

خان صاحب : میں نہیں بتاؤں گا۔ تم خود ہی بوجھو تو جانیں۔

ننھا : چلیے سو سو کی شرط۔ آپ بوجھ لیں تو ہم سو روپے دیں گے آپ نہیں بوجھیں گی تو ہم دو سو روپے لیں گے۔

خان صاحب : ہاں بھئی ہو گئی شرط۔ چلو، پہچانو۔ زرینہ تم نہیں بتاؤ گی۔

بیگم : یہ ...... یہ ہمارے پرانے محلے والے اجمیری صاحب کے لڑکے ہیں جو سعودیہ چلے گئے تھے۔

خان صاحب : گولی مارو اجمیری کو ...... یہ تو اور ہی چیز ہیں۔

بیگم : بھئی پہیلیاں نہ بجھواؤ، جلدی سے بتاؤ۔

خان صاحب : تمہارے خون میں کوئی کشش نہیں محسوس ہو رہی ہے؟

ننھا : بغیر بتلائے کبھی نہیں ہو گا۔ آپ کے دو سو روپے گئے۔

خان صاحب : ارے بھئی، تمہارے بھائی کے بیٹے ہیں، دونوں۔ منی اور ننھا۔

بیگم : (چیخ مارتی ہیں) بھائی طفیل کے بیٹے! ارے تم دونوں زندہ ہو!

ننھا : جی ہاں۔ کئی سال سے۔

بیگم : ہائے بلائیں لگ جاؤ میرے بچو۔

ننھا : پہلے روپے نکالیں۔

بیگم : ہائے لیا (دونوں گلے لگ جاتے ہیں) ہائے! ٹھنڈی پڑ گئی کلیجے میں۔ میں تو تم دونوں کی جان کی دعائیں مانگتی تھی۔ راتوں کو تمہاری فکر میں نیند نہیں آتی تھی۔

ننھا : ہمیں خود فکر کے مارے نیند نہیں آتی۔

بیگم : اللہ میرے! تو نے یہ دن نصیب کیا ارے، ان بچوں کے لیے چائے والے لاؤ، بیٹیا زرینہ۔

زرینہ : یس ممی (چلی جاتی ہے)

ننھا : زرینہ کی بہن رضیہ کہاں ہے؟

بیگم : زرینہ کی بہن رضیہ کب تھی۔ وہ تو زکیہ تھی۔

ننھا : ہاں اسی کا پوچھ رہا ہوں۔

بیگم : وہ کراچی میں ہیں۔ اس کی شادی ہو گئی۔

خان صاحب : ارے ہاں منی بیٹا، تمہاری بھی تو بات چل رہی تھی چاٹگام میں تایا ابن کی بیٹی سے؟

ننھا : ہاں جی اس کی شادی ہو گئی۔

خان صاحب : تیری اماں کا خط آیا تھا۔ مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے کہا پروین اور منی کی ضرور شادی کرا دو۔

الن : اپنی پنو کی بات کر رہے ہیں آپ؟

خان صاحب : بیٹا بہت بہت مبارک ہو وہ بھی یتیم بچی تھی میں بھی چاہتا تھا کہ گھر کی لڑکی گھر میں رہے۔ یا ہرنہ پھرے (زرینہ چائے کی ٹرے لے کر آتی ہے) گھر میں لڑکا اور لڑکی موجود ہوں تو باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔

بیگم : بیٹے شادی کو کتنے سال ہوئے؟

الن : تیسرا سال چل رہا ہے۔

بیگم : ماشاءاللہ کوئی بچہ ہے؟

الن : جی ہاں ایک بچہ ہے، پورے دو سال کا۔

ننھا : بالکل گول مٹول سا، جیسا بنٹا ہوتا ہے۔ بڑا ہی شرارتی الن، وہ کیا کہہ رہا تھا؟ میں اسکول نہیں جاؤں گا۔

خان صاحب : پونے دو سال کا بچہ؟

ننھا : ہاں جی ہر وقت ٹی وی دیکھتا رہتا ہے۔ وہاں سے اس نے یہ باتیں سیکھ لی ہیں۔ پرسوں جنگل گا رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے چپ کرایا۔

بیگم : تو تم لوگ یہاں پہنچے کب؟

الن : جی کوئی دو مہینے ہو گئے۔ ہم تو وایا برما آئے ہیں۔ چاٹگام سے برما، برما سے نیپال، نیپال سے کابل، کابل سے پشاور اور پشاور سے کراچی۔

ننھا : اور کراچی سے لاہور۔ بہت صعوبت تلاش کیا تو نے۔

بیگم : ساتھ کون کون آسکا؟

ننھا: جی

بیگم: اور پروین اور تمہارا بیٹا اور تمہاری امی؟

الن: جی وہ سب کراچی آگئے ہیں۔

بیگم: کراچی میں کس کے پاس ہیں؟

الن: امی کی ایک سہیلی ہیں۔ ان کے پاس۔

بیگم: اچھا، اچھا۔ لو بھئی کراچی جانے کی کیا ضرورت تھی یہیں آجاتے ہمارے پاس۔

الن: آپ کو تو پتا ہی ہے، سب کچھ لٹ لٹا گیا وہاں۔

ننھا: پیسے پیسے کی مجبوری ہے۔ نوبت فاقوں تک آپہنچی ہے۔

خان صاحب: مجبوری کیسی؟ اللہ کا دیا سب کچھ ہے یہاں سب کو بلواؤ یہاں۔ تمہارے لیے کاروبار کا بندوبست میں کیے دیتا ہوں۔ ساٹھ ستر ہزار سے کام شروع کر دو۔

ننھا: لائیے نکالیے۔

الن: بکو نہیں۔ تو پھوپھا جان، آپ کی اپنی بھی تو بزنس ہے؟

خان صاحب: ہاں بھئی۔ اپنی دو دو فیکٹریاں ہیں، پنکھوں کی۔

ننھا: تو ہم دونوں کو ایک ٹیبل فین تو دے دیں۔ گرمی کے مارے نیند نہیں آتی۔

بیگم: ارے بھئی، فیکٹری تمہاری ہے تم لوگوں کا سامان کہاں ہے؟

ننھا: چاٹگام میں۔

الن: سب کچھ وہیں رہ گیا بس جو ہمارے بدن پر آپ دیکھ رہی ہیں وہی بچا ہے۔

ننھا: شکر ہے یہ کپڑے ہم نے پہن رکھے تھے، ورنہ سوچیے کیا ہوتا!

بیگم: ارے، تم دونوں کی جان بچ گئی یہی بہت ہے کپڑوں کا کیا ہے وہ تو بھی بن جائیں گے۔

ننھا: کہاں سے بن جائیں گے؟

خان صاحب: بھئی زرینہ کے ساتھ چلے جاؤ اور ہمارے ٹیلر کو ناپ دے آؤ۔

ننھا: چل الن، بہترین موقع ہے۔ اس دفعہ میں بھی بالکل ویسے ہی کپڑے سلواؤں گا جیسے تو پہنتا ہے۔

بیگم: ہاں بھئی تم دونوں جو جی چاہے پہنو۔ بس ہماری آنکھوں کے سامنے رہو۔ ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے۔

زرینہ: آپ چائے ختم کرلیں۔

ننھا: (گرم پیالی منہ سے لگاتا ہے منہ جل جاتا ہے) اوئی اوئی...

خان صاحب: تم لوگ چائے پیو۔ میں تمہارے کمرے ٹھیک کرتا ہوں۔ آؤ بیگم۔

بیگم: ان کو شرط کے پیسے تو دے دوں (دو نوٹ سو سو کے دیتی ہیں) یہ لو دونوں کا ایک ایک ہے۔

ننھا: سن لے۔ اس میں میرا بھی ایک ہے بعد میں مکر نہ جانا تیری عادت ہے۔

خان صاحب: ارے بھئی تو ایک ایک ہزار تمھیں اور ملے گا۔

ننھا: وہ کس خوشی میں جناب؟

خان صاحب: میں نے عہد کیا تھا کہ جب منن اور پنو کی شادی ہوگی تو اسے میں اور بیگم ایک ایک ہزار سلامی کے دیں گے۔ اب تو بینک کا وقت ختم ہو گیا کل تمھیں دوں گا۔

ننھا: میں بھی لوں گا۔

الن: تم کیوں لوگے؟

ننھا: تم کیوں لوگے؟

الن: میری تو شادی ہو گئی ہے۔

ننھا: تو میں بھی اپنی شادی پر لوں گا ٹھیک؟

خان صاحب اور بیگم: ٹھیک بالکل ٹھیک (بیگم الن کا ماتھا چومتی ہے اور خان صاحب ننھے کا دونوں چلے جاتے ہیں۔ فیڈ آؤٹ)

(منظر کھلتا ہے الن اور ننھا ڈائننگ روم میں بیٹھے ہیں)

ننھا: یار الن میں تو کہتا ہوں نکل چل یہاں سے ابھی وقت ہے۔

الن : یہیں ! یہاں کیا تکلیف ہے ؟ کھانے کو عمدہ کھانا ، پہننے کو عمدہ کپڑا ، رہنے کو عمدہ مکان - سیر کے لیے گاڑی -

ننھا : یار خواہ مخواہ بھید کھل گیا تو مارے جائیں گے - ہمارے پاس دو سو کیش بھی ہیں - آ نکل چل -

الن : پاگل ہوا ہے ؟ ابھی دو ہزار اور لینے ہیں پھوپھا بنک سے رقم لے کر آ رہے ہوں گے - تجھے کیا پتا ہے دونوں میاں بیوی بنک گئے ہیں ، روپے نکلوانے -

ننھا : لالچ مت کر الن ، ہمارے لیے یہ دو سو ہی بہت ہیں

الن : تمہارے لیے بہت ہوں گے - میں تو دو ہزار لیے بغیر جاؤں گا نہیں -

(دروازے کی گھنٹی بجتی ہے)

الن : (جا کر دروازہ کھولتا ہے) آئیے (ایک دبلا پتلا سا نوجوان داخل ہوتا ہے)

نوجوان : خان صاحب یہیں رہتے ہیں ؟

الن : کون خان صاحب ؟

نوجوان : میرے پھوپھا ہیں -

الن : پھوپھا ؟

نوجوان : جی ہاں -

الن : تمہارا نام منن تو نہیں ؟

نوجوان : جی بالکل میں منن ہی ہوں -

الن : تم زندہ ہو ؟

ننھا : اندھا ہے ؟ نظر نہیں آرہا ؟ بھاگ -

الن : بکو نہیں (نوجوان سے) تم چاٹگام میں تھے ؟

نوجوان : جی ہاں مگر آپ سب سوالات کیوں کر رہے ہیں ؟

ننھا : ہاں الن ، اب سوال جواب کا وقت نہیں ہے -

نوجوان : پھوپھا کہاں ہیں ؟

الن : وہ بنک گئے ہیں -

نوجوان : اور پھوپھی ؟

الن : وہ اس کمرے میں ہیں سامنے (اشارہ کرتا ہے) (نوجوان کمرے کی طرف بڑھتا ہے - الن ایک میز پوش کھینچ کر نوجوان کے منہ پر باندھنے لگتا ہے اور کمرے کے پاس لے جاتا ہے - ننھا بھی اس کے پیچھے ہے)

الن : (کمرے میں چل ، تو اس کے ہاتھ باندھ) میں اس کا منہ باندھتا ہوں -

نوجوان : یہ کیا کر رہے ہو ؟

ننھا : یہ ہم پریکٹیکل جوک کر رہے ہیں -

الن : دروازہ بند کر (ننھا دروازہ بند کر دیتا ہے - تھوڑی دیر میں خان صاحب ، زرینہ اور بیگم داخل ہوتی ہیں)

خان صاحب : ارے بچو کہاں ہو ؟ ارے بھئی منن ! ننھے ! چلے گئے دونوں ؟

بیگم : نہیں ہوں گے کہاں جائیں گے - (گھنٹی بجتی ہے)

خان صاحب : (دروازہ پر) کون ؟

ایک لڑکی : جی خان صاحب انبالے والے کی کوٹھی یہی ہے ؟

خان صاحب : جی ہاں - آجاؤ بیٹی - تم کون ہو ؟

لڑکی : جی میں پروین ہوں -

خان صاحب : بیٹھو (لپٹے جاتے ہیں) اچھا ہوا بیٹی تم آ گئیں - بچہ کہاں ہے منن کا ؟

لڑکی : وہ تو کراچی میں ہے امی کے پاس

بیگم : (گلے لگا لیتی ہے) اللہ تو نے یہ دن نصیب کیا - ہم تو نا امید ہو گئے تھے -

لڑکی : منن کہاں ہیں ؟

بیگم : یہیں تو تمہارا بیکار ہے ، بیٹا منن - (الن نکل کر آتا ہے)

الن : جی پھوپھی جان

بیگم : لے پروین بھی آگئی -

الن : او ! تو بھی آگئی ؟ کمال ہے -

لڑکی : کیا ؟

الن : لائیے سلامی نکالیے پھوپھا جان -

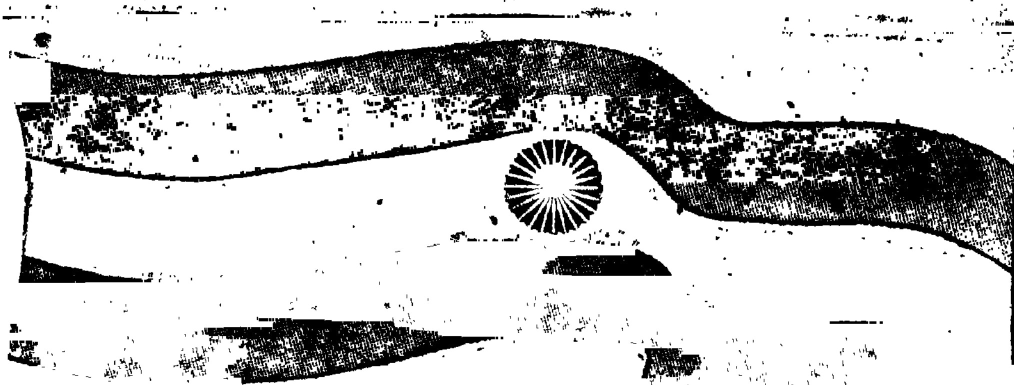
خان صاحب : نہیں تجھے نہیں - میں تو پروین کو دوں گا -

الن : پروین اور میں کوئی دو ہیں ؟ (نوٹ لے لیتا ہے - واپس لے لیتے ہیں - الن بیچارے کو خوش کرتا ہے

لڑکا : (الجھ سے) تم کون ؟
بیگم : ہاں تو کون ہوتا ہے جسے پروین کو دیں گے سلامی کے پیسے
لڑکی : یہ ہے کون ؟
خان صاحب : یہ منن ہے بیٹا ۔
لڑکی : یہ منن کب ہے ؟ (ننھا داخل ہوتا ہے)
ننھا : یہ منن کب ہے یہ تو الن ہے ۔
خان صاحب : کیا ؟
(اندر سے کوئی دروازہ زور سے کھٹکھٹا رہا ہے، خان صاحب دروازہ کھولتے ہیں منن باہر آتا ہے)
ننھا : منن یہ ہے ۔
خان صاحب : اور تم دونوں کون ہو ؟
ننھا : الن اور ننھا (ننھا منن کی پٹی کھولتا ہے)
خان صاحب : تو تم دونوں نقلی بھتیجے بنے ہوئے تھے ! زرینہ پولیس کو فون کرو ۔
لڑکی : حد ہوگئی ۔ میں وہاں ٹیکسی میں بیٹھی منن کا انتظار کر رہی تھی ۔ وہ آپ کی کوٹھی کا پتہ پوچھنے آئے اور میرا خیال ہے ان دونوں نے انھیں دبوچ لیا ۔
ننھا : بالکل ہم دونوں نے ایک منٹ دیر نہیں کی ۔
خان صاحب : تمھیں گرفتار کرنے میں پولیس بھی ایک منٹ دیر نہیں کرے گی ۔

ننھا : جی ہاں نہیں کرے گی (چونک کر) کیا ؟ نہیں جی ۔ آپ ہمیں معاف کر دیں پھوپھا جان ۔
(پاؤں پر گر جاتا ہے)
خان صاحب : خبردار ! جو مجھے پھوپھا جان کہا !
ننھا : پھوپھی جان !
بیگم : نکل باہر دفع ہو
ننھا : زرینہ ! اب تو صرف تم سے کہہ سکتا ہوں دل کی بات ۔ معاف کر دو ۔ ہم دونوں بھوکے پیاسے ہوٹل میں بیٹھے تھے ۔ یہ ہمیں زبردستی لے آئے (منن کی طرف اشارہ کرتا ہے) ان بھائی صاحب کی ملاقات نہ ہوتی تو ہم یہاں اور رہ لیتے ۔
خان صاحب : نکل جاؤ دونوں صورت حرام کہیں کے (دونوں نکل جاتے ہیں)
ننھا : میں کہہ رہا تھا نا کہ دو سو کافی ہیں دو ہزار کے پیچھے ہم نے دو سو بھی گنوا دیئے ۔
الن : یار غلطی ہوگئی ۔
ننھا : بس غلطی ہوگئی کہہ دیتا ہے ۔ ایک ہاتھ دوں گا ۔
الن : امی ! امی !
(فیڈ آؤٹ)

•●•



زندہ دلانِ حیدرآباد
کا ترجمان

شگوفہ

جلد ۲۴
شمارہ ۹
ستمبر ۱۹۹۱ء

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلس مشاورت:
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
یوسف ناظم
مجتبیٰ حسین
دلیپ سنگھ

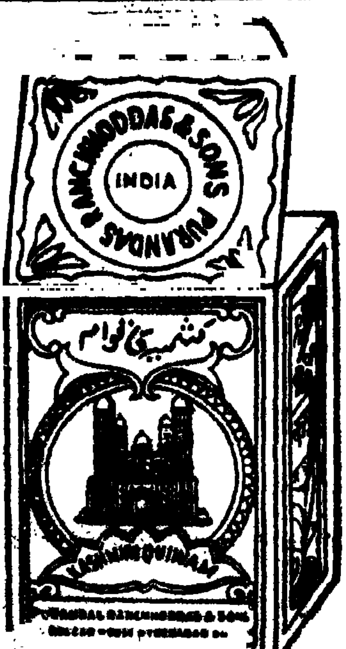
مجلس ادارت:
مضطر مجاز
محمد حمایت اللہ
صلاح الدین نیر
طالب خوندمیری

خصوصی نمائندے:
بمبئی: فیاض احمد فیضی
ریاض: عابد معز
دوبئی: غلام نجم الدین
آسٹریلیا: ایس ایم معین

فی پرچہ: ۶ روپے
زرِ سالانہ: ۶۰ روپے
عرب ممالک سے: ۵۰ ریال، دیگر ممالک: ۳۰۰ روپے سکہ ہند

طباعت: دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد

"شگوفہ" ۱۱-۳۱۰۰ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
فون 557716 مکان 521064


INDIA
کشمیری قوام

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

گوشۂ فیاض احمد فیضی

مال مفت (انشائیے)

پچورن (منظومات)

مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

مقالہ "شگوفہ کی ادبی خدمات" پر عزیزہ ابرار کو ایم فل کی ڈگری

یونیورسٹی آف حیدرآباد نے جناب عزیزہ ابرار (اے۔ایم۔اے۔عزیز) کو ان کے مقالے "شگوفہ کی ادبی خدمات" پر اردو میں ماسٹر آف فلاسفی (ایم فل) کی ڈگری عطا کی ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر رحمت یوسف زئی کی نگرانی میں اپنا مقالہ تحریر کیا۔ عزیزہ ابرار کا مقالہ (۲۲۶) صفحات پر مشتمل ہے۔

مقالہ حسب ذیل پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا۔

(۱) حیدرآباد میں اردو طنز و مزاح کا ارتقا (۲) زندہ دلانِ حیدرآباد کا قیام اور شگوفہ کا اجرا (۳) شگوفہ کی طنزیہ و مزاحیہ نثر نگاری (۴) شگوفہ کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری (۵) طنز و مزاح میں شگوفہ کا مقام۔ مسٹر عزیزہ ابرار یونیورسٹی آف حیدرآباد کے پی۔ایچ ڈی اسکالر ہیں۔ کالج آف انجینئرنگ میں لکچرر کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے ہیں۔ آل انڈیا اردو ریسرچ اسکالرس کونسل کے جنرل سکریٹری ہیں۔ حیدرآباد کے ابھرتے ہوئے نقاد، افسانہ نگار، ادیب اور شاعر ہیں۔ ان کی تحریریں ملکی اور غیر ملکی اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ نیز آل انڈیا حیدرآباد کے لیے ۱۹۷۳ء سے لکھ رہے ہیں۔

مجتبیٰ حسین

قند و زقند

ادب

فیاض احمد فیضی

پچھلے ہفتہ میں اپنے دفتر میں "قند و زقند" کا مطالعہ کر رہا تھا (ایسے کام میں دفتر کے اوقات میں ہی انجام دیتا ہوں) کہ اچانک میرے ایک دوست ملنے کے لیے آگئے۔ ان کی آمد کے پیشِ نظر جب میں "قند و زقند" کے نسخے کو میز کی دراز میں رکھنے لگا تو بولے "میاں بہت دنوں بعد آج تمہیں ایک کتاب کے مطالعے میں غرق پایا ہے۔ ذرا دیکھیں تو سہی کہ ایسی کون سی نیک بخت کتاب ہے جو اپنے آپ کو تم سے پڑھوا رہی ہے۔"

میں نے کتاب میز کی دراز میں رکھ دی کیوں کہ مجھے اپنی ادب اور کتاب، تینوں کی عافیت اسی میں نظر آئی، کیوں کہ میں جس دوست کا ذکر کر رہا ہوں وہ ادب کے بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں جتنا کہ آج کے نئے لکھنے والے۔ اسی لیے میں ادب کے موضوع پر کبھی ان سے تبادلۂ خیال نہیں کرتا۔ موجودہ سیاست اور جرائم ہی دو ایسے موضوعات ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دونوں ایک ہی موضوع ہیں، جن کے بارے میں میں کبھی کبھار بحالتِ مجبوری تبادلۂ خیال کر لیتا ہوں۔ بولے "میاں کتاب کیوں چھپا رہے ہو جیسے اسمگلنگ کا مال ہو۔"

میں نے کہا "بھیا! ابھی اس کتاب کا اجرا نہیں ہوا ہے۔ جب ہو جائے تو پڑھ لینا۔" بولے "کتاب تو چھپ چکی ہے۔ اب اجرا ہو جائے تو کیا اس میں نئے معنی و مطالب پیدا ہو جائیں گے۔ یہ سب ہم جیسوں کے چونچلے ہیں۔ بھلا بتاؤ دیوانِ غالب اور کلیاتِ نظیر اکبرآبادی کی کبھی رسمِ اجرا ہوئی تھی مگر دیکھو کہ رسمِ اجرا کے بغیر بھی یہ کتابیں آج تک پڑھی جا رہی ہیں۔"

میں نے کہا "یار! یہ ادب کے معاملے ہیں۔ تم کیوں اپنے آپ ہلکان کرتے ہو۔" بولے "اچھا یہ تو بتاؤ کتاب کا نام کیا ہے؟"

میں نے کہا "قند و زقند"

کچھ دیر سوچ کر بولے "مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ تم ضرور کسی پوشیدہ مرض میں مبتلا ہو تبھی تو یونانی طب کی کتاب پڑھ رہے ہو۔"

میں نے ماتھا پیٹ کر کہا "بھیا! یہ یونانی طب کی کتاب نہیں ہے۔"

... قند ... شکر قند اور قند کا ہے؟

میں نے کہا "تم جانتے ہو کہ میں تم سے بحث نہیں کرتا۔ بس اتنا کہے دیتا ہوں کہ یہ یونانی طب کی کتاب نہیں ہے۔"

بولے اچھا یہ بتاؤ یہ کتاب کونسی زبان میں لکھی گئی ہے؟"

میں نے کہا "بھیا جب تم آئے ہو تو میں اس کتاب کو پڑھ رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ کتاب اس زبان میں لکھی گئی ہے جسے میں جانتا ہوں۔"

اپنے ہونٹوں پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ کو پھیلاتے ہوئے بولے "اچھا! تو یہ جاپانی زبان کی کتاب ہے"۔

میں نے تاڑ لیا کہ یہ چھیڑ خانی کے موڈ میں ہیں۔ لہذا ان کی بات کو ٹالنے کے لیے میں انجان بن گیا تو چھیڑ کر پوچھا "اگر بہ فرض محال یہ اردو کی کتاب ہے تو بتاؤ کس صنف کی کتاب ہے۔"

میں نے کہا "صنف کا تم خود اندازہ لگالو۔"

بولے "شعری مجموعہ تو یہ ہو نہیں سکتا کیوں کہ شعری مجموعوں کے ایسے خوب صورت نام رکھنے کا اب کوئی چلن نہیں۔ تنقید کی کتاب البتہ یہ ہو سکتی ہے۔"

میں نے پوچھا "تم نے کیسے اندازہ لگایا؟"

بولے "ہمارے ناقد تنقید کے میدان میں زقندیں بھرنے کے سوائے اور کیا کرتے ہیں؟ رہی قند کی بات تو اسے "ضرورت نثری" کے تحت زقند کے ساتھ لگا دیا ہے۔ اور کیا؟"

میں نے کہا "تم پرلے گاودی ہو۔ یہ نہ تنقید کی کتاب ہے نہ شعری مجموعہ یہ طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔"

ان کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بولے "یار! کہیں تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو۔ کیا یہ سچ مچ طنز و مزاح کی کتاب ہے؟"

میں نے درازمیں سے کتاب نکالی اور کتاب کے دوسرے صفحہ پر پبلشر کی طرف سے انگریزی میں چھپا ہوا کتاب کا نام دکھایا اور اس کے نیچے کتاب کی صنف کی صراحت کے لیے انگریزی میں چھپا ہوا لفظ "ہیومر" "HUMER" بھی دکھایا۔ ان کا منہ اور بھی حیرت سے کھل گیا۔ بولے یار! یہ HUMER والا ہیومر اصلی "HUMOUR" ہیومر ہے یا کوئی اور ہیومر"

میں نے کہا یہ اردو پبلشروں کی انگریزی ہے ورنہ یہ ہے تو طنز و مزاح ہی۔"

بولے "مجھے بھی اب یقین ہوتا جا رہا ہے کہ یہ طنز و مزاح کی ہی کتاب ہے کیوں کہ کنہیا لال کپور بھی اپنی کتابوں کے ناموں میں حرف عطف یعنی "و" کے استعمال کو ضروری سمجھتے تھے جیسے "شیشہ و تیشہ" "سنگ و خشت" "بال و پر" ویسے تمہارے یوسف ناظم صاحب کے پہلے طنزیہ و مزاحیہ مجموعۂ مضامین کا نام بھی "کیف و کم" ہی تھا جس کے بارے میں تمہارے دوست باقر مہدی کہتے ہیں کہ اس میں کیف بھی کم ہے اور کم بھی کم ہے۔"

میں نے کہا "اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب پر تو تمہاری بہت گہری نظر ہے"

بولے "میری نظر کی بات تو رہنے دو۔ یہ بتاؤ کتاب کا مصنف کون ہے؟"

میں نے کہا "فیاض احمد فیضی۔"

کچھ دیر سوچ کر بولے "یار! یہ فیاض احمد فیضی تو آب زم زم کا پانی اور شب برات کی رات جیسی چیز نظر آتے ہیں پہلے تو فیض احمد فیض کے نام میں بھی فیض کی بہتات نظر آتی ہے بھلا اسے فیض جاریہ تک کہا جا سکتا ہے۔

لیکن یہاں تو فیض کی تذکیر اور تانیث دونوں کی نہ صرف آمیزش بلکہ آویزش تک نظر آتی ہے۔ بخدا مصنف نے اپنا نام بھی اپنے مجموعۂ مضامین کے نام کی طرح ہی رکھا ہے۔ اگر ان کو کوئی ان کے مضامین کا نام "فیاض و فیضی" رکھ دے اور مصنف کا نام "قند احمد زقند" رکھ دے تو بھلا کون یہ جان سکتا ہے کہ اس میں مصنف کا نام کون سا ہے اور کتاب کا نام کون سا"۔

میں نے ہاتھ جوڑ کر اپنے دوست سے کہا "بھیا! اب خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ مجھے اس کتاب کی رسم اجرا میں شرکت کے لیے بمبئی جانا ہے اور تم مجھے کنفیوز کرتے جا رہے ہو"۔

بولے: "بھیا کنفیوز تو میں ہو رہا ہوں۔ بھلا بتاؤ وہ کون سی قند ہے جسے کھا کر آدمی زقند بھرنے لگ جائے۔ بے شمار حلوائیوں سے میرے بھی مراسم ہیں ایسی قند تو میں نے آج تک نہ دیکھی نہ کھائی"۔

میں نے کہا "مگر مجھے تو اس کتاب میں وہ قند ملی ہے جس کا مزہ چکھ کر آدمی زقند بھرنا شروع کر دے"۔

میرے کمرے سے جاتے ہوئے بولے "میاں! تمھارے ساتھ مشکل یہ ہے کہ تم نیکی بھی گناہ کی طرح کرتے ہو اور تمھارے گناہ کے تیور نیکی جیسے ہوتے ہیں"۔

حضرات! قند و زقند کے بارے میں میرے دوست سے جو گفتگو ہوئی تھی اُسے میں نے من و عن تفننِ طبع کے طور پر اوپر بیان کر دیا ہے۔ اس بات چیت کا قند و زقند اور خود فیاض احمد فیضی سے اتنا تعلق نہیں ہے جتنا کہ میرے دوست کی کج فہمی سے ہے۔ لہٰذا اب میں اپنے طور پر فیاض احمد فیضی کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ فیاض احمد فیضی کو میں نے سب سے پہلے بارہ تیرہ برس پہلے زندہ دلانِ حیدرآباد کے ادبی اجلاس میں سنا تھا۔ جسمانی اعتبار سے کم عمر تو وہ تب بھی تھے لیکن اب تو اور بھی کم عمر نظر آنے لگے ہیں۔ حیدرآباد کے سامعین نے فیاض احمد فیضی کے حیدرآبادی نہ ہونے کے باوجود جس طرح ان کی پذیرائی کی تھی وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ اسی محفل میں ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ بعد میں جتنی مرتبہ وہ ملے ایسی ہی محفلوں میں ملے اور میں نے انھیں ہر محفل میں دونوں ہاتھوں سے داد وصول کرتے ہوئے دیکھا۔ جون ۱۹۸۸ء میں کراچی میں جب پہلی پاک ہند طنز و مزاح کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں فیاض احمد فیضی نے بھی شرکت کی۔ اس کانفرنس میں ان کے مضمون "پھلوں میں رنگ بھرے" کو بے پناہ داد ملی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ان کا یہ مضمون پھلوں کے بارے میں ہے۔ جتنے دن کراچی میں رہے ہر ادبی محفل میں لوگ فرمائش کر کے ان سے یہ مضمون سنتے تھے۔ فرمائش کا انداز کچھ اس طرح ہوتا تھا "بھئی وہ سنگترے والا مضمون سنائیے۔ کوئی کہتا "سیب والا مضمون عنایت ہو"۔ "ہاں بھئی وہ لیچی والا مضمون عطا ہو"۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا "بھئی! وہ جامنوں والا مضمون پڑھیے"۔ حالاں کہ جامن کو فیاض احمد فیضی نے پھلوں میں ہی نہیں کیا تھا۔ فیضی کا یہ بے حد کامیاب مضمون ہے لیکن کراچی میں خصوصیت کے ساتھ اس مضمون کی کامیابی کا راز وہاں کسی نے یہ بتایا کہ کراچی میں پھلوں کی قلت ہے اور لوگ ایسے ہی مضامین میں پائے جانے والے پھلوں یا صبر کے پھل پر گزارا کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے تو انھیں فروٹ مرچنٹ سمجھ کر یہاں تک پوچھ لیا کہ بمبئی میں ان کی فروٹ شاپ کس علاقے میں واقع ہے۔

فیضی کو میں جب بھی کوئی مضمون سناتے ہوئے دیکھتا ہوں تو خوش ہو جاتا ہوں۔ ایک تو یہ پڑھتے بہت اچھا

ہیں اور جتنا اچھا پڑھتے ہیں اس سے کہیں زیادہ اچھا لکھتے ہیں۔ میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کے نئے مزاح نگاروں میں فیاض احمد فیضی کو زبان کے تخلیقی استعمال پر جو قدرت حاصل ہے وہ بہت کم کے حصے میں آئی ہے۔ یوں تو ادب کے ہر شعبہ میں زبان کی اہمیت مسلمہ ہوتی ہے لیکن مزاح نگاری کے معاملے میں زبان کی بنیادی اہمیت ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں ایسے مزاح نگار بھی گزرے ہیں جو صرف لفظوں سے کھیلنے کا ہنر جانتے تھے۔ لفظوں کو ایسی چابک دستی سے استعمال کرتے تھے کہ ان میں نئے معنی اور نئے مطالب پیدا ہو جاتے تھے۔ فیضی نہ صرف زبان پر قدرت رکھتے ہیں بلکہ اپنے موضوعات کا بھی بڑی ہوشیاری سے انتخاب کرتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ تیز اور ہمہ جہتی ہے۔ ان کے یہ جملے ملاحظہ فرمائیے :

"سنگترے کی ساخت کرکٹ کے گیند جیسی اور اس کا سائز ٹیکا مانگ گاتے ہوئے استاد کے کھلے ہوئے منہ کے برابر ہوتا ہے "

" ریاست بہار کی دو چیزیں ہندوستان بھر میں مشہور ہیں۔ ایک خود بہاری اور دوسرے لیچی " -

فیاض احمد فیضی نے " قندوز قند " کے دیباچے میں لکھا ہے :

" کسی زمانے میں مزاح واقعی اسٹیفن لیکاک کے الفاظ میں زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام تھا جس کا فنکارانہ اظہار ہو جائے " لیکن اس دوران میں زمانے نے اتنی ترقی کر لی ہے اور ناہمواریاں ہماری زندگی اور ہمارے معاشرہ کا کچھ اس طرح لازمی جزو بن گئی ہیں کہ ان پر قلم اٹھانا گویا خود کو دوسروں کا نشانۂ تضحیک بنانا ہے۔ جہاں تک ہمدردانہ شعور کا تعلق ہے اب ہم تمام ادیب و فنکار اپنی ذات سے ہمدردی رکھنے ہی کو باشعور ہونے کی دلیل مانتے ہیں "

فیاض احمد فیضی نے ان چند جملوں میں مزاح نگاری کے تئیں پوری ایمانداری کے ساتھ نہ صرف اپنے "نقطۂ نظر" کا اظہار کر دیا ہے بلکہ آج کے معاشرے کے کھوکھلے پن کو بھی ظاہر کر دیا ہے۔

اپنی بات کو ختم کرنے سے پہلے ایک اور بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہمارے بعض مزاح نگاروں کی تحریروں میں کسی نہ کسی شہر کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ جیسے رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں علی گڑھ شوکت تھانوی کی تحریروں میں لکھنؤ، پطرس بخاری کی تحریروں میں لاہور، یوسف ناظم اور خود میری تحریروں میں حیدرآباد۔

شہر صرف اس کو نہیں کہتے جس میں لوگ آباد ہوں بلکہ سچا شہر وہ ہوتا ہے جو خود لوگوں میں آباد ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں جو علی گڑھ آباد ہے وہ اصلی علی گڑھ سے بہت بڑا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ ایک قصبہ نہیں بلکہ عالم کی طرح نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن وہ واحد شہر ہے جو کسی مزاح نگار کی تحریروں میں اب تک اس طرح آباد نہیں ہوا تھا جیسا کہ فیاض احمد فیضی کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ بمبئی شہر کے مخصوص مزاج کے اعتبار سے دیگر واقعی اس شہر کا کوئی مزاج ہے تو ہمارا یہ خیال غلط ہے کہ یہاں [illegible] ہے مطلب شہر [illegible] ہے لیکن فیاض احمد فیضی کی تحریروں میں بمبئی آباد نظر آتا ہے وہ یہاں ایک شہر کی طرح دکھائی دیتا ہے۔

فیاض احمد فیضی کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ [illegible]

کہ کہیں کسی کتاب کی رسم اجرا انجام پانے والی ہو اور ہم فوراً ایک مضمون لکھ کر پہنچ گئے۔ سولہ برس کی مزاح نگاری کے بعد ان کا پہلا مجموعہ شائع ہو رہا ہے جو بیس مضامین پر مشتمل ہے۔ کم لکھنے کے لیے ادیب کو کافی وقت چاہیے اور یہ وقت فیاض احمد فیضی کو میسر ہے۔ بلاشبہ "قند زقند" اردو مزاح نگاری کے سرمایہ میں ایک نہایت اہم معتبر اور قابل قدر اضافہ ہے۔ میں فیاض احمد فیضی کو ان کے پہلے مجموعے کی اشاعت پر مبارک باد دیتا ہوں۔

...... خالی پیلی زندگی کا بڑا اہم جزو ہے۔ بعض لوگ تو اپنی ساری عمر خالی پیلی بتا دیتے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ لوگ اتنی مصروفیتیں اپنے اوپر لاد لیتے ہیں کہ عمر بھر ان کے دل کی تمنا دل میں ہی رہ جاتی ہے کہ زندگی کا کچھ حصہ تو خالی پیلی گزاریں۔ ایسے لوگ ساری زندگی بھاگتے دوڑتے گزار دیتے ہیں اور بھاگتے دوڑتے ہی اچانک کہیں موت کو گلے لگا لیتے ہیں لیکن ایسے لوگ کم از کم ہمارے ملک میں بہت کم ہیں یہاں تو روز۔ خالی مکھیاں مارتے آدمی اکتا جاتا ہے تو کوئی ایسی مصروفیت ڈھونڈ نکالتا ہے جس میں تکان نہ ہوتی ہو۔ جاپان جیسے ملکوں میں خالی پیلی کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا بلکہ وہاں تو لوگ اسے جرم سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں جاپان کی ترقی کا یہی راز ہے مگر ایسی ترقی کا کیا فائدہ جس میں خالی پیلی کی رونق نہ ہو۔ اسی لیے تو یہ ہمارے ہاں اتنی مقبول ہے۔ شمالی اور مشرقی ہندوستان میں تو لوگ بڑے شوق سے دن کا بڑا حصہ خالی پیلی کاٹ دیتے ہیں اور رات کے بارے میں تو طے ہے کہ یہ خالی پیلی کے لیے ہی ہوتی ہے۔ بمبئی جیسے شہر میں بھی جہاں آدمی عمر کا ایک تہائی حصہ سفر کرتے ہوئے گزار دیتا ہے، بعض لوگ تو محض خالی پیلی کے لیے لمبی چھٹیاں لیتے ہیں اور ہفتوں لمبی تان کر سوتے رہتے ہیں۔ کام جائے بھاڑ میں، زندگی کا خوش گوار لمحہ وہ ہے جب اسے ساری دنیا خالی پیلی معلوم ہو یہ وہ لمحہ ہے جو آدمی کو عام انسانوں کی سطح سے کہیں اوپر اٹھا دیتا ہے مگر اس کی شرط یہ ہے کہ اس کا پیٹ یا تو ضرورت سے زیادہ بھرا ہوا ہو یا وہ کئی روز سے فاقہ کر رہا ہو۔ یہی وہ لمحہ تھا جس نے سدھارتھ کو گوتم بدھ بنا دیا تھا اور وہ اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کو سوتا چھوڑ کر جنگل کی راہ سدھارے تھے اور گیان حاصل کیا تھا۔ اب تو ہرے بھرے جنگل باقی نہ رہے، ان کی جگہ ریگستانوں نے لے لی اور نہ آج کل کی بیویاں اتنی بھولی بھالی ہیں کہ گہری نیند سو جائیں اور آپ کو چپکے سے فرار کا موقع ہاتھ لگ جائے اب تو شیر خوار بچے بھی اتنے اسمارٹ ہو گئے ہیں کہ آدھی رات کو جہاں انھوں نے دیکھا کہ تھکے ماندے والدین کی آنکھ لگ گئی ہے فوراً اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے ایک دل دوز چیخ کے ساتھ رونا شروع کر دیتے ہیں۔ ماں کا ممتا بھرا دل تڑپتا ہے اور وہ رات کے ایک بجے منے کے ابا کو حکم صادر فرماتی ہیں: "اب خالی پیلی سونے کی ایکٹنگ نہ کیجیے اور اٹھ کر منے کو چپ کرائیے۔ دیکھیے آپ کی گود میں آنے کے لیے کتنا بے چین ہے۔"

(خالی پیلی: فیاض احمد فیضی)

قندوزقند کی کہانی

یوسف ناظم

میرے نزدیک ایک اچھی مزاحیہ کتاب وہ ہوتی ہے جسے آدمی پڑھے بغیر ہی ہنس دے۔ فیاض احمد فیضی اس لحاظ سے خوش نصیب مصنف ہیں کہ ان کی پہلی ہی کتاب " قندوزقند " میں یہ خوبی موجود ہے اور وہ بھی بدرجہ اتم۔ میں نے بچشمِ خود دیکھا ہے کہ جس کسی نے بھی یہ کتاب ہاتھ میں لی مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوگئی۔ مسکراتے تو وزرائے خارجہ بھی ہیں۔ لیکن جب دو وزرائے خارجہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ آثار جنگ کے ہیں۔ یہ وزیر ہمیشہ اپنی کسی داخلی تکلیف کی بنا پر مسکراتے ہیں۔ مزاحیہ کتاب کو دیکھ کر اور چھو کر مسکرانے کی بات ہی الگ ہوتی ہے۔ یہ خیرسگالی اور بھائی چارے کی مسکراہٹ ہوتی ہے۔ مزاحیہ کتابیں اسی لئے دن بہ دن مقبول ہوتی جا رہی ہیں کہ یہ قارئین کا دل بھی بہلاتی ہوں گی۔ لیکن ناظرین ان کتابوں سے زیادہ محظوظ ہوتے ہیں۔ آج کل مہنگی چیزوں کی بازار میں کوئی کمی نہیں۔ سرکار نے اس کا خاص انتظام کر رکھا ہے لیکن سب سے زیادہ مہنگی چیز اگر کوئی ہے تو وہ مسکراہٹ ہے۔ آدمی کا دل حکومت کے خزانے کی طرح خالی ہوگیا ہے۔ سونے کی بسکٹ اور چاندی کی اینٹیں تو صاحبان تفتیش کی نظر بچا کر درآمد کی جاسکتی ہیں اور اس کارِ خیر کیلئے شاید انھیں کچھ نذر بھی کرنا ہوتا ہوگا۔ لیکن بہرحال اس قسم کا مال درآمد کرنا ناممکن نہیں جبکہ مسکراہٹ صرف آمد کی چیز ہے درآمد کی نہیں۔ کنھیالال کپور نے شاید اسی لئے کہا تھا کہ اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے۔ ان کا مطلب یقیناً یہی ہوگا کہ ہم مسکراہٹ کا انتظام خود کریں اسے عالمی بنک کے قرض کی طرح باہر سے نہ منگوائیں۔ فیاض احمد فیضی نے کہ آدمی قصداً سمجھدار ہیں کنھیالال کپور کی ہدایت پر عمل کر کے ظرافت مندی کا ثبوت دیا ہے۔ سعادت مندی کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد کام کی چیز اب ظرافت مندی رہ گئی ہے۔ ظرافت مندی اصل میں طبابت کی ایک شاخ ہے اور یہ سیب سے زیادہ مفید اور مفرح چیز ہے اسلئے آپ نے دیکھا کہ ہوگا جو لوگ اپنی صحت کی برقراری کے لئے سیب نہیں کھاسکتے وہ اخبار پڑھتے وقت سب سے پہلے اس میں ڈھونڈ کر ایک لطیفہ پڑھ لیتے ہیں۔ اخبار میں لطیفہ نہ چھپا ہو تو اداریہ پڑھ کر ہنس لیتے ہیں۔ وہ لوگ جنھیں فرصت زیادہ ہوتی ہے اور جو زیادہ مقدار میں ہنسنا چاہتے ہیں وہ کوئی تنقیدی کتاب پڑھتے رہیں۔

فیاض احمد فیضی کی کتاب " قندوزقند " کے نام ہی نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے اور بہتوں نے جن میں قابلِ شمار ماہرین لغت ہیں زقند کے معنی تلاش کرنا شروع کر دیئے۔ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ مصنف نے کسی بچے کو (شاید مصنف کا ہی) میٹھی گولی کھا کر اچھلتے کودتے دیکھ لیا تھا۔ یہ منظر بہت عام ہے لیکن اس سے استفادہ کرنا عام نہیں

فیاض احمد فیضیؔ نے اس منظر کو دیکھ کر اپنی کتاب کا نام حاصل کیا - ظرافت نگاری کارِ طفلاں نہیں ہے لیکن کتاب کا یہ نام پہلا سمجھئے بہر حال کارِ طفلاں کی دین ہے یہ تو بیسویں صدی کا آخری دہا ہے اور ابھی سے بڑی عمر کے لوگوں نے بچوں سے سبق حاصل کرنا شروع کر دیا ہے۔ اکیسویں صدی میں تو والدین راستہ بھی چلنا چاہیں گے تو بچوں کی انگلی پکڑ کر ہی چلا کریں گے۔

میں نے ازراہ تجسس مصنف کے نام پر بھی غور کیا - فیاض احمد نام تو خیر ٹھیک ہے - یہ نام عام طور پر مستعمل ہے اور اسی لئے اس نام میں املے کی غلطی کا کوئی خطرہ نہیں لیکن جب ہم آگے پڑھتے ہیں اور نام کے تیسرے جز پر پہنچتے ہیں تو یہ فیضی کا لاحقہ سمجھ میں نہیں آتا - سلمان رشدی کے معاملے میں تو طے ہے کہ موصوف کا رشد و ہدایت سے کوئی تعلق نہیں لیکن فیضی کے معاملے میں غور کرنا پڑتا ہے کہ ان کا تعلق کسی فیضی سے ہے یا صرف فیض سے ہے۔ مجھے جہاں تک معلوم ہے ایک تو وہ فیضی تھے جو سولہویں صدی عیسوی میں ہندستان میں پائے جاتے تھے۔ عالم فاضل آدمی تھے اور جلال الدین اکبر اعظم کے نو رتنوں میں سے ایک تھے۔ کہتے ہیں اکبر اعظم کو اعظم بنانے میں ان کا اور ان کے بھائی ابوالفضل کا بڑا ہاتھ تھا بلکہ دونوں بھائیوں کے ہاتھ تھے کیونکہ اکیلے ایک بھائی سے یہ کام ممکن نہ تھا۔ دونوں بھائیوں میں بڑا کون تھا اور چھوٹا کون بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ فیضی البتہ بہت ہی ثقہ اور سنجیدہ شخص تھے زبان بھی ان کی ترکی تھی اسلئے فیاض احمد فیضی کا نسبی اور رسمی تعلق ان فیضی سے تو ہو ہی نہیں سکتا۔ تعلق تو بڑی چیز ہے کوئی نسبت بھی نہیں ہو سکتی یہ ہے فیض احمد فیض تو یہ حال حال کے آدمی ہیں لیکن یہ شاعر تھے اسلئے فیاض احمد فیضی، فیض احمد فیض کے توسط اور توسل سے بھی فیضی نہیں ہوسکتے کیونکہ فیضی شعر نہیں کہتے شعر ٹھیک سے پڑھ لیتے ہوں گے۔ لیکن شعر پڑھ لینا کسی شاعر سے مربوط اور مخلوط ہونے کے لئے کافی نہیں ہے اس لئے ان کے فیضی ہونے کی یہ وجہ بھی ساقط البحر یعنی بند ہو جاتی ہے - دلی اور سیالکوٹ سے فیض حاصل کرنے کی بات تو خارج از بحث ہوگئی - بمبئی میں جہاں فیاض احمد فیضی نے تنددرستی کی کاشت اور مشق کی صرف عطیہ فیضی تھیں - ان سے تو فیاض احمد کے متاثر ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا بلکہ لوگ پوچھ سکتے ہیں کہ یہ نام میرے ذہن میں آیا کیسے۔ اس لئے اطراف و اکناف کے حالات پر غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فیاض احمد فیضی خود بالذات فیضی ہیں اور اس معاملہ میں کسی عالم یا کسی شاعر کے قرضدار نہیں ہیں وہ مزاح میں خود مکتفی ہونا ضروری بھی ہوتا ہے۔ فیضی میرے حساب سے ایک باعمل مزاح نگار ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ انھوں نے عمل کو علم پر ترجیح دی - اس کا ثبوت۔ یہ ہے کہ انھیں اسکوٹر کے موضوع پر کچھ لکھنا تھا تو انھوں نے اپنے بنک سے قرض حاصل کر کے اسکوٹر خریدا - بنک سے قرض لینے کی انھیں بھی یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ خود بنک سے متعلق ہیں اور ہمارے یہاں بنکوں میں جو بھی کام کرتا ہے - خواہ وہ بنک کا کوئی بھی ہو وہ بیرون بنک کا مقروض ضرور ہوتا ہے - بنک میں ترقی وہی کرتا ہے جو بنک کا مقروض ہو - فیاض احمد فیضی اسکوٹر پر مضمون لکھنے سے پہلے کئی سال تک اسے بے ضرورت چلاتے رہے - اپنی نجی ضروریات کے تحت انھوں نے اپنی اسکوٹر میں سائیڈ کار بھی لگوائی - یہ کار نہیں ہے لیکن اسے کار ہی کہا جاتا ہے - جب انھوں نے اسکوٹر اور اسکوٹر کی شریک سفر یعنی سائیڈ کار کے تمام کوائف و کیف پر عبور حاصل کر لیا تب کہیں جا کر مضمون لکھا - کاش ہمارے مقالہ نگار بھی ایسا کر سکتے - یہی صورت حال اس مضمون کے ساتھ پیش آئی جس کا عنوان پھلوں میں رنگ بھرے ہے - لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ دن رات کرافورڈ مارکٹ اور بائیکلہ مارکٹ کے چکر اسلئے کاٹتے تھے کہ انھیں پھلوں سے متعلق ایک مضمون لکھنا تھا پھلوں سے ان کا ربط ضبط اتنا بڑھا کہ خود پھلوں سے پھلوں کے رموز و اسرار کے بارے میں ان سے درس لینے لگے - پھلوں کی قربت کی وجہ سے ان کا مزاج بھی پھلا پھولا اور رفتہ رفتہ اتنا پھیل گیا کہ یہ کتاب وجود میں آگئی - ان کے باعمل مزاح نگار ہونے کے لئے یہ دو ثبوت کافی ہیں تیسرے اس کتاب میں ایک اور مضمون موجود ہے ”عنوان ہے لڑکیاں میرے شہر کی“ اس مضمون میں میں سمجھتا ہوں مصنف نے

عمل کی بجائے علم استعمال کیا ہوگا۔ بہرحال یہ میرا خیال ہے خام بھی ہو سکتا ہے۔

فیضی نے سوچ سوچ کر مزاح لکھا ہے اور سنبھل سنبھل کر برتا ہے یہ بنیادی طور پر بہسارے کے ہیں لیکن اپنے سنبھلے ہوئے انداز سے مجھے بہساروں سے زیادہ سنبھلے نظر آتے ہیں یوں بھی سنبھل ہونا قدرے اعزاز کی بات ہے۔

فیاض احمد فیضی اردو کے شاید مختصر مزاح نگار ہیں جو بنک سے متعلق ہیں ان سے پہلے مشتاق احمد یوسفی نے بنک جیسے خشک اور بخس مقام کو صبا آشنا اور تبسم شناس بنایا۔ ہندوستان میں یہ کام فیضی نے شروع کیا۔ میں نے سنا ہے جس دن بھی بنک جاتے ہیں لوگ ضرور ہنستے ہیں۔

فیاض احمد فیضی سے اچھی توقعات وابستہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ کوئی گورنمنٹ تو ہیں نہیں کہ ان سے توقعات وابستہ کرنا کار عبث ثابت ہو۔ یوں بھی جس طرح دنیا امید پر قائم ہے مزاح نگاری بھی امید پر قائم ہے ان کا ارادہ لکھتے رہنے کا ہے ہر ادیب کی نیت یہی ہوتی ہے اور مزاح نگاری کے نقصانات خواہ کتنے ہی ہوں فائدہ یہ ہے کہ اس میں موضوعات ہوتے ہیں اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مزاح نگار پر یہ پابندی نہیں ہوتی کہ وہ موضوع ہی پر لکھے جبکہ شعر و شاعری میں یہ سہولت حاصل نہیں ہے۔ شاعر کو غیر شاعرانہ موضوع کا پابند رہنا پڑتا ہے جیسے کہ ؎

ایک لڑکی بگھارتی تھی دال	دال کرتی تھی عرض یوں احوال
ایک دن تھا ہری بھری تھی میں	سارے آفات سے بری تھی میں

یا یہ کہ ......

یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی	دل کو لگتی ہے بات بکری کی

یعنی شاعر مجبور ہے کہ بکری کو بکری کی طرح نہیں ردیف کی طرح استعمال کرے۔ مزاح میں جب اس قسم کے موضوع آتے ہیں تو ادھر کا کھیت اور ہم نے بکری پالی جیسے مضامین کی کاشت اور پرداخت خود بخود ہو جاتی ہے۔

فیاض احمد فیضی خوش گفتار آدمی ہیں یہ جتنی باتیں کرتے ہیں ان میں سے ۱۰ فیصد باتیں با موقع ہوتی ہیں۔ اس معاملے میں وہ مجھ سے بہتر ہیں با موقع باتوں کا یہ اوسط مجھے اب تک میسر نہ آسکا۔ فیاض احمد فیضی اگر اپنے اعصاب کو محفوظ رکھ سکیں تو ان کی موجودہ زقند پول والٹ تو بن ہی جائے گی۔

انھوں نے اپنے پیش لفظ میں مجتبیٰ حسین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب مصنف نے ان سے مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی تو مجتبیٰ حسین نے جواب میں یہ لکھا کہ آپ کو مقدمے کی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی اس مقدمے کی ضرورت نہیں ہے جو کٹ ایلا پہ لکھا جاتا ہے۔

• "فیضی اچھا بولنے، پڑھنے والے شخص ہیں ان میں دوسروں کی خدمت کرنے کا جذبہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ان کی کتاب بہت دلچسپ ہے جس میں جا بجا غیر معمولی فقرے مل جاتے ہیں ان میں صرف ایک جملہ آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں۔ "ہر ناکامیاب انسان کے پیچھے ایک عورت اور ہر ناکام شخص کے پیچھے ایک بیوی ہوتی ہے"

(شام کرشن نگم)

پرویز یداللہ مہدی
(ممبئی)

مشرف بہ مزاح ـــــ فیضی (خاکہ)

۱۹۷۵ء کے اوائل کا ذکر ہے۔ ایک دن مکتبہ جامعہ لمیٹڈ میں ایک دبلا پتلا سانولی رنگت کا اجنبی نوجوان جس کا ر اسٹائل ۴۰ء کے دور کے ہندوستانی فلمی ہیروز کی طرح اور آنکھوں پر سوار چشمے کا فریم ۵۰ء کے فیشن کا تھا یانک مجھ سے اس بے تکلفی کے ساتھ ملا جیسے لنگوٹیا یار ہو۔ اس بے تکلفی کے باوجود مجھے اس پر ایک او کالی قسم کے ری کا گمان ہوا، ایک ایسا قاری جو غلطی سے کسی قلم کار کی کوئی تخلیق کسی رسالے میں پڑھ کر متعلقہ قلم کار کی ملاقات میں ، پڑتا ہے اور جیسے ہی اسے کہیں غلطی سے دیکھ لیتا ہے۔ غلط سلط تعریف کی توپوں کے دہانے اس پر کھول دیتا ہے۔ ے میری چھٹی حس کا کمال کہیے یا محض اتفاق نووارد نے چھوٹتے ہی انہی دنوں ماہنامہ "شگوفہ" میں چھپے میرے ایک ضمون کی تعریف میں چند ترشے ترشائے جملے اگلے اور مجھے اپنی دانست میں پیڑ کے جھاڑ پر چڑھانے کی کوشش کرنے لگا یے تعریف چاہے غلط ہو یا صحیح شاعروں و ادیبوں کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ چناں چہ اس نے میری ری کمزوری کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور جب میں نے تعریف و توصیف کے درخت کی سب سے اونچی ڈال پر بیٹھا مید کھلا کہ یہاں تو ہر شاخ پر الّو بیٹھا ہے۔ ابھی میں اپنے پیش رو الّوؤں کی ناگفتہ بہ حالت کا جائزہ ہی لے رہا تھا اس دُبلے پتلے نوجوان نے پینترا بدل کر پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی کے ادبی کارناموں بے لاگ تبصرہ فرماتے ہوئے اچانک تنقید کے کلہاڑے سے اس درخت کو جڑ سے کاٹ دیا۔ میں دوبارہ زمین چکا تھا اور حیرت سے اس نوجوان کو دیکھ رہا تھا جس نے پہلی ہی ملاقات میں ایک ہی نشست میں خالص قاری ے مستند مبصر اور پھر جید نقاد کے چولے چٹکیوں میں بدل ڈالے تھے۔ جب میں نے اس کی جسارت پر غور کیا تو قدہ کھلا کہ اس میں کچھ تو اس کی بے باکی کا اور کچھ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے "ان لمیٹڈ" ادبی ماحول کا عمل دخل تھا۔ نے کے اردو ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ ادبی حدود اربعہ میں مسلسل و مستقل حاضری کے نتیجے میں ایسے ایسے ے شاعر، ادیب اور نقاد کے درجوں پر فائز ہو چکے ہیں جنھوں نے کبھی مکتب کا منہ بھی نہیں دیکھا بلکہ بعض ایسے نا ہیں پڑھنا تو درکنار صرف کتابیں سونگھ کر ہی چوٹی کے فن کار بن گئے، پس اس سے ثابت ہوا کہ مکتبے کے فارم

کا درجہ کسی مکتب کے فارغ التحصیل سے بہرحال بہت بلند ہوتا ہے ، ایک تو کلکتے کا گلے گلے ادب میں ڈوبا ماحول دوسرا اثنائے گفتگو بات بات میں دورِ حاضر کے مزاح نگاروں کے آباؤ اجداد کے زوردار حوالوں نے اس اجنبی نوجوان کے ارد ایک عجیب سا ادبی چلہ کھینچ دیا تھا اس سے پہلے کہ میں اس کی ذات کے گرد کھینچے اس چلّہ نما حصار کو توڑ کر اس کی شخصیت کے قلعے میں جھانکتا وہ اپنی گل افشانیٔ گفتار کے جوہر دکھلا کر جس طرح اچانک وہاں آیا تھا اسی طرح اچانک وہاں سے رخصت ہو گیا۔!

ابھی میں اس پہلی پہلی ملاقات کے جھٹکے سے پوری طرح سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ کچھ روز بعد وہ پھر مجھ سے ٹکرا گیا۔ اس روز میں یوسف کھتری کے فٹ پاتھی باکڑے کے روبرو بہ مشکل تمام اپنے "زانوئے ادب" تہہ کیے بیٹھا تھا وہ اچانک وہاں آ دھمکا اور بڑی ہی بے تکلفی سے میرے سامنے زانوئے ادب تہہ کر کے بیٹھ گیا۔ جغرافیائی اعتبار سے یوسف کا ادبی باکڑا، جس سطح مرتفع پر واقع تھا اس کی سطح، سطح سمندر سے تھوڑی ہی بلند تھی، چناں چہ اس محدود و مختصر بلندی کے پیشِ نظر یوسف نے اپنے باکڑے کے روبرو چھوٹے چھوٹے "منی" اسٹولوں کی شکل میں احباب کی خاطر ایسی نشستوں کا اہتمام و انتظام کر رکھا تھا کہ ضرورت مند اپنے زانوئے ادب تہہ کیے بغیر بیٹھ ہی نہیں سکتا اور اس روز نقشہ یہ تھا کہ میں باکڑے کے آگے اور وہ دبلا پتلا نوجوان میرے آگے زانوئے ادب تہہ کیے بیٹھا تھا اگرچہ اس نوجوان کے زانوئے ادب کی خیریت بھی خطرے سے دوچار تھی۔ پھر بھی اس نے میرے زانوئے ادب کی تکلیف دہ پوزیشن کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور مجھے بولنے کا موقع دیے بغیر خود ہی بولتا رہا اس مرتبہ بھی اس نے حسبِ عادت پطرس، رشید احمد صدیقی اور یوسفی کے حوالے دیے بلکہ پطرس کے کتوں کو رشید احمد صدیقی کے "ارہر کے کھیت" میں چھوڑ کر خود یوسفی کے "بائی فوکل کلب" میں جا گھسا اور کلب کی کھڑکی سے کھیت میں لوٹیں لگاتے ہوئے کتوں کو دیکھ کر محظوظ ہوتا رہا پھر جیسے ہی اس کی باتوں کا کوٹہ ختم ہوا اور میرے بولنے کی باری آئی، اس نے جھٹ اپنی بغل میں دبی ایک کتاب یوسف کے حوالے کی اور دوسری کتاب باکڑے پر سے اٹھا کر یہ جا وہ جا فٹ پاتھ کی بھیڑ میں غائب ہو گیا ۔۔۔ مومن کی پہچان یہ بھی بتائی گئی ہے کہ وہ ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جا سکتا، لیکن وہ اجنبی نوجوان دوسری مرتبہ بھی چوٹ دے گیا تھا بلکہ میرے ایمان کو بھی خطرے میں ڈال گیا تھا، میں نے جھنجھلا کر یوسف سے کہا "بڑا بد دماغ قسم کا نوجوان ہے یار یہ! جب بھی ملتا ہے خود ہی بولتا رہتا ہے نان اسٹاپ اور جیسے ہی میرے بولنے کی باری آتی ہے چھم سے نکل جاتا ہے۔!"

یوسف حیرت سے بولا "تم اس "چشمش" کو نہیں جانتے؟ وہ فیضی ہے، فیاض احمد فیضی!" میں نے چونک کر کہا۔ "فیضی ۔ نام کچھ سنا سنا سا لگتا ہے! کہیں تمہارے اس فیضی کا اگلے وقتوں کی عطیہ فیضی سے نزدیک یا دور کا کوئی رشتہ تو نہیں ۔۔۔!"

یوسف چونک کر بولا "عطیہ فیضی ۔۔! یہ عطیہ فیضی کون ہے بھائی ۔۔۔؟"

میں نے چڑ کر کہا "یار ادب فروش ہو یا ردّی فروش؟ عطیہ فیضی کو نہیں جانتے؟ ارے بھئی علامہ اقبال و عطیہ فیضی ۔ شاعرِ مشرق کی گرل فرینڈ، جو کبھی اس بمبئی میں رہتی تھیں۔"

یوسف بڑبڑا کر بولا " یہ گرل فرینڈ والا معربی چکر کیا شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے زمانے میں بھی تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ بیٹا یہ چکر تو باوا آدم کے دنیا میں قدم رنجہ فرماتے ہی شروع ہو گیا تھا۔ خیر تم گرل فرینڈ کا چکر چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ یہ فیضی آخر ہے کیا چیز ؟ شاعر، ادیب، مبصر، نقاد ۔ ؟"

وہ بولا۔ " ابھی تک تو کچھ بھی نہیں ہے، لیکن ایک دن کچھ بنے گا ضرور! تمھاری لائن کا آدمی ہے، مزاحیہ ادب بہت پڑھتا ہے!"

میں نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا " یہ تو اس کے چشمے سے ہی پتہ چلتا ہے کہ پڑھا لکھا ہے یا کم سے کم پڑھے لکھے خاندان کا چشم و چراغ ہے۔! ویسے یہ کرتا کیا ہے ؟"

یوسف بولا ــــ یہ تو میرے کو معلوم نہیں، لیکن اکثر اسے محمد علی روڈ کے ایک بینک میں آتے جاتے ضرور دیکھا ہے "اب یہ چشمش، ادھر پیسہ نکالنے جاتا ہے یا ڈالنے معلوم نہیں۔!"

فیضی کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے بینک میں جانا بلکہ کھاتہ کھولنا ضروری تھا اور بینک میں کھاتہ صرف وہی خوش نصیب شاعر و ادیب کھول سکتے ہیں جن کی سرکار دربار میں پہنچ ہوتی ہے جبکہ اردو کے بیشتر شاعروں وادیبوں پر وقت ابھی اتنا مہربان نہیں ہوا ہے کہ بینکوں میں اپنے کھاتے کھول سکیں۔ سچ پوچھیے تو اردو والے بینک کے کھاتے سے زیادہ ادھار کھاتے میں یقین رکھتے ہیں چنانچہ ان کے کھاتے بینکوں کے بجائے سود کے نام پر کھال اتار لینے والے بنیوں، مارواڑیوں، سیٹھوں و ساہوکاروں کے ہاں کھلتے اور چلتے ہیں۔ ان ادھار کھاتوں کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ ایک بار کھل جانے کے بعد یہ کبھی بند نہیں ہوتے ورثے کی صورت پشت با پشت تک چلتے رہتے ہیں۔ خیر بینک میں داخل ہوئے بغیر فیضی کے احوال واقعی کی بابت معلومات حاصل کرنا اگرچہ ٹیڑھی کھیر تھا لیکن میں نے بھی اس ٹیڑھی کھیر کو سیدھی کرنے کا بیڑہ اٹھا لیا تھا۔ کیوں کہ طنز و مزاح کے واسطے سے میں خود کو فیضی سے قریب محسوس کرنے لگا تھا اور یہ نہیں چاہتا تھا کہ شاعری و افسانہ نگاری کی حسین پری اسے بہلا پھسلا کر اپنے چنگل میں پھانس لے اور اردو کا طنزیہ و مزاحیہ ادب جو پہلے ہی کسمپرسی و کم مائیگی کا شکار ہے میری غفلت اور بے اعتنائی کی وجہ سے ایک نئے مزاح نگار کی گل افشانیوں سے محروم رہ جائے۔ اس کے علاوہ مجھے فیضی کو ان خیر خواہانِ ادب کے ہتھے چڑھنے سے بھی بچانا تھا جو طنز و مزاح کو دوسرے درجے کا ادب قرار دے کر نو واردانِ بساط کے حوصلے پست کر دیتے ہیں۔ محض اس اندیشے کے تحت کہ :

"یہ کہیں یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے !

میں بینک میں داخلے کی کوئی کارگر ترکیب سوچ ہی رہا تھا کہ حسنِ اتفاق سے ایک شام فیضی خود بینک کے باہر نظر آ گیا۔ وہ مانڈوی پوسٹ آفس کے سامنے والی فٹ پاتھ پر ایک چھوٹے سے باکڑے کے پاس کھڑا تھا باکڑا کیا تھا مختلف اقسام کے عید کارڈس کی منی گیلری تھا۔ میں نے سلام کو بالائے طاق رکھ کر فوراً کلام کیا۔ کیا بات ہے ؟ عید کارڈ خریدنے جا رہے ہیں ؟ وہ بولا " خرید نہیں رہا ہوں! اتفاق سے یہ میرا ہی باکڑا ہے، میں کے علاوہ پارٹ ٹائم یہ دھندا بھی کرتا ہوں ــــ!"

میں نے ... فوراً کاؤنٹر سے کڑیاں جوڑتے ہوئے کہا۔ یہ دھندا تم یقیناً بینک سے قرض لے کر

کرتے ہو تب ہی اکثر بینک میں آتے جاتے دکھائی دیتے ہو۔ اس نے جواب میں میری بات کی تردید کر ڈالی بولا۔ میں قرض لینا نہیں ضرورت مندوں کو قرضے منظور کرتا ہوں۔ بینک میں کام کرنے کا ہی تو فائدہ ہے۔ نہ اپنی ہنگ کی ہے نہ پچھوکا اور ڈنب ملتبہ چکھا" میں نے حیرت اور تعجب سے کہا۔ "یعنی تم بینک میں کام کرتے ہوئے یہ دھندا بھی کرتے ہو" بولا "ایک عرصہ سے میں بینک کے شعبۂ انسپکشن میں کام کرتا ہوں اور اکثر سوائے بینک کے ہر جگہ دکھائی دیتا ہوں۔ اس لیے چند خدائی فوجداروں نے از راہِ ہمدردی مجھے مشورہ دیا کہ میاں سبلے کا اتنا سا وقت اور جوانی کیوں ضائع کرتے ہو کوئی کام دھندا کرو، چار پیسے کماؤ، سو بس اسی مشورے کی روشنی میں چار پیسے کمانے کی کوشش کر رہا ہوں۔!!"

اس وضاحت سے میری حیرت تو رفع ہو گئی لیکن تعجب ہنوز باقی تھا کہ اس کے آس پاس مشیروں اور صلاح کاروں کی کمی نہیں پھر بھی کسی نے لکھنے لکھانے کی طرف اس کی توجہ مبذول نہیں کروائی، چنانچہ میں نے اس سلسلے میں استفسار کیا تو بولا۔ "لکھنے لکھانے کی طرف توجہ تو میں نے کالج کے زمانے ہی میں دینا شروع کر دی تھی لیکن افسوس اردو ادب کے مدیرانِ کرام ہی کو میرے لکھنے کی طرف توجہ دینے کی توفیق نہیں ہوئی۔ ابھی تک!"

اس گفتگو کے تھوڑے ہی عرصہ بعد خدا کا کرنا یہ ہوا کہ مدیر شگوفہ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال نے فیضی کے لکھنے پر خصوصی توجہ فرمائی پھر ان کے توسط سے زندہ دلانِ حیدرآباد نے فیضی کے لکھنے بلکہ خود فیضی پر توجہ فرمائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیضی بہت جلد ایک قابلِ توجہ مزاح نگار بن گیا اور یوں مزاح نگاری کے فیوض و برکات نے فیضی کو جی بھر کے فیض یاب کیا ـــ!

کہتے ہیں آدمی کو جب توجہات کا چسکا لگ جاتا ہے تو پھر وہ کسی اور طرف توجہ نہیں دیتا۔ دن رات اپنی ساری توجہ دوسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانے میں صرف کر دیتا ہے، فیضی نے بھی یہی کیا خود کو مزید قابلِ توجہ بنانے کے لیے مزاح نگاری سے زیادہ انجمن سازی پر توجہ دینے لگا نتیجۃً "زندہ دلانِ حیدرآباد" کے جواب میں ایک اور بزم "زندہ دلانِ بمبئی" وجود میں آئی جس کے جملہ حقوق منقولہ و غیر منقولہ اس نے روزِ اول ہی اس طرح اپنے نام محفوظ کر لیے ہیں۔ جیسے بزم ہذا کلیتہً اس کی مملوکہ بلکہ منکوحہ ہو۔ کہنے کو تو میرا نام بھی بزم ہذا سے وابستہ ہے لیکن برائے نام کیونکہ میرے نام کا انتخاب اس نے میری لاعلمی میں کیا ہے، جب میں نے اس غیر جمہوری اور غائبانہ انتخاب پر دبے لفظوں میں احتجاج کیا تو مسکرا کر بولا۔ "جمہوریت میں کوئی چیز کوئی بات غیر جمہوری نہیں ہوتی۔ ارے جب غائبانہ نمازِ جنازہ ہو سکتی ہے تو کیا غائبانہ انتخاب نہیں ہو سکتا ـــــ!" حضرات یہ جواب سن کر اس روز میرا ایمان اس بات پر اور بھی پختہ ہو گیا کہ جو شخص مزاح نگاری کر سکتا ہے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے، مردے تو پھر مردے ہیں زندہ دلوں کی غائبانہ نمازِ جنازہ کا بھی اہتمام کر سکتا ـــ!

میری بحث پن کی حد تک بے باک فیضی کی دو کمزوریاں ہیں، ایک تو وہی جو دورِ حاضر کے تقریباً تمام مزاح نگاروں کی مشترکہ کمزوری ہے یعنی بیوی جو مزاح نگاروں کی مہربانی سے گھر کی انگنائی سے مزاح کی جہانی میں [illegible] ہے البتہ فیضی کی تحریروں میں جو بیوی جا بجا مداخلت کرتی ہے اس کے بارے میں حتمی طور پر کہنا مشکل ہے کہ آیا یہ فیضی کی اپنی بیوی ہے یا کسی اور کی ـــــ بیوی کے علاوہ اس کی دوسری کمزوری [illegible] کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ یعنی اس کے اعصاب پر [illegible] صاحب [illegible] [illegible] بلکہ موضوع چاہے کچھ ہو یا پھر سہینہ ناظم صاحب کے [illegible]

ناظم صاحب کے ذکر خیر میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ فیضی انھیں عموماً ایسے لفظوں میں یاد کرتا ہے جن کے جملہ حقوق ہمارے معاشرے میں تاحال صرف مرحومین کے لیے مختص و محفوظ ہیں۔ اس اعتبار سے ناظم صاحب یقیناً پہلے زندہ ادیب ہیں جن کا ذکر فیضی سچے اور پرخلوص لفظوں میں کرتا ہے۔ اس کے علاوہ فیضی، ناظم صاحب کی فقرے بازی سے بھی اس حد تک متاثر ہے کہ اپنی روزمرہ گفتگو میں ناظم صاحب ہی کی طرح فقرے بازی کے گل بوٹے کھلانے کی کوشش کرتا ہے تاہم ہر دو کی فقرے بازی میں نمایاں فرق یہ ہے ناظم صاحب کی فقرے بازی ترقی کر کے ادب کا حصہ بن چکی ہے اور فیضی کی فقرے بازی کو ابھی ادب کے حدود میں داخل ہونا ہے۔

ناظم صاحب سے فیضی کی نسبت خاص کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے جب ناظم صاحب کو مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کا سکریٹری منتخب کیا گیا تو فیضی ان سے زیادہ دن دور نہیں رہ سکا۔ کسی طرح جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے ان کے نزدیک پہنچ گیا گویا سکریٹری یوسف ناظم صاحب پر جہاں یہ ثابت کر دیا کہ:

تو چھوڑے تو چھوڑے پر میں نہ چھوڑوں

وہیں یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ پروان ضرور بمبئی میں چڑھا ہے لیکن اس کے آبا و اجداد کا تعلق صوبہ بہار سے ہے ——— وہی بہار، اردو جہاں کی دوسری سرکاری زبان اور تشدد عوامی زبان ہے۔

مزاح نگاری، فقرے بازی اور انجمن سازی میں فیضی جب خاصا طاق و مشاق ہو گیا تو ایک دن میں نے اس سے کہا۔ "یار فیضی، مزاح نگاری بھی بہت ہو گئی اور انجمن سازی و فقرے بازی بھی، اب تم اپنا مجموعہ مارکٹ میں لے ہی آؤ۔ !"

سنجیدگی سے بولا۔ "ابھی نہیں، پہلے ذرا شہر میں اپنا ایک ذاتی گھر کر لوں، پھر مجموعے کی سوچوں گا۔ !" وجہ معقول تھی میں چپ رہا ——— اور جب کچھ عرصہ بعد اس نے قلب شہر میں اپنا ذاتی گھر خرید لیا تو میں نے پھر مجموعے کی بات چھیڑی۔ بولا ——— "ابھی نہیں، پہلے ذرا ایک معقول سی سواری خرید لوں پھر سوچوں گا۔ !"

میں نے حیرت سے کہا۔ "ایک معقول سا اسکوٹر تو ہے تمھارے پاس ! اور کیا چاہیے ——— ؟" بولا ——— "تم جسے معقول سواری کہہ رہے ہو اس سے زیادہ نامعقول سواری آج تک ایجاد نہیں ہوئی ——— یہ بھی کوئی سواری ہے کہ جس کی پچھلی نشست پر اگر بیوی دھری ہو تو آدمی اپنی گرل فرینڈ کو لفٹ نہیں دے سکتا ہے چاری پیدل ٹاپتی رہ جاتی ہے اور اگر اتفاق سے گرل فرینڈ پیچھے چپکی ہو اور ایسے میں بیوی شاپنگ سے تھکی تھکائی لوٹتی ہوئی سڑک پر نظر آ جائے تو انجان بن جانا پڑتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس میں قصور اسکوٹر کا نہیں، اسکوٹر والے کا ہے جو ایک میان میں دو تلواریں ایک ساتھ رکھنے کی حماقت کرتا ہے۔ میرے حساب سے اسکوٹر اگر معقول سواری نہیں ہوتی تو شہرۂ آفاق مزاح نگار مجتبیٰ حسین اسکوٹر پر سوار ہو کر دلی کی سڑکیں نہیں ناپتے، مدیر شگوفہ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال حیدرآباد کے گلی کوچوں میں اسکوٹر نہیں دوڑاتے، بس اس سے ثابت ہوا کہ مزاح نگاروں کے مقدر میں صرف اسکوٹر لکھا ہے اس لیے انھیں اس سے اونچا نہیں اڑنا چاہیے ——— !"

فیضی بدستور اڑیل لہجے میں بولا ——— "مزاح نگاروں کی حد تک تمھاری بات درست ہے لیکن تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ میں صرف مزاح نگار نہیں، بینک کا ایک ذمہ دار آفیسر بھی ہوں۔ سچ پوچھو تو جب قرض مانگنے والے

اپنی کار ڈرائیو کرکے بینک میں آتے ہیں تو مجھے بڑی شرم آتی ہے۔ ذرا سوچو قرض دار کاروں میں اینٹھتے پھریں اور قرض خواہ بے کار، کتنی معیوب بات ہے یہ ـــ !" اس بار بھی اس کا جواز معقول تھا لہٰذا میں پھر چپ رہا۔ الغرض جب کار کا اسٹیئرنگ اس کے ہاتھوں کی گرفت میں پہنچ گیا تو میں نے پھر مجموعے کی اشاعت کی طرف توجہ مبذول کروائی۔

"یار فیضی اب تو تمہارا گھر بھی ہوگیا کار بھی خرید لی تم نے، یعنی ہر طرح سے صاحبِ نصاب ہوگئے ہو اب تو صاحبِ کتاب بننے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔ ؟"

بولا۔ "رکاوٹ تو خیر کوئی نہیں ہے لیکن ایک ہچکچاہٹ ہے، اردو معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ اس میں آدمی کو لکھنا بھی خود ہی پڑتا ہے، چھاپنا بھی خود ہی اور پڑھنا بھی خود ہی، یہ تو سراسر ایسی ہی بات ہوئی جیسے کوئی غریب کنواری لڑکی محنت مزدوری کرکے اپنا جہیز خود ہی جوڑے، اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے مضامین کا مسودہ اردو اکیڈیمی میں داخل کردوں تاکہ اس بہانے ارباب اردو اکیڈیمی کو ڈھیر سارے نامعقول مسودوں کے ساتھ ایک عدد معقول مسودہ کی اشاعت میں مالی اعانت کا سنہری موقع میسر آجائے ـــ" اس طرح ٹال مٹول کرتے کرتے بالآخر قند و زقند "شرمندۂ اشاعت ہوگئی۔ فیضی کی اولین کاوش میں قند کتنا ہے اور زقند کتنی ہے یہ تو پیشہ ور ناقدین مبصرین ہی بہ نہایت تول کر بتلا سکتے ہیں تاہم اپنے ناقص مطالعے کی روشنی میں، میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بعض مقامات پر فیضی اپنے پیش رو مزاح نگاروں سے اس حد تک مرعوب و متاثر دکھائی دیتا ہے کہ اس کی تحریروں پر کسی اور کی تحریر کا گمان ہوتا ہے گویا اپنے پیش رو مزاح نگاروں کے نقشِ قدم پر چلتے چلتے فیضی اچانک ان کے "نقشِ قلم" پر چلنے لگتا ہے، شاید نادانستگی میں فیضی قدم اور نقشِ قلم کو ایک ہی چیز سمجھتا ہے۔

مجھے یقین ہے فیضی جس دن نقشِ قدم اور نقشِ قلم کے فرق کو محسوس کرلے گا اپنا ذاتی اسلوب اور اپنی راہ متعین کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ اسی خوش آئند امید کے ساتھ میں طنز و مزاح کی خارزار وادی میں فیضی اور اس کی اولین کاوش قند و زقند کا خلوصِ دل کے ساتھ استقبال کرتا ہوں :

تیرے مزاح نے کیا کام لاجواب کیا
زقند کو قند کیا قند کو کتاب کیا ـــ !

انور خاں
بمبئی

قند وقند ــــــ خوب صورت اور پیاری نثر کا نمونہ

اردو میں غالب کے خطوط، اودھ پنچ، پطرس، شوکت تھانوی، شفیق الرحمٰن، رشید احمد صدیقی، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی سے مشتاق احمد یوسفی تک طنز و مزاح کی ایک شاندار روایت رہی ہے۔ قارئین نے انھیں بڑی محبت دی ہے اور ان کے مضامین کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھا ہے۔ ان کی کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن نکلے ہیں اور آج بھی لوگ انھیں پڑھتے ہیں۔ لیکن ادھر دو دہائیوں سے کسی مزاح نگار کو ایسی مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔ مجتبیٰ حسین کی کتابیں البتہ پسند کی جاتی ہے۔

اس صورتِ حال نے کئی سوالات کو جنم دیا ہے۔ کیا مزاح اچھا نہیں لکھا جا رہا یا قاری کا مزاج بدل گیا ہے یا پھر آج کا عہد کسی اور طرح کے مزاح کا طلب گار ہے؟ روزنامہ جنگ کو دیے گئے ایک انٹرویو میں وارث علوی سے جب ان سے یہ سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ "طنز و ظرافت اور انشائیہ نے اب ایسا فارم تلاش کر لیا ہے کہ یہ تمام چیزیں الگ الگ کبھی ڈرامے میں کبھی ناول میں، کبھی افسانے میں آپ کو نظر آئیں گی۔ لیکن ان کی انفرادی حیثیت تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ چناں چہ اب مزاح نگاروں کی تعداد بھی نسبتاً کم ہے۔ کیوں کہ وہ ہمیں ہنسا نہیں سکتے۔ البتہ ایک بڑا مزاح نگار ہے۔ اس کا نام مشتاق احمد یوسفی ہے لیکن اس کے ہاں مزاح، طنز و ظرافت سے بھی طاقت ور ایک عنصر موجود ہے وہ اس کا اسلوب ہے۔ جو تینوں کو اپنے قابو میں رکھتا ہے۔ یعنی تبسم کہتے ہیں کہ "طنز و مزاح صفت نہیں اسلوب ہے کیوں کہ مزاح شاعری میں بھی ہو سکتا ہے، افسانے میں بھی ہو سکتا ہے"۔

ادھر شگفتہ مزاحیہ انداز کی ہلکی پھلکی کالم نگاری نے بھی بڑا درجہ پایا ہے چناں چہ مشفق خواجہ، عطاء الحق قاسمی اور انتظار حسین کے کالم بڑے مقبول ہوئے ہیں اور چوں کہ کالم بھی مضامین کی طرح کسی بھی موضوع پر لکھے جاتے ہیں اور پھر وہ عصرِ حاضر میں ہونے والے سیاسی، ادبی، واقعات اور صورتِ حال سے جڑے ہوتے ہیں۔ قارئین کی خاصی دل چسپی کا باعث ہوتے ہیں۔ اس لیے مزاح نگار کے لیے انھیں اپنی طرف متوجہ کرنا خاصا مشکل ہو گیا ہے تا وقتیکہ اس کے پاس کچھ کہنے کے لیے نہ ہو۔

اس صورتِ حال میں ہمارے دوست جناب فیاس احمد فیضی کے مضامین کا پہلا مجموعہ 'قند و ز قند' شائع ہوا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ....

ہے کہ فیضی کو زبان پر خاصا قابو ہے۔ چن چن کر زبان و بیان کی غلطیاں نکالنے کی بات اور ہے لیکن آج جب بیش تر نوجوان مزاح نگار اچھی نثر لکھنے پر قادر نہیں فیضی بڑی خوب صورت اور پیاری نثر لکھتے ہیں۔ اپنی بات شگفتہ لب و لہجے میں کہنے پر وہ قادر ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ کم از کم یہ دو باتیں ضرور ثابت کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مزاح پر کسی کی پہلی کتاب سے اگر ہماری یہ دو توقعات پوری اترتی ہیں تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ شخص آئندہ بحیثیت مزاح نگار اپنی پہچان بنا سکتا ہے۔

فیضی ایسے وقت میں اپنی کشتی کھینے کی کوشش کر رہے ہیں جب ہوا ان کے مخالف ہے۔ آج کا قاری شاید کنہیا لال کپور کے تیر و نشتر کا طلب گار ہے۔ زہر خند، تاریک طربیہ اور دل دہلا دینے والا تمسخر چاہتا ہے۔ الیکشن، لیڈر، ہڑتال جیسے معصوم عنوانات کے تحت مضامین اب اسکول اور کالج کے لڑکوں کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ سیاست آج کا بنیادی استعارہ ہے اور یہ ہماری بدقسمتی رہی ہے کہ ہمارے بیش تر مزاح نگار یا تو سرکاری ملازمتوں میں رہے ہیں یا درس گاہوں کے اسیر اور دونوں ہی مقامات مزاح نگاروں کے لیے مردہ گھر سے کم نہیں۔ دونوں ہی ضابطوں سے بندھے ہوئے ہیں اور لکھنے میں بے حد محتاط۔ یہ احتیاط ان کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہے اور بات یہاں تک پہنچتی ہے کہ ایسے جملے جن سے لیڈر کی پیشانی پر شکن پڑے یا مولوی کو نقضِ امن کا موقع ملے ذہن میں ابھرنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتے ہیں۔ چناں چہ ایک ایسا مزاح وجود میں آتا ہے جس میں ہلکی پھلکی باتیں، ہلکے پھلکے انداز میں کہی جاتی ہیں۔ سامعین وقتی طور پر لطف اندوز ہو بھی لیں تو ہال کے باہر قدم رکھتے ہی اسے فراموش کر دیتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی اثر اس وقت ہوتا ہے جب یہ رسالوں میں شائع ہوتے ہیں کہ قاری جب رسالہ ہاتھ سے رکھتا ہے تو ان مضامین کو بھول چکا ہوتا ہے۔

ایسا نہیں کہ اب موضوعات نہیں رہے یا انھیں اس قدر برتا جا چکا کہ اب مزید لکھنا ناممکن ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایک عام آدمی جو ٹھیک ٹھاک ایک نارمل زندگی گزار رہا ہے جب وزیر بنتا ہے تو ہمارے عادات و اطوار، چال ڈھال سب بدل جاتے ہیں۔ دن میں پچاس آدمیوں سے وہ پچاس وعدے کرتا ہے جن کو پورا کرنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ صبح شام خوشامدی لوگ اسے گھیرے رہتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس کی تیوریاں چڑھ جاتی ہیں۔ انا کو ٹھیس لگتی ہے۔ چار دن کی سلطانی کے بعد جب وہ اپنے عہدے سے دست بردار ہوتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ کسی زخمی سپاہی کی طرح وہ اکیلا ہے۔ اس کی حالت اب پہلے سے کہیں قابلِ رحم ہے۔ گھر کی خالی بھائیں بھائیں کرتی دیوڑھی اسے وقت سے قبل بوڑھا کر دیتی ہے۔

اسی طرح الیکشن کے موقع پر وہ لوگ جو سنجیدہ اخبارات کے اداریے بھی نہیں سمجھ پاتے اچانک سیاست پر اتھارٹی بن کر نمودار ہوتے ہیں اور اب تو مولوی بھی الیکشن میں ایک اہم عنصر بن کر ابھرتے ہیں۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے مزاح نگار اب تک اسی پرانی ڈگر پر چلے جاتے ہیں یعنی ان موضوعات پر لکھتے بھی ہیں تو . . . . اسکولوں کے جواب مضمونوں کی طرح۔ الیکشن، برسات کا ایک دن، لیڈر، ہڑتال، مزدور وغیرہ۔

قیامں احمد فیضی اس میدان میں تازہ وارد ہیں۔ گزشتہ دس پندرہ سال میں شائع ہوئے اپنے تقریباً سارے ہی مضامین انھوں نے اس کتاب میں یک جا کر دیئے ہیں۔ بہتر ہوتا کہ وہ ان میں سے چند اچھے مضامین کا انتخاب کرتے بعض اوقات یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ مضامین کو ایڈٹ کیا جاتا تو بہتر ہوتا کہ مصنف نے اپنی دانست میں موضوع کے

متعلق جتنی باتیں سوچ سکتا تھا ایک ہی مضمون میں لکھ ڈالی ہیں جس سے بوجھل پن پیدا ہوگیا ہے۔ بمبئی کی لوکل ٹرین میں دفتر کے اوقات میں سفر کرنا ایک نادر تجربہ ہے جو لوگ تفریح کی خاطر بمبئی آتے ہیں انھیں اس کا لطف ضرور لینا چاہیے۔ اگر اسے برداشت کرسکیں۔ ورنہ فیضی کا سفرنامہ جرج گیٹ پڑھ لینا چاہیے یہ مضمون واقعی سفرناموں میں ایک بالکل نیا اور منفرد مضمون ہے۔

آج مزاح پر جس معیار کی کتابیں شائع ہورہی ہیں ان سے مجھے یہ کتاب بہتر نہیں تو کمتر بھی نہیں لگی اور ان کتابوں سے تو یقیناً یہ کتاب بہتر ہے جس میں اخبار کے کالموں کو یکجا کرکے مزاحیہ مضامین کا نام دیا جاتا ہے۔

لکھنا اب تک ان کا شوق تھا کتاب کی اشاعت کے بعد ہماری توقعات ان سے بڑھ جاتی ہیں۔ ہم ان سے توقع کرتے ہیں کہ وہ چند مضامین ایسے ضرور لکھیں جو ہمارے اچھے مزاح نگاروں کے نمائندہ مضامین کے ساتھ رکھے جاسکیں۔ ہمارے بعض بہت اچھے مزاح نگاروں نے مزاح کو افسانے کے انداز میں پیش کیا ہے۔ بعض کردار ایسے دیئے ہیں کہ جن کا نام سنتے ہی لبوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے یا دلچسپ واقعات سے مدد لی ہے۔ میرا خیال ہے کہ انشائیہ نما مزاحیہ مضامین کے مقابلے میں یہ انداز قاری کے لیے زیادہ قابلِ قبول ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے اپنے مضامین میں ان تینوں باتوں کا سہارا لیا ہے اور صرف مزاحیہ فقروں پر اکتفا نہیں کیا۔ آدمی مسلسل مسکرا بھی تو نہیں سکتا! میں چاہوں گا کہ فیضی بھی اپنے اسلوب کو چوکھا بنائیں۔ اِدھر مجتبیٰ حسین نے ایک نئی روش یہ پیدا کی ہے کہ ہلکے سے افسانوی رنگ کے ساتھ تھوڑا ساحزنیہ انداز اختیار کرلیتے ہیں۔ یہ بھی ایک خوب صورت انداز ہے۔ اپنے پیش روؤں سے استفادہ کرنا ہر نئے ادیب کا حق ہوتا ہے۔ میں چاہوں گا کہ فیضی بھی اپنے اسی حق کا استعمال کریں اور کسی ایسے طرز کی بنیاد ڈال جائیں کہ اس کی وجہ سے یاد رکھے جائیں۔ آج کا ماحول منٹو کے سیاہ حاشیے جیسا بلیک ہیومر چاہتا ہے یا پھر بیدی کے الہ آباد کے حجام اور جنجنہ بد دعا اور کرشن چندر کے ایک گدھے کی سرگزشت جیسے طنزیے یا کنہیا لال کپور کا زہرخند جو آسمان کے نیچے ہر شے کا مذاق اڑاتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ وہ بے ضرر قسم کا مزاح نہ لکھیں بلکہ ایسی باتیں کہیں کہ جن سے واقعی لوگوں کو تکلیف ہو ان کی تحریروں میں قاری کو اپنا مکروہ، منافق چہرہ نظر آئے کہ لوگ اب اس قدر کرپٹ ہوچکے ہیں کہ اپنی حرکتوں پر انھیں شرم بھی نہیں آتی۔ آج ادب میں سیاست میں بلکہ زندگی کے ہر میدان میں جو صورتِ حال ہے اس کے لیے ہم سب ذمّہ دار ہیں۔ ہر شخص ذمّہ دار ہے اور آج کے ادیب کی تحریر میں اس کا عکس بے حد ضروری ہے۔

انور ظہیر خان (بمبئی)

فیاض احمد فیضی ـــــــ عرف بہاری بابو

فیاض احمد فیضی کا رنگ گندمی ہے۔ ڈھنگ کچھ نیارے کچھ پیارے ہیں اور چہرہ نہایت صاف ستھرا کہ جس پر جھائیں اور مہاسے کا دور دور نشان نہیں ملتا۔ مونچھ اور داڑھی سے ہمیشہ بے نیاز نظر آتے ہیں۔ گویا اردو شاعری کی اس کم سن جنس کی یاد دلاتے ہیں جس کا ذکر سترھویں اور اٹھارھویں صدی کی شاعری میں ہر ناویے سے ہوا ہے۔ یار دوستوں نے ان کے چہرے پر کبھی سبزۂ خط نہیں دیکھا، شبہ ہے کہ یہ کبھی اگا بھی ہے یا نہیں۔ مگر بہت قریب سے دیکھنے والوں کا قیاس ہے کہ "یہ" روز اگتا ہے اور روز غائب ہو جاتا ہے۔

ریاست بہار سے ان کا تعلق ہے۔ مگر اب تعلق کم، بے تعلقی زیادہ ہے، بہاری خون ان کی رگوں میں گردش کر رہا ہے۔ لیکن بہاریوں کی بو باس ان کو چھو کر نہیں گزری۔ کیا معجزہ کسی اور چیز کا نام ہے! صوبہ بہار بنگال سے لگا ہوا ہے۔ جب خلیج بنگال سے چلنے والی ہوائیں ریاست بہار میں داخل ہوتی ہیں تو ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنے ساتھ لائی ہوئی چاول کی سگندھ اور مچھلی کی گندھ کا اثر بہاریوں کی زبان و ذہن اور ذوق پر چھوڑ جاتی ہیں۔

فیاض احمد فیضی چاول اور مچھلی بڑے شوق سے کھاتے اور کھلاتے ہیں۔ (ویسے موصوف کھاتے زیادہ ہیں اور کھلاتے کم۔ البتہ پانی زیادہ پلاتے ہیں) آزمائش شرط ہے۔ اطلاعاً عرض کر دوں کہ کھانے سے قبل کھانے کے دوران اور کھانے کے بعد مختلف طرح کے پانی پلاتے رہتے ہیں کہ بیچارہ پینے والا پیتے پیتے پانی پانی ہو جاتا ہے۔ فیضی کو چاول اور مچھلی سے اتنی رغبت کیوں ہے۔ ہم آج تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ یہ "بنگالی ہوا کا اثر ہے" ان کے بہاری بابو ہونے کا یا ان کی نصف بہتر یعنی ہماری بھابی صاحبہ کی کرامت۔ خیر! اس سے ہمیں کیا لینا دینا۔ ہمیں تو صرف بگھارے چاول، تلی ہوئی مچھلیوں اور مچھلی کے قورمے شوربے پر ہاتھ صاف کرنے سے سروکار رہا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ایسے مواقع فیضی بہت کم ہمیں نصیب ہونے دیتے ہیں۔ ہماری بھابی (فیضی کی شریک حیات) کا تعلق پونہ سے ہے۔ پونہ کی آب و ہوا میں پتہ نہیں کیا بات ہے کہ کھانا زیادہ کھایا جاتا ہے۔ ہوا پانی سے واسطہ کم پڑتا ہے۔ فیضی کہیں یا نہ کہیں بھابی بہ اصرار کھلاتی ہیں۔ اور اتنی مقدار میں کھلاتی ہیں کہ پھر مہینوں چاول اور مچھلی کھانا تو دور کی بات، دیکھنے کی طبیعت نہیں ہوتی۔ بس! بھابی صاحبہ کے لیے بے ساختہ دعا نکلتی ہے (جس کا کچھ حصہ فیضی صاحب کے کھاتے میں چلا جاتا ہے) کہ وہ تو انا اور سلامت رہیں تاکہ عزت کام و دہن کے مواقع بار بار ہماری زندگی میں آتے رہیں۔

فیضی کا پیشہ بینک کی ملازمت ہے۔ آفیسر کے عہدے پہ فائز ہیں انھیں اس پیشے سے وابستہ رہتے ہوئے ابھی کئی درجے طے کرنے ہیں۔ گویا حال روشن تر اور مستقبل روشن ترین ہے۔ ادب پڑھنا، ادب لکھنا اور ادیبوں کے درمیان اٹھنا بیٹھنا، سیراب ہونا، اپنے چٹکلوں اور لطیفوں سے انھیں سیراب کرنا ان کا مشغلہ ہے۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ بینک کی ملازمت، تجارت کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ فیضی اس مفروضے کے قائل نہیں مگر سائل بھی نہیں ان اردو ادیبوں کی طرح کہ جو بھیک جمع کرتے پھرتے ہیں اور سدا دستِ سوال دراز کیے رہتے ہیں۔ ادب پڑھنا اور ادب جننا تو ملازمت سے پہلے بھی ان کا شوق تھا جس پر "شوقِ فضول" کی پھبتی نہیں کسی جا سکتی۔ مگر اب یہ شدّ و مد سے کتابوں پر دیدے ٹپکا رہے ہیں اور اتنی ہی شدّ و مد سے ان کے قلم سے لفظ ٹپک رہے ہیں تاکہ ملازمت تجارت اور شرافت کی تفریق واضح کی جا سکے اور ان میں کیا تال میل ہے اُجاگر کیا جا سکے۔ اس ٹیگ اور کلوگ میں یہ جذبۂ یہ توازن بڑی چیز ہے۔

فیاض احمد فیضی سے اب تک کتنوں کو فیض پہنچا۔ اس کا ہمارے پاس لیکھا جوکھا نہیں تاہم امیروں کبیروں وزیروں سے رسم و راہ رکھنے ان کے درمیان اٹھنے بیٹھنے کے ادب آداب جانتے ہیں (اگر ان سے فیض بھی پہنچا ہو تو ہم نہیں جانتے) ویسے آج کے اس نفسا نفسی کے دور میں یہ کوئی معیوب بات نہیں۔ اور ہم جیسے کئی ہیں جو ان کے تئیں اپنی نیک تمنّا کا اظہار کرتے ہیں کہ ع:

تو میرا نہیں بنتا، نہ بن اپنا تو بن

خوشی کی بات یہ ہے کہ فیضی نے اپنا بننے کی دُھن میں دوسروں کو یکسر فراموش نہیں کیا ہے۔ یہ بات غالباً اس لیے ہے کہ قلم کے سپاہی اور کوچۂ ادب کے راہی ہیں اور اس راہ پر چلنے کے لیے ضمیر کی شمع روشن رکھنی پڑتی ہے۔

فیضی نہ تہی دست ہیں اور نہ بخیل۔ ہم نے ادیبوں کے جمگھٹے میں انھیں اکثر چائے کا بل ادا کرتے دیکھا ہے۔ آدمی ہیں بڑے ہوشیار۔ چائے کا بل اس لیے ادا کرتے ہیں کہ سستے چھوٹے اگر لوگ باگ زبانِ دراز کے دامان تر کرانے کی فرمائش کر دیتے تو ظاہر ہے اس سے بڑے نقصان میں رہتے۔ مے و مینا سے انھیں غرض نہیں اس لیے میخانے کا رُخ نہیں کرتے، اگر رُخ کرتے بھی ہیں تو درِ میکدہ سے لوٹ آتے ہیں۔ کہ اندر داخل ہوئے تو کہیں اپنی آفیسری اور تونگری کا خراج نہ ادا کرنا پڑے۔ ان کی احتیاط بھی کیا چیز ہے کہ ہم جیسوں کو محتاط بنا دیتی ہے۔

فیضی کی تونگری، خوش وضعی، خوش لباسی، خوش کلامی، نفاست پسندی، ذوقِ جمال، خاطرِ احباب اور کار ڈرائیونگ میں نظر آتی ہے۔ تقریباً دو سال پہلے فیضی تھری وہیلر پہ ذرا ترچھا بیٹھے نظر آتے تھے۔ پھر سکنڈ ہینڈ گرین ماروتی میں بڑے ٹھسّے سے دکھائی دینے لگے۔ شکر ہے کہ فیضی کے پاس عقل کے ناخن ہیں۔ تدبّر کرنا اور تدبیر نکالنا جانتے ہیں۔ اسی لیے کچھ ہی دنوں میں یہ پھر کسی پر سوار ہوں گے ہم انھیں سوار ہی نہیں شہ سوار دیکھنا چاہتے ہیں[1] واقعہ یہ ہے کہ فیضی نچلا بیٹھنے کے قائل نہیں۔ اپنے سے عمر اور رتبے میں بڑے لوگوں سے دوستی کرتے ہیں۔ شاید ان کا نظریہ ہے کہ اگر آدمی کوتاہ قد ہے تو ایسے لوگوں سے دوستی جتا کر قد آور ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں ان کا یارانہ یا شناسائی ہے ان میں امیر کبیر، وزیر، حاکم، با تدبیر اور ادیبِ شہیر بھی نظر آتے ہیں۔

---

[1]: پتہ چلا ہے کہ انھوں نے ماروتی فروخت کر کے فیٹ (FIAT) کار خرید لی ہے۔ (ادارہ)

فیضی کو نسوانی حسن سے خاص لگاؤ ہے۔ عورت کے ذکر پر ان کا چہرہ کھِل اٹھتا ہے۔ مگر بہکتے نہیں، چہکتے ضرور ہیں۔ ان کے پاس اچھے برے 'ویج' 'نان ویج' چٹکلوں کا اچھا خاصہ بھنڈار ہے۔ شاعر نہیں ہیں شعر بھی کم یاد ہیں مگر اس کی کمی لطیفوں سے پوری ہو جاتی ہے۔ فیضی کا کمال یہ ہے کہ لطیفہ سناتے وقت یا سنانے کے بعد لطیفہ نہیں بنتے۔ کیوں کہ آدمی کے لطیفہ بننے کے بعد "لطیفہ" اپنا دامن اٹھا کے ٹل جاتے ہیں اور "کثیفہ" اپنا آسن جمانے لگتی ہے۔

"قند و زقند" فیضی کے انیس[19] مزاحیہ و طنزیہ مضامین اور ایک عدد مزاحیہ ڈرامے کا مجموعہ ہے قند کے معنی شکر، کھانڈ اور سرخ رنگ کے کپڑے کے ہیں۔ زقند کے معنی جست یا چھلانگ کے ہیں۔ یہ ترکیب مہمل ہے، یا معنی خیز: اس پر گفتگو کے مرحلے طے ہوتے رہیں گے۔ "قند و زقند" کے مطالعے کے دوران یہ محسوس ہوتا ہے کہ مصری کی ڈلی منہ میں گھلی جا رہی ہے اور مطالعے کے بعد قلاقند کھانے کو جی چاہتا ہے۔

فیضی جب زبان کھولتے ہیں تو غلط اردو نہیں بولتے۔ مگر "قند و زقند" میں شامل مضامین میں بعض مقامات پر زبان و بیان کی خامیاں راہ پا گئی ہیں۔ لہٰذا لوگوں کو گمان گزرتا ہے کہ یہ مضامین فیضی کے قلم کی دین ہیں یا کوئی معشوق ہے اس پر وہ زنگاری ہیں' بعض احباب کا خیال ہے کہ یہ فیضی ہی کے مضامین ہیں اور اس طرح کے مضامین فیضی ہی لکھ سکتے ہیں۔

لال فیتے کی فائلیں انسان کا لہو چوس لیتی ہیں۔ ان کی گرہوں میں ذہانت قید ہو جاتی ہے۔ وہ طائر بلند پرواز پرندہ پابستہ بن جاتا ہے' فیضی کو فائلوں سے روز واسطہ پڑتا ہے۔ یہ واسطہ ہی روزی روٹی کا ذریعہ ہے بسترت ذرا، راحت فزا اور حیرت آسا پہلو یہ ہے کہ ان پر فائل کے غمزے اور عشوے مسلط نہیں ہوتے ہیں: اس لیے انکی زبان' ان کا ذہن اور ضمیر ان کے قابو میں ہے۔ لہٰذا آدمی کام کے ہیں اور نام کما جائیں گے ●●

طالب خوندمیری

ایک مُتشاعر کا سیلف پورٹریٹ

میں جب سے شاعری کرنے لگا ہوں
ذرا سا کھوپڑی سے پھر گیا ہوں
تصوّر میں نظر آتا ہے مجھ کو
بہت اونچے منارے پر کھڑا ہوں
بڑی خوش فہمیوں میں مبتلا ہوں
میں جب سے شاعری کرنے لگا ہوں

کبھی اقبالؔ پر شب خون مارا
کبھی توفیق سے پایا اُتارا
زہے قسمت مجھے حاصل رہا ہے
کسی مشہور شاعر کا سہارا
کہ قوّالوں میں اٹھتا بیٹھتا ہوں
میں جب سے شاعری کرنے لگا ہوں

دکھاتا ہوں میں استادوں کو رستہ
مرے آگے کلامِ میرؔ خستہ
ولیؔ ہو، دردؔ ہو، سوداؔ کہ آتشؔ
ہیں میرے سامنے سب دست بستہ
دیارِ خواب کا فرماں روا ہوں
میں جب سے شاعری کرنے لگا ہوں

ملی ہے شاعروں کی جب سے صحبت
ہوا نشّہ، مرے فن کی ضرورت
جھجک پہلے پہل تھی آج لیکن
پڑی ہے اس قدر دارو کی عادت
کہ اب پانی بھی کم کم پی رہا ہوں
میں جب سے شاعری کرنے لگا ہوں

عروضِ شعر سے مطلب نہیں ہے
مرے فن پر مجھے پورا یقیں ہے
زمینِ شعر میں کچھ کھڈ اگر ہیں
کسی کو کیا! مری اپنی زمیں ہے
ترنّم سے میں ان کو پاٹتا ہوں
میں جب سے شاعری کرنے لگا ہوں

نہ تھا کچھ رعب زلفِ مختصر میں
بڑھاتا جا رہا ہوں بال سر میں
صفائی سے مجھے مطلب نہیں اب
معطّل ہو گیا حمّام گھر میں
نہایا کب تھا، یہ بھولا ہوا ہوں
میں جب سے شاعری کرنے لگا ہوں

بتاؤں کیا غزل گاتا ہوں کیسے
زباں اکثر خفا رہتی ہے لَے سے
دھنیں سب حلق ہی میں گونجتی ہے
مجھے محسوس یوں ہوتا ہے جیسے
کسی ویران گنبد کی صدا ہوں
میں جب سے شاعری کرنے لگا ہوں

بہت بیزار ہوں میں اپنے گھر سے
وہاں رہتا ہوں کم بیگم کے ڈر سے
بہ فیضِ شاعری یہ وقت آیا
کہ خود اپنے ہی بچّوں کی نظر سے
میں وزنِ شعر کی صورت گرا ہوں
میں جب سے شاعری کرنے لگا ہوں

زباں! جس سے نظر اپنوں نے موڑی
اسی سے میں نے رسم و راہ جوڑی
مرے اشعار جس میں ڈھل رہے ہیں
یہی کم بخت ہے اردو نگوڑی
اسی کے ساتھ دھکّے کھا رہا ہوں
میں جب سے شاعری کرنے لگا ہوں

کوئی میری غزل کو تولتا ہے
کوئی کچھ منہ بنا کر بولتا ہے
میں جب زندہ دلوں میں بیٹھتا ہوں
تو دل! یہ راز مجھ پر کھولتا ہے
کہ میں ان کی پسندیدہ غذا ہوں
میں جب سے شاعری کرنے لگا ہوں

میں جب اٹھتا ہوں شب کو دن میں سو کر
تو رہ جاتا ہوں پھر راگوں میں کھو کر
اگر ہو جائے کوئی تان اونچی
کئی الفاظ کھا جاتے ہیں ٹھوکر
تو لگتا ہے کہ میں بھی تو تلا ہوں
میں جب سے شاعری کرنے لگا ہوں

تمھیں بھی میں بتا دیتا ہوں طالب
بھرا ہے شاعری سے میرا قالب
مرے فن کے لیے کافی ہے اتنا
تخلص رکھ لیا ہے میں نے گالب
بجا غالب کا میں ہم قافیہ ہوں
میں جب سے شاعری کرنے لگا ہوں

○

بانو سرتاج
(چندرا پور)

خطرے کا الارم

ایک الارم وہ ہوتا ہے جو جنگ کے دنوں میں ہوائی حملے سے خبردار کرنے کے لیے بجایا جاتا ہے اور جسے سن کر عوام پناہ گاہوں میں پناہ لے کر جان بچاتے ہیں۔ فائر بریگیڈ اور پولیس جیپ کا سائرن سن کر لوگ سڑکیں تو خالی کرتے ہی ہیں بلکہ پولیس سائرن کے معاملے میں اکثر مکان بھی خالی کر کے کہیں اور پناہ لیتے ہیں۔ گھڑی کا الارم بجتا ہے تو تکیے یا رضائی میں منہ چھپا لیا جاتا ہے۔ کان بند کر لیے جاتے ہیں کہ گہری نیند کا لطف الارم بجنے کے بعد ہی آتا ہے ـــــ مگر ہم سے پوچھئے تو ہم ایک ہی الارم کو خطرے کا الارم مانتے ہیں اور وہ الارم ہے ہماری بیگم کا "اجی سنیے!" کا تخاطب!

بیگم جب ہمیں گفتگو کے لیے مدعو کرتی ہیں تو اس کی اہمیت دو ملکوں کے سربراہوں کے مابین ہونے والی گفتگو سے کچھ کم نہیں ہوتی۔ باقاعدہ ایجنڈا تیار کیا جاتا ہے ..... نشست گاہ کا تعین ہوتا ہے، وقت طے کیا جاتا ہے، موسم کے لحاظ سے ٹھنڈا یا گرم مشروب تیار کیا جاتا ہے اور پھر آواز میں ہر ممکنہ حلاوت اور نرمی لاتے ہوئے وہ الارم بجا دیتی ہیں ـــ اجی سنیے! فرق ہوتا ہے گفتگو کے مزاج میں ـــ اہم شخصیات ناپ تول کر بات کرتی ہیں اور ضروری معاملات ہی پر گفتگو کرتی ہیں مگر ہماری بیگم ہر موضوع پر بلا تکان اور بے لگام بولنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ نپولین کی ڈکشنری میں صرف ایک لفظ ناممکن نہیں تھا۔ ہماری بیگم کی ڈکشنری میں کم گوئی، اختصار، خاموشی، مصلحت وغیرہ اہم الفاظ نہیں ہیں۔ وہ جس موضوع کا گفتگو کے لیے انتخاب کرتی ہیں اس کے بیک گراؤنڈ اور تاریخی جائزے کے ساتھ اس پر نہ صرف تنقید ضروری سمجھتی ہیں بلکہ مستقبل کے امکانات کا جائزہ لیتی ہیں۔ مثلاً پڑوسن کی نئی ساڑی کا ذکر کرنا ہو تو ساڑی کی قسم، رنگ اور ٹیکسچر کا بیان ہوتا ہے جس مل کی تیار کردہ ہے، جس نام سے مشہور ہے اس کا تفصیلی اجمال دے کر دوسری ساڑیوں سے اس کا موازنہ وغیرہ مراحل درجہ بدرجہ طے ہوتے ہیں ـــــ کسی کے گھر کی سجاوٹ کا ذکر کرنا ہو تو دیوان خانے کی لمبائی چوڑائی، دیواروں کا رنگ، ان پر آویزاں تصاویر ان کے رنگ، صوفے میں استعمال کی گئی لکڑی، اس پر کی گئی نقاشی اور جملہ خصوصیات، پردے کا رنگ، اس کی قیمت، ان ڈور ... آن کی تعداد، ان کا انتخاب، ان کی اقسام کا تفصیلی ذکر کر کے ہمیں باخبر کرتی ہیں۔

اسی لیے ہم ان کی چہکار یا پکار کو خطرے کے الارم اور پولیس کے سائرن سے زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں ..... یہ الارم خطرے سے آگاہ کر کے محفوظ جگہ میں جانے کا اشارہ ہوتے ہیں، اجی سنیے کا الارم ہمیں ہماری پناہ گاہ سے ... شمشیر بے نیام کے حضور میں حاضر ہو جانے پر مجبور کرتا ہے۔ اسی لیے ہم ہر دم یہی دعا کرتے ہیں کہ یہ الارم نہ بجے ...ہا ہے مگر قسم لے لیجئے جو آج تک یہ دعا قبول ہوئی ہو۔

آج بھی اُن کی ابجی سنیے، کے جواب میں ہم چراغ کے جن کی سی تیزی کے ساتھ آن کے حضور حاضر ہو گئے۔ بیگم
صوفے پر جمائے بیٹھی تھی —— بولیں "آپ نے غور کیا؟ ان دنوں احمد صاحب کی بیگم میں نمایاں تبدیلی ہو گئی ہے۔"

ہم نے مدافعت کرتے ہوئے کہا" غور کرنا تو کجا! ہم نے بیگم احمد کو آج تک دیکھا ہی نہیں۔" بیگم نے مشین گن سے وار
کیا..... تڑا تڑ....... "بڑے بھولے بن رہے ہیں۔ نفیسہ آپا کی شادی میں آپ نے انھیں دیکھا؟ نیلے رنگ کا
غرارہ سوٹ پہنے ہوئے تھیں جس پر والی ٹکلیاں لگی ہوئی تھیں .... اس روز ترپاٹھی جی کے یہاں ان کی شادی کی
سلور جوبلی پارٹی میں جو جون کی سترہ تاریخ کو ہوئی تھی وہ موجود تھیں۔ گزشتہ سال مئی میں اتوار کے روز لبرٹی سینما کے پارکنگ
لاٹ پر جب ہم بی آر چوپڑہ کی سلور جوبلی ہٹ نکاح دیکھ کر نکل رہے تھے، ان دونوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ عید کے
جوائے آئس کریم پارلر میں ہماری میز سے چوتھی میز پر وہ موجود تھیں۔ کیوں نہ موجود ہوتیں؟ آئس کریم پارٹی ان کے
آئی اے ایس کزن نے ہی تو دی تھی۔ خیر خیر....... مجھے پتہ ہے آپ اپنی بات پر اڑے رہیں گے کہ انھیں نہیں
جانتے....... آپ ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ یادداشت خراب ہونے کا بہانہ کر کے اچھی خاصی جاننے والی کے
کہہ دیں گے۔ اچھا تو وہ فلاں کی بیگم تھیں؟..... ان کی بات رہنے دیں..... نوجیون کالونی کی تیسری قطار کے
پانچویں فلیٹ میں رہنے والی مسز مکھرجی میں ہوئی تبدیلی تو آپ کی نظر میں یقیناً ہی آئی ہو گی —— مسز شنکرن کے بارے
میں آپ خود ہی پرسوں کہہ رہے تھے کہ علیل نظر آتی ہیں، مزاج پرسی کو جانا ہو گا....... اور پھر کل پرمود اور للیتا دیدی
آپ کے آفس جاتے وقت آپ سے باتیں کر رہے تھے تب آپ نے للیتا دیدی کو تو دیکھا ہو گا۔ پہلے سے کتنا بدل گئی؟
شوخ رنگ کی پیلی ساڑی میں........ مشین گن کا راؤنڈ ختم ہو گیا۔ بیگم نے ہمیں جھنجھوڑا، "اُف وہ! سو گئے کیا
میں کیا لوری سنا رہی ہوں؟"

بیگم جب اپنی بڑی بڑی کجراری آنکھوں کے نشانے پر ہمیں سادھتی ہیں تو ہماری آنکھیں پانی مانگنے لگتی ہیں۔
لطف کی بات تو یہ ہے کہ آغاز محبت میں ہم ان ہی آنکھوں کے دیوانے ہوئے تھے۔ ان آنکھوں نے ہم پر وہ جادو کر
تھا کہ ہماری آنکھ میں اور کوئی جچتا نہ تھا۔ اُن آنکھوں کے سحر نے ہماری آنکھوں پر پردے ڈال دیے تھے۔ ہم ا
آنکھوں کی جھیل میں کچھ یوں ڈوبے کہ آنکھوں آنکھوں میں رات کٹ جاتی تھی اور ہمیں چین نہ ملتا تھا۔

ادھر بیگم کی آنکھوں میں بھی ہم ہی بستے تھے۔ انھوں نے ہمیں اپنی آنکھوں کی پتلیوں میں قید کر لیا اور جب کہیں
جا کر ہماری آنکھیں کھلیں اور ہمیشہ کے لیے آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ بیگم کی نادر شاہی ہماری آنکھوں کی کرکری بن
گئی۔ ہم کسی سے آنکھیں چار کرنے کے مجاز نہ رہے۔ کسی سے آنکھیں چار کرنے کے جرم کی پاداش میں نظروں سے گرانے
کی دھمکی ہمیں دی گئی۔

اس وقت بیگم نے آنکھیں نکالیں تو ہم نے دست بستہ کہا۔ "یقین نہیں آتا کہ آپ ہماری بیگم ہی بول رہی ہیں۔"
"کیا مطلب؟" وہ کچھ گھبرائیں کہ غلط ہتھیار تو نہیں استعمال کر دیا۔
"اور کسی کی بیوی میں ہوئی تبدیلی کا تو ہمیں دھیان نہیں مگر آپ ہمیں یکسر بدلی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ آپ ہماری زبان
سے کسی خاتون کا ذکر تو دور خاتون کا نام بھی سننا پسند نہیں کرتیں اور آج فرداً فرداً ہر خاتون کے بارے میں ہماری رائے
پوچھ رہی ہیں۔ مسز مکھرجی سے بات نہ کرنے کے لیے آپ نے ہمیں قسم دے رکھی ہے، مسز شنکرن آپ کی والدہ کی سہیلی

ہیں اور شادی کے تیسرے ہی روز آپ نے اُن کے سامنے نگاہ نہ اٹھانے کی ہمیں ہدایت دی تھی اور یا مظہر العجائب

پرمود بھائی اور للیتا دی۔ دی۔۔۔۔ تھے ہم سے کیا بات کی یہ آپ نے نہیں پوچھا ــــــ"

"للیتا دیدی کہیے"۔۔۔۔۔ بیگم نے آنکھیں نکالیں۔

"۔۔۔۔۔ پرمود بھائی اور للیتا دیدی ہم سے کیا بات کر رہے تھے یہ آپ نے نہیں پوچھا۔ ورنہ عام حالات میں کوئی خاتون سرراہ ہم سے وقت بھی دریافت کرتی ہے تو آپ سمجھتی ہیں کہ وہ ہم سے اظہار عشق کر رہی ہے"۔ للیتا دیدی کے ساتھ پرمود تھے۔۔۔۔۔۔"

پرمود بھائی کہیے"۔ ہم نے نہلے پہ دہلا مارا تو وہ خشمگیں نگاہوں سے ہمیں دیکھ کر خاموش رہ گئیں۔۔۔۔ ہم موقع غنیمت جان کر جانے کے لیے اٹھے تھے کہ وہ گڑبڑا کر بولیں: "قسم ہے آپ کو جو پوری بات سنے بغیر گئے۔ میں نے کیا پوچھا تھا آپ سے؟"

ہم نے طوطے کی طرح سبق دہرانا شروع کیا "ہم اپنے پورے ہوش و حواس میں یہ بیان دے رہے ہیں کہ ہم نامحرم عورتوں کی طرف نگاہ نہیں کرتے۔ مسز مکرجی کی طرف نہ دیکھنے کی قسم آپ نے ہمیں دے رکھی ہے۔ مسز احمد کو یہی قسم شاید مسٹر احمد نے دے رکھی ہے اس لیے وہ بھول کر بھی کبھی ہم پر نگاہ کرم نہیں کرتیں۔ مسز شنکرن کی علالت کا ذکر ہم نے یوں کیا کہ وہ بھی اسی بس سے اسکول جاتی ہیں جس بس سے ہم دفتر جاتے ہیں۔ پرمود بھائی اور للیتا پوچھ رہے تھے کہ اُن کے بقایا جات کے بل کب تک تیار ہو جائیں گے۔ ہمارا پورا دھیان اسی بات کی طرف تھا۔ ہمیں تو یہ بھی یاد نہیں کہ للیتا نے اس روز کس رنگ کا شلوار سوٹ پہنا تھا۔

"یعنی آپ کو یہ یاد ہے کہ للیتا دیدی نے شلوار سوٹ پہنا تھا، ساڑی نہیں" بیگم نے فوراً بات پکڑی۔

"بھئی۔ اس لیے یاد رہ گیا کہ قرمزی رنگ کا وہ شلوار سوٹ اس پر بہت پھب رہا تھا۔۔۔۔۔ ہاں بھی شاید اسی دن للیتا نے سٹ کرائے تھے۔۔۔۔۔ کافی کم عمر لگ رہی تھی"۔

ہم پر بھی بیگم کی صحبت کا اثر ہو گیا تھا اس لیے اختصار سے بات کرنے کی بجائے داماں چھیڑ دی تھی بیگم کو ظاہر ہے یہ کب گوارا ہوتا۔ بسیار گو کبھی اچھا سامع نہیں ہوتا۔ بے حد برا سا منہ بنا کر بولیں۔ "صرف یہ بتلایئے کہ آپ نے ان لوگوں میں کیا تبدیلی محسوس کی؟"

ہم نے اقبالی مجرم کی طرح گردن جھکا کر عجز سے کہا "آج تو یاد نہیں۔ غور سے سب کو دیکھنے کے بعد ایک دو روز میں بتائیں گے"۔

"کوئی ضرورت نہیں"۔ انھوں نے روک دیا: "میں خود ہی بتلائے دیتی ہوں"۔

"تو پہلے ہی بتا دیتیں۔ خواہ مخواہ ساری تاریخ و جغرافیہ پڑھا کر رکھ دی"

بیگم ہماری ناراضگی پر ذرا سا بھی دھیان نہ دیتے ہوئے رازدارانہ انداز میں بولیں، "بات یہ ہے کہ یہ سب کی سب ہلت کلب جا رہی ہیں"۔

"تو آپ کو کیوں تکلیف ہو رہی ہے" ہم نے بے ساختہ پوچھا۔

وہ اپنی رو میں بولیں "مسز احمد اور مسز مکرجی کا آٹھ آٹھ کلو اور مسز شنکرن کا نو کلو وزن کم ہو گیا ہے"۔

"اور للیتا کا؟" ہم نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے للیتا کا نام لے کر ۲۰۰۱۔

"اس کا بھی لگ بھگ پانچ کلو۔ ۔ ۔ ۔" بیگم نے چند لمحے توقف کر کے کہا "میں بھی ہیلتھ کلب جاؤں گی"

"لیکن کیوں؟ کوئی خاص موٹی نہیں ہیں آپ۔ بس ذرا تندرست ہیں"

"لیکن ہیلتھ کلب جانا آج کل فیشن بن گیا ہے۔ جس کے پاس وقت ہے، پیسہ ہے وہ ہیلتھ کلب ضرور جاتا ہے"

"مگر ہمارے پاس وقت ہے نہ پیسہ ہے"

"غلط کہہ رہے ہیں آپ! میرے پاس وقت ہے آپ کے پاس پیسہ! آپ سمجھتے کیوں نہیں، کلب جانے سے کیسا رعب پڑتا ہے؟ لوگ کہتے ہیں بڑے لوگ ہیں جبھی پانچ چھ سو روپیہ کلب میں پھینک آتے ہیں"

"خوب رہی یہ بھی ہم ادھر خون پسینہ ایک کر کے دولت کمائیں اور آپ اُسے ہیلتھ کلب میں پھینک آئیں آپ نے وہ کہانی نہیں سنی جس میں ایک باپ اپنے نکھٹو بیٹے کو روپیہ کمانے بھیجتا ہے اور ۔ ۔ ۔ ۔"

"مجھے نہیں سننی کہانی وہانی۔ ۔ ۔ ۔" وہ روٹھ کر بولیں۔

"تو آپ ایسا کریں ہیلتھ کلب میں پیسہ پھینکنے کے بجائے ہمیں ہی کہیں پھینک آئیں" کہہ کر ہم نے باہر کی راہ لی۔

دوسرے روز ہی اتفاق سے ہمیں آفس کے کام سے مدراس جانا پڑا اور چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر وہاں ہمارا قیام طویل ہو گیا۔ ۔ ۔ ۔ کوئی اگر کاہلوں کی فہرست تیار کرے تو شاید یہ تنہا ایسی لسٹ ہو گی جس میں ہمارا نام سرفہرست ہو گا۔ ۔ ۔ ۔ شاید گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں بھی اسی خصوصیت کی بنا پر کبھی ہمیں بھی جگہ مل جائے۔ ہم نے بیگم کو وہاں سے ایک بھی خط نہیں لکھا۔ روز سوچتے کہ کل کام ختم ہو جائے گا تو رات کی ٹرین سے نکل چلیں گے اور یوں پلک جھپکتے بیگم اور بچوں کے درمیان ہوں گے۔

پورے بتیس ۳۲ دن بعد یوں نکل کر یوں گھر پہنچے تو وہاں کا ماتمی ماحول دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ بیگم برسوں کی بیمار نظر آ رہی تھیں، بچے الگ پریشان تھے۔ بیگم ہمیں دیکھتے ہی روتے ہوئے بولیں "خدا کا شکر ہے کہ آپ لوٹ کر گھر آ گئے۔ ۔ ۔ ۔ میں تو سمجھی تھی کہ آپ میری ضد سے تنگ آ کر گھر سے بھاگ گئے"

"گھر سے بھاگنے کی بھی خوب رہی۔ کبھی آپ نے سنا کہ مرد بھی گھر سے بھاگتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ (مرد گھر چھوڑ کر جایا کرتے ہیں) مگر آج کل کی بیویوں سے کچھ بعید نہیں، کب کس پہ کون سا الزام لگا دیں! کبھی پتی پیڑت سنستھا کی کسی میٹنگ میں جا کر سنیے دیکھیے، کیسے کیسے مظالم ڈھاتی ہیں آج کی بیویاں اپنے شوہروں پر۔ ۔ ۔ ۔ اس لیے اب مرد بھی گھر سے بھاگنے لگے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ بیوی اکثر کسی دوسرے مرد کے لیے گھر سے بھاگتی ہے مرد بیوی سے جان چھڑانے کے لیے بھاگتا ہے اور پھر عورت ذات سے خوف کھانے لگتا ہے"

بیگم نے زوردار دعوت کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ خوب سجی سنوریں۔ رات کو تنہائی ملتے ہی بولیں "اب کبھی مجھے اس طرح چھوڑ کر نہ جائیے گا"

"نہیں جائیں گے، نہیں جائیں گے ماسوا ایک موقع کے۔ ۔ ۔"

"کیا مطلب؟" بیگم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

..... "یعنی جب آپ کا وزن بھی بڑھ جائے گا تو ہم اسی طرح غائب ہو جائیں گے۔ ہیلتھ کلب جانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی..... ہنگ لگے نہ پھٹکری رنگ آئے چوکھا"

ہم نے فلک شگاف قہقہہ لگایا مگر بیگم کی صورت پہ بارہ ہی بجے رہے ●●

صابر بہاری

(رانچی)

منظوم لطیفہ

اک بزرگِ محترم نے دوست سے اپنے کہا
یار میرے واسطے بیوہ تو کوئی ڈھونڈھ لا
اب شبِ فرقت نہیں کٹتی مری آرام سے
کھپرے گنتا رہتا ہوں بستر پہ اپنے شام سے
کیا مری خاطر تم اب اتنا بھی کر سکتے نہیں
دامنِ امید میرا یار بھر سکتے نہیں
میری حالت پہ کرم فرماؤ اے میرے حبیب
ایک بیوہ میری خاطر لاؤ اے میرے حبیب
زیست کا میں بوجھ تنہا کس طرح ڈھوتا پھروں
کب تک آخر اپنی محرومی پہ میں روتا پھروں
سن لیا جب ماجرا اک دوست نے اک دوست کا
مسکرا کر اس ضعیف العمر سے اس نے کہا
کیا ضروری ہے کسی بیوہ سے ہی شادی کرو
کیوں نہ اپنے واسطے دوشیزہ کوئی ڈھونڈھ لو
خود بخود بیوہ وہ لڑکی جلد ہی ہو جائے گی
یوں تمھاری آرزو بھی دفعتاً بر آئے گی

اعجاز وارثی (سنبھل)

....تو غزل ہوتی ہے

شاعری کا پڑے دورہ تو غزل ہوتی ہے
بیوی جھلتی رہیں پنکھا تو غزل ہوتی ہے

تالے پڑ جائیں سبھی رزق کے دروازوں پہ
اور فاقے پہ ہو فاقہ تو غزل ہوتی ہے

شہر خوباں میں سیہ بختوں کے نالے سن کر
کوئی غرفہ ہو اگر وا تو غزل ہوتی ہے

بھیرویں ساز پہ گاتی رہیں وہ پچھلے پہر
سر پہ بجتا رہے طبلہ تو غزل ہوتی ہے

اپنی ناکام محبت کے سبب دنیا میں
کوئی ہو جائے جو رسوا تو غزل ہوتی ہے

عشق کی دوڑ میں منہ دیکھتے رہ جائیں سوار
اور بڑھ جائے پیادہ تو غزل ہوتی ہے

ہم کو آتا نہیں راس امن و سکوں کا ماحول
روز ہوتا ہے جھگڑا تو غزل ہوتی ہے

سالیاں سلمیں چڑاتی رہیں منہ شام و سحر
دھونس دیتا ہے سالا تو غزل ہوتی ہے

صرف نمکین تو کافی نہیں دعوت کے لیے
مرغ کے ساتھ ہو زردہ تو غزل ہوتی ہے

یاد آتی رہے اس وعدہ شکن کی شب بھر
اور ہو جائے سویرا تو غزل ہوتی ہے

خشک ٹکڑوں سے کہیں ہوتا ہے بالیدہ دماغ
تر ہو ہر ایک نوالہ تو غزل ہوتی ہے

مشک بو شام کے تن پر ہو ستاروں کا لباس
روبرو ہو کوئی عذرا تو غزل ہوتی ہے

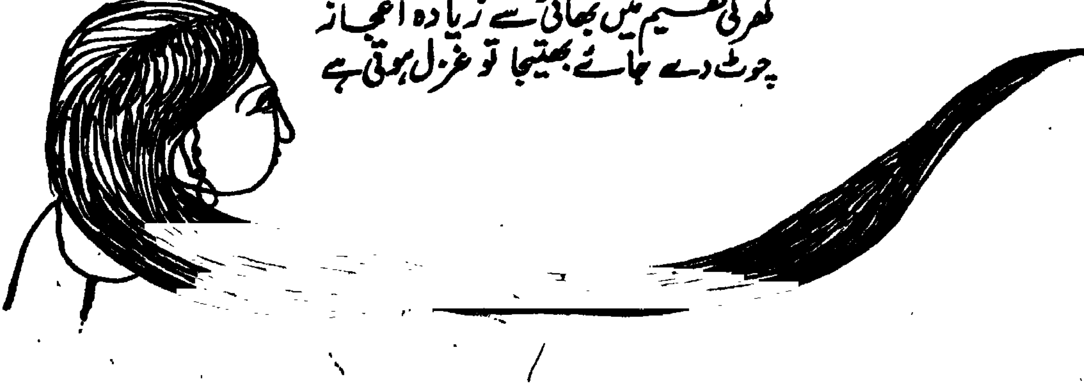
یوں بھی ہوتا ہے کبھی شہر نگاراں میں ہمیں
کوئی کہہ دیتا ہے اپنا تو غزل ہوتی ہے

پے بہ پے بیٹیاں ہی آتی رہیں جس گھر میں
بیٹا اس گھر میں ہو پیدا تو غزل ہوتی ہے

اسپ تازی پہ فروکش ہو دلھن وقت وداع
بند بینس میں ہو دولہا تو غزل ہوتی ہے

شب کے سناٹے میں سارق کوئی گھر میں گھس کر
رکھ دے سینے پہ طمنچہ تو غزل ہوتی ہے

گھر کی تقسیم میں بھائی سے زیادہ اعجاز
چھوٹ دے جائے بھتیجا تو غزل ہوتی ہے



اسکول ماسٹر کا خواب

۳

ہر فن مست مولانا الہ دین بے چارہ

[illegible]

[illegible] کھیل کھیل کے انجام تھے ۔ اسی [illegible] میں [illegible]
[illegible] سردار جی [illegible] لیا ۔

[illegible] میں سوئی کھو جانا ضروری نہیں ۔ البتہ اتنی تصدیق ہم بھی کر سکتے ہیں کہ جب سے اس نے [illegible] ہیں ۔ اس نے گل بادشاہ خان ٹرک ڈرائیور سے کار چلانی سیکھ لی ۔ مگر یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی شخص [illegible] استاد کا کام شروع کر دے ۔ ڈرائیونگ ٹیسٹ اس زمانے میں ایک اینگلو انڈین سارجنٹ لیا کرتا تھا [illegible] کے بال وہ پانچ چھ سال سے کاٹ رہا تھا ۔ تیلیقہ کا اپنا بیان تھا کہ سارجنٹ نے جنرل گیٹ کے پاس [illegible] لیا ۔ ٹیسٹ کیا تھا ، فقط ضابطے کی خانہ پری سمجھیے ! Calipha ! Well کار سے انگلش کا Figure
8 بنا کر دکھاؤ صرف اس ایریا میں ، جہاں ہم یہ لال جھنڈا لے کے کھڑا ہے ۔ اس لائن کو کراس نہیں کرنا ۔ 8 ایک دم ریورس [illegible] بنانا لگتا ۔ یہ سنتے ہی میں بھونچکا رہ گیا ۔ ریورس میں نے سیکھا ہی نہیں تھا ۔ گل بادشاہ خان سے میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ استاد [illegible] ریورس میں چلانا سکھا دو ۔ وہ کہنے لگا ۔ یہ میرے استاد نے نہیں سکھایا ۔ نہ کبھی اس کی ضرورت پڑی ۔ میرا استاد چنار گل خان [illegible] تھا کہ شیر ، ہوائی جہاز ، کوئی ٹرک اور پٹھان ریورس گیر میں چل ہی نہیں سکتے ۔

" میں نے اپنے دل میں کہا کہ چقندر کی دم ! میں انگلش کا 8 کا ہندسہ بنا سکتا تو تیرے جیسے بھالو کی حجامت کاٹنے کو کرتا ۔ غلام [illegible] کی چمپی مالش کرتا ۔ کیا بتاؤں ، اس گنجے گادنے کیسے کیسے پاپڑ بیلے ہیں ۔ جی جی ہاؤس میں مالی کا کام بھی کیا ہے ۔ [illegible] نہیں اگائی ۔ البتہ کراچی میں ، کیا نام اس کا ، ٹیولپ اُگا کے دکھایا ہے ۔ پر بڑے آدمیوں کی کوٹھیوں میں پھولوں کو کوئی نگاہ [illegible] نہیں دیکھتا ۔ بس مالی خود ہی پھول اگاتے ہیں اور خود ہی دیکھ دیکھ کے خوش ہو لیتے ہیں ۔ ہدایت اللہ پیرا میرے کو بولتا تھا کہ [illegible] کا ہر عضو مفلوج ہو گیا ہے ۔ زبان بھی ۔ اسی حالت میں باہر آنے کے کو ہا در پیدر کرتا رہتا ہے ۔ پر آدمی ہے ز [illegible] کا صاف نہیں کرتا ۔ جیسے جیسے طاقت جواب دے رہی ہے ۔ گالی اور زبان اور موٹی ہوتی جا رہی ہے ۔ اس کی بات [illegible] صرف [illegible] خدمت گار ہیرا اس کے منہ سے اپنا کان بھڑا کر سنتا اور سمجھتا ہے ۔ وہی اس کی پنجابی گالی کا دلی والوں کی اردو میں [illegible] شہاب صاحب کو بتاتا ہے ۔ وہ فٹافٹ اس کا انگریزی ترجمہ کر کے جی جی کی امریکی سکریٹری مس [illegible] کو بتاتے [illegible] انگریز لوگوں اور فیورن سفیروں کو کوٹے شکا ٹھکا کر بتاتی ہے کہ جی جی صاحب کہہ رہے ہیں کہ آپ سے مل کے [illegible] ۔
[illegible]

" تو جناب عالی ! سارجنٹ نے اپنے ڈنڈے سے زمین پر 8 بنا کر دکھایا ۔ لاحول ولا قوۃ ! میں بے فضول ڈر گیا تھا ۔ [illegible] سائیکل میں جسے ہینڈل کہتے ہیں اسے انگریزی میں فیگر آف 8 کہتے ہیں ۔ [illegible]
[illegible]
[illegible] 8 کے [illegible]
[illegible] آوازیں آئیں ۔ اسٹاپ ! اسٹاپ ! [illegible]
[illegible]
[illegible]

" آپ کی جوتیوں کے طفیل ہر فن میں طاق ہو جانے کو کیا نہیں آتا۔ جراحی بھی کی ہے۔ ایک آپریشن بگڑ گیا تو معافی مانگ لی کہ میرا دوست ولی اپنی ماموں زاد بہن پہ دل و جان سے فریفتہ تھا۔ پر وہ کسی طور شادی کے لئے رضامند نہیں ہوتی تھی۔ نہ جانے کیسے اس کو یہ وہم ہو گیا کہ اس کی بائیں طرف پہ جو مسّا ہے۔ اس کی وجہ سے شادی نہیں ہو رہی ہے۔ میں نے وہ مسّا کاٹ دیا۔ ناسور بن گیا اور لنگڑا ہو گیا وہ دن ہے اور آج کا دن، میں نے سرجری نہیں کی۔ وہ لڑکی آخر کے تیئیں میری زوجہ بنی۔ میری دائیں ٹانگ پہ مسّا ہے

ماحول پر لاحول اور مارکونی کی قبر پہ ...

کار متعدد اندرونی و غیر اندرونی خفیہ اور علانیہ امراض میں مبتلا تھی۔ ایک پرزے کی مرمت کرواتے تو دوسرا جواب دے بیٹھتا۔ جتنا پٹرول جلتا، اتنا ہی موبل آئیل۔ اور ان دونوں سے دگنا ان کا اپنا خون جلتا۔ آج کلچ پلیٹ جل گئی تو کل ڈائنمو بیٹھ گیا اور پرسوں گیر بکس جلا کر لائے تو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی سیٹ کے نیچے کدال چلا رہا ہے۔ خلیفہ نے تشخیص کی کہ صاحب اب پیور سلائڈی کر رہا ہے۔ پھر بریک گڑبڑ کرنے لگے۔ مستری نے کہا "ماڈل بہت پرانا ہے۔ پرزے بننے بند ہو گئے۔ آپ کہتے ہیں تو مرمت کر دوں گا۔ مگر مرمت کے بعد بریک یا تو مستقل لگا رہے گا یا مستقل کھلا رہے گا۔ سوچ کر دونوں میں سے چن لیجئے۔" ایک دفعہ خلیفہ نے اطلاع دی کہ کار کے shock absorbers ..... ختم ہو گئے۔ shock observers وہ shock observers کہتا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اب شاک لوکنے کے لائق نہیں رہے تھے۔ جہاں دیدہ بڑھوں کی مانند ہو گئے تھے جو کسی نیم تاریک کونے یا زینے کے نیچے والی کوٹھری میں پڑے پڑے صرف observe کرتے ہیں جو ناخلف دکھائیں سو ناچار دیکھنا۔ یہ مقام خودشناسی اور دانائی کا ہے جب انسان بچشم خود لغو سے لغو حرکت اور کرتوت دیکھ کر نہ آزردہ ہو، نہ طیش میں آئے اور نہ ماحول پر لاحول پڑھے تو اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ پہلے ہم دوسری وجہ بیان کئے دیتے ہیں کہ اب وہ جہاں دیدہ، بردبار اور درگذر کرنے والا ہو گیا ہے اور پہلی وجہ یہ کہ وہ حرکت اس کی اپنی ہی ہے۔

ایک دن گیارہ بجے رات کو ظریف جبل پوری کے مکان واقع الوئیم کوارٹرز سے واپسی میں گوراقبرستان کے سامنے سے گزر رہے تھے کہ اچانک بابائی کی آواز میں رعشہ پیدا ہوا۔ گھنگھرو سا بولنے لگا۔ خود ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی جا چکی تھی۔ خلیفہ نے کہا "جناب عالی بیٹری جواب دے رہی ہے۔" انہیں تعجب ہوا، اس لئے کہ وہ روزانہ گھر پہنچتے ہی بیٹری کو کار سے نکال کر آرام مشین سے جوڑ دیتے تھے تاکہ آٹھ گھنٹے تک چارج ہوتی رہے۔ شام کو گھر سے اسے نکال کر اپنے ریڈیو سے جوڑ دیتے جو صرف کار بیٹری سے چلتا تھا۔ پھر رات کو دس ایک بجے جب رات گئے ہو جاتے تو اسے ریڈیو سے علٰحدہ کر کے واپس کار میں لگا دیتے تاکہ صبح خلیفہ ڈرائیو کرے۔ اسی طرح بیٹری [illegible] کی تین شفٹوں میں تین مختلف چیزوں سے جڑی رہتی تھی۔ جواب نہ دیتی تو کیا کرتی۔ بالکل کنفیوز ہو جاتی تھی۔ یہ نہ [illegible] ان کے ریڈیو سے جو کچھ ہوتے پروگرام کے بجائے اکثر آرام مشین کی آوازیں نشر ہوتی رہتی تھیں جنہیں وہ [illegible] یہ [illegible] تک سر دھنتے۔ اسی طرح کار کے انجن سے موسم کی خرابی کی ریڈیائی آوازیں آنے لگی تھیں۔ عجیب

[illegible] میں ہیڈ لائٹس کار کی بیٹری کے بجائے کار بیٹری کی [illegible] تھی اور [illegible] بچتے تھے۔ بس زمانے میں بجلی نہیں آئی تھی۔

تھا۔ رات کو پچھلے پہر کے سناٹے میں جب اچانک عجیب و غریب آوازیں آنے لگتیں تو گھر والے یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ وہ ریڈیو کی دیں یا آنا و شینہ میں قوال پھنس گیا ہے۔ اور ان بچاروں کی معصومیت قابل معافی تھی۔ اسلئے ان آوازوں کا مخرج دراصل وہ گلا تھا جس سے بشارت خراٹے لے رہے ہوتے تھے ان کا کہنا تھا کہ کراچی ریڈیو سے میرے گلے میں مستقل خراش پڑ گئی ہے ایک اور عذاب یہ کہ جب تک ریڈیو اسٹیشن بند نہ ہو جاتا۔ تین چار پڑوسی ان کی چھاتی پر سوار پروگرام سنتے رہتے۔ اب بشارت اس مردم آزاد ایجاد سے سخت متنفر ہو گئے تھے۔ غالباً ایسے ہی حالات اور ایسے ہی بلیک موڈ میں عصر حاضر کے سب سے بڑے انگریزی شاعر فلپ لارکن نے کہا تھا کہ مارکونی (+) کی قبر پر پبلک ٹائلٹ بنا دینا چاہیئے۔

سوداوی اور صوبائی مزاج کے چار پہیئے

چند روز سے جب گرمی نے شدت پکڑی تو چاروں پہیوں کا مزاج سوداوی و صوبائی ہو گیا۔ مطلب یہ کہ چاروں پہیئے چار مختلف سمتوں میں جانا چاہتے اور اسٹیرنگ وہیل سے روٹھے رہتے تھے۔ یہی نہیں بعض اوقات خود اسٹیرنگ وہیل پہیوں کی مرضی کے مطابق گھومنے لگتا تھا۔ خلیفہ سے پوچھا "اب یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے مطلع کیا "حضور! اسے بیلنگ (wobbling) کہتے ہیں۔ انھوں نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ مرض کا نام معلوم ہو جائے تو تکلیف تو دور نہیں ہوتی۔ الجھن دور ہو جاتی ہے۔ ذرا دیر بعد وہ سوچ کر مسکرا دیئے کہ کار یہ چال چلے تو (wobbling)۔ راج ہنس چلے تو wadding ناگن چلے تو wriggling [illegible] تو wiggling۔

یہ کستارا چلا کر ناؤ چلی
واہ کیا بات دھیان میں آئی

اس دفعہ وہ خود بھی ورکشاپ گئے۔ مستری نے کہا زنگ سے سائلنسر بھی جھڑنے والا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کراچی کی ہوا میں اتنی رطوبت ہے اور دلوں میں اتنی رقت ہے کہ کھلے ہاتھ پھیلا کر اور آنکھیں موند کر کھڑے ہو جاؤ تو پانچ منٹ میں چلو بھر پانی اور ہتھیلی بھر پیسے جمع ہو جائیں گے اور اگر چھ منٹ تک ہاتھ پھیلائے اور آنکھیں موندے رہو تو پیسے غائب ہو جائیں گے۔ یہاں بال، سائلنسر اور پھیپھڑے قبل از وقت جھڑ جاتے ہیں۔ لاہور میں کم از کم اتنا تو ہے کہ سائلنسر نہیں جھڑتے" مستری نے مشورہ دیا کہ "اگلے مہینے جب نیا ہارن فٹ کرائیں تو سائلنسر بھی بدلوا لیں اس وقت تو یہ اچھا خاصا ہارن کا کام دے رہا ہے" بشارت نے جھنجھلا کر پوچھا۔ "اس کار کی کوئی چیز کام بھی کر رہی ہے یا نہیں؟" مستری تو سوچ میں پڑ گیا۔ پھر جواب دیا کہ "mileometer" تو کمی رفتار سے کام کر رہا ہے۔ دراصل اب کار کی کارکردگی * murphy's Law کے عین مطابق ہو گئی تھی یعنی اس کی ہر وہ چیز جو بگڑ سکتی تھی۔ بگڑ چکی تھی اس صورت میں حکومت تو چل سکتی ہے۔ کار نہیں چل سکتی۔

شتر ترانہ :-

[illegible] درست نہ ہو سکے۔ لیکن اب ان کی کمی محسوس نہیں [illegible] استعمال کی

(+) مارکونی ریڈیو کا موجد

* Murphy's Law any thing that can go wrong will go wrong

نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ جس جگہ بریک لگانا ہو۔ کار اس سے ایک میل پہلے ہی رک جاتی تھی۔ اور بشارت نے تو جب سے ڈرائیونگ سیکھنی شروع کی وہ بجلی کے کھمبوں سے بریک کا کام لے رہے تھے۔ کھمبوں کے استعمال پر ان کا کئی کتوں سے جھگڑا بھی ہوا۔ مگر اب بعض کتوں نے چیخ دھیمل کیپ سے کچھ کام لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس عمل کے دوران خود کو گردن موڑ موڑ کر وہیل کیپ میں دیکھتے جاتے تھے۔ حال ہی میں بشارت نے یہ بھی نوٹس کیا کہ کار کچھ زیادہ ہی زود رنج اور حساس ہو گئی ہے۔ سڑک کراس کرنے والے کی گالی سے بھی رکنے لگی تھی۔ بشرطیکہ انگریزی میں ہو۔ وہ بتدریج خوش خرامی سے سبک خرامی اور سست خرامی پھر آہستہ خرامی اور لخرامی کی منزلوں سے گذر کر اب تک خرامی پر آ گئی تھی۔ اس کی چال اب ان اڑیل اور سٹھے او نٹوں سے ملنے لگی۔ جس کی تصویر رڈیارڈ کپلنگ نے اونٹوں کے Marching Song میں کھینچی ہے۔ جس کی تان اس پر ٹوٹتی ہے۔

Can't! Don't! Shan't! won't

بلاشبہ یہ تان حقیقت ترجمان اس لائق ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک، جو کسی طور آگے نہیں بڑھنا چاہتے، اسے اپنا قومی ترانہ بنا لیں۔

"اسٹوپڈ کاؤ" سے مکالمہ:۔

ڈھائی تین مہینے تک بشارت کا تمام وقت، محنت، کمائی، دعائیں اور گالیاں ناکارہ کار پر صرف ہوتی رہیں۔ ابھی اس نابکار (بلین) کا زخم پوری طرح نہیں بھرا تھا کہ یہ نوبا* ہو گیا۔

بقول استاد قمر جلالوی :۔

ابھی کھا کے ٹھوکر سنبھلنے نہ پائے کہ پھر کھائی ٹھوکر سنبھلتے سنبھلتے

کار اب اپنی مرضی کی مالک ہو گئی تھی۔ جہاں چلنا چاہیے وہاں ڈھٹائی سے کھڑی ہو جاتی اور جہاں رکنا ہو وہاں ادبدا کے ساتھ چلتی رہتی۔ مطلب یہ کہ چوراہے اور سپاہی کے اجازتی سگنل پر کھڑی ہو جاتی، لیکن بمپر کے سامنے کوئی راہگیر آ جائے تو اسے صرف نظر کرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی۔ جس سڑک پر نکل جاتی، اس کا سارا ٹریفک اس کے خرام و قیام کا تابع ہو جاتا۔ جولیہ فیض کے مصرع کی الٹ ہو گیا تھا۔ ؎

"جو چلے تو کوہ گراں تھے ہم، جو رکے تو جاں سے گذر گئے"

تھک ہار کر بشارت اسی میم کے پاس گئے اور منت سماجت کی کہ خدا را! پانچ سو کم میں ہی یہ کار واپس لے لو۔ وہ کسی طرح نہ مانی۔ انھوں نے اپنی فرضی مفلوک الحالی اور اس نے اپنی بیوگی کا واسطہ دیا۔ انصاف کی توقع اٹھ گئی تو رحم کی اپیل میں زور پیدا کرنے کے لئے دونوں خود کو ایک دوسرے سے زیادہ مسکین اور بے آسرا ثابت کرنے لگے۔ دونوں پریشان تھے۔ دکھی اور مصیبت زدہ تھے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کے لئے پتھر کا دل رکھتے تھے۔ بشارت نے اپنی آواز میں مصنوعی رقت پیدا کرنے کی کوشش کی اور بار بار رومال سے ناک پونچھی۔ جواب میں میم سچ مچ رو پڑی۔ اب بشارت نے جلدی جلدی پلکیں پٹ پٹا کر آنکھوں میں فرضی آنسو لانے چاہے مگر الٹی ہنسی آنے لگی۔ بد حواسی میں منہ نہایت دردناک مگر بالکل فرضی منظر ۔۔۔

---

* [illegible] میں انگریزی کا ایک لفظ ہے جس کا اصل ماخذ فرانسیسی کا Faux pas ہے جس کا تلفظ اور معنی بعینہ وہی ہیں۔

... کو قرآن اور نیام کا منظر۔ ٹریفک کے حادثے میں اچانک وقتِ موت اور اس کی خبر سنتے ہی بیگم کو جھٹکے سے شدید ہوئی ملازم کا دوپٹہ اوڑھ کر چھن چھن چوڑیاں توڑنا اور رو رو کر اپنی آنکھیں سُجا لینا) آنکھوں میں بھر کر خود پر رقت طاری کرنے کی کوشش کی۔ مگر ظالم پیمانہ آنکھ سے آنسو ٹپکا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ انھیں اپنے شقی ہونے پر سخت غصہ آیا۔ دفعتاً انھیں اپنے انکم ٹیکس کے نوٹس کا خیال آگیا اور ان کی گھگی بندھ گئی۔ انھوں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا کہ آپ سے سچ عرض کرتا ہوں اگر بیکار کچھ دن اور میرے پاس رہ گئی تو میں پاگل ہو جاؤں گا یا بے موت مر جاؤں گا۔"

یہ سنتے ہی میم پگھل گئی۔ آنکھوں میں ڈبڈبا آنسو بھر کے بولی، آپ کے بچوں کا کیا بنے گا، جن کی صحیح تعداد کے بارے میں بھی آپ کو شک ہے کہ سات ہیں یا آٹھ۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے میاں کی ہارٹ اٹیک سے موت بھی اسی منحوس کار کی وجہ سے ہوئی اور اسی میں ..... اسٹیرنگ وہیل پر دم توڑا۔

ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ اس سے تو بہتر تھا کہ میں گھوڑے کے ساتھ ہی گزارا کر لیتا۔ اس پر مغنیہ چونکی اور مشتاقانہ بے صبری سے پوچھنے لگی۔

"You mean a real horse"

"Yes of course! why?"

"میرے پہلے شوہر کی موت گھوڑے پر سے گرنے سے واقع ہوئی تھی۔ وہ بھلا چنگا پولو کھیل رہا تھا کہ گھوڑے کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ گھوڑا اس پر گرا۔ وہ مجھے پیار سے Stupid cow کہتا تھا۔" اس کی اینگلو سیکسن بلو گرے آنکھوں میں سچ مچ آنسو تیر رہے تھے جیسے بشارت مدقوق القلب واقع ہوئے ہیں۔ جوان عورت کو اس طرح آبدیدہ دیکھ کر ان کے دل میں اس کے آنسوؤں کو ریشمی رومال سے پونچھنے اور اس کی حالتِ دیگی کو فی الفور ختم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ یہ کہنا تو کسر بیانی ہو گی کہ ان کے نہاں خانۂ دل کی کسی منزل میں خوبصورت عورت کے لئے ایک نرم گوشہ تھا اس لئے کہ یہاں تو تمام منزلیں سارے کا سارا خانہ ویراں۔

"انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا"

... کہ بنے ہیں دوست ناصح

انسان کا کوئی کام بگڑ جائے تو ناکامی سے اتنی کوفت نہیں ہوتی جتنی ان بن مانگے مشوروں اور نصیحتوں سے ہوتی ہے جن سے ہر وہ شخص نوازتا ہے جس نے کبھی اس کام کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ کسی دانا نے کیسی پتے کی بات کہی تھی کہ کامیابی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ پھر آپ کو کوئی مشورہ دینے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ ہم اپنے منہ سے بڑی بات نہیں کہہ سکتے دوستو۔ لہٰذا یہ نہیں بتا سکتے کہ ہم کامیاب ہیں یا ناکام۔ لیکن اتنا اتا پتا بتلائے دیتے ہیں کہ اگر ہمارے اسکوٹر میں کوئی خرابی ہو جائے تو ہمارے تمام دوست اور بہی خواہ سارے کام دھندے چھوڑ چھاڑ اپنے اپنے پیچ کش اور پانے (Pannets) لے کر ہم پر پل پڑتے۔ ایک صاحب اپنے چلکدار پانے سے ہماری گول ڈھبری کھولنے کی کوشش کرتا۔ دوسرا تیل چھڑکنے کے سوراخ میں پتہ سے اسکرو کو ٹھونک دیتا۔ تیسرا شخص [illegible] سے ہمارے تمام اسکرو "ٹائٹ" کرتا۔ آخر میں سب مل کر سارے اسکرو اور ڈھبریاں کھول کر پھینک دیتے محض یہ دیکھنے کے لئے کہ ہم ان کے بغیر بھی فقط دوستوں کی قوت سے [illegible]

[illegible]شامت کا ہوا ۔ کہ اس کے بعد ... کے بعد انھیں کثرت ایسی نصیحت سننی پڑتی تھی جو ان کے کام کی خرابیوں کے بجائے ان کی اپنی خامیوں کی طرف اشارہ کرتی جس کے نتیجے میں ... ہونا ضروری نہیں ادھر پیدا ہونے والے بشارت کو ... کر کے کہتے کہ خوش قسمت ہو کہ کام نہیں رکا۔

نصیحت کرنے والے میں صرف حاجی عبدالرحمٰن علی محمد بانٹوا والے نے کام کی بات کہی۔ اس نے نصیحت کی کہ کبھی کسی بزرگ سے مشورہ، انکم ٹیکس کے دفتر یا ڈاکٹر کے پرائیویٹ کلینک میں جانا ہو تو کار ایک میل دور کھڑی کر دو۔ ایک ہفتہ پہلے سے پان کھانے کے بعد دانت صاف کرنا بند کر دو۔ جو ہاتھ کے دونوں طرف ربڑ کے ریکھ میں پکے بریکٹ لگے رہنے دو۔ اور چار دن کے پہلے ہوئے کپڑے اور اپنی ہمت کا بڑھا ہوا شیو میکران کے سامنے جاؤ۔ اگر فیکٹری کے مالک ہو تو ریڑھی والے کا سا حلیہ بنا لو نہیں تو سالا لوگ ایک دم چمڑی اتار لیں گا اور کورے بدن پر نمک مرچ کی مالش کر کے ہوا بند رکھ دیں گا۔ تم اکھا تمام عمر تراہ تراہ کرتا پھر یں گا۔ اے بھائی! ہم تمہارے کو بولتا ہے۔ کبھی انکم ٹیکس آفیسر، پولیس، جوان جوڑو اور پیر فقیر کے پاس جاؤ۔ ہمیش کوئی ڈالی۔ کچھ دال پانی، کچھ نجر بجرانہ لے کے جاؤ۔ نہیں تو سالا لوگ کھڑے کھڑے کھال کھنچوا کے اس میں ٹڈاں کے اخبار کی ردی بھروا دیں گا۔ سبجا سبزہ۔ سو کا نوٹ دیکھ کے جس کی آنکھ میں ٹو ہنڈرڈ کینڈل پاور کا چمکارا نہیں آئے تو سمجھو سالا سولہ آنے کلر بلائنڈ ہے یا اولیا واللہ سے تم لا (بن) گیا ہے نہیں تو پھر ہو سکے نہ ہو گئے اسٹیٹ بنک کا گورنر ہے جو نوٹوں پر دستخط کرتا ہے!"

خلیفہ کی پاپ بیتی :-

خلیفہ کی مصیبت یہ تھی کہ ایک دفعہ شروع ہو جائے تو رکنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ بوڑھا ہو چلا تھا، مگر اس کی ڈینگوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑھاپے نے نفسی اور خواہش نفس کو ہی حقیقت نفس الامری بنا دیا ہے اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ یک پرانی مثل ہے کہ بڑھاپے میں انسان کا شہوانی قوت زبان میں آجایا کرتی ہے۔ اس کی شہوت بھری داستان سچی ہو یا نہ ہو، داستان کہنے کا انداز سچا اور کھرا تھا۔ اس کے سادہ دل سننے والے ایسے بے پناہ متاثر ہوتے کہ یہ خیال ہی نہ آتا۔ سچ بول رہا ہے یا جھوٹ۔ بس جی چاہتا یونہی بولے چلا جائے۔ خلیفہ کی کہانی اسی کی زبانی جاری ہے۔ ہم نے صرف نئی سرخی لگا دی ہے۔

"اور یار فقیرا! گلیا نی* تو جانو آگ بھرا بھبھوکا (+) تھی۔ اچٹتی سی نظر بھی پڑ جائے تو جھٹ نیم کی ٹہنی ہاتھ میں تھما دیتی تھی۔ یار! جھوٹ نہیں بولوں گا۔ روز قیامت کے دن حشر کے میدان میں اللہ میاں کے علاوہ والدہ صاحب کو بھی منہ دکھانا ہے۔ اب تجھ سے کیا پردہ۔ میں کوئی پیغمبر تو ہوں نہیں۔ گوشت پوست کا انسان ہوں۔ اور جیسا کہ مولوی حشمت اللہ کہتے ہیں۔ انسان خطا و نسیان کا پتلا ہے۔ تو یارا واقعہ یہ ہے کہ نیم ہی ٹہنی مجھے بھی لہرانی پڑی۔ بیشمار برس بھی نہیں لگا تھا۔ ستر ہواں چل رہا کہ نصیحت ہو گیا۔ بے حد چالاک، تمیزدار ایک مجبر شریف عورت تھی۔ ایسی ویسی نہیں۔ بیاہی تیاہی تھی۔ چند برس میں رہی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ رعنا بی اور چوہدری کے گھر میں ایک ساتھ ہی قدم رکھا۔ عمر میں مجھ سے بیس نہیں تو پندرہ برس بالضرور بڑا ہو گا۔ اولاد کا تعویذ لینے فریدہ آباد گیا ہوا تھا۔ کبھی کبھی کبھی۔ میں چار پتنگیں کنوا کے چرخی بغل میں دبائے چھت پر سے اترا تو دیکھا کہ

---

* خلیفہ ... کسی چمکیلی کہاوتی تھی کہ اس کے پاس ہو کے گزرے دو ... سے زیادہ کی استطاعت نہیں رکھتے۔ گویا اصل وجہ تشبیہ ... نہیں، تفصیل ... ہے۔

+ بھبھوکا ... ایک قسم کی آتش بازی ... [illegible]

[illegible] پانی کی آنکھوں کے سہارے ہی سے آنکھوں میں اب تک باپ کے جالیوں کا پیچھے سال بسا ہوا ہے۔ مجھے آتے
[illegible] الف کھڑا ہو گیا۔ یار تجھے کیا بتاؤں پھر تک تک میں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ گرمی بھر جلنے کی طرح
الٹ کر رکھ دیا۔ گڑ کی خاصیت گرم ہوتی ہے۔

میرے مرض کا جب انداز ہوتا تو والد صاحب، اللہ ان کی بال بال مغفرت کرے۔ آپے سے باہر ہو گئے۔ جوتا تان کر
کھڑے ہو گئے کہنے لگے "تو میرا فلز نہیں! میرے سامنے سے ہٹ جا نہیں تو ابھی گردن اڑا دوں گا۔" حالاں کہ تلوار تو درکنار
گھر میں جو تلی (کند) چھری تک نہ تھی جس سے نکلنے کی ناک کٹ سکے۔ پھر میں ان سے قد میں ڈیڑھ بالشت بڑا تھا۔ پر ان کا
تن وساب تھا کہ جلد اپنے رنگین تہد میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ماں میرے اور ان کے درمیان ڈھال بن کر کھڑی ہو گئی اور ان کا ہاتھ
پکڑ لیا۔ مجھے ایک ایک بات یاد ہے۔ ریا بچاؤ کرانے میں چوڑیاں ٹوٹنے سے ماں کی کلائی سے خون ٹپکنے لگا۔ دن رات محنت
مزدوری کرتی تھی جہاں تک میری چھٹپن کی یادداشت کام کرتی ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر ہمیشہ جھریاں ہی دیکھیں۔ آنسو اس
کی جھریوں سے دیکھ دیکھ بہتے تھے۔ مجھے آج بھی ایسا لگتا ہے جیسے ماں کے آنسو میرے گالوں پہ بہہ رہے ہیں۔ وہ کہنے لگی
"اللہ قسم! میرے لال پہ دشمنوں نے بہتان لگایا ہے۔" میں نے والد صاحب سے بہتیرا کہا کہ پرانے باجرے کی کھچڑی اور پال کے آم کو نے
سے گرمی چڑھ گئی ہے یقینے تو سہی۔ مشکی گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر چڑھنے سے مجھے یہ موذی مرض لگا ہے۔ بکھو مریال ہو سے موت نکل
جائے گی۔ پر وہ بھلا ماننے والے تھے۔ کہنے لگے "ابے نکھو مریال کے بچے! میں نے گڑیاں نہیں کھیلی ہیں۔ تو نے تائیوں کی عزت
خاک میں ملوا دی۔ بزرگوں کی ناک کٹوا دی۔" ماں کے سوا کسی نے میری بات پر یقین نہیں کیا۔ چھوٹے بھائی معذ مجھ سے جھگڑنے
لگے۔ اس لیے کہ ماں نے ان کے اور والد کے آم اور گھی میں تر تراتی باجرے کی کھچڑی بند کر دی تھی۔ یار فقیرا کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر
اللہ میاں کو اپنے بندوں سے اتنی بھی محبت ہوتی جتنی میری ان پڑھ ماں کو مجھ سے تھی تو اپنا بیڑا پار جاتا۔ حشر کے دن سارے
گناہ بخش دیے جائیں گے اور مولویوں کی کھچڑی اور آم بند ہو جائیں گے۔ انشاء اللہ۔

"خیر۔ اور تو جو کچھ ہوا سو ہوا۔ پر میرے فرشتوں کو بھی پتا نہیں تھا کہ تمیزن پر میرا چچا جان قبلہ کسی زمانے میں عاشق
ہو چکے ہیں۔ مولا قسم! خدا بھی شک گزرتا تو میں دل مار کے بیٹھ رہتا۔ بزرگوں کی شان میں گستاخی نہ کرتا۔ یار جوانی میں یہ
حالت تھی کہ نبض پہ انگلی رکھو تو ہتھوڑے کی طرح ضرب لگاتی تھی۔ شکل بھی میری اچھی تھی۔ طاقت کا یہ حال کہ کسی لڑکی کی کلائی
پکڑ لوں تو اس کا چھڑانے کو جی نہ چاہے۔ خیر وہ دن ہوا ہو گئے۔ میں کہہ رہا تھا کہ علاج مرض سے کہیں زیادہ جان لیوا تھا۔ بعد کو
[illegible] کرنے کے بعد دن میں تین دفعہ قد سے کہتے ہے قند سیاہ اور شیشے کے عرق اور کتیرا گوند کے پیالے پلائے جاتے اور
دو وقت پھیکی روٹی۔ کوتھیر (ہرا دھنیا) کی بے نمک مرچ کی چٹنی کے ساتھ کھلائی جاتی۔ اسی زمانے سے میرا نام بھیا کوتھیر
پڑ گیا۔ والد صاحب کو اس وقوعے سے بہت صدمہ پہنچا۔ مشکی مزاج آدمی تو تھے ہی۔ کبھی خبر آتی کہ شہر میں فلاں جگہ ناچ گانا
ہو رہا ہے تو والد صاحب مجھی کو آگ بھبھوکا نظروں سے دیکھتے۔ انھیں محلے میں کوئی لڑکی تیز تیز قدموں سے جاتی نظر آجاتی
تو سمجھتے کہ ہو نہ ہو میں ہی اس کے پیچھے لگا ہوں۔ ان کی صحت تیزی سے گرنے لگی۔ دشمنوں نے مشہور کر دیا کہ تمیزن نے ایک رات
ان پر جادو کی شیشی کر دی۔ خود ان کا بھی یہی خیال تھا۔ انھوں نے مجھے ذلیل کرنے کے لیے [illegible] کا جس سے بھی زیادہ

[illegible] ۔ [illegible] میں [illegible] سے [illegible]

اور یہاں تک کہ ہاتھ بند ہوا دیا اور ہنسی کے بجائے غم کا پہلو آگیا ۔۔۔ میرے قد سے بھی بڑا ۔۔۔ مجھے تھما دیا ۔ میں نے شکوت کے دوران اس سے آٹھ پتنگیں کاٹ دیں ۔ وہ کیسی بادشاہی کا زمانہ ہوتا ہے ۔ اس زمانے میں کوئی مجھے حضرت سلیمان کا تخت بھی دے دیتا اور ملکہ سبا بھی دے دیتا تو وہ خوشی نہیں ہوتی جو ایک پتنگ لوٹنے سے ہوتی تھی ۔ یارا کسی دن لے کے کھاتے تو کھلا دے ۔ مدتیں ہو گئیں ۔ مزہ تک یاد نہیں رہا ۔ ماں بڑے مزے کے بناتی تھی فقیرا نے اپنی ماں کو برباد کر دیا!"

خلیفہ اپنی ماں کو یاد کر کے یکایک آبدیدہ ہو گیا ۔

بزرگوں کا قتل عام

خلیفہ اپنے موجودہ منصب اور فرائض کے لحاظ سے کچھ بھی ہو ۔ اس کا دل ابھی تک گھوڑے میں اٹکا ہوا تھا ۔

" ابھی آتی ہے بو بالش سے اس کی اسپ مشکی کی بو *

ایک دن وہ دکان کے منیجر مولانا کرامت حسین سے کہنے لگا کہ " مولانا ! ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ جس بچے کے چپت اور جس سواری کے چابک نہ لگ سکے وہ روزِ قیامت کے دن تک قابو میں نہیں آنے کی ۔ نادر شاہ بادشاہ تو اسی فلسفے پر عمل کر کے گھوڑے سے کود پڑا اور جو بچا ملا اس کے قتل عام کرنے لگا ۔ چنانچہ سارے بزرگ قتل عام میں گاجر مولی کی طرح کٹ گئے ۔ گھوڑے کے بچوں تک کو بلم سے چھید کر ایک طرف کو پھینک دیا ۔ ایک مرد زندہ نہیں چھوڑا ۔ مولانا نے ناک کی نوک پر رکھی ہوئی عینک کے اوپر سے دیکھتے ہوئے پوچھا خلیفہ! پچھلے پانچ سو سال میں کوئی لڑائی ایسی نہیں ہوئی جس میں تم اپنے بزرگوں کو چن چن کر نہ مروا چکے ہو ۔ جب قتل عام میں تمہارا بچہ بچہ مارا گیا ۔ جب تمہارے سارے بزرگ ایک ایک قتل کر دیئے گئے تو اگلی نسل کیوں کر پیدا ہوئی ۔" بولا " آپ جیسے بزرگوں کی دعاؤں سے !"

بزرگوں میں سب سے زیادہ فخر وہ اپنے دادا پر کرتا تھا ۔ جس کی ساری زندگی کا واحد کارنامہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ پچاس سال کی عمر میں سوئی میں دھاگا پرو لیتا تھا ۔ خلیفہ اس کارنامے سے اس درجہ مطمئن بلکہ مرعوب تھا کہ یہ تک نہیں جانتا تھا کہ سوئی پرونے کے بعد دادا اس سے کیا کرتا تھا ۔

---

* یہ مصرع دراصل گھوڑے سے نہیں معشوق سے متعلق تھا ۔ ہم نے صرف اتنا تصرف کیا کہ " زلف مشکیں " کے بجائے اسپ مشکی جڑ دیا ۔ اس سے غزل کی لچک ، بتانِ ہزار شیوہ کی طرفگی اور وزن سے ہماری واقفیت ثابت ہوتی ہے ۔ بے شمار اشعار ہماری نظر سے گذرے ہیں کہ اگر یہ نہ بتایا جائے کہ ممدوح کون ہے تو خیال اوّلاً گھوڑے کی طرف جاتا ہے جب کہ وہ معشوق کے بارے میں ہوتے ہیں ۔

پروفیسر حفیظ بنارسی

بجلی

بنگلے میں بڑے لوگوں کے لہراتی ہے بجلی   ناداروں کے رستے سے بھی کتراتی ہے بجلی
اوّل تو یہ آتی ہی نہیں رات گئے تک   آتی ہے تو فوراً ہی چلی جاتی ہے بجلی
کم بخت کی فرقت میں عجب حال ہے اپنا   بھولیں تو ہمیں اور بھی یاد آتی ہے بجلی
وہ وقت بھی تھا شام و سحر ساتھ تھا اس کا   اب شام و سحر ہجر میں تڑپاتی ہے بجلی
گرمی سے پسینے میں شرابور ہوئے ہم   کب کوئی مگر ہم پہ ترس کھاتی ہے بجلی
بے کار بنا دیتی ہے ہر گھر کے "فرج" کو   پنکھے کی ہوا لے کے چلی جاتی ہے بجلی
سو کبھی ہوتی رہتی ہے صراحی ہو کہ بوتل   پانی کے لیے بھی ہمیں ترساتی ہے بجلی
کم ہے یہ کہتی ہے کہ دن کو ہمیں کاٹے   مچھر سے ہمیں رات کو ڈسواتی ہے بجلی
مدت کی شناسائی ہے اس دشمنِ جاں سے   کیوں گھر میں پھر آتے ہوئے شرماتی ہے بجلی
شرمندہ بنا دیتی ہے مہمان کے آگے   یوں بن کہے بے وقت چلی جاتی ہے بجلی
اربابِ حکومت کو کوئی فکر نہیں ہے   ان کو تو ہر اک حال میں مل جاتی ہے بجلی
امریکہ سے کہیے کہ وہ خیرات میں دیدے   بھارت سے تو کافور ہوئی جاتی ہے بجلی
پیسہ کہاں اتنا کہ چلائیں جنریٹر   مجبوروں کے ارمان پہ ستم ڈھاتی ہے بجلی
ہم مرثیہ پڑھتے رہیں حفیظ آپ ہی اپنا   ماتم کے اب اشعار کہلواتی ہے بجلی

محمود عشقی (ناندیڑ)

○

بے ادب جب سے ادب پر تبصرے کرنے لگے   تب سے اہلِ علم کچھ کہتے ہوئے ڈسنے لگے
وہ سنورنے پر زیادہ وقت جب دینے لگا   ہم بھی اس کا دل بڑھانے کے لیے مرنے لگے
غیر معمولی شرافت مصلحت کچھ بھی کہو

محمد حسین منشی
(بمبئی)

مسکراتے آئیے

ــــــ روتے جائیے

دندان ساز و معالج امراض دندان Dentist ڈینٹسٹ کے شفاخانے کے باہر جو بورڈ لگا ہوتا ہے اس پر دانتوں کا چوکھٹا بنا ہوتا ہے اس کی یہ امتیازی حیثیت بھی ہے اور اس بات کی علامت بھی کہ مسکراتے آیئے ۔ بھلے ہی علاج کے بعد جاتے ہوئے آپ کو رونا پڑے ۔

آدمی پیدا ہوتا ہے تو اس کی آنت ہوتی ہے دانت نہیں ۔ وہ اس دنیا میں آتا تو خالی ہاتھ ہے مگر مرنے کے بعد دانت ضرور دے جاتا ہے ۔ اور مرد تو داڑھی بھی لے جاتا ہے ۔ ابتداء میں دودھ کے دانت نکلتے ہیں جو دراصل دودھ کے نہیں ہوتے (یہ کوئی مٹھائی تو ہے نہیں) لیکن کہلاتے دودھ کے ہی ہیں ۔ بعد میں یہی دانت زرد خشک پتوں کی طرح یکے بعد دیگرے تمام جھڑ جاتے ہیں اور ان کی جگہ دائمی دانت لے لیتے ہیں ۔ یہ دانت کھانے کے بھی ہوتے ہیں اور دکھانے کے بھی (معشوقوں کے دانت بجلی گرانے کے لئے بھی) حیا سے سر جھکا لینا اور ادا سے مسکرا دینا ۔ حسینوں کو بھی کتنا سہل ہے بجلی گرا دینا ۔ عقل داڑھ بعد میں نکلتی ہے مگر ضروری نہیں کہ عقل داڑھ نکلنے پر عقل بھی آ جائے ۔

ادھر جوانی کی بہار ختم ہوتے ہی دانتوں کی پت جھڑ شروع ہو جاتی ہے ۔ کچھ بیماری سے کچھ کمزور مسوڑھوں کے سبب کھوکھلا ہو جاتا ہے ۔ تو کسی میں پیپ بھر جاتا ہے اور کوئی جھومنے لگتا ہے ۔ اس درمیان دانتوں کی کتنی ہی حفاظت کرئے لاکھ تدبیر کرو سب کہاں زندگی بھر کا ساتھ دیتے ہیں ۔ منہ میں دانت چکی کا کام کرتے ہیں جو غذا کو باریک پیس کر معدے میں روانہ کرتے ہیں ۔ دانتوں کی صفائی بھی اسی وجہ سے بے حد ضروری ہے اور دانتوں کی جھاڑو ہے مسواک (مسواک کا انگریزی نام نہیں لیکن یہ منہ میں چلتی ضرور ہے) لیکن آج مسواک کی جگہ ٹوتھ برش نے لے لی ہے اور ٹوتھ پیسٹ کے اشتہارات سے دوردرشن کو زبردست آمدنی ہوتی ہے ۔ اکثر لوگ تو اشتہار دیکھنے کے لئے ٹی وی کو آن کرتے ہیں ۔ ورنہ پروگرام میں رکھا ہی کیا ہے ۔ ہاں درمیان میں رکاوٹ کے لئے معذرت کا اعلان بھی اچھا لگتا ہے ۔

دانتوں میں درد اٹھا، ہلنے لگا، سڑ گیا، ہو یا کوئی اور تکلیف ہو تو ماہر امراض دندان کی طرف رخ کرنا پڑتا ہے ۔ دانت اگر ونا ہو گئے ہوں تو ان کی صفائی یا ان پر سونے اور چاندی کا لباس چڑھانے کے لئے یا ان کی جگہ نقلی دانت بنوانے کے لئے ڈینٹسٹ کے پاس جانا ہی پڑتا ہے ۔ کچھ فیشن پرست اور ضرورت پرست بھلے چنگے اپنے دانتوں کا [illegible] مناسب سمجھتے ہیں مگر وہاں ڈینٹسٹ کی فیس اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ دانتوں تلے پسینہ آ جاتا ہے ۔

ڈینٹسٹ کے یہاں یہ حادثہ بھی نہیں ہوتا کہ آپریشن کے دوران کوئی اوزار انگوٹھی یا گھڑی مریض کے منہ میں رہ گئی ہو البتہ یہ ممکن ہے کہ درد والے دانت کی بجائے صحیح سالم دانت اکھاڑ لیا جائے۔ ادھر مریض درد اور کرب کے مارے چلاتے جاتا ہے مگر اس کی آہیں کراہیں اور آہ و زاری سب بیکار۔ دانت دیا درد لیا والا معاملہ ہے۔ ان دنوں جھگڑے فساد اور ہاتھا پائی کا ایسا ماحول ہے کہ اکثر مار پیٹ میں دانت ٹوٹتے ہیں یا ٹیڑھے ہو جاتے ہیں۔ جبڑوں پر بھی کاری ضرب لگ جاتی ہے۔ کمر اور ہاتھ پاؤں کی ہڈیاں تک ٹوٹ جاتی ہیں (مجبور کو ٹوٹ کر چاہنے کا شاید یہی انجام ہے) جس طرح اینٹ کا جواب پتھر سے ملتا ہے اسی طرح یہاں تو دانت بھی گنوایا اور پیسے بھی گئے کا معاملہ ہے مریض اپنا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی ڈاکٹر کی فیس ادا کر دیتا ہے۔ جس طرح زمین تیزی سے چلتی ہے مگر ہلتی نہیں اسی طرح دانت ہلتا ہے اکھڑتا نہیں۔ رسہ کشی جاری رہتی ہے۔ مریض بدست طبیب او کھلی میں سر دیا ہے تو دھکیوں کا کیا ڈر؟ حیرت کا مقام ہو تو لوگ دانتوں میں انگلی دبا لیتے ہیں۔ لیکن ڈینٹسٹ تو انگلیوں میں مریض کے دانت دبا لیتا ہے۔ وہ بھی بڑی بے دردی کے ساتھ۔ کیوں نہ ہو دانت اپنا اور نہ درد اپنا۔ دانت اکھاڑ کے اس کی جگہ دوا لگا دی اور روئی کا پھایا رکھ دیا۔ یعنی سو

رہا نہ دہن میں دانت اور درد رہا
مکین کون ہوا ہے مقام کس کا ہے

گیا ہوا زمانہ کہ پردہ نشین خواتین کی نبض دیکھنے کے لئے کلائی پر دھاگا باندھ دیا جاتا تھا اور اس کا دوسرا سرا طبیب کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔ نہ وہ حکیم رہے نہ وہ تقاضے کیا مرد کیا عورت۔ ہر ایک کو دانت کی تکلیف ہونے پر ڈاکٹر کے شفاخانے میں آنا پڑتا ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں حسن عالمتاب کو بھی بے نقاب ہو کر حاضر ہونا پڑتا ہے۔ جہاں یہ وہ جگہ ہے جہاں مریض کو بٹھایا نہیں لٹایا جاتا ہے۔ خواہ وہ پورے نقاب میں ہو یعنی بند لفافہ یا نیم نقاب کہ چہرہ کھلا ہو بمثل ان لینڈ لیٹر یا بالکل پردے سے بے نیاز مانند پوسٹ کارڈ ہو۔ خواتین مرد ڈاکٹر کو بتانے میں ابتداء میں قدرے جھجک بھی محسوس کرتی ہیں اور حیا بھی لیکن تابکے اور بعض تو ان میں بڑی بے باک ہوتی ہیں بمصداق اس مصرعہ کے سو "نقاب الٹ ہی دی اس نے یہ کہہ کر کہ کر ہی لے گا مرا تو کیا"

آپ کا باغیچہ پھلے پھولے یا آپ کے بچے پھلیں پھولیں تو کتنی خوشی ہوتی ہے۔ لیکن آپ کے منہ اور گال پھول جائیں تو ان کے ساتھ ڈاکٹر یاد آنے لگتا ہے۔ ادھر مریض کو دیکھ کر ڈاکٹر پھولے نہیں سماتا۔ ڈینٹسٹ کے یہاں اگر مزدوری ہوا تو منہ میں تھرما میٹر لگایا جاتا ہے۔ بغل میں نہیں کیونکہ بغل میں یا تو بچہ رہتا یا پھر چھری۔ ویسے مارے تکلیف کے مریض کے منہ پر بارہ بجے گرانی طاری ہو جاتی ہے۔ دانت کا درد بھی FIVE in one ہے یعنی دانت کے درد کے علاوہ سر، کان اور آنکھ میں بلا کا درد ہوتا ہے۔ کئی مریض تو ڈاکٹر کے اوزار دیکھ کر ہی بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ جس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر کو بے ہوشی کا انجکشن نہیں لگانا پڑتا۔ بلڈ پریشر کی جانچ کے لئے نرم گداز بازو کو ہاتھ میں لینے کا بہتر انداز ہوتا ہے۔ لطف اندوز ہونے کے اس عمل سے ڈاکٹر کا بلڈ پریشر البتہ بڑھ جاتا ہے۔

نقلی دانت بنانے وقت اگر کسی غیر ماہر ڈاکٹر سے سابقہ پڑ گیا تو سمجھئے مریض گیا کام سے۔ منہ میں مسالہ بھر کے دانت کا ناپ لیا جاتا ہے اور بار بار منہ دبایا جاتا ہے۔ اس طرح مریض کی بولتی بند۔ بڑی احتیاط اور کوشش کے باوجود تیار شدہ دانت اپنا سا ڈھیلا ہے یا تو بہت بے حد تنگ۔ درست کرنے کے بعد بھی ٹھیک ٹھاک نہیں

نکلتا - فدا چھینک آئی کہ پورا سیٹ باہر۔ اگر تھی کی تو پانی کے ساتھ باہر۔ ادھر ڈاکٹر کا اصرار کہ مسوڑھے تیزی سے گھس رہے ہیں اور کمزور بھی ہو گئے ہیں حالانکہ مریض بار بار یقین دلاتا ہے کہ اب بھی اس کے مسوڑھے اتنے مضبوط ہیں کہ ثابت سخت اخروٹ خشک سنگھاڑا اور ہڈی چبا سکتا ہے۔ مگر ڈاکٹر کے آگے یہ سب دلیلیں عبث اور بیکار۔ سنا ہے کہ پرانی جیک پر نئے دانت کے سیٹ بھی فٹ ہو جائیں تو بہت سارے مریضوں کی یہ پریشانیاں ختم ہو جاتیں۔ دو مریض اپنے اپنے مصنوعی دانتوں کے سیٹ سے غیر مطمئن تھے۔ گو یم مشکل وگرنہ گویم مشکل کا جو کھٹا استعمال کرتے ہیں تو تکلیف اور بے قراری رہتی ہے ذکر یوں تو منہ پر بلا نظر آتے۔ دونوں کے دل میں کیا آئی کہ ایک دوسرے کا جو کھٹا بدل لیا۔ اتفاق سے دونوں کو ایک دم فٹ بیٹھ گیا۔ دونوں نے جا کر ڈاکٹر کو اپنی بتیسی دکھا کر اس کے دانت کھٹے کر دیئے بے چارہ ڈاکٹر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ بہت سے مریض دانت کا درد برداشت کر لیتے ہیں مگر اناڑی ڈاکٹر سے علاج نہیں کرواتے۔

اصلی دانتوں میں خلال کرنے کا جو مزہ ہے وہ نقلی دانتوں میں کہاں۔ ابھی تک تو Veterinary Dentist مویشی کے دندان ساز میدان میں نہیں آئے ہیں۔ مگر آدمیوں کو ہی حیوان سمجھ کر علاج کرتے

ڈاکٹر کی یہ تاکید ہوتی ہے کہ زیادہ میٹھا نہ کھائیں ورنہ دانت جلد خراب ہو جاتے ہیں مگر غریب اور اوسط درجے کے مریضوں کو کہاں کیک اور مٹھائی نصیب ہوتی ہے۔ وہ تو فقط میٹھی باتیں کر لیتے ہیں جس سے خوش ہو کر لوگ دعائیں دے ڈالتے ہیں کہ تمہارے منہ میں گھی شکر۔ ورنہ کہاں کا گھی اور کہاں کی شکر۔ شاید اسی مٹھاس سے دانت خراب ہوتے ہوں۔

دانت کے کلینک میں نہ ایمبولنس کا رواج اور نہ ایمرجنسی وارڈ جیسی کوئی چیز۔ یہاں مریض زندہ آتا ہے مر کے نہیں نکلتا۔ البتہ باہر نکل کر مرتا ہے۔

• •

غزل

ڈرانا ہر کسی سے یوں نہ تم بے ساختہ آنکھیں
کہیں بدنام ہو جائیں نہ شہرت یافتہ آنکھیں

کبھی خود بند ہو کر راہِ دل مسدود کرتی ہیں
کبھی دیتی چلی جاتی ہیں دل تک راستہ آنکھیں

کبھی دل بھی تڑپتا ہے دہائی دے کے آنکھوں کی
کبھی رو رو کے دے جاتی ہیں دل کا واسطہ آنکھیں

کہیں فتنہ گری سے ہیں سکون چین کی دشمن
کہیں امن و اماں کی ہیں نشانی فاختہ آنکھیں

نہیں تابِ نظارہ اور جلووں کی تمنا ہے
کہیں اندھی نہ ہو جائیں خدا نخواستہ آنکھیں

چلا کچھ بھی نہ میرا زور جب اپنی ہی بیوی پر
دکھاتا رہ گیا میں ہو کے دل برداشتہ آنکھیں

حسینوں سے نگاہیں خواہ مخواہ تم کیوں لڑاتے ہو
کہیں کمزور ہو جائیں نہ پنشن یافتہ آنکھیں

خواہ مخواہ (بمبئی)

قطعات

چلو مانا کہ جینا ہے تو کچھ کرنا ضروری ہے
پہنچنا ہے جو منزل پر سفر کرنا ضروری ہے
مگر کوئی مجھے اتنا تو بتلا دے سیاست میں
امر ہونا ہے تو کیا خواہ مخواہ مرنا ضروری ہے

○

عزت کو اپنی نفس کی کھونٹی پہ ٹانگ کر
تھوڑی بہت خودی ہے جو لایا ہوں مانگ کر
چھوٹا سا اک فلیٹ، فرج، کار، وی سی آر
سب کچھ خدا سے مانگ لیا تم کو مانگ کر

غزل

اقبال ہاشمی
(حیدرآباد)

اک نظر یوں نہ وار کر ڈالو
دوسری بار مت نظر ڈالو

چار رشتے ہیں جب تمہیں جائز
چار سے اپنے گھر کو بھر ڈالو

میں بھی بھوکا ہوں میرے کاسہ میں
پہلے نان پھر زمین و زر ڈالو

چندہ اپنا ہے مسجدیں اس کی
کچھ ادھر اور کچھ ادھر ڈالو

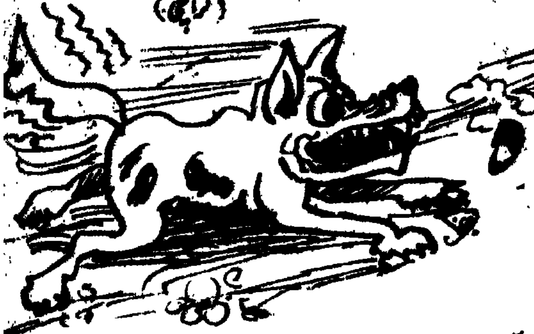
وہ تو بیٹھے ہے سامنے اس کے
دل ہی ڈالو نہ تم جگر ڈالو

بس تھکاوٹ ہی ہاتھ آئے گی
پھیرے چاہے نگر نگر ڈالو

بے اثر شاعری سے کیا حاصل
ہاشمی چاشنی کا اثر ڈالو

محمد عظمت اللہ
(کراچی)

کتوں کا شکوہ



کتوں کو آدمی نے بہت مایوس کیا۔ وہ آخر کب کتوں کا ممنون احسان ہو گا کہ جبکہ ابتدا سے کتوں نے آدمی کا ساتھ دیا۔ آدمی نے غاروں میں رہنے کا سلیقہ کتوں سے سیکھا۔ کتا آدمیوں کے ساتھ صدیوں سے ہے اور رہے گا۔

کتوں کی عادات، فطرت اور خصلت میں قدرت نے انمول اور نایاب صفات بھر دی ہیں جس کی وجہ سے آدمی کتوں کی ایک ایک صفت سے جلتا، رشک کرتا بلکہ حسد کرتا ہے کتوں سے متعلق بزرگان وقت کے دس جملے دعوت فکر دیتے ہیں۔

- کتا بھوکا رہتا ہے اور تھوڑی سی چیز پر قناعت کرتا ہے، یہ آدابِ صالحین ہے۔
- کھانا سامنے رکھا ہوا دیکھتا ہے تو دور بیٹھا دیکھتا رہتا ہے، یہ علامت مساکین ہے۔
- کتے کا کوئی مکان نہیں ہوتا، یہ علامتِ متوکلین کی ہے۔
- کتا رات کو بہت کم سوتا ہے، یہ صفتِ شب بیداری اور علامتِ محبین ہے۔
- یہ اپنے مالک کو نہیں چھوڑتا، خواہ وہ اسے مارے اور اس پر کتنی ہی جفا کرے، یہ علامتیں مریدانِ صادقین کی ہیں۔
- کتا ادنیٰ جگہ پر راضی ہو جاتا ہے، یہ علامت منکسرین و متواضعین کی ہے۔
- کتے کی جائے رہائش پر کوئی قبضہ کرے تو اس کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جاتا ہے، یہ علامت راضین (صابر شاکر) کی ہے۔
- کتے کو مار کر بھگائیں پھر ٹکڑا ڈالیں، فوراً آجاتا ہے۔ دل میں بغض نہیں رکھتا، یہ علامت عاشقین کی ہے۔
- کتا کسی مکان سے کوچ کرتا ہے تو پھر ادھر التفات نہیں کرتا۔ یہ علامت محزونین کی ہے (ملول غمگین)
- کتا وفا کا پیکر ہوتا ہے۔ اپنے مالک سے بے وفائی نہیں کرتا۔

دنیا میں آدمی کی نہیں کتوں کی وفاداری ضرب المثل بن گئی ہے۔ آج تک آدمی وفاداری میں کتوں سے پیچھے ہے مگر آدمی کوشش میں لگا ہوا ہے کہ وہ وفاداری میں کتوں کے مقام کو چھو لے۔ انسان نے کتوں سے خانہ بدوشی چھوڑ روزی کی تلاش میں محنت اور سفر کرنا سیکھا۔ سیاحت کے شوقین کتے ہی ہیں۔

کتوں کی ایک شاندار صفت یہ ہے کہ پیٹ بھر کر کھا چکنے کے بعد بھی بچی ہوئی ہڈی یا روٹی کو اپنے ہی قبضے میں رکھتا ہے وہ کو [illegible] کر دیتا ہے مگر کسی دوسرے کو کھانے نہیں دیتا۔ اس صفت کو بھی آدمی نے اپنا لیا۔

کتے تیسری دنیا میں رہ کر بھی تیسری دنیا کے آدمیوں کی طرح خاموشی سے ظلم نہیں سہتے۔ جو کتوں کو تنگ کرتا ہے کتے اُسے کاٹتے بھی ہیں۔ کتے صرف دانت سے کاٹتے ہیں اور کتوں کے کاٹنے کا یہ ایک ہی طریقہ ہے۔ آدمی نے کتوں سے کاٹنا سیکھا مگر آدمی' آدمی کو ہزاروں طریقے سے کاٹتا ہے۔ آدمی اگر آدمی پر بھروسہ کرے تو بُری طرح کاٹا جاتا ہے' یہاں تک کہ آدمی الفاظ سے کاٹتا ہے' جملوں سے کاٹتا ہے۔ تلوار کا گھاؤ مندمل ہو جاتا ہے۔ مگر آدمی کا کاٹا ہوا لاعلاج ہوتا ہے' اس لیے ہی حضرت غالب نے کہا:

"ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں"

شاید یہی وجہ ہے کہ آج کل آدمی کے قریب انسان سے زیادہ کتے نظر آتے ہیں۔ پہلی' دوسری یا تیسری دنیا کیوں نہ ہو اچھی نسل کے کتوں کا کسی کے بنگلہ پر موجود رہنا آدمی کے اعلیٰ ذوق اور خاندان کی امارات کی نشانی ہے۔

صبر' شکر اور قناعت کتوں کی خاص صفات ہیں۔ کتے ہر حال میں راضی بہ رضا رہتے ہیں' صبر کرتے ہیں' رونے سے گریز کرتے ہیں جبکہ آدمی کا بچہ پیدا ہوتے ہی بلاوجہ روتا ہے اور آدمی' بچے کے رونے کو زندگی کی علامت کہتا ہے۔ آدمی اپنے لیے روتا ہے' اپنوں کے لیے روتا ہے مگر کتے آدمی کے آنے والے غم کو محسوس کر کے روتے ہیں۔ کتے۔ آدمی کو مستقبل قریب میں آنے والی مصیبت کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتے ہیں مگر احسان فراموش آدمی کتوں کی بروقت پیشنگوئی اور خطرے سے آگاہی کو غلط رنگ دے کر کتوں کے رونے کو نحوست قرار دیتا ہے' ہمدرد و غمخوار رونے والے کتوں نے مار پیٹ سہہ کر بھی رونا اور پیشین گوئی کرنا نہیں چھوڑا۔ یہ عادت کتوں کے پختہ عزم کی نشاندہی کرتی ہے۔

عزم اور یکجہتی کی ایک اور مثال جس پر کتوں کو فخر ہے' وہ کتوں کی ایک ہی بولی اور لہجہ اور زبان ہے جبکہ تنگ نظر انسان ہر چند میل پر الگ الگ لہجہ اور زبان استعمال کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی کتوں سے سبق سیکھ کر آدمی آدمی کے قریب آسکتا ہے۔ ایک دوسرے کو سمجھ کر آپس میں دکھ درد کو بانٹ سکتا ہے' بشرطیکہ دنیا بھر کی ایک ہی زبان' بولی اور لہجہ ہو ۔۔۔ ویسے کتے اپنی بولی اور زبان کے پرچار میں انتہاپسند واقع ہوتے ہیں۔ یہ کتے دوسروں کو اپنی بولی سکھانے میں تشدد سے بھی گریز نہیں کرتے۔ جب یہ کسی آدمی کو کاٹتے ہیں تو وہ مرنے سے پہلے کتوں کی بولی میں بات کرتا ہے۔ یہاں بھی کتے اپنی اپنی دھن کے پکے نظر آتے ہیں۔

آدمی نے کتوں کی کئی صفات کو اپنایا ہے۔ کتے چوٹ کھا کر بُری طرح آوازیں نکالتے ہیں' اس صفت کو آدمی نے اپنایا اور تکلیف کے وقت زور زور سے کراہتا ہے۔

بھونکنے والے کتے کاٹتے نہیں ہیں مگر سیاست میں لیڈر بھونکتے بھی ہیں' کاٹتے بھی ہیں۔ یہاں ایک حد تک سیاست دانوں نے کتوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

باچھیں چیر کر' دانت نکال کر چیخ چیخ کر ایک دوسرے پر جھپٹنا' ایک دوسرے پر پل پڑنا کیا آدمی نے کتوں سے نہیں سیکھا۔ بھونکنا کتوں کی عادت بلکہ پیدائشی حق ہے۔ آدمی نے کتوں سے بھونکنا سیکھا۔ کیا جلسوں میں چیخ چیخ کر تقریر کرنا اجلاس میں خصوصاً بلند آواز کے ساتھ [illegible] کا بیجا چلانا؟ کتوں کے بھونکنے [illegible]

[illegible] پیچھا [illegible] ایشیائی [illegible] حکایت میں شیرزادہ [illegible]
[illegible] کے نقیب معلوم نہیں ہوتے! یہ تمام [illegible] اور [illegible]
کتوں سے ہی [illegible] پائی ہیں۔

دم ہلانا کتے کی عادت ہے۔ آدمی کی اگر دم ہوتی تو وہ اپنی غرض اور کام نکالنے کے لیے کتوں سے [illegible] دم ہلاتا۔ کتے [illegible] مالک کو ممنونیت اور رفیق ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ آدمی خوشامد کرتے ہیں قدم بوسی تک کرتے ہیں۔ یہ قدم بوسی کتوں کی صفت ہے۔ [illegible] ہے کہ آدمی کی قدم بوسی میں [illegible] ہوتی ہے اور کتوں کی قدم بوسی میں ان کی [illegible] احسان مندی ہوتی ہے۔ یہاں بھی کتوں نے آدمی کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ آج تک کسی کتے نے خودکشی نہیں کی جبکہ بعض بزدل آدمی مالی پریشانیوں [illegible] اور زمانے کے نشیب و فراز کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے بجائے خودکشی کر لیتے ہیں۔

کتے بہادری میں بھی آدمی کو بہت پیچھے چھوڑتے ہیں۔ کتے شکار کو بھگا بھگا کر شکار کرتے ہیں۔ [illegible] کی طرح ڈرپوک نہیں ہوتے۔ نہ ہی میدان پر کمین گاہ بناتے ہیں۔ کتے کا شکار کیا ہوا جانور آدمی [illegible]

آدمی جانور سے زیادہ ناجائز کام کرتا ہے۔ گھٹیا آدمی مخبری کرتے ہیں کم ظرف آدمی غداری کرتے ہیں [illegible] میں مخبری ہے اور کتے بہترین سراغرساں ثابت ہوتے ہیں۔ کتوں کی قوتِ شامہ کا جواب نہیں۔

فوج، پولیس اور کسٹم میں کتوں سے سراغرسانی کا کام لیا جاتا ہے۔ ان محکموں کی کارکردگی کتوں کی وجہ سے بہتر ہوتی ہے۔ محکمہ کسٹم اگر چاہے تو کتوں کی مدد سے دنیا کو ہیروئن کی لعنت سے چھٹکارا دلا سکتا ہے۔ کتے اپنی جان پر کھیل کر آدمی کا ہر طرح ساتھ دینا چاہتے ہیں مگر آدمی کتوں سے کماحقہ فائدہ اٹھانے کے لیے تیار نہیں یا آدمی کتوں کا مزید احسان نہیں لینا چاہتا۔

آدمی جب تمام جانوروں سے مایوس ہو جاتا ہے تو کتوں کی طرف آس لگائے آگے بڑھتا ہے۔ [illegible] جگہ..... برف کی گاڑیاں ہیں جن کو مختلف جانور کھینچتے ہیں۔ کتوں نے بغیر پہیوں کی گاڑی کو برف پر کھینچ کر جانوروں پر سبقت حاصل کی اور آدمی کو اس کی منزل تک پہنچا رہے ہیں اور برف کے [illegible] کا کام انجام دے رہے ہیں۔

کتے بہترین چوکیدار ہیں۔ ہزاروں سال سے آدمی نے کتوں کو چوکیداری [illegible] کتوں کے بجائے آدمی کو چوکیدار بنا دیا گیا ہے۔ [illegible] چوبیس گھنٹوں میں تین چوکیدار بدلے جاتے ہیں [illegible] اس اقدام کو کتوں کے حق [illegible] تصور کرتے ہیں۔

[illegible]

قریب المرگ بیمار آدمی جدید دواؤں اور آکسیجن ٹینٹ میں انتہائی نگہداشت کے کمرہ میں رکھا جاتا ہے اور مریض زندگی اور موت کی کشمکش میں کئی دن سکرات کے عذاب میں رہ کر مرتا ہے لیکن کتا جب [illegible] جاتا ہے تو آدمی اس کے گلے میں [illegible] دے دیتا ہے اور فوراً کتے کی زندگی چند لمحوں میں ختم کر دی جاتی ہے اور کتے کو سکرات کے عذاب سے فوراً چھٹکارا مل جاتا ہے۔ یہاں بھی کتا آدمی کے مقابلہ میں خوش نصیب ہے۔

کتے کے نصیب کا کیا کہنا، انسان سے پہلے خلا میں کتے نے سفر کیا۔ کتے کے نقشِ قدم پہ آدمی چل نکلا۔

فلسفیوں نے خاموش بیٹھ کر سوچنا بھی شاید کتوں ہی سے سیکھا ہے۔

دُنیا جوں جوں ترقی کر رہی ہے آدمی کے اطراف کتے ہی زیادہ نظر آنے لگے ہیں۔ آدمی میں کتوں کی صفات آتی جا رہی ہیں۔ آج آدمی پھر بھی احسان مندی، بے غرضی، فرض شناسی، رہبری، سراغ رسانی، چوکیداری، اطاعت، قناعت پسندی، سکینت، توکل، شب بیداری، ایک مالک کی غلامی، عاجزی و انکساری، صابری و شاکری اور وفاداری میں کتے سے بہت پیچھے ہے۔

کتا مالک کے حکم کا تابعدار ہوتا ہے۔ مالک کے سدھائے ہوئے اور بتائے ہوئے طریق پر چلتا ہے جبکہ احسان فراموش انسان اپنے مالک اور پیدا کرنے والے خالق کے حکم کی تعمیل نہیں کرتا اور نہ مالک کے بتلائے ہوئے راستہ پر چلتا ہے۔ آج کا آدمی کتوں سے بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ آج کے آدمی نے کتوں سے کچھ نہیں سیکھا۔

کتوں کا آدمی کے لیے یہی پیغام ہے۔

"تو اگر انسان نہیں بنتا نہ بن، کتا تو بن"

یوسف کوچیلا (دہلی)

لیکچر

پچھلے ہفتہ مجھے ایک لیکچر سننے کا اتفاق ہوا۔ یہ مقامی یونیورسٹی کے تھیٹر ہال میں تھا۔ یہ تھیٹر بہت خوبصورت ہے اس میں تقریباً سات سو کے قریب نشستیں ہیں۔ کرسیاں بہت آرام دہ ہیں۔ روشنی اور آواز کا انتظام بھی بہت اچھا ہے [illegible] سامعین اطمینان سے لیکچر سن سکتے ہیں۔ میں اپنی طالب علمی کے زمانہ میں بڑے شوق سے لیکچر سنتا تھا۔ لیکن کتنا فرق آ گیا ہے۔ تب لیکچر [illegible] اور ہال بھر جاتے تھے اور زیادہ تر لوگ کھڑے ہو کر سنتے تھے کیونکہ سننے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی تھی [illegible] نہیں ہو سکتے تھے۔

اس خوبصورت ہال میں میموریل لیکچر تھا۔ یہ میموریل لیکچر بھی خوب ہوتے ہیں۔ اس کا ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ "[illegible]" ایسے زندگی کے کسی نہ کسی شعبے میں نام پیدا کیا ہو۔ زیادہ تر ان سیاستدانوں کی یاد میں ہوتے ہیں۔ عوام [illegible] تحریک میں [illegible] ایسے میموریل لیکچر کے لئے اکٹھا ہوتے ہیں۔ ہال میں دو ڈھائی سو سے زیادہ لوگ نہیں ہوں گے [illegible] کرسیاں ہوتی ہیں۔ ایک پر صدر اس کی بغل میں میموریل لیکچر کا مقرر اور دوسری طرف [illegible] [illegible] اس پر کوئی معزز ہستی مشہور و معروف ہستی۔ جب تک یہ پانچ کرسیاں پُر نہ ہو جائیں لیکچر شروع نہیں [illegible] ہونے پر ماسٹر آف سیریمنی اٹھے گا۔ مائک کے سامنے آ کر [illegible] [illegible] مائک کو ایڈجسٹ کرے گا۔ اگر سامنے والے کا قد چھوٹا اور مائک [illegible] [illegible] بہت خوش [illegible] لیکچر کے اصولوں میں ایک ہے۔ بہر کیف ماسٹر آف سیریمنی۔ کرسیوں پر بیٹھے افراد کا [illegible] [illegible] کا تعارف اور اس مضمون کے متعلق واقفیت بہم پہنچائے گا۔ لگ بھگ پندرہ بیس منٹ وہ [illegible] [illegible] پہنچا ہے گا۔ لوگ بور ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ تب یہ بولنا بند کرے گا۔

[illegible] کی کوشش کرے گا کہ وہ چند لفظوں میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ [illegible] [illegible] بہت جوش سے بولتا ہے۔ [illegible] لیکچر شروع [illegible] [illegible] میموریل لیکچر [illegible] گیا ہے۔ اس کا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] گیا ہے۔

[illegible] گئے [illegible] بہت [illegible] ہو گئے ہیں۔ معاملہ بہت حد تک بدل چکے ہیں۔ [illegible]
[illegible] [illegible] کسی طرح [illegible] حاضرین کو [illegible]
[illegible] نہیں چلتا کہ [illegible] کے بولنا بند کر دینے کے سلسلے میں [illegible] کی تقریر کی
[illegible] ہیں۔

[illegible] ایک [illegible] کی بار [illegible] صدر صاحب [illegible] کی کہ وہ [illegible]
[illegible] صاحب صدر آ گئے۔ [illegible] اٹھے اور ایک [illegible] آنے کے [illegible]
[illegible] صاحب [illegible] حاضرین پر ایک نظر [illegible] لوگوں کو [illegible]
[illegible] اور [illegible] کہ وہ مقرر اور حاضرین کے بیچ میں نہیں آنا چاہتے اور اسی [illegible]
[illegible] مقرر سے [illegible] کرنے کی خواہش کرتا ہے۔ ہال [illegible]
[illegible] تقریر شروع کر [illegible] ہے۔

[illegible] صاحب جو مقرر [illegible] کے لئے یہ سب اہتمام کیا گیا۔ مائیک کے قریب آتا ہے۔ چشمہ صاف کرتے [illegible]
[illegible] طرف [illegible] پھر ان لوگوں کے نام جو [illegible]
[illegible] اسی وقت [illegible] ویڈیو کیمرہ والے۔ [illegible] اپنے اپنے [illegible]
[illegible] کہ آپ اس کو نہیں دیکھ سکتے۔

[illegible] اس حالت میں اسی وقت [illegible] پہنچتے پہنچتے تک [illegible] گھنٹہ گزر جاتا ہے۔ [illegible]
[illegible] سننے والوں کی تعداد [illegible] بھی کم رہ گئی ہے۔ [illegible]
[illegible] کہ اگر [illegible] سننے والا بھی نہ ہوا تو وہ خالی [illegible]
[illegible] تیار شدہ [illegible]
[illegible] کی [illegible] باقی رہے گی۔ [illegible]
[illegible] جا سکتا ہے [illegible] جا سکتا ہے [illegible]
[illegible] شروع کرتا ہے۔ [illegible] ختم ہو جاتا ہے کیونکہ [illegible]
[illegible] نہیں۔

[illegible] اگر آپ [illegible] جائیں تو مقرر [illegible] گھنٹہ [illegible]
[illegible] گھنٹہ [illegible]
[illegible] سکتے۔

[illegible] کا ایک [illegible]
اشاعت

ڈرامہ [illegible]

وضاحت

میں ایک نہایت قدیم اور عظیم ادبی شاہکار ہے کہ بجلی کی بارش اور [illegible] کا کوئی بھروسا نہیں [illegible]
یہاں [illegible] کا [illegible] نہ جانے کا بھروسا ہے۔ مروج محاورہ کس حد تک درست ہے یہ کہنا ہمارے [illegible]
[illegible] جب یہ محاورہ گھڑا گیا ہے تو [illegible]

بجلی کی بارش تو عالمی شہرت یافتہ ہے [illegible]
نہیں آتی اور کبھی آتی ہے تو اس وقت جب [illegible]
[illegible]
جلوہ افروز کرتی ہے تو بیچارے [illegible] اور دیگر مضافات تشنہ رہ جاتے ہیں۔ اور کبھی اس طرف نظرِ کرم کرتی ہے تو [illegible]
تپ رہا ہوتا ہے۔ اس کی انہیں منافقانہ اداؤں کی وجہ سے شہر کے [illegible] ریڈیو اور اخبار چار مہینوں تک [illegible]
قائم کرتے رہتے ہیں۔ کوئی دعویٰ نہیں کرتا۔ دعویٰ کرنا بھی تو کیسے جبکہ بارش کی پیشن گوئی پر [illegible]
[illegible] دنیا [illegible]
[illegible] بجلی کی بارش کا بھروسا نہ کبھی رہا ہے اور نہ [illegible]

مذکورہ بالا محاورہ کے [illegible] کی وضاحت [illegible]
[illegible] کے متعلق ہیں۔

[illegible]

[illegible] ہے۔ مغربی ماحول میں تو بہتر ہے کہ رنگوں کی [illegible] ہے۔ علاوہ ازیں مشینی زندگی computerised Life
کے چیلنجز نے ہمارے [illegible] "دل" والی بات ہی [illegible] ہے۔ اب اگر [illegible] ان تمام وجوہات کے باوجود بھی کوئی دل [illegible]
کو کسی بھی [illegible] ادائے عشق کا [illegible] کہیں گے تو وہ اس کی [illegible] کیا ہے۔

ہماری شادی خانہ آبادی سے قبل ہم ایک لڑکی سے دوستی رکھتے تھے۔ اس دوستی کے پس پردہ ہم دونوں ایک دوسرے
کو دل ہی دل میں [illegible] چاہتے تھے۔ [illegible] اور شوخ و شنگ لڑکی تہہ دل سے چاہتی تھی کہ وہ ہم سے کچھ اردو زبان سیکھ لے
اور ہم دل ہی دل [illegible] دوستی بنانا چاہتے تھے۔ دونوں ہی اپنے اپنے [illegible] پر ڈٹے رہتے [illegible]
[illegible] جب اس [illegible] نے مختلف اشعار کی [illegible]
[illegible] عشق کی [illegible] آپ کیا سوچنے لگے۔ جی جی ایسا کچھ خیال
آپ کے دل میں [illegible] ہم محض [illegible] کچھ حاصل کرنے کی غرض سے آپ کے پاس آتے ہیں۔ ہمارے سارے سپنے آپ نے
توڑ دیئے [illegible] جس نے ہم سے اردو سیکھ لی تھی [illegible] ہمارے چہرے [illegible] ہوگئے اور ہم پھر
پھر [illegible] کی تلاش میں بھٹکنے لگے۔

ہماری قسمت [illegible] کہ سال بھر کی تلاش بسیار کے بعد بھی ہمیں [illegible] نہ مل سکا کہ ہم خودکشی کے متعلق کچھ سوچتے
البتہ ایک اور لڑکی کی دوستی ضرور نصیب ہوگئی۔ اور ہمارے دل کے [illegible] کا سامان مہیا ہوگیا۔ لیکن چونکہ ہم دودھ کے
جلے [illegible] بھی پھونک پھونک کر [illegible] لگے۔ دوستی کی تو حدود متعین نہیں ہوتیں لہٰذا ... دوران گفتگو [illegible]
[illegible] سیاست سے لیکر موضوع عشق معاشقہ بھی زیر بحث آتا رہتا۔ لیکن صاحب کیا مجال جو ہم بھولے سے بھی اظہار عشق کے مرتکب
ہوئے ہوں [illegible] حرام کر لیا تھا۔ لیکن شومئ قسمت کہ شادی کا دعوت نامہ [illegible]
[illegible] اس پر [illegible] کہ شادی میں ضرور شریک ہوں
[illegible] ..... [illegible] شادی میں شریک نہ ہوا تو وہ [illegible] کر چرچ کی
[illegible] شادی سے انکار کر دے گی۔ ہم نے بڑی مشکل سے اپنے دل، جگر اور دماغ کے بکھرے ہوئے ریزوں کو جمع کیا اور اس
کے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس کی پیشانی پر بوسہ ثبت کیا اور ایک اچھے دوست کی طرح
[illegible] یہ دوسرا حادثہ تھا اس لئے [illegible] وفا کرنے میں زیادہ پریشانی نہ ہوئی۔

ان [illegible] مختلف حادثات کے بعد کچھ ہی عرصہ میں والدین نے ہماری شادی بڑی دھوم دھام سے کروا دی اور
[illegible] میں عافیت سمجھی۔ اس تقریب میں ہماری سابق سہیلیاں بھی اپنے [illegible] کے ساتھ
[illegible] شریک ہوئیں اور دلی مبارکباد پیش کی۔ [illegible]
[illegible] تمام [illegible] نظریات عشق کے بارے میں بتا دیا۔ جب [illegible]
[illegible] سے مسکرائیں اور کہا "[illegible] بھروسا نہیں"۔ [illegible] کہا "بیگم
[illegible] ..... !!" آپ کی [illegible] جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ [illegible]
[illegible] زندگی [illegible] بیگم صاحبہ [illegible]
[illegible] !!

منظوم

ساس کا اغوا

لے گئے ساس کو اک ڈاکو اٹھا
پر خوشی یہ بہت دیر ٹھہری نہیں
خط میں مرقوم تھا کہ سے بہو ساس کی
بھیج دے تو روپے ستتر ہزار
وقت پہ یہ رقم گر نہ پہنچے ہمیں
تم کو مہلت یہ دیتے ہیں ہم سات دن
ہاں اگر آٹھویں دن نہ پیسہ ملا
اب بہو کی پریشانیاں ختم جھٹ
خط بہو نے لکھا میرے ڈاکو شری
میں بھی کرنے پیسے کا اب انتظام
ہاں اگر ایک دو دن بھی ہو جائیں لیٹ
دوسرا خط لکھا اس نے ماں باپ کو
رات ڈاکو اٹھا لے گئے ساس کو
اور انھوں نے مجھے ایک دھمکی ہے دی
پھر تو ہو جائے گی ساس کی واپسی
مانگ ہے ان کی روپے ستتر ہزار
ان کو میں نے ہمیشہ چھپا کے رکھا
اس لیے والدِ محترم ذی وقار
آپ سے ایک ناچیز احسان ہے

ہو گئی خوش بہت جب بہو نے سنا
ایک خط مل گیا جو پڑا تھا وہیں
تشنگی بھر کی اگر چاہتی ہے خوشی
جس کی خاطر ہیں ہم سارے ہی بے قرار
ساس کو پھر حوالے کریں گے تمھیں
جاؤ پیسے اکٹھا کرو رات دن
پھر نہ کرنا کہیں کوئی شکوہ گلہ
جیسے منھ پہ لگائی کسی نے چپت
تمہری ساس کو کر نہ دینا بری
دیکھنا کہ بگڑنے نہ پائے یہ کام
تم نہ گھبرانا ڈاکو شری دی گریٹ
دے رہی ہوں منادی میں یہ آپ کو
جو کہ پکڑے ہوئے ہیں مری ساس کو
کہ اگر مانگ ان کی نہ پوری ہوئی
اور میں یہ کبھی بھی نہیں چاہتی
میرے بکسے میں ہیں صرف اکہتر ہزار
اپنے شوہر کی نظریں بچا کر رکھا
بھیج دیں کل بقایا رقم چھ ہزار
عمر بھر میں رہوں گی بڑی شان سے

پانچویں دن ہی پیسہ روانہ ہوا
ساس کا ختم آخر فسانہ ہوا

○ رضی لال بنارسی

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

جلد : ۲۴ شمارہ ۱۱

نومبر ۱۹۹۱ء

ایڈیٹر

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

سرورق : طالب خوندمیری

طباعت : دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد

طباعت سرورق : صام آفسیٹ پریس آفیسرس میس ملک پیٹ

فی پرچہ : ۶ روپے زر سالانہ ۶۰ روپے

عرب ممالک سے ۵۰ ریال دیگر ممالک سے : ۳۰۰ روپے سکہ ہند

شگوفہ : ۳۱ بیچلرز کوارٹرز

معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد فون 557716 مکان: 521064

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

سلیمان اریب مرحوم

مدیر ماہنامہ "صبا" کو

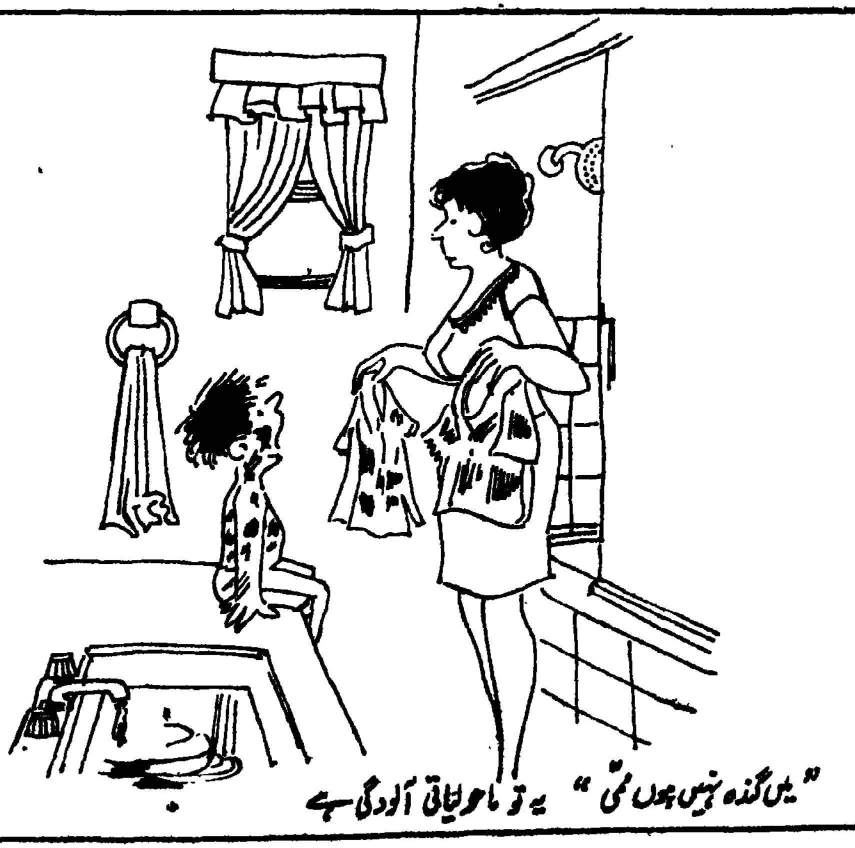
ادارہ "شگوفہ" کا خراجِ عقیدت

کُل ہند سمینار اور محفلِ شعر

۲۲ر ڈسمبر ۱۹۹۱

ملک کے نامور ادیب اور شاعر حصّہ لیں گے

• دیگر تفصیلات کا آئندہ شمارہ میں اعلان ہوگا



"میں گندہ نہیں ہوں ممّی" یہ تو ماحولیاتی آلودگی ہے

مشتاق احمد یوسفی

دسویں قسط

اسکول ماسٹر کا خواب

کتّا کیوں کاٹتا ہے

کافی دیر تک تو بشارت کو یقین نہیں آیا کہ یہ سب کچھ سچ ہو سکتا ہے۔ کراچی ہے کوئی رجواڑہ تو نہیں۔ اچھی خاصی ڈرامہ معلوم ہوتی تھی۔ لیکن جب رات کے نو بج گئے تو معاملہ سچ مچ گمبھیر نظر آنے لگا۔ اے ایس آئی نے کہا "آج رات اور کل کا دن اور رات آپ کو حوالات میں گزارنے پڑیں گے۔ کل اتوار پڑ گیا۔ پرسوں سے پہلے آپ کی ضمانت نہیں ہو سکتی" انہوں نے پوچھا "کس بات کی ضمانت؟" جواب ملا "یہ عدالت بتائے گی" انہیں فون بھی نہیں کرنے دیا۔ ادھر حوالات کی کوٹھری میں جس کے جنگلے سے پیشاب کی کھراند بھک بھک آ رہی تھی۔ خلیفہ وقفے وقفے سے ہتھکڑی والا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا اور ہی ہی ہی کر کے اس طرح روتا کہ ہنسی کا گمان ہوتا۔ بشارت کا غصہ اب ایک اپاہج اور گونگے کا غصہ تھا۔ اتنے میں تھانے کے منشی جی چٹائی کی جانماز پر عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر ان کے پاس آئے۔ سوکھ کر بالکل تنکا ہو گئے تھے۔ مگر عینک تلے آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ لہجے میں شفقت اور مٹھاس گھلی ہوئی۔ ایک بوتل لیمونیڈ کی اپنے ہاتھ سے گلاس میں انڈیل کر پلائی۔ اس کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی ڈبیا سے پان نکال کر کھلایا۔

منشی جی نے بڑے نرم اور پرخلوص لہجے میں کہا کہ ہمارے سرکار (ایس ایچ او) بڑے بھلے آدمی ہیں۔ شریفوں کے ساتھ شریف اور بدمعاشوں کے حق میں ہلاکو۔ یہ میری گارنٹی ہے کہ آپ کا چوری شدہ مال تین دن میں برآمد کرا دیا جائے گا۔ سرکار انتڑیوں میں سے کھینچ کر نکال لاتے ہیں۔ علاقے کے ہسٹری شیٹران کے نام سے تھرتھر کانپتے ہیں۔ وہ ریڈیو گرام، زیورات، وہ ساریاں جو اس کمرے میں آپ نے دیکھیں، ان کی بازیابی آج صبح ہی ہوئی ہے۔ معروضہ یہ ہے کہ حضور گاڑی میں جو لکڑی پڑی ہے۔ وہ سرکار کے پلاٹ پر ڈلوا دیجئے۔ آپ کی اسی مالیت کی مسروقہ لکڑی سرکار تین دن میں برآمد کروا دیں گے۔ گویا آپ کی گرہ سے تو کچھ نہیں گیا۔ میں نے ابھی ان سے ذکر نہیں کیا۔ ممکن ہے سن کر خفا ہو جائیں۔ بس یونہی آپ کا عندیہ لے رہا ہوں۔ سرکار کی صاحبزادی کا رشتہ خدا خدا کر کے طے ہوا ہے۔ بٹیا سال کی ہو گئی۔ بہت نیک اور سگھڑ ہے۔ آنکھ میں خفیف سی کجی ہے۔ لڑکے والے جہیز میں کار، فرنیچر، ریڈیو گرام اور

ویسٹ اوپن ٭ پلاٹ پر بنگلے بنے ہیں - قبرکی دروازے محلہ کہاری کے ہیں۔ بر چوک جائے تو یہی سب کچھ بھگتنا پڑتا ہے - ورنہ ہمارے سرکار اس قسم کے آدمی نہیں - آجکل بہت پریشان اور چڑچڑے ہو رہے ہیں - یہ تو سب دیکھتے ہیں کہ باؤلا کتا ہر ایک کو کاٹتا پھرتا ہے - یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ وہ اپنی مرضی سے باؤلا تھوڑا ہی ہوا ہے - آپ نے خود دو چار فقروں سے اندازہ کر لیا ہوگا کہ سرکار نے کیسی شگفتہ اور موزوں طبیعت پائی ہے - تین برس پہلے شعر کہتے تھے - شام کو تھانے میں شاعروں کا اژدھام ہوتا کہ بعض اوقات حوالات میں کرسیاں ڈلوانی پڑتی تھیں - ایک شام بلکہ رات کا ذکر ہے - گھمسان کا مشاعرہ ہو رہا تھا - سرکار ترنم سے تازہ غزل پڑھ رہے تھے - سارا عملہ داد دینے میں جٹا ہوا تھا - مقطع پر پہنچے تو سنتری راندوادخاں نے تھری ناٹ تھری رائفل چلا دی - حاضرین سمجھے شاید قبائلی طریقے سے داد دے رہا ہے - مگر جب واویلا مچا تو معلوم ہوا کہ دورانِ غزل جب مشاعرہ اپنے شباب پر پہونچا تو ڈکیتی کیس میں ماخوذ ایک ملزم جو حوالات کا جنگلا بجا بجا کے داد دے رہا تھا، بھاگ گیا - شاعروں نے اس کا تعاقب کیا - مگر اسے تو کیا پکڑ کے لاتے، خود بھی نہیں لوٹے - اللہ جانے پولیس کانسٹیبلان نے پکڑنے میں تساہلی برتی یا ملزم نے "پکڑائی" نہیں دی - مگر سرکار نے ہمت نہیں ہاری - راتوں رات اسی نام کے بستہ الف کے ایک چھٹے ہوئے بدمعاش کو پکڑ کے حوالات میں بند کر دیا - کاغذات میں مفرور ملزم کی ولدیت بدل دی - مگر اس کے بعد شعر نہیں کہا - تین برس سے سرکار کی ترقی اور شعر کی آمد بند ہے - عدم صاحب سے یاری ہے - پچھلے برس اپنے معصوم بچوں کے حلق پہ چھری پھیر کر حکام بالا کو ڈیڑھ لاکھ کی نذر گذرانی تو "لائن حاضری" سے چھٹکارا ملا اور اس تھانے میں تعیناتی ہوئی - اب سرکار کوئی ولی اللہ تو ہیں نہیں کہ سلام پھیر کر جانماز کو نا الٹ کر دیکھیں تو ڈیڑھ لاکھ کے نوٹ از غیب دھرے ملیں - دودھ تو آخر تھنوں ہی سے نکالنا پڑتا ہے - بھینس دستیاب نہ ہو تو کبھی کبھی چوہیا ہی کو پکڑ کے دوہنا پڑتا ہے -

بشارت کو نقصان مایہ سے زیادہ اس ذلت آمیز مثال پر غصہ آیا - بکری بھی کہہ دیتا تو غنیمت تھا گو کہ چھوٹی ہے ذات بکری کی! لیکن صورتحال کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی - انھوں نے کہا، میں اپنی رپٹ واپس لیتا ہوں - اے ایس آئی نے جواب دیا کہ دن دہاڑے سرقہ ناقابل راضی نامہ جرم ہے - یعنی قابل دست اندازی پولیس ہے - آپ رپٹ واپس لینے والے کون ہوتے ہیں؟ اگر آپ نے واپس لینے پر اصرار کیا تو جھوٹی رپٹ درج کرانے پر آپ کا یہیں آن دی اسپاٹ چالان کر دوں گا - عزت کے لالے پڑ جائیں گے - اگر آپ کا وکیل بہت لائق فائق ہوا تو تین مہینے کی ہوگی - ایس ایچ او صاحب پیر کو فیصلہ کریں گے کہ آپ کن کن دفعات کے تحت ماخوذ ہیں -

انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کا ہر فعل، ان کی ساری زندگی قابل دست اندازی ہی نہیں قابل دست اندازی پولیس رہی ہے اور یہ سراسر پولیس کی غفلت کا نتیجہ تھا کہ وہ اب تک عزت آبرو سے بسر کر رہے تھے -

انھوں نے طیش میں آکر دھمکی دی کہ مجھے حبس بیجا میں رکھا گیا ہے - یہ غیر قانونی حراست ہے - میں ہائیکورٹ میں Habeas Corpus Petition پیش کر دوں گا - اے ایس آئی بولا، آپ پٹیشن کیا پیش کریں گے - ہم خود آپ کو ہتھیلی پہ دھر کے عدالت میں پیش کر دیں گے - دھڑلے سے دس دن کا جسمانی ریمانڈ لیں گے - دیکھتے جائیے -

---

٭ ویسٹ اوپن کراچی میں جو نکہ شام کو ٹھنڈی ہوا سمندر یعنی مغرب کی سمت سے چلتی ہے - اسلئے مغرب رویہ مکانوں کو ترجیح دی جاتی ہے - قیمت بھی زیادہ ہوتی ہے -

آپ بیتی لکھنے کی خاطر جیل جانے والے

اے ایس آئی یہ دھمکی دے کر چلا گیا۔ چند منٹ بعد اس کا باس ایس ایچ او بھی اپنا ڈنڈا بغل میں دبائے ایم ٹھم عام کھانستا کھنکارتا اپنے گھر چلا گیا۔ عین اسی وقت مٹھائی والا وکیل نہ جانے کہاں سے دوبارہ آن ٹپکا۔ رات کے گیارہ بجے بھی اس نے کالا کوٹ اور سفید پتلون پہن رکھی تھی۔ وکیلوں کا مخصوص کلف دار سفید کالر بھی لگا ٹے تھا۔ کہنے لگا برادر اہر چند کہ میرا اس مقدمے سے کوئی تعلق نہیں۔ محض انسانی ہمدردی کی بناء پر کہہ رہا ہوں کہ آپ متعدد جرائم میں ملوث کئے جا سکتے ہیں۔ خدانخواستہ ابھی دفعہ ۱۶۴ ضابطہ فوجداری کے تحت آپ کے ڈرائیور کا اقبال جرم قسم بند ہو جائے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ آپ صورت سے بال بچے دار آدمی معلوم ہوتے ہیں آپ لیڈر تو ہیں نہیں جو سیاسی کیریر بنانے اور سوانح عمری لکھنے کے لالچ میں جیل جائیں۔ پارٹیشن سے پہلے کی بات اور تھی۔ لیڈر باغیانہ تقریر کر کے جیل جاتا تھا تو جناب والا! سارا ملک انتظار میں رہتا تھا کہ دو تین سال بعد چھوٹیں گے تو کوئی تفسیر کوئی آپ بیتی، کوئی تصنیف مکمل کر کے نکلیں گے بد قسمتی سے انگریزوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو جیل سے قبل از وقت رہا کر دیا تو تفسیر ادھوری رہ گئی۔ بہر حال وہ زمانے اور تھے آج کل والا حال نہیں تھا کہ تقریر کرنے سے پہلے ہی دھر لئے گئے اور چھوٹے تو جیل کے دروازے پر کوئی ہار پہنانے والا تک نہیں۔ نہ چراغ ”نے گلے والا مضمون“ بخدا میں یہ بحث نہیں کر رہا ہوں کہ آپ مجھے وکیل کر لیں، گو کہ میں آپ کو منع بھی نہیں کر سکتا۔ محض آپ کے بھلے کو کہہ رہا ہوں۔ مجھے پریکٹس کرتے پچیس سال ایک پیسہ ہولہ میں نے آج تک کوئی قانونی گتھی ایسی نہیں دیکھی جسے نانواں (روپیہ) نہ سلجھا سکے۔ سارے سم سم اسی سے کھلتے ہیں۔ آگے آپ کے اختیار ہے۔ البتہ اتنا فوڈ فار تھاٹ (Food forthought) شب گذاری کے لئے چھوڑے جاتا ہوں کہ اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجا چاہتے ہیں۔ آپ نے ان آٹھ گھنٹوں میں پولیس کا کیا بگاڑ لیا جو آئندہ آٹھ گھنٹوں میں بگاڑ لیں گے کل اتوار ہے۔ آپ اسی طرح حوالات میں اکڑوں بیٹھے اپنے کانسٹی ٹیوشنل رائیٹس اور ضابطہ فوجداری کے حوالے دیتے رہیں گے۔ حوالات زیادہ سے زیادہ یہی تو تیر مارے گی کہ آپ کو پیر کے دن رہا کر دے گی۔ سو ہم تو جناب والا پیر سے پہلے ہی آپ کو اس چو ہے دان کے باہر دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ زیر حراست ہیں۔ اچھا۔ بہت رات ہو گئی۔ شب بخیر! منشی جی کو میرے گھر کا فون نمبر معلوم ہے۔

وکیل کے جانے کے بعد ہیڈ کانسٹیبل ایک چٹائی، ایلومینیم کا لوٹا اور کھجور کا دستی پنکھا لے آیا اور خلیفہ والی حوالات کی طرف اشارہ کر کے بشارت سے کہنے لگا ”دن بھر بیٹھے بیٹھے آپ کی کمر تختہ ہو گئی ہوگی۔ اب آپ یہ بچھا کر وہاں لیٹ جائیے مجھے جنگلے میں تالا لگانا ہے۔ مچھر بے پناہ ہیں۔ یہ کمبل اوڑھ لیجئے گا یادہ گرمی لگے تو یہ پنکھا ہے۔ رات کو استنجا آئے تو یہ تسک دھیں .... بارہ بجے کے بعد حوالات کا تالا نہیں کھولا جا سکتا“ .... نے بتیاں بجھانی شروع کر دیں۔

مگر قارورہ کچھ اور کہتا ہے

بتیاں بجھنے لگیں تو خلیفہ زور زور سے ”سرکار! سرکار“ کر کے رونے لگا۔ حوالات کی دیواروں پر کھٹملوں کی قطاریں رینگنے لگیں۔ اور چہرے کے گرد خون کے پیاسے مچھروں کا ہالہ گردش کرنے لگا۔ .... مرحلہ پر منشی جی دفعتاً پھر

مخروطی پیڑے۔ اور ملباری ہوٹل سے منگوایا ہوا قیمہ جس میں پڑی ہوئی ہری مرچیں اور ہرے دھنیے کی الگ سے خوشبو آ رہی تھی اور تنور سے اتری نان بشارت کے سامنے رکھی۔ گرم نان سے اشتہا کو بائولا کر دینے والی وہ لپٹ آ رہی تھی جو ہزاروں سال قبل انسان کو آگ دریافت کرنے کے بعد گیہوں سے آئی ہو گی۔ اسے کھانے سے انکار کرنے کے لئے بشارت نے کچھ کہنا چاہا تو کہہ نہ سکے کہ بھوک سے برا حال تھا اور سارا منہ رال سے بھر گیا تھا۔ ہاتھ کے ایک جھٹکے سے اشارے سے انکار کیا اور ناک دوسری طرف پھیر کر بیٹھ گئے۔ اس پر منشی جی بولے، قسم خدا کی! میں بھی نہیں کھاؤں گا۔ اس کا عذاب آپ کی گردن پر۔ تین بجے ایک بن چائے میں ڈبو کے کھایا تھا۔ بس۔ ڈاکٹر آنتوں کی ٹی بی بتاتا ہے۔ مگر پیر الٰہی بخش کالونی والے حکیم شفاء الملک کہنے لگے کہ یہ بیماری زیادہ کھانے سے ہوتی ہے۔ لو اور سنو! میں نے کہا، حکیم صاحب! میرا جثہ جسامت تو دیکھئے۔ بولے، مگر قارورہ تو کچھ اور کہتا ہے۔

یکبارگی منشی جی نے بات کا رخ موڑا۔ بشارت کے گھٹنے چھو کر کہنے لگے، میں آپ کے پیروں کی خاک ہوں۔ پر دنیا دیکھی ہے۔ آپ عزت دار آدمی ہیں۔ مگر معاملے کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہے کہ قارورہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں آپ کے خسر کا محلے دار اور ادنیٰ نمک خوار رہ چکا ہوں۔ دیکھئے، عزت کا صدقہ مال ہوتا ہے۔ لکڑی دے دلا کے رفع دفع کیجئے۔ کل دو تین ہزار کی بات ہے۔ یہ تو دیکھئے آپ ہیں کہاں! پھر یہ غور فرمائیے کہ ساڑھے تین ہزار کی اس لکڑی کے عوض آپ کو ساڑھے تین ہزار کی دوسری لاٹ مل جائے گی۔ پھر جھگڑا کس بات کا؟ سرکار شیر کے منہ سے شکار ہی نہیں چھینتے، اس کے دانت بھی اکھاڑ لاتے ہیں۔ علاقے میں کہیں کوئی واردات ہو، سرکار کو گویا الہام ہو جاتا ہے کہ کس کا کام ہے۔ بعضے بعضے کو محض تھیلے پر ہی دھر لیتے ہیں جیسا کہ معاف کیجئے، حضور کے ساتھ ہوا۔ پچھلے سال ان ہی دنوں کی بات ہے۔ سرکار نے ایک شخص کو گالی گلوچ سے شارع عام پر رکاوٹ پیدا کرنے پر گرفتار کیا۔ بظاہر ذرا سی بات تھی۔ مگر قارورہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔ سب کو تعجب ہوا۔ مگر دو گھنٹے بعد سرکار نے اس کے گھر سے وہائٹ ہارس وہسکی کی تین سو بوتلیں، دو گھوڑا بوسکی کے تھان، مسروقہ زیورات، درجنوں ریڈیو گرام اور دنیا بھر کا چوری کا مال برآمد کر لیا۔ گھر میں ہر چیز چوری کی تھی۔ ایک چیز بھی ذاتی نہیں نکلی۔ سوائے والد کے جس نے کہا کہ میں اس ناخلف کو عاق کرتا ہوں۔ مگر ہمارے سرکار دل کے بہت اچھے ہیں۔ پچھلے سال اسی زمانے میں میری بیٹی کی شادی ہوئی۔ سارے اخراجات سرکار نے خود برداشت کئے۔ ان ہی کا ایک ریڈیو گرام بھی جہیز میں دیا۔ میں اس کی گارنٹی دیتا ہوں کہ مسروقہ لکڑی اور ٹرک کی رجسٹریشن بک آپ کو تین دن کے اندر اندر دکان پر ہی ڈیلیور ہو جائے گی۔ میری مان جائیے۔ ویسے بھی بیٹی کی شادی کے لئے رشوت لینے اور دینے کا شمار نیگ نیوتے میں کرنا چاہیے۔ آپ سمجھ رہے ہیں۔؟

روٹی میری کاٹھ دی، لاون میری بھکھ ★

اب پیاز کے سب چھلکے ایک ایک کر کے اتر چکے تھے۔ بس آنکھوں میں ہلکی ہلکی سوزش باقی رہ گئی تھی۔ خواری کا اصل سبب سمجھ میں آ جائے تو جھنجھلاہٹ جاتی رہتی ہے۔ پھر انسان کو چپ لگ جاتی ہے۔ منشی جی اب انھیں اپنا ہی آدمی لگنے لگے۔

"منشی جی! یہاں سبھی"

"حضور! سبھی"

"وکیل صاحب بھی! "

★ میری روٹی کاٹھ کی ہے اور بھوک میری لگاون۔ ۔ بابا فرید

"وکیل صاحب جی"

"منشی جی! پھر آپ ....؟"

"حضور! میرے سات بچے ہیں۔ بڑا بیٹا انٹر میں ہے۔ بیوی کو بھی ٹی بی بتائی ہے۔ دن میں دو تین دفعہ خون ڈالتی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے مری یا کوئٹہ کے سینی ٹوریم لے جاؤ۔ تنخواہ اس سال کی ترقی ملا کر اٹھائیس روپے پانچ آنے بنتی ہے★"

بشارت نے ٹرک میں لدی ہوئی لکڑی ایس ایچ او کو نذر کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ آدھی رات اِدھر، آدھی رات اُدھر، بارہ بجے خلیفہ کی ہتھکڑی کھلی تو وہ پی موری کے منبع و مخرج کے درمیان سجدے میں چلا گیا۔ شکرانے کے سجدے سے ابھی پوری طرح نہیں اٹھا تھا کہ ہاتھ پھیلا کر ہیڈ کانسٹیبل سے بیڑی مانگ کر پی۔ ادھر بشارت کو بھی کمرے سے باہر نکلنے کی اجازت ملی۔ منشی جی نے مبارکباد دی اور اپنی پیتل کی ڈبیا سے نکال کر دو بیڑہ پان۔ یہ کہہ کر پیش کی کہ یہ گلوریاں آپ کی بھابی نے صبح بطورِ خاص بنائی تھیں۔ ہیڈ کانسٹیبل نے بشارت کو علیحدہ لے جا کر مبارکباد دیتے ہوئے کہا "خوشی کا موقع ہے۔ منشی جی کو پچیس روپے دے دیجئے۔ غریب، عیالدار، ایماندار آدمی ہے اور جناب عالی اب ہم سب کا منہ میٹھا کرائیے۔ ایسے خوشی کے موقع بار بار تھوڑا ہی آتے ہیں۔ آپ بے شک گھر فون کر لیں۔ گھر والے پریشان ہوں گے کہ سرکار اب تک کیوں نہیں لوٹے۔ ایکسی ڈنٹ تو نہیں ہو گیا۔ ڈھنڈیا مچ رہی ہو گی۔ اسپتالوں کے کیژولٹی وارڈ میں ہر مردے کی چادر ہٹا ہٹا کے دیکھ رہے ہوں گے اور مایوس لوٹ رہے ہوں گے۔" بشارت نے سو روپے جیب سے نکال کر مٹھائی کے لئے دیئے۔ تھوڑی دیر بعد ایس ایچ او کے کمرے سے وہی وکیل صاحب مٹھائی کے ایسے ہی چار ڈبوں کا مینار گود میں اٹھائے اور تھوڑی کی ٹھونک سے اسے بیلنس کرتے ہوئے نمودار ہوئے۔ انھوں نے بھی بڑی گرم جوشی سے مبارکباد دی اور ان کی معاملہ فہمی اور سمجھداری کو سراہا۔ تین ڈبے عملے میں تقسیم کئے اور چوتھا بشارت کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ یہ ہماری طرف سے بھابی صاحب اور بچوں کو دے دیجئے گا۔ ڈبا حوالے کرنے کے بعد انہوں نے اپنا کلف دار کالر اتار دیا اور سیاہ کوٹ اتار کر ہاتھ پر لٹکا لیا۔

بھکاری کون؟

وکیل صاحب نے مشورہ دیا کہ لگے ہاتھوں لکڑی ایس ایچ او صاحب کے پلاٹ پر ڈالتے جائیے۔ نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ گاڑی میں ایک رائفل بردار کانسٹیبل خلیفہ کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ خلیفہ نے اس دفعہ "پدر سوختہ" کہہ کر ایک ہی گالی سے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ کوئی بہت پڑھا لکھا یا معزز آدمی پاس بیٹھا ہو تو وہ گاڑی فارسی میں گالی دیتا تھا۔ گالی دیتے وقت اس کے چہرے پر ایسا ایکسپریشن آتا کہ گالی کا مفہوم معقود ہو کر سامنے آ جاتا۔ تھانے والوں نے ایک گیس کی لالٹین ساتھ کر دی تاکہ اندھیرے میں پلاٹ پر مال اترانے میں آسانی رہے۔ گاڑی کے پچھلے حصے میں لکڑی کے تختوں پر لالٹین ہاتھ میں لئے بشارت بیٹھ گئے۔ جھٹکوں سے مینٹل جھڑ جانے کے ڈر سے انہوں نے لالٹین ہاتھ میں ادھر اٹھا رکھی تھی۔ خلیفہ ایسا بن رہا تھا جیسے گاڑی ہمیشہ اتنی ہی آہستہ چلاتا ہے۔ کانسٹیبل نے جھنجھلاتے ہوئے اسے دو دفعہ ڈانٹا "سالے ٹرک چلا رہا ہے یا اپنی زوجہ کے جنازے کا جلوس نکال رہا ہے؟" بشارت

★ کانسٹیبل کی تنخواہ اس زمانے میں سترہ روپے ہوتی تھی اور ASI کی ستر روپے جو بنک کے چپراسی کی تنخواہ کے برابر تھی

کی آنکھیں نیند سے بند ہو چلی تھیں، مگر کراچی کی سڑکیں جاگ رہی تھیں۔ سینما کا آخری شو ابھی ختم ہوا ہی تھا۔ کاروں کے شیشوں پر اوس کے قطرے بہہ رہے تھے اور ان کی قمیض بھیگ چلی تھی۔ پیلس سینما کے پاس بجلی کے کھمبے کے نیچے ایک جوان نیم برہنہ پاگل عورت اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ بچے کی آنکھیں دُکھنے آئی ہوئی تھیں اور سوجن اور چیپڑوں سے بالکل بند ہو چکی تھیں۔ ننگی چھاتیوں پر بچے نے دودھ ڈال دیا تھا جس پر مکھیوں نے چھاؤنی چھا رکھی تھی۔ ہر گذرنے والا ان حصوں کو جو مکھیوں سے بچ رہے تھے۔ نہ صرف غور سے دیکھتا بلکہ مُڑ مُڑ کے ایسی نظروں سے گھورتا چلا جاتا کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ دراصل بھکاری کون ہے۔

ذرا دور ایک سات آٹھ سال کا لڑکا ابھی تک موتیا کے گجرے بیچ رہا تھا۔ انھوں نے ترس کھا کر ایک گجرا خرید لیا۔ اور کانسٹیبل کو دے دیا۔ اس نے رائفل کی نال پر لپیٹ لیا۔ بشارت سر جھکائے خیالات میں گم، بندر روڈ، عیدگاہ، صدر اور نرسری ہوتے ہوئے پی ای سی ایچ ایس پہنچے تو ایک کا عمل ہو گا۔ انھوں نے لالٹین گاڑی کے بونٹ پر رکھ دی اور اس کی روشنی میں وہ لکڑی جو چوروں سے بچ گئی تھی، اپنے ہاتھوں سے تھانے دار کے پلاٹ پر ڈال آئے۔

ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر؟

طوطے کی پیش گوئی

ڈھائی بجے رات جب وہ گھر پہنچے تو وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اس آٹو میٹک چھکڑے کو اونے پونے ٹھکانے لگا دیں گے۔ گھر، گھوڑے، گھر والی، سواری اور انگوٹھی کے پتھر کے معاملے میں وہ سعد اور نحس کے قائل تھے۔ انھیں یاد آیا کہ ۱۹۵۳ء میں موٹر سیکل رکشا کے حادثے میں زخمی ہونے کے بعد جب وہ بندر روڈ پر میونسپل کارپوریشن کے سامنے بیٹھنے والے ایک نجومی کے پاس گئے تو اس نے اپنے سدھائے ہوئے طوطے سے ایک لفافہ نکلوا کر پیش گوئی کی تھی کہ تمہاری قسمت میں ایک بیوی اور تین حج ہیں۔ تعداد کی ترتیب اس کے برعکس ہوتی تو کیا اچھا ہوتا، انھوں نے دل میں کہا۔ ویسے بھی ہر زندگی بھر اس بے ثواب لوٹنے کے معاملہ میں وہ لالچی بالکل نہیں تھے۔ نجومی نے زائچہ بنا کر اور ہاتھ کی لکیریں محدب شیشے سے دیکھ کر کہا کہ دو تین اور چار پہیوں والی گاڑیاں تمہارے لئے نحس ثابت ہوں گی۔ یہ بات وہ زائچے اور محدب شیشے کے بغیر صرف ان کے ہاتھ اور گردن پر بندھی ہوئی پٹیاں دیکھ کر بھی کہہ سکتا تھا۔ بہر حال اب وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک ایک یا پانچ پہیوں کی گاڑی ایجاد نہ ہو۔ انھیں ٹانگوں پر ہی گذارہ کرنا پڑے گا، ایسا لگتا تھا کہ اس گاڑی کو خریدنے کا اصل مقصد لکڑی کو چوروں اور ایس ایچ او تک بحفاظت تمام پہنچانا تھا جو بحمد اللہ بغیر کسی تاخیر اور رکاوٹ کے تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

۷

بنگال ٹائیگر گیا، ببر شیر آگیا

جب انھوں نے خلیفہ کو مطلع کیا کہ اب وہ اس کی خدمات سے استفادہ کرنے کے لائق نہیں رہے تو وہ بہت رویا گایا۔ پہلے تو کہا، میں گاڑی کو اکیلا چھوڑ کر کیسے جاؤں؟ پھر کہنے لگا، کہاں جاؤں؟ بعد ازاں اس نے آقا اور ملازم کے اٹوٹ رشتے اور نمک کھانے کے دور رس نتائج پر تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہے اور جو بھاری نقصان ان کو پہنچا ہے، اس کی تلافی وہ اس طرح کرنا چاہے گا کہ سال بھر میں ان کی حجامت کی جو اجرت

بنتی ہے، اس میں سے وہ لکڑی کی رقم مجرا کر لیں۔ اس پر وہ چیخنے کہ خلیفے! تو سمجھتا ہے کہ میں ساڑھے تین ہزار سالانہ کی حجامت بنواتا ہوں؟ خلیفہ نے دوبارہ اپنی غلطی کا خندہ پیشانی سے اعتراف کیا اور ساتھ ہی گاڑی کو گشتی ہیر کٹنگ سیلون بنانے کی پُر حماقت تجویز پیش کی جو آتے ہی حقارت سے رد کر دی گئی۔ زچ ہو کر اس نے یہاں تک کہا کہ وہ تمام عمر —— یعنی گاڑی کی یا اس کی اپنی عمر طبعی تک جو پہلے دغا دے جائے —— بالکل مفت ڈرائیوری کرنے کے لئے تیار ہے۔ گویا جو نقصان پہلے تنخواہ لیکر پہنچاتا تھا وہ اب بلا تنخواہ پہنچائے گا۔ غرض کہ خلیفہ دیر تک اسی قسم کی تجویزوں سے ان کے زخموں پر پھٹکری چھڑکتا رہا۔

وہ کسی طرح نہ ملنے تو خلیفہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ مگر استرا اٹھا لیا۔ مطلب یہ کہ آخری خواہش ظاہر کی کہ اس قطع تعلق کے باوجود، اسے کم از کم حجامت کرنے کے لئے آنے کی تو اجازت دی جائے۔ جو بشارت نے صرف اس شرط پر دی کہ اگر میں آئندہ کوئی سواری —— کسی بھی قسم کی سواری —— رکھوں تو حرام جو تم نہیں چلاؤ گے۔

کچھ دن بعد خلیفہ یہ خبر دینے آیا کہ صاحب جی! یوں ہی میرے دل میں اُچنگ ہوئی کہ ذرا تھانیدار صاحب بہادر کے پلاٹ کی طرف ہوتا چلوں۔ میں تو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اپنی رشوت میں دی ہوئی لکڑی کے پاس اپنی چوری شدہ لکڑی پڑی ہے پہلو بہ پہلو ہمارا مال ایک شیر دوسرے شیر کے منہ میں سے نکال کر ڈکار گیا۔ ہمیں کیا فرق پڑتا ہے کہ دھاری دار شیر (Bengal tiger) چلا گیا اور ببر شیر آ گیا۔ میرا اعتبار نہیں تو خود جا کے ملاحظہ کر لیجئے۔

خلیفہ ہنسنے لگا۔ اسے اپنی ہی بات پر بے محل، بے اختیار اور مسلسل ہنسنے کی بری عادت تھی۔ سانس ٹوٹ جاتا تو ذرا دم لیکر پھر سے ہنسنا شروع کر دیتا۔ وہ ہنسی الاپتا تھا۔ دم لینے کے وقفے میں آنکھ مارتا جاتا۔ سامنے کا ایک دانت ٹوٹا ہوا تھا۔ اس وقت وہ اپنی ہنسی کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا اور بالکل کلاؤن معلوم ہو رہا تھا۔

ٹرک ہذا بکاؤ ہے

گاڑی ایک مہینے تک بیکار کھڑی رہی۔ کسی نے جھوٹوں بھی دام نہ لگائے۔ تضحیک و توہین کے پہلو سے بچنے کی خاطر ہم نے اسے گاڑی کہا ہے۔ بشارت بے حد حساس ہو گئے تھے کوئی اسے کار کہتا تو انھیں خیال ہوتا کہ طنز کر رہا ہے اور ٹرک کہتا تو اس میں توہین کا پہلو نظر آتا۔ وہ خود Vehicle کہنے لگے تھے۔ وہ مایوس ہو چلے تھے کہ دفعتاً ایک ایک دن کے وقفے سے اکٹھی تین "آفرز" آ گئیں پڑوسی سمنٹ ڈپو کے مالک نے اس ترپال کے جو کبھی گاڑی پر چڑھا رہتا تھا، تیرہ روپے لگائے جبکہ ایک گدھا گاڑی والے نے بارہ روپے کے عوض چاروں پہیے نکال کر لے جانے کی آفر دی، انھوں نے اس جاہل کو بری طرح لتاڑا کہ یہ بھی ایک ہی رہی۔ تیرا خیال ہے کہ یہ گاڑی پہیوں کے بغیر چل سکتی ہے۔ اس نے جواب دیا۔ سائیں! یہ پہیوں کے ہوتے ہوئے کونسی چل رہی ہے! رقم کے لحاظ سے تیسری آفر سب سے اچھی تھی۔ یہ ایک ایسے شخص نے دی جو حلیے سے اسمگلر لگتا تھا۔ اس نے گاڑی کی نمبر پلیٹ کے دو سو لگائے۔

اللہ اہانت آمیز آفرز کے بعد بشارت نے گاڑی پر ترپال چڑھا دیا اور توبہ کی کہ آئندہ کبھی کار نہیں خریدیں گے۔ آگے چلکر مالی حالت اور طبیعت کی چونچالی بحال ہوئی تو اس توبہ میں اتنی سی ترمیم کر لی کہ آئندہ کسی آنجہانی گورے کی گاڑی نہیں خریدیں گے خواہ اس کی بیوہ میم کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو۔ مرزا نے مشورہ دیا کہ اگر تمہاری کسی سے دشمنی

ہے تو گاڑی اسے تحفتاً دیدو۔" بشارت کہا، "نذر ہے"۔ چند روز بعد انھوں نے ترپال اتار دیا اور ایک گتے پر "برائے فروخت" نہایت خوشخط لکھوا کر گاڑی پر ٹانک دیا۔ دو تین دن میں گاڑی اور گتے پر گرد اور آرا مشین سے اڑتے ہوئے برادے کی دبیز تہیں چڑھ گئیں۔ مولانا کرامت حسین جو اب خرم کے مینجر کہلاتے تھے ونڈ اسکرین کی گرد پر انگلی سے "خوش آمدید" اور ٹرک پر "بڑا بکاؤ ہے" لکھ دیا جو دور سے نظر آتا تھا۔ روزانہ ظہر کے وضو کے بعد حروف پر گیلی انگلی پھیر کر انھیں روشن کر دیتے۔ نماز با جماعت کے بعد مسجد سے اتر کر گاڑی کا دم کرتے۔ فرماتے تھے ایسا جلالی وظیفہ پڑھ رہا ہوں کہ جس چیز پر بھی پھونک مار دی جائے وہ یا تو چالیس دن کے اندر اندر بک جائے گی۔ ورنہ وظیفہ پڑھنے والا خود اندھا ہو جائے گا۔ دن میں تین چار دفعہ اپنی آنکھوں کے سامنے ہاتھ کی کبھی کبھی تین یا چار انگلیاں دائیں بائیں گھماتے رہتے یہ تحقیق کرنے کے لئے کہ بینائی جاتی تو نہیں رہی۔ وظیفے کے بعد مسجد سے دکان تک راستے بھر جلالی پھونک کو اپنے منہ میں بڑی احتیاط سے بھرے رکھتے کہ "لیک" ہو کر غلطی سے کسی اور چیز پر نہ پڑ جائے۔ ●●

طالب خوندمیری

کلرک کی مناجات

مرے مولا مجھے افسر بنادے

مری قسمت کو تھوڑی سی چلادے
کلرکی سے مرا پیچھا چھڑادے
مجھے پی۔ اے کی کرسی سے اُٹھا کر
کسی ایم۔ ڈی کی کرسی پر بٹھادے
بہر صورت مرا رُتبہ بڑھادے
مرے مولا مجھے افسر بنادے

مجھے اب تک غریبی نے سنبھالا
سلائی کرکے میری ماں نے پالا
سفارش کو مری کوئی نہیں ہے
کسی نیتا کا چمچہ ہوں، نہ سالا
ذرا تو ہی مجھے دھکا لگادے
مرے مولا مجھے افسر بنادے

یہ محنت اب نہ ہوگی اور مجھ سے
یہ کرسی چھین لے فی الفور مجھ سے
کسی صورت بھی اب ممکن نہیں ہے
خود اپنے آپ پر یہ جَور مجھ سے
یہ پربت فائلوں کا کون لادے؟
مرے مولا مجھے افسر بنادے

جواری ہوں نہ میں دارو کا عادی
پہنتا ہوں جوانی میں بھی کھادی
پھر اس پہ طرفہ، میری بے وقوفی
رچالی مفلسی میں اپنی شادی
خسر سے ہی کم از کم کچھ دلادے
مرے مولا مجھے افسر بنادے

مری تنخواہ میں دَم بھی نہیں ہے
یہاں اوپر کی اِنکم بھی نہیں ہے
اِدھر رہتی ہے میری جیب خالی
اُدھر کم خرچ بیگم بھی نہیں ہے
بخیلی ہی ذرا اُس کو سکھا دے
مرے مولا مجھے افسر بنا دے

ملائی ہو اگر "پے" سے بھی دُونی
نہیں رہتی کسی کی جیب سُونی
اگر سوغات ملتی ہو خوشی سے
اُسے رشوت سمجھنا بدشگونی
یہ نکتہ میرے بھیجے میں بٹھا دے
مرے مولا مجھے افسر بنا دے

لگا ہے تندرستی کو پپیتا
نہ ہوتا حوصلہ تو میں نہ جیتا
گھرا رہتا ہوں جب تک فائلوں میں
مرا خوں چوستا ہے سُرخ فیتہ
مجھے اس جونک کے مُنہ سے بچا دے
مرے مولا مجھے افسر بنا دے

مرے اوصافِ طاعت گُل رہے ہیں
یہی گُن، فدویانہ، کل رہے ہیں
مرے اندر بھی شاید کچھ دنوں سے
جراثیمِ رعونت پَل رہے ہیں
انھیں کچھ اور بھی "نشوونما" دے
مرے مولا مجھے افسر بنا دے

وہ کرسی جس پہ افسر بیٹھتا ہے
مقدّر کا سکندر بیٹھتا ہے
اگرچہ کچھ نہیں کرتا ہے، پھر بھی
بہت مصروف بن کر بیٹھتا ہے
اداکاری یہی مجھ کو سکھا دے
مرے مولا مجھے افسر بنا دے

ڈپٹنا، ڈانٹنا، تنبیہہ کرنا
ہر اک الزام ماتحتوں پہ دھرنا
بلا موقع تو میں بھی سیکھ لوں گا
قلم سے مصلحت کی گھاس چرنا
ریاکاری مرے اندر جگا دے
مرے مولا مجھے افسر بنا دے

کہاں تک مفلسی کا بوجھ ڈھوؤں
میں کب تک کھا کے آدھا پیٹ سوؤں
یہاں، تو بھی تو کچھ سُنتا نہیں ہے
بتا اب کس کے در پہ جا کے روؤں!
یہ سب سہنے کا مجھ کو حوصلہ دے
مرے مولا مجھے افسر بنا دے

دُعا میں کم سے کم اِتنا اثر دے
مری جھولی قناعت ہی سے بھر دے
اگر ممکن نہیں میری ترقی!
اِسی اِنکم میں جینے کا ہُنر دے
کفایت کا کوئی رستہ دکھا دے
کلرکی ہی سہی کچھ آسرا دے

وجاہت علی سندیلوی

ہم اور ہمارا جوتا

بہت دن ہوئے، شاید طالب علمی کا زمانہ تھا، جب ہم نے کسی فلم میں دیکھا کہ دو حسین ٹانگیں بہت ہی صاف شفاف اور استرے کی دھار جیسی کریز والی پتلون اور بہت ہی خوب صاف اور چمکدار جوتے پہنے ایک طویل زینے سے اترتی چلی آرہی ہیں۔ ہر قدم سے خود پسندی تمکنت اور انانیت پھوٹی پڑتی۔ ہم اس منظر سے بہت متاثر ہوئے تھے۔

اور ہمیں پہلی بار اس نفسیاتی نکتے کا شدت سے احساس ہوا کہ محض چال یعنی پیر اٹھانے اور رکھنے کا انداز انسان کی شخصیت کا کتنا بڑا غماز ہو سکتا ہے۔ ایکٹر کے جسم کا اوپری حصہ اور چہرہ بعد میں دکھایا گیا۔ اور اس سے ہمارے خیال کی مزید تصدیق ہو گئی تھی۔ اس تجربے اور تجزیے نے ہمارے ذہن میں یہ ایک مستقل تمنا بیدار کر دی کہ کبھی ہم بھی ایک بہت خوبصورت جوتا جو ظاہر ہے کہ بہت قیمتی بھی ہوگا، ضرور خریدیں گے۔ جوتا ہاتھ آجائے گا تو ہم اپنی چال ڈھال خود بخود حسب منشا بنا لیں گے۔ ع

خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے

لیکن مدت ہو گئی یعنی ہم طالب علم سے بے روزگار اور پھر ایک کلرک ہو گئے، صاحب زادے سے ایک شوہر اور دو بچوں کے باپ بن گئے۔ لیکن ہم من پسند جوتا نہیں خرید پائے۔ اس انتظار میں نہیں معلوم کتنی دوسری تمنائیں جائز اور ناجائز ہمارے سینے میں شعلہ بن کر بھڑکیں۔ اور جھوٹ کیوں بولیں، کچھ پوری بھی ہوئیں لیکن زیادہ تر جل بھن کر، بیشتر آزاد امیدواروں کی ضمانتوں کی طرح اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئیں اور وقت کی بھٹی انہیں کھا گئی۔ البتہ اپنا ایک من پسند جوتا خریدنے کی بے غیرت تمنا ہمارے دل کے خاکستر میں کسی دبی چنگاری کی طرح سلگتی ہی رہی۔ ؎

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ پاپوش سو ہے۔

ہمارے افسر بالا یعنی 'باس' اگر ہم پر مہربان نہیں تھے تو نامہربان بھی نہیں کہے جا سکتے۔ یونیورسٹی میں وہ ہمارے ہم جماعت تھے۔ ہم نے بی۔اے فرسٹ ڈویژن میں اور انھوں نے تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا تھا، لیکن وہ کمپنی کے مالک کے بھانجے تھے اور ہم بذریعہ اشتہار بلائے ہوئے کمپنی کے مالک محض ایک نمک خوار۔ ہم اپنی حیثیت اچھی طرح جانتے اور پہچانتے اور اسی وجہ سے ہم ان کی انگریزی کے لفظوں کے غلط ہجوں اور جملوں کی غلط گرامر پر ہنسنا تو درکنار مسکراتے تک نہیں تھے۔

نصرت منزل، سندیلہ، یوپی

اور جب بات ضبط سے باہر ہو جاتی تو جھوٹی کھانسی کے بہانے اپنے منہ میں رومال ٹھونس لیتے۔ ہمارے باس کیدار ناتھ گپتا کو اپنی ان لسانی قلابازیوں اور حماقتوں کا شاید کچھ احساس بھی تھا۔ کیوں کہ وہ اکثر حروف کی شکلیں مشکوک بناتے۔ (یعنی چاہے یہ پڑھو چاہے وہ) اور جملوں میں الفاظ چھوڑ جاتے (یعنی جو صحیح ہو وہی سمجھ لو) بہر کیف ہم تو ان "غلطی ہائے مضامین" پر کچھ بولتے نہیں البتہ ٹائپسٹ لڑکیاں مس جینی اور مسز آکلے ان کا خوب مذاق اڑاتیں۔ حتیٰ کہ ایک روز ہم نے مسز آکلے کو یہاں تک کہتے سنا کہ اگر ٹیسٹ لیا جائے تو ہمارے باس کا مشن اسکول کے چوتھے درجے میں بھی داخلہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن چوہوں کی چرب زبانی سے بلی کی صحت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ کیدار ناتھ جانتے کہ اصل چیز کرسی ہے نہ کہ زبان دانی۔ افسر کی کرسی پر بیٹھ کر اُن کے منہ یا قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ ع:- مستند ہے میرا فرمایا ہوا، کی تعریف میں آئے گا۔ خود ہم بھی سمجھتے کہ ہم لاکھ صحیح زبان لکھیں اس کا کوئی مفہوم نہیں اور ہمارا باس جو بھی اُوٹ پٹانگ گھسیٹ دے اس سے بہت سے کاموں کی نوعیتیں اور سمتیں بدل سکتی ہیں۔
اس کی ہر بات : ع: پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے۔

کیدار ناتھ جس پلاسٹک کی کمپنی میں حصے دار اور جنرل منیجر تھے اس کا دائرہ عمل کافی وسیع تھا۔ اس کا ایک کام تو پلاسٹک کا سامان بنانا تھا اور دوسرا کام اس کو تھوک میں فروخت کرنا تھا۔ ہمارا تعلق دوسرے حصے سے تھا۔ ہمارے ساتھ قریب پچاس کلرک، ٹائپسٹ اور چپراسی وغیرہ کام کرتے اور ہم اُن کے نام نہاد سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ہماری صلاحیتوں، عہدے اور اُن کے ہم جماعت رہنے کے شرف کی بنا پر ہمارے باس ہماری پیٹھ پر کئی طریقوں سے گُڑ ملتے۔ دفتر میں جو بھی کام انھیں مشکل یا پیچیدہ نظر آتا اس کو وہ فوراً آنکھ بند کر کے ہمارے سر تھوپ دیتے۔ ہمارا اگر کوئی برائے نام ماتحت غلطی کرتا تو اس کی براہِ راست باز پرس صرف ہمیں سے کرتے اور کبھی کبھی ہم پہ یہ بھی نوازش کر دیا کرتے کہ ہمیں دفتر کے اوقات کے علاوہ اپنے گھر پہ بلا لیتے اور اپنا کوئی نجی کام ہمارے سپرد کر دیتے۔ مثلاً ٹرینوں میں ریزرویشن، بیٹو کی برتھ ڈے پارٹی کا انتظام، پپی کے پاس ہونے پہ ٹیچروں کو مٹھائی کے ڈبوں کی پیش کش۔ بیٹو اور پپی (لڑکے اور لڑکی) کے لیے پرائیویٹ ٹیوٹر کی تلاش، مسز کیدار ناتھ اور ان کی سہیلیوں کے لیے سرکس کے ٹکٹوں کی خریداری وغیرہ وغیرہ۔ اکثر جی جل جاتا اور سوچتے کہ ایسی ملازمت کو جس میں کوئی عزت نہ ہو، ٹھوکر مار دیں اور گاؤں واپس جا کر ان دو بیگھے کھیتوں کو جوتیں جو والد مرحوم چھوڑ گئے ہیں، لیکن پھر اپنے مرشد مولوی عبدالقدوس صاحب کی وہ نصیحت یاد آ جاتی جو انھوں نے ہماری بے روزگاری کے زمانے میں ہم کو کی تھی: "اصول وصول سب خرافات! نوکری کرنا ہے تو گدھے کو شیر کہو اور اس کو دانہ گھاس پہنچانے میں کوئی کوتاہی مت کرو۔ شہر میں بڑے بڑے مکانوں کے جتنے کھنڈر دیکھ رہے ہو۔ یہ سب اصولوں کے مقبرے ہیں۔ ان میں رہنے والے بڑے بڑے لوگ چھوٹے چھوٹے یا اپنی مرضی کے خلاف کام کرنا اپنے لیے عار سمجھتے۔ انھوں نے کل جو اپنی عزتِ نفس بچائی تھی، وہ آج اُن کے گھر، گرہستی اینٹ اور مٹی کے ڈھیروں کے ساتھ سرِ بازار کوڑیوں میں نیلام ہو رہی ہے اور جب ہم نے یہ کہا کہ اُس وقت تو اُن لوگوں نے اپنی آن پر حرف نہ آنے دیا تھا۔ دُنیا کے سامنے نہ سہی خود اپنے سامنے تو وہ شرمندہ نہیں ہوتے تھے تو ہمارے مرشد نے ہمیں غصے سے گھورا۔ اور ہماری بات کو جواب کے لائق بھی نہیں سمجھا۔

کیدار ناتھ ایک روز اپنے کسی کام سے ہمیں بازار لے گئے۔ ہم بازار جاتے تو خواہ مخواہ ہر جوتے کی دکان میں ضرور گھستے۔ ہمارے دل میں کوئی ایسی تلاش چھپی بیٹھی تھی کہ جس کا ہمیں شعوری طور پر کوئی احساس ہی نہ تھا۔ ہم سیدھے چلتے چلتے سامنے نظر پڑنے والی ایک شان دار جوتے کی دکان میں داخل ہو گئے۔ "یہاں کہاں؟" کہتے ہوئے غالباً ہمیں روکنے کے لیے کیدار ناتھ ہمارے پیچھے پیچھے تھے۔ یہاں ہم پہ ایک طرح سے بجلی گری۔ دکان میں ایک مخصوص اسٹول پر پلاسٹک کے

کے خوب صورت شوکیس میں ہمارے خوابوں کا جوتا، براؤن ڈوری دار نوکیلے ہوئے نقش و نگار سے مزین، آئینے کی طرح چمک دار رکھا ہوا تھا۔ ہم اپنے مقناطیس کی طرف کسی لوہے کے ٹکڑے کی طرح کھنچے چلے گئے اور ہم نے کیدار ناتھ سے بڑی بے اختیاری سے کہا "آپ اسے خرید لیجیے۔" انھوں نے پہلے تو کہا "بہت جوتے پڑے ہیں!" لیکن جب انھوں نے اس پہ پانچ پانچ پانچ روپیوں والا قیمت کا لیبل دیکھا تو وہ پھسل گئے۔ وہ چیز کو نہیں، اس کی قیمت کو حیثیت کی علامت سمجھتے۔ اُن کے سوچنے کا غالباً انداز یہ تھا کہ وہ جب یہ جوتا پہن کر کسی پارٹی میں جائیں گے تو اُن کے مدِمقابل لوگ رشک و حسد سے دیکھیں گے اور وہ ایسا خداداد موقع کسی قیمت پر بھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے۔ جوتے کو پہن کر دیکھا گیا، دو تین قدم چلا گیا اور خرید لیا گیا۔ ہماری طمانیت کے لیے یہی کافی تھا کہ دکان سے موٹر تک ہمارا محبوب جوتا اپنے کیس کے ساتھ ہماری ہی بغل میں رہا۔ کیدار ناتھ جب بھی یہ جوتا پہن کر دفتر آجاتے تو قالین پر نہیں ہمارے دل کے ٹکڑوں پر چلتے۔ اس روز ہم ان کے چہرے کے آثار چڑھاؤ کو نہیں بلکہ ان کے صرف فرش پر جوتا رکھنے کے انداز اور زاویے ہی کو دیکھا کرتے۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنا پیر کچھ اس طریقے سے رکھ دیا تھا کہ ان کے جوتے میں کچھ شکنیں ابھر آئی تھیں۔ ہم نے اسے ایک ذاتی غم کے طور پر محسوس کیا۔ محبوب کے رخِ روشن پر جھریاں دیکھ کر کسی عاشقِ نامراد کا دل خون نہ ہو جائے گا؟

اور پھر ایک دن میں ایک عجیب محیر العقول حادثے سے دوچار ہوا۔ اتوار کو میں نخاس کے بازار میں بلا مقصد گھوم رہا تھا۔ کہیں کسی کباڑی کی دکان پر کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لیتا اور جب پوچھنے پر اس کے دام معلوم ہوتے تو اس طرح جلدی سے اسے رکھ دیتا جیسے میں نے کوئی جلتا ہوا انگارہ اٹھا لیا ہو۔ چڑیا والی گلی کے ڈھال پر ایک موچی پرانے جوتے مرمت کرکے بیچ رہا تھا۔ اس کے سامنے پندرہ بیس کم ذات جوتے رکھے تھے اور ان کے درمیان ہمارا شہزادہ گلفام بھی مسکرا رہا تھا یعنی ہمارے خوابوں کا جوتا بھی رکھا ہوا تھا۔ ہم نے جھپٹ کر اس کو اٹھا لیا۔ "کیا یہ بھی بکاؤ ہے؟" ہم نے بے تابی سے پوچھا اور ہاں سننے پر دام دریافت کیے معلوم ہوا کہ ساٹھ روپے۔ ہم نے اسے بالکل اپنے سائز کا پایا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا تو کہیں سے مرمت کیے جانے کے کوئی آثار نہ تھے۔ جوتا بنا ہوا سا کیا ڈھلا ہوا سا لگتا۔ کیا قدرت ہمارے ساتھ مذاق کر رہی تھی۔ کئی دوسرے لوگ موچی کے پھڑ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لہٰذا ہم نے مول تول کرنا آئی لکشمی کو ٹھکرانا سمجھا۔ ہم نے کانپتے ہاتھوں سے ساٹھ روپے نکال کر فوراً موچی کے ہاتھ پر رکھ دیے اور پلک جھپکتے جوتا ہمارا ہو چکا تھا۔ ہمارا محبوب جوتا! ہمیں اس موقع پر غالب کا یہ شعر بہت مہمل نظر آیا اور تعجب اس بات پر ہوا کہ یہ ہمیں یاد ہی کیوں آیا:

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

چوں کہ ہمارے باس کے پاس بھی ایسا ہی جوتا تھا اور وہ اس کی قیمت پانچ سو روپے ادا کر چکے تھے لہٰذا ہماری ہمت نہ پڑی کہ ہم اپنا محبوب جوتا پہن کر دفتر جائیں۔ ہم اپنے جوتے پر روز پالش کرتے اور اسے پہن کر دفتر جانے سے پہلے اور وہاں سے آنے کے بعد اپنے مکان کے سامنے گلی میں ٹہلا کرتے اور اگر کوئی ملاقاتی مل جاتا تو سلام کر کے نظریں جھکا لیتے تاکہ وہ بھی جھکائے اور ہمارے شان دار جوتے کی زیارت کرے۔ ہماری ایک بڑی مصیبت یہ تھی

ہمارے گھر میں کوئی طویل زینہ نہ تھا اور جوتے کی اصلی تمکنت اور دل رُبائی زینوں سے اُترتے ہی فقط ظاہر ہوتی ہے۔
اس کی تلافی ہم نے اس طور سے کی تھی کہ ہمارے گھر کے صحن سے باورچی خانے تک جانے میں جو چار زینے پڑتے تھے، انہیں پر ہم پانچ دفعہ چڑھتے اور اترتے اور اس طرح ہم نے اُن کی من مانی تعداد بڑھا لی تھی۔ بار بار بلا ضرورت..... ...... باورچی خانے میں پہنچنے پر پہلے تو ہماری بیوی کو تعجب ہوا لیکن بعد میں اُسے غصّہ آنے لگا اور اس کی زبان سے کچھ اس قسم کے جملے نکلے۔ "کیا میری نگرانی کر رہے ہو؟" "کیا میں چنے کے دانے کھا جاتی ہوں؟ تیل پی جاتی ہوں؟ اور کیا میں کھانا پکانے میں کچھ زہر مار کر جاتی ہوں؟" اور پھر جب ہمارے بار بار کے اس جواب پر کہ محض تمہیں دیکھنے آ گیا تھا وہ اور بھی آگ بگولہ ہو جاتی تو ہم باہر نکل جاتے۔ اور اُن کے گھر کے تین زینے چڑھ کر شمبھو ناتھ جی کی گھنٹی بجانے لگتے۔

ایک دن شمبھو ناتھ جی نے گھنٹی بجانے پر دروازہ کھولا تو اُن کے چہرے پر صابن لگا ہوا تھا اور ہاتھ میں اُسترا تھا..... انہوں نے کچھ ترشی سے پوچھا: "فرمایئے"۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کہیں تو ہم نے یوں ہی زبان چلا دی، "گرانی تو روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے"۔ اور پھر اس عام بات کو بہت بے تکا سمجھ کر ہم نے سوال کر دیا، "کیا پوسٹ مین آ چکا؟" اس وقت نو بجے تھے اور محلے میں پوسٹ مین دو بجے سے پیشتر کبھی نہ آتا۔ شمبھو ناتھ جی نے بڑی ہمدردی سے ہمیں دیکھا اور کوئی جواب دیے بغیر ہم پر دروازہ بند کر دیا۔

کچھ اس قسم کے حالات تھے اور کچھ اپنی جبلّی طبیعت بھی، ایک روز ہمت کر کے ہم اپنا محبوب جوتا پہن کر اپنے دفتر چلے گئے؎

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
دیکھ جوتے کو مرے چڑیاں غزل خواں ہو گئیں

چوکیدار، چپراسی، دفتری، کلرک، بابو، اسٹینو، ٹائپسٹ وغیرہ وغیرہ جو کوئی بھی ہمارے جوتے دیکھتا اُن کی بے ساختہ تعریف کرنے لگتا اور ہم جس تعریف میں جتنی جلن، کُڑھن اور حسد محسوس کرتے، اتنی تناسب سے اس پر جھومتے اور خوش ہوتے۔ کچھ لوگ ہم سے جلنے بھننے کا انتقام ہم سے سوالات کی صورت میں لے رہے تھے۔ "کتنے کا لیا؟" "کب لیا؟" "کہاں سے لیا؟" وغیرہ وغیرہ۔ اور ہم اُن کے جواب بڑے سرپرستانہ انداز میں دے رہے تھے: "پانچ سو پانچ کا لیا۔" "پرسوں لیا"۔ "حضرت گنج سے لیا" وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جب مس جینی نے بڑی بیگانگت ظاہر کرتے ہوئے ہم پر ضرورت سے زیادہ جھک کر اور ہمارے کان کے پاس منہ لا کر ہم سے پوچھا "بائی گاڈ! تمہیں ہمارے ڈیڈ باڈی کی قسم! کیا باس نے اپنا جوتا یوز کر کے تم کو دے دیا؟" تو ہمارے صبر کا پیمانہ چھلک اُٹھا اور ہم نے چیخ کر کہا، "ہاں ہاں باس نے اپنا جوتا ہمارے سر پر مِس یوز کر کے ہم کو دے دیا!"

تھوڑی دیر بعد ہمارے جوتے کی خبر شاید کیدار ناتھ کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ کیوں کہ انہوں نے ہمیں بلا بھیجا اور اپنے آفس میں رکھی ہوئی سب سے دُور کی الماری سے ایک فائل لانے کو کہا۔ ہمارے الماری تک جانے اور واپس آنے...... کے دوران اُنہوں نے ہمارے جوتے کا دیدار ضرور کیا ہوگا۔

ہم واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور اپنا کام کرنے لگے۔ تھوڑی دیر سکون رہا اور پھر ایک دم سے ایک بم سا پھٹا اور پھر پورے دفتر میں ایک بھونچال سا آ گیا یعنی بجلی کی سرعت سے یہ خبر پھیل گئی کہ باس کا نیا جوتا کھو گیا ہے۔ اُن کا ایک وارڈ روب دفتر میں بھی رہتا اور اگر دفتر سے براہ راست اُنہیں کسی تقریب میں جانا ہوتا تو یہیں سے کپڑے بدل کر جاتے۔ ہر شخص چہ مے گوئیاں اور گھور گھور کر ہمارا جوتا دیکھ رہا تھا۔ ہم سر جھکائے ایسے ساکت بیٹھے تھے جیسے ہم پر فالج گرا ہو۔ ہم نے اپنے جوتے کو چھپانے کے لیے اپنے دونوں پیر کرسی کے اگلے پایوں میں پھنسا رکھے تھے۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن ہم کچھ نہ سمجھ پاتے۔ اور ہمارا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ ہماری اس وقت سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ زمین پھٹ جاتی اور ہم لیٹے ہوتے

سمیت اس میں سما جائیں۔ اور پھر بہت سی کانوں کا وقفہ کے درمیان ہمارے دماغ میں مس جینی کی یہ آواز گھنٹی کی طرح بجی " وہ تو کہتا ہے باس نے خود اُسے یہ جوتا پریزنٹ کیا ہے" اور موسم کے انتہائی سرد ہونے کے باوجود ہم ٹھنڈے پسینے سے تر بتر ہو گئے۔ کچھ دیر بعد۔ جو ہمارے لیے برسوں کے برابر تھی ہمارے ایک سینیئر کلرک بدھو رام ہمارے پاس آئے اور سرگوشی کے لہجے میں ہم سے پوچھا " کیا باس نے آپ کو خود یہ جوتا دیا تھا؟" ہم نے گلوگیر لہجے میں کہا " نہیں "

" تو آپ کے پاس اس کا کیش میمو تو ہوگا " انھوں نے شرلاک ہومز بنتے ہوئے پوچھا۔ " نہیں یہ تو ہم نے ایک موچی سے خریدا تھا!" ہم نے قریب قریب روتے ہوئے کہا ——

بدھو رام تن کر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے ہم سے زیادہ پورے دفتر کو سُنانے کے لیے اونچی آواز میں کہا " سپرنٹنڈنٹ صاحب اب اس سلسلے میں آپ کے تین بیانات ہیں۔ آپ نے یہ جوتا حضرت گنج سے خریدا، آپ کو جوتا اس نے خود دیا۔ آپ نے یہ جوتا نخاس میں ایک موچی سے خریدا "۔ ۔ ۔ اور اکڑتے ہماری حالتِ زار پر رحم کھاتے اپنی جگہ واپس چلے گئے۔ ان کا انداز کسی ایسے تیمار دار کا تھا جو مریض کی جاں بری سے بالکل مایوس ہو کر اُس کے سرہانے سے اُٹھ رہا ہوں۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد کہ ہم نہ صرف چور بلکہ سینہ زور بھی ہیں۔ ہمارے ساتھیوں کی کئی پھبتیاں کم ہو گئی تھیں اور وہ جو کچھ کہنا چاہتے برملا کہہ رہے تھے۔ " چوری اُپنے عیرتی " ایک صاحب نے غالباً ہماری ہمدردی میں کہا لیکن ہے بے چارہ بے وقوف۔ ورنہ وہی جوتا پہن کر دفتر کیوں آتا۔ سنکٹ پرشاد نودوا وکیل استغاثہ بن گئے " اجی اُسے کیا خبر تھی باس کے جوتے کا غائب ہونا آج ہی کھل جائے گا۔ وہ چار روز بعد کھلتا تو وہی کہتا کہ میں تو گمشدگی سے پہلے ہی اپنا جوتا پہنے دفتر آتا رہا ہوں "۔ ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ منشی عبدالکریم فارسی بھی جانتے ہیں۔ لیکن اُنہوں نے صورتِ حال دیکھتے ہوئے یہ مصرع بہت برمحل پڑھا۔

ع : چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

مسز آکلے نے ٹائپ رائٹر کی کھٹ کھٹ بند کیے بغیر کہا " بھئی مجھے تو یہ صورت سے ہی چور معلوم ہوتا ہے "۔ مس جینی نے اپنی لپ اسٹک سدھارتے ہوئے ہمارے کردار کے ایک ایسے پہلو کا انکشاف کیا کہ جس سے ہم خود بے خبر تھے " یہ اس لئے ہم سے بند بند میں ٹائمس فلرٹ کرنا مانگتا۔ لیکن ہم نے لفٹ نہیں دی۔ میرزمین کو یہ سوٹ نہیں کرتا "۔ ہمارے متعلق صیغہ واحد غائب میں اس طور سے گفتگو ہو رہی تھی جیسے ہم موجود نہ ہوں یا ذفات پا چکے ہوں۔

یہ تو سب کو یقین تھا کہ کیدار ناتھ نے اس سنگین جرم کی اطلاع پولیس کو ضرور کر دی ہو گی۔ وہ ذرا ذرا سی چیز وں کے دھر اُدھر ہو جانے پر آپے سے باہر ہو جاتے اور یہ تو چوری سینہ زوری اور ان کے وقار کو براہِ راست چیلنج کرنے کی بات تھی۔ دفتر میں لعنت ملامت کی بوچھار کے ساتھ ایک سسپنس بھی چھایا ہوا تھا کہ اب کیا ہوگا؛ سارے دفتر کو انتظار تھا اور سب سے زیادہ خود ہمیں کہ تھانے دار صاحب چار کانسٹیبلوں کے ساتھ آتے ہی ہوں گے اور ہمارا جوتا اُتروا کر اپنے قبضہ میں کر لیں گے اور ہمیں گرفتار کر کے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر ننگے پیر لے جا کر حوالات میں بند کر دیں گے۔

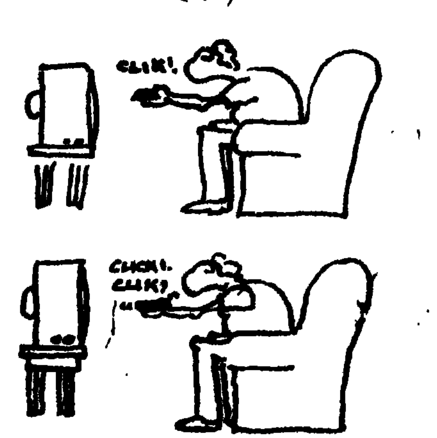
ہمیں پھانسی پانے کا تو اب تک کوئی ذاتی تجربہ نہیں ہے تاہم ہمارا خیال ہے کہ پھانسی پانے سے زیادہ کربناک دیت پھانسی کے تختے پر لٹکنے اور تماشائیوں کے سامنے تماشا بننے میں ہوتی ہو گی۔ ہم کو تھانیدار صاحب پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ جلدی آتے کیوں نہیں اور تضحیک، طنز اور تمسخر کے جو گدھ ہمارے جیتے جی ہماری بوٹیاں نوچ رہے ہیں اُن سے ہمیں نجات کیوں نہیں دلاتے۔ غالب بھی غالباً کچھ ہمارے ہی جیسے حالات سے دوچار ہوئے ہوں گے تبھی انہوں نے یہ شعر کہا:

مجھے معلوم ہے جو تو نے تبھی میرے حق میں سوچا ہے ؎ کہیں ہو جائے جلد اے گردشِ گردونِ دوں وہ بھی

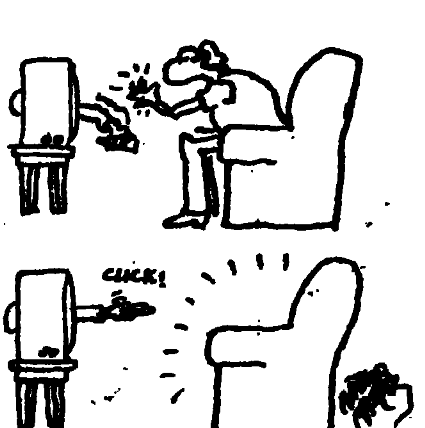
دفتر کا گھنگھور گھٹا کی طرح چھایا ہوا سناٹا ایک عجیب غیر ڈرامائی انداز سے سہ پہر کو تین بجے ختم ہوا۔ جمعدار کا لڑکا بھانو باہر کینٹین سے چائے لایا تو اس نے بتایا "صاحب کا جوتا کوچ کے نیچے رکھا مل گیا۔ میں نے ہی ڈھونڈا۔" سب کی نظریں حتیٰ کہ خود ہماری سب سے پہلے ہمارے جوتے پر دوڑیں کہیں یہی تو کوچ کے نیچے نہیں پہنچ گیا۔ لیکن نہیں۔ ہمارا جوتا ہمارے پیروں میں بدستور چمک رہا تھا۔ دفتر والے سر جھکا کر اپنے کاموں میں ایسا منہمک ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو ہم کانپتے پیروں سے لپک کر باتھ روم میں گھس گئے۔ وہاں ہمیں اس سے پہلے ہی چلا جانا چاہیے تھا۔

گھر واپس آکر ہم نے خوب ڈٹ کر اپنے محبوب جوتے پر ایک الوداعی پالش کی اور اسے ایک ڈبے میں رکھ کر اپنے سرہانے والی الماری میں بند کر دیا۔ اب ہم یہ جوتا نہیں پہنتے بلکہ اس الماری کی طرف بھی کم ہی دیکھتے ہیں جس میں کہ ہم نے اسے نظر بند کر دیا ہے۔ ہم میں اب یہ خود اعتمادی بھی پیدا ہو گئی ہے کہ اپنے محبوب جوتے کے بغیر بھی ایک مکمل شخصیت کے مالک ہیں لیکن نہیں معلوم کیا بات ہے کہ ہم اکثر بہت اوٹ پٹانگ خواب دیکھتے ہیں۔ بدھو رام مس جینی سے فلرٹ کر رہے ہیں۔ ہم نے تھانے دار کی وردی اور اپنا جوتا پہنے ہوئے انھیں گرفتار کر لیا ہے۔ لیکن عدالت میں ہم خود ملزم کے خانے میں کھڑے ہیں۔ ہم پر مال مسروقہ کی خریداری کا الزام ہے۔ مجسٹریٹ کی کرسی پر وہی نخاس کا موچی بیٹھا ہے جس نے ہمیں ہمارے محبوب سے ملوایا تھا۔ وہی ہمیں پھانسی پر چڑھائے جانے کی سزا دیتا ہے۔ کال کوٹھری سے پھانسی کے تختے تک کیدار ناتھ ہمارے ساتھ چلتے ہیں اور ہم دونوں کے پیروں میں ایک ہی طرح کے جوتے ہیں۔ کیدار ناتھ کو جلاد دبوچ لیتا ہے اور ہم بھاگ نکلتے ہیں۔ ایک چیخ کے ساتھ ہماری آنکھ کھل جاتی ہے پھر دیر تک ہمیں اس خیال کی وجہ سے نیند نہیں آتی کہ کیدار ناتھ کے پھانسی پا جانے کے بعد ان کے نئے جوتوں کا کیا حشر ہوگا؟ ●●

(١)



(٢)



پروفیسر حفیظ بنارسی

تلاشِ ایمان

ایمان کی تلاش میں بھٹکا میں دربدر
ایمان تھا کہ مجھ کو نہ آیا کہیں نظر

اس کی تلاش اور تجسس میں یہ ہوا
میں کوچۂ رقیب میں بھی [illegible] گیا

مسجد کے راستے سے گیا خانقاہ میں
گزرا صنم کدوں سے بھی ایمان کی چاہ میں

اس در پہ بھی گیا نہ گیا تھا جہاں کبھی
سجدہ وہاں کیا نہ جھکا تھا جہاں کبھی

اک مولوی کے پاس بھی پہونچا بصد گماں
بولا وہ نیک نام کہ ایماں یہاں کہاں

میں اس کا کاروبار تو کرتا ہوں بالیقیں
لیکن مری دکاں میں یہ جنسِ گراں نہیں

پھر ایک سن رسیدہ سے پنڈت کے گھر گیا
شیرازہ واں بھی میرے یقیں کا بکھر گیا

اس نے کہا کہ ہم کو عبث اس کی آس ہے
ایماں نہ مولوی کے نہ پنڈت کے پاس ہے

ہم لوگ صرف نام کے ایماں شعار ہیں
دنیا کمانے کے لئے ہم دیندار ہیں

ناکام واں سے لوٹا تو آیا دماغ میں
جلوہ فگن ہو روشنی جیسے چراغ میں

سوچا کہ اس کو ڈھونڈوں کسی دیدہ ور کے پاس
جو قوم پر فدا ہے اسی راہبر کے پاس

اک دیش بھگت کا مجھے معلوم تھا مکاں
ایماندار جن کو سمجھتا تھا کل جہاں

پہونچا جو میں وہاں تو ملا وہ تپاک سے
گویا فلک نے بات کی اک مشتِ خاک سے

فرمایا اس نے آپ غلط گھر میں آ گئے
کاغذ کی ناؤ لیکے سمندر میں آ گئے

دھوکا ہوا جناب کو تقریر سے مری
آپ آ گئے فریب میں تصویر سے مری

گفتار اور چیز ہے کردار اور چیز
ایماں کی ہے دولتِ بیدار اور چیز

ایمان والے ہیں نہ صداقت کے لوگ ہیں
ہم لوگ تو سیاسی جماعت کے لوگ ہیں

ہم لوگ کہتے اور ہیں کرتے کچھ اور ہیں
سچ پوچھئے میاں تو یہی اپنے طور ہیں

دین اور دھرم بیچ کے ہم رہنما بنے
ایماں کو ڈبویا تو ہم ناخدا بنے

بہتر یہی ہے آپ مری پیروی کریں
ایماں کی فکر چھوڑ کے بس لیڈری کریں

مایوس ہو کے میں نے ٹٹولا پھر اپنا دل
واں بھی نہ کچھ ملا تو ہوا اور بھی خجل

پھر ایک بادہ کش سے ملاقات ہو گئی
اس کی نگاہ واقفِ حالات ہو گئی

کہنے لگا کہ آپ کو کیوں ہے یہ جستجو
کیوں آپ اس کے واسطے پھرتے ہیں کو بہ کو

بت خانہ دیکھئے نہ خدا خانہ دیکھئے
دیوانہ وار گیسوئے جاناں نہ دیکھئے

میں اس کی جستجو میں پریشان ہو چکا
ہر شئے کو دیکھ کے حیران ہو چکا

ہندو کے دل میں ہے نہ مسلماں کے دل میں ہے
ایمان اب کہاں کسی انساں کے دل میں ہے

ایمان کی تلاش فضول اب کسی میں ہے
ایمان اب ایک لفظ ہے جو ڈکشنری میں ہے

بلبل کاشمیری
لندن

... تو غزل ہوتی ہے

(نذر اعجاز وارثی)

دھوپ میں میم نہائے تو غزل ہوتی ہے
نقرئی جسم دِکھائے تو غزل ہوتی ہے

رُخ کی بجلی وہ جلائے تو غزل ہوتی ہے
شمع جب سامنے آئے تو غزل ہوتی ہے

عشق جب وِصل بجائے تو غزل ہوتی ہے
دل کے انجن کو چلائے تو غزل ہوتی ہے

بھینس جوہڑ میں نہلائے تو غزل ہوتی ہے
اور وہاں بین بجائے تو غزل ہوتی ہے

کوئی مچھر جو کسی پردہ نشین کو آکر
شب کو بستر میں ستائے تو غزل ہوتی ہے

جسم کے تار بجیں تو کوئی مصرع اُبھرے
ریشماں بھیرویں گائے تو غزل ہوتی ہے

بے ستون صحن کی دیوار کا ڈھا کر گائے
جُوئے شیر اس میں سے لائے تو غزل ہوتی ہے

"آہوئے چشم" ہرا آئے تو اس کی رہ میں
جب ہرن آنکھیں بچھائے تو غزل ہوتی ہے

زعفراں زارِ ادب، شعر کی بارش سے کھلا
بُلبل اب گل بھی کھلائے تو غزل ہوتی ہے

ڈاکٹر راہی قریشی
گلبرگہ یونیورسٹی ۔ گلبرگہ

... شام ہوتے ہی

میاں بیوی میں پھر ہوتا ہے جھگڑا شام ہوتے ہی
تماشہ دیکھتا ہے پھر محلہ شام ہوتے ہی

نہ کوئی روک سکتا ہے نہ کوئی ٹوک سکتا ہے
ٹھکانے پہ پہنچ جاتا ہے دولہا شام ہوتے ہی

عجب رنگینیاں برسانے لگتا ہے گلستاں میں
یہ کونا شام ہوتے ہی ' وہ کونا شام ہوتے ہی

سحر ہوتے ہی شاعر اپنی غزلیں پیش کرتا ہے
کوئی آرمبھ کرتا ہے کویتا شام ہوتے ہی

مجھے یاد آنے لگتی ہیں، ستاتی ہیں، رُلاتی ہیں
سکینہ اور سلمہ اور سیما شام ہوتے ہی

ملے دفتر میں کچھ رشوت تو پھر مل جائے دستر پر
پراٹھا، قیمہ، بھیجہ اور انڈا شام ہوتے ہی

طلوعِ ماہتابِ مطلعِ افلاک کیا دیکھوں
کہ کھڑکی میں ہوا روشن وہ کھڑا شام ہوتے ہی

یہ ہوٹل جس میں کوئی بھی قدم رکھتا نہیں دن بھر
یہ بن جاتا ہے فن کاروں کا اڈا شام ہوتے ہی

چمن میں چار سُو کیا چاند سے چہرے چمکتے ہیں
منوّر ہونے لگتا ہے اندھیرا شام ہوتے ہی

پڑوسن کی حسین بیٹی کی ہمراہی میں اے راہی
نکل جاتا ہے میرے گھر سے بیٹا شام ہوتے ہی

پرویز یداللہ مہدی

یہ ہے بامبے مری جاں

دونوں طرف سے بھیڑ . . .

جس طرح گرگٹ کی دوڑ باڑہ تک محصور ہوتی ہے اسی طرح لوکل ٹرینوں کی دوڑ مضافات تک محدود ہوتی ہے۔ اسی لئے یہ سبربین (SUBURBAN) عرف مضافاتی ٹرینیں کہلاتی ہیں۔ ایک طرف یہ مضافات کو قلب شہر سے جوڑتی ہیں اور دوسری طرف مضافات میں رہنے والوں کی آفات میں مزید اضافہ کرتی ہیں۔ مضافاتی ٹرینوں کی برق رفتاری مسافت اور مسافر دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کرتی ہے۔ نتیجتاً فاصلے کے ساتھ ساتھ آدمی کی عمر بھی کٹ جاتی ہے وہ بھی اسی ترتیب کے ساتھ کہ آدھی عمر لوکل ٹرین کے سفر میں اور بقیہ آدھی اس سفر کے ہاتھوں ڈھیلے پڑنے والے انجر پنجر کو دوبارہ معمول پر لانے میں تمام ہو جاتی ہے اگرچہ ہر لوکل ٹرین کئی عدد ڈبوں عرف کمپارٹمنٹ پر مشتمل ہوتی ہے اور ان میں فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کی درجہ بندی کا بھی بطور خاص خیال رکھا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود دفتروں کارخانوں، ملوں اور کاروباری اداروں کے اوقات کار کے دوران ان پر اس قدر ہجوم غفیر لدا جاتا ہے کہ فرسٹ اور سیکنڈ میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا اور یوں ان مخصوص اوقات میں محمود و ایاز دونوں ایک ہی صف میں پہنچ جاتے ہیں۔ اسی طرح بھیڑ بھاڑ کے اوقات میں بمبئی والوں کو اپنی اوقات کا پتہ چلتا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب سیکنڈ کلاس کی ناقابل برداشت بھیڑ کے شکنجے میں پھنسا کوئی تنک چڑھا مسافر بے قابو ہو کر تو تو میں میں بلکہ ہاتھا پائی پر اتر آتا تو اغل بغل کے مسافر بجائے اسے ٹھنڈا کرنے کے یوں اس پر طنز کے تیر برساتے نظر آتے "جاستی بھنکس نہیں کرنے کا۔ پاس خالی تیرے پاس نہیں ہے اپن کے پاس بھی ہے کیا؟ سالا ادھر کسی کو ٹمپریچر تا نا؟ جا کے تیرے گھر والوں کو بتا؟"

"سالا نوابی کرتا۔ گردی میں تو ور روز ادمی لوگ کا چٹنی بنتا کیا۔!"

"سالا بڑے باپ کی اولاد ہوئینگا تو تیرے گھر میں ادھر جنتا کلاس، منی بجنے والے کا شے کو آیا۔ فرسٹ کلاس میں جانا۔!"

محولہ بالا گھسے پٹے فقروں کی گونج پہلے صرف سیکنڈ کلاس میں سنائی دیتی تھی۔ لیکن اب فرسٹ کلاس میں بھی ان کی بازگشت سنائی دیتی ہے یہی نہیں بلکہ جب فرسٹ کلاس کی تھرڈ کلاس دھکم پیل میں کوئی نازک مزاج مسافر بری طرح کلبلانے لگتا ہے تو یہ نیا فقرہ بھی سننے کو ملتا ہے۔ "یہ فرسٹ کلاس ہے پیارے! ادھر آدمی کا

ایسے ہی جوس بھی نکلتا ہے، جلوس بھی، تیرے کو کتی دھکے کھانے کا ہے تو سکینڈ کلاس میں جا۔"

بات کسی حد تک صحیح بھی ہے کیونکہ آبادی کے بڑھتے ہوئے بھونچال کے طفیل آج صورتحال یہ ہے کہ کیا فرسٹ کلاس کیا سکینڈ کلاس سو

دونوں طرف ہے بھیڑ برابر لدی ہوئی !!!

مسافر آگے۔ منزل پیچھے

اس میں کوئی شک نہیں کہ بمبئی کی لوکل ٹرینوں میں سفر کرنے والے مسافروں کو ہر آن ایک سخت مرحلے سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور ہر مرحلہ خدا گواہ مرحلۂ سخت اور جان عزیز والا ہوتا ہے۔ تاہم مرحلوں کی اس طویل فہرست میں دو مرحلے سب سے زیادہ دشوار گزار ہوتے ہیں۔ ایک ٹرین میں بخیر و خوبی سوار ہونے کا دوسرا اپنے مطلوبہ اسٹیشن پر صحیح سلامت اترنے کا ٹرین میں چڑھتے وقت سب سے بڑی رکاوٹ اترنے والے مسافر کھڑی کرتے ہیں۔ ان کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ آپ کسی صورت ٹرین میں سوار نہ ہونے پائیں اس سخت مزاحمت کے باوجود اگر کسی طرح ایڑی چوٹی کا پورا زور لگا کر ٹرین میں سوار ہو بھی گئے تو اس بات کی ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ اپنے مطلوبہ اسٹیشن پر اترنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس موقع پر چڑھنے والے مسافروں کی حتی المکنہ کوشش ہوتی ہے کہ آپ کسی طور اترنے نہ پائیں گویا کسی نہ کسی مرحلے میں آپ کی ناکامی یقینی ہے یعنی کبھی مرحلہ اولیٰ آپ کو ساقط البحر کر دیتا ہے تو کبھی مرحلہ ثانی آپ کو خارج از بحر ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ سچ پوچھئے تو فرہاد کی طرح لوکل ٹرینوں میں وہی جواں مرد پلک جھپکنے میں چڑھ اتر سکتے ہیں جو اس شاعرانہ مشورے پر عمل پیرا ہونے کی بھر پور صلاحیت و سکت رکھتے ہیں۔

جعفر دیار یار میں جب بھیڑ بھاڑ ہو
تو بھی گھسڑ پھسڑ کے گھسیڑم گھسار ہو

تاہم دیار یار میں "گھسڑم گھساڑ" کے لئے صرف سر سے کفن باندھ لینا ہی کافی ہے جبکہ الکٹرک ٹرین میں سفر کرنے کے لئے سر سے کفن باندھنے کے علاوہ "یوگا" کے مختلف "آسنوں" سے واقفیت ضروری ہے۔ بالخصوص حبس دم" یعنی دیر تک سانس روکنے کے عمل پر پوری طرح قادر ہونا لازمی ہے اس سے کم از کم سفر کے دوران قدم قدم پر دم نکال دینے والے جھٹکوں سے آدمی محفوظ رہتا ہے۔ جو سخت جان بندہ بمبئی کی لوکل ٹرینوں میں چڑھنے اترنے اور سفر کرنے میں مہارت تامہ حاصل کر لیتا ہے اس کے تعلق سے عام طور پر یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ قیامت کے دن میدانِ حشر کا بھیڑ بھاڑ کا بھی اس کے آگے اتنا ہی حقیر اور بے وقعت ہو جائے گا جتنا کہ اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ اس کے علاوہ پل صراط جو دوزخ کے اوپر گذرنے والا قدرتی فلائی اوور ہے جس کے بارے عام خیال ہے کہ بال سے باریک تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ اور ہر نیک و بد کا اس پر سے گذرنا ناگزیر ہے۔ ایسے خطرناک پل پر سے بھی بمبئی کی لوکل ٹرینوں میں روزانہ بخیر و عافیت اپ اینڈ ڈاؤن کرنے والا باہمت و خوش قسمت مسافر ہنستے کھیلتے۔ قلانچیں بھرتے ہوئے گذر جائے گا۔ غالباً ان پس مرگ آزمائشوں کے پیش نظر ہی بمبئی کی لوکل ٹرینوں کو دو مختلف زمروں میں تقسیم کیا گیا۔ سلو (Slow) یعنی سست گام اور فاسٹ (Fast) یعنی سست گام ٹرینیں ہر اسٹیشن پر رک کر سلامی دیتے ہوئے اپنی منزل مقصود تک کا سفر طے کرتی ہیں اور فاسٹ عرف تیز گام ٹرینیں صرف مخصوص اسٹیشنوں پر توقف کرتے ہوئے اپنی منزل

پر پہنچتی ہیں۔ بالفاظ دیگر تیز گام ٹرینیں بیچ کے اسٹیشنوں پر بالکلیہ گھاس نہیں ڈالتیں۔ بیچ والے اسٹیشن چلاتے رہ جاتے ہیں "رک رک رک" اور یہ جواباً کسی مغرور حسینہ کی طرح بڑی ہی حقارت سے یہ کہتی ہوئی گذر جاتی ہیں۔ "چپ چپ چپ"۔ ویسے ٹرین چاہے سست گام ہو یا تیز گام ہر ٹرین بیچ کے اسٹیشنوں پر صرف ۲ منٹ دم لینے کے لئے یعنی مسافروں کا دم لینے کے لئے رکتی ہے اور اس پل دو پل کے وقفے میں ہزاروں مسافروں کو اترنا اور اتنے ہی مسافروں کو سوار ہونا پڑتا ہے۔ ایسے نفسا نفسی کے عالم میں ظاہر ہے لاتعداد مسافر اپنے اپنے مطلوبہ اسٹیشنوں پر اترنے سے رہ جاتے ہیں اور یوں منزل پیچھے رہ جاتی ہے اور مسافر آگے نکل جاتا ہے۔

مسافری، کافری

جس طرح لوکل ٹرینوں میں چڑھنے اترنے کے آداب نہیں ہوتے صرف "آسن" ہوتے ہیں اسی طرح ٹرین میں کھڑے ہونے اور بیٹھنے کے بھی اصول نہیں صرف اسٹائیل ہوتے ہیں جس میں نہ تو مسافروں کی مرضی کا دخل ہوتا ہے نہ اختیار یوں بھی تمام مسافروں کا "باجماعت" انداز میں "قبلہ رو" کھڑا ہونا ضروری بھی نہیں شاید اسی لئے مسافری اور کافری کو ایک مانا گیا ہے چنانچہ جو مسافر جس پوزیشن میں سوار ہوتا ہے اپنے مطلوبہ اسٹیشن پر اترنے تک اسی پوزیشن میں رہتا ہے۔ مثال کے طور پر سوار ہوتے وقت اگر کوئی دھکم پیل میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور غلطی سے "مرغا" بن جائے تو پھر اترنے تک "مرغا" ہی بنا رہتا ہے۔ دوران سفر وہ لاکھ سر اسے بھیڑ کا دباؤ اسے دوبارہ آدمی نہیں بننے دیتا۔ سچ ہے کہ لوکل ٹرین کا سفر اچھے خاصے حیوان ظریف کو خالص حیوان بنا دیتا ہے۔ بقول شاعر ؎

لوکل ٹرین تو نے ہمیں کیا بنا دیا
مرغا کبھی کتا کبھی چوہا بنا دیا!

یوں تو زندگی کے ہر شعبے میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے والے کو ہمارا معاشرہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ لیکن لوکل ٹرینوں کا معاملہ قدرے مختلف ہے ان میں وہی لوگ آرام سے سفر کرتے ہیں جو دوسروں کے پیروں پر کھڑے رہنے کا گر جانتے ہیں۔ لہٰذا بمبئی میں لوکل ٹرینوں میں سفر کرنا ہے تو دوسروں کے پیروں پر کھڑے ہونے کی عادت ڈالئے ویسے اس میں نہ کوئی خاص تیر مارنا پڑتا ہے نہ محنت کرنی پڑتی ہے بے شمار حاضرانِ حضور اور غافلانِ بحضور کے پاؤں خود آپ کو قدم رنجہ فرمانے کی کھلی دعوت دیتے ہیں بس چپکے سے کسی اور کے پیروں پر اپنے پیروں کو جما کر کھڑے ہو جائیے۔ خدانخواستہ اگر متاثرہ شخص نے آپ کو رنگے ہاتھوں بلکہ رنگے پیروں پکڑ لیا تو فوراً سوری کہہ کر کسی اور غافل کے پیروں کو نشانہ بنا لیجئے اور اسطرح پیر بدلتے بدلتے اپنی منزل پر پہنچ جائیے۔ ؎

کیا خوب سودا نقد ہے
اس پاؤں لے اس پاؤں دے

آپ نے شہر کے شور شرابے سے دور کسی پرسکون فضا و وادی میں کسی ندی کے کنارے "ایک ٹانگ" پروں میں چھپائے دوسری زمین پر ٹکائے مراقبے میں گم بگلوں کا بھی نظارہ کیا ہوگا۔ اور ایک ٹانگ پر کھڑے دھیان گیان میں ڈوبے سادھوؤں کو بھی یقیناً دیکھا ہوگا۔ لیکن دونوں ٹانگیں اٹھائے ہوا میں معلق نہ

بگلے دیکھے ہوں گے، نہ سادھو، بگلوں کے تعلق سے ہم دعویٰ کے ساتھ اسلئے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ بگلے لوکل ٹرین میں سفر نہیں کرتے ہیں۔ البتہ جہاں تک اشرف المخلوقات کا تعلق ہے ہم نے اپنی چشم گنہگار سے دونوں ٹانگیں فرش سے اوپر اٹھائے بھیڑ کے ریلے میں پھنسے ہوا میں معلق بے شمار آدمیوں کو لوکل ٹرین میں سفر کرتے ضرور دیکھا ہے۔ اگر آپ کو کرتب بازی کا ذرا بھی شوق ہے تو بھیڑ بھاڑ کے اوقات میں صرف ایک بار بمبئی کی لوکل ٹرین میں سفر کرکے دیکھئے۔ انشاء اللہ مایوس نہیں ہوں گے۔ سہ

"سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے"

••

بابو آر کے (داخل پور شہر)

ممبر... اُلٹی پالٹی کا

میونسپل کمیٹیوں کے الیکشن کا اعلان ہوتے ہی شہر میں ہر سمت دھوم دھام اور شور و غل کا بازار گرم ہوگیا۔ لوگوں کی بھیڑ بھاڑ سے ہوٹلیں ابل پڑیں اور پان' ٹھیلے چھلک گئے۔ دعا سلام کے ڈونگرے برسنے لگے اور مصافحوں اور معانقوں کی دھوم مچ گئی۔ تمام شہر الکشن کے بخار بلکہ سیاسی سرسام میں مبتلا ہوگیا۔ ہر کسی پہ الکشن کا بھوت سوار تھا بلکہ بھوتوں پہ الکشن سوار تھا۔

ہم تو ویسے بھی اپنے وارڈ کے رنراپ امیدوار تھے اس مرتبہ ہماری کامیابی کے زیادہ CHANCES تھے۔ ہمارے اپنے ووٹر کے اگر سر میں درد بھی ہوا تو ہم سر کے بل اس کی مزاج پرسی کرنے اس کے گھر تک گئے تھے۔ چونکہ ہم اور ہمارا حریف امیدوار دونوں طاقتور تھے اس لیے ہمارے وارڈ کے ووٹرس بھی دو گروپوں میں بٹ گئے تھے' جب کبھی ہمارے مخالف ووٹر کی طبیعت خراب ہوتی تو ہم مسرور ہوتے اور مریض کے کھٹیا سے ڈولے میں منتقل ہونے کی دعائیں مانگتے اسی طرح ہمارے ووٹر کی طبیعت ناساز ہونے پر ہمارا حریف امیدوار' قبرستان میں ایک نئی نویلی قبر دیکھنے کا آرزومند رہتا۔

یہ الکشن' سلیقے سے لڑنے کا ہمارا ارادہ تھا اس لیے ہم نے اپنے حلقے کے معتبر ووٹرس سے بالمشافہ ملاقات کی۔ اُن سے رنگا رنگ وعدے کیے۔ اپنے حلقے کے ڈاکٹروں سے ملنے ہم اُن کے مطب گئے...... اور انھیں اُن کا دھندہ زوروں پر چلنے کی نیک تمنائیں پیش کیں۔ پھر اپنے حلقے کے مریضوں سے بھی ملے اور انھیں ڈاکٹروں سے محفوظ رہنے کی دعائیں دیں۔ ہمارے حلقے کے جن والدین کو اپنی بچیوں کے ہاتھ پیلے کرنے تھے... ہم اُن سے بھی ملے اور بغیر جہیز کی شادیاں کروانے کا انھیں یقین دلایا اور کنوارے لڑکوں کے لالچی ماں باپ کو لڑکی کے روپیے میں پری اور جہیز میں جہاز تک دلانے کے خواب دکھائے۔ اٹھارہ سالہ ووٹرس کو رجھانے کے لیے ہم نے قسمیں کھائیں کہ ہم وارڈ کے ہر چوک پر قدِ آدم آئینوں کا حصار باندھ دیں گے۔ بیوٹی پارلر سجا دیں گے اور ننگی سے بھرپور فلموں کے لیے ویڈیو ہال گرما دیں گے۔ ہمارے وارڈ میں دو خاندان گورکنوں کے بھی تھے اس لیے ہم اُن سے بھی ملے اور انھیں آگاہ کیا کہ اگر وہ دن رات قبریں کھودنا چاہتے ہیں تو...... وہ صرف ہمیں ہی ووٹ دیں۔ جب بات اُن کے پلے نہ پڑی تو ہم نے انھیں سمجھایا کہ الکشن میں کامیاب ہونے کے بعد ہم گندگی

اور غلاظت دوٹرس کو فراہم کرنے ڈاکٹروں سے تعاون کریں گے اور بے جگری سے علاج کر کے ڈاکٹر لوگ آپ کو تعاون دیں گے۔

خیر صاحب اس دوران الکشن سے تھوڑا پہلے کھینچا تانی کر کے ہم نے ایک آدھ فنکشن "تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے" کے نام پر نکال ہی لیا اور اس تقریب طعام میں بجائے رشتہ داروں اور قرابت داروں کے اپنے تمام ووٹرس کو مدعو کر لیا۔ اس تقریب کے بعد ہم نے ووٹرس سے رابطہ برقرار رکھنے کے لیے گاہے گاہے اپنے گھر میں خواتین کی پرتکلف تبرک سے مزین قرآن خوانیوں کا تانتا باندھ کر رکھ دیا۔ بیگم اور بچوں کو تاکید کی کہ ووٹرس کو خوش رکھنے کے جتن میں ہمہ تن مصروف رہو۔ دعا سلام ٹھونکتے رہو خیر خیریت پوچھتے رہو۔ ووٹرس سے جب بھی ملو باچھیں اور جیب دونوں کھلی رکھو۔ باچھیں کھلی رکھنے کا عمل بیگم نے باچھیں اکڑ لینے کی حد تک دہرایا۔ اس عمل سے بھلے ہی ووٹرس نے ہمیں قبول نہ کیا ہو لیکن بہرصورت بیگم قبول صورت کہلانے جانے لگیں۔

تو صاحب قصہ مختصر یہ کہ ہم نے جائز اور ناجائز ہر طریقہ استعمال کر کے الکشن جیت لیا۔ اور پھر.... میونسپل کونسلر بنتے ہی ہماری کایا پلٹ گئی۔ ہم اپنے حلقے کے خدائی فوجدار بن گئے۔ شادی ہو یا طلاق، موت ہو یا پیدائش۔ ڈلیوری ہو یا ڈسینٹری۔ بول چال سے لیکر مارا ماری تک اور گود بھرنے سے لیکر گور کھودنے تک ہمارا عمل دخل ضروری ٹھہرا۔ دفتروں تو ہم پر نوٹ کے برسنے لگیں جس سے ہوا یہ کہ ہماری شخصیت کے ساتھ ساتھ ہم بھی وزنی ہوتے گئے۔ دکانوں۔ مکانوں کے اُدگھاٹنوں کی قینچیں ہمارے ہاتھ میں رہنے لگی اور جلسوں کی صدارت تو ہماری لونڈی بن کر رہ گئی۔ ہم نے اپنے وارڈ میں ووٹ۔ نل اور نالی کے انتظامات اپنا پرایا دیکھ کر کیے۔ کہیں لائٹ لگوائے اور کہیں نکلوائے۔ نالیاں کہیں بنوائیں اور کہیں کھدوائیں۔ ہم نے اپنے وارڈ میں نل بھی لگوائے۔ ایسے ہی ایک نل کا اُدگھاٹن ہمارے ہاتھوں [illegible] کی افادیت اور اہمیت پر سیر حاصل تبصرہ کرنا تھا۔ ہر لیڈر کی طرح ہم نے بھی مجمع میں تالیاں بجانے اور نعرے لگانے کے لیے اپنے کرائے کے گرگے جلسے میں چھوڑ رکھے تھے۔ اور انھیں ہدایت کی کہ دوران تقریر وہ وقفہ وقفہ سے تالیاں بجائیں اور موقع موقع سے نعرے بھی لگائیں...... تو صاحب ہم نے اپنی تقریر یوں شروع کی۔ حاضرین! ل! اس تخاطب پر مجمع میں تالیاں بج اٹھیں۔ ہم نے اپنے گرگوں کو گھورا.... تالیاں تھم گئیں۔ ہم نے کہا دیویو اور سجنو! نل ہمارے سماج میں مہان درجہ رکھتے ہیں۔ یہ نل ہمارے بھارتیہ سماج کا اٹوٹ انگ ہیں ـــــ ہماری....... سنسکرتی کا آدھار استمبھ ہے۔ بھائیو اور بہنو' ہمارے ان ہی نلوں کی آغوش میں اہنسا' عدم تعاون' داداگیری اور مارا ماری نے جنم لیا۔ راشٹر پتا مہاتما گاندھی نے ان نلوں سے بہت کچھ سیکھا۔ انہی نلوں پر جاری ہنسا اور مارا ماری نے انھیں کا اہنسا کا مارگ سجھایا۔ اس طرح یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ہمارے ملک کی آزادی میں بھارتیہ نلوں کا بھی اتنا ہی یوگ دان ہے جتنا کہ ہمارے نیتاؤں کا مجمع میں سے آوازیں ابھرتی ہیں "ستیہ ہے ستیہ ہے"۔ ہم نے کہا ماتاؤں' بہنوں اور سجنو! ان دنوں ہمارے ملک میں دو پریشر بہت زیادہ سننے میں آتے ہیں۔ ایک تو انسانوں میں بلڈ پریشر دوسرا نلوں میں پانی کا پریشر۔ پتہ نہیں کیوں اس جملہ پر تمام جلسہ تالیوں کے پریشر میں آگیا۔ ہم نے دلگیر لہجہ میں کہا ... ہمارے

نلوں کا خونی اتہاس گواہ ہے کہ اُن سے پانی کے دھارے کبھی کبھار ہی پھوٹتے ہیں جبکہ جھگڑوں کے روپ میں خون کے دھارے ہمیشہ چھوٹتے ہیں ان ہی نلوں پہ ہماری گرہستن عورتیں لائی لگائی کرتی ہیں جس کے کارن نلوں پر سر، برتن اور گھر تینوں پھوٹتے ہیں۔ ان ہی نلوں پہ ہمارے مرد داداگیری اور نوجوان عاشقی کرتے ہیں اس تقریر پہ جلسہ میں سیٹیاں گونجنے لگیں۔ اب ہم اپنی تقریر کے آخری موڑ پر تھے۔ حاضرین! ہم آخر میں یہی دعا کریں گے کہ یہ ہمارا نیا نل، نلوں کے خونی اتہاس سے ہٹ کر امن محبت اور بھائی چارے کا نیا اتہاس بنائے اتنا کہہ کر ہم نل کا ادگھاٹن کرنے باوقار انداز میں ڈائس سے نیچے اُترے اور نپے تلے قدموں سے نل کی جانب بڑھے۔ ہم نے حاضرین پہ غیور نظریں ڈالیں اور تمکنت سے نل کی ٹونٹی کو اس انداز سے گھمایا گویا تمام عالم کو پانی اسی نل سے۔۔۔ "SUPPLY" ہونے والا ہو۔۔۔۔ اور پھر تالیوں کی گھڑگھڑاہٹ اور برتنوں کی جھنجھناہٹ میں نل سے پانی کی دھار بہہ نکلی اور اُسی ایک پل میں پانی بھرنے والی بھیڑ نے ہمیں رگڑتے دیکھ کر نل سے بہت دور پھینک دیا ہم نزول کے پتھر سے بوس وکنار کرتے ہوئے الکٹرک کے آہنی پول سے بغلگیر ہوئے۔ منہ پھوٹا اور ہاتھ ٹوٹا۔۔۔۔۔ جس ہاتھ نے ابھی ابھی کا اُدگھاٹن کیا تھا وہی ہاتھ پلاسٹر کی قید بامشقت میں گرفتار تھا۔ ہم اسپتال سے لوٹ ہی رہے تھے کہ راستے میں ہمیں نل BULLETIN یوں ملی کہ ہمارے وہاں سے نکلتے ہی پانی کے لیے مارا ماری میں کتنے ہی لوگوں کے ہاتھ پاؤں کٹے اور سر پھوٹے۔ بھالے برچھے نکلے اور تلواریں چلیں۔ ہم بھاری قدموں اور بھاری ہاتھ کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر بیگم نے مزاج پرسی یوں شروع کی۔۔۔۔۔۔ یہ کہاں سے لوٹ پھوٹ کر آرہے ہو؟ ہم نے ہاتھ کا درد چہرے پر سمیٹ لیا اور بولے اپنے وارڈ کے نل کا اُدگھاٹن کرکے لوٹے ہیں۔ وہ انگارہ ہوگئیں۔۔۔ گھر میں پانی کی بوند نہیں۔۔۔ میرے اور بچوں کے حلق میں کربلا اتر گئی اور یہ چلے ہیں نل کا ادگھاٹن کرنے! میں کہتی ہوں بند کرو۔۔۔ یہ گھر کا کھا کر ماموں کی بکریاں چرانا۔ ہم نے کہا۔۔۔۔ بیگم تم زندگی بھر دو چیزوں کا ہمیشہ غلط استعمال کرتی آئی ہو۔۔۔۔ وہ ہمیں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگیں۔ ہم نے کہا ایک تو ہمارا اور دوسرے محاوروں کا ہم نے انھیں سمجھایا۔۔۔۔ دیکھو ایک تو ہمیں ماموں کبھی ہوئے نہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے اُن کے نہ پیدا ہونے کا۔۔۔۔۔ تو شاید انھیں کسی بہنوئی صاحب کا سالا بننا گوارہ نہ ہوگا۔ اب اگر تم اپنے ماموں کی بکریاں چرانے کی بات کر رہی ہو۔۔ تو ہم جیسے نجیب الطرفین آدمی کا دھنگر برادری میں رشتہ ہو جاتا گویا یہ ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ بیگم نے برجستہ کہا دیکھو جی! اس کام کو آپ کسی اور وقت پہ ٹالے رکھیے فی الحال گھر میں چلو بھر پانی بھی نہیں ہے۔

اس وقت ہم طیش میں گھر سے نکلے اور سیدھے میونسپل کمیٹی کا رُخ کیا۔ لال پیلے ہو کر ہم اور ہیکش مہودے کے چیمبر میں گھس گئے۔ ہمیں اس حال اور اکھڑے موڈ میں دیکھ کر ادھیکش مہودے اپنی کرسی پر جم کر بیٹھ گئے کیونکہ ماضی میں کتنی ہی مرتبہ ہمارے اکھڑے موڈ نے ان کی کرسی کے پاؤں اکھاڑ دیے تھے۔

وہ گھبرا کر اپنے ہاتھوں کے طوطے اڑا کر ہمارے ہاتھ پہ بندھے پلاسٹر کی جانب دیکھ کر بولے۔ "یہ کہاں دو دو ہاتھ کر آئے! ہم نے کہا، اپنے وارڈ کے پبلک نل پہ۔۔۔۔ وہ متعجب ہو کر۔۔۔۔۔ کیا! تمہارے گھر میں نل نہیں؟ ہم نے

کھلی بھی تو ہمارے لیے شرم کا مقام ہے۔ ہم رولنگ باڈی میں رہ کر بھی ایک بوند پانی کو ترسیں اور...... مد
ہیں کہ بہتی گنگا میں نہائے جا رہے ہیں........ چوں کہ میونسپل کمیٹی میں پیش
اکیس کا معاملہ تھا یعنی اپوزیشن میں بیس کونسلر تھے اور ادھیکش مہودیہ کو اکیس ممبروں کا ساتھ چھوڑ کر اپوزیشن میں
جانے کی دھمکی دیتے اور اپنا الو سیدھا کرتے۔ ویسے بھی ان دنوں ہمارے الو نے ذرا زیادہ ہی ٹیڑھا رہنے کی عا
اپنالی تھی......

حسب معمول آج بھی ادھیکش مہودیہ نے اپنی جیب سے سو سو کے دس نوٹ نکالے اور ہماری جانب بڑھا
بولے...... یہ لو...... آج سے یہ دس ہاتھیوں کی فوج تمہارے گھر میں پانی بھرتی رہے گی۔ گھر جاؤ...ا
نل فٹ کرلو۔ تو صاحب میونسپل کمیٹی کی ممبری ہمارے لیے 'ندی کا نہانا' دعوت کا کھانا ثابت ہوئی۔ ہم نے اپ
ممبری کے دوران لوگوں کو نوکریاں دے کر رشوتیں کھائیں۔ جھوٹے ٹینڈر پاس کروا کے پیسہ بٹورا۔ ٹھیکیداروں سے
مارکٹوں، اسکولوں اور نالیوں کے باندھ کام میں کمیشن کھائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں نالیوں سے غلاظت
بجائے خود نالیاں بہہ گئیں۔ مارکٹ اور اسکول کی عمارتیں خشوع و خضوع کے ساتھ رکوع و سجود کے مقام پر فائز ہو
قصہ مختصر یہ کہ ہماری ممبری کے پانچ سال جاتے جاتے کمیٹی میں کاگ پکارنے لگے اور ہمارے گھر میں ہن برسا۔ ہمارا
بیلنس ابراہیم لودھی کی فوج کی طرح ہاتھیوں کی فوج سے مسلح ہوا...... اور بیگم کا جسم سونے کے زیورات سے
قدر loaded ہوا کہ وہ چلتا پھرتا سونے کا مندر بن گئیں۔

الکشن نامہ

مجاہد لکھنوی
(کراچی)

ہم نہیں کہتے کہ اچھے یا بُرے کو ووٹ دو
بس نشانی دیکھ کر گھوڑے گدھے کو ووٹ دو

ہو نہ جس کے پیچھے کوئی غیر ملکی مائی باپ
ایسے اپنے ہم وطن، گھر کے پلے کو ووٹ دو

ایسے بھوتوں کی لنگوٹی ہے غنیمت دوستو!
گر نہ کوئی ہاتھ آئے بھاگتے کو ووٹ دو

جو کرے باتیں کبھی مغرب کی، مشرق کی کبھی
کچھ بھی ہو ہرگز نہ آپ اُس دوغلے کو ووٹ دو

دیکھو بیلٹ پر چھپی تصویر پہ ہرگز نہ جاؤ
دانت کُھر سے ہو درست، ایسے کھرے کو ووٹ دو

چکنی چپڑی باتیں ہر اک، کر رہا ہے آج کل
چھوڑ کر اِن کو کسی کھرّے چنے کو ووٹ دو

ہو کوئی شیریں سخن وابستہ گر امید سے
شوق سے پھر تم بھی چینی جھنجھنے کو ووٹ دو

رہتی ہے اکثر یہ پانی اور ہوا میں گفتگو
ایک ہوکر آؤ اپنے بُلبُلے کو ووٹ دو

بھول جائیں پونڈ، اسٹرلنگ، ڈالر اور ریال
بھائی بہنوں سے کہو اپنے روپے کو ووٹ دو

ہیں یہ دریا تو وہی پر اب یہ دھارے اور ہیں
سوہنی والے نہ اب کچّے گھڑے کو ووٹ دو

کھول کر کانوں کو سُن لیں نوکری پیشہ عوام
اپنے صاحب کے بھتیجے بھانجے کو ووٹ دو

ہو اِمرتی جیسا سیدھا سادہ جو اُمیدوار
بَس مجاہدؔ تم بھی اُس بے زاویئے کو ووٹ دو

غزل

یوسف یکتاؔ
سکندرآباد

---- (چچا و بھتیجے سے معذرت کے ساتھ)
حضرت غالبؔ و برادرم بوگسؔ مرحوم

ناز نخرے ہیں کیا، ادا کیا ہے
یہ مصیبت میرے خدا کیا ہے

ہیں وہ سائے کی طرح میرے ساتھ
کوئی پوچھے کہ مدّعا کیا ہے

کھوج میں ہے ابھی تلک دُنیا
"آبر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے"

کھچڑی پاپڑ آچار گھی دے دو
"اور درویش کی صدا کیا ہے"

سوا روپے میں ہوگیا انڈا
اے گرانی تجھے ہوا کیا ہے

ہم ہیں کھوسٹ تو وہ ہیں مست شباب
"یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے"

بے طلب ان کو مل گئی دُنیا
ہم نے مانگا تھا کیا ملا کیا ہے

ہو رہی ہے شفا دعاؤں سے
ہم نہیں جانتے دوا کیا ہے

کون پوچھے گا آپ کو یکتاؔ
آپ کے پاس اب رکھا کیا ہے

قطعات

اسرار جامعی
(دہلی)

طاقت

طاقت میں کم نہیں ہیں کسی سے وہ آج بھی
غافل بھی وہ نہیں ہیں کچھ اپنی فلاح سے
بھرتا بنا کے کھائیں گے اسرائیلیوں کا وہ
شیخ عرب کو ہوگی جو فرصت نکاح سے

سچ

جامعی نے یہ بتایا دوستو
سچ کا ہے بیڑا اٹھایا دوستو
ہے ثبوت اس کا کہ جب بھاشن دیا
وہ ہمیشہ پٹ کے آیا...

بے وزن

ایک شاعر گا رہے تھے اس سے جو واقف نہ تھے
شعر کا بے وزن ہونا کس قدر معیوب ہے
سن کے یہ اسرار بولے آفریں ! صد آفریں!
بحر ناموزوں میں شاعر کی غزل کیا خوب ہے

وزن

وزن کتنا ہے کسی فن کار کا
یہ پتا چلتا ہے کیسے اور کب
سن کے یہ اسرار بولے جان لو
جب اُسے دیتے ہیں کاندھا لوگ سب

لہو کی قیمت

اسرار یہ بتایئے فرقہ پرست کو
کام ایسا وہ کرے جو ذرا سود مند ہو
سڑکوں پہ گر بہے تو کسی کام کا نہیں
قیمت لہو کی جب ہے کہ بوتل میں بند ہو

منہ پھٹ ناگپوری

صاف صاف

عمر جب ساٹھ سال کی ہوگی
ساری حرکت کمال کی ہوگی
عشق میں "عین غین" کرتی ہے
وہ سپتری دلّال کی ہوگی
گاؤں میں بج رہا ہے منجیرہ
سائیں بابا کی پالکی ہوگی
طور کا جب بھی تذکرہ ہوگا
بات اُن کے جلال کی ہوگی
ڈھونڈنا ہی پڑے گا گھر والی
فکر جب روٹی دال کی ہوگی
ہاتھ ملتے ہوئے گئے ڈاکو
اس کی دولت حلال کی ہوگی
آج گنجوں کی سر منڈائی ہے
گنتی ایک ایک بال کی ہوگی
جنم لیتا ہے جب بڑا نیتا
کوئی ساعت زوال کی ہوگی
صبحدم شیخ کو ہوئی اُلٹی
کل کی دارو اچھال کی ہوگی
ہو بھلے سے جنوب کا لیڈر
اس کو چنتا شمال کی ہوگی
منہ پھٹ ایسا کوئی ہمیں نہ ملا
جس کو چاہت نہ مال کی ہوگی

شیخ سلیم
(لکچرار انوار العلوم کالج حیدرآباد)

بیوی اور بیلن

دُنیا سائنس اور ٹکنالوجی میں خواہ کتنی ہی ترقی کرلے، کتنے ہی حیرت انگیز ہتھیاروں کی نئی نئی قسمیں ایجاد کرلے مگر بیلن جیسے اعضاء شکن، زود اثر بے چوک اور چلانے میں نہایت آسان ہتھیار کا نعم البدل پیش کرنے کے لیے سائنس داں دونوں ٹانگوں سے معذور نظر آرہے ہیں۔ انھوں نے اپنے سائنسی کارناموں سے ساری دُنیا کو محوِ حیرت کردیا لیکن بیلن سے بچنے اور بچانے کے لیے کوئی مؤثر حفاظتی آلہ نہیں ایجاد کرسکے اور نہ ہی شریف شوہروں کو کوئی احتیاطی تدابیر ہی بتا سکے، کچھ عرصہ قبل ہم ٹی۔ وی پر کویت اور عراق کے جنگی مناظر سے اسی طرح لطف اندوز ہوئے جس طرح "ویڈیو" پکچر سے ہوتے ہیں، جنگ کے دوران ہم نے یہ بھی دیکھا کہ (ترقی یافتہ ممالک کچھ بھی نہیں دیکھتے) تباہ کن میزائل کو بے اثر اور ناکارہ بنانے کے لیے پیٹریاٹ میزائل داغے گئے اور بڑی حد تک تباہ کن اور خوش کن (امریکہ کے لیے) میزائلوں کو غیر کارکرد بنانے میں کامیابی حاصل کی، لیکن جب بیوی کا بیلن چلتا ہے تو اکثر شریف شوہر بچ نہیں پاتے بلکہ بچنے کے تمام اقدامات سے ماورا ہوکر بیوی کے بیلن سے مار کھالینے میں ہی اپنی عافیت (عاقبت بھی ہوسکتی ہے) سمجھتے ہیں۔ میں دُنیا کے صرف شوہر سائنس دانوں سے پوچھتا ہوں ....
(پوچھنا میرا بنیادی حق ہے) کہ انھوں نے تباہ کن میزائل سے بچنے کے لیے تو پیٹریاٹ میزائل بنائے مگر بیوی کے اعضاء شکن، حوصلہ شکن وغیرہ وغیرہ بیلن سے محفوظ رہنے کا کوئی مؤثر طریقہ کیوں نہیں ایجاد کیا، اس موقع پر اگر کوئی بے تکی مداخلت کرتے ہوئے کہہ دے کہ بیلن سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے "ہیلمٹ" کا صحیح استعمال نہایت "مفید" کارگر اور واحد علاج ہے تو اِن بے تکے (تو تلے نہیں) حضرات سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب میاں، بیوی میں فری اسٹائل بیلن وار چلتی ہے تو بیلن کا نشانہ صرف "سر" بنے گا، سوچنا خیالِ خام (خیالِ عام بھی ہوسکتا ہے) ہے، کیوں کہ جسمِ ناتواں کے دوسرے اعضا بھی نشانہ بن سکتے ہیں، چوں کہ مشتاق اور ہوشیار (ترقی پسند تربیت یافتہ) بیوی بخوبی جانتی ہے کہ اس کے میاں کو دوسرے کے سر سے زیادہ اپنے سر کا (خواہ گنجا ہی کیوں نہ ہو) بہت خیال رہتا ہے اور وہ اس کی بقا کے لیے جائز و ناجائز تمام تدابیر اختیار کرے گا کیوں کہ تمام مرد (صرف شریف) اس محاورے پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

"سر سلامت تو پگڑیاں ہزار"

بیوی اور بیلن کا ساتھ کرتا اور دامن کا ساتھ ہے، بیلن کے بغیر بیوی کا اور بیوی کے بغیر بیلن کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

ہماری دردمندانہ اور غم زدہ (زنانہ نہیں) شوہروں سے بے رحمانہ اپیل ہے کہ وہ اپنی بیوی کے دستِ ظالم (دستِ قاتل نہ سمجھیں) میں اس قدر مہلک اور اعضاء شکن کھلونا نہ دیں جو خود ان کے لیے جان لیوا اور موت کا میزائل نہ بن جائے اور

اگر کبھی بیوی کے دستِ خیال میں بیلن کو خوش بختی سے دیکھ لیا تو پھر بیوی کے آس پاس، اطراف و اکناف کا علاقہ ممنوعہ PROHIBITED ہو جاتا ہے بلکہ بیوی کے چاروں طرف کرفیو نافذ رہتا ہے، شوہر اگر خوش فہمی سے خلاف ورزی کرے تو لازمی اور یقینی طور پر (. [illegible] [illegible]) کا نفاذ عمل میں آتا ہے اور پھر مفلس (مفلس نہیں) شوہر کے لیے کوئی اور چارہ (دکھانے کا نہیں) نہیں رہ جاتا۔

ٹی۔ وی اور بیوی کے فائدے چاہے جتنے کم زیادہ ہوں، مگر بیلن کے اختیارات اور استعمالات وسیع تر ہوتے ہیں، ذی شعور (ذی حس نہیں) بیوی اچھی طرح واقف ہوتی ہے کہ گھر میں اس کے (Fundamental rights) کیا ہیں اور بیلن کے قانونی اور غیر قانونی اختیارات، حیثیت اور بیلن کی لازمی خدمات کیا ہیں۔ ناتجربہ کار اور ناواقف کار (اکثر شہری ہوتے ہیں) بیوی اپنے بیلن سے غیر معقول کام لیتی ہے مثلاً۔ روٹی پکانے اور پیٹھ کھجانے وغیرہ وغیرہ لیکن تربیت یافتہ (جیسے شیو سینا) تجربہ کار اور واقف کار بیوی شوہر کا سر توڑنے، پھوٹنے اور اس کی گردن اکڑ جانے پر درد دور کرنے (ویسے بیوی کے سامنے شوہروں کی گردنیں کم ہی اکڑتی ہیں) کا نہایت معقول اور موزوں کام لیتی ہے۔

معصوم اور شریف (کم ہی ہوتی ہیں) بیوی سے اگر بیلن چھین لیا جائے (جیسا کہ سماج میں اکثر شہریوں کے بنیادی حقوق چھین لیے جاتے ہیں) تو پھر بیوی عدم تحفظ کا شکار ہو جاتی ہے (جیسے اقلیتیں ہیں) اور تعجب نہیں کہ وہ اپنے حق کیلئے عدالت (عالیہ) سے درخواست کرے کہ اُسے ایک عدد بیلن فراہم کر دے تاکہ وہ اپنے اور صرف اپنے شوہر کے شانہ بہ شانہ بلکہ سر بہ سر چل سکے۔ بے بس اور لاچار بیوی کرے تو کیا کرے کیونکہ آئے دن شوہر کے مظالم سہہ کر اس میں بغاوت (آپ جذبات بھی کہہ سکتے ہیں) کے جذبات (اگر ہوں تو) کا اُبھرنا ایک فطری امر ہے اور ممکن ہے کہ حکومت قانونی طور پر بیلن کو بیوی کے لیے لازمی قرار دے کیونکہ بہرحال (PROTECTION) کی ذمہ داری حکومت کی ہے (شوہر اس سے صریحاً بری ہو گئے ہیں)۔

ہم نے ایک نہیں کئی ایک مرتبہ ایک خوش حال (ظاہری) شوہر سے ان کی بے جا خوش حالی کا سربستہ راز پوچھا تو انہوں نے نہایت خوشی سے برجستہ جست لگا کر جواب دیا " دراصل جب کبھی میرے اور بیوی کے درمیان یک طرفہ لڑائی ہوتی ہے تو بیوی اگر مجھ پر بیلن دے مارتی ہے اور اس کا نشانہ غلط نہ ہو تو وہ خوش ہوتی ہے اور اگر بیوی کا نشانہ غلط ہو جائے تو میں خوش ہوتا ہوں اور اس طرح ہم دونوں خوش رہتے ہیں "۔

منظور وقار (گلبرگہ)

سامعین

سامعین سننے والوں کو کہتے ہیں۔ لیکن ہر سننے والا سامع نہیں کہلاتا۔ جو لوگ پڑوسیوں کی خفیہ باتیں دیوار سے کان لگا کر سنتے ہیں یا سینما ہال میں بیٹھ کر قادر خاں کے لکھے ہوئے دلچسپ ڈائیلاگ خود قادر خاں کی زبانی سماعت کرتے ہیں ، لوگ سامعین کے زمرے میں شامل نہیں ہوتے اول الذکر "سازشی" اور آخر الذکر "تماش بین" کہلاتے ہیں البتہ گلی محلوں سے لیکر کرون میں منعقد ہونے والے ادبی اجلاسوں تک البتہ سیاسی جلسوں سے لیکر نورانی محفلوں تک جو بھی لوگ جمع ہوتے ہیں وہ بلاشبہ سامعین کہلاتے ہیں۔ تاہم مختلف موقعوں اور محفلوں کے سامعین کی قسمیں حسب ذیل ہیں۔

مشاعروں کے سامعین :

مشاعروں میں شرکت کرنے والے سامعین شاعری سے زیادہ شاعروں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ انھیں شاعر کا کلام سنکر لطف نہیں آتا جو لطف شاعر کے حرکات و سکنات کو دیکھ کر مل جاتا ہے۔ چنانچہ شاعر جوں ہی کلام سنانے کے لئے اسٹیج پر نمودار ہوتا ہے سامعین کی بھیڑ میں مختلف قسم کی آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔ سامعین شعراء کی حرکات سکنات کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتے ہیں اور ان کے چہروں کے اتار چڑھاؤ پر بھی قہقہے بلند کرتے رہتے ہیں۔ وہ شاعر کی ہر حرکت پر نظر رکھتے ہیں اگر کسی چیز کو نظر انداز کرتے ہیں تو وہ چیز ہوگی شاعر کا کلام سامعین شاعر کے کلام سے کوئی مطلب نہیں ہوتا وہ اس انتظار میں لگے رہتے ہیں کہ شاعر سے کوئی لغزش ہو اور انھیں ہوٹنگ۔

سامعین کی پچھلی صفوں میں قہقہے اور دلچسپ جملے اُبل پڑتے ہیں یہاں تک کہ بعض نوجوان سامع اس قدر جذباتی ہو جاتے ہیں کہ اپنی جگہ کھڑے ہو کر عجیب و غریب آوازیں نکالنے لگتے ہیں۔ اس صورت میں بے چارہ ناظم مشاعرہ بار بار سامعین سے نظم و ضبط برقرار رکھنے کی اپیلیں کرنے لگتا ہے۔ اگر کوئی مشاعرہ اکتا دینے والا کلام سنانے کے لئے کمر بستہ ہو جاتا ہے تو پچھلی صف میں بیٹھے ہوئے نوجوان "بس کر... بس کر" بیٹھ جا بیٹھ جا" کے نعرے لگانے لگتے ہیں۔ اس پر بھی جب شاعر کلام سنانے پر مصر ہوتا ہے تب نوجوان کھڑے ہو کر تالے جو ٹنگے بیٹھتا ہے یا بیٹھا ما جیسے فقرے کسنے لگتے ہیں بے چارہ شاعر اپنا سا منہ لیکر مجبوراً بیٹھ جاتا ہے۔ ایسا نہیں کہ مشاعرہ گاہ میں سب چیخ و پکار کرنے والے سامعین ہوتے ہوں بلکہ مشاعرے میں چند سنجیدہ سامع بھی ہوتے ہیں جو عام طور پر اسٹیج کے بالکل قریب بیٹھتے ہیں اور شاعر

کا کلام دلچسپی سے سنتے ہیں "واہ واہ" "مکرر مکرر" کی آوازیں نکال کر گردن ہلا ہلا کر داد دیتے ہیں اور تقریباً تمام شعراء کو دل پر پتھر رکھ کر سنتے ہیں ان میں بعض صدر مشاعرہ (جو ملک کا معروف شاعر ہوتا ہے) کے شاگرد ہوتے ہیں یا مہمان خصوصی (جو شہر کا سب سے مالدار آدمی ہوتا ہے) یا میزبان کے چہیتے۔ سنجیدہ اور باذوق سامعین وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جنھوں نے مشاعرے کے انعقاد کے سلسلے میں مالی اور عملی تعاون دیا۔ یوں تو اکثر سامعین اشتہارات پڑھ کر ہی مشاعرے میں شریک ہوتے ہیں مگر سامعین کی ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جنھیں شعراء خود اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ مثلاً ہمارے شہر کے ممتاز شاعر علامہ پاگل پاکھنڈی جب بھی کسی مشاعرے میں کلام سنانے کے لئے مکان سے نکلتے ہیں اپنے ساتھ آٹھ دس سامع ضرور لے آتے ہیں یہ سامعین اسٹیج کے قریب بیٹھ کر علامہ کے کلام پر خوب داد دیتے ہیں "علامہ دانشیڈ" "علامہ دانشیڈ" کے نعرے لگاتے ہیں۔ علامہ کے ایک ایک شعر کو سن کر اچھل پڑتے ہیں بشرٹ کے بٹن کھول کر دانت باہر نکال کر ایسی زبردست داد دیتے ہیں کہ اسٹیج پر موجود دیگر شعراء علامہ کی شہرت پر ششدر رہ جاتے ہیں۔

ادبی اجلاسوں کے سامعین :

ادبی اجلاسوں کے سامع سراپا سنجیدہ ہوتے ہیں شکل و صورت سے انسان کم دانشور زیادہ محسوس ہوتے ہیں۔ ہر پانچ منٹ بعد ایک سگریٹ جلانا دن بھر پان کی جگالی کو جاری رکھنا۔ ادبی اجلاسوں میں شرکت کرنے والے سامعین کی پہچان ہوتی ہے ان کا مزاج ابالی ہوتا ہے غصہ تو ہمیشہ ان کی ناک پر ـــــ ہوتا ہے کسی سے کوئی بھول ہوئی کہ یہ بھڑک اٹھتے ہیں۔ ادبی اجلاسوں میں شریک ہونے والے وقت کی پابندی کرنا اپنی "انسلٹ" سمجھتے ہیں اگر ادبی اجلاس ۱۱ بجے شروع ہونے والا ہے تو یہ ۱۲ بجے جلسہ گاہ پہنچیں گے۔ فنکشن ہال میں داخل ہونے سے پہلے ادھر ادھر دیکھیں گے کہ کوئی انھیں "خوش آمدید" کہنے کے لئے دروازے پر موجود ہے یا نہیں۔ جب تک منتظم جلسہ ہال میں داخل ہونے کی درخواست نہ کریں گے یہ ہال میں قدم رنجہ نہیں فرمائیں گے۔ شعراء اور ادیبوں کی تخلیقات کو سن کر یہ لوگ خواہ مخواہ داد نہیں دیتے جب انھیں کسی کام کی چیز سننے کو ملے گی تبھی تھوڑی بہت داد سے نوازتے ہیں۔ ادبی اجلاسوں کے شرکا تخلیقات کی سماعت سننے کے ساتھ ساتھ ان میں موجود خامیوں اور کوتاہیوں کا سر اجلاس محاسبہ بھی کرتے ہیں (دراصل قلمکاروں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر ان کی بلبلاہٹ سے لطف اٹھاتے ہیں) اگر کسی ادبی اجلاس میں پچاس سامع شریک ہوں تو لوگ اس اجلاس کو کل ہند ادبی اجلاس کا نام دیتے ہیں۔

سیاسی جلسوں کے سامعین :

سیاسی جلسوں کے سامعین صرف سیاسی جلسوں ہی میں شرکت کرتے ہیں یہ حضرات لیڈروں کے وعدوں اور
لیڈروں
خوبصورت خوابوں سے خوش ہوتے ہیں
کی دھواں دار تقریروں کو سن کر تالیاں پیٹتے ہیں سیٹیاں بجاتے ہیں زندہ باد مردہ باد کے نعرے لگاتے ہیں اپنے ساتھ مونگ پھلی پاپڑ اور چھولے لاتے ہیں۔ دوران جلسہ تقریریں بھی سنتے ہیں مونگ پھلی پاپڑ اور چھولے سے شغل بھی فرماتے رہتے ہیں بیٹھنے کے لئے کرسیوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جگہ نہ ملنے کی صورت میں کوڑے کے ڈھیر پر بھی بیٹھ

جاتے ہیں - اینٹوں کی دیواروں پر مکانوں کی چھتوں پر درختوں کی شاخوں پر بلکہ جہاں بھی جگہ میسر آتی ہے وہیں بیٹھ جاتے ہیں ۔ سیاسی جلسوں میں شرکت کرنے والے سامعین کی ایک بڑی تعداد ٹہلتے کھڑے ہو کر سگریٹ بیڑی پیتے ہوئے بھی نظر آتی ہے ۔ یہ وہ سامعین ہیں جنھیں فرش پر بٹھانے کی لاکھ کوشش بے کار ہو جاتی ہے یہ کھڑے رہ کر ہی لیڈروں اور قائدین کی تقریریں سماعت کرتے ہیں اور بھرپور لطف اٹھاتے ہیں۔

نورانی محفلوں کے سامعین :

محفل وعظ میں شرکت کرنے والے دیندار کہلاتے ہیں ۔ یہ لوگ علماء کا وعظ بڑے اشتیاق سے سنتے ہیں۔ واعظ جب جذباتی ہو جاتے ہیں تو سامعین بھی جذباتی ہو کر نعرۂ تکبیر بلند کرنے لگتے ہیں ۔ واعظ روتے ہیں تو یہ بھی روتے ہیں واعظ ہنستا ہے تو یہ بھی ہنستے ہیں۔ محفل وعظ میں شرکت کرنے والے اکثر سامعین واعظ سے پند و نصیحتوں کے بجائے لطیفے سننے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں ۔ واعظ بھی موقع بے موقع وعظ کے دوران لطیفے سنا سنا کر محفل وعظ کو زعفران زار بناتے رہتے ہیں ۔

محفل سماع کے سامعین :

محفل سماع کے سامعین نہا دھو کر صاف کپڑے زیب تن کر کے آنکھوں میں سرمہ لگا کر جسم پر عطر کا چھڑکاؤ کر کے سماع میں شریک ہوتے ہیں ۔ قوالی کے ایک ایک بند پر جھومتے رہتے ہیں ۔ کوئی شعر بہت زیادہ پسند آتا ہے تو سامعین میں سے چند لوگ چیخ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور جھوم جھوم کر رقص کرنے لگتے ہیں ۔ اس وجد آمیز کیفیت کو دیکھ کر محفل میں موجود دیگر سامعین بھی ایستادہ ہو جاتے ہیں ۔

آل راؤنڈ سامعین :

آل راؤنڈ سامعین ہر محفل اور ہر جلسے میں برابر شریک ہوتے ہیں ۔ سیاسی جلسے چاہے جنتا دل کے ہوں یا جنتا پارٹی کے کانگریس آئی کے ہوں یا کمیونسٹ پارٹی کے آل راؤنڈ سامعین اسٹیج کے قریب ضرور نظر آئیں گے ۔ متضاد عقائد کے اجتماعات میں ضرور شرکت کرتے ہیں ۔ ویڈیو تھیٹروں، سینما گھروں اور ناٹک کمپنیوں میں بھی آل راؤنڈر سامعین موجود رہتے ہیں ۔

آل راؤنڈ سامعین کا کام ـــــــــ سماعت کرنا اور تماشہ دیکھنا ہوتا ہے چاہے محفل یا جلسے میں اچھی بات کہی جا رہی ہو یا بری بات تماشہ اخلاقی ہو یا غیر اخلاقی ان باتوں سے آل راؤنڈ سامعین کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ۔ ••

قلمی معاونین سے التماس ہے کہ تخلیقات پر پوسٹل ایڈریس ضرور لکھیں ۔

خالد عبدالسمیع اثر
(ریاض۔ سعودی عرب)

"میں کسی سے خفا نہیں ہوتا"

(ایک طرحی مصرع پر)

اُن سے وعدہ وفا نہیں ہوتا
کیا کسی کا بھلا نہیں ہوتا

چشمِ نازک کو یوں نہ نم کیجے
"میں کسی سے خفا نہیں ہوتا"

زیرِ لب آکے رُک گئے ارماں
ہم سے مطلب ادا نہیں ہوتا

زندگی پُرسکون ہو کیسے؟
عیش سے غم جُدا نہیں ہوتا

اُن کا جانا بھی ایک قیامت ہے
وہ نہ جاتے تو کیا نہیں ہوتا

روٹھ کر کیوں ہمیں ستاتے ہو
پیار و اُلفت میں کیا نہیں ہوتا

کس لیے اب یہاں چراغاں ہیں
دِل تو جل کر دِیا نہیں ہوتا

تم نے سجدے تو کرلیے ہیں اثر
حق تو ایسے ادا نہیں ہوتا

غزل

اقبال ہاشمی
حیدرآباد

مطلع غزل کا عرض ہے دِل کو سنبھالنا
مطلب تمہارے ہاتھ ہے کچھ بھی نکالنا

چہرہ حسین ہے تو نظر بھر کے دیکھ لو
اچھا نہیں ہے اس پہ نظر پھر سے ڈالنا

حیران میرے فن پہ ہیں بیکار قرض خواہ
لیڈر سے میں نے سیکھا ہے فردا پہ ٹالنا

تہذیبِ نَو کے بارے میں اقبال کہہ چکے
گندے ہیں سارے انڈے انہیں کیا اُبالنا

اپنی ہوا بگڑتی ہوئی دیکھنا جہاں
اپنے حریف کی وہیں پگڑی اُچھالنا

عزت اگر عزیز ہے اقبال ہاشمی
بہ حلقہ کی داڑھیوں میں نہ تنکے نکالنا

شگوفہ
فاطمہ تاج
(حیدرآباد)

ہم اور ہمارے وہ

یہ جو ہمارے "وہ" ہیں نا! بڑے "وہ" ہیں۔ ان کو کب غصہ آجائے گا کب یہ سنجیدہ ہوں گے۔ یہ کب خوش ہوں گے اور کب رنجیدہ ہو جائیں گے اس کا اندازہ ہمیں آج تک نہ ہو سکا ہم نے کئی بار ان کے مزاج کے بھنور میں غوطہ لگاتے کئی بار ڈوبتے اور ابھرتے رہے مگر ان کی ذات کی گہرائی تک ہم نہیں پہنچ سکے۔ یہ اکثر وقتی طور پر جذبات کی لہر سے گردشِ دوراں کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں تو کبھی حوصلے کے ساحل پر منجمد ہو جاتے ہیں۔ ان کے ڈوبنے ابھرنے سے ہوتا تو کچھ نہیں لیکن ہم احساسِ کمتری کے آبشاروں میں بہہ نکلتے ہیں۔ ہمیں شرف حاصل ہے ان کے رفیقِ حیات ہونے کا، مگر ان کی حیات کا اندازہ وڑنے والا سا ہے۔ ہم اپنی شکستہ پائی کے باوجود ان کے ساتھ دوڑ لگاتے رہتے ہیں ہمارے "زخمِ پا" کبھی مندمل نہیں ہو پاتے "وہ" مشرق کی جانب چلتے چلتے اچانک رخ بدل کر مغرب کی طرف دوڑنے لگتے ہیں۔ جیسے سہ پہر کے بعد آفتاب جانب مغرب تیز گام ہو جاتا ہے دیکھیے ذرا ان کی عادتیں . . جو ہمارے لیے سوہانِ روح بن جاتی ہیں اور کبھی دودھ اور شہد کی نہروں والی جنت میں سکونت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ یہ عام آدمیوں کی طرح ہماری تعریف نہیں کرتے یہ ہمیں دنیا سے ہی نہیں خود اپنی بھی نظر سے چھپا رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارا کوئی بھی پکوان ان کے پسند کے قابل نہیں ہوتا جب کبھی ایسا اتفاق ہو تو ہم ان کی طرف بڑی امید سے دیکھتے ہیں کہ شاید پہلے "لقمۂ لذیذ" پر آج تو داد مل جائے گی مگر وائے ناکامی! یہ چپ چاپ پیٹ بھرنے کے بعد دسترخوان سے اٹھ جاتے ہیں۔ اگر کبھی کسی "ڈش" میں مرچ زیادہ یا میٹھے میں شکر زیادہ ہو تو پہلے ان کی بھنویں چڑھ جاتی ہیں۔ بعد میں یوں اظہار ہوتا ہے۔ ہمیشہ ایسا پکوان تو نہیں ہوتا تھا آپ کیا بات ہو گئی؟ لیجیے صاحب ہم نے چور پکڑ لیا۔ ہم پر ہونے والی تنقید میں ہماری تعریف ہم نے ڈھونڈ لی "پہلے نہیں ہوتا تھا" کا مطلب یہی ہوا نا! کہ ہم اچھا پکوان کرتے ہیں۔

مگر زبان سے اعتراف کرنے میں وہ ہمیشہ ہی پس و پیش کرتے رہے ہیں کہ کہیں ہمارا دماغ خراب نہ ہو جائے۔

"وہ" ہمارے لیے بہترین ساڑیاں لاتے ہیں خوب سے خوب تر کا انتخاب ان کی نظر میں ہمیشہ ہی رہتا ہے۔ ہمارے پہننے کے بعد بے چارے اپنی لائی ہوئی ساڑیوں کے بارے میں تعریفوں کے پل باندھنے میں لگ جاتے ہیں اور ہمارے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہتے وہ نہیں چاہتے کہ ہم ان کی نظر کا شکار ہو جائیں اور دردِ شکم سے تڑپنے لگیں۔ بس ایک ہی گہری نظر میں وہ ہمارے سراپے کا جائزہ لے کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ دوبارہ کی زحمت وہ کبھی نہیں گوارا کرتے۔ ہاں! اگر ہم سے کوئی غلطی سرزد ہو تو اچھی طرح خبر لیتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم بار بار ایک ہی ساڑی پہن کر کہیں جانے اور آنے لگیں تو کہتے ہیں۔ کیا تمہارے پاس ایک

ہی ساڑی ہے؟ کیا الماریاں ہراج کرنے کا ارادہ ہے" وغیرہ وغیرہ ....

وہ ہمارے لیے ساڑیوں کا انتخاب بہت ہی محبت سے کرتے ہیں ۔ انتہائی خوش رنگ بڑے ہی جان دار پرنٹ ہمارے لیے خرید لاتے ہیں ۔

کبھی کبھی اگر ہم اپنی پسند سے کوئی بالکل سادہ ساڑی خرید لیں اور پہن کر کہیں جانے لگیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ کیا یہ ساڑی نانی ماں کی ہے ؟ یا دادی ماں کی ساڑی تم نے تبرکاً پہن لی ہے "؟

ہم منہ پھلائے ہوئے کپڑے بدل لیتے ہیں اور دل میں سوچتے ہیں کہ ہم خود ہمارے نہیں رہے ......

چلیے اب ہم چلتے ہیں' ہمارے وہ ہمارے ساتھ شاپنگ کے لیے تیار کھڑے ہیں اور ہم ان کی لائی ہوئی جھم جھماتی شوخ رنگ ساڑی پہن کر جا رہے ہیں ......

●●

اسمٰعیل ظریفؔ
(حیدرآباد)

رباعیات

کوچے سے حسینوں کے گزرنا سیکھو
الٹے سیدھے انداز سے مرنا سیکھو
غیروں کی ہری گھاس کو تکنے والو
رہ کر حدِ مخصوص میں چرنا سیکھو

○

پتلون میں بشرٹ میں رہا کرتے ہیں
کترائی ہوئی چال چلا کرتے ہیں
فیشن کی ہوا ایسی چلی ہے اکثر
تقلید بھتیجے کی چچا کرتے ہیں

○

بے لائٹ سائیکلیں چلا کر دیکھو
بے سائیڈ ڈبل سواری جا کر دیکھو
دن میں وہاں تارے نظر آجاتے ہیں
اک روز پولس چوکی تو جا کر دیکھو

○

پھرتی ہے یہ کہتی تری نانی ساقی
ہے میرا نواسہ میاں جانی ساقی
پینے پہ بھی چار شیشے آیا نہیں کیف
میخانے میں کیا بکتا ہے پانی ساقی

○

عزیز ابرار
(حیدرآباد)

حیدرآباد میں
اردو طنز و مزاح کا ارتقاء

یہ مضمون عزیز ابرار کے مقالے "شگوفہ کی ادبی خدمات" کا پہلا باب ہے۔ یونیورسٹی آف حیدرآباد نے انھیں اس مقالے پر ماسٹر آف فلاسفی کی ڈگری عطا کی ہے۔

ہنسی انسان کا فطری عمل ہے۔ جس میں اس کے حواس، حسیات اور شعور مصروف بہ کار ہوتے ہیں۔ ورنہ انسان اور جانور دونوں کی حیاتیاتی جبلت ہے۔ قبل تمدن کے دور میں ہنسی کی بنیاد نفرت، انتقام، تشدد، احساس برتری، فتح یا تضحیک پر قائم تھی۔ جو انسان کی وحشیانہ آوازوں پر محیط ہوتی تھی۔ غیر مہذب سماج میں ہنسی ایک عجیب شکل میں سامنے آئی۔ مثلاً روم کے باشندے بھوکے شیر کے روبرو زندہ آدمی کو ڈھکیل کر خوش ہوتے تھے۔ آج کے ہنسی کے محرکات مختلف ہیں۔ آج زیادہ تر سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی، تہذیبی، تعلیمی، ادبی اور ذہنی ناہمواریوں پر توجہ ہے۔ نیز انسان کی دیگر کمزوریاں بھی ہنسی یا تضحیک کا باعث ہوتی ہیں۔ آج دنیا میں ہر سطح پر ان گنت مسائل موجود ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ دوسروں پر ہنسنے کا رواج عام ہے۔ بعض افراد اور بعض قومیں خود پر بھی ہنسنے کا ظرف رکھتی ہیں۔ اس میں خامیوں سے نجات اور ترقی کی سمت پیش قدمی کے رجحان کا اظہار ہوتا ہے۔ ادیب اور شاعر اپنے آپ پر ہنسنا خوب جانتے ہیں۔ بلاشبہ ہنسی اور مزاح میں گہرا تعلق ہے۔ عموماً ہنسی غیر فنکارانہ اور مزاح فنکارانہ اظہار پر مبنی ہوتا ہے۔ شوخی، شرارت، پھبتی، ظرافت، بذلہ سنجی، تضحیک، ہجو، ضلع جگت، ہزل، لطیفہ اور طنز و مزاح کی مختلف صورتیں ہیں۔ جدید دور کی ہنسی، مزاح اور طنز میں مقصدیت اہم ہے۔ اکثر اوقات ہنسی دکھ میں ہمدرد ساتھی کا رول بھی ادا کرتی ہے۔ مہذب سوسائٹی میں ہلکی سی مسکراہٹ پر بھی قناعت کرلی جاتی ہے۔ ہنسی اور بے تکلف قہقہے نوجوانوں اور خوش فکروں میں مروج ہیں۔

طنز و مزاح دو علٰحدہ جذبے ہونے کے باوجود باہم مربوط ہیں۔ مزاح کی اصطلاح میں طنز بھی شامل ہے۔ طنز میں ظرافت اور مزاح میں مسرت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ فرد، سماج، اقتدار اور قوانین وغیرہ کی کمزوریاں، حماقتوں اور بے اعتدالیوں کے [illegible] کے لئے طنز استعمال کیا جاتا ہے۔ طنز کی قدر و قیمت کے تعین کے لئے اس کی صداقت اور بے تعصبی کی بازیافت ضروری ہے۔ ذرا سی لغزش نہ صرف اس کے مقصد پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔ بلکہ طنز نگار خود بھی شرمندگی کا شکار ہو جاتا ہے

ادب، اخلاق، شائستگی، تہذیب، نرمی، تنقید، مزاح اور اشاریت طنز کے حربے ہیں۔ مزاح کے بغیر طنز گالی کا درجہ رکھتا ہے۔

طنز و مزاح کے عالمی پس منظر میں انگریزی مزاحیہ ادب اہمیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی کتاب "اردو ادب میں طنز و مزاح" میں انگریزی ادب کے مزاحیہ تخلیق کاروں کی نشاندہی کی ہے۔ جن میں چاسر، شکسپیر، ڈرائیڈن، پیپس، سٹیل، پوپ، سوفٹ، گولڈ اسمتھ، فیلڈنگ، سٹرن، ایڈیسن، اسٹیل، چارلس لیمب، جین آسٹن، چارلس ڈکنس، تھیکرے، لی کاک، کالی ورلے، اسکائر، سوزن برن، ایڈورڈ لیئر، لیوس کارول، گلبرٹ، جیکب، جیروم، سٹیفن لیکاک، وڈ ہاؤس اور مارک ٹوین قابل ذکر ہیں۔ اردو ادب پر انگریزی ادب کے علاوہ فارسی ادب کے اثرات زیادہ ملتے ہیں۔ فارسی ادب میں طنز و مزاح کے مشہور تخلیق کاروں کے نام یہ ہیں رودکی، فردوسی، انوری، سوزنی، کمال اصفہانی، سلمان ساوجی، عمر خیام، سعدی شیرازی، امیر خسرو، حافظ شیرازی، عبید زاکانی، ابو اسحاق اطعمہ، نظام الدین محمود، قاری یزدانی البسہ، مرزا علی اکبر، صادق ہدایت، مسعود فرزاد، فریدوں توکلی، ابوالقاسم حالت اور مہدی سہیلی وغیرہ۔

اردو ادب میں طنز و مزاح کا آغاز اٹھارویں صدی میں ہوا۔ جعفر زٹلی اردو طنز و مزاح کا امام قرار پاتا ہے اس کا اصلی نام مرزا محمد جعفر تھا۔ اس کی سن وفات ۱۱۲۵ھ م ۱۷۱۳ء ہے۔ جعفر نے اپنی شاعری میں اردو اور فارسی تراکیب کی آمیزش سے ایک مضحکہ خیز اسلوب ایجاد کیا۔ اس نے اپنے عہد کے زوال پذیر معاشرے کی خرابیوں کا بھدگی سے جائزہ لیا۔ اس کا کلام لسانی تہذیبی اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ راست گوئی اور گہرا طنز و مزاح اس کی خصوصیات ہیں۔ اگرچہ پھکڑپن اور ابتذال بھی نمایاں طور پر موجود ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی "تاریخ ادب اردو" میں لکھتے ہیں کہ اس نے نظم اور نثر دونوں میں اپنے جوہر کا کمال دکھایا ہے۔ تیر سے پہلے دکنی ادب میں نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" میں طنز پایا جاتا ہے۔ پھر اردو شاعری کا باقاعدہ ابتدائی دور شروع ہوا۔ جس میں طنز و مزاح کے ایک اسلوب "ایہام گوئی" کو برتا گیا۔ ایہام گو شعراء میں تیر کے علاوہ ناجی اور آبرو کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ ایہام گوئی نے اردو زبان کے امکانات اور اردو شاعری سے عوام کی دلچسپی میں مثبت رول ادا کیا۔ اس رجحان کے بعد سودا کی ہجو "قصیدۂ تضحیکِ روزگار" اور حاتم کا "نزپلہ" "نسخہ مفرح الضحکِ معتدل" جیسی تخلیقات نے اردو طنز و مزاح کی آبیاری کی۔ نظیر اکبرآبادی کی بذلہ سنجی بھی اپنی جگہ اہم ہے عہد متوسط میں ہجو کے لئے میر حسن، بقا اکبرآبادی، انشاء، مصحفی، قائم چاند پوری، جرأت اور رنگین وغیرہ اہم نام ہیں اردو شعراء کے ادبی معرکے طنز و مزاح کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان میں شاہ مبارک اور مرزا ظہیر، سودا اور ضاحک، میر اور خاکسار، مصحفی اور انشاء، ناسخ اور آتش، ذوق اور غالب کے معرکے قابل ذکر ہیں۔

دبستان لکھنؤ سے اردو طنز و مزاح میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ جس میں ریختی کو فروغ ہوا۔ انشاء اور رنگین اس کے موجدوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اردو کی بعض داستانوں میں ظرافت کے نمونے ملتے ہیں۔ ان میں "فسانۂ عجائب" "داستان امیر حمزہ" اور "داستان خیال" وغیرہ شامل ہیں۔ اس عہد کے بعد غالب کے خطوط اور غالب کے بعض اشعار طنز و مزاح کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ نذیر احمد اور سرسید کی تحریریں جزوی طور پر طنز و مزاح کی حامل ہیں۔

اردو طنز و مزاح کے لئے "اودھ پنچ" کا دور بے حد اہم ہے۔ اودھ پنچ سے پہلے مولوی محمد باقر کا

"دلی اردو اخبار" ۱۸۳۶ء میں انگریزوں پر طنز ہے۔ "لندن پنچ" کی تقلید میں کچھ اردو اخبارات جاری ہوگئے۔ مثلاً "مدراس پنچ" ۱۸۵۹ء میں اور "روہیلکھنڈ پنچ" ۱۸۷۶ء میں۔ لیکن ان اخباروں کی عمر کم رہی۔ منشی سجاد حسین نے ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے مزاحیہ اخبار "اودھ پنچ" جاری کیا۔ جو اردو صحافت میں طنز و مزاح کی بنیاد تسلیم کیا گیا۔ اس دور کے مزاح نگاروں میں منشی سجاد حسین، اکبر الہ آبادی، سید محمد آزاد، پنڈت رتن ناتھ سرشار، سید عبدالغفور شہباز، منشی جوالا پرشاد برق، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، پنڈت تربھون ناتھ ہجر اور احمد علی شوق وغیرہ ہیں۔ جنھوں نے اپنے عصر کے معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی مسائل پیش کئے۔ اودھ پنچ نے اظہار کے لئے کارٹون بھی ایجاد کئے۔ اودھ پنچ دراصل ایک تحریک بن کر ابھرا۔ اودھ پنچ ۱۹۱۲ء میں بند ہوگیا۔ اس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کئی مزاحیہ اخبار جاری کئے گئے مثلاً بنگال پنچ، انڈین پنچ، لاہور پنچ، جالندھر پنچ، آگرہ پنچ، پنجاب پنچ، دکن پنچ، راجپوتانہ پنچ، لکھنؤ پنچ، سرپنچ، ہریانہ پنچ، کیھٹرو پنچ، کرناٹک پنچ، فتح گڑھ پنچ، گجرات پنچ، برار پنچ، ظریف ہند، طلسم حیرت، پرکالۂ آتش، جعفر زٹلی، طوفان، چلتا پرزہ، پاشے خان، ظریف، شریر، شیخ چلی، بیربر، ظریف الہند، ملا دوپیازہ، تیس مار خان، ہزار داستان، طوطی ہند، مذاق، اولڈ بوائے، ریاض الاخبار، تار برقی، صلح کل، گل کدۂ ریاض، فتنہ اور عطر فتنہ وغیرہ۔ اودھ پنچ کے بعد مہدی افادی، سلطان حیدر جوش، منشی پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، علی عباس حسینی، قاضی عبدالغفار، ملا رموزی، خواجہ حسن نظامی، شیخ محمد اقبال، ظفر علی خاں، عبدالماجد دریابادی، ابوالکلام آزاد، امتیاز علی تاج، فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی اور عبدالعزیز فلک پیما جیسے لکھنے والے ملتے ہیں۔ اس دور کے بعد رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شفیق الرحمن، ابراہیم جلیس، غلام احمد فرقت کاکوروی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سحر، رشید جہاں، کنہیا لال کپور اور فکر تونسوی وغیرہ اہم نام ہیں۔ مزاحیہ ادب کے آخری دور میں علی صائب میاں، مرزا شکور بیگ، سلیمان خطیب، دلاور فگار، راجہ مہدی علی خاں، مجید لاہوری، ظریف لکھنوی، واقف مرادآبادی، رضا نقوی واہی، مظہر جعفری، بھارت چند کھنہ، احمد جمال پاشا، یوسف ناظم، عطاء الحق قاسمی، مجتبیٰ حسین، پرویز یداللہ مہدی، نریندر لوتھر، شفیقہ فرحت، ڈاکٹر رشید موسوی اور سلمیٰ صدیقی وغیرہ اپنی جگہ پاتے ہیں۔

اودھ پنچ کے بعد اردو صحافت میں طنز و مزاح کا رواج ہوا۔ کئی اردو اخبارات بشمول ہمدرد، مدینہ، انقلاب، خلافت، زمیندار، اجمل، سچ، صدق، شیرازہ، امروز، نمک دان، جنگ، نوائے وقت، میزان، رہبر دکن، پیام، وقت، بلٹز، قومی آواز، ملاپ، اور سیاست وغیرہ میں مزاحیہ کالم لکھے جانے لگے۔ مزاحیہ کالم کے بانی مولانا محمد علی جوہر ہیں۔ جنھوں نے "ہمدرد" میں یہ سلسلہ شروع کیا۔ مولانا محمد علی جوہر، عبدالمجید سالک، عبدالماجد دریابادی، ظفر علی خاں، چراغ حسن حسرت، مجید لاہوری، قاضی عبدالغفار، فکر تونسوی، شاہد صدیقی، انتظار حسین، احمد ندیم قاسمی، ابراہیم جلیس، یوسف ناظم، ابن انشاء اور نصر اللہ خان نے مزاحیہ کالم نگاری کو فروغ دیا۔ زندہ دلان حیدرآباد کے ترجمان رسالہ شگوفہ کا اجراء عمل میں آیا۔ علی گڑھ سے "ہبی پنچ" جاری ہوا۔ لیکن اس کے صرف چند شمارے شائع ہوئے۔

حیدرآباد میں طنز و ظرافت کے دور کا آغاز انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے درمیانی وقفہ پر محیط ہے۔ بعض دانشوروں نے اس کا قطعی نقطۂ آغاز متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر کی زیر نگرانی لکھے گئے مقالہ "حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشو و نما" میں مقالہ نگار انیسہ سلطانہ نے سید عبدالکریم نور کو حیدرآباد کے سب سے پہلے مزاحیہ شاعر کی حیثیت پیش کیا ہے اور مرزا فرحت اللہ بیگ کو پہلا مزاحیہ نثر نگار قرار دیا ہے۔ نور کا سنہ پیدائش ۱۲۹۷ھ ہے۔ جو عیسوی

تقویم کے مطابق ۱۸۷۱ء کے کہیں قریب قرار پاتا ہے۔ حیدرآباد میں مزاحیہ ہفتہ وار اخبار "دکن پنچ" ۲۸ فروری ۱۸۸۷ء کو جاری ہوا۔ ۱۸۹۲ء میں دکن پنچ کا نام بدل کر "مشیر دکن" رکھا گیا۔ اس کے مدیر پنڈت کشن راؤ تھے اور قلم کاروں میں حکیم شمس اللہ قادری، مرتضیٰ، عبدالقادر اور عزیز جنگ وغیرہ اہم ہیں۔ مشیر دکن کے طنزیہ و مزاحیہ عنوانات میں "آزادی و بے پردگی کے لچھن" "پولیٹیکل گھن گھور گھٹا" "شفا خانہ افضل گنج" "سررشتۂ تعلیمات" "انجینئرنگ اسکول کی افسوسناک حالت" اور "اعلیٰ عہدیداروں کا الاؤنس" وغیرہ شامل ہیں۔

حیدرآباد میں طنز و مزاح پر کوئی قابلِ اعتنا تحقیقی مضمون نہیں ہے۔ دستیاب مضامین کی نوعیت جداگانہ ہے جیسے ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال [1]، شیم نصرتی [2]، ڈاکٹر طیب انصاری [3] اور ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید [4] وغیرہ کے مضامین میں حیدرآباد کے پہلے مزاح نگار کا قطعی تعین نہیں ہے علاوہ ازیں مذکورہ مضامین تحقیقی ہونے کی بجائے تنقیدی بصیرت کے حامل ہیں۔

انیسویں صدی کے آخری دہوں میں پیدا ہونے والے تین اہم مزاح نگاروں میں سید عبدالکریم نور، مرزا فرحت اللہ بیگ اور عظمت اللہ خاں شامل ہیں۔ نور شاعر تھے اور باقی دو مزاح نگار نثر سے تعلق رکھتے ہیں۔

نور حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک پُرگو اور مزاحیہ شاعر تھے۔ ان میں اچھی شاعرانہ صلاحیتیں تھیں۔ توفیق حیدرآبادی سے تلمذ نے ان کے فن میں نکھار پیدا کیا۔ پروفیسر سید اشرف شمسی اور نواب بہادر یار جنگ کی دوستی نے مزید حسن بخشا۔ ان کے کلام میں غزلیات، نظمیں، رباعیات، قطعات، ظریفیاں، اور سہرے وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ غزلوں کا مجموعہ "ضیائے نور" شائع ہوا۔ نظموں میں "غافل" "استقلال" "تلاطم" "موسم گرما" "مسدس قومی" "شہیدانِ وفا اور "گمشدہ لڑکی" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی شعری حیثیت کے علاوہ صحت مند طنز و مزاح ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلی میں ۱۸۸۳ء یا ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد آئے۔ ان کی مشہور تصنیف "پھول والوں کی سیر" ہے۔ دیگر مزاحیہ مضامین "دلی کا یادگار مشاعرہ" "وحیدالدین سلیم" "عظمت اللہ" "نذیر احمد کی کہانی" "خواجہ بدرالدین عیش" "ایک وصیت کی تکمیل" اور "ایک نواب صاحب کی ڈائری" وغیرہ مشہور ہیں۔ ان کے پاس تاریخی، سماجی اور سیاسی شعور ہے وہ خالص مزاح لکھتے ہیں۔ کہیں کہیں طنز بھی جزوی حیثیت پاتا ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ عظیم بیگ چغتائی، خواجہ حسن نظامی اور ابوالکلام آزاد وغیرہ ان کے ہم عصر تھے۔

حیدرآباد کے مزاح نگاروں میں عظمت اللہ خاں کا ذکر ہوتا ہے۔ فرحت اللہ بیگ اور عظمت اللہ خاں میں بعض باتیں مشترک ہیں۔ دونوں کی پیدائش انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ہوئی۔ دونوں ہم عصر مزاح نگار ہیں۔ نیز دونوں کا مقام ولادت دہلی اور مقام ملازمت حیدرآباد ہے۔ عظمت اللہ خاں ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے۔ وہ بنیادی طور پر مزاح نگار نہیں ہیں۔ لیکن "مضامین عظمت" میں شامل دس مضامین مزاحیہ ہیں۔ ان کے علاوہ دو ڈرامے مزاح میں جگہ

---

[1] ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال: آندھرا پردیش میں اردو طنز و مزاح کے بائیس سال، مشمولہ مبصر (۵) از ایچ ای ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ۔

[2] شیم نصرتی: نور۔ حیدرآباد کے ایک زندہ دل شاعر، شگوفہ، جولائی۔ اگست ۱۹۷۲ء

[3] ڈاکٹر طیب انصاری: حیدرآباد کے مزاح نگار، شگوفہ، جنوری ۱۹۷۹ء

[4] ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید: حیدرآباد میں طنز و مزاح آزادی کے بعد، شگوفہ، جنوری ۱۹۸۸ء

پاتے ہیں۔ طنزیہ مضمون "کشش صنف سخن کیا ہے" ان کے فن کی بہتر نمائندگی کرتا ہے۔ مضمون "گرفتہ یا خستانہ" میں مزاح فلسفیانہ رنگ میں ہے۔ "انوائی کھٹوائی" میں سنجیدگی بھی شامل ہو گئی ہے۔ تحریر یں لطیف مزاح سے مزین ہیں۔ اسلوب کی تشکیل میں بیرونی زبانوں بالخصوص انگریزی سے مدد لی گئی ہے۔

پھر جامعہ عثمانیہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں باقاعدہ تعلیم کا آغاز ۷/ اگست ۱۹۱۹ء سے ہوا۔ جامعہ کا ایک اہم کارنامہ اس کے تخلیق کار ہیں۔ جلال الدین اشک جامعہ کے مزاح نگاروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اشک نے ۱۹۲۵ء میں بی اے کی تکمیل کی۔ ۱۹۲۷ء میں ایل ایل بی کیا۔ انھوں نے نظم و نثر میں تخلیقات پیش کی ہیں ان کے جملہ تین مجموعے ہیں۔ ان میں "شیطان کا انتقام" نثری مجموعہ "سلک گوہرین" منظوم ڈرامہ اور "گرگٹوں کا شہر" شعری مجموعہ ہے۔ "شیطان کا انتقام" میں اشک نے شاعری، افسانہ نگاری اور صحافت پر شدید طنز کیا ہے۔ ان کی تخلیقات میں شعور کی پختگی اور طنز و مزاح کی گہرائی کا احساس ہوتا ہے۔

آزادی سے پہلے حیدرآباد میں شاہی حکومت تھی۔ اس عہد کے مزاحیہ ادب میں اقتدار اور سیاست پر طنز کی نشاندہی مشکل ہے۔ سماجی موضوعات میں بھی طنز کم ہے۔ اس کی وجہ شاید حیدرآباد کی روایتی تہذیب ہو۔ مزاح زیادہ فروغ پاتا رہا۔ لیکن بیسویں صدی کے اوائل میں حیدرآبادی مزاح نگاروں نے شمالی ہندستان میں رونما ہونے والی سیاسی، سماجی، ثقافتی علمی اور ادبی تبدیلیوں کے اثرات قبول کئے۔ چنانچہ بیشتر مزاح نگاروں نے طنز اور مزاح دونوں میں دلچسپی لی۔ اس دور کے مزاح نگاروں میں تمکین کاظمی، عصمت اللہ بیگ، ناکارہ، مرزا شکور بیگ اور نذیر دہقانی ہیں۔

تمکین کاظمی کی پیدائش ۲۷/ نومبر ۱۹۰۲ء کو حیدرآباد میں ہوئی۔ انھوں نے اپنے نام کے علاوہ فرضی نام بخاری، آوارہ[1] اور فلک نما وغیرہ استعمال کئے۔ وہ بنیادی طور پر سنجیدہ نثر نگار ہیں۔ انھوں نے مزاحیہ تحریریں بھی لکھی ہیں۔ ان کا پہلا مزاحیہ مضمون

---

[1] تمکین کاظمی اپنی کتاب "غنچۂ تبسم" کے صفحہ (۵) پر لکھتے ہیں کہ اس کتاب کے اکثر مضامین ان کے نام سے شائع ہوئے۔ اور بعض فرضی ناموں بخاری، آوارہ اور فلک نما وغیرہ کے ساتھ چھپتے ہیں۔ نیز صفحہ (۶) پر اپنی زبان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنے مضامین میں دکنی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ کئی دانشوروں نے آوارہ کا شمار حیدرآباد کے اولین مزاح نگاروں میں کیا ہے۔ تمکین کاظمی کے بیان کے مطابق وہ خود آوارہ بھی ہیں۔ شاید اس لئے انیس سلطانہ نے اپنے دوسرے باب "حیدرآباد میں طنز و مزاح ۱۹۵۰ء سے پہلے" میں آوارہ کو شامل نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر طیب انصاری نے اپنے مضمون "حیدرآباد کے مزاح نگار" مشمولہ "شگوفہ" جنوری ۱۹۷۱ء کے صفحہ (۱۱۵) پر بتایا ہے کہ "تبے پرکی" اڑانے والا آوارہ بلگرامی ہے۔ معاشرتی ماحول کی عکاسی لکھنوی زبان میں کرتا ہے۔ لکھنوی زبان، روزمرہ کے محاورے اس کی تحریر کی جان ہیں۔ اس دور کے مزاح نگاروں میں عصمت اللہ بیگ، مرزا فرحت اللہ بیگ، اور شیخ الدین ناکارہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر رحمت یوسف زئی، ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال، پرویز یداللہ مہدی، رشید الدین اور مظہر مجاز کے مطابق آوارہ کا پورا نام آل عبا قادری آوارہ تھا۔ وہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھے۔ ان کی مزاحیہ کتاب کا نام "تبے پرکی" ہے اور وہ تمکین کاظمی کے فرضی نام آوارہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ خواجہ عبدالغفور نے اپنی کتاب "طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" کے صفحہ (۲۳۸) پر سید آل عبا آوارہ مارہروی اور آوارہ حیدرآبادی کا دو مختلف مزاح نگاروں کی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔ خواجہ صاحب کے مطابق سید آل عبا آوارہ مارہروی کی تصانیف میں "تبے پرکی" "اپنی موج میں" "اسرار ہند" اور "سفاک دلہن" شامل ہیں جبکہ آوارہ حیدرآبادی کی ادبی زندگی کا آغاز جامعہ عثمانیہ سے ہوا۔

"فن مریدی" رسالۂ "نظر" لکھنؤ جولائی ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ مزاحیہ مجموعہ "غنچۂ تبسم" میں انیس مضامین ہیں۔ تمکین سرمست کاظمی کی تحریروں میں اصلاحی رجحان ہے۔ ان کے ہاں طنز و مزاح میں توازن ہے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ بھوپال میں پیدا ہوئے۔ چچا زاد بھائی فرحت اللہ بیگ کی طرح حکومت حیدرآباد کے ملازم ہوئے۔ عصمت اللہ بیگ نے شاعری اور نثر نگاری دونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی مزاحیہ کتابوں میں "دادا ابا بجھکڑ" "مہاجر بیربل" "چھلی خان" "گدھے کی عقلمندی" "ایوب کی کہانیاں" "انوار تبسم" اور "کاک ٹیل" وغیرہ شامل ہیں۔ جن میں "کاک ٹیل" اور "انوار تبسم" مزاحیہ کلام کے مجموعے ہیں۔ "سوریا چیتا" "زندہ بدمست" "مردہ" "جھنکار" "حکیم محمد علی خان جوہر" "ملاجی کا مکتب" "قاضی کی کارگذاری" اور "حکیم جی کا مطب" ان کے اچھے نثر پارے ہیں۔ "گڈے اور گڑیا کی شادی" "بڑھا دولہا" "ہڈیاں میری" "ووٹ اور نوٹ" "یورپ کا بچھوا" "بھارت کا شکر چارہ" اور "نوکری کا کانسٹی ٹیوشن" ان کی اہم نظمیں ہیں۔ عصمت اللہ بیگ نے طنز و مزاح کے ذریعہ قومی اصلاح کا کام کیا ہے۔ ان کے اسلوب میں سادگی ہے۔

محمد شفیع الدین ناکارہ کا عوامی شہرت کا درجہ آوارہ کے بعد ہے۔ ابتدائی تحریریں سنجیدہ ہیں اور ان کے بعد مزاحیہ تحریریں ملتی ہیں۔ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "صمدانی" ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ اسی میں جملہ گیارہ مضامین ہیں۔ ناکارہ کا سماجی شعور پختہ ہے۔ وہ طنز و مزاح کے استعمال سے واقف ہیں۔

تمکین کاظمی، مرزا شکور بیگ اور نذیر دہقانی بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں پیدا ہونے والے اہم مزاح نگار ہیں۔ مرزا شکور بیگ کی ولادت ۱۵ر ستمبر ۱۹۰۰ء کو حیدرآباد میں ہوئی۔ ان کی مزاحیہ شاعری کی ابتداء ہائی اسکول میں ہوئی۔ کالج تک پہنچتے پہنچتے اس میں نکھار آگیا۔ کالج کے زمانہ کی نظم "دال" شہرت کی حامل ہے۔ ان کے مزاحیہ کلام کا مجموعہ "ترانۂ شکور" ہے۔ ان کے نثری مجموعہ کا نام "مزاحیہ تقاریر و مضامین" ہے۔ رباعیاں ان کے فن کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان کی مزاحیہ شاعری اصلاحی رجحان پر مبنی ہے۔ طنز گہرا اور مزاح شگفتہ ہے۔ کئی امور میں اکبر الہ آبادی سے مماثلت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود ان کا رنگ منفرد ہے۔

حیدرآباد میں طنز و مزاح کی مقبولیت فرحت اللہ بیگ، آوارہ اور ناکارہ کے بعد نذیر دہقانی کی مرہون منت ہے ان کی بدولت دکنی شاعری کا احیاء ہوا۔ نذیر دہقانی کی پیدائش ۱۹۰۸ء میں جنگاؤں میں ہوئی۔ دیہات میں گزارے ہوئے بارہ برسوں نے دہقانی کی تخلیقی زبان پر اپنے اثرات مرتب کئے ہیں۔ ان کی شاعری دیہات، شہر اور سیاست کا احاطہ کرتی ہے۔ "نوائے دہقانی" ان کا مجموعۂ کلام ہے۔ "دیہاتن" "ملباڑن" "موٹ کا گیت" "موسیٰ ندی کی کہانی" "صورت" "کب تلک" "خالہ اماں" "غپ چپ" اور "مزدور" وغیرہ ان کی دلچسپ تخلیقات ہیں۔ دہقانی نے تقریباً پچاس ہزار اشعار کہے ہیں۔ فطرت و حسن کی شادابی، طنز و ظرافت کا توازن اور لفظ و معنی کی ہم آہنگی نذیر کی خصوصیات ہیں۔

برق آشیانوی ۱۸ر اپریل ۱۹۰۸ء کو سکندرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کی شاعری میں مقصدیت بنیادی عنصر ہے۔ اہم انسانی مسائل ان کے موضوعات ہیں۔ ان کے شعری مجموعے کا نام "مکرر ارشاد" ہے۔ تخلیقات میں "بغیر انجن کی ریل گاڑی" "حادثہ" "شہر میں اب ایسی جگہ" "مریضِ عشق" "مریضِ قلب" "شعر کی فریاد" "مدار ستارہ" "دھوم کی درخواست اقتدار کے نام" اور "نیا سال مبارک" وغیرہ ہیں۔ انھوں نے طنز و مزاح میں "توازن برقرار رکھا"

کامیاب کوشش کی ہے۔ برقی آشیانوی نے نثر سے بھی دلچسپی لی۔ ان کی پہلی نثری تخلیق "حسن کلاؤ" ہے۔ جس کا سنہ اشاعت ۱۹۳۵ء ہے۔ "یہ ایک تبسم" ان کا نثری مجموعہ ہے۔ اس میں اٹھارہ مضامین ہیں۔ "قصہ پہلی چھتری کا" "طبی معائنہ" اور "ایک گھر کا جغرافیہ" اچھے مضامین ہیں۔

نثر نگاروں میں رشید قریشی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی ولادت ۱۷/ جون ۱۹۲۰ء کو حیدرآباد میں ہوئی۔ رشید قریشی برقی آشیانوی سے بارہ سال چھوٹے ہیں۔ لیکن تخلیق کے میدان میں صرف تین سال پیچھے ہیں۔ رشید قریشی کے مضامین، انشائیوں اور افسانوں کا مجموعہ "من کی دنیا" ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل "تانگے والا" ان کا پہلا مزاحیہ مضمون ہے "مزاج شریف" ان کی اہم تصنیف ہے۔ جس میں ایک ڈرامہ، ایک مزاحیہ انشائیہ اور تیرہ مضامین ہیں "بیوی کی سہیلیاں" "کبری بیگم" "بُردکھاوا" "آنا دولہوں کا دیر سے" "کیا کیا نہ کیا شادی کے لئے" اور "دوسری بیوی کا پہلا شوہر" وغیرہ ان کے مزاح پارے ہیں۔ عنوانات سے موضوعات ظاہر ہیں۔ البتہ مزاح کا معیار شائستہ ہے۔ رشید قریشی نے ہنسنے ہنسانے سے زیادہ مطلب رکھا ہے "مزاج لطیفہ" بھی ان کا مزاحیہ مجموعہ ہے۔

حیدرآبادی صحافت میں طنز و مزاح کا ذکر بھی ضروری ہے۔ شمالی ہندستان کی سیاسی تحریکوں سے حیدرآبادی مزاح نگار متاثر ہونے لگے۔ پہلی جنگ عظیم کے اثرات نے ہندستانیوں میں سیاست سے زیادہ دلچسپی پیدا کی۔ سیاسی اور سماجی طاقتوں کے ٹکراؤ کی وجہ سے مشرقی تمدن اور جاگیردارانہ قدروں کی قبولیت کمزور پڑنے لگی۔ انگریزی اور دوسری زبانوں کے ادب سے اردو ادیبوں نے تاثر قبول کیا۔ نتیجتاً نئی تعلیم، نئی تہذیب اور نئے سیاسی اور سماجی تقاضوں پر توجہ مرکوز ہوئی۔ ان عوامل نے شمال اور جنوب کے سنجیدہ اور مزاحیہ ادب کو متاثر کیا۔ قدیم اور جدید قدروں میں تصادم نے ادب کے لئے نئے پہلو مہیا کئے۔ اکثر تخلیق کاروں نے سماج کی ناہمواریوں کا مشاہدہ متوازن کیفیت سے کیا۔ ان میں فرحت اللہ بیگ اور قاضی عبدالغفار وغیرہ شامل ہیں۔ سیاسی طنز کے رجحانات قومی اور حیدرآبادی دونوں سطحوں پر پائے جاتے ہیں۔ حیدرآباد کے اخبارات "پیام" "میزان" "رہبر دکن" اور "وقت" وغیرہ میں مزاحیہ کالم لکھے جانے لگے۔ حیدرآباد کے مزاحیہ کالم نگاروں میں قاضی عبدالغفار اور شاہد صدیقی اہم نام ہیں۔ جنھوں نے نئے میلانات کے باوجود حیدرآبادی مذاق ملحوظ رکھا۔ ڈاکٹر سید مصطفٰے کمال کے مطابق آزادی سے قبل حیدرآباد کے روزناموں کا اپنا ایک مخصوص معیار تھا۔ ان اخبارات کے طنزیہ و مزاحیہ کالم اسی مزاج کے غماز تھے۔[1]

قاضی عبدالغفار سنجیدہ تخلیقی ادب میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے صحافت سے بھی سروکار رکھا۔ وہ اپنے کالموں کے ذریعے مزاحیہ ادب میں اپنی انفرادیت قائم کرتے ہیں۔ اخبار "پیام" میں ان کا کالم "سرِراہ" کے عنوان سے چھپتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے عصر کے مسائل موثر انداز میں پیش کرتے رہے۔ ۱۳۵۸ھ اور ۱۳۵۹ھ کے کالموں میں جنگ عظیم کا پس منظر نظر آتا ہے۔ ان کے فقروں میں طنز زیادہ اور مزاح کم ہے۔

مزاحیہ کالم نگاری میں دوسرا اہم نام شاہد صدیقی ہے۔ وہ ۱۹۱۱ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد آگئے۔ شاہد صدیقی نے مزاحیہ شاعری بھی کی۔ انھوں نے کئی موضوعات مثلاً شادی، مشاعرے اور کرکٹ پر

۱۔ ڈاکٹر سید مصطفٰے کمال: مضمون "آندھرا پردیش میں اردو طنز و مزاح کے بائیس سال" مشمولہ معیار (۵)، ص ۹۱

پر مزاحیہ نظمیں "محقق" اور "برتھ کنٹرول" ان کی مشہور مزاحیہ نظمیں ہیں۔ صحافت کے لئے ابتداء میں شاہد صدیقی نے ہفتہ وار اخبار "الاعظم" کا انتخاب کیا۔ اس کے بعد "پیام" سے منسلک ہوگئے "صبح دکن" اور "تجلیات" اخباروں میں کام کیا۔ اس کے بعد روزنامہ "سیاست" میں ان کے کالم "شیشہ و تیشہ" سے انھیں غیر معمولی شہرت ملی۔ انھوں نے اس کالم کے لئے "کوہ کن" نام اختیار کیا۔ ان کے کالم "کچھ پروگرام" "فری اسٹائیل" اور "نام نہاد تنقید" وغیرہ مزاحیہ ادب کی اچھی مثالیں ہیں۔

آزادی سے پہلے خواتین نے مزاح نگاری پر توجہ نہیں دی۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ خواتین کی تعلیم کا فیصد زیادہ نہیں تھا۔ تعلیم یافتہ اور آزاد خیال خواتین طنز و مزاح اختیار کرنے سے احتراز کرتی تھیں۔ بے جا ہنسنا اور ہنسانا معیوب سمجھا جاتا۔ نسوانی حیا اور بزرگوں کے اعتراضات بھی مانع ہوتے تھے۔ دراصل سماج اور تمدن کے مروجہ اصولوں نے انھیں اس شعبے سے دور رکھا۔ نیز ادب میں مزاح کا کوئی خاص مقام نہ تھا۔ آزادی سے پہلے مزاح نگار مرد ہی تھے۔ مرد مزاح نگاروں کے اس ہجوم میں صرف دو خاتون مزاح نگار نظر آتی ہیں۔ آصف جہاں بیگم اور جہاں بانو نقوی۔ آصف جہاں بیگم حیدرآباد کی پہلی خاتون مزاح نگار کی حیثیت سے تسلیم کی جاسکتی ہیں۔ ان کی ولادت ۱۹۱۲ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ بارہ طنزیہ و مزاحیہ مضامین پر مشتمل ایک مجموعہ "گلِ خنداں" ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ مضامین میں "گناہ دروغ برگردن" "بچپن" اور "بیا وغیرہ شامل ہیں۔ گلِ خنداں کے دیباچے میں نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ ان کے مضامین بے ساختگی، شیرینی اور نزاکت خیال موجود ہے۔ وہ روزمرہ کی معمولی باتوں میں لطف پیدا کر دیتی ہیں۔

آزادی سے کچھ عرصہ پہلے سیاسی شعور نسبتاً زیادہ بیدار دکھائی دیتا ہے۔ اس دور میں ہندستان اور حیدرآباد میں نشو و نما پانے والی سیاسی تحریکیں عروج پر تھیں۔ عوام ایک نئے طرزِ حکومت کے خواہشمند تھے۔ معاشرتی، تہذیبی، ادبی اور صحافتی آداب میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ اس دور کے مزاح نگاروں میں ابراہیم جلیس کا ذکر ضروری ہے۔ اعجاز حسین کھٹا اپنی نظم "سائیں کی صدا" سے آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ دیگر موضوعات سے بھی مزاح نگاروں نے غفلت نہیں برتی۔ البتہ سیاسی میلان ضرور غالب رہا۔

ابراہیم جلیس کی ولادت ۲۲ ستمبر ۱۹۲۳ء کو گلبرگہ میں ہوئی۔ انھوں نے سنجیدہ اور مزاحیہ نثر نگاری کی۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "زرد چہرے" ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ "دو ملک ایک کہانی" "چالیس کروڑ بھکاری" "چور بازار" "اوپر شیروانی اندر پریشانی" "شگفتہ شگفتہ" "بھوکا ہے بنگال" "جنگل میں منگل" اور "ہنسے تو پھنسے" وغیرہ ان کی دیگر تصانیف ہیں۔ جلیس کا پسندیدہ موضوع سیاست ہے۔ وہ بنیادی طور پر طنز نگار ہیں۔

ڈاکٹر طیب انصاری[1] کے مطابق ابراہیم جلیس[2] کے فوری بعد جس مزاح نگار نے شہرت پائی وہ عاتق شاہ ہیں۔ عاتق شاہ ۷ نومبر ۱۹۳۲ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ وہ ۱۹۴۵ء سے مسلسل لکھ رہے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں پہلا مجموعہ "ٹ پاتھ کی شہزادی" شائع ہوا۔ "انڈین کاجو" طنزیہ انشائیوں پر مشتمل مجموعہ ہے دوسرے مجموعوں میں "ایک وقت کا کھانا" "چالیس قدم" اور "راستے کی کہانی" وغیرہ شامل ہیں۔ "گوشت کی دکان" "ناک" "آم" اور "چمچے" و

۱۔ ڈاکٹر طیب انصاری۔ مضمون "حیدرآباد کے مزاح نگار" "شگوفہ" جنوری ۱۹۷۶ء

۲، ۳۔ ابراہیم جلیس اور عاتق شاہ کے دراصل افسانہ نگاروں کی حیثیت سے اپنی شناخت بنائی ہے۔ ان پاس طنز بنیادی عنصر کے طور پر موجود ہے۔

ان کے مضامین ہیں۔

نثر نگاروں میں بھارت چند کھنہ کا اہم نام ہے۔ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ "مصیبتیں" ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ اسی میں "ہمارا کلرک" اچھا طنز یہ ہے۔ ان کے مزاحیہ مجموعے "کھٹی میٹھی بجلیاں" ۱۹۶۱ء میں "تیر نیم کش" ۱۹۷۲ء میں اور "کیا نام نہ ہوگا" ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئے۔ "بستیہ گرہ لا محدود" اور "کیا نام نہ ہوگا" ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئے۔ "ستیہ گرہ لا محدود" "توخیٔ شحریر" اور "حصت از دیوار کا قیدی" وغیرہ ان کے اچھے مضامین ہیں۔ کھنہ نے مزاح پر زیادہ توجہ کی ہے۔ اس میں وہ کامیاب بھی ہیں۔

آزادی سے پہلے حیدرآباد کے مزاح نگاروں میں ڈاکٹر صادق، قاضی زین العابدین عابد، سید علی منظور، شاکر رحیم میاں، علی اشرف، فریدالدین گردہ اور علی صائب میاں وغیرہ بھی شامل ہیں۔

آزادی کے بعد حیدرآباد کا پس منظر ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کے الفاظ میں:۔

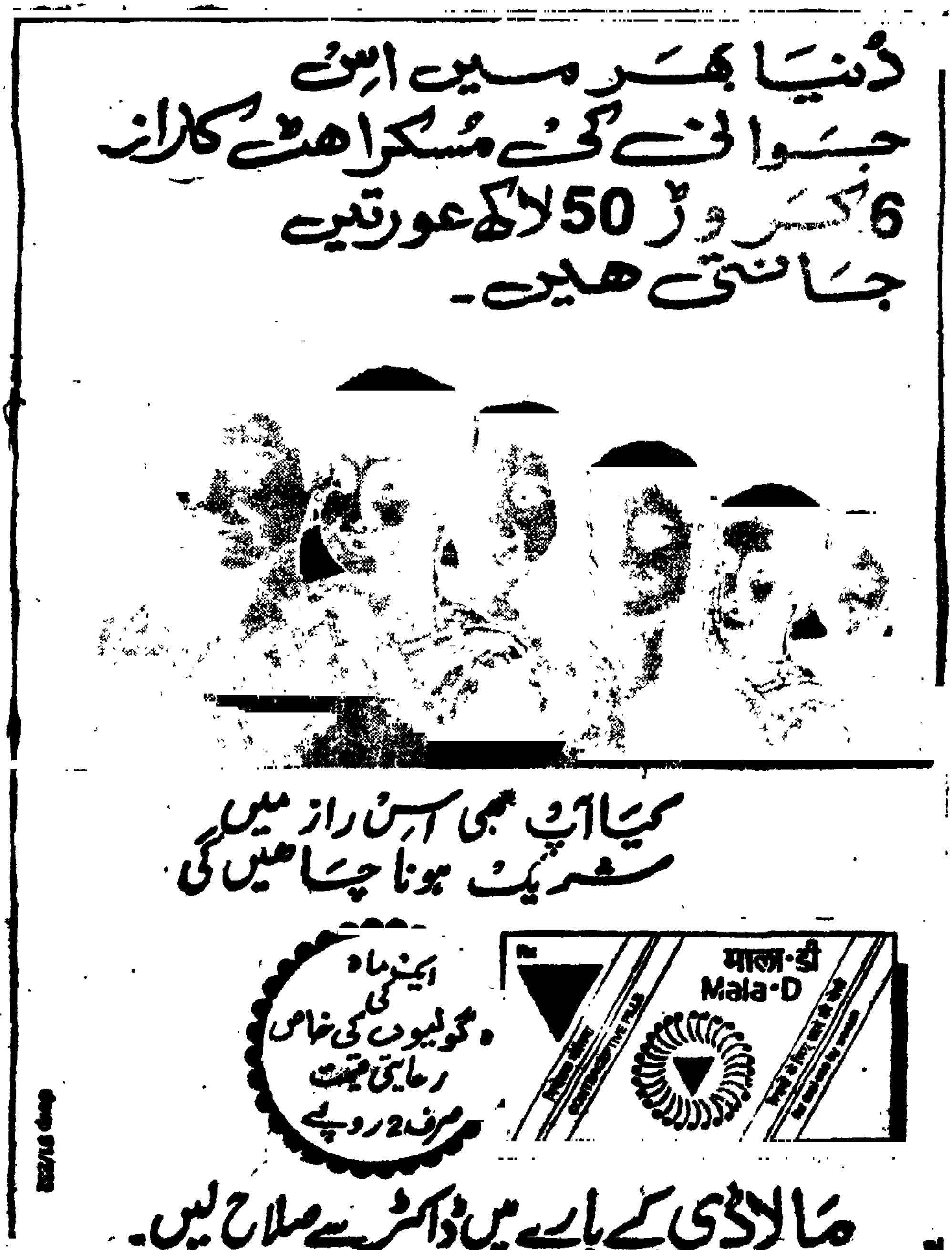
"آزادی کے بعد حیدرآباد کے پس منظر میں خوشگوار اور ناخوشگوار طرح طرح کے واقعات تھے۔ دوسری جنگ عظیم کی باقیات، تقسیم ہند، ملک کی آزادی، سقوطِ حیدرآباد۔ اور پھر معاشی ابتری، کساد بازاری، ٹوٹتے بکھرتے اور بچھڑتے خاندان تہذیبی قدروں کا زوال، فرقہ وارانہ فسادات، لسانی نقشے میں تبدیلی، اردو کا دیس نکالا، یہ اور ایسی کئی باتیں!" [۱]

۱۹۴۸ء کے بعد ایک نیا حیدرآباد ابھر کر سامنے آیا۔ صحت مند انقلاب اور قدروں کی شکست و ریخت اہم حقیقتیں بن گئیں۔ ادب نے ردِ عمل کے طور پر نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کی۔ طنز و مزاح کے لئے فطرتاً زیادہ امکانات پیدا ہوئے۔ چونکہ اہل اردو بے اطمینانی سے دوچار تھے۔ طنز و مزاح پر کسی حد تک جمود کی کیفیت طاری رہی۔ اس کے باوجود اس دور کے مزاحیہ ادب کا سرمایہ قابل اعتنا ہے۔ اگر نثر میں معیار اوسط پایا جاتا ہے۔ اکثر شعراء ابتذال کا شکار رہیں۔ صحافت میں مزاح کے معیار پر نسبتاً توجہ رہی ہے۔ روزنامہ "رہنمائے دکن" اور روزنامہ "سیاست" میں مزاحیہ کالموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ صحافت میں مزاحیہ کارٹون شامل کئے جانے لگے۔ کارٹونسٹ کی حیثیت سے وہاب حیدر اور رشیم ملتانی قابل ذکر ہیں۔ اس عہد کے اہم مزاحیہ شاعروں میں سرور ڈنڈا، سلیمان خطیب، محمد حمایت اللہ، مسافر نلگنڈوی اور اسمٰعیل ظریف وغیرہ ہیں۔ ان میں ابتدائی تین شاعروں کی شناخت "دکنی شاعری" ہے۔ نثر نگاروں میں اطہر افسر نے مزاحیہ ڈراموں کے ذریعہ طنز و مزاح کی اچھی خدمت کی ہے۔

حضرت امیر خسروؒ کی خانقاہ سے دکنی دربار تک ریختی نے طویل سفر طے کیا۔ قدیم دکنی شعراء ہاشمی، وجہی، غواصی، نصرتی، شاہی، شوقی، ابن نشاطی، محمد قلی اور طبعی وغیرہ نے اردو ادب کے سرمایے میں قابل قدر اضافہ کیا۔ اس کے بعد عرصۂ دراز تک دکنی شاعری کے نشان نظر نہیں آتے۔ دکنی عوام (اور غیر معیاری زبان سمجھی جانے لگی تھی۔ دہلی اور لکھنؤ کی زبانیں معیاری تسلیم کی جا چکی تھیں)۔ (باقی آئندہ شمارے میں)

---

[۱] ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، مضمون "حیدرآباد میں طنز و مزاح آزادی کے بعد"، شگوفہ، جنوری ۱۹۸۸ء، ص ۸۹


دُنیا بھر میں اس
جوانی کی مُسکراہٹ کا راز
6 کروڑ 50 لاکھ عورتیں
جانتی ہیں۔
کیا آپ بھی اس راز میں
شریک ہونا چاہیں گی
ایک ماہ
کی
گولیوں کی خاص
رعایتی قیمت
صرف 2 روپے
माला-डी
Mala-D
مالا ڈی کے بارے میں ڈاکٹر سے صلاح لیں۔

شبنم مناروی
(ریاض)

"جھوٹے رُوپ کے درشن"

مصنفہ راجہ انور

ایک جائزہ

اگر میں پنجاب یونیورسٹی کا چانسلر ہوتا تو "جھوٹے روپ کے درشن" کی پاداش میں فلسفے کے میدان میں راجہ انور کو دیا گیا طلائی تمغہ اور ڈگری روک لیتا! کسی میرج بیورو کا ناظم اعلیٰ ہوتا تو اپنا ہیڈ کوارٹر نیو کیمپس پر منتقل کر دیتا۔ یونیورسٹی کی کسی لڑکی کا غیرتمند باپ ہوتا تو اسے زندہ درگور کر دیتا۔ کوئی رجعت پسند مولوی ہوتا تو ایسے راجہ بازار کے چوک میں سنگسار کرتا! وزیر نشریات ہوتا تو اس کتاب کی تمام جلدیں بحق سرکار ضبط کرنے کا حکم دیتا۔ !! لیکن نہیں یہ سب کچھ نہیں۔ میں تو ایک ادیب ہوں۔ ایک تخلیق کار ——— جس کی روح عورت کی ہوتی ہے جسم مرد کا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ راجہ انور کے وجود کے اُن خلاؤں میں سما جاؤں۔ جن کی تاریکیاں نسل در نسل ہمیں ورثہ میں ملی آئی ہیں۔؟ غلامانہ ذہنیت کی تعلیم کے اجارہ دار راجہ کو مجرم سمجھیں کہ اس فرسودہ اقتدار کے نیم جان ڈھانچے کو سہارا دینے والے ان تمام گرتے ہوئے ستونوں کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ جو ہمارے اجداد کی لاشوں پر قائم ہوئے وہ قصوروار ہے کہ اس نے جاگیردارانہ ذہنیت کی ہوس پرست اور مفلوج رقاصہ کو آئینہ دکھایا ہے جو پرانے زمانے کے سوداگرانہ ذہن کی وجہ سے جاغار کتابوں کی روحوں کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ اُسے پابند سلاسل کرو کہ اس نے اپنی باغیانہ فطرت اور مجنونانہ سرکشی سے لکھنؤ کی دم توڑتی ہوئی تہذیب کی آخری نشانی امراؤ جان ادا کی جھلک پنجاب کے امنگوں بھرے پرخلوص چہرے پر رجعت پسندانہ اقدار کی گرفت میں جکڑی ہوئی زر پرست ہوسناک اور بزدل لڑکی میں دیکھی۔ اسے سزا دو کہ آتش خانم کی صورت کو انتقام کی آگ میں جھلستی ہوئی ایک سرمایہ دار خاندان کا روپ دیا ہے۔ اُسے سزا دو اور پوچھو! ان بتوں کو! جو بے حس والدین کی صورت میں آنے والی نسلوں کو اپنی بنجر ہوتی جاگیروں کی بانجھ دھرتی میں دفن کرتے چلے جاتے ہیں۔ اُسے خاکستر کر دو کہ اس نے فلسفہ کا طالب علم ہو کر سرمایہ دارانہ دور کی اپاہج نئی نسل کے مضطرب جذبات کے اس خوابیدہ آتش فشاں کا دہانہ کھول دیا۔ وہ قاتل ہے کہ اس نے بے حس سرمایہ دارانہ نظام کے ان قاتل ہاتھوں کو پہچان لیا ہے۔ جو سرمایہ دارانہ نظام کے پردے میں ایک بار پھر مظلوم عوام کی لاشوں پر رقص کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ راجہ انور نے جھوٹے روپ کا پردہ چاک کر کے نئی نسل کے لئے کردار کو جنم جنم انتقام کی ترغیب دی ہے وہ کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کا جواب زمانہ دے گا۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ راجہ نئی نسل کا ایک ایسا باغی ہیرو ہے۔ جو اپنی ہی آگ میں جل کر پہچان کے ایسے مرحلے پر پہنچا ہے۔ جہاں فلسفہ تصوریت کے ادراک

خلاؤں سے اتر کر انسانی جسم پر وارد ہوتا ہے۔ راجہ انور کے ہاں فرائیڈ اور مارکس ایک روح اور ایک جسم بنا کر زندگی کی گاڑی کو آگے دھکیل رہے ہیں۔ راجہ انور بھی اس مقام پر نظر آتا ہے۔ جہاں کشمکش حیات میں زندہ روحوں کو مردہ جسموں پر فتح کی نوید ملتی ہے۔

"جھوٹے روپ کے درشن" راجہ انور کی جذباتی زندگی کی داستان ہے لیکن اس کی کیفیت نہ فرار کی راہیں سجھاتی ہے۔ نہ لوریاں دیکر سلا دیتی ہے بلکہ وہ ایک آزاد پسند نوجوان کی کہانی ہے جس میں روح اور مادہ متوازن میلان ہے۔ جہاں تخیل اور حقیقت کے انوکھے ملتے ہیں۔ بظاہر یہ چند خطوط ہیں۔ ایک سوشلسٹ فلسفہ داں، غیر جذباتی نوجوان کے دو درجن سے کچھ کم ایسے خطوط جو اس نے اپنی محبوبہ کو کچھ ہجر اور کچھ وصال کی صورت میں لکھے۔ اور پھر نصف درجن سے کچھ زیادہ ایسے جوابات جو اس کی محبوبہ نے اسے لکھے۔ اور جوابات پر پابندی لگادی۔ پھر آخر کار راجہ کا ایک کھلا خط۔ جو شاید پوسٹ نہ کیا جاسکا۔ ان خطوط کا مرکزی خیال یہ ہے کہ وہ احساس کم مائیگی کا شکار نوجوان اونچے طبقہ کی اس خوبصورت نفاست پسند اور نمود و نمائش کی دلدادہ لڑکی پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ جس کا خاندان یونیورسٹی کی تعلیم کو نوکری کا وسیلہ نہیں بلکہ اپنی برتری کا کھوکھلا احساس سمجھتا ہے۔ اس برتری کا کھوکھلا احساس جو نسل در نسل اسے ورثہ میں ملا ہے۔ لڑکا اپنے طبقاتی کردار کی پہچان سے عاری وارد ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت ریزہ ریزہ ہے۔ وہ ایک شفاف آئینہ ہے۔ کنول نام کی اس لڑکی وابستگی ہوتی ہے تو اس لڑکی کا سرخ خون آئینہ کی پشت کو رنگین کر دیتا ہے۔ اور یوں وہ بے بس لڑکی پہلی بار اپنی ذات کا عکس اس آئینہ میں دیکھتا ہے۔ اپنے اس ہونے کے سراب کو وہ اپنی زندگی کی معراج سمجھتا ہے۔ یوں وہ اس اجنبی لڑکی کو دیوی کا نام دیکر اس کے چرنوں میں کھو کر ایک بار پھر اپنی ہستی گم کر دیتا ہے۔ اس کی انانیت اس کی وجاہت اور اس کی مردانگی اپنی حدوں سے بڑھ کر اپنی وسعت میں اپنا تشخص کھو دیتی ہے۔ تو وہ زندگی کے آدرش پر نکلتا ہے۔ زندگی کے اس موڑ میں اس کا مقابلہ لڑکی کے ایک ایس پی دوست اور میجر کزن سے ہوتا ہے۔ یوں وہ اس تثلیث میں ایک بار پھر اپنی بھرپور صلاحیتوں اور بے لوث چاہت کے باوجود اپنی روحانی اور مادی قوتوں کے نقطہ ارتکاز پر آتا ہے۔ یہاں اسے اس لڑکی سے چھپ کر ملنے میں بھی آسودگی نصیب ہوتی ہے لیکن یہ طرز عمل دراصل اس کے اندر بزدلی کا زہر بھر دیتا ہے محرومیاں اسے اپنا مقدر نظر آتی ہیں۔ دیوی کے پجاریوں کی کمی نہیں۔ اس بت پر چڑھاوا چڑھانے والے راجوں کی کمی نہیں۔ راجہ انور ان کے مقابلے میں محض نام کا راجہ ہے کہ نسل در نسل محرومیوں اور ناکامیوں کا شکار۔ نام کی تجرید میں آسودگی ڈھونڈنے والے طبقہ کا ترجمان۔ گاؤں کی سادہ اور رومان پرور زندگی سے بھاگا ہوا۔ چین اور شانتی کا متلاشی تاریکیوں اور تنہائیوں میں سومنات کی دیوی کے چرنوں میں بیٹھ کر۔ مسکراہٹ کا حسن اور قربت کا لمس پا کر اسے اک خود رفتگی ملتی ہے جس میں وہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے سوئمبر جیت لیا ہے لیکن جب سوئمبر کا وقت آتا ہے تو اسے مقابلہ میں شامل ہونے سے محروم کر دیا جاتا ہے کہ سوئمبر میں طاقت، وجاہت اور پاکیزگی کو کوئی دخل نہیں بلکہ تو قبیلوں کے سردار ہی مقابلے میں شرکت کے اہل ہیں۔ ہیرے اور جواہرات کے وہ بیوپاری جو نگر نگر گھوم کر ہیرے جمع کرتے ہیں۔ وہ جن کی انسانی صورت میں عورتوں کو ایک وحشت اور خوف محسوس ہوتا ہے لیکن جن کی غلامی ان کا مقدر بن چکی ہے۔ راجہ کو سوئمبر میں شرکت سے محروم کر دیا جاتا ہے تو وہ خواب سے بیدار ہو کر اپنے اندر عزت نفس کا درد سہ دیتا ہے۔ اس کی سرکشی ہر اس بت کو پاش پاش کر دیتی ہے۔ جو دولت کا چڑھاوا مانگتا ہے وہ ہر

خدمت گزاروں کا جشن ہے۔ بالفاظ دیگر یہ جشن ہمارا جشن ہے۔ الغرض انہی خیالوں میں گم ہم نے بانی حیدرآباد محمد قلی قطب شاہ کو بہ ایصال ثواب یاد کیا اور ام۔ اے کے زمانے میں خریدا ہوا وہ دیوان جو قدرے ناقص الطرفین تھا۔ آدھا دیوان ہمارے دیوان خانے کی دیمک کے سبب اور آدھا دیوان ہمارے دیوان خانے کے ٹپکوں کے طفیل لائق قرات نہ تھا۔ جھاڑ پونچھ کر باہر نکالا تاکہ حیدرآباد کے چار صد سالہ جشن کے تناظر میں اس کا تفصیلی مطالعہ کریں اور اپنی نامکمل تحقیق سے عوام کو مستفید ہونے کا موقع دیں۔ مطالعہ کرنے جو بیٹھے تو ایک مصرع پہ اٹک کر رہ گئے۔ "مرا شہر... آگے جو لفظ تھا وہ پڑھا نہ جاتا تھا اور جو لفظ آب زدگی کے طفیل وہاں موہوم ہو چکا تھا وہ ہم پڑھنا نہیں چاہتے تھے۔ آخر ہم "چوراں" کیسے پڑھ سکتے تھے۔ اپنی عزت سبھی کو پیاری تھی آخر ہم بھی تو حیدرآبادی ہیں۔ یہ لفظ امتداد زمانہ کے سبب مسخ ہو گیا ہوگا۔ امتداد زمانہ کے سبب لوگوں کے چہرے مسخ ہو جاتے ہیں، کردار مسخ ہو جاتے ہیں، افعال و عادات مسخ ہو جاتے ہیں یہ ہمیں معلوم تھا لیکن خاموش دیوان کے بے جان الفاظ مسخ ہوتے ہیں یہ آج ہی دیکھا تھا۔ ہم بہت حیران و پریشان ہو گئے کہ افسوس دکنی زبان کا ایک لفظ ہم سے کھل نہیں رہا ہے۔ کس منہ سے خود کو ریسرچ اسکالر کہیں ہم سے وہ لوگ لاکھ درجے اچھے ہیں جنھوں نے خود کو کبھی ریسرچ اسکالر نہیں کہا البتہ خاموشی سے اپنے نام سے پہلے ڈاکٹر لگا لیا۔ سوچا بہت غور کیا کہ "مرا شہر..... کے آگے کیا لفظ ہو سکتا ہے۔ ہماری عادت ہے کہ جب ہم زیادہ سوچتے ہیں تو آنکھیں خود بہ خود بند ہو جاتی ہیں۔ حسب عادت آنکھیں بند ہو گئیں تو ہمارے خراٹوں کی دھیمی لے ہمارے لیے لوری کا کام کرنے لگی۔ ہم چونکے کہ اس وقت جب گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز ہمارے کانوں میں گونجنے لگی... ہم حیران تھے کہ نئے دور کی ہماہمی میں یہ ماضی کی صدا کیسی۔ موٹروں اور کاروں کے شور میں یہ گھوڑے کی ٹاپ چہ معنی دارد۔ اب تو شاہ راہوں پر گھوڑے نظر ہی نہیں آتے گدھے ہی گدھے نظر آتے ہیں۔ اب گھوڑے ریس کے میدان میں دکھائی دیتے ہیں یا سرکس کے شامیانے میں۔ پھر یہ ہنہناہٹ کی کی صدا کیسی۔ یہ کون شہ سوار ہے جو غربت کدے پر بہ نفس نفیس تشریف لایا ہے۔ بیاض قدیم کا بوسیدہ دفتر ہاتھوں میں دبائے باہر نکلے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک قد آور وجیہہ اور نہایت خوش شکل شہزادہ ایستادہ ہے۔ یوں محسوس ہوا کہ یکبارگی بھاگ کھل گئے ہوں۔ بادشاہوں کے چہرے بولتے ہیں۔ ہم نے شاعرانہ انداز میں تسلیم بجالایا اور فرط مسرت میں شہزادے کے گھوڑے کی باگ تھام لی۔ شاید ہماری فطرت میں نیک دل حکمرانوں کی تعظیم ودیعت ہے۔ عرض کیا۔ بندۂ کمترین اعلیٰ حضرت کے تعارف کا محتاج ہے۔ ارشاد ہوا ہم اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ یہ سننا تھا کہ ہم نے رکاب کا تسمہ چوم لیا۔ بادشاہ مسکرانے لگا۔ جیسے وہ ہماری اس وارفتگی پر خوش ہو رہا ہو۔ ہم نے آداب درباری کو روبہ کار لاتے ہوئے عرض کیا "ظلِ سبحانی کی تشریف آوری سے بندۂ بے دام کا دل روشن ہو گیا ہمیں یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ بادشاہ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ ہم نے اپنی جیب سے رومال نکالنا چاہا لیکن حسب معمول وہ جیب میں نہیں تھا۔ بادشاہ کو روتا دیکھ کر ہمیں بہت حیرت ہوئی کہ کیا بادشاہ بھی روتے ہیں۔ بادشاہوں کو تو کسی بات کی کمی نہیں ہوتی پھر وہ کیوں روتے ہیں۔ رونا تو ہمیں چاہیے کہ صبح اٹھتے ہیں تو دودھ کے لیے پیسے نہیں ہوتے۔ لائٹ آف ہوتی ہے تو موم بتی کو پیسے نہیں ہوتے۔ بادشاہ کو روتا دیکھا تو بہت عبرت آئی۔ عبرت سے ہمیں بھی رونا آیا۔ لیکن ہمیں دلاسہ بھی کوئی چیز ہے۔ ہم نے دلاسے دینے شروع کیے۔ "ظلِ سبحانی۔ یہ محلِ بکا نہیں جائے قہقہہ ہے۔ آں جناب نے جس شہر کو بسایا تھا آج اس کا چار سو سالہ جشن منایا جا رہا ہے۔ ہماری موجودہ حکومت ہر طرح کی وابستگی اور از خود رفتگی کا ثبوت دے رہی ہے۔ والا اقبال کے افسانوی عشق کی داستان بچے بچے کی زبان پر ہے۔ ظلِ الٰہی نے جس گنگا جمنی تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی وہ آج پھول پھل کر تناور پہنچ گئی ہے۔ ہر سمت امن و آشتی کا پھریرا لہرا رہا ہے۔ ہر طرف محبت و وفا کارفرما ہے۔ جہاں تک فسادات کا سوال ہے تو وہ لندن

۲

بیوہ میم کی مسکراہٹ کی قیمت :-

بشارت کافی عرصے سیکنڈ ہینڈ کار کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے کہ ایک دن خبر ملی کہ ایک برٹش کمپنی کے انگریز افسر کی چھ سلنڈر کی بہت بڑی کار بکاؤ ہے۔ افسر کا دو مہینے قبل انتقال ہو گیا تھا اور اب اس کی جوان بیوہ اسے اونے پونے ٹھکانے لگانا چاہتی تھی۔ بشارت نے بیوہ کو ایک نظر دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا کہ اس کار کو جسے انھوں نے ہنوز دور سے بھی نہیں دیکھا تھا خرید لیں گے۔ وہ اس کمپنی کو تیس سال سے چمڑے کے پیکنگ کیس اور لکڑی کا سپلائی کر رہے تھے۔ کمپنی کے پارسی چیف اکاؤنٹنٹ نے کہا کہ آپ کو یہ کار ۱۱-۱۰-۳۲۸۳ روپے میں ملے جانا چاہیے۔ ممکن ہے پڑھنے والوں کو یہ رقم اور آخری پائی تک کی باریکی عجیب لگے۔ مگر بشارت کو عجیب نہیں لگی۔ اس لئے کہ یہ وہ رقم تھی جو کمپنی ایک عرصے سے اس بہانے سے دبائے بیٹھی تھی کہ انھوں نے ناقص کھوکھے سپلائی کئے جس کی وجہ سے چنیوٹ اور سیالکوٹ میں سیلاب کے دوران کمپنی کے سارے مال کی گلدی بن گئی۔ بشارت کہتے تھے کہ [illegible] نے بارہ بار آنے میں چمڑے کے کھوکھے سپلائی کئے تھے۔ آبدوز یا کشتی نوح نہیں۔ کمپنی کے کمینے افسر Act of God (آفتِ سماوی) کا الزام عاجز پر لگا رہے ہیں۔

خوبصورت میم نے، جس کے بیوہ ہونے سے وہ ناخوش نہ تھے، لیکن جسے بیوہ کہتے ہوئے ان کا کلیجہ منہ کو آتا تھا، یہ شرط اور لگا دی کہ تین مہینے بعد جب وہ Bat o 21 جہاز سے لندن جائے گی تو اس کے سامان کی پیکنگ کے لئے مضبوط [illegible] کیسوں اور ترکھان کے سپلائی کرنے ہوں گے۔ اس شرط کو انھوں نے نہ صرف منظور کیا۔ بلکہ اپنی طرف سے یہ اضافہ کیا کہ میں روزانہ آپ کے بنگلے آ آ کر آپ کی اور اپنی نگرانی میں خود بنفس نفیس (بنفس نفسانی؟) پیکنگ کراؤں گا۔ بشارت نے چیف اکاؤنٹنٹ سے کہا کہ کار بہت پرانی ہے۔ ۲۵۰۰ میں مجھے دے دو۔ اس نے جواب دیا 'منظور۔ بشرطیکہ آپ [illegible] کھوکھوں کا بل گھٹا کر ۱۵۰۰ کر دیں۔ بشارت نے میم سے فریاد کی کہ "قیمت بہت زیادہ ہے۔ [illegible] کم کرا دو" اس کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے اتنی حاشیہ آرائی اور کر دی کہ "غریب آدمی ہوں۔ تلے اوپر کے سات آٹھ بچے ہیں۔ [illegible] پیرہ بھائی بہن مجھ سے چھوٹے ہیں۔"

یہ سن کر میم کے چہرے پر حیرت، ہمدردی اور ستائش کا ملا جلا ایکسپریشن آیا۔ کہنے لگی۔

"Oh! dear, dear! I see what you mean. your parents too were poor but passionate."

اس پر انھیں بہت غصہ آیا۔ جلا ہی تو کہنا چاہتے تھے کہ تم میرے باپ تک کیوں جاتی ہو؟ لیکن اس جملے کی [illegible] زبان پر آتا آتا رہ گیا، اس پر [illegible] ۔ انھوں نے اسی وقت دل میں فیصلہ کیا کہ [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

غزل

یوسف شمسی کاکوی (بہار)

"نہیتا" سے تم دور رہو، نہ بننا ہرگز فول میاں
گر آئے ان کے چکر میں پھر پھانکو گے تم دھول میاں

یا بُت کو رکھ لو تم اندر، یا اس میں جگہ اللہ کو دو
بس ایک ہی اس پہ بیٹھے گا، دل کا جو ہے اسٹول میاں

ایسے میں نہ لوٹے جنتا کو تو جیون بھر پچھتاؤ گے
ہے سستا سب سے خون یہاں ہر وقت بنا ہی کول میاں

معشوق ہیں جتنے دنیا میں ہیں زہر کی پڑیا جان لو تم
ہے خوشبو ان کی زہریلی ہیں سندر جتنے پھول میاں

صورت بھی نہیں سیرت بھی نہیں کون ان کو لے کر جائے گا
جب ظاہر و باطن چوپٹ ہے پھر کیسے ہو مقبول میاں

کمزور غلامی کرتے تھے، کمزور غلامی کرتے ہیں
کون اس کو کہے گا آزادی بکواس ہے نامعقول میاں

تم کتنے راون پھونکو گے ہر شاسک دیش کا راون ہے
یہ آگ لگانا کھیل ہے بس مت کھیل پرایا پھول میاں

وہ دور سنہرا تھا بے شک جب شاعر زر میں تلتا تھا
ہے شعر و سخن کے چکر میں شمسی کا گھر مکفول میاں

محبوب مانجھوی
(ملاسی پور)

سہرا

کاغذی پھولوں کا باندھے ہوئے سر پہ سہرا
دُلہا دیہات سے آیا ہے پہن کر سہرا
دل کشی کوئی نہ خوشبو نہ ہے رنگت اس میں
شرم کھاتے ہوئے آتی ہے معطّر سہرا
اس قدر لمبا ہے، قدموں پہ گرا پڑتا ہے
چار جوتے قدِ نوشہ سے ہے بڑھ کر سہرا
اپنے ہاتھوں سے کہاں گوندھا ہے مالن نے اسے
کسی موچی نے دیا ہے یہ بنا کر سہرا
اس کی ہر بات الگ، شان الگ، آن الگ
نہیں عالم میں کوئی اس کے برابر سہرا
دیکھتا جو ہے تعجب سے یہی کہتا ہے
ہم نے دیکھا ہی نہیں ایسا پھٹیچر سہرا
تیرے دیہات میں کیا کوئی نہیں خارستان
نہ ہوا تجھ کو "دھتورے" کا میسّر سہرا
اک نظر دیکھتے ہی سارا فلک کانپ اٹھا
چھپ گئے دیکھ کے ڈر سے مہ و اختر سہرا
ہاتھ اٹھا کر کہا اک منچلے نے اے اللہ
دشمنوں کا بھی نہ ایسا ہو دلندر سہرا
باغِ فردوس بریں سے کئی کلیاں لا کر
کسی جنات سے گندھوانا تھا جم کر سہرا
ہاتھ اٹھا کر یہ دعا پیر و جواں نے مانگی
سب کو دکھلائے اسی ڈھب کا مقدر سہرا
مہرباں مجھ پہ ہیں ارواحِ خبیثہ محبوب
فیض انھیں کا ہے کہ میں لکھتا ہوں اکثر سہرا

کا چالان کیا جائے گا“ چالان کے نام سے ہی ہمارے پسینے چھوٹنے لگے ۔ اس موقع پر ہمارے دوست کا تجربہ کام آیا اور انھوں نے ہماری حالتِ زار پر رحم کھا کر بیچ بچاؤ شروع کر دیا“ دیکھیے حولدار صاحب! یہ نئے ہیں انھیں نہیں معلوم تھا۔ وہ غصے میں بولا“ اجی! لیکن آپ تو پرانے تھے ۔ آپ ہی نے سب سمجھا دیا ہوتا انھیں“ ۔ جب بات کسی طرح نہیں بنی تو ہم چالان ادا کرنے تیار ہو گئے۔ لیکن اس موقع پر پھر ہمارے دوست کا تجربہ کام آیا اور انھوں نے پولس والے کو ایک طرف لے جا کر جانے

۱۹۹۱ء بچوں کا سال ہے ۔ بچوں کے لیے اس سال
کا
تحفہ
ممتاز ادیب رشیل السلام کی لکھی
ہوئی بچوں کے لیے
کہانیاں
خیالی پلاؤ
کے نام سے عنقریب شائع ہوں گی

کیا دیا دلایا کہ اس نے واپس آکر ہمیں اسکوٹر لے جانے کی اجازت دے دی اور وارننگ دی کہ وہ آئندہ رعایت کرنے والا نہیں !

کچھ دور آگے گئے تو پچھلے پہیے کی ہوا اچانک اتر گئی معلوم ہوا کہ پنکچر ہو گیا ہے ۔ بنانا ہو گا ۔ اب جو ہم اسے گھسیٹے ہیں تو وہ منوں وزنی ہو گئی ہے ۔ بڑی مشکل سے ہم اور ہمارے دوست پنکچر جوڑنے والے کے پاس لائے ۔ پنکچر جوڑنے کے بعد پھر نکلے ۔ اب اسکوٹر ہوا سے باتیں کرنے لگا ۔ کچھ دور چل کر وہ پھر رک گیا ۔ ٹانکی کھول کر دیکھی تو پیٹرول ندارد ۔ ہمارے دوست نے انکشاف کیا کہ پرانی گاڑیوں میں پیٹرول بہت صرف ہوتا ہے ۔ پیٹرول پمپ وہاں سے بہت دور تھا ۔ چنانچہ اسے ایک آٹو میں ڈال کر پیٹرول پمپ لے گئے ۔ وہاں دیکھا تو ایک لمبی قطار ہے ۔ موٹروں کی الگ ۔ موٹر سیکلوں اور اسکوٹروں کی الگ اور آٹو رکشاؤں کی الگ ۔ بہر حال پیٹرول تو بھرانا ہی تھا ۔ ناچار انتظار کیا اور دو گھنٹے کے بعد پیٹرول بھروا کر واپس آ گئے ۔

دوسرے دن سوچا دفتر والوں پر رعب ڈالنے اب اسے آفس لے جائیں گے ۔ بڑی شان سے صاف ستھرے کپڑے پہن کر گھر سے نکلے ۔ نکلنے سے پہلے ہوا اور پیٹرول وغیرہ سب دیکھ لیا ۔ آفس کی باؤنڈری میں داخل ہوئے تو سب نے گھیر لیا اور مبارک، سلامت کی آوازیں گونجنے لگیں ۔ ایک منہ پھٹ چپراسی دوسرے کے کان میں آہستہ سے کہہ رہا تھا“ کس کباڑیئے کی دوکان سے خریدی“ ہم نے یہ سن لیا لیکن ان سنی کرتے ہوئے کہا کہ گو سکنڈ ہینڈ ہے لیکن نتھو میکانک نے یقین دلایا ہے کہ اچھی حالت میں ہے ۔ اسی چپراسی نے پھر کانا پھوسی کی“ یہی نتھو جو چوری کی اسکوٹریں بیچتا ہے ۔ ہم نے اس بات کو بھی سنی ان سنی کر دی ۔ اور ایک دوست سے کہا“ لوگ کہتے ہیں کہ نتھو چوری کی گاڑیاں بیچتا ہے ۔ لیکن ہمیں اس سے کیا ۔ وہ جانے اور اس کا ایمان ۔ ہم نے تو پیسے دے کر خریدی تھی“ ۔ اس پر ہمارے ان ہی دوست نے کہا کہ ماڈل بہت پرانا ہے اور نتھو نے ہم سے زیادہ پیسے اینٹھ لیے ۔

دفتر برخاست ہونے کے بعد ہم بجھے بجھے دل سے نکلے ۔ اسکوٹر اسٹارٹ کی تو وہ پھس پھس کر کے رہ گئی ۔ دوست احباب نے مدد کی کچھ چپراسیوں نے ڈھکیلا ہم لے کر چلے لیکن دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ اگر راستہ میں آف ہو گئی تو کون مدد کرے گا ۔ اسی سوچ میں غرق تھے کہ سامنے سے ایک ٹرک دندناتا ہوا آیا ۔ ہم اسے بچانے کی فکر میں تھے ہی کہ اس نے آکر ہمارے اسکوٹر کو ٹکر دے دی ۔ اس کے بعد یاد نہیں کیا ہوا ۔ جب ہمیں ہوش آیا تو ہم ہاسپٹل میں تھے ۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ وہی ہاسپٹل ہے جہاں ہم پیدا ہوئے تھے اور اب ۵۰ سال بعد اسکوٹر کی بدولت پھر اسی میں آگئے ہیں ۔ دیکھا تو ہماری شریکِ مصیبت ہنڈل

محمد نسیم الدین فریس ریسرچ اسکالر
(حیدرآباد)

مشتاق احمد یوسفی کی طنزیہ و مزاحیہ نگارشات

اردو زبان میں طنز و مزاح نگاری کی روایات کوئی زیادہ قدیم نہیں ہیں۔ اردو میں پہلے پہل طنز و مزاح کے ہتھیاروں کو نثر سے زیادہ شاعری کے اسلحہ خانے کی زینت بنایا گیا بعد ازاں نثر کے میدان میں ان حربوں کو استعمال کرنے والے مجاہدین طنز و مزاح کی صف اوّل میں جعفر زٹلی، سودا اور انشاء وغیرہ جیسے شہسواران فن نظر آتے ہیں جن کے مرکّب خامہ نے طنز و مزاح تضحیک تمسخر اور تفنن و ظرافت کی اعلیٰ ترین منازل سر کی ہیں۔ بعد کے لکھنے والوں نے طنز و مزاح کو بازاریت اور رکاکت و ابتذال کی سطح سے اونچا اٹھا کر اسے تہذیب و شائستگی اور سلیقہ و ہنرمندی عطا کی اور اپنی محنت و لگن سے اس کو باقاعدہ فن لطیف کا درجہ دیا اور صنف ادب کے طور پر منوالیا۔ اس خصوص میں رشید احمد صدیقی۔ پطرس۔ کنہیالال کپور اور فکر تونسوی جیسے بلند قامت طنز و مزاح نگاروں کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے قدیم روش اور پامال راہوں سے ہٹ کر نئی ڈگر اختیار کی اور طنز و مزاح کو مستقل آرٹ یا فن کے طور پر استعمال کیا اور مغربی ادبیات سے استفادہ کر کے اردو ادب میں طنز و مزاح کو نئی جہتوں۔ نئی وسعتوں اور جدید اسالیب و تکنک کو روشناس کرایا۔ اس نسل نے اپنی ذاتی اُپج۔ عمیق مطالعے گہرے سیاسی و سماجی شعور اور اصلاحیت فکر و نظر کے ذریعے طنز و مزاح کی جدید کلاسیکی روایات کو فروغ دیا۔ موجودہ نسل میں متوسطین کی اس طرز نگارش اور NEW CLASSICAL روایات کو آگے بڑھانے والوں میں مشتاق احمد یوسفی کا نام ایک منفرد و ممتاز مقام رکھتا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی نے اب تک چار شہ پارے پیش کیے ہیں۔ چراغ تلے۔ خاکم بدہن، زرگزشت اور آب گم، یہ تعداد بہت کم معلوم ہوتی ہے لیکن معیار و کیفیت کے لحاظ سے بہت اونچے درجے اور گرانقدر حیثیت کی حامل ہے کیوں کہ فنون لطیفہ میں اصل چیز تعداد و کمیت نہیں بلکہ تاثیر و کیفیت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کا دیوان مختصر اور کم ضخیم ہونے کے باوصف فن و معیار کی کسوٹی پر دیگر شعراء کے بھاری اور ضخیم دواوین پر تفوق و برتری رکھتا ہے۔ اسی طرح پطرس نے بھی ایک مختصر سے مجموعہ مضامین کے بل پر مزاح نگاری میں بقائے دوام حاصل کی ہے۔ پطرس کے بعد جس طنز و مزاح نگار نے کم لکھ کر بہت اونچا مقام اور شہرت عام حاصل کی ہے وہ مشتاق احمد یوسفی ہیں۔

نئے لکھنے والوں میں مشتاق وہ واحد فنکار ہے جس کے فن میں قدیم کلاسیکی روایات اور جدید رجحانات کا خوشگوار امتزاج نظر آتا ہے۔ اگرچیکہ اُن کے ہاں موضوعات کا تنوع ہے لیکن وہ فرحت اللہ بیگ کی طرح بسیار نویس نہیں ہیں اگرچیکہ اُن کا مزاح بے ساختہ قہقہے لگانے پر مجبور کرتا ہے پھر بھی وہ شوکت تھانوی کی طرح پھوہڑپن پر اتر نہیں آتے۔ نکتہ آفرینی اور بات پیدا کرنے کے فن سے وہ خوب واقف ہیں لیکن رشید احمد صدیقی کی طرح موضوع سے بہکتے اور شعور کی رو (STREAM OF CONSCIOUSNESS) میں بہتے نہیں۔ اگرچیکہ وہ بھی سماج کی ناہمواریوں اور